

حیاتِ شبلی

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے
سوانح حیات اور علمی عملی کارنامے

مترجم

(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

www.KitaboSunnat.com

دار المصنفین شبلی کیدھی

اعظم گڑھ یو۔ پی (ہند)
۲۷۶۰۰۱

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

فَأَقْصِبِ الْاَقْصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

حیات شبلی

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے

مرتبہ

www.KitaboSunnat.com

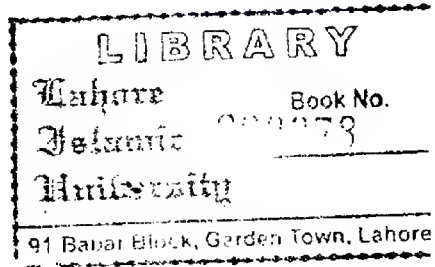
(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دَارُ الصِّغْفَرِیْنَ شَبْلِیْ کَبْرِیْ

اعظم گڑھ یو۔ پی (ہند)

© جملہ حقوق بحق دارالمصنفین محفوظ
سلسلہ دارالمصنفین نمبر: ۶۶

نام کتاب : حیات شبلیؒ
نام مصنف : مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ
صفحات : ۶۷۶
طبع جدید : اکتوبر ۲۰۰۸ء
مطبع : معارف پریس، اعظم گڑھ، یوپی
ناشر : دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 276001 یوپی (انڈیا)
قیمت :
باہتمام : عبدالمنان بلالی



DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. 19
AZAM GARH- 276001 U.P. (INDIA)
Email: Shibli_academy@rediffmail.com
www. Shibliacademy.org
Ph: (office) 05462- 265080
Ph: (library) 05462- 265017
ISBN- 978- 81- 906613-8-6

فہرست مضامین حیات شبلی رحمۃ اللہ علیہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷	کتاب کے ضمنی مباحث		فہرست
۷	تصویر کا بدل	۱	۱ - ۲۹
۸	کتاب کا نام		فہرست رجال و حواشی
۸	محسن کی شکر گزاری	۳۰	۳۰ - ۳۲
۸	مولانا کے تین بڑے احسانات		حیات شبلی
	دیباچہ	۱	۱ - ۸
	حیات شبلی	۱	
۹	۳۴ - ۹	۲	سوانح کے ذرائع علم مولانا کی زندگی میں ان کی سوانح عمری کا خیال وفات کے بعد ان کے سوانح پر مضامین اور رسالے حیات شبلی کی ترتیب کا آغاز و انجام معاونوں کا شکریہ حیات شبلی کے معتمد و منتقد عہد جدید کا معلم اول
	ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق اشخاص کا پیدا ہونا	۴	
۹	مغلوں کے آخری دور میں دو عظیم الشان فتنے	۴	
۱۰	ان کے استیصال کے لیے مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کا ظہور	۶	
۱۰		۷	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲	اس دور کا ہیرو اور اس کی خدمات		سکھوں کی قوت اور اکابر دہلی و
۱۲	مولانا کا مقصد زندگی	۱۰	رائے بریلی کی تحریک اصلاح و دعوت
	مستشرقین یورپ کے اعتراضات کا		انگریزوں کا عروج اور عیسائی
۱۲	رد اور ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ	۱۰	مشرکیوں کا اسلام پر حملہ
	ہرزمانہ کی ضرورت کے مطابق علما		ڈاکٹر وزیر و مولانا رحمت اللہ وغیرہ
۱۲	کی ایک جماعت کی تیاری	۱۰	کی مدافعت
۱۲	قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح کا خیال		آریہ تحریک کے مقابلہ کے لیے
۱۲	اس کی مخالفت	۱۰	مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور
	دارالعلوم ندوہ کی تاسیس اور مخالفت		رد بدعات کے لیے مولانا رشید احمد
۱۲	میں کمی	۱۱	گنگوہی وغیرہ کی خدمات
	جدید فلسفہ کی کتابوں کے داخل		علوم جدیدہ کی شبہات آفرینی اور
۱۲	نصاب ہونے پر اصرار		مولوی کرامت علی جون پوری
	عربی نصاب تعلیم میں انگریزی		(متولی، امام باگڑہ، ہگلی) اور
۱۳	کا داخل کرنا	۱۱	مولوی چراغ علی اور سرسید کے کام
	قدیم فلسفہ و منطق کے خارج از نصاب		مستشرقین یورپ کا دور اور اسلام اور
	کیے جانے پر استفسار اور مولانا		مسلمانوں کے علوم و فنون، تاریخ و
۱۳	کا جواب	۱۱	تمدن پر اعتراضات
	انگریزی کے لازمی کیے جانے پر میرا		نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی
۱۳	اختلاف اور مولانا کے اثرات	۱۲	اثر پذیری و گم رہی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	اردو کو تصنیفی زبان بنانے اور اس کی	۱۵	مولانا کے مجمل کارنامہ مہائے زندگی
۲۲	ترقی میں مولانا کا حصہ		جزیہ کے متعلق مولانا کی نئی تحقیق
	مولانا کی تصنیفات، ادب و انشا کا	۱۷	اور اس کی مقبولیت
۲۳	اعلا ترین نمونہ ہیں		مولانا کا مضمون حقوق الذمیین
	ہر قسم کے موضوع پر طبع آزمائی اور	۱۹	اور معترضین اسلام کا رد
۲۳	دارۂ تصنیف و تالیف کی توسیع		کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق یورپ
	مولانا کی تصنیفات میں نیا مناظرانہ	۲۰	کا الزام اور مولانا کی تردید
۲۳	رنگ اور اس کی پسندیدگی		جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلامی
	ان کی ہر کتاب مناظرانہ اور کسی نہ	۲۰	پر تبصرہ
۲۴	کسی فرقہ کے رد میں ہے		ہندوؤں پر عالم گیر کے مفروضہ
	ان کی کلامی و تاریخی کتابیں اور	۲۰	مظالم اور اس کا جواب
۲۴	غیر مسلم معترضین		مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں
۲۴	مولانا کے طریقہ تصنیف کی تقلید	۲۱	پر مضامین
۲۴	مولانا کا وسیع مطالعہ اور اس کا فیض		الفاروق میں اسلامی طرز حکومت کی
	نئی کتابوں کی تلاش و جستجو و فراہمی،	۲۱	تصویر
۲۵	مطالعہ کا ذوق		تاریخی مسائل کی جدید تحقیق کا
	دوسرے اداروں اور کتب خانوں کو	۲۱	نمونہ مولانا کی تصنیفات میں
۲۵	ان کی خریداری کی ترغیب		قرآن پاک کی تحریف کے متعلق
۲۵	مولانا کی علمی و ادبی دعوت و تبلیغ کا فروغ	۲۲	ڈاکٹر منگنا کے آرٹیکل کا جواب

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸	اسلام کی تبلیغ میں متکلمانہ طریقوں کی بے تاثیر	۲۵	مولانا کے طرز و اسلوب تحریر کی عام تقلید
۳۰	علم کلام، اسلام کے مخالفین و معترضین کے خلاف بہ طور ایک آلہ کے	۲۵	علماء کے ایک مرکزی ادارہ کے قیام کا تخیل
۳۰	علم کلام کے ذریعہ اسلام کی خدمت	۲۵	ندوہ کے ایک اجلاس میں علماء کے فرائض پر ایک تقریر
۳۳	متکلمین کا اصل مقصد علم کلام سے علاحدگی	۲۶	ندوہ کی مرکزیت کی دعوت
۳۳	ذات نبوی ﷺ کے ساتھ عقیدت	۲۶	سیاسیت سے دل چسپی
۳۳	سیرت نبوی ﷺ کے لیے تیاری اور احادیث و سیرت کی کتابوں کا مطالعہ	۲۶	کانگریس کی حمایت
۳۳	آخری عمر کے مقاصد زندگی	۲۶	مسلم لیگ کے زاویہ نظر کی تبدیلی
۳۳	ندوہ کی اصلاح	۲۶	میں مولانا کے سیاسی مقالات اور نظموں کا حصہ
۳۳	اسلام کی اشاعت و حفاظت	۲۶	ہندوستان میں اتحاد اسلامی کے داعی اول
۳۳	سیرت نبوی ﷺ کی تکمیل	۲۶	مسلمانوں کا موجودہ سیاسی ذوق
۳۳	زندگی کا آخری کارنامہ	۲۶	ادریسی بیداری میں مولانا کا حصہ
۳۳	سیرت کی تصنیف کا اعلان اور علماء کو اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش	۲۶	اور اس میں ناکامی
۳۳	مسلمانوں کی صدائے لبیک	۲۸	تکفیر اور مولانا کی برأت
۳۳	سیرت کی اشاعت کے فیوض و برکات		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۴	لکھنؤ		مسلمانوں میں عام سیرت نگاری
۴۶	فرنگی محل	۳۳	کاذوق
۴۶	میر فتح اللہ شیرازی		مقدمہ
۴۶	ملا عبد السلام لاہوری	۳۵	۳۵ - ۷۱
۴۶	ملا عبد السلام دیوبند	۳۵	خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان
۴۷	ملا دانیال چوراسی	۳۶	ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم
۴۷	شیخ محبت اللہ آبادی	۳۶	علماء الدین خلجی کے زمانہ کے علماء
۴۷	قاضی گھاسی	۳۸	علم کا قافلہ پورب کو
۴۷	شیخ آصف الد آبادی	۳۸	بداویوں
۴۷	شیخ محمد فضل الد آبادی	۳۹	کٹرہ
۴۸	ملا قطب الدین سہالوی	۳۹	اودھ
۴۸	ملا قطب الدین شمس آبادی	۴۰	قنوج اور کٹرہ
۴۸	ملا محبت اللہ بہاری	۴۱	ظفر آباد اور جون پور
۴۹	حافظ امان اللہ بنارس	۴۱	ملک پورب (مشرق)
۴۹	ملا نظام الدین فرنگی محلی	۴۲	صوبہ الہ آباد و اودھ
۴۹	مدرسین فرنگی محل	۴۲	جون پور
۵۰	ملا کمال الدین اور ملا حمد اللہ	۴۳	اودھ
	ملا باب اللہ جون پوری اور		قاضی شہاب الدین دولت آبادی
۵۰	غلام بیگی بہاری	۴۳	اوران کے فیوض و برکات

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۹	ملا محمد افضل جون پوری	۵۰	سلسلہ خیر آباد
۵۹	دیوان عبدالرشید اور ملا محمود جون پوری	۵۱	مولانا فضل حق خیر آبادی
۵۹	عالم گیر کا زمانہ	۵۱	فرنگی محل کا اخیر دور
۵۹	اس عہد کے بعض علما	۵۲	مولانا عبدالحمید فرنگی محلی
۶۰	جون پور کے مدرسے	۵۲	مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محلی
۶۱	اودھ کی نوابی کا زمانہ	۵۲	مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی
	دلی کے آخری خانوادہ علم	۵۲	علمائے جون پور
۶۵	کا اثر پورب پر	۵۳	علمائے ظفر آباد
۶۶	مولانا کرامت علی حنفی جون پوری	۵۳	پورب میں علمی ترقی کے چار دور
۶۶	مولانا محمد فصیح غازی پوری	۵۳	شرقی سلطنت کا دور
۶۶	مولانا سخاوت علی جون پوری	۵۶	لودیوں کا زمانہ
۶۷	ان کے مشاہیر تلامذہ	۵۷	سلطان سکندر لودی اور علما کی قدر دانی
۶۷	اہل حدیث اور خالص حنفی	۵۷	شیخ عبداللہ
۶۷	شاہ ولی اللہ دہلوی	۵۷	میاں حاتم سنہلی
	مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور	۵۷	مولانا الہ داد جون پوری
۶۹	ان کے تلامذہ	۵۸	شیخ رفیع الدین محدث شیرازی
۶۹	پورب کے دو نئے مدرسے	۵۸	تیموریوں کا زمانہ
۶۹	مدرسہ اسلامیہ امام بخش جون پور	۵۸	سید عبدالاولی جون پوری
۷۱	مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور	۵۹	شاہ جہاں کا دور

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۸	ولادت اور تعلیم و تربیت	۷۲	اعظم گڑھ اور اس کے اطراف
۷۸	۱۵۸ - ۷۸	۷۲	۷۸ - ۷۲
۷۸	حسب و نسب و مولد	۷۲	سرکار جون پور کا رقبہ
۷۸	بندول کی تعریف میں مولانا کے	۷۲	اعظم گڑھ کی تاریخ
۷۸	چند شعر	۷۲	اعظم گڑھ کے نو مسلم خاندان
۷۸	خانقاہ	۷۳	اعظم گڑھ کی وجہ تسمیہ
۷۸	موضع جیران پور	۷۳	اعظم گڑھ کا بانی
۷۸	نسب		اعظم گڑھ کے بعض مردم خیر قصبات
۷۹	شجرہ	۷۶	اور دیہات
۸۰	قبول اسلام	۷۶	سرائے میر
۸۰	خاندانی حالات	۷۶	نظام آباد
۸۰	نا تہال انصاری	۷۶	میٹھ نگر، ماہل، پھر یہا
۸۱	بزرگوں کے حالات	۷۶	گھوسی
۸۱	شیخ حبیب اللہ	۷۶	مولوی عبدالقادر صاحب
۸۳	والدہ ماجدہ	۷۷	چریا کوٹ
۸۳	اولاد	۷۷	منو
۸۶	ولادت	۷۷	محمد آباد اور ولید پور
۸۶	نام	۷۸	مبارک پور
۸۶	نعمانی کی وجہ انتساب	۷۸	سگروی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۱	طالب علمی میں مناظروں کا شوق	۸۷	بچپن
۱۰۳	تکمیل	۸۸	تعلیم و تربیت
۱۰۳	سفر حج ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء	۸۸	فطری آثار کمال
	ایک مثنوی کے چند شعر جو ردضہ	۸۹	مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ
۱۰۴	اقدمس کے سامنے پڑھی تھی	۸۹	مولانا علی عباس صاحب چریا کوٹی سے تلمذ
۱۰۴	مدینہ منورہ کے کتب خانوں کی سیر	۸۹	مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جونپور
	ایک صاحب حال ہندی کا ذکر مولانا	۸۹	مولانا فاروق صاحب
۱۰۴	کی زبان سے	۹۱	استاد کی نسبت شاگرد کا بیان
	عربوں کی فیاضی اور جرأت مندی	۹۳	مدرسہ اسلامیہ اعظم گڑھ کی ویرانی کا منظر
۱۰۴	اور شریفانہ اخلاق کا مولانا پر اثر		رام پور اور لاہور کے تعلیمی سفر
۱۰۵	پہلا قومی کام	۹۴	(۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۲ھ)
	ترکوں کی اعانت کے لیے اعظم گڑھ	۹۴	مولانا ارشاد حسین رام پوری
۱۰۶	میں چندہ	۹۵	دیوبند کی حاضری
۱۰۶	اتحاد اسلامی کا جذبہ	۹۵	مولانا فیض الحسن لاہور
	ان ایام میں مولانا کے علمی اور ادبی	۹۸	استاد کی وفات پر مولانا کا تاثر
۱۰۷	مشاغل (۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک)	۹۸	مرثیہ
۱۰۷	تعلیم و تدریس		مولانا احمد علی محدث سہارن پوری
۱۰۷	شعر و شاعری	۹۹	سے تعلیم حدیث
۱۰۷	غزل گوئی و قصیدہ نگاری	۱۰۰	سند حدیث

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۹	اعظم گڑھ میں وکالت (۱۸۸۱ء)	۱۰۸	مشاعروں میں شرکت
۱۱۹	ملازمت (۱۸۸۲ء)	۱۰۹	ایک انگریزی نظم کا منظوم اردو ترجمہ
۱۲۰	نیل کا کام (۱۸۸۲ء)	۱۰۹	غیر مقلدوں کا رد
۱۲۱	بستی میں وکالت (آخر ۱۸۸۲ء)		رسالہ ظل الغمام فی مسئلۃ
	مولانا کا اپنی طالب علمانہ زندگی	۱۱۰	القرآۃ خلف الامام
۱۲۱	پراپنا آپ تبصرہ	۱۱۰	اس رسالہ کا دیباچہ
	علی گڑھ کا سفر (۱۸۸۱ء) اور سرسید	۱۱۲	سلسلہ تحریر
۱۲۱	سے ملاقات		مولانا عبدالحی فرنگی بھلی کے رسالہ
۱۲۲	سرسید کی مدح میں عربی قصیدہ		امام و الکلام کی تردید میں اسکات
۱۲۳	علی گڑھ کالج کا تعلق (۱۸۸۳ء)		المعتدی علی انصاف المقندی کی
۱۲۵	عربی ادب کا درس	۱۱۳	تصنیف
۱۲۵	مولانا ماجد علی کا استفادہ		اس رسالہ کی مصروف شام و روم
۱۲۵	علی گڑھ میں قیام	۱۱۳	میں مقبولیت
۱۲۵	علی گڑھ کی معاشرت اور احباب	۱۱۵	اخبار اور دھنچ و پیام یار سے دل چسپی
	علی گڑھ میں ابتدائی مشاغل اور	۱۱۶	اردو غزل گوئی
۱۲۶	احباب		کتابوں کا مطالعہ اور نادر کتابوں کی
۱۲۷	سرسید سے میل جول	۱۱۶	تلاش کا ذوق
	اشارات کے ایک مشکل مقام کے	۱۱۶	مولانا کی ایک پرانی عربی تحریر
۱۲۷	حل میں سرسید کی مدد	۱۱۷	وکالت کی تعلیم (۱۸۷۹ء و ۱۸۸۰ء)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۱	مصری مطبوعات کا سرمایہ	۱۲۹	کالج میں مولانا کے شاعرانہ کمال کا شہرہ
۱۳۲	کالج پر مولانا کے اثرات	۱۳۰	نیارنگ
	طلبہ میں فارسی ادب اور عربی	۱۳۱	جدید تعلیم پر مولانا کا پہلا تبصرہ
۱۳۳	زبان کا ذوق	۱۳۱	علی گڑھ کے اثرات، موضوع شعر میں تغیر
	قرآن پاک کا ذوق اور طلبہ میں اس	۱۳۱	قصیدہ عید
۱۳۳	کا ذوق	۱۳۲	انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس
۱۳۳	ذات نبویؐ کے ساتھ طلبہ کی عقیدت	۱۳۲	نیشنل اسکول کا قیام (۱۸۸۳ء)
۱۳۳	کالج میں مجالس میلاد کا قیام	۱۳۳	مجلس موازنہ ترقی قوم
	فن سیرت میں عربی رسالہ بدء اسلام	۱۳۳	بندول میں اسکول
۱۳۳	کی تصنیف، اور اس کا داخل نصاب ہونا	۱۳۳	ندوہ کے نصاب تعلیم میں انگریزی
۱۳۳	طلبہ میں مذہبی رنگ	۱۳۴	تاریخی ذوق
	طلبہ میں مضمون نویسی و تحریر و انشا	۱۳۵	تصنیفی ذوق
۱۳۴	اور شعر و سخن کا ذوق	۱۳۶	نصیف کی تیاری
	کالج کی نام و بی و مقبولیت میں	۱۳۶	مثنوی صبح امید
۱۳۵	مولانا کی نظموں کا حصہ	۱۳۶	یورپ کی تحقیقات علمی سے آگاہی
۱۳۶	سر سالار جنگ اول کا مرثیہ		پروفیسر آرنلڈ سے تعلقات اور
	خلیفہ سید محمد حسن وزیر ریاست پٹیالہ	۱۳۶	ایک دوسرے سے استفادہ
۱۳۷	کی آمد میں فارسی کے چند بند		مولوی سید علی بلگرامی کے کتب خانہ
۱۳۸	قصید خیر مقدم نواب وقار الامرا بہادر	۱۴۰	سے استفادہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۶	انجمن ترقی اردو کا قیام اور مولانا کی نظامت	۱۴۹	نواب آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم حیدرآباد دکن کی تشریف آوری پر رودکی کے طرز پر فارسی قصیدہ
۱۵۶	دہلی کانفرنس میں ”اسلام اور بے تقصیبی“ پر لکچر	۱۵۰	کالج کی شہرت میں مولانا کی تصانیف و مضامین و خطبات کا حصہ
۱۵۷	ڈھا کہ کانفرنس میں تاریخ اسلام پر تقریر	۱۵۰	تصنیفات کے ذریعہ کالج کی اعانت
۱۵۷	نئی تال کا سفر (مئی ۱۸۸۷ء)	۱۵۱	کالج یونین سے مولانا کی دل چسپی
	تصنیف کا آغاز	۱۵۲	یونین میں گذشتہ طرز تعلیم کی حمایت میں مولانا کی تقریر
۱۵۹	۱۸۸۷ء		جمہوری طرز حکومت کی تائید میں ایک تقریر اور اس سے سرسید کا اختلاف
۱۵۹	۱۵۹ - ۱۹۱	۱۵۲	یورپ کی تاریخی غلطیوں کے جواب و تصحیح کے لیے مجلس کا قیام
۱۵۹	۱- مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم	۱۵۲	مخڈن اینگلو اورینٹل کالج کی میگزین کی ادارت
۱۶۰	۲- دوسری تصنیف المامون	۱۵۳	کانفرنس کی خدمت
۱۶۰	مولانا شروانی سے تعلقات	۱۶۶	کلکتہ کانفرنس میں فارسی زبان کی تعلیم کی تائید میں مولانا کی پر جوش تقریر
	رام پور کے سرکاری کتب خانہ اور مدرسہ عالیہ میں (۱۸۸۸ء)	۱۵۶	گورنر بنگال سراوڈ برن کا اعتراف
۱۶۱	لطیفہ		
۱۶۳	۳- تیسری تصنیف سیرۃ العمان		
۱۶۵	حیدرآباد کا سفر (۱۸۹۱ء)		
۱۶۶	مولوی سید علی بلگرامی کا شوق ملاقات		
۱۶۸	قصیدہ فارسی		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۵	غازی عثمان پاشا کی زیارت و ملاقات	۱۶۹	اس کا مقبولیت
۱۸۶	تمغہ مجیدی اور حکومت ہند	۱۶۹	بھوپال میں قیام
۱۸۶	قسطنطنیہ سے روانگی	۱۷۰	نواب سید علی حسن خاں سے ملاقات
۱۸۶	بیروت		سلسلہ علالت کا آغاز اور سفر کشمیر
۱۸۷	بیت المقدس	۱۷۰	کا خیال (اپریل ۱۸۹۲ء)
۱۸۷	قاہرہ	۱۷۱	سفر قسطنطنیہ (مئی ۱۸۹۲ء)
۱۸۷	جامعہ ازہر	۱۷۵	شیخ عبدالفتاح سے ملاقات اور دوستی
۱۸۸	کتب خانہ خدیویہ	۱۷۵	شیخ علی ظہیان سے تعلقات
۱۸۹	علماء سے ملاقات	۱۷۶	کتب خانوں کی سیر
۱۸۹	صحت پر عمدہ اثر	۱۷۷	نادر کتابوں کا تذکرہ
۱۸۹	واپسی اور سفر کے نتائج اور تاثرات	۱۷۸	مدارس کا معائنہ
۱۹۱	کالج میں خیر مقدم	۱۸۰	ترکی مصنفین و ادبا سے ملاقات
۱۹۱	مبارک باد کا جلسہ	۱۸۰	ترکی زبان کی تحصیل
۱۹۱	چودھری خوشی محمد خان ناظر کی مدیہ اردو نظم		پرانے عربی مدرسوں کے معائنہ
	ایک تقریب میں مولانا کا فارسی	۱۸۰	سے انقباض
۱۹۱	ترکیب بند	۱۸۱	قومی کالج نہ ہونے پر افسوس
	سفر نامہ، کلیات اور رسائل	۱۸۲	رسم سلامتی
	۱۸۹۲ء		موکب سلطانی کا نظارہ اور مولانا
۱۹۲	۱۹۲ - ۲۲۶	۱۸۲	کے تاثرات

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	مولوی داؤد بھائی صاحب کا	۱۹۲	۴- سفرنامہ
۲۰۸	عربی قصیدہ تبریک	۱۹۲	سفرنامہ لکھنے کا خیال
۲۱۰	نذیر احمد صاحب بی اے کی عربی تقریر		بعض سیاسی اسباب کی بنا پر
	ولایت اللہ صاحب بی اے کی	۱۹۲	اس کو ترک کر دینا
۲۱۰	مدحیہ اردو نظم	۱۹۳	اعادہ خیال اور سفرنامہ کی تالیف
۲۱۲	مولانا حمید الدین کا عربی قصیدہ	۱۹۳	اس کے اثرات
۲۱۳	خواجہ غلام الثقلین اور سید محمود کی تقریر	۱۹۴	۵- کلیات فارسی (۱۸۹۳ء)
۲۱۴	مولانا ظفر علی خاں کا فارسی قصیدہ	۱۹۶	۶- رسائل شبلی
۲۱۵	مولانا حالی کا عربی قصیدہ	۱۹۷	اس کا مقدمہ
۲۱۶	مولانا کی شکر یہ کی تقریر		۷- الفاروق کی تصنیف پر اختلاف
۲۱۸	اسٹریجی ہال میں جلسہ	۱۹۹	رائے (۱۸۹۳ء)
۲۱۸	رسم خلعت و عطاء خطاب		الفاروق کی تالیف سے سرسید کا اختلاف
۲۱۸	مسٹر ہوٹنگٹن کمشنر میرٹھ کی تقریر	۲۰۰	اور اس کے متعلق ان کا ایک خط
	تقریر اور تقریب کی روداد		منشی سراج الدین صاحب کی
۲۱۹	اخبار پانیر میں (۱۸۹۳ء)	۲۰۱	سیرۃ الفاروق پر سرسید کا اظہار افسوس
	پورے ملک کے ہدیہ تبریک پر		تجویز الفاروق کی مخالفت میں سرسید
۲۲۱	مولانا کی شکر یہ آمیز تقریر	۲۰۳	کی رائے
۲۲۱	تماشا نے عبرت (فروری ۱۸۹۴ء)	۲۰۴	شمس العلماء کا خطاب (جنوری ۱۸۹۴ء)
۲۲۲	لاہور کا سفر (۱۸۹۵ء)	۲۰۵	کالج میں تبریک و تہنیت کا جلسہ
۲۲۲	الہ آباد یونیورسٹی کا تعلق (۱۸۹۵ء)	۲۰۵	نواب محسن الملک کی تقریر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۰	تفسیر کے عربی ترجمہ کی خواہش کے سلسلہ میں سرسید کی مولانا سے بدگمانی	۲۲۲	قدیم کتابوں کی اشاعت کی تجویز (۱۸۹۶ء)
	سرسید کے مضمون الدعا والا استجابہ کی تردید میں ایک ہندو بزرگ کا رسالہ	۲۲۷	حیدرآباد کا دوسرا سفر اور عطائے وظیفہ (۱۸۹۶ء)
۲۳۰	اور سرسید کا شبہ	۲۲۸	امرائے حیدرآباد کی قدر دانی
۲۳۰	القاروق کی تصنیف میں اختلاف رائے	۲۲۸	مولانا کے اعزاز میں جلسہ
۲۳۱	جلسہ ندوہ کی ایک تقریر پر سرسید کا غصہ		امرا و اکابر اہل علم کا مولانا کی خدمت میں سپاس نامہ
	سرسید کا انگریزی طور و طریق سے عشق اور مولانا کا اس سے اختلاف	۲۲۹	سپاس نامہ کے جواب میں فارسی کے دو بند
۲۳۱	سرسید کا اپنی سوانح عمری کی خواہش اور مولانا کا گریز	۲۳۱	اعجاز القرآن پر ایک دل آویز تقریر
۲۳۲	عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کی حمایت اور سرسید کا اختلاف	۲۳۳	حضور نظام میر عثمان علی خاں کے عہد میں وظیفہ میں اضافہ
۲۳۲	ایک فارسی قصیدہ متعلق بہ عربی تعلیم اور رباب کالج کی بے زاری	۲۳۳	مولانا سے انگریزوں کی سیاسی بدگمانی
۲۳۳	سرسید سے سیاسی اختلاف	۲۳۳	کالج کے ایک جلسہ میں مولانا کا ایک اردو قصیدہ
۲۳۳	مولانا کی کانگریس کے اصولوں کی حمایت	۲۳۵	سرسید سے کشمکش اور اختلاف
۲۳۳	ترکوں کی فتح پر مسلمانوں کا جوش اور سرسید کی بے زاری	۲۳۶	سرسید پر مولانا کی پہلی تنقید
۲۳۵		۲۳۷	سرسید اور مولانا میں مذہبی اختلاف

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۵۶	نصاب درس میں علوم جدیدہ کے اضافہ کی تجویز	۲۳۵	سرسید کی سیاسی پالیسی پر مولانا کی رائے
۲۵۷	تیسرا اجلاس		ندوۃ العلماء
۲۵۷	دارالعلوم کے اجراء کی تجویز		یعنی علما کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت
۲۵۷	پٹنہ کو وفد		۲۳۷ - ۳۲۹
۲۵۸	چوتھا اجلاس	۲۳۷	دلی کا خانوادہ
۲۵۸	پانچواں اجلاس	۲۳۷	مولوی بزرگ علی
	دارالعلوم کی عمارت کے لیے	۲۳۷	مفتی عنایت احمد
۲۶۰	علما کے عطیات	۲۳۸	کانپور میں علم
	کالج سے رخصت لینے کی تجویز (۱۸۹۷ء)	۲۳۸	مفتی لطف اللہ صاحب
۲۶۲	الفاروق کی تالیف	۲۳۹	مولانا شاہ فضل رحمن صاحب
	(۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۸ء)	۲۳۹	فیض عام کا فیض
۲۶۳	بھوپال کا دوسرا سفر اور عربی مدارس کی تنظیم (فروری و مارچ ۱۸۹۸ء)	۲۵۰	ندوۃ العلماء
	سرسید کی وفات (مارچ ۱۸۹۸ء)	۲۵۲	فیض عام میں ندوہ کا پہلا اجلاس
۲۷۰	مولانا کا تاثر	۲۵۲	فیض عام کا جلسہ دستار بندی
۲۷۱	رخصت اور ترک ملازمت	۲۵۲	ندوۃ العلماء کا جلسہ
۲۷۱	(مئی ۱۸۹۸ء)	۲۵۳	تجلیز
۲۷۱	اعظم گڑھ کو رجعت (جون ۱۸۹۸ء)	۲۵۶	ندوہ کا دوسرا اجلاس

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸۳	شبلی منزل میں (۱۹۰۰ء)	۲۷۲	کتب خانہ کی یک جاتی
۲۸۳	عقد ثانی	۲۷۲	علاقت
۲۸۵	درس	۲۷۳	سفر کشمیر (جولائی ۱۸۹۸ء)
۲۸۵	۸- الغزالی کا خاکہ	۲۷۴	الفاروق کی تکمیل اور اشاعت
	ندوہ کے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں	۲۷۵	سلسلہ علاقت کا اشتداد
۲۸۵	عدم شرکت	۲۷۵	اس عالم کے علمی مشاغل
۲۸۵	پھر افغان دارالترجمہ (جولائی ۱۹۰۰ء)	۲۷۵	علاقت کا سخت دورہ (مئی ۱۸۹۹ء)
۲۸۶	نیشنل اسکول		ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کا علاج اور
۲۸۶	علی گڑھ کی مجلس دینیات اور ندوہ	۲۷۶	عارضی صحت (۱۸۹۹ء)
	ندوہ کی طرف سے حکومت کی سیاسی		اور نیشنل کانفرنس اٹلی کا ارادہ
۲۸۶	بدگمانی کا زمانہ (۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء)	۲۷۷	(جولائی ۱۸۹۹ء)
	والد کی علاقت اور خانگی پریشانی		امیر کابل کی دعوت
۲۸۷	(۱۲ نومبر ۱۹۰۰ء)	۲۷۸	(جولائی و اگست ۱۸۹۹ء)
۲۸۷	والد کی وفات		پھر شکایات کا عود اور علمی مشاغل
۲۸۷	مرثیہ	۲۷۸	(ستمبر ۱۸۹۹ء)
۲۸۸	خانگی مصائب (دسمبر ۱۹۰۰ء)	۲۷۹	لطیفہ
	حیدرآباد میں قیام	۲۸۰	قصیدہ کشمیریہ
۲۹۰	(فروری ۱۹۰۱ء و فروری ۱۹۰۵ء)	۲۸۲	مولانا حالی کا قطعہ تہنیت
۲۹۰	امور مذہبی کی نیابت کی تجویز	۲۸۲	ندوہ کی یاد (نومبر و دسمبر ۱۸۹۹ء)
۲۹۲	دماغی کشمکش	۲۸۳	سفر ایران کا قصد (دسمبر ۱۸۹۹ء)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	نواب محسن الملک کی علی گڑھ کے لیے	۲۹۳	سلسلہ آصفیہ اور سررشتہ علوم و فنون
۳۱۰	کوشش اور گورنمنٹ سے صفائی (۱۹۰۲ء)	۲۹۴	سررشتہ علوم و فنون کی نظامت
	قرض نے نجات اور نوکری سے		مولوی سید علی بلگرامی کی حیدرآباد
۳۱۰	سبک دوشی کی کوشش		سے علاحدگی اور سررشتہ علوم و فنون
۳۱۱	ندوہ کی یاد	۲۹۶	کا تذبذب
۳۱۳	ندوہ کے اجلاس امرتسر میں شرکت	۲۹۷	حیدرآباد پر ایک نظم
۳۱۳	مولانا کافارسی ترکیب بند	۲۹۷	سررشتہ کا نیا انتظام
۳۱۴	میری زیارت کا پہلا موقع	۲۹۸	قیام حیدرآباد کی تصنیفات
۳۱۵	تبدیل نصاب کی کوشش (۱۹۰۳ء-۱۹۰۴ء)	۲۹۸	الغزالی اور اس کی اشاعت
۳۱۸	ندوہ کا انتشار	۳۰۰	۹- علم الکلام
	ندوہ کا سالانہ اجلاس وراس میں	۳۰۲	۱۰- الکلام
۳۱۸	(شوال ۱۳۲۱ھ/ جنوری ۱۹۰۴ء)	۳۰۳	۱۱- سوانح مولانا نائے روم
	انجمن ترقی اردو کی نظامت	۳۰۵	حیدرآباد کی ادبی دل چسپیاں
۳۲۱	(جنوری ۱۹۰۳ء)	۳۰۵	حیدرآباد میں ان کا حلقہ ادب
۳۲۱	اس سلسلہ میں مولانا کی خدمات	۳۰۶	۱۲- انیس و دبیر
۳۲۷	حیدرآباد سے استعفا	۳۰۹	سررشتہ کی دوسری کتابیں
۳۲۸	بھوپال کی تحریک	۳۰۹	کتاب الآلات
	مولانا کے قیام دارالعلوم کی خبر سے	۳۰۹	دکن کی تاریخیں
۳۲۸	طلبائے دارالعلوم کی خوشی		حیدرآباد کی سیاسی کشمکش اور مولانا کی
۳۲۸	اس خوشی میں میرافارسی قصیدہ	۳۰۹	دل برداشنگی (۱۹۰۲ء و ۱۹۰۴ء)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	الندوہ ۱۹۰۲ء-۱۹۱۲ء ۱۳۲۲ھ-۱۳۳۱ھ		دارالعلوم کی معتمدی ۱۹۰۵ء-۱۹۱۳ء ۳۳۰ - ۳۳۷
۳۲۸	۳۶۳ - ۳۲۸	۳۳۰	جدید نصاب کا اجرا
	ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک علمی	۳۳۲	تعلیم انگریزی کا انتظام
۳۲۸	رسالہ کے اجرا کا خیال	۳۳۴	اس کے اثرات و نتائج
۳۵۰	الندوہ کی اشاعت کا سامان	۳۳۶	ہندی اور سنسکرت کی تعلیم
	مولانا شبلی اور مولانا شروانی کی	۳۳۷	نئی عربی
۳۵۰	مشترکہ ادارت	۳۳۸	میری کتاب لغات جدیدہ
۳۵۰	اس کے مقاصد	۳۳۸	ہونہار طلبہ کی تربیت
۳۵۰	اس کے فیوض	۳۳۹	تقریر کی مشق
۳۵۰	علماء کے خیالات میں انقلاب	۳۳۹	لائق مدرسین کی فراہمی
۳۵۰	اس کے اسلوب و زبان و پیرایہ	۳۴۱	درجہ اعلیٰ اور درجہ تکمیل
۳۵۰	بیان کا عام نتیجہ	۳۴۳	علوم جدیدہ کی تعلیم
۳۵۰	اس کا اثر نوجوان علماء اور	۳۴۵	قرآن پاک کا درس
	فارغ التحصیل طلبہ پر	۳۴۵	انقلاب زمانہ
۳۵۰	خود ندوہ کے طلبہ کی ذہنی تربیت	۳۴۶	ندوہ کا کتب خانہ
	میں اس کا حصہ		مولانا کی کوششوں سے اس
۳۵۱	میرے ایک مضمون پر مولانا حالی	۳۴۶	میں اضافہ
	کی تحسین		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۵۴	الندوہ کی اہمیت پر مولانا شریک بیان	۳۵۱	الندوہ کے بعض قابل ذکر مضامین
	دارالعلوم ندوہ کی مالی ترقی و تعمیر		مولانا ابوالکلام اور الندوہ
	سے متعلق مولانا کی خدمات	۳۵۲	کی سب اڈیٹری
۳۵۵	۳۶۳ - ۳۵۵	۳۵۲	ان کا پہلا مضمون
۳۵۵	بھوپال کی ماہانہ امداد	۳۵۳	المرأة المسلمہ پر ان کا مفصل تبصرہ
	اجلاس بنارس ۱۹۰۶ء اور پہلی	۳۵۳	ان کی شہرت کا آغاز
۳۵۶	علمی نمائش	۳۵۳	الندوہ میری سب اڈیٹری میں
۳۵۶	بنارس میں ہنگامی قیام اور شعر العجم	۳۵۳	مولانا عبداللہ العبادی کی ادارت میں
۳۵۷	واپسی اور قرآن پاک کا درس	۳۵۳	پھر میری ادارت
۳۵۷	بہمنی اور دستہ گل کا پس منظر	۳۵۳	مولانا عبدالسلام ندوی کی ادارت
۳۵۹	بہمنی میں ندوہ کی تحریک		ان کے پہلے مضمون تناخ پر
۳۵۹	بڑودہ کا سفر اور مضامین عالم گیر	۳۵۳	مولانا کی مسرت
۳۶۰	ڈھا کہہ کا سفر	۳۵۴	ان کے بعض اور اہم مضامین
۳۶۰	منظر پور کا سفر	۳۵۴	ان کی مستقل ادارت
۳۶۱	جلسہ عطاءئے سند (مارچ ۱۹۰۷ء)	۳۵۴	۱۹۱۱ء میں میری سب بارہ ادارت
۳۶۲	میری عربی تقریر اور مولانا کی مسرت		اس دور کا خاتمہ اور مولانا عبدالکریم
۳۶۳	”اسلام اور بے تعصبی“ پر مولانا کی تقریر	۳۵۴	کی ادارت
	پاؤں کا حادثہ	۳۵۴	مولوی اکرام اللہ خاں کی ادارت
	۱۷ مئی ۱۹۰۷ء	۳۵۴	اس کا خاتمہ
۳۶۴	۳۹۵ - ۳۶۴	۳۵۴	الندوہ کے علمی نتائج

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۷۵	ندوہ کے سرکاری تعلقات کا آغاز	۳۶۳	حادثہ کی تفصیل مولانا کی زبان سے
۳۷۶	سرکاری امداد	۳۶۶	احباب اور محققین کا اضطراب
۳۷۷	قومی امدادیں		مولانا شرر، نواب علی حسن خاں
۳۷۷	وظائف	۳۶۶	وغیرہ کی برائے عیادت آمد
۳۷۷	سرمایہ محفوظہ		راقم کے قلم سے الندوہ میں
۳۷۷	تعمیر کی فکر	۳۶۷	بعض واقعات کی تفصیل
۳۷۸	مدرسہ کے لیے عطائے زمین (۱۹۰۸ء)	۳۶۸	حادثہ کی شاعرانہ تغلیل
۳۷۹	جلسہ سنگ بنیاد ((۱۹۰۸ء))	۳۶۹	مولانا حالی کی رباعی
۳۷۹	اس کی روداد مولانا کے قلم سے	۳۶۹	نواب علی حسن خاں کی رباعی
۳۸۱	لطیفہ	۳۶۹	خواجہ عزیز الدین کی رباعی
۳۸۲	ندوہ کا جلسہ سالانہ (۱۹۰۸ء)	۳۶۹	رباعیات اقبال سہیل
۳۸۳	دارالاقامہ کا خیال	۳۷۰	اس حادثہ پر خود مولانا کی تنظیمیں
۳۸۳	بخیرہ کی امداد	۳۷۰	جناب سہیل کا جواب
۳۸۳	شکریہ میں مولانا کا فارسی قطعہ	۳۷۱	خاک سار کی ایک رباعی
۳۸۳	بھوپال کی امداد میں اضافہ	۳۷۱	میرے چند عربی شعر
۳۸۵	ریاست رام پور کی امداد (۱۹۱۰ء)		میرا ایک عربی قصیدہ مولانا کی
۳۸۵	درس گاہ کی تعمیر کا کام	۳۷۱	صحت کی خوشی میں
۳۸۵	تفسیر کے کمرہ کی بنیاد اور مولانا کا تاثر	۳۷۲	مولانا فاروق چریا کوٹی کی ایک نظم
	مدرسہ میں سرآغا خاں کی آمد اور	۳۷۳	فکابات و لطائف
۳۸۷	پانچ سو سالانہ کی امداد (۱۹۱۰ء)	۳۷۵	صحت کے بعد بمبئی و حیدرآباد کا سفر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۰۳	مشرقی کمیٹی شملہ (۱۹۱۱ء)	۳۸۹	اجلاس دہلی (۱۹۱۰ء)
۴۰۶	ڈھاکہ یونیورسٹی (جولائی ۱۹۱۲ء)		مولانا نذیر احمد کی کتاب امہات الامۃ
۴۰۸	ورینگر اسکیم الہ آباد (۱۹۱۲ء)		کے نذر آتش کیے جانے کا واقعہ
۴۰۸	اردو کوڈ یونان گری ہونے سے بچانا	۳۸۹	اور مولوی عبدالحق صاحب کی غلط بیانی
۴۰۹	مذہبی تعلیم کی کمیٹی میں شرکت	۳۹۱	ندوہ کا اجلاس لکھنؤ (۱۹۱۲ء)
	صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی	۳۹۱	سید رشید رضا مصری کی صدارت
۴۰۹	(۱۹۱۰ء-۱۹۱۲ء)	۳۹۲	تحریک صدارت
	عربی مدارس کی تنظیم کی تحریک		مولانا ابوالکلام آزاد کی قادر الکلامی
۴۱۱	(۱۹۱۲ء)	۳۹۲	کے مظاہرے
۴۱۳	مدینہ یونیورسٹی کی تجویز (۱۹۱۳ء)	۳۹۳	صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی کی رپورٹ
۴۱۳	مسلم یونیورسٹی کی تجویز (۱۹۱۱ء)		دارالعلوم کی ضرورت پر مولانا شبلی
	مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی	۳۹۳	کی ولولہ انگیز تقریر
۴۱۶	(۱۹۱۳ء)		سید رشید رضا مصری کی پراثر
۴۱۷	ناگ پور یونیورسٹی میں مشورہ (۱۹۱۲ء)	۳۹۵	اختتامی تقریر
	مذہبی اور قومی کام		بعض دوسرے تعلیمی خدمات
۴۱۹	۴۱۹ - ۴۵۳	۳۹۶	۳۱۸ - ۳۹۶
۴۱۹	وقف علی الاولاد (۱۹۰۸ء-۱۹۱۲ء)		ریاست حیدرآباد کی تعلیمی خود مختاری
۴۱۹	سر سید کا مسودہ وقف خاندانی	۳۹۶	(۱۹۰۸ء-۱۹۱۲ء)
	وقف علی الاولاد کے لیے بعض		مشرقی بنگال و آسام میں اصلاح
۴۱۹	اکابر کی کوششیں	۴۰۳	مدارس کی تجویز (۱۹۱۰ء)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۱	اشاعت اسلام (۱۹۰۸ء-۱۹۱۳ء)	۲۲۰	ان کی ناکامی
۲۳۱	۱۹۰۸ء کا فتنہ ارتداد	۲۲۰	اس کی طرف مولانا کی توجہ (۱۹۰۸ء)
۲۳۱	اس کے انسداد کے لیے مولانا کی آمادگی	۲۲۱	قانون دانوں اور سربراہ آوردہ لوگوں سے مشورہ
۲۳۱	پٹیالہ مسلمان راج پوت کانفرنس میں شرکت	۲۲۱	ندوۃ العلماء کی طرف سے تجویز
۲۳۱	نومسلم راج پوت اور حفاظت اسلام	۲۲۲	استفتاء
۲۳۱	ایک مسلمان خاندان کے ارتداد پر مولانا کے تاثرات	۲۲۲	شیعہ و سنی علما کا اجتماع
۲۳۳	دلی کے اجلاس ندوہ میں اشاعت اسلام پر ایک تقریر	۲۲۲	مولانا کا رسالہ
۲۳۵	دارالعلوم ندوہ میں بھاشا کی تعلیم	۲۲۳	شیعہ کانفرنس و مسلم لیگ کے تائیدی رزلیوشن
۲۳۶	شاہ جہاں پور و رائے بریلی وغیرہ کا دورہ	۲۲۳	ہندوؤں کی حمایت
۲۳۷	مجلس اشاعت و حفاظت اسلام کا قیام	۲۲۴	یہ مسئلہ بل کی صورت میں
۲۳۸	نومسلموں کی مردم شماری	۲۲۴	کونسل میں مسٹر جناح کی تقریر
۲۳۹	نومسلموں کو دوبارہ ہندوہ ہو جانے سے بچانے کی تدابیر	۲۲۴	مسٹر جناح کے بل سے مولانا کا اختلاف
۲۳۹	لکھنؤ میں اشاعت و حفاظت اسلام کا جلسہ	۲۲۵	مولانا کے حسب خواہش ترمیم کامیابی
۲۴۰		۲۲۶	تقطیل جمعہ (۱۹۱۲ء)
		۲۲۹	افسوس ناک لطیفہ
		۲۲۹	اوقاف اسلامی (۱۹۱۴ء)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	اٹلی کے خلاف انور بے وغیرہ کا عزم	۴۴۱	مولانا کی تقریر
۴۵۷	اور مولانا کے جذبات	۴۴۵	خدام الدین (۱۹۱۲ء)
۴۵۸	تحریک بلقان کی رہنمائی		جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کا رد
۴۵۸	نظم شہر آشوب اسلام	۴۴۷	(اگست و ستمبر ۱۹۱۱ء)
۴۵۹	حکومت برطانیہ کے تغافل پر ایک نظم	۴۵۰	قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ (۱۹۱۰ء)
	بمبئی کی ایک اسلامی انجمن کا جوش	۴۵۲	مجلس علم کلام کی تجویز (۱۹۱۲ء)
۴۶۰	وفاداری اور مولانا کی ایک نظم	۴۵۲	کلکتہ کا سفر (۱۹۱۲ء)
	سر آغا خاں کی ترکوں کو صلاح اور	۴۵۳	پٹنہ کا سفر (۱۹۱۲ء)
۴۶۰	مولانا کا طنزیہ جواب		سیاسیات
	ہندوستانی طبی مشن کی روانگی پر	۴۵۴	۴۹۰ - ۴۵۴
۴۶۱	مولانا کے تاثرات	۴۵۴	مولانا کی سیاست
۴۶۱	ڈاکٹر انصاری سے عقیدت		ماہین اسلامی سیاست اور ترکوں
۴۶۱	طبی وفد کی واپسی پر مولانا کی نظم	۴۵۴	سے محبت
	قربانی کے روپیہ سے ترکوں کی	۴۵۴	ترکوں کی تعریف میں ایک نظم
۴۶۲	اعانت اور اس کے متعلق فتویٰ	۴۵۵	دستوریت کے اعلان پر مولانا کی خوشی
	مولانا ظفر علی خاں کا شبہ اور	۴۵۵	انجمن اتحاد و ترقی سے دل چسپی
۴۶۳	مولانا کا جواب		سلطان عبدالحمید کے قبول دستوریت
	ترکوں کی اعانت کے لیے	۴۵۶	پر مولانا کے تاثرات
۴۶۳	اخبارات میں اپیل	۴۵۶	سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف
۴۶۴	ایڈریانو پیل کی فتح پر مولانا کی مبارک باد	۴۵۷	اٹلی و طرابلس پر حملہ و مولانا کا تاثر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸۹	آخری واقعات	۲۶۴	مسجد کان پور کا ہنگامہ (۱۹۱۳ء)
	ندوۃ العلماء میں مولانا کی	۲۶۵	اس واقعہ کا مولانا پر اثر
	مخالفت اور معتمدی سے استعفا	۲۶۵	کان پور سے متعلق مولانا کی نظموں
۲۹۱	۵۱۳ - ۲۹۱	۲۶۶	کالک کے سیاسی انقلاب میں حصہ
۲۹۳	مولانا خلیل الرحمن صاحب کا اختلاف	۲۶۶	اس سلسلہ کی پہلی نظم
۲۹۴	کمیشن کا معاملہ	۲۶۶	شرکت واقعہ سے محرومی کا غم
	مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی		فیصلہ کان پور کی عدم تبدیلی پر
۲۹۶	کا معاملہ		گورنمنٹ کا اصرار اور
۲۹۹	دارالعلوم کی معتمدی سے استعفا	۲۶۷	مولانا کی تعریض
۵۰۰	مولانا کے استعفا کا اثر		سر علی امام کی تجویز مصالحت پر مولانا
۵۰۱	حیدرآباد کا سفر اور ماہانہ میں اضافہ	۲۶۸	کا ایک قطعہ
۵۰۱	نکھنوکو واپسی	۲۶۹	لارڈ ہارڈنگ کی آمد اور مصالحت
۵۰۱	طلبائے دارالعلوم سے بدستور تعلق	۲۶۹	مولانا کا ادائے شکر
۵۰۲	درس بخاری کو روکنا	۲۶۹	سیاسیات ہند
۵۰۲	میلا د میں مولانا کی تقریر کو روکنا	۲۷۱	مسلم گزٹ (۱۹۱۲ء)
۵۰۲	اسٹرائک	۲۷۳	مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ
۵۰۳	مولوی مسعود علی ندوی اور طلبائے قدیم	۲۸۰	مسلم لیگ کی اصلاح
۵۰۳	اصلاح ندوہ کی کوشش	۲۸۱	مسلم لیگ اور کانگریس کا اتحاد
۵۰۴	مجلس اصلاح ندوہ کا قیام	۲۸۳	احرار کو تنبیہ
۵۰۴	الہلال اور مولانا ابوالکلام آزاد	۲۸۶	سیاست میں بھی اعتدال تھا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۲۱	اعظم گڑھ کا قیام اور اسکول کا کام	۵۰۵	حکیم اجمل خاں
	مدرسۃ الاصلاح سرانے میر		مجلس اصلاح ندوہ کا اجلاس عام دہلی میں
	۱۹۰۸ء - ۱۹۱۳ء	۵۰۵	مولانا کی تکفیر
۵۲۳	۵۲۳ - ۵۲۸	۵۰۵	دہلی کی اصلاحی کانفرنس
۵۲۳	مدرسۃ الاصلاح کی مختصر تاریخ	۵۰۶	محمد علی مرحوم اور اسٹرائٹنگ کا خاتمہ
۵۲۳	۱۹۱۰ء میں مدرسہ کا جلسہ اور مولانا کی شرکت	۵۰۷	اصلاحی سب کمیٹی
۵۲۳	مولانا عبید اللہ سندھی سے تعارف و ملاقات	۵۰۸	مولانا بسبئی میں
۵۲۳	مدرسہ کے متعلق مولانا کی تجویز	۵۰۸	علی گڑھ کانفرنس کا کمیشن
	دارالعلوم کی معتمدی سے سبک دوش	۵۰۸	اس کے متعلق مولانا کی تنظیمیں
۵۲۵	ہونے کے بعد مدرسہ کی طرف التفات	۵۱۰	مصالحت کے لیے مولانا کی آخری کوشش
	اعظم گڑھ کا مستقل قیام اور مدرسہ	۵۱۲	آخری مصالحت (مئی ۱۹۱۵ء)
۵۲۵	سرانے میر		بھائی کی وفات اور
۵۲۶	جامعہ اسلامیہ کا تصور		وطن کی طرف بازگشت
۵۲۶	مولانا شبلی متکلم ندوی		اور مرحوم بھائی کے ادھورے
	دارالمصنفین		کاموں کی تکمیل کا عزم
	۱۹۱۰ء - ۱۹۱۳ء	۵۱۳	۵۱۳ - ۵۱۹
۵۲۹	۵۲۹ - ۵۳۷	۵۱۵	مرثیہ مولوی اسحاق صاحب مرحوم
۵۲۹	ابتدائی خیال		شبلی اسکول
۵۳۱	سیرت اکاڈمی		۱۹۱۳ء - ۱۹۱۳ء
۵۳۲	دارالمصنفین کی تجویز کی اشاعت	۵۲۰	۵۲۰ - ۵۲۲

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۵۲	خرابی صحت	۵۳۲	دارالمصنفین کا مرکز
۵۵۲	جائشین کی تلاش	۵۳۴	وظائف کا انتظام
۵۵۲	سیرت کے لیے مسودوں کی وصیت	۵۳۴	دارالمصنفین کا تعلیمی خاکہ
	مولانا حمید الدین، مولانا ابوالکلام	۵۳۶	طلبہ کا انتخاب
۵۵۲	آزاد اور خاک سار کی طلبی		سیرت النبی ﷺ
۵۵۳	مکمل سیرت کی وصیت	۵۳۸	۵۵۱ - ۵۳۸
۵۵۵	وفات	۵۳۸	ذات نبوی ﷺ سے عقیدت
۵۵۶	مرقد	۵۳۸	۱۴- بدء الاسلام
	آل اولاد	۵۳۸	سیرت کا ابتدائی خیال
۵۵۷	۵۵۸ - ۵۵۷	۵۳۹	تالیف سیرت کا عزم
۵۵۷	پہلی شادی	۵۴۱	مجلس تالیف سیرت
۵۵۷	فاطمہ درابجہ	۵۴۲	سرکار عالیہ بھوپال کی امداد
۵۵۷	حادثہ نعمانی	۵۴۵	تالیف سیرت کا آغاز
۵۵۷	پہلی بیوی کا انتقال	۵۴۷	۱۵- پہلا حصہ
۵۵۷	دوسری شادی	۵۴۹	ایک فتنہ
	دوسرے محل سے دو لڑکیاں اور ایک	۵۵۰	فتنہ کی ناکامی
۵۵۷	لڑکا اور ان کا بچپن میں انتقال	۵۵۱	سیرت کی ناتمامی کا داغ
۵۵۷	دوسری بیوی کا انتقال		وفات
۵۵۷	مولانا کا تاثر		۱۳۳۳ھ - ۱۹۱۴ء
۵۵۸	تجرہ کی زندگی	۵۵۲	۵۵۶ - ۵۵۲

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۸۹	ذکاوت حس		اخلاق و عادات
۵۹۰	عصیت دینی	۵۵۹	۶۳۳ - ۵۵۹
۵۹۳	پابندی اوقات	۵۵۹	مولانا کاشب و روزگار پروگرام
۵۹۳	اعزہ و اقارب سے محبت	۵۶۰	شکل و شمائل
۵۹۵	مولانا حمید الدین سے اخلاص	۵۶۱	لباس
۵۹۶	تلاذہ سے محبت	۵۶۲	طعام
۵۹۶	کتب بینی	۵۶۳	دولت کی بے قدری
۵۹۷	کسب معاش کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ	۵۶۸	استغنا اور بے نیازی
۵۹۷	سرسید کے کتب خانے سے استفادہ	۵۶۹	خودداری
۵۹۹	پرائیوٹ و عام کتب خانوں کی سیر	۵۷۴	عدم قبول احسان
۵۹۹	مطالعہ کا طریقہ	۵۷۶	راست بازی
	نئی اور نادر کتابوں کے لیے مولانا	۵۷۶	سفارشوں میں احتیاط
۶۰۰	کی بے تابی	۵۷۹	روکد سے احتراز
۶۰۰	معیار انتخاب	۵۸۰	صفائی پسندی
۶۰۰	قدیم قلمی کتابوں کی جستجو	۵۸۱	نفاست پسندی
۶۰۲	درس و تدریس	۵۸۲	خاک ساری
۶۰۳	لطف صحبت	۵۸۳	بعض اوقات میں خلوت پسندی
۶۰۳	ملاقات کی عام اجازت	۵۸۳	اظہار رائے میں بے باکی
۶۰۴	موضوعات گفتگو میں تنوع	۵۸۵	سادگی
۶۰۴	نکتہ چینی اور اعتراضات کی اجازت	۵۸۸	رحم دلی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی سے	۶۰۵	اساتذہ اور معاصرین کی مدح و ستائش
۶۱۷	تعلقات و ادبی استشارہ	۶۰۵	احباب
	مولوی عبدالرزاق صاحب	۶۰۵	نواب محسن الملک
۶۱۷	کان پوری سے تعلقات	۶۰۶	مولانا حالی
۶۱۸	امرا و الیان ملک سے تعلقات	۶۰۶	مولانا سید علی بگرامی
۶۱۸	امرائے حیدرآباد کی قدر دانی	۶۰۷	نواب عماد الملک
	اعلا حضرت نواب میر عثمان علی خاں کا	۶۰۷	مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی
۶۱۸	عدم ملاقات پر اظہار افسوس	۶۰۸	حکیم اجمل خاں
	سلطان جہاں بیگم صاحب مرحومہ	۶۰۸	نواب سید علی حسن خاں
۶۱۹	والیہ بھوپال سے ملاقات	۶۰۹	ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی
۶۱۹	مولانا کی وفات پر بیگم صاحبہ کا تاثر	۶۰۹	احباب علما
	نواب حامد علی خاں والی رام پور سے	۶۱۰	باہم معاصرین کے اعترافات
۶۱۹	تعلقات	۶۱۰	نواب محسن الملک کا اعتراف کمال
	نواب صاحب جھیرہ اور ان کے	۶۱۱	مولانا کے ساتھ مولانا حالی کی عقیدت
۶۱۹	خاندان سے تعلقات	۶۱۳	باہم معاصرانہ چشمک کی تردید
۶۱۹	جھیرہ میں مولانا کا ورود	۶۱۵	ڈپٹی نذیر احمد سے تعلقات
	گورنمنٹ ترکی کی قدر دانی اور		الندوہ کی تعریف میں ڈپٹی نذیر احمد
۶۱۹	تمغہ مجیدی	۶۱۶	کے عربی شعر
	امیر عبدالرحمن خاں والی کابل		مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے ادبی
۶۱۹	کی قدر دانی	۶۱۶	کلمات کا اعتراف مولانا کی زبان سے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۳۰	مولانا کا علم کلام	۶۲۰	انگریزی گورنمنٹ کی عزت افزائی
۶۳۰	علامہ ابن تیمیہ سے عقیدت	۶۲۰	ایڈورڈ ہفتم کے حضور میں باریابی
۶۳۱	فلسفہ و حکمت سے بے زاری	۶۲۰	مذہب
	وجود باری پر ایک عزیز سے گفتگو	۶۲۱	لطیفہ
۶۳۲	اور مولانا کا تاثر	۶۲۲	عقاید و خیالات
	وجود باری کے اثبات کے متعلق	۶۲۳	مولانا عقلیت پسند تھے
۶۳۲	مشکلمانہ دلائل کو کمزور جانتے تھے	۶۲۳	معجزات کے قائل تھے
۶۳۳	خاتمہ		جن اور شیطان کے وجود کو تسلیم
	مراثی و قطعات	۶۲۳	کرتے تھے
۶۳۳	۶۳۲ - ۶۳۳	۶۲۳	فرشتوں کے وجود کے قائل تھے
	مرثیہ فارسی از: مولوی	۶۲۳	حشر و نشر و جنت و دوزخ کا اعتقاد
۶۳۳	اقبال احمد صاحب سہیل	۶۲۳	بدعیات سے متنفر تھے
۶۳۸	نوحہ استاد	۶۲۵	لطیفہ
۶۴۱	وداع شبلی	۶۲۵	الکلام پر اعتراضات اور مولانا کا جواب
	قطعہ تاریخ از: خواجہ عزیز الدین	۶۲۶	عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ میں خفی تھے
۶۴۱	صاحب لکھنوی	۶۲۶	معتزلی نہیں تھے
۶۴۲	قطعات مرثیہ و تاریخ از بیچ مدراں	۶۲۷	عقاید میں ماتریدیت کو ترجیح دیتے تھے
۶۴۲	قطعہ برائے لوح مزار		اشاعرہ و ماتریدید و مقابل
	قطعہ تاریخ از: مولوی سید احمد مرتضیٰ	۶۲۸	فرقے تھے
۶۴۲	صاحب نظر وکیل	۶۲۹	اشعریہ و حنفیہ کے مختلف فیہ مسائل

فہرست رجال حواشی

حیات شبلیؒ

صفحہ	اسمائے گرامی	صفحہ	اسمائے گرامی
۸۹	مولانا عنایت رسول چریاکوٹی	۴۸	حاجی صبغۃ اللہ خیر آبادی
۹۰	مولانا فاروق چریاکوٹی	۵۴	سلاطین شرقی کے نام اور زمانے
۹۴	مولانا ارشاد حسین صاحب رام پور	۵۶	سلاطین لودی کے نام اور زمانے
۹۵	مولانا فیض الحسن صاحب سہارن پوری	۶۱	نوابان اودھ کے نام اور زمانے
۱۰۱	حافظ شاہ اجمل حسین صاحب مرحوم	۶۷	مولانا مصطفیٰ شیر بہاری
۱۰۲	داروغہ حیدر بخش کی مسجد		مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی اور
۱۰۹	مولانا سلامت اللہ جیراج پوری	۶۸	شاہ اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ
	منشی ثار حسین مرحوم ایڈیٹر پیام یار		مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کی شان
۱۱۵	اوران کی دوکان	۷۰	میں مولانا فاروق چریاکوٹی کے اشعار
۱۴۴	مولوی سمیع اللہ خاں	۷۵	محمد علی تمنا
۱۴۶	خواجہ محمد یوسف مرحوم علی گڑھ	۷۶	حضرت میر علی عاشقانؒ
۱۴۹	خواجہ عزیز الدین مصنف قیصر نامہ	۸۴	ایک کتبہ
۱۴۷	پروفیسر آرنلڈ	۸۹	مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم
۱۵۶	محمد صدیق صاحب مختار دیسوی	۸۹	مولوی ابوالکارم محمد علی صاحب مسوی

صفحہ	اسمائے گرامی	صفحہ	اسمائے گرامی
	مولانا مسیح الزماں خاں صاحب	۱۶۱	مولانا حفیظ اللہ صاحب بندی
۲۵۹	شاہ جہاں پوری		جنرل عظیم الدین خاں صاحب مدار
۲۶۱	مفتی عبداللطیف صاحب	۱۶۳	المہام رام پور کا واقعہ قتل
	سلسلہ تصنیفات سررشتہ علوم و	۱۶۵	مولانا شملی کا ایک خط
۲۹۲	فنون حیدرآباد	۱۸۳	حسین حبیب آفندی
۲۹۴	مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نونہروی	۱۸۵	غازی عثمان پاشا کا واقعہ دست بوسی
۳۱۸	منشی محمد اطہر علی صاحب رئیس کا کوری	۱۹۴	خواجہ سید رشید الدین صاحب
۳۱۹	ملا عبدالقیوم صاحب حیدرآباد دکن	۲۱۰	ولایت اللہ صاحب ممبر سنٹرل اسمبلی
۳۳۴	مولوی سید ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ	۲۱۲	ممتاز حسین مرحوم بیرسٹر
۳۳۵	مولوی حاجی معین الدین ندوی مرحوم	۲۱۲	مولانا حمید الدین
۳۶۱	مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری		لال بہاری لال مشتاق دہلوی
۳۷۶	منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم گدیہ	۲۱۵	شاگرد مرزا غالب
۳۸۷	نواب غلام احمد خاں کلامی، مدراس	۲۴۰	مولوی اقبال احمد صاحب سہیل
۴۰۵	ڈاکٹر منصور علی گڑھ		مولوی غلام محمد صاحب شملوی
۴۲۲	مولانا فضل حق صاحب رام پوری	۲۴۳	مرحوم وکیل ندوہ
۴۵۳	مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم	۲۵۱	مولوی محمد احسن صاحب استھانوی
۴۵۵	مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری		مولوی ابراہیم صاحب آروی
۴۶۰	سیٹھ یوسف ثوبانی مرحوم	۲۵۴	بانی مدرسہ احمدیہ آرہ
۴۶۵	مسٹر مظہر الحق، بیرسٹر پٹنہ	۲۵۶	رؤسائے کا کوری

صفحہ	اسمائے گرامی	صفحہ	اسمائے گرامی
۵۳۶	مولوی عبدالرحمن نگرانی مرحوم		مولانا کے رنگ میں میری دو
۵۳۶	مولوی محسن بہاری مرحوم	۴۸۲	سیاسی تنظیمیں
۵۳۶	شیخ محمد خلیل صاحب عرب	۴۹۶	مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم
۵۵۷	حامد نعمانی مرحوم	۴۹۸	سید فضل الحسن حسرت موہانی
۵۹۶	سر ڈینی سن راس	۵۰۰	مولانا عبید اللہ صاحب سندھی
۶۲۶	مولانا عبدالجلیم شرر مرحوم		مولانا شبلی متکلم ندوی
۶۳۰	مولانا وارث حسن صاحب مرحوم	۵۲۶	مہتمم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر
	مولوی اکرام اللہ خاں ندوی	۵۲۶	لفظ جامعہ کی تاریخ
۶۳۱	اڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ	۵۳۶	مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم





حیاتِ شبلیؒ

پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں، جس نے بتیس برس ۱۸۸۲ء-۱۹۱۴ء تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پُر شور رکھا۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ است
سوانح کے ذرائعِ علم | خاک سار نے استاد مرحوم کی صحبت و تربیت میں آٹھ برس (۱۹۰۵ء-۱۹۱۴ء) تک مسلسل گزارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں اور رہا، مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، یہ دس برس درحقیقت ان کی بتیس برس کی علمی و قومی زندگی کے سب سے مصروف ایام تھے، بلکہ انہی کو ان کے ستاون برس کی زندگی کا حاصل کہا جاسکتا ہے، خود انہی کا شعر ہے:

ساغرِ زندگیم حیف کہ جز دردِ نداشت جز ہمیں جرعہ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام
ان کے اس مصروف ترین حصہ زندگی کے اکثر لمحات میری نظر کے سامنے گزرے ہیں، اس لیے اس کے مالہ و ماعلیہ سے بہ حد بشری مجھے پوری واقفیت ہے اور اس واقفیت نے اس کتاب کی تالیف میں مدد دی۔

مولانا کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے واقعات، ان کے اعزہ و احباب اور ان کے ابتدائی شاگردوں سے پوچھے اور سنے، تعلیمی حالات خود مولانا کی زبان سے وقتاً فوقتاً سننا رہا، علی گڑھ کے قیام کے واقعات کا بڑا حصہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پرانے اوراق سے بہم پہنچا اور ان کی پوری زندگی کا خاکہ ان کے مکاتیب کے مرقع میں بہ آسانی مل گیا۔

۱۔ مولانا کا شعر ہے، اصل میں زدہ ام ہے۔

دانا نے راز کار سازی کی کار سازی کے قربان کہ راقم الحروف کو مولانا کی زندگی ہی میں ۱۹۰۸ء میں ان کے خطوط و مکاتیب کے جمع کرنے کا خیال آیا اور اس وقت اس کا مقصد خطوط کے علمی و ادبی ذخیرہ کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا، لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی سوانح عمری کا خیال آیا، تو نظر آیا کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ان مکاتیب کی تالیف و اشاعت کے ذریعہ درحقیقت صاحب مکاتیب کے سوانح زندگی کے ذخیرہ کو میرے ہاتھوں بلا قصد و ارادہ پہلے ہی سے محفوظ کر دیا تھا، اسی طرح مولانا کے سوانح کی تالیف، واقعات کی ترتیب اور تاریخوں کے تعین میں مکاتیب کی یہ دونوں جلدیں بے حد کارآمد ہوئیں، اور اسی لیے سوانح و واقعات کے ذکر میں مکاتیب کے ہر خط کا حوالہ نمبر اور تاریخ کے تعین کے ساتھ دیا گیا ہے، تاکہ ہر شخص بہ آسانی واقعہ کی تحقیق کر سکے اور اس نظر سے دیکھے تو معلوم ہوگا کہ حیاتِ شبلی درحقیقت مولانا شبلی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔

بڑی تسکین اس سے ہوئی کہ بجز اللہ اس وقت ہمارے درمیان مولانا کے ایک حبیبِ مکرم اور ان کی زندگی کے اکثر اوقات کے شریک و مشیر وہم دم جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی موجود ہیں، جن سے واقعات کی تحقیق میں مدد ملی، اسی طرح مولانا کے علی گڑھ کے پرانے دوست میر ولایت حسین صاحب سے قیام علی گڑھ اور تعلقات سرسید کے واقعات کی تفتیش کی گئی اور انہوں نے مہربانی فرما کر کچھ واقعات لکھ کر بھی بھیجے۔

مولانا کی زندگی میں ان کی سوانح عمری کا خیال | میری اہلی دیکھئے کہ مولانا کی زندگی میں کبھی یہ وہم نہیں آیا کہ یہ ہستی اس قدر جلد ہمارے درمیان سے اٹھ جائے گی، اس لیے ان کے سوانح حیات کے قلم بند کرنے کا خیال بھی نہیں ہوا، البتہ بعض دوسرے لوگوں کو اخیر زمانہ میں ادھر توجہ ہوئی، لیکن ان کے جواب میں مولانا نے کسی کو اپنے حالات کی مختصر سی کھٹوتی لکھ کر بھیج دی اور کسی کو کچھ کہہ کے نال دیا، چنانچہ رسالہ ادیب الہ آباد کے ایڈیٹر شاہ صاحب میرٹھی نے اپنے رسالہ میں چھاپنے کے لیے کچھ حالات لکھ کر مانگے، تو جواب میں لکھا کہ ”یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنے حالات خود لکھ سکوں، مسلم ریویو میں ایک صاحب نے کچھ واقعات لکھے تھے، وہ آپ لے سکتے ہیں، اس کے سوا سید سلیمان پروفیسر ندوہ کو آپ بہ تاکید لکھیں تو وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔“ (مکاتیب اول، مکتوب الیہ نمبر ۳۵) لیکن نہ مجھے لکھا گیا اور نہ میں نے لکھا۔

مسلم ریویوالہ آباد کے جس مضمون کا حوالہ ہے، وہ غازی پور کے مشہور خاندان کے ممتاز فرد شاہ منیر عالم صاحب مرحوم کا لکھا ہوا ہے، جو انگریزی کے اچھے انشا پرداز تھے اور مولانا سے شخصی طور پر واقف تھے، یہ مضمون اگست ۱۹۱۲ء کے رسالہ مسلم ریویوالہ آباد میں چھپا تھا، اس مضمون کے لیے مختصر حالات خود مولانا نے لکھوادیے تھے، جو تعلیم و سفر قیامِ علی گڑھ کے چند سرسری واقعات پر مشتمل ہے۔

۱۹۱۲ء میں سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری نے کچھ حالات دریافت کیے تو ایک ایک دو دو سطروں میں کچھ اپنی تعلیم، کچھ قیامِ علی گڑھ اور کچھ اپنی تالیفات و آرا کا حال لکھ کر دو صفحوں میں خط کو تمام کر دیا اور آخر میں شرمایہ لکھ ڈیا کہ ”خود اپنا آٹھا کیا گاؤں“۔

مولانا کی ترتیبِ سوانح کی سعادت کے سب سے بڑے خواہش مند منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم تھے، شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ جس طرح انہوں نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی لائف لکھی ہے (یعنی وہ اس طرح لکھی ہے کہ طرزِ انشا کے پچھانے والوں کو وہ بہ ظاہر خود صاحب سوانح کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے) اسی طرح وہ مولانا کے سوانح کی بھی تالیف کریں، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں انہوں نے خود مولانا سے خواہش کی مگر مولانا نے اس کو کسی طرح قبول نہیں کیا، چنانچہ مولانا ابوالکلام کو لکھنؤ سے ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو وہ لکھتے ہیں ”ہاں اور نہی! افتخار عالم صاحب، مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ان ہی آلودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلیہ کو چھوٹا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگتے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوائیے، بھئی بتا تو نہ دو گے، ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی“۔ (مکاتیب ابوالکلام-۳)

منشی سید افتخار عالم صاحب مولانا کے اس انکار کے بعد بھی اپنے خیال سے باز نہیں آئے، چنانچہ پانچ برس کے بعد پہلے تو خود مولانا کو لکھا، انہوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۱۲ء کو یہ ظریفانہ جواب دیا، ”میری لائف میرے بعد لکھنے کا ورنہ مکمل لائف کیوں کر ہوگی“۔ (مکاتیب اول مکتوب ایہ نمبر ۲۳)

۱۔ یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۲ء میں چھپا ہے۔ ۲۔ عالم السرائر تو خدا کے سوا کوئی اور نہیں، مگر یہاں مقصود بعض محفی حالات کا علم ہے۔ (س) ۳۔ اس فقرہ سے استنباط اور ترفع کا مفہوم نہ سمجھا جائے، مقصود یہ ہے کہ منشی صاحب مرحوم صرف اردو و فارسی کا علم رکھتے تھے، گو خوش سلیقہ اور سنجیدہ تھے، تاہم مولانا پر لکھنے کے لیے علومِ عربیہ اور فنونِ کلامیہ اور ادب و تاریخ پر اطلاع ضروری تھی، اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ وہ ان کی سوانحِ عمری کے فرض سے بے آسانی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ (س)

یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے دس ہی مہینوں کے بعد کاتب کی لائف یعنی زندگی واقعہ پوری ہو جائے گی، بہر حال منشی صاحب موصوف نے مولانا کے اس جواب کے بعد مجھے گھیرا کہ میں مولانا کے قلم سے ان کی خواہش کی تکمیل کرادوں اور اس غرض کے لیے انہوں نے فروری ۱۹۱۴ء میں مجھے پونہ خط لکھا، میں نے مولانا سے ان کی سفارش کی تو مجھے جواباً ارشاد ہوا ”افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا“۔ (مکاتیب سلیمان ۶۶)

ہائے ان کی یہ پیشین گوئی بھی حرف بہ حرف کیسی پوری ہوئی، سچ مچ میں دنیا کے اور کاموں سے آخر فارغ ہی ہو کر ادھر متوجہ ہوا۔

وفات کے بعد ان کے سوانح پر مضامین اور رسالے | راقم نے مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے مختصر حالات پہلے تو الغزالی کے ایک نئے اڈیشن میں جو اس زمانہ میں اصح المطابع لکھنؤ میں چھپ کر تمام ہوا تھا، بطور دیباچہ کے لکھے، پھر اسی کو معارف اگست ۱۹۱۶ء میں چھاپ دیا، اور مولانا کے مرض الموت کے حالات و وفات اور آخری احوال پر مسلسل دو تین مضمون فروری ۱۹۰۵ء کے زمین دار لاہور میں لکھے، مولانا کے دوسرے قدیم احباب و اعزہ میں سے مولانا حبیب الرحمن خاں شیردانی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء میں، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے دل گداز میں، خواجہ غلام الثقلین صاحب نے اپنے رسالہ ”عصر جدید“ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء میں، سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے رسالہ اردوئے معلیٰ میں اور مولانا عبداللہ العمادی نے زمین دار مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء میں اور بہت سے اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں نے ان کے حالات مرثیے اور نوحے اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں میں لکھے اور شائع کیے، مگر ان میں استناد کے قابل یہی تین چار اول الذکر مضامین ہیں اور اس وقت سے لے کر اس وقت تک مولانا کے حالات کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اس کا ماخذ زیادہ تر پہلا اور کچھ دوسرا اور تیسرا اور چوتھا مضمون ہے۔

ان کی سوانح عمری مستقلاً لکھنے کی کوشش سب سے پہلے منشی محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ بھوپال نے کی، انہوں نے بشیر پاشا سیریز اٹاواہ کے ضمن میں مولانا کے حال میں ۱۹۲۵ء میں ایک رسالہ ”تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلیؒ“ کے نام سے لکھ کر شائع کیا۔

حیاتِ شبلیؒ کی ترتیب کا آغاز و انجام | خاک سار نے میرت کی مصروفیت اور خاندانی اور ابتدائی

حالات کے عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق و شریک کار عبدالسلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے ہیں، اس لیے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیبِ شبلی کے متفرق معلومات کو بہ ترتیب یک جا کر دیا، ان اوراق کو مولانا شیردانی اور مولانا مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی، پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، ایم اے، ال، ال، بی، ایم ایل، اے وکیل اعظم گڑھ کے سپرد کیا گیا کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے، چنانچہ انہوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودہ کو گھٹنا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی، ان کا یہ مضمون ”سیرتِ شبلی“ کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا، اس کے بعد وہ اسبلی کی ممبری اور اس کے سیاسی فرائض میں ایسے الجھے کہ اس سیرتِ شبلی کے مسودہ کو تمام کرنے کے لیے وہ مناسب وقت و فرصت کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

اس لیت و لعل میں ساہا سال گزر گئے، اس اثنا میں مولانا کے بہت سے احباب اور ان کے سوانح کے مطالعہ کے مشاق اسی اشتیاق میں چل بے، یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء آ گیا، یعنی مولانا کی وفات اور دارالمصنفین کی بنیاد پر پچیس پچیس برس گزر گئے، احباب کا تقاضا ہوا کہ دارالمصنفین کی پچیس برس کی سلور جوہلی منائی جائے، میرا اصول یہ ہے کہ:

ع نخی رویم بہدراہے کہ کارواں رفتست

اس پامال رسم کو چھوڑ کر یہ خیال آیا کہ اس جوہلی کی یادگار میں خود موضوع جوہلی یعنی مولانا شبلی کی سوانحِ عمری کا وہ کام کیوں نہ انجام دے دیا جائے جو ساہا سال سے فرصت کے انتظار میں پڑا ہے، چنانچہ بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں اس کا آغاز کر دیا، آخر تین برس کی محنت میں ۱۹۴۲ء میں یہ انجام کو پہنچا اور اسی زمانہ میں اس کی چھپائی بھی شروع ہو گئی، مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس طرح صاحب سوانح کی وفات ۱۹۱۴ء والی یورپ کی جنگِ عظیم میں واقع ہوئی، ان کی یہ سوانحِ عمری کی تالیف بھی ۱۹۴۰ء والی جنگِ عظیم میں واقع ہوئی، جس سے زیادہ مقدر میں کاغذ کے ملنے کی دقت ایسی ضخیم کتاب کی چھپائی

میں ہارج ہوتی رہی اور آخر کسی نہ کسی شکل سے یہ مشکل حل ہوئی، اور چھپنے کی صورت نکلی۔

معاونوں کا شکریہ | میں آخر میں اپنے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا مشکور ہوں، جنہوں نے اس کام کی تکمیل میں مجھے مدد دی، بالخصوص مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا جن کے مجموعہ اوراق کے سبب سے مکاتیب کی ورق گردانی اور کاغذات اور مسودات کی تلاش کی مصیبت سے بہت کچھ نجات ملی اور مولوی اقبال احمد سہیل صاحب کا جن کی تحریر سے اعظم گڑھ کے بعض علمی واقعات اور مولانا کے خاندانی اور ابتدائی حالات کے جاننے میں بڑی مدد ملی اس کے بعد محبی منشی محمد امین صاحب زبیری کا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں، نظمیں اور واقعات نقل کر کے مجھے بھیجتے رہے۔ سب سے زیادہ مخدومی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کا ممنون ہوں جنہوں نے مسودہ کے ان آٹھ صفحات کو بڑی محنت سے حرف پر حرف پڑھا اور کہیں کہیں اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر کچھ بڑھایا، اور اس طرح میرے بیانات پر اپنی ذاتی واقفیت کی مہر سے گویا توثیق کی۔ فللہ الحمد۔

حیاتِ شبلی کے معتقد و منتقد | خاک سار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اس کو بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا جائے، مولانا کے سوانح میں بعض رفقاء کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکلا جائے، تاہم نقائص اور عیوب، بشریت کا خاصہ ہیں، اس لیے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہو سکتی ہیں، کیوں کہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار و اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں، لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں محذور ہیں:

فمن الرضا عن كل عيب كليله ولكن عين السخط تبدى المساويا

(رضامندی کی آنکھ ہر عیب کے مشاہدہ سے قاصر رہتی ہے، لیکن ناراضی کی آنکھ ہر ایسی ہی کو ناہر کرتی ہے۔

بہر حال شبلیؒ، شبلیؒ، جنیدؒ و شبلیؒ نہ تھے۔

عہد جدید کا معلم اول | مولانا کارنگ ان قدیم علمائے دین کا نہ تھا، جن کا پاک مشغلہ صرف خانقاہوں میں رشد و ہدایت اور مدرسوں میں درس و تدریس ہے، اگر ایسا ہوتا تو ایسے بزرگوں کے تذکروں کے لکھنے کا جو پرانا دستور چلا آتا ہے، تذکرہ نگار کو اس سیدھے راستے پر چلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی، بلکہ یہ عہد جدید کے سب سے پہلے عالم کی زندگی کے سوانح ہیں، جن میں قدیم کے ساتھ ساتھ ایسے جدید رجحانات بھی پہلو بہ پہلو ہیں جو عہد قدیم کی مانوس نگاہوں میں کبھی کبھی کھٹک پیدا کر دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی، اس لیے وہ قدیم و جدید کے ایک ایسے سنگم بنے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آ کر مل گئے تھے، مدرج البحرین يلتقیان اور اسی لیے ان کی زندگی کے کارنامے گزشتہ علماء دین کے کارناموں سے نسبتاً مختلف ہیں، وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آرا و خیالات سے واقف بھی تھے، قدیم علما کی صحبت بھی اٹھائی تھی اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھے، ساتھ ہی محقق فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مورخ بھی تھے، منکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے، اور نئے زمانہ کے اقتضا آت اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے اور یہ سب گونا گوں رنگ ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں، جن کی تفصیل ان اوراق میں نظر آئے گی۔

کتاب کے ضمنی مباحث | اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ۹ سو صفحات کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں، بلکہ وہ حقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے، جس میں دیارِ مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، جو بڑی دیدہ ریزی سے یک جا ہوئی ہے۔

تصویر | رسم زمانہ کے مطابق عام لوگوں کو اس میں صاحبِ سوانح کی عکسی تصویر بھی ضروری معلوم ہوتی ہوگی، مگر لفظ و معنی کی رنگ آمیزی سے ان کی جو سچی اور اصلی تصویر اس پوری کتاب میں نظر آتی ہے، وہ اس فریب نظر والے لہ گناہ بے لذت رکی تصویر سے زیادہ پائدار اور زیادہ قیمتی ہے، البتہ اس کی کوشش ہے کہ ان کی جسمانی فانی تصویر کے بجائے ان کے باقیات صالحات کاموں کی تصویر سے اوراق کو مزین کیا جائے، یعنی

۱۔ جس کی ضخامت کمپوزنگ کے سبب گھٹ کر تقریباً سات سو صفحات ہو گئی ہے۔

ان عمارتوں کی تصویریں دے دی جائیں جن میں ان کے اعمالِ صالحہ اور صدقات جاریہ مجسم ہیں۔

کتاب کا نام | کتاب کا نام بھی خود صاحبِ سوانح کا فیضِ انتخاب ہے، مولانا ابوالکلام کے نام والے اوپر کے خط میں ’حیاتِ شبلی‘ خود ان کے قلم سے نکلا ہے اور پسند کے قابل ہے۔

محسن کی شکر گزاری | اس حیاتِ شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ اس طرح استاد مرحوم کے احسانات کے بارے سے سبک دوش ہو گیا تو یہ ناشکری ہوگی کیوں کہ میری حقیر ذات پر ان کے جو احسانات ہیں وہ کیف و کم کے احاطہ سے باہر ہیں، اور ان کے تین سب سے بڑے احسانات تو ایسے ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے، سب سے اول یہ کہ انہوں نے اس بے مایہ کو اننگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور اس قابل کیا کہ دو حرف لکھ پڑھ کر اپنی استقامت کے بہ موجب دین و ملت کی کوئی خدمت، بجالا سکے، دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو تعلیم کا سب سے نازک دور آتا ہے، اس میں اس کی ایسی دست گیری فرمائی کہ حصولِ علم اور شوقِ مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بہکنے نہ دیا اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سن کر طبابت کے خاندانی پیشہ سے ہٹا کر علم و فن کے آستانہ پر لا کر کھڑا کر دیا اور سب سے آخر یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی یہ شکل و صورت اس کو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، رحمتِ عالم، سید اولادِ اعظم محمد رسول اللہ ﷺ کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اول پہنچایا، یعنی حضورِ انور ﷺ کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ، جمع و تنقید اور تالیف و تحقیق کی خدمت ابتدا ہی میں سپرد فرمائی، جو الحمد للہ یہاں اس کے لیے سعادت کا ذریعہ ہے اور انشاء اللہ وہاں اس کے لیے آخرت کا ذخیرہ ہوگی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم کی ہزار کج رویوں کے باوجود حجاز کے بہ جائے ترکستان جانے کی غلطی اس سے سرزد نہیں ہوئی اور ساری علمی و عملی کوتاہیوں کے باوجود بھی اسی سایہِ رحمتِ ﷺ کے دامن سے وہ ساری عمر لپٹا رہا، اور اس طرح سرکارِ مدینہ سے اس کو محبت کا وہ خزینہ عطا ہوا جس سے وہ بزرگوں کی نگاہِ قبول کے قابل ٹھہرا، اور تلافیِ مافات کی توفیق سے بہرہ ور ہوا۔

ع حل ایر نکتہ ہم از روئے نگار آخ رشد

پہچ مداں سلیمان

۲۵ محرم ۱۳۶۲ھ

۲ فروری ۱۹۴۳ء



دیباچہ حیات شبلی علیہ السلام

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ
اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے، لیکن اس کے یقینی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اُس کے لیے ظاہری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کر کے دین الہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ کام کبھی کبھی ایسوں سے بھی لیا جاتا ہے جو اپنے ظاہری اعمال کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی نہ تھے۔

داد اور قابلیت شرط نیست بلکہ شرط قابلیت داد اوست

ہر مسلمان سپاہی جنید و شبلی نہیں ہوتا، لیکن اس کا یہی ایک کام کہ خدا کی راہ میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی، اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی جنت کا دروازہ اس کے لیے فوراً کھل جاتا ہے۔

پچھلی صدیوں میں جو کچھ پیش آیا اور ہر دور میں اسلام کی حفاظت، دشمنوں کی مدافعت اور وقت کی دینی ضرورت کے مطابق اشخاص جس طرح پیدا ہوتے رہے، ان کے حالات تاریخ کے صفحات میں مذکور ہیں، خود ہندوستان میں دیکھئے کہ گو آل تیور سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے فائدے پہنچے، مگر ان کے بعض فرماں رواؤں کی کوتاہ اندیشی سے دور خنہ بھی پیدا ہو گئے، ایک یہ کہ ایرانی امرا کو سلطنت میں اختیار حاصل ہو گیا، اور دوسرا یہ کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کی بہت سی مذہبی رسموں کو علی الاعلان

قبول کر لیا گیا، آخر انہی دونوں رختوں سے وہ سیلاب آیا جس نے ان کو بھی ڈبو دیا اور اسلام کی بنیادوں کو بھی درہم برہم کر دینا چاہا، عین اس وقت سرہند ودہلی کے دو خانوادوں سے وہ اشخاص پیدا ہوئے جنہوں نے ان فتنوں کے منہ بند کیے اور اسلام کے قلعہ کو اس سرزمین میں از سر نو محفوظ کیا، تیموریوں کا دور جب ختم ہوا اور سکھوں نے سر اٹھایا تو پھر دہلی اور رائے بریلی کے خانوادوں سے وہ اکابر اٹھے جنہوں نے پورے ہندوستان کو جگادیا اور ہر طرف اصلاح و دعوت اور تبلیغ دین کا ولولہ پیدا کر دیا۔

انگریزوں کے برس عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا، عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کر دیے، دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پا کر ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم و فنون و تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی، خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رحم علی صاحب بنگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کیے، جنہوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیے، اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو رد عیسائیت کے باب میں تائیدِ نبی سے کم نہیں اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا۔

آریوں کے دیا نند سوتی کے مقابلہ کے لیے خاص طور سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور بھی تائیدِ نبی ہی کا نشان تھا اور پھر جس طرح عقائدِ حقہ کی اشاعت اور ردِ بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا، اس کے آثار باقیہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں، یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کیے، ان کا اصلی جواب تو وہ علما دے سکتے

تھے جو ہمارے قدیم متکلمین کی طرح قدیم فلسفہ میں ماہر تھے، اس زمانہ کے نئے علوم اور نئی تحقیقات سے واقف ہوتے، مگر بہر حال مالا یدرک کُلُّہ لا یتدرک کُلُّہ کہ اگر پورا نہ مل سکے تو ادھر وہاں ہی سہی کے اصول کے مطابق ان ہی لوگوں میں سے جو گوئیہ عالم تھے، لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے، اور ان کے علوم و خیالات سے کچھ کچھ واقف تھے، ہر سید، مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی صاحب جون پوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کھڑے ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو ادا کرنا چاہا اور ان سے بہتوں کو ایک معنی کرفائدہ بھی پہنچا، لیکن چون کہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق کی صحبتوں سے مستفید تھے، انہوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں اور ایسی تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقت سے بہ مراحل دور تھیں، ان کی غلطیوں کا سبب ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنے زمانہ کی طبعی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی اور قطعی مان کر مسائل شرعیہ کو ان کے مطابق کرنے لگے اور یہ وہی غلطی تھی جس میں بہ مقابلہ فلسفہ یونان تیسری اور چوتھی صدی میں باطنیہ فرقہ کے علماء اور مصنفین مبتلا ہو چکے تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ علماء و فلاسفہ جو کچھ کہتے ہیں وہی انبیاء اور رسل علیہم السلام کہتے ہیں، اس لیے دونوں میں ایسی تطبیق دی جائے کہ انبیاء کا کلام کسی نہ کسی تاویل سے حکماء و فلاسفہ کے خیال کے مطابق ہو جائے، لیکن متکلمین اہل سنت نے یہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ یہ کیا کہ انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ فرمایا اس کو قطعی و یقینی مان کر حکماء و فلاسفہ کے ان مسائل کی جو قطعاً مخالف تھے، دلائل سے غلطی ثابت کی اور جو کسی قدر صحیح سے صحیح ہو سکتے تھے، اس کی تاویل کر دی اور جو تمام تر مطابق تھے یا کم از کم مخالف نہ تھے یا انبیاء علیہم السلام نے ان سے نفیاً یا اثباتاً بحث ہی نہیں کی تھی، ان کی توثیق کی۔

اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے، اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے۔

مولانا شبلی مرحوم کا کام متعدد وجوہ سے اہمیت خاص رکھتا ہے، مرحوم جن معترضین کے جواب کے لیے اٹھے وہ ان پڑھ مشنریوں میں نہ تھے اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب ان کے لیے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لیے ضرورت یہ تھی کہ ایک ایک کو نہ سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی

جائے، ان کے بتائے ہوئے حوالوں کی غلطی اور کم زوری بتائی جائے اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم و فنون اور تاریخ و تمدن کے شان دار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے، تاکہ اسلام کی تاریخی و تمدنی عظمت اور علمی جلالیت سب کے سامنے آجائے جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں ازسرنو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مایگی کا بھی اندازہ ہو۔

مرحوم کا مقصد زندگی اور امنگ بھی پیدا ہو اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مایگی کا بھی اندازہ ہو۔

مرحوم کا مقصد زندگی اور امنگ بھی پیدا ہو اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مایگی کا بھی اندازہ ہو۔

انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علما کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے، یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہیں، اور ان ہی کی تفصیل اس کتاب کی غرض و غایت ہے۔

اس دوسری غرض کے لیے انہوں نے ایسے پرزور مضامین لکھے اور تقریریں کیں، جن سے یہ ثابت ہو کہ ہماری عربی تعلیم کا پرانا نصاب اصلاح کا محتاج ہے اور ہمارے علماء کو زمانہ کی نئی ضرورتوں کا احساس ہونا چاہیے، شروع شروع میں ہر نئی تحریک کی طرح اس کی بھی مخالفت کی گئی اور شدید مخالفت کی گئی، مگر جب لکھنؤ میں دارالعلوم کی بنیاد ڈالی دی گئی اور اس کے نتائج سامنے آئے تو رفتہ رفتہ مخالفت کی آواز دھیمی پڑتی گئی اور مولانا اور مولانا کے تلامذہ کے ہاتھوں حیدرآباد سے بھال پور تک اور خاص طور سے صوبہ ہائے متحدہ اور بہار کے مدرسوں اور ڈھاکہ اور حیدرآباد کے مشرقی و دینی شعبوں میں عظیم الشان اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں، یہاں تک کہ اب صوبہ متحدہ کی مقدس مذہبی درس گاہوں تک اس کے اثرات پہنچ رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نے ندوۃ العلماء کے وجود سے پہلے ہی اس کے متعلق سب سے پہلی آواز سفر نامہ روم و مصر و شام میں ۱۸۹۲ء-۱۳۰۹ھ میں اٹھائی تھی اور ہندوستان کے ساتھ قسطنطنیہ اور مصر کے مدرسوں اور خاص طور سے جامع ازہر کے نصاب و طریق تعلیم و تربیت پر بڑی دل سوزی سے انکس و حسرت کے آنسو گرائے، آنسو کے یہ قطرے بے اثر نہ رہے، اسی کے چند سال بعد ۱۸۹۹ء میں جامع ازہر کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی، اس کے متعلق سید رشید رضا ڈیڑھ سالہ سفر نامے مسلسل مضامین لکھے، ۳۰ جہادی الثانی ۱۳۱۰ھ کے السنار میں اپنی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے جن تین نام ور علما کے نام سنداؤ پیش کیے وہ یہ تھے، شیخ احمد جان روسی، شیخ شہقیطی مغربی (مراکش) اور شیخ شبلی نعمانی ہندی،

۱۔ اخبار البشیر، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷

اس کے بعد اگر ۱۹۱۴ء کی تحریک جامعہ مدینہ کی کامیاب ہو جاتی تو اصلاح مدارس کی یہ تحریک ساری دنیائے اسلام میں پھیل جاتی، مولانا اس ماحول میں جس کو ہندوستان میں تعلیم جدید نے پیدا کیا تھا، ۱۶ برس کے قریب رہے تھے، ان کو خوب معلوم ہو چکا تھا کہ سیلاب کا یہ بہاؤ کس رخ پر ہے، اور اس سیلاب میں ہمارے مذہبی علوم و فنون کا کیا حال ہوگا اور جو شکوک و شبہات اس تعلیم کی بدولت پیدا ہو رہے ہیں، ان کے جواب دینے کے لیے کس استعداد کے علماء کی ضرورت ہے، ساتھ ہی مصر و شام و ترکی کی سیاحت نے علماء کے جدید فریض کی ضرورتوں کو ان پر آئینہ کر دیا تھا اور انہی وجوہ سے ان کو اپنی تحریک کی ضرورت کا وہ شدید احساس تھا جو دوسرے علما کو نہ تھا۔

اس اصلاحی تحریک کی دو دفعات پر مولانا کو بہ شدت اصرار تھا، ایک یہ کہ قدیم یونانی فلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں داخل کی جائیں، دوسری یہ کہ علماء تعلیم یافتوں کی اصلاح، یورپ میں تبلیغ اور مستشرقین یورپ کے اعتراضات کے جواب اور غلطیوں کی اصلاح کے لیے انگریزی پڑھیں، اس سلسلہ میں دو واقعے مجھے یاد آئے، ایک دفعہ تنہائی تھی تو خاک سار نے عرض کیا کہ قدیم فلسفہ و منطق کی کتابوں کو نصاب سے خارج کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے، فرمایا یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں اور نہ ہمارے مذہب کی فہم و معرفت ان پر موقوف ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ میں ان علوم کو علما کے نصاب میں اس لیے داخل کیا تا کہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا، علمائے اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے نہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے ان مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لیے ان کا اثر خود بہ خود زائل ہو گیا، اور اب ان سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علما انہی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کے تحقیقی جواب دیں۔

مجھے مولانا کی اس رائے سے کہ دارالعلوم کے تمام طلبہ کے لیے انگریزی لازمی کی جائے اتفاق نہ تھا، چنانچہ ایک دن موقع پا کر میں نے عرض کی کہ آپ مدرسہ میں انگریزی کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں، انہوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے ٹپتی جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی

واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی، اب بھی دیکھو، جب غیر مذہبی تعلیم یا فتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے، کیا یہ کام ہمارے علما کا نہیں ہے۔

یہ خیالات ان کے میسوں مضامین اور متعدد تقریروں میں بار بار دہرائے گئے ہیں اور عباسیہ کے زمانہ میں علوم یونانی کی اشاعت اور علم کلام کی ایجاد سے اس کی اصلاح کی مثال برابر ان کے سامنے رہی، ایک تقریر میں وہ پوری تفصیل کے بعد فرماتے ہیں، علما کو اس بات کا مطلق خوف نہیں کرنا چاہیے کہ علوم جدیدہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں اور ان کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے، کیوں کہ جب امام غزالی کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے تو ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے، جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے، اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بہ خوبی کر سکیں گے اور جدید تعلیم یا فتوں کو مذہبی شکوک و شبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے، صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علما جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذات خود حاصل نہ کریں، ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے۔“ (خطباتِ شبلی ص ۹۰)

اسی خیال کے بہ موجب انہوں نے خود سبقت کی اور اپنے بل بوتے کے مطابق قدیم علم کلام میں سے جدید علم کلام کے عناصر جمع کیے اور الغزالی، سوانح مولانا نائے دوم، علم الکلام اور الکلام میں ان کو ترتیب دیا، مگر ان کتابوں میں دو قسم کی کیاں محسوس ہوتی ہیں، ایک یہ کہ جدید علوم و مسائل سے ان کی واقفیت بھی محض سنی سنائی ہی تھی، یا ثانوی درجہ کی تھی، اس لیے وہ ان مقامات کی پوری تحدید نہ کر سکے، جہاں سے اسلامی مسائل پر زد پڑتی تھی، دوسری کمی یہ ہوئی کہ انہوں نے اسلام کے صحیح عقائد کو مستحکمین و حکمائے اسلام کی کتابوں سے چون کر لیا، حالانکہ ان کا اصلی سرچشمہ کتاب الہی اور سنت نبوی ﷺ تھی، اگر یہ دونوں چیزیں براہ راست سامنے رکھی جاتیں تو منزل مقصود کا صحیح پتہ لگ جاتا، اخیر زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے مطالعہ نے یہ نقطہ نظر ان کے سامنے کر دیا تھا، مگر تصنیفی عمل کا وقت گزر چکا تھا، البتہ سیرت نبوی ﷺ کی تکمیل کا موقع ان کو ملتا تو ضرور وہ اس کی تلافی کرتے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنی ہے کہ امام غزالی وغیرہ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے یونانی تراجم کو براہ راست درس میں داخل نہیں کیا، بلکہ ان علوم کو پڑھ کر انہوں نے خود یا دوسرے مسلمانوں نے ان علوم پر اسلامی طرز پر اپنی جو کتابیں لکھیں ان کو علما کے درس میں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان علوم کو خود مسلمان بنایا پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دیا، مولانا کے سامنے بھی جیسا کہ اوپر کی تقریر میں ہے، یہی چیز تھی، مگر افسوس کہ اس پر عمل اب تک اس لیے نہ ہوسکا کہ ان علوم کو علما اب تک حاصل نہ کر سکے اور ان پر ان کی تصنیفات کا زمانہ تو بہ مراحل دور ہے، تاہم جو اصل نکتہ ہے وہ یہی ہے کہ پہلے ان جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہیے، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہیے، ورنہ بغیر اس کے وہی باطنیت اس زمانہ میں بھی پھیلے گی، جو امام غزالی سے پہلے پھیلے تھی، بلکہ میں کہتا ہوں کہ مختلف تحریکوں اور تصنیفوں کے ضمن میں وہ پھیل بھی رہی ہے۔

یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی، یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جز اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درس گاہوں میں ان ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کر کے دکھانا ضروری قرار دیا گیا اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی و قومی برتری کا اعلان کریں اور اپنے مقابلہ میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ و تمدن کے روشن چہرہ پر نئے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیریں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آئے اور اہل یورپ کے کارناموں کے سامنے ان کو اپنے مذہبی و تمدنی و سیاسی و قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں اور اس طرح ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لیے مرزدہ ہو جائے۔

اس کام کے لیے سب سے پہلے انہوں نے خود سردار کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی ذات پاک کو چنا اور اس کو اپنے ہر قسم کے اعتراضوں اور شبہوں کا مورد ٹھہرایا، اس کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلاطین اسلام رحمہم اللہ کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی سلطنتوں کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لیے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہیں کیا، اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھلانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی اور مسلمان بچے جب اسکولوں اور کالجوں میں زیر درس تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں پڑھتے تھے، تو شرم سے گردن جھکا لیتے تھے، اس طرح مسلمانوں کو طرح طرح کے علمی و

سیاسی فریبوں سے خود اسلام سے برگشتہ کر دیا۔

چوں کہ ہندوستان، مصر، مراکش، الجزائر، تونس وغیرہ اسلامی ملکوں میں ان یورپ والوں سے پہلے مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں، اس لیے ان کے تاریک پہلوؤں کو دکھلائے بغیر ان کے کارنامے چمک نہیں سکتے تھے، اس بنا پر مسلمان بادشاہوں اور ان کی سلطنتوں کو برا کہنا اور برا دکھانا ان کے مصنفوں کا سب سے بڑا فرض ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں دشمنوں کا یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، ہندوستان میں ان حملہ آوروں کے سب سے پہلے علم بردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے جو اس زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ کار بھی تھے، ان کے بعد صوبہ یوپی کے سابق گورنر سر ولیم میور صاحب بھی آئے اور لوگ اسی طرح آتے رہے، انگلستان میں بھی یہ کام عمدگی سے انجام پاتا تھا اور انگلستان کے سوا فرانس اور جرمنی میں جن کو مشرق کی شہنشاہی کا دعویٰ تھا، یہ کام پوری مستعدی سے جاری تھا، ڈاکٹر جے اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، برتھلمی، سینٹ ہلیر، فولڈ کی، ولہاؤسن، گولڈزیبر، رینان وغیرہ یورپ کے فضلا باری باری سے اس کام کو انجام دیتے رہے اور آخر میں انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگیو لیو تھ صاحب اٹھے، یہاں تک کہ مصر و شام کے عیسائیوں نے بھی ان کی تقلید میں اس کام کو شروع کیا، جن میں سب سے زیادہ بدنام الہلال مصر کا ڈیپٹی جرجی زیدان ہے۔

یہ لوگ مشنری نہ تھے اور نہ مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے، بلکہ ان کا شمار یورپ کے فضلا میں تھا، یہ اپنے اغراض فاسدہ کے زہر پر ہمیشہ علمی تحقیقات کا غلاف چڑھا لیا کرتے تھے اور خود مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھوج کھوج کر اپنے کام کا سامان نکال لاتے تھے اور اس کے لیے سچ یہ ہے کہ وہ بڑی عرق ریزی کرتے تھے، نادر عربی کتابوں کی تلاش اور جستجو کرتے تھے، محنت کے ساتھ پڑھتے تھے اور ان مسالوں پر اپنی تصنیف و تحریر کی بنیاد ڈالتے تھے اور اب بھی وہ اپنے کاموں میں اسی طرح مصروف ہیں۔

ایسے ہوش مندرحیفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے، جنہوں نے ان ہی کے طریقے سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبا لیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیوں کر

اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی۔

اس سلسلہ کا آغاز مولانا نے اپنی ”گزشیہ تعلیم“ سے کیا جس میں دکھایا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کو ترقی دے کر دوسری قوموں کی زبانوں سے کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ اور دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع درس گاہوں کو قائم کر کے دنیا کی ترقی میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے، پھر آگے چل کر معلومات کے اضافہ کے بعد اس مضمون کو متعدد عنوانوں میں تقسیم کروایا۔

مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی سب سے زیادہ نفرت انگیز پروپیگنڈہ جزیہ کے نام سے جاری کیا جاتا تھا، یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے، اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا، یعنی کوئی غیر مسلم رعایا اس مذہبی ٹیکس کے ادا کیے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی، اور اس میں شک نہیں کہ بعض فقہانے یہی لکھا ہے کہ جزیہ غیر مسلم کو قتل نہ کیے جانے کا معاوضہ ہے جس کو وہ ادا کرتا ہے، لیکن یہ مسلک ان مسلمان قوموں کا نہ تھا، جن کو ہندوستان کی فرماں روائی نصیب ہوئی، مولانا نے بڑی تحقیق سے اس بات کو پایہ ثبوت کو پہنچایا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے، یعنی اسلامی ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لیے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا، تاکہ مسلمان سپاہی بیرونی حملہ آوروں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کریں، اسی لیے جب خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں غیر مسلموں نے فوجی خدمت ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے اور مسلمانوں نے ان کی اس خدمت کو قبول کیا ہے تو وہ ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں، مولانا کا یہ مضمون شایع ہوا تو لوگوں کو ان کی اس اچھوتی تحقیق پر حیرت ہو گئی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کی اتنی خوشی ہوئی کہ مولانا کی یہ تنہا تحقیق ہی ان کے نزدیک ان کے کارنامہ فضیلت کے لیے کافی تھی، مولانا کا تمام تراستدلال کتب فتوح و تاریخ سے تھا، اس لیے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس کے ماننے میں اب بھی تامل ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہائے اسلام رحمہم اللہ گواہ بارہ میں مختلف ہیں کہ جزیہ بقا علی الکفر یعنی غیر مسلم ہونے کا معاوضہ ہے (ہدایہ) قتل کا بدل ہے، یا قتال کا (فتاویٰ سراجی و فتح القدیر) یا اس بات کا کہ ان کو اسلامی ملک میں سکونت کی اجازت دی گئی ہے، (بسوط ج ۱۰/۷۸) تاہم وہ ائمہ جن کی

نظرِ جزیہ کے ساتھ اہل ذمہ کے شرائطِ مصالحت اور اس کے مصارف پر ہے، انہوں نے صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ فوجی خدمت سے استثناء کا معاوضہ ہے۔

پانچویں صدی کے فقہ حنفی کے مشہور امام سرخسی المتوفی ۳۹۰ھ مبسوط میں معترض کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اگر جزیہ کفر کا معاوضہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان دنیا کے چند خرف ریزوں کو لے کر کفر کی بقا کو انگیز کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں:

پھر مسلمان ان ذمیوں سے ان کی اس ذاتی جسمانی امداد کے معاوضہ میں جس کے یہ ذمی اپنے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اہل نہیں ہیں، جزیہ لیتے ہیں، اس لیے کہ دارالاسلام کی مدافعت و مدد اس کے سبب رہنے والوں پر یکساں واجب تھی اور چون کہ ذمی جسمانی امداد کے قابل نہیں کیوں کہ وہ دل میں دشمنوں کی طرف طبعاً مائل ہیں تو اگر ان کو اسلامی فوج میں داخل کر لیا جائے تو وہ دشمنوں کو مدد پہنچائیں گے، اس لیے ان سے جسمانی مدد کے بدلہ مالی مدد لی جاتی ہے تاکہ ان کی امدادی رقم ان مسلمان غازیوں پر صرف کی جائے، جو دارالاسلام کی طرف سے لڑ رہے ہیں اور اسی لیے ان ذمیوں سے ان کی مالی حالت کی کمی اور زیادتی کے سبب سے ان کے جزیوں کی رقم بھی کم و بیش رکھی گئی ہے، کیوں کہ امداد کرنے والوں میں بھی اس حیثیت کی کمی بیشی کا اعتبار رکھا گیا ہے، کیوں کہ اگر مسلمان نادار ہو تو وہ صرف اپنی ذات سے پیادہ لڑائی کو تیار ہوگا اور متوسط الحال مسلمان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے گا اور دولت مند مسلمان خود بھی سواری پر جائے گا اور اپنے غلام کو بھی اپنے ساتھ سوار کر کے لے جائے گا، انہی حالات کے مساوی ذمیوں سے بھی جزیہ کی رقم یہ تفاوت حال وصول کی جائے گی، یعنی جس طبقہ کا مسلمان سپاہی و غازی اپنے اوپر خرچ کرے گا، اس طبقہ کے ذمی سے اس کے مطابق جزیہ لیا جائے گا۔

ثم ياخذ المسلمون الجزية منه خلفاً عن
النصرة التي فانت باصراره على الكفر،
لان من هو من اهل دار الاسلام فعليه
القيام بنصرة الدار وابدانهم لا تصلح
لهذه الناصرة، لانهم يميلون الى اهل
الدار المعادية فيشوشون علينا اهل
الحرب، فيؤخذ منهم المال، ليصرف الى
الغزاة الذين يقومون بنصرة الدار،
ولهذا يختلف باختلاف حاله في الغنى
والفقر، فانه معتبر باهل الناصرة،
والفقير لو كان مسلماً كان ينصر الدار
راجلاً ووسط الحال كان ينصر الدار
راكباً والفائق في الغنى يركب ويركب
غلاماً فما كان خلفاً عن الناصرة يتفاوت
بتفاوت الحال ايضاً. (مبسوط سرخسی جلد ۱۰
صف ۷۸ مصر)

اسی اعتراض و جواب کو سید محمود آلوسی (مفتی بغداد) اپنی مشہور و مقبول تفسیر روح المعانی میں نقل کر کے کہتے ہیں:

وقد یجاب بانہا بدل عن النصرۃ
للمقاتلۃ منا ولہذا تفاوتت لان کل من
کسان من اهل دار الاسلام یجب علیہ
النصرۃ للذیار بالنفس والمال و حیث ان
الکافر لا یصلح لہا میلہ الی دار الحرب
اعتقاداً اقیمت الجزیۃ الماخوذة
المصرفۃ الی الغزاة بتمامہا. (جلد
عاشر ص ۷۲)

اور اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ یہ جزیرہ ہمارے
(مسلمان) سپاہیوں کی جسمانی و ذاتی امداد کا مالی معاوضہ
ہے اور اسی سے اس کی مقدار حیثیت مالی کے مطابق ٹھنٹی
بڑھتی رہتی ہے، کیوں کہ دارالاسلام میں سب رہنے والوں
پر دارالاسلام کی امداد جان و مال سے ضروری ہے اور اس
کے بجائے غیر مسلم اس لیے کہ وہ طبعاً دارالحرب والوں کی
طرف اعتقاداً میاں رکھتا ہے، جزیرہ (مال معاوضہ) لیا
جاتا ہے جو ان مسلمان سپاہیوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

علمائے احناف کا یہی مسلک ہے، چنانچہ ہدایہ کتاب الجزیرہ اور اس کی شرح فتح القدر میں یہ
مسائل مذکور ہیں، اس باب میں مولانا کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے امام سرحدی کے نظریہ کی تائید میں
مغازی و فتوح کی کتابوں سے تائیدی واقعات یک جا کر دیے جس نے نظریہ کو فقہ کا ناقابل تردید مسئلہ
بتا دیا، مخالفین اسلام کی طرف سے اس پر بڑا غلغلہ بلند تھا کہ اسلامی ملکوں میں غیر مسلم رعایا کو عام حقوق
زندگی بھی حاصل نہیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں آرمینیا کا واقعہ پیش آیا، یعنی ٹرکی نے آرمینیا کے
عیسائیوں کی بغاوت کو جب بزور ختم کر دیا تو یورپ کے اصحاب قلم نے اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں پر
مظالم کے دردناک مرثیے چھاپے اور اس کا ذمہ دار اسلام کو قرار دیا، اس موقع پر مولانا نے آرمینیا کے
مفروضہ مظالم کے اسباب الگ لکھے اور ”حقوق الذمیین“ لکھ کر یہ بتا دیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم
رعایا یعنی ذمیوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہیں، بلکہ اس کی بلندی تک یورپ
کی سلطنتوں کے عدل کا پر پرواز ہونہ نہیں پہنچتا ہے۔

اس مضمون نے مخالفوں کی آنکھیں بھی کھول دیں اور اس وقت سے برابر عیسائی اہل قلم اس
کے جواب میں مصروف ہیں اور سب سے آخری کتاب اس کے جواب میں پروفیسر پادری اے لیس
ٹرین (سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی) کی کتاب ”غیر مسلم رعایا مسلمان خلفاء کے زیر حکومت“

(The Caliphs and Their non-muslim subjects) ۱۹۳۰ء ہے۔

عیسائی یورپ نے خلفائے راشدین اور خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے خلاف ایک بہت بڑا الزام یہ قائم کیا تھا کہ انہوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو جو دنیا کی صدیوں کی محنتوں کا خزانہ تھا، جلا کر خاک کر دیا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام علم کا دشمن ہے، گو اس پر بحث ہو سکتی ہے کہ ہر خرافات کا مجموعہ علمی خزانہ ہونے کا مستحق کہاں تک ہو سکتا ہے، تاہم مولانا شبلی آگے بڑھے اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ الزام مسلمانوں پر سراسر غلط ہے، بلکہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں صدیوں پہلے اس کو برباد کر دیا تھا، یہ تحقیق بھی بہت مقبول ہوئی اور اس کے بعد خود یورپین محقق مصنفوں نے اس الزام کی تردید کی ہے، شام کے جرجی زیدان نے مولانا کے مضمون کا جواب لکھا تو اللہ تعالیٰ نے راقم آختم کو توفیق بخشی کہ اس کا جواب لکھے، چنانچہ وہ الندوہ میں شائع ہوا۔

اسی جرجی زیدان نے قبۃ اسلام میں بیٹھ کر تمدنِ اسلامی کے نام سے متعدد جلدوں میں اسلامی عربی تمدن کی تاریخ لکھی اور اس میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے یہ ظاہر عرب خلفاء کے محاسن اور درحقیقت ان کے معائب کا دفتر تیار کیا کہ نادان مسلمان اس کے شکر گزار ہوں، لیکن دانائے دشمنوں نے اس کی اصل حقیقت کو سمجھ کر اس کی یہ قدر دانی کی کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر مارگیولیو تھ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مسلمان طالب علموں کے سامنے اس زہر آلود خوانِ کرم کو رکھنا طے ہوا، اس وقت ساری دنیائے اسلام اور علمائے اسلام میں سے مولانا ہی کا قلم نیام سے نکلا اور مصنف کے سارے اعتراضات کی صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان کی یہ خدمت ایسی قیمتی ثابت ہوئی کہ مصر کے علمائے اس کی پوری قدر کی اور مولانا کی جلالیت مرتبت کا اعتراف کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف انگریز مورخوں نے سیاسی اغراض کی خاطر ہندوؤں پر عالم گیر کے مفروضہ مظالم کی یہ تشہیر کی کہ خود مسلمانوں کو بھی اس کا یقین آ گیا اور پھر ہندوؤں میں جدو تاتھ سرکار جیسے محقق پیدا ہو گئے، جنہوں نے عالم گیر کو اس بنا پر کہ وہ اکبر کے بعد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تخیل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا، ہر الزام کا مورد بنایا، اس وقت سارے ہندوستان میں صرف مولانا ہی کا قلم تھا، جو نیام سے باہر آیا اور تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیے، یہ اب تک اس باب میں بے مثال تصنیف ہے اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے، اسی طرح مسلمان

بادشاہوں کے علمی و تمدنی کارناموں کو پوری آب و تاب سے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے جمع کیا اور ان کو شائع کیا، اسلامی کتب خانے، اسلامی شفا خانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات، ترک جہاں گیری وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں، یہ کہنا بہت آسان ہے اور ایک حد تک سچ بھی ہے، یہ سلاطین مسلمان ضرور تھے، مگر اسلام یا اسلامی طرز حکومت کے تمام تر نمائندے نہ تھے، اس لیے ان پر اعتراضات کرنے سے اصل اسلام پر زونہیں پڑتی، لیکن اسلام کے ۱۳۶۱ برسوں کے اندر مسلمان بادشاہوں اور اسلامی حکومتوں نے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی پاک اثر اگر ظاہر نہیں کیا تو اسلام کی بے تاثیر کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔

اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لیے انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حیات مبارکہ کا انتخاب کیا، اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تلاش و محنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہد حال کے اقتضا کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بے ساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انہوں نے دنیا کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہ مبارک کی مثال اگر اس کے مرقع میں ہے تو پیش کرے۔

آج کل کی سیاسی و اقتصادی تحریکات کے انقلابی دور میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام کیا ہے، ڈھونڈنے والے ڈھونڈ رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کام کا مسالہ ان کو کہاں سے ہاتھ آ رہا ہے؟ الفاروق سے! اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان کی دور بین نگاہ نے اس ضرورت کا پہلے ہی احساس کر لیا تھا۔

الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمد اللہ پوری طرح موجود ہی ہے، مصنف نے اس گوشہ کو اجاگر کیا ہے، جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور جس کی ضرورت ان کے عہد میں بہت شدید تھی، چنانچہ یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے ولوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بوایا، اسی طرح اس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جوابی نظریوں کی کم زوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے۔ والعصمة للہ وحدہ۔

تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرداز یورپ نے قائم کیا ہے، اور یورپ کے مستشرقین جس

وسعت نظر، جستجو اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں، مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا، جن کی مدح و ستائش کا اعتراف خود یورپ کے مستشرقین نے علی الاعلان کیا اور اس طرح اسلام کی سر بلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے، مولانا کے دست و بازو نے اس کو علی حالہ بلند رکھا اور اس کے لیے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکر یہ کے مستحق ہیں۔

عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآن پاک کو محرف ثابت کر سکیں، اس کے لیے وہ ہر طرح کی تدلیس اور دسیسہ کاری کیا کرتے ہیں، جس سال انہوں نے وفات پائی ہے، اسی سال اپریل ۱۹۱۴ء میں لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانے لائبریری کے ایک گوشہ میں قرآن پاک کا ایک ایسا پرانا قلمی نسخہ پایا ہے جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے، ڈاکٹر منگانے اس کی پوری تشہیر کی، چنانچہ ۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو نائٹس آف لندن نے اس پر ایک آرٹیکل لکھا اور بڑے دعویٰ سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان کے مقابلہ کے لیے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا اور متعدد مضامین میں اس کا جواب دیا، اور اس تحقیق کا سارا تار و پود بکھیر دیا۔

اس زمانہ میں علما جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی یا فارسی میں، مولانا نے بھی علی گڑھ آنے سے پہلے تک اسکاٹ المحدثی عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑی کوشش سے لکھتے تھے، صرف ایک رسالہ ”قرآۃ فاتحہ خلف الامام“ کے رد میں اردو میں لکھا، مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا، لیکن جس طرح ہمارے علمائے کرام نے زمانہ کی زبان بدلنے کے ساتھ عربی کی جگہ مفید عام تالیفات فارسی میں شروع کر دیں اور پھر فارسی کا چلن بدلنے پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی و حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی و حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ نے اردو میں تالیف شروع کی، مولانا نے بھی عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ فرمائی اور اس زبان کو جس کی نسبت بہ طور معذرت سیرۃ النعمان میں یوں فرماتے ہیں ”حرف یہ اردو دن آئیں نہ بود“ اپنی نکتہ سنجیوں اور خوش بیانیوں سے یہ عروج بخشا کہ علمائے زمانہ کے لیے اس میں لکھنا پڑھنا مطلق عار نہ رہا اور بے شمار کتابیں ان کے قلم سے اس زبان میں تالیف پائیں، اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ اس میں بعض علمائے اسلام نے بھی کتابیں لکھیں جو اپنی ہدایت و افادیت اور مضامین کی بلندی و ندرت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں، مگر

بیان کے اشکال، تعبیر کی دقت، علمی و فنی اصطلاحات کی کثرت اور فلسفیانہ طرز بیان کے تتبع کے سبب سے عوام تو عوام بہت سے خواص کے دسترس سے بھی وہ باہر ہیں، مولانا نے اپنے لیے بیان کی سہولت، عبارت کی روانی، ترتیب کی خوبی، عام فہم الفاظ کے انتخاب اور تشبیہ و استعارہ کی عمدگی سے وہ طرز نکالا کہ ان کی کتابیں ادب و انشا کا اعلیٰ نمونہ قرار پائیں اور تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ حضرات علما کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا اور اب تو وہ علمی و مذہبی علوم کی عکسالی زبان بن گئی ہے۔

اس موضوع پر ایک اور رُخ سے نظر کیجیے، اس وقت حضرات علما جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے وہ دو تین موضوعوں سے باہر نہ تھے، تصوف و فقہ کے خلاف مسائل کی تحقیق یا فرق باطلہ کی تردید، مولانا نے جب اس میدان میں قدم رکھا، اس محدود رقبہ کو وسیع سے وسیع کر دیا، تاریخی، فقہی، تمدنی، ادبی، علمی، فلسفی، سیاسی غرض ہر نوع سخن میں وہ گل باری کی کہ ساری زمین قسم قسم کے پھولوں سے پر بہار ہو گئی اور اب اس کی تقلید میں علما کی تحریریں اور تالیفات بجز اللہ کی اپنی وسعت روز بروز بڑھا رہی ہیں۔ اس موضوع کا ایک اور گوشہ بھی پردہ کشائی کا محتاج ہے، علمائے کرام کا بڑا مشغلہ اس عہد میں مناظرہ تھا، اور اس وقت کا علم کلام گویا یہی طرز سخن وری تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تالیفات کے لیے اس کوچہ کو اختیار نہیں کیا، مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری عمر اسی مولویانہ مناظرہ ہی میں گزر گئی، اس وقت خصوصیت کے ساتھ چار فریقوں میں مناظرے جاری تھے، حنفی اور اہل حدیث، سنی اور شیعہ، مسلمان اور عیسائی، مسلمان اور آریہ، اب ذرا مولانا کی تالیفات پر نظر ڈالیے، بقول انہی کے:

گرچہ سرو برگ سخن دیگرست شمع جہان ست و لکن دیگرست

انہوں نے مناظرہ کی بدنامی کو بدل دیا اور احقاقِ حق اور ازہاقِ باطل کے لیے زمانہ کے مطابق ایک اور دل نشین شکل پیدا کر دی، ان کی سب سے پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع کیا حنفی اور اہل حدیث کا مناظرہ نہیں؟ ان کی دوسری کتاب الفاروق کیا شیعہ سنی مباحث کا فیصلہ نہیں؟ ان کی باقی کلامی و تاریخی کتابیں عیسائی مشنریوں اور مستشرقوں اور ہندو معترضوں کے جواب میں نہیں، لیکن بات یہ ہے کہ قدیم مناظرانہ قیل و قال کا طریق حریفانہ تعصبات، جو ابی الزامات، بدنامی و طعن و سوء تعبیر اور ناسزا سب و شتم سے اتنا بدنام ہو گیا تھا کہ اس نے تاثیر و تاثر اور قبولِ حق کی ساری صلاحیت اپنے اندر

سے کھودی تھی، حالاں کہ احقاقِ حق اور از باقِ باطل ہمیشہ سے اہل حق کا شیوہ رہا ہے اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا، اس لیے مولانا کی ژرف نگاہی نے لڑائی کے میدان کو نہیں، بلکہ جنگ کے نقشہ کو بدل دیا، انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رد الزام اور رد جواب کے بہ جائے اپنے ہی دعووں کو ایسے دل نشین، دل چسپ اور محققانہ طریق استدلال سے بیان کیا جائے کہ بیان کی ندرت، طریق تعبیر کی سنجیدگی اور دلائل کی قوت خصم کو جواب کے قابل ہی نہ رکھے، چنانچہ سیرۃ النعمان اور الفاروق اور الجزیہ وغیرہ کے جوابات میں جواب دینے والوں نے ایزی چوٹی کا زور لگایا، مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر رہیں اور ان سے بڑا فیض پہنچا اور علمائے بھی اس پر داز پر کتابیں لکھنی شروع کر دیں، جو مفید حال ہیں۔

مولانا سے پہلے ہمارے علم پر مدرسیت اتنی چھا گئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتابوں اور ان کے شرح و حواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا، کسی اور علم و فن کی کتاب سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نواد اور کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا، انہوں نے ہر علم و فن کی بہ کثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادِ کتب بہ کثرت بہ ہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے کوئی کوئی نہ کونہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیے، نصابِ تعلیم میں ان میں سے بعض کو داخل کیا، طلبہ اور علمائے کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، اندوہ کے ایک اجلاس میں علمائے فرائض پر تقریر کرتے ہوئے خاص طور سے ادھر توجہ دلائی، ان کو یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی کہ یورپ کے مستشرقین جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ تو مسلمانوں کے علوم و فنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح، تفسیر اور اشاعت میں ایسی جاں فشائیاں دکھا رہے ہیں اور مسلمان علما جو ان علوم کے اصل وارث تھے، ان کو اپنے ان خزانوں کی خبر نہیں، چہ جائے کہ ان کی تلاش و تصحیح و مطالعہ و اشاعت کی زحمت اٹھائیں، مولانا نے اسی شوق میں ایک دفعہ یہ ارادہ کیا کہ ان کی اشاعت کی خاطر ایک مجلس قائم کی جائے، اس کا اعلان بھی کیا، مگر خاطر خواہ جواب نہیں ملا، اسی سلسلہ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد کو متوجہ کیا اور اس سے فائدہ پہنچا اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ تحریک علمائے نامیوں میں ناکام نہیں رہی۔

ان ہی ددغرضوں کے لیے دارالمصنفین کا خاکہ ان کے دماغ میں آیا تھا، جو ان کی زندگی کا

اخیر کار نامہ تھا، ان کو جب کوئی نئی قلمی کتاب ہاتھ آتی یا کوئی نادر کتاب چھپ کر آتی تو ان کی سرخوشی کا عجیب عالم ہوتا تھا، قلمی کتابوں کو ہر قیمت پر خریدنے کو تیار ہو جاتے تھے، اگر ہاتھ خالی ہوتا تو حیدرآباد وغیرہ سرکاری کتب خانوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے، دوستوں کو اس کی خریداری کی ترغیب دیتے، جن میں سب سے پہلا نمبر ان کے حبیب مکرم مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کا تھا، اور اس کی خبر دوستوں کو اور عزیز شاگردوں کو دیتے تھے، چنانچہ مکاتیب کے اوراق ان بشارتوں اور خوش خبریوں سے معمور ہیں۔

مولانا خود بھی اس علمی تبلیغ کو اپنی زندگی کا ایک اہم فرض سمجھتے تھے، چنانچہ وفات سے ڈیڑھ سال پہلے اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں:

”بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں، تم لوگ اب اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں، المرء اعرف بنفسه، لیکن صحیح علمی مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا، اگر اس میں ذرا بھی کام یابی ہوئی ہو تو مسلم گزٹ کے مصنوعی معائب کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔“ (۵)

مولانا کو اپنی اس علمی دعوت و تبلیغ اور ادبی تعلیم و تربیت میں کہاں تک کام یابی ہوئی، اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے، ان کی یہ کام یابی صرف ان کے حلقہ تلمذ تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے حلقوں کے علماء اور تعلیم یافتہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور برابر متاثر ہوتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کے طریقہ تحریر، اسلوب تحقیق اور طرز تنقید کی تقلید سے اب کوئی حلقہ خالی نہیں رہا۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علماء میں باہم ایسا رشتہ اتحاد ہو اور بہ حیثیت ایک جماعت کے ان کا یہ علمی و مذہبی وقار ہو کہ سارے مسلمان ان کی پیروی کو اپنا شعار بنالیں اور ان کو پوری قوم پر پورا اختیار حاصل ہو اور حکومت وقت اس وقت ان کے سامنے سر جھکا دے گی، چنانچہ وہ اپنی اس تقریر میں جو علماء کے فرائض پر ندوہ کے ایک اجلاس میں کی تھی، فرماتے ہیں:

”غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علماء کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے

ہیں، ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علماء کو ضرورت نہ ہو، لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے، کیوں کہ علماء جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضہ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی..... اس وقت ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اوقاف کے لاکھوں روپے جو متولیوں

کے ہاتھ سے نہایت بے دردی سے برباد ہو رہے ہیں، ندوہ کے ہاتھ میں دے دیے جائیں اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرے۔“

ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصاب تعلیم جو اس وقت ایتری کی حالت میں ہے، اس کی اصلاح کر دی جائے اور گورنمنٹ کو اس دعویٰ پر بہت کچھ لگاوا ہوگا۔

ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے جس طرح قدیم زمانہ میں عدالتِ صدر میں فقہی مسائل کے لیے قاضی و مفتی مقرر کیے جاتے تھے، وہ قاعدہ سرنوسے قائم کیا جائے۔

ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعتِ اسلام اس کی ہدایتوں کی پابند ہو، اس کے فتوؤں کے آگے سر جھکائے، اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کر سکے۔

اس صورت میں ندوہ تمام قوم کو بیہودہ مراسم سے، خلافِ شرع باتوں سے، ناجائز امور سے بی زور روک سکتا اور جماعتِ اسلام کو نماز کا، روزہ کا، حج کا، زکوٰۃ کا بی زور پابند کر سکتا ہے، بی زور تلوار کا نہیں ہوگا، بلکہ اجتماعِ سنت کا اور اتفاقِ باہمی کا ہوگا۔“ (خطباتِ شبلی ص ۳۳-۳۴)

مولانا کی نگاہ میں علما کے فرائض کتنے وسیع تھے، وہ خود اس وسعت پر عامل اور دوسروں کو بھی اس وسعت خدمت کی طرف دعوت دے رہے تھے، علما میں وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دل چسپی لی، کانگریس کی حمایت کی، ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے، مسلم لیگ کے زاویہ نظر بدلنے کے لیے متعدد مضامین اور میمیوں نظمیں لکھیں، احرارِ اسلام کی رہنمائی کی اور ان کی بے راہ روی پر ان کو ٹوٹتے بھی رہے، ہندوستان میں عالم گیر اتحاد کے وہ داعی اول تھے، اوقافِ اسلامی، وقفِ علی الاولاد، تعطیلِ جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومتِ وقت کے سامنے پیش کر کے تحریک کو حجامِ یابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر ان کا یہ بڑا احسان ہے، اس روشنی میں دیکھئے کہ اب آج کل جو حضرات علما میں سیاسی سرگرمی ہے، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہے، ملکی مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہے اور ہندو مسلم اختلافات کو دور کرنے کے لیے جو دور بینی ہے، اور مختلف سیاسی گروہوں میں منقسم ہو کر بھی بہر حال سیاسی مسائل سے جو وابستگی ہے وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہے۔

مولانا نے علما کے طبقہ میں جن نئے خیالات اور حالات کی پرورش کی اور ان کی جامد سطح میں جو حرکت پیدا کرنی چاہی، اس کا یہ مختصر خاکہ ہے، ان کے ذہن میں اس انقلاب کے لیے تدریج کی

ضرورت تھی، اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی پر عمل پیرا تھے، چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:

”سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں علما و غیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لیے زینے درکار ہیں، الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا تاریخ علم کلام، پھر اصلی سطح یعنی علم کلام جدید ہے جو زیر تصنیف ہے..... غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علما برسوں بلکہ قرونوں کے لیے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں بلکہ ع میں تو ڈوبا ہوں ولے یا رکوبھی لے ڈوبوں گا۔“ (مہدی ۱۳)

انہوں نے اپنے طرز عمل کی غلطی محسوس کی ہوگی، ایک زمانہ تک ان کو اس پر تعجب آتا رہا کہ سلف میں بھی بہت سے علما اور ائمہ گزرے ہیں، جن کے بہت سے خیالات اور نظری عقائد جمہور علما سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے، یا مرجئی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے، اور لوگ ان کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے، کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہ نظری خیالات ان کے زہد و عبادت و اتقا کے ساتھ تھے، اس لیے وہ مقبول تھے، اور یہاں یہ کیفیت نہیں، اس کے بعد وہ دور آیا جب ان کا خیال ادھر رجوع ہوا کہ اختلاف خیال کے باوجود وہ علما میں کھپ سکتے ہیں اور ان کی تصنیفات کے اختلافی حصہ سے قطع نظر کر کے ان کے کارآمد حصوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، چنانچہ دس برس کے بعد مئی ۱۹۱۳ء میں ایک صاحب نے اس زمانہ میں جب بعض علما نے سرکار بھوپال میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ سیرت کی امداد بند کر دی جائے، مولانا کو اوزراہ ہم دردی لکھا تھا کہ سیرت کی تصنیف میں روحانیت سے قطع نظر نہ ہو۔

مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

”آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لیے بہت سے الفاظ تراشے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے، لیکن دین دار نہیں لیکن ان ہی دین داروں کو مینوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی، باوجود اس کے ان کی دین داری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا۔“

یقین فرمائیے زمانہ کی خرابزاری دیکھ کر دنیا میں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے، خواہیں تک عوام بن گئے ہیں، حق و باطل کی تمیز کا مادہ مصلوب ہو گیا ہے، مدینہ یونیورسٹی کے نصاب پر جو کچھ یہ حضرات لکھ رہے ہیں، کیا سچائی پر مبنی ہے، صرف یہ کاوش ہے کہ ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا۔

قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ حجاج پر قوم کو بھروسہ نہیں،

بلکہ وہی منقذ قرآن آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے، موجودہ عمارت کعبہ بھی حجاج کی ہے۔

بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے، حافظ، جاحظ، عبدالقادر جرجانی، حکاک کی کا بنایا ہوا ہے، سب معتزلی تھے، کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں، تفسیر کشاف تمام محدثین پڑھتے تھے، حالانکہ اس میں اعتراض بھرا ہوا ہے، قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے، تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود بھروسا ہوتا ہے، کہ وہ خدا صفا کر لے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد اور رشک کے سوا کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں۔

اربابِ دیوبند نہایت زاہد اور متعصب ہیں، اس کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں، تاہم چوں کہ مخلص ہیں، اس لیے شور و شہ نہیں مچاتے، کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں بتا دیتے ہیں۔ (عبدالحکیم ۲)

لیکن ایک ہی سال کے بعد ۱۹ مئی ۱۹۱۳ء کو جب منازعاتِ ندوہ کے سلسلہ میں دہلی کے بعض علمائے علم الکلام اور الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر ان کی تکفیر کا فتویٰ دیا تو صاف اعلان فرمایا:

”میرے عقائد وہی ہیں جو حضراتِ حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائلِ فقہیہ دونوں

میں حنفی ہوں۔“ (دیکھئے زیر عنوان عقائد و خیالات ۸۲۵) (طبع قدیم)

اس اعلان کے ۶ ماہ بعد مولانا نے وفات پائی۔

یہاں پر ایک بات نوک زبان پر آئی جاتی ہے، مسلمانوں کو شکوک و شبہات اور الحاد و بے دینی سے بچانے کے لیے جو تدبیر ہمارے حکمائے متکلمین نے اختیار کی وہ بھی گواہی جگہ پر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض علومِ زمانہ کے ذریعہ مسلمانانِ زمانہ کو زمانہ کی غلطیوں سے بچا کر یقین و اذعان کی منزل مقصود تک پہنچانے کی یہ تدبیر نہیں، متکلمین کے علاج سے یہ ہو سکتا ہے کہ بیماری کے کچھ اثرات زائل ہو جائیں، لیکن اس سے صحت کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا، آنحضرت ﷺ کا ظہور جس زمانہ میں ہوا، روم و مصر و شام و ایران میں یہ فلسفیانہ علوم اور الہیات کے یہ شکوک و شبہات پورے کے پورے موجود تھے، مگر اس کی اصلاح علم کلام کی ایجاد سے نہیں کی گئی، بلکہ قوتِ ایمان اور حسنِ عمل کی زندہ مثالوں نے ان کے شکوک و شبہات کے پردوں کو چاک کر دیا، تعلیم یافتگانِ نبوت جہاں پہنچے سیدھی سادی اور بے کج و بیچِ خدائی منطق جو قرآن کی صورت میں تھی، اور اسوۂ رسول ﷺ جس کے وہ خود نمونہ تھے، یہ دو چراغ ان کے ہاتھ میں تھے، جن کو لے کر وہ آگے بڑھتے گئے اور تاریکی کا پردہ چاک

ہوتا گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا دور آیا، ان کے زمانہ میں ہذیل، علاف، نظام اور جاحظ وغیرہ متکلمین بھی تھے، مگر تاریخ بتا سکتی ہے کہ اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ کس رخ سے بہتا رہا اور دین و اخلاق کی خشک زمین کس سے سیراب ہوتی رہی، یہی صورت حال اس دور کے بعد بھی رہی، شیخ الرئیس بوعلی سینا اور حضرت ابو سعید ابوالخیر رضی اللہ عنہ ایک زمانہ میں تھے، مگر روحانی ہدایت کہاں سے ملی اور حضرت ابو سعید کا حکیم مشرق بوعلی سینا کو یہ فرمانا اب بھی صادق ہے، ”آنچه تو می گوئی من می دانم و آنچه می دانم من می بینم“ دوسرے ملکوں کو چھوڑیے، ”صرف اپنے ملک کو دیکھیے، یہاں خیالی اور شرح مواقف پر حاشیہ چڑھانے والوں نے کتنے دلوں کو منور کیا اور چشت و سہرورد کے خاندانوں نے اپنے نور باطن سے لاکھوں قلوب کو روشن کر دیا، بات یہ ہے کہ علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کرنا سکھاتا ہے، لیکن بند دلوں کو کھولنا، اس کا کام نہیں۔

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ فن کلام بے کار و بیچ ہے، ایسا سمجھنا غلطی ہے، ملت اسلامیہ ایک عالم گیر سلطنت ہے، اس میں ادنیٰ سپاہی سے لے کر امرا و وزرا تک کی یکساں ضرورت ہے، جس سلطنت میں وزیر ہی وزیر ہوں سپاہی نہ ہوں، وہ کب دشمنوں سے محفوظ رہ سکتی ہے، لیکن ہر ایک ملازم اور عہدہ دار کا ایک خاص مرتبہ اور درجہ ہے، ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور موہبت کے مطابق مختلف عہدوں اور درجوں کے کام کے لائق بنائے گئے ہیں، وزرا ہیں جو سلطنت اور فرماں روائی کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، امرا میں جو رموز سلطنت کے مشیر اور کارپرداز ہیں، سپاہی ہیں جو ملک کے ہر سرحدی درہ اور دشمنوں کے حملوں کے مقامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی خدمت سلطنت کے انتظام اور اس کی حفاظت و بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہے، ان میں سے اگر وزرا اور امرا یہ سمجھیں کہ سپاہیوں کی ضرورت نہیں تو سلطنت کے انتظام و حفاظت کے اسرار سے ناواقف ہیں اور اگر سپاہی یہ سمجھیں کہ سلطنت کے لیے وہی سب کچھ ہیں، وزرا اور امرا کی ضرورت نہیں تو وہ بھی اس سلطنت کے خیر خواہ نہیں، کہ وہ نہ ہوں تو ملک میں تباہی برپا ہو جائے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ مرکزی سلطنت کے مصالح و حکم کے واقف کار اور سلطنت کی پالیسی کے ذمہ دار اور اس کے کلی نفع و ضرر کے نگراں وزرا اور امرا ہی ہیں، سپاہیوں کے متعلق صرف اتنے ہی حصہ کی حفاظت فرض اور اسی کے مصالح و حکم کی رعایت ان پر واجب ہے، جن کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

متکلمین کی مثال اس سلطنت کے مجاہد سپاہیوں کی ہے جو دین کے معترضوں کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے علم و فن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں اور حضراتِ محدثین و فقہاء و صوفیہ صافی کی مثال سلطنت کے وزرا اور امرا کی ہے، جن کے ہاتھ میں حکومت کی پالیسی، سلطنت کے مصالح و حکم کی نگرانی اور ساری سلطنت کے حسن انتظام اور اجرائے احکام کی طاقت ہوتی ہے، فوج کا ہر دستہ اپنی جگہ پر اپنے مفوضہ حصہ ملک کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ہے، مگر سلطنت کی پالیسی اور رموز مملکت اور ساری سلطنت کے حسن انتظام اور اجرائے احکام سے اس کو تعلق نہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر وہ یہ کہیں کہ ملت کے کلی مصالح و حکم کے وہ نگران ہیں، تو وہ غلطی کریں گے اور اگر اسی طرح حضراتِ محدثین و فقہاء یا سمجھیں کہ دشمنوں سے حفاظت کے یہ فوجی دستے بے کار ہیں تو وہ بھی غلطی پر ہیں۔

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح ذہن میں آجاتی ہے کہ ہمارے متکلمین نے اپنے مناظرانہ التزامات کے سلسلہ میں عقائد کا جو دفتر تیار کر رکھا ہے، اس کو ملت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں، وہ تو ان کے فنی مفروضات تھے، جن کو دشمنوں کے مقابلہ میں ان کو خاموش کرنے کے لیے انہوں نے کھڑے کر لیے تھے، اسی طرح حضراتِ محدثین و فقہاء کو چاہیے کہ ان متکلمین کے ان فنی مفروضات پر اس وقت تک ان کو ملت کا باغی و طاعی ٹھہرا کر ان کو کافر نہ بنایا کریں، جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرنے لگے کہ ان مدافعانہ مناظروں میں ان کی زبان و قلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہی عین اسلام ہے اور اگر وہ ایسا دعویٰ کریں گے تو یہ سرحدی حفاظت کے بہ جائے جو ان کا فریضہ ہے، مرکزی سلطنت کے اساس و انتظام مملکت کے رموز و اسرار و قواعد و احکام میں مداخلت ہے، جس کا دوسرا نام طوائفِ الملوکی یا بغاوت ہے، اسی لیے یہ بات بہ طور اصول کے مان لی گئی ہے کہ لازم مذہب، مذہب نہیں، یعنی متکلمین کے آراء و نظریات سے جو غلط نتائج لازم آجائیں، وہ ان کا عقیدہ نہیں قرار دیا جائے گا۔

گم کردہ راہ متکلمین کو چھوڑ کر بحمد اللہ تمام متکلمین حق اس نکتہ سے بہ خوبی آگاہ تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ اخیر عمر میں جب جنگجو یا نہ قوی میں افسردگی آتی ہے اور عقل کے بلند بانگ دعوؤں کی حقیقت سے ان کو آگہی ہو جاتی ہے تو دلائل و براہین عقلی کے بہ جائے وحی الہی اور تعلیم نبوی کی صداقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور پکارتے اٹھتے ہیں ”إِنْسِي وَجْهِي لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ خَائِفًا“
۱۔ امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں یہی فرمایا ہے، اور ان کو حارث دین عن تخیلات البتعد کا خطاب دیا ہے، اور حج کے محافظ دستوں سے ان کو تشبیہ دی ہے، (باب العلم الذی ہو فرض کفایہ)۔

وَمَا آتَانَا مِنَ الْمُسَدِّ كَيْفًا. امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم کلام ہی چھوڑ کر فقہ کا دامن پکڑا تھا، امام ابو الحسن اشعری نے چالیس برس کے اعتراف کے بعد بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر قبول حق کا اعلان کیا، کہتے ہیں کہ جب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینہ پر دھری تھی اور سبکی نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری صحیح مسلم ان کی اخیر زندگی کا مشغلہ حیات تھی، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد حکما اور مستحکموں کی نسبت لکھا کہ ان کا خاتمہ عقل کی کوتاہیوں کے اعتراف اور وحی نبوی کے عقیدہ کے اقرار پر ہوا، مرتے وقت امام جوینی کی زبان پر یہ تھا، ”میں اسلامی علوم کو چھوڑ کر عقل کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو افسوس ہوتا، اب میں اپنی ماں کے عقیدہ پر مرتا ہوں“ یا یہ کہا کہ ”اب میں نیشاپور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں“ اسی قسم کے اقوال علامہ آمدی شہرستانی اور خسرو شاہی وغیرہ مستحکمین سے منقول ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اپنے ذاتی تحقیق و تجربہ کے بعد علم کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی الغزالی میں اس کو نقل کیا ہے جو بلفظ یہاں درج ہے:

”اکثر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس (علم کلام) سے حقائق کھل جاتے ہیں اور ان کا پورا پورا علم ہو جاتا ہے، لیکن افسوس علم کلام اس بلند مقصد کے لیے کافی نہیں، بلکہ اس سے کشف حقیقت کے بہ جائے خبط اور گم راہی زیادہ بڑھتی ہے اور یہ بات اگر کوئی محدث (محقق) یا ظاہر پرست کہتا تو تم کو خیال ہوتا کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہو جاتا ہے، لیکن یہ بات وہ شخص (یعنی خود امام صاحب) کہتا ہے جس نے علم کلام کو اس حد تک حاصل کیا کہ مستحکمین اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے، بلکہ اسی علم کلام ہی میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے اور علوم سے جو اس فن سے مناسبت رکھتے تھے، واقفیت پیدا کی، یہ سب کر کے وہ علم کلام سے بے زار ہو گیا۔“

امام رازمی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہے:

”میں نے کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے سارے ابواب پر پوری طرح غور و خوض کر لیا تو میں نے دیکھ لیا کہ ان سے نہ بیجا زبردست ہوتا ہے اور نہ بیجا سیراب اور میں نے پایا کہ منزل مقصود تک لے جانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا راستہ ہے اور جس کو میری طرح ان علوم کا تجربہ ہو گیا، اس کو یہی معلوم ہو گا۔“

۱۔ شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ہند ص ۶، عقیدہ جمویہ کبریٰ رسائل ابن تیمیہ مصر ص ۱۴۱ اجتماع الجیوش الاسلامیہ ہند و صواعق مرسلہ ابن قیم مصر ص ۹۔ ۲۔ الغزالی ص ۱۴۳، مولانا نے اس کے لیے احیاء العلوم کے باب ذکر علوم کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ بیان درحقیقت احیاء العلوم کی کتاب قواعد العقائد کی فصل ثانی میں ہے۔ ۳۔ شرح حدیث النزول، ابن تیمیہ ص ۱۰۵، امرتسر۔

حافظ ابن قیم نے اس کتاب سے کچھ اور فقرے نقل کیے ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں کہ اے کاش ہم بیداری نہ ہوتے اور اسی مقام پر میں نے کہا

وغيابة سعي العالمين ضلال

اور دنیا والوں کی کوششوں کی حد ناکامی ہے

سوى أن جمعنا فيه قيل وقال

ہم نے اپنی ساری عمر کی بحث سے سوا اس کے اور کچھ نہ کیا کہ لوگوں کے اقوال کا دفتر جمع کر لیا۔

اور جان لو کہ ان نکتہ راہوں میں گھسنے اور ان حقائق کے

اسرار دریافت کرنے کے لیے غور و فکر کے بعد مجھے اس

باب میں صحیح و مناسب طریقہ قرآن پاک ہی کا نظر آیا اور

وہ عقلی کریکچر چھوڑ دینا اور آسمان وزمین کے عجائبات سے

اللہ کے وجود پر دلیل قائم کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ

تعالیٰ کی عظمت کا بدل اعتقاد تفصیلات میں پڑے بغیر۔

واعلم ان بعد التوغل في هذه المضائق و

التعمق في الاستكشاف عن اسرار هذه

الحقائق رأيت الاصول الاصلح في هذا

الباب طريقة القرآن العظيم والفرقان

الكريم، وهو ترك التعمق والاستدلال

باقسام اجسام السموات والارضين على

وجود رب العالمين ثم المبالغة في

التعظيم من غير خوض في التفاصيل^۱۔

امام موصوف نے مرض الموت میں جس کا زمانہ مندر رہا، ۲۰۶ھ کو اپنے ایک شاگرد کو

اپنا ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا جس کو تذکرہ نویسوں نے بعینہ نقل کیا ہے، اس میں موصوف نے اپنی عمر بھر

کی علمی تحقیقات اور کلامی مباحث کا آخری نتیجہ پیش کیا ہے۔

میں نے تمام کلامی اور فلسفیانہ طریقوں کو آزمایا تو میں

نے ان کا فائدہ اس فائدہ کے برابر نہیں پایا، جس کو میں

نے قرآن عظیم میں پایا۔

ولقد اخترت الطرق الكلامية والمنهاج

الفلسفية فما رأيت فائدة تساوى الفائدة

التي وجدتها في القرآن العظيم. (حجرات

الاطبا ابن ابی اصیبر ج ۳)

اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ میں محض اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کا امیدوار ہو کر مر رہا ہوں، اس

وصیت نامہ کے آٹھ مہینے دس دن کے بعد یکم شوال ۶۰۶ھ کو انہوں نے وفات پائی۔

۱۔ اجتماع الجيوش الاسلاميه، ص ۱۲۰، امرتسر۔

غرض یہ احوال جس طرح دوسروں کو پیش آئے، اس حیات نامہ کے ہیرو کو بھی پیش آئے، اور آخراں کو یہ کہنا پڑا:

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود گشت راز و گمراہی راز کہ افشای کرد

۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکار رسالت ﷺ کے آستانہ پر حاضری کے لیے بے تاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی و کلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہو گئی تھی، ان کے پاس نہ اب ابن رشد، غزالی و رازی و بوعلی سینا کا گزر رہے، نہ تاریخ و کلام و فلسفہ کا نام ہے، شب و روز اور کتب احادیث و سیرت کا مطالعہ، تعلیمات نبوی کی ترتیب، اخلاق نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھتے، کھری چارپائی ہو یا چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا اور انہی درباریوں کی ہم نشینی میں ان کا سارا وقت گزر جاتا اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربار رسالت ﷺ کا آستانہ (مکاتیب اول عبدالحکیم-۳) چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھارہا تھا، یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لیے خط و کتابت تھی، اُس زمانہ سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط و مکاتیب کو پڑھ ڈالیے، ان میں تین باتیں آپ کو ملیں گی، نہ وہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت و حفاظت اور سیرت نبوی ﷺ، یہاں تک کہ دم نزاع بھی آخر لفظ جو ان کی زبان سے نکلا وہ سیرت ہے۔

سیرت کی حیثیت ان کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا، فرماتے ہیں:

”اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث ہمیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے۔ (مقدمہ سیرت)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمہ اسلام کے دوسرے جزو یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری تفسیر و تشریح کا نام تھا، اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا اور اسی کو وہ سرمایہ سعادت دارین سمجھتے تھے۔ {مکاتیب اولی حصہ، اضافہ ۲}

کیا ان کے اس کام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے نہیں کیا جاسکتا کہ ادھر ان کے قلم نے سیرۃ کی تصنیف کا اعلان کیا اور ادھر مسلمانوں کی زبانوں سے بہ یک دفعہ لبیک کی صدا بلند ہوئی، اور امداد کی نذر لے کر خود ایک والیہ ملک آگے بڑھی اور اب جدھر سنو سیرت سیرت کا لفظ ہر مسلمان کی زبان پر تھا، پھر اس کی دوہری مقبولیت کا نشان دیکھئے، وہ زبان جس میں ان کے اعلان سے پہلے صرف میلاد نامہ کی قسم کے رسالوں اور ایک آدھ کتاب تواریخ حبیب اللہ کی پرانی طرز کی سیرت کے سوا کوئی ایک کتاب بھی موجود نہ تھی، صرف پیروی کی برکت سے پچیس برس کے اندر سیرت پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں کے دفتر سے معمور ہو گئی، اس کوشش میں مقدس علما بھی شریک ہو گئے، نئے تعلیم یافتہ اہل قلم بھی، گم کردہ راہ مدعی اسلام فرقتے بھی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔



’اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بہ قدرِ استعداد پہنچا، جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی، اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی۔“

ہندوستان کی یہ فضائے بسیط بھی ابر کرم سے محروم نہ رہی، ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابر کرم کے چھینٹوں نے اس کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز و شاداب کر دیا، بحر ہند کے سواحلِ ملیبار و مدراس سے لے کر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہو گئیں، دوسری طرف سندھ کی وادی اس کی فوجِ ظفرِ موج سے معمور ہو گئی، تیسری صدی کا خاتمہ تھا کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی، اپنی سلطنت کی طرح ڈالی، اس کا پہلا بانی الپ تگین اور اس کا جانشین یسکتگین ہوا اور اس کے تحت و تاج کا وارث وہ نام و رہا، جس کے حملوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں سے لے کر بحر ہند کے کناروں تک تہلکہ برپا کر دیا۔ سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پر شور کر دیا اور غزنی سے لے کر پنجاب تک ایک لختِ اسلام کی حکومت قائم کر دی، چھٹی صدی میں غوری آئے تو انہوں نے اور ان کے غلام افسروں نے سارے ہندوستان کو اسلام کے زیرِ نگیں کر دیا، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ یہ ملک اسلام کے مقبوضات میں ہے، جس میں نو کروڑ، تو حید کے حلقہ بہ گوشِ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان | جس طرح ہندوستان کو خراسان و ماوراء النہر و عراق و عجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا، اسی طرح اُس کے دل و دماغ کو انہی ملکوں کے اربابِ کمال نے اپنا باج گزار بنایا، قطارِ درقِ قطارِ علما، بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آ رہے تھے، اُس زمانہ میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا، اس لیے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر و غیرہ میں ڈالا، ملتان اور سندھ کے بعد ان کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ و غیرہ میں ہوتی، سلطان شمس الدین ایلتمش نے جب

۶۰ھ میں دلی کو اسلام کا دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے باکمال علما سٹ سٹ کر دلی میں جمع ہونے لگے۔ غیاث الدین بلبن (۶۱۳ھ-۶۱۵ھ) کے زمانہ میں شمس الدین خوارزمی، شمس الدین قوشچی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمال الدین زاہد وغیرہ بیسیوں ارباب کمال تھے جن کے علم و فضل کی رونق سے دلی، بغداد اور قرطبہ کی برابری کر رہی تھی۔

علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ-۷۱۶ھ) کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، فرید الدین شافعی، حمید الدین مخلص، شمس الدین بکھی، محی الدین کاشانی، فخر الدین ہانسوی، وجیہ الدین رازی، تاج الدین مقدم وغیرہ چھیا لیس علما دلی میں ایسے تھے جن کی نسبت ضیاء برنی جیسے مورخ کا بیان ہے کہ دنیا میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

محمد شاہ تغلق (۷۲۵ھ-۷۵۲ھ) کے زمانہ میں معین الدین عمرانی، قاضی عبدالقادر شریعی کندی دہلوی، مولانا خواجگی، شیخ احمد تھامیری جیسے باکمال تھے، جن کے دامن تربیت میں شہاب الدین دولت آبادی، جون پوری پرورش پا کر ملک انعلمابن کر نکلے۔

ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم | اوپر کی سطروں میں زمانوں کی ترتیب اور علما کی وطنیت کی نسبت پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلے اگرنج، بخارا، کاشان، قوشج (ترکستان) ارے اور دمشق کے علما کے نام تھے، تو اب ملتان، بھکڑ، ہانسی، دلی، تھامیر وغیرہ کے نام ساتھ ساتھ ملتے جاتے ہیں، ملتان تو اب بھی مشہور شہر ہے، بھکڑ سندھ میں ہے، ہانسی پنجاب کے موجودہ ضلع حصار میں اب ایک قصبہ ہے اور تھامیر پانی پت کے پاس ہے۔

مورخ ضیاء برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ-۷۱۶ھ) کے زمانہ کے علما کے حالات پر چند صفحے لکھے ہیں، وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہیں، ”در تمامی عصر علانی در دارالملک دہلی علماے بودند کہ آنچنان استادان کہ ہر یکے علامہ وقت در بخارا اور در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تہریز و سفہان و رے و روم و در ربع مسکون نہ باشند، و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و معقولات و اصول دین و نحو و لفظ و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق و موعی شگافند و ہر سالے چندین طالبان علم از اس استادان برآمدہ بدرجہ افادت می رسیدند، و مستحق جواب دادن فتویٰ

۱۔ مضمون ”اسلامی نظام درس“ مولانا سید عبدالحی مرحوم، الندوہ، فروری ۱۹۰۹ء۔

می شدند و بعضی از اساتادان در فنون علم و کمالات علوم بدرجہ غزالی و رازی رسیده بودند، چنانچہ قاضی فخر الدین ناقلہ و قاضی شرف الدین سرباہی و مولانا نصیر الدین غنی و مولانا تاج الدین مقدم و مولانا ظہیر الدین انگ و قاضی مغیث الدین بیانہ و مولانا کرکن الدین سنائی و مولانا تاج الدین کلاہی و مولانا ظہیر الدین بھکری و قاضی محی الدین کاشانی و مولانا کمال الدین کوی و مولانا وجیہ الدین پایلی و مولانا منہاج الدین قاضی و مولانا نظام الدین کلاہی و مولانا نصیر الدین کڑہ و مولانا نصیر الدین صابونی و مولانا علاء الدین تاجر و مولانا نیریم الدین جوہری و مولانا حجت ملتانی قدیم و مولانا حمید الدین مخلص و مولانا برہان الدین بھکری و مولانا افتخار الدین برنی و مولانا حسام الدین سرخ و مولانا وحید الدین مہرور و مولانا علاء الدین کرک و مولانا حسام الدین شاوی و مولانا حمید الدین بنیانی و مولانا شہاب الدین ملتانی و مولانا فخر الدین ہانسوی و مولانا فخر الدین سقاقل و مولانا صلاح الدین سترکی و قاضی زین الدین ناقلہ و مولانا وجیہ الدین رازی و مولانا علاء الدین صدر الشریعہ و مولانا میرآن ماریکلہ و مولانا نجیب الدین ساری و مولانا شمس الدین قم و مولانا صدر الدین گندھک و مولانا علاء الدین لاہوری و مولانا شمس الدین یحییٰ و قاضی شمس الدین گازرونی و مولانا صدر الدین تاوی و مولانا معین الدین لونی و مولانا افتخار الدین رازی و مولانا معز الدین اندیمہنی و مولانا نجم الدین انتشار و چہل و شش استاد مذکور کہ من القاب اسامی ایشان نوشتہ ام آنا نند کہ من در پیش بعضی تلمذ کردہ ام و بخد مت بعضی رسیده و بیشترے رادر مسند اوقات و در محافل و مجالس دیدہ، دیاران از شاگردان مولائی شرف الدین پوشچی و استادان یکدیگر کہ من القاب ایشان نیاوردہ ام، در عہد علائی بر صدر حیات بودہ اند و ادایم سبق می گفتند در آخر عہد علائی مولانا علم الدین ہنیدہ شیخ بہاء الدین زکریا کہ جهان علم و عالم دانش بود در دہلی، رسیده و اگر من خواہم کہ دریں تاریخ جملہ استادان و معلمانے کہ در محل استاذی رسیده بودند ذکر کنم بہ تطویل انجامد و از غرض باز نام و افسوس ہزار افسوس کہ قدر و قیمت بزرگی بہ فضل آل استادان سلطان علاء الدین نہ دانست کہ یک حق از صد حقوق ایشان نہ گزاردہ و نہ معاصران عہد دانستند کہ خاک قدم آنچنان استادان رادر چشم جہاں میں خود کوشند و نہ من کہ مولف ام در ایام خبرے از جلال و کمال ایشان ادراک کردم و امر و ذکرہ قرتی بیشتر گزارشہ کہ آل عدیم المثلالات بہ جو از رحمت رب العالمین پیوستہ اند و بدرگاہ قرب حضرت بے نیازی ترقی کردہ بعد از ایشان نہ بچو ایشان و نہ ہزار دم بجز ذات ایشان مراند دیگرے را نظر آمدہ، بعضیے کہ قدر و قیمت

۱۔ ملتانی۔

ایشان دریافتہ ام کہ اگر در کمالاتِ علوم و تفسیر ہر یکے مجلد سے بہ نوہم مقرر ہاشم دوران ایام کہ استادان کہ ہر یکے ابو یوسف قاضی و محمد شیبانی عہد و عصر خویش بودند بر صدر حیات افادت می کردند اگر مفتی طمطر اقی استاذی بر سر کردہ از خراسان و ماوراء النہر و خوارزم و یا از شہرے دیگر و در دہلی بر سیدی و کمالاتِ علوم بزرگان مذکور را مشاہدہ کردی سبق درست گرفتنے و بلند پیش ایشاں بہ زانوے ادب درآمدی و اگر در حیات آں استادان تصنیفی جدید ہر علمے کہ فرض کنند از بخارا و سمرقند و خوارزم و عراق در شہر آوردندی کہ اگر استادان شہر ما آں تصنیف را استحسان و اعتباری کردندی معتبر شدی والا مجبور ماندے، و مقصود از ذکر ایشاں در تاریخ علانی آں است کہ چہ عصرے و عہدے بود کہ در اں عہد و عصر چندین متفیان نفاس علوم بر صدر حیات در افادتِ علوم مشغول باشند و چگونہ آں عصر متشنائے عصر و آں شہر متشنائے شہر ہائے ربیع مسکون نہ باشد (نیروز شاہی برنی ص ۳۵۲، ۳۵۵ کلکتہ) علم کا قافلہ پورب کو | ان بزرگوں کی نسبت وطنی پر غور کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف اگر کاشان، قاین، رے، گازرون وغیرہ کے نام در تھے تو ان کے پہلو بہ پہلو اب ملتان اور بھکر (سندھ) کے ساتھ لاہور، ستام (پٹیالہ) بیانہ (ریاست بھرت پور) ہانسی (پنجاب) دلی، اندیہ پت (دہلی کے پاس) کڑہ (الہ آباد کے پاس) کول (علی گڑھ) پائل سترکھ (بارہ بنگلی اودھ) کے مشاہیر بھی کھڑے نظر آتے ہیں، یعنی علم کا قدم اب پچھتم سے بڑھ کر پورب کی طرف اٹھ رہا ہے، ان بزرگوں کی عظمت و جلالت یہ تھی کہ مورخ ان میں سے ایک ایک کو غزالی و رازی کا ہم سر بتاتا ہے، جن کی توثیق و سند سے بخارا و سمرقند و خوارزم اور عراق کے اماموں کی تصنیفیں اعتبار و مرتبہ پاتی تھیں۔

بدایوں | غرض خلیجیوں اور تعلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا جاتا تھا، علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی، اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے، حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین بدایونی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وہ سیاح معرفت ہیں جنہوں نے بدایوں اور دلی کی منزلوں کو ملا دیا، اس زمانہ میں اس سرزمین کے دوسرے نام در مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (استاذ نظام الاولیاء) قاضی جمال بدایونی ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ بخش بدایونی وغیرہ ہیں، خواجہ بخش بدایونی وہ ہیں جنہوں نے طوطی نامہ لکھ کر کاغذ کے طوطی اڑائے ہیں، تصوف میں ان کی دو کتابیں ”سلک السلوک“ اور ”کلیات و جزئیات“ ہمارے کتب خانہ میں ہیں۔

۱۔ پائل ریاست پٹیالہ (پنجاب) میں ہے، بارہ بنگلی میں غلط لکھ گیا ہے۔

کڑھ | بدایوں کے بعد گنگا کے دہانہ پر کڑھ اب بھی ایک قصبہ ہے، مگر اس زمانہ میں وہ سلطنت کے مشرقی حصہ کا ایک مرکزی شہر تھا، سلطان فیروز شاہ خلجی کے قتل اور سلطان علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کا وہ سانحہ جس پر تاریخ اب بھی انگشت بہ دندان ہے، اسی شہر میں دریا کنارے گزرا تھا، عہدِ علائی میں مولانا نصیر الدین کڑھ کا نام پڑھ چکے اور ان کے بعد مولانا مظہر کڑھ کا نام آتا ہے، جن کے فارسی دیوان کے دو نسخے ابھی لکھنؤ اور علی گڑھ کو ہاتھ آئے ہیں، یہ حضرت نصیر الدین اودھی چراغِ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔

اودھ | بدایوں اور کڑھ سے ملا ہوا وہ صوبہ جس کو اودھ کہتے ہیں، یہ اصل میں اس شہر کا نام تھا، جس کو رام اور چھن کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے، جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجدوہیا کے نام سے مشہور ہے، مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں اودھ کیا اور ایک پورے صوبہ کا نام رکھا۔

دلی جس زمانہ میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے نور سے جگمگا رہی تھی، اس کی کرنیں چھن چھن کر اودھ کے خطہ کو روشن کر رہی تھیں، اس مطلعِ خورشید سے جو سب سے پہلا آفتاب طلوع ہوا، اس کا نام شمس الدین تکی اودھی ہے، یہ اودھ کے تھے، اسی لیے اودھی کہلاتے ہیں، اسی زمانہ میں اسی تیرہ و تار دیار میں ایک ایسا چراغ بھی جلا جس سے خود دلی روشن ہوئی، اس کا نام شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغِ دہلی ہے۔

ان سے پہلے مولانا فرید الدین کا نام آتا ہے، جو مذہب کے شافعی اور اودھ کے شیخ الاسلام تھے، مولانا فرید الدین اودھی اور ظہیر الدین بھکری کے شاگرد شمس الدین تکی اودھی ہیں اور شمس الدین اودھی کے شاگرد شیخ نصیر الدین اودھی چراغِ دہلی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اس چراغ سے اور بہت سے چراغ جلتے، جن سے اودھ کا خطہ چشمہ نور بنا۔

www.KitaboSunnat.com

سید محمد کرمانی سیر الاولیاء میں جو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے حال میں سب سے پہلی اور پرانی تالیف ہے لکھتے ہیں ”مولانا علاء الدین نیلی کہ خلیفہ سلطان المشائخ بود..... در کشف غوامض کشف و مفتاح مثل نہداشت در مجلس مولانا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود قاری کشف خدمت مولانا علاء الدین (نیلی اودھی) بود و خدمت مولانا شمس الدین تکی و علمائے اودھ سامع بودند“ (صفحہ ۲۷۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے عہد میں شیخ الاسلام اودھ کی درس گاہ میں اودھ کے علما کا ایک انبوہ درس و تدریس میں مصروف تھا جن میں سے تین نے خاص امتیاز پایا۔

۱- شمس الدین محمد بن محیی اودھی المتوفی ۷۴۷ھ

۲- نصیر الدین محمود چراغ دہلی اودھی المتوفی ۷۵۷ھ

۳- شیخ علاء الدین نیلی اودھی المتوفی ۷۶۲ھ

اہل تذکرہ نے ان بزرگوں کو اودھ کی خاک سے نسبت دی ہے، مگر یہ نہیں معلوم کہ اودھ کی کس خاص سرزمین کو ان کی پیدائش گاہ بننے کا فخر حاصل ہے، حضرت سلطان المشائخ کے خلفا میں اودھ کے قصبہ گوپامٹو (ہردوئی) کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ مبارک تھے اودھ کے علا جب دلی سے اپنے وطن کو جانے لگتے تو حضرت سلطان المشائخ کا حکم ہوتا کہ راستہ میں ان سے ملتے جائیں، سیر الاولیا کی عبارت یہ ہے ”دیاران اودھ چنانکہ مولانا شمس الدین محیی و شیخ نصیر الدین محمود مولانا علاء الدین نیلی و عزیزان دیگر چوں از خدمت سلطان المشائخ بازمی گشتند فرمان می شد چوں در گوپامٹو برسید خواجہ مبارک را بہ بیدید“ (ص ۳۱۰) اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگ وارگوپامٹو (ہردوئی) اودھ ہی کے کسی مقام کے رہنے والے تھے، اودھ سے اصل مقصود تو اجمودھیا ہے، اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اس زمانہ میں بڑا شہر تھا، ایک خان اس کا حاکم (مقطع) تھا (۱۹۰) وہاں بعض بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری المتوفی ۸۵۸ھ ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اجمودھیا کے آس پاس اسلامی آبادیاں تھیں، ان میں سے ایک مشہور آبادی کا نام کچھوچھ ہے جس کو حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سستانی المتوفی ۸۰۸ھ کی خواب گاہ بننے کی عزت حاصل ہے۔

قنوج اور کڑہ | دلی اور مالک پورب کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا، اس کی ایک سرحد قنوج (فرخ آباد) اور دوسری کڑہ (الہ آباد) تھی، ممالک پورب کے دونوں بازوؤں پر یہ دو شہر آباد تھے، ان دونوں کو عبور کرنے سے پورب کی سرحد شروع ہو جاتی تھی، قنوج سے لکھنؤ کی سمت سے گورکھپور اور ترہٹ اور پورنیہ ہو کر بنگال اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ کڑہ سے پار ہو کر جون پور کی طرف سے پٹنہ سے آگے بڑھ کر بنگال، یہی دونوں راستے آج بھی ہیں، ایک پر، ای، آئی، ریلوے ہے اور دوسری پر بی این ڈبلو۔

۱۔ خلی اور تغلق بادشاہوں کے سفر بنگالہ (لکھنؤ) کی منزلیں تاریخوں میں پڑھے۔

ظفر آباد اور جون پور | سلطان غیاث الدین تغلق کے نئے دور سے ہندوستان کے مغربی اور مشرقی حصوں میں اتصال بڑھتا گیا، سلطان خود بنگال تک گیا اور آیا، اس کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفر خاں اور دوسرے کا ظفر الدین جو ناتھا پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفر آباد اور دوسرے کے نام پر بعد کو فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ-۷۹۰ھ) نے جون پور آباد کیا، یہ آبادی ۱۷۷۷ء سے پہلے ہو چکی تھی کیوں کہ اس سال سلطان فیروز شاہ نے بنگال سے لوٹ کر جون پور میں قیام کیا تھا۔

غرض آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جون پور و ظفر آباد کے حلقہ میں اسلامی نوآبادیوں نے وسعت پائی، ۷۹۶ھ میں خواجہ علی جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پا کر جون پور کو اپنا مرکز بنایا، اس سلطان الشرق کی ولایت کی حدیں کہاں سے کہاں تک تھیں، اس کا پتہ مبارک شاہی کے ان لفظوں سے ملے گا ”در عرصہ جون پور رفت بہ آہستگی اقطاع قنوج و کڑہ (الآباد) اودھ و سندھ (سندھ)؟“ دول منو بہرائچ و بہار و ترہٹ رادر قبض و تصرف خود آورد“ (ص ۱۵، کلکتہ) اس سے معلوم ہوا قنوج، بہرائچ اور الہ آباد سے لے کر بہار اور ترہٹ (مظفر پور اور درجہنگہ وغیرہ) تک اس ملک پورب کی وسعت تھی، آٹھویں صدی کے پوربی بزرگوں میں حسب ذیل نام تذکروں میں ملتے ہیں، بدر الدین اودھی، تاج الدین کڑہ، جلال الدین اودھی، شیخ دانیال سترکھ (بارہ بنگلی) رکن الدین کڑہ، رکن الدین ظفر آبادی (جون پور) رکن الدین بہاری، مخدوم شرف الدین بہاری، زین الدین دیوہ (بارہ بنگلی) قاضی ساء الدین، بجنور (کھننؤ) صلاح الدین سترکھ (بارہ بنگلی) علماء الدین اودھی، علماء الدین سندھیلوی، قاضی ظفر الدین سترکھ، شیخ مبارک گوپامسو (اودھ) شیخ محمد معروف ایشی (اودھ) منہاج الدین بہاری وغیرہ۔

ملک پورب (مشرق) | خواجہ جہاں نے ۸۰۲ھ میں انتقال کیا اور اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے اُس کی جگہ خود مختارانہ جلوس کیا، یعنی نویں صدی ہجری کے آغاز سے پورب کی آزاد و خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی، مبارک شاہ ۸۰۴ھ میں مر گیا، اور اب اس کی جگہ پر ابراہیم شرقی بیٹھا جو اس خاندان کا سب سے بڑا نام و رفرماں روا گزرا ہے، اس نے جون پور میں چالیس برس حکومت کر کے ۸۴۳ھ میں وفات پائی اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں لاہور، ملتان اور دہلی سے علم کا مرکز منتقل ہو کر پورب کے اطراف ل آئیں اکبری، جلد ۲، ص ۱۷، نول کشور ۲ مبارک شاہی، ص ۱۲۸، کلکتہ ۱۷۷۷ فرشتہ میں ۷۷۶ھ ہجری ہے۔ یہ نام نزیہ الخواطر مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم جزء مایہ نامنہ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چپے گئے ہیں۔

میں آیا، گویا اس حکومت نے اس کے بعد صرف چالیس برس کی اور زندگی پائی یعنی ۸۸۳ھ میں بہلول لودی کے ہاتھ سے یہ مٹ گئی اور یہ زمانہ بھی شرقی بادشاہوں کی جنگ جوئی اور دلی کے لودھی بادشاہوں کے دست برد سے امن اور چین سے نہیں گزرا، تاہم علم و فن کی جو شمعیں روشن تھیں وہ سیاسی حوادث کی ان آندھیوں سے نہ بجھیں، بلکہ ان کی روشنی روز بروز اور تیز ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ تیموریوں کے عہد میں یہ خطہ اور سراپا نور بن گیا، شاہ جہاں فخریہ کہا کرتا تھا کہ ”پورب شیراز ماست“ علامہ آزاد بلگرامی نے سبخت المرجان میں لکھا ہے کہ پورب کی وسعت میں تین صوبے تھے، صوبہ الہ آباد، صوبہ اودھ اور صوبہ عظیم آباد۔

مغلوں سے پہلے اودھ اور جون پور ایک ساتھ بولے جاتے تھے اور قنوج سے لے کر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا جس میں اودھ اور جون پور دونوں شامل تھے اور دوسرا صوبہ کڑا یعنی الہ آباد کا تھا، جس میں گنگا کے اس پار کا علاقہ موجودہ کان پور سے لے کر کڑہ، مانک پور، فتح پور، موجودہ رائے بریلی، سلون وغیرہ سے گزرتا ہوا غازی پور تک چلا جاتا تھا، صوبہ عظیم آباد موجودہ بہار کا صوبہ ہے۔

صوبہ الہ آباد و اودھ | یہاں ہم کو صرف صوبہ الہ آباد اور صوبہ اودھ سے غرض ہے، متنبی کا مشہور مصرع ہے۔ مصائب قوم عند قوم فوائد یعنی ایک کی مصیبت دوسرے کی مسرت کا ذریعہ ہوتی ہے، جس زمانہ میں خراسان و ایران تازیوں کے حملہ سے زریور برہور ہے تھے، ہندوستان میں غلیبوں کا زمانہ تھا اور امن کا دور دورہ، ساتویں صدی کے آخری سال گزر رہے تھے، دو بزرگ ایک صفی الدین جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے اور دوسرے شمس الدین زاوی اپنے اہل دعیال کے ساتھ ہندوستان آئے اور دلی میں سکونت اختیار کی، صفی الدین کے پوتے نظام الدین اور شمس الدین کے بیٹے شہاب الدین نے علمائے دہلی کے سامنے زانوے ادب تہ کیے اور نام و ر ہو کر دلی میں ہنگامہ درس بلند کیا اور شہاب الدین ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام سے سر بلند ہوئے۔

جون پورا | دلی بگڑ کر پورب کئی دفعہ آباد ہوا ہے، دو آبادیاں تو آنکھوں کے سامنے ہیں، دلی پر جب نادر شاہ درانی، احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں اور جاٹوں کی چڑھائی ہوئی تو کتنے باکمال لکھنؤ اور عظیم آباد کو چلے آئے، پھر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب انگریزوں نے دلی کو تباہ کیا تو پھر دلی بگڑ کر پورب آباد ہوا، اسی

طرح اس سے پہلے نویں صدی ہجری کے شروع میں جب تیمور نے پنجاب اور دلی کو غارت کیا تو اربابِ فضل و کمال نے پورب کا رخ کیا، اُس وقت خوش قسمتی سے پورب میں ایک خود مختار مشرقی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی، شیخ نظام الدین اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے پورب کی سمت حرکت کی اور جون پور آ کر رحمتِ اقامت ڈالا، بادشاہ وقت نے پیش از پیش قدر دانی کی۔

قاضی شہاب الدین نے شیخ نظام الدین کو اپنی دامادی میں قبول کیا، ان کے تین لڑکے ہوئے، صفی الدین، فخر الدین اور رضی الدین تینوں نے اپنے نانا کے درس و کمال سے فیض پایا، شیخ صفی الدین نے درس و افادہ کا بازار گرم کیا، عربی صرف و نحو کی مشہور ابتدائی فارسی کتاب دستور المبتدی ان ہی کی تصنیف ہے، شیخ صفی الدین اسی زمانہ میں روددی جا کر سید اشرف جہاں گیر سمنانی کچھ چھوٹی سے جوان دنوں وہاں مقیم تھے، مرید ہوئے، شیخ رضی الدین روددی کے قاضی مقرر ہوئے، ان بھائیوں کی اولادوں نے روددی ہی میں سکونت اختیار کی، جن کے سلسلہ میں اب تک نعمانی شیوخ کی آبادی اس قصبہ میں قائم ہے، شیخ صفی الدین نے ۸۱۹ھ میں وفات پائی، شیخ صفی کے ایک بیٹے ابوالکارم اسماعیل المتوفی ۸۶۰ھ تھے، یہ وہی ہیں جن کے لیے صفی نے دستور المبتدی لکھی اور انہی کے بیٹے مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جون پور کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا اور یہیں ۸۴۹ھ میں وفات پا کر سلطان ابراہیم شرقی کی جامع مسجد کے پاس جس کا نام مسجد اٹالہ ہے، دفن ہوئے۔ یہ پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت تھی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی یہ بودادلی سے لائے تھے، دلی میں انہوں نے مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمتقدر شرقی کنڈی سے جن کا عربی قصیدہ لامیہ مشہور روزگار ہے، تحصیل علم کی جون پور کی مسند پر جب آ کر وہ بیٹھے تو ان کے فیض کمال سے مشرق کی ساری سرزمین اہلہا اٹھی، کڑھ سے لے کر غازی پور تک ایک سائ فیض جاری ہوا۔

اودھ | صوبہ اودھ کا پرانا مرکز تو اجدھیا تھا، اجدھیا کے پاس ہی ایک گاؤں تھا جو بعد کو فیض آباد مشہور ہوا، حضرت شاہ ابوالعباس المتوفی ۸۰۰ھ اور شیخ بہاء الدین اکبر المتوفی ۸۸۸ھ اور شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ وغیرہ بہت سے بزرگ یہاں آرام کر رہے ہیں، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ نے اس کو اس صوبہ کا دارالسلطنت بنایا، ۱۱۹۴ھ میں نواب آصف الدولہ المتوفی ۱۳۱۳ھ کے عہد میں سلطنت کا مرکز فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا، مگر لکھنؤ کی علمی مرکزیت اس سے صدیوں پہلے قائم ہو چکی تھی۔

لکھنؤ لکھنؤ پہلے گومتی کے کنارے ایک گاؤں تھا، چون کہ قنوج اور جون پور کے بیچ میں وہ ایک منزل تھی، اس لیے رفتہ رفتہ اس کی آبادی بڑھنے لگی، تاریخوں میں سب سے پہلے اس کا نام میری تلاش میں تیمور کے حملہ کے بعد ۸۰۳ھ میں ملتا ہے، تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف المسلمو کی کا دور ہوا اور ظفر خاں نے گجرات میں خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج و اودھ و کڑہ اور جون پور میں اور خضر خاں نے لاہور و دیپال پور و ملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں تو ملوا اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست جمائی چاہی، مبارک شاہ نے پورب میں اس کے پاؤں جمنے نہ دیے، اس سلسلہ میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے، فرشتہ میں ہے ”ملوا اقبال خان بہ قنوج رفتہ خواست کہ بہ جونپور و لکھنؤ درآید“ (ص ۱۵۹ نول کشور) اس سے معلوم ہوا کہ جون پور کے بعد لکھنؤ کی مرکزیت اس زمانہ میں توجہ کے قابل ہو چکی تھی، اسلام کی بہت سی آبادیاں ان نفوس قدسیہ کی یادگار ہیں جو آبادیوں سے نفور ویرانوں اور سنسان میدانوں کی تلاش میں رہتے تھے، لکھنؤ کی ابتدائی اسلامی آبادی کا سراغ بھی اسی اثر کا پتہ دیتا ہے۔

مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جو سلاطین تغلق کے زمانہ میں تھے، اور جنہوں نے ۸۵ھ میں وفات پائی ہے ان کے مرید و خلیفہ شیخ قوام الدین تھے، محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ ”مقبرہ اودر لکھنؤ است یزار و متبرک لہ“ ۸۴۰ھ میں وفات پائی، ان کے مرید و خلیفہ شیخ سارنگ تھے، جنہوں نے ۸۴ھ میں رحلت کی، ان دونوں بزرگوں کا فیض مخدوم شیخ مینا رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کا مزار لکھنؤ میں (موجودہ میڈیکل کالج کے پاس) ہے، مخدوم شیخ مینا رحمۃ اللہ علیہ نے ۸۸۳ھ میں انتقال فرمایا۔

ایک پتہ اس سے پہلے کا بھی چلتا ہے، کہتے ہیں کہ سمرقند کے کوئی بزرگ ہندوستان آ کر گومتی کے کنارے لکھنؤ آ کر بسے تھے، تا تاریخوں کے فتنہ کے زمانہ میں (ساتویں صدی) شیخ ضیاء الدین کرمانی کرمان سے ہندوستان آئے اور شیخ موصوف سے ملنے کے لیے وہ لکھنؤ وارد ہوئے اور یہیں کے ہو رہے ان کے پر پوتے شیخ اعظم لکھنوی ہیں جو بڑے عالم ہوئے ہیں، ان کی اولاد اب تک لکھنؤ، دیوہ اور اناؤ میں آباد ہے، شیخ اعظم پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے لکھنؤ کو علم و فضل کا مرکز بنایا وہ اس تحفہ کو جون پور سے لائے۔

تیموری حملہ کے زمانہ میں جو لوگ دلی سے جون پور گئے تھے، ان میں سے قاضی عبدالقادر دہلوی کے پوتے شیخ ابوالفتح بھی تھے جو اپنے دادا ہی کی طرح مشہور فقیہ و شاعر و مدرس تھے اور قاضی

شہاب الدین کے معاصر وہم استاد تھے، ۸۵۸ھ میں وفات پائی، ان کے دامن تربیت میں شیخ اعظم پل کر جوان ہوئے اور لکھنؤ میں جا کر مسند درس بچھائی، شیخ اعظم کے تلامذہ شیخ ضیا لکھنوی اور شیخ سعد الدین خیر آبادی المتوفی ۸۸۲ھ ہیں، شیخ کا مزار خیر آباد میں اب بھی مرجعِ خلافت ہے۔

لکھنؤ کے مرکز کا ایک اور تیسرا خاندان شیخ ساء الدین لکھنوی کا ہے، ان کے صاحب زادہ شیخ الاسلام سعد اللہ فرازندوری ہیں، ۸۲۹ھ میں وفات پائی، ان کے جانشین اور صاحب زادے شیخ امین الدین لکھنوی ہیں، اس گھر میں ظاہر و باطن دونوں کے فضل و کمال کی شمعیں روشن تھیں، ہمارے کتب خانہ میں شیخ امین کے مکتوبات اور ان کے رسالہ موعظۃ المسترشدین کے نہایت پرانے نسخے ہیں، ان کے دوسرے فرزند شیخ سعد الدین لکھنوی ہیں جنہوں نے ۸۸۱ھ میں وفات پائی، تاریخ علمائے ہند کا بیان ہے 'مدام بہ درس و افادہ علوم دینیہ اشتغال داشت و در مدرسہ وے طلبہ مستعد رجوع می کردند' شیخ امین الدین کے صاحب زادہ شیخ حامد تھے، جن کے نام مکتوبات میں متعدد خط ہیں، اس نسخہ کے آخر میں اس خاندان کے ایک یادگار نے اپنا حسب ذیل نام و نسب لکھا ہے، شیخ الاسلام شیخ پیارہ بن شیخ حامد بن شیخ امین الدین بن شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ بن زائر الحرمین الشریفین، شیخ ساء الدین بن بندگی، حضرت مخدوم قاضی فخر الدین بملوی؟۔

لکھنؤ کے پاس کسمپڑی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، یہاں ایک بزرگ شیخ عبدالقادر بن شیخ سلطان جو مولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث کی اولاد سے تھے، پیدا ہوئے، انہوں نے لاہور جا کر علم کا فیض حاصل کیا اور لکھنؤ آ کر درس و افادہ کی نہر بہائی، جو چالیس برس تک جاری رہی، لکھنؤ کے اطراف میں ان کے ذریعہ بڑا علم پھیلا، ان کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا وسط ہے، ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام شاہ پیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جن کی نسبت سے لکھنؤ میں اب تک گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ اور مسجد مشہور ہے، ۱۰۸۰ء میں وفات پائی، ان کا اصل وطن جون پور کے ضلع کا مشہور قصبہ منڈیاہو ہے، مگر عمر لکھنؤ میں گزری اور یہیں دفن ہوئے، شاہ پیر محمد صاحب کے شاگرد و خلیفہ شیخ محمد آفاق لکھنوی، محمد رضا لکھنوی اور میر محمد شفیع دہلوی ہیں، شیخ محمد آفاق لکھنوی دراصل پٹنہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، تقدیر لکھنؤ لے آئی اور اپنے پیر کے پانچویں آسودہ ہیں۔

۱ اخبار الاخبار، ص ۱۶۳ ۲ تاریخ علمائے ہند، ص ۲۳ ۳ ایضاً، ص ۷۵ ۴ ایضاً، ص ۱۸۲۔

موجودہ اعظم گڑھ اور غازی پور کے بیچ میں ایک مشہور قصبہ گھوسی ہے جو اس وقت اعظم گڑھ کے ضلع میں ہے، یہاں کی خاک سے ایک نام ور شیخ عطاء اللہ گھوسی اٹھے، ان کے صاحب زادہ شیخ غلام نقشبند گھوسی ہوئے، میر محمد شفیع بھی عطاء اللہ کے شاگرد تھے، شیخ غلام نقشبند نے پہلے اپنے والد سے پھر میر شفیع سے اور آخر میں سند فراغ شاہ پیر محمد صاحب سے حاصل کی اور شیخ غلام نقشبند لکھنؤی کے نام سے مشہور روزگار ہوئے اور یہ رتبہ پایا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علما ان کی شاگردی پر نازاں ہوئے، شاہ عالم بہادر شاہان کی ملاقات کا مشتاق ہوا، ۱۱۲۶ھ میں وفات پائی اور لکھنؤ کی خاک میں ہمیشہ کے لیے آرام کیا۔

فرنگی محل | اب آخر میں اس مقدس خانوادہ کا ذکر ہے جو لکھنؤ کے افق پر ایسا چمکا جس کے آگے سارے ستارے ماند پڑ گئے اور نظر آنے لگا کہ لکھنؤ کے علمی مطلع پر ان کے سوا کوئی ستارہ کبھی چمکا ہی نہ تھا، یہ خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا، یہ انصار کرام کا خاندان تھا، جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہ گیا تھا، جس میں مولانا حالی اور دیگر نام ور پیدا ہوئے، دوسرا حصہ ادوہ آ کر سہالی میں آباد ہوا، ملا قطب الدین شہید سہالوی اس خاندان کے پہلے نام ور ہیں، اس خاندان کا علمی سلسلہ بہت دور سے چلتا ہے۔

میر فتح اللہ شیرازی | میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لے کر ہندوستان وارد ہوئے اور ۹۹۰ھ میں اکبر شاہ تک پہنچے، اکبر نے بڑی قدر کی ۹۹۷ھ میں یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کے لیے مرجھا گیا اور وہیں خاک میں مل گیا، ہندوستان میں متاخرین علمائے ایران کی معقولاتی کتابوں کا رواج میر نذکور ہی کے ذریعہ پھیلا، میر آزاد بگرامی آثار اکرام میں لکھتے ہیں ”تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق ذوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و میر زاجان میر بہ ہندوستان آورد، دور حلقہ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند، و از ان عہد معقولات را رواج دیگر پیدا شد“ (صفحہ ۲/۲۳۸)

ملا عبد السلام لاہوری | میر فتح اللہ شیرازی کے دامن تربیت میں جن با کمالوں نے پرورش پائی ان میں ایک ملا عبد السلام لاہوری ہیں، ساٹھ برس تک درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، ۱۰۳۷ھ میں نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

ملا عبد السلام دیوہ | اوہ میں (موجودہ بارہ بنکی کے ضلع میں) دیوہ ایک مشہور قصبہ ہے، اس سرزمین نے ملا عبد السلام لاہوری کے ہم نام ملا عبد السلام دیوہ کو پیدا کیا، ملا صاحب پورب میں ایک حد تک پڑھ

۱۔ گمراہ ضلع سئو میں شامل ہے۔ ۲۔ آثار اکرام، ص ۲۱۶ ۳۔ ایضاً، ص ۲۳۶۔

پڑھا کر لاہور گئے اور ملا عبد السلام لاہوری کے درس میں بیٹھے اور نام ور بن کر اٹھے، گوشاہ جہاں نے فوج میں حکمہ افتا کا منصب ان کو دیا تھا، مگر لاہور کی آب و ہوا ان کو آخر پھر وہیں کھینچ لے گئی اور وہاں جم کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق و مغرب میں شروع ہوا۔

ملا دانیال چوراسی | ملا سے دیوہ کے کئی شاگرد مشہور ہوئے، پچھم میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اور پورب میں ملا دانیال چوراسی (الہ آباد) شیخ محبت اللہ الہ آبادی اور شیخ آصف الہ آبادی، ملا دانیال چوراسی کے شاگرد، ملا قطب الدین سہالوی تھے۔

شیخ محبت اللہ الہ آبادی | خیر آباد کے مشہور قصبہ کے پاس صدر پور ایک مقام ہے، وہاں ایک فاروقی خاندان آباد تھا، اس خاندان میں ایک بزرگ شیخ محبت اللہ پیدا ہوئے، جنہوں نے لاہور جا کر ملا عبد السلام دیوی سے کسب کمال کیا اور واپس آکر الہ آباد کو اپنے فیض تربیت کا مرکز بنایا، ان کو ہندوستان کا محی الدین ابن عربی کہا جائے تو بے جا ہے، اسی لیے ابن عربی کو اگر شیخ اکبر کہا جاتا ہے تو ان کو شیخ کبیر، اسی خاندان کے آخری یادگار مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی تھے۔

قاضی گھاسی | شیخ محبت اللہ الہ آبادی کے شاگردوں میں کئی اصحاب باکمال ہوئے جن میں سے قاضی گھاسی الہ آبادی، میر سید کبیر قنوجی اور میر سید محمدی فیاض امر وہوی کے نام معلوم ہیں، شیخ نے ۱۰۵۸ھ میں وفات پائی۔

قاضی گھاسی الہ آبادی کے زمرہ تلامذہ میں ملا قطب الدین سہالوی بھی داخل ہیں، ملا صاحب نے قاضی صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، اس سلسلہ سے ملا قطب الدین فرنگی محل لکھنؤ اور دائرہ شاہ محبت اللہ الہ آباد کے سنگم یا مجمع البحرین ہیں۔

شیخ آصف الہ آبادی | قاضی محمد آصف الہ آبادی ملا عبد السلام دیوہ کے ممتاز شاگرد، اصل میں خیر آباد کے پاس کے گاؤں صدر پور کے رہنے والے تھے اور الہ آباد میں قاضی تھے، ان کے شاگرد شیخ محمد افضل الہ آبادی ہوئے۔

شیخ محمد افضل الہ آبادی | غازی پور کے ضلع میں سید پور شرفا کا مشہور قصبہ ہے، اس قصبہ میں وہ نام ور بزرگ پیدا ہوئے جن کو دنیا شیخ محمد افضل الہ آبادی کے نام سے جانتی ہے، الہ آباد کے بارہ دائروں میں ایک

دارہ اسی نقطہ فضیلت کی کشش سے پیدا ہوا ہے، انہوں نے قاضی آصف الہ آبادی اور ملا نور الدین جون پوری سے فیض پایا، شیخ کو اپنے زمانہ میں قبول خاص و عام حاصل ہوا، ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی، مزار الہ آباد میں ہے۔ شیخ افضل کے تلامذہ میں ایک ان کے صاحب زادہ شیخ محمد تکی خوب اللہ المتوفی ۱۱۳۳ھ ہیں اور شاہ خوب اللہ کے جانشین شاہ محمد فاخر الہ آبادی المتوفی ۱۱۶۳ھ اور شیخ محمد ناصر ہیں، اس سلسلہ فیض نے پورب کے اضلاع کو سرسبز و شاداب کیا، اور ظاہر و باطن کے برکات سے بھر دیا۔

ملا قطب الدین سہالوی | ملا قطب الدین سہالوی نے جیسا کہ اوپر گذرا، شیخ دانیال چوراسی اور قاضی گھاسی الہ آبادی سے کسب فیض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر تو شہر، ہمارے قصبات تک دارالعلم تھے، ملا قطب الدین سہالوی نے سہالی میں اپنی درس گاہ ترتیب دی، اور جوق در جوق طلبہ دیار و اطراف سے آنے لگے، یہاں تک کہ زمین داری کے ایک جھگڑے میں سہالی کے عثمانی شیوخ اور میتھی پور کے خان زادوں کے ہاتھوں سے شہادت پائی، اُن کے مشہور تلامذہ ملا قطب الدین شمس آبادی، حافظ امان اللہ بنارس، قاضی شہاب الدین گوپاموی، حاجی صبغۃ اللہ خیر آبادی محدث اور مولوی اسماعیل اورنگ آبادی وغیرہ ہیں۔

ملا قطب الدین شمس آبادی | ملا صاحب کے مطلع درس سے جو پہلا آفتاب چمکا وہ سید قطب الدین شمس آبادی ہیں، سید موصوف اصل میں ایٹھی کے رہنے والے تھے جو اودھ کا مشہور قصبہ ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد اس قطب نے ایٹھی کے بہ جائے شمس آباد کو اپنا مرکز بنایا، یہ شمس آباد ضلع فرخ آباد میں قنوج کے پاس ہے، آزاد لکھتے ہیں ”در شمس آباد مسند افادہ گستر و جم غفیر راہ اضافہ دانش و بینش مرتبہ کمال و تکمیل کرامت نمود، (ماثر اکرام صفحہ ۲۱۰) شمس آباد کا یہ آفتاب ۱۱۲۱ھ میں غروب ہو گیا۔

ملا محبت اللہ بہاری | اس ”جم غفیر“ میں جو ملا شمس آبادی کی دانش گاہ سے مرتبہ کمال کو پہنچے ایک نام ور ٹھیٹھ پورب سے آکر شامل ہوئے، یعنی بہار کے ایک گاؤں کڑا محبت علی پور سے، دنیا ان کو قاضی محبت اللہ بہاری مصنفِ سلم و مسلم کے نام سے پہچانتی ہے، تکمیل کے بعد یہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے، یہ عالم گیر کا زمانہ تھا، محمد معظم شاہ عالم اول کے زمانہ میں ہندوستان کے صدر جہاں مقرر ہوئے، ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور شیخ فرید الدین طویلیہ بخش کے مزار کے احاطہ میں بہار کے محلہ چاند پورہ میں دفن ہوئے، بعض ۱۔ میر آزاد نے مآثر اکرام جلد اول میں زائر کے حال میں اس خاندان کا تذکرہ کیا ہے۔ ۲۔ میر آزاد نے مآثر اکرام میں ان کو قطب الدین شمس آبادی کا شاگرد لکھا ہے، عرب جا کر شیخ طاہر تفتی اور ابراہیم کردی محدثین مکہ معظمہ سے حدیث پڑھی۔

صاحبوں نے ملا محبت اللہ بہاری کو خود ملا قطب الدین سہالوی کا شاگرد بتایا ہے۔

حافظ امان اللہ بنارس | قاضی محبت اللہ بہاری کے ایک اور معاصر امام وقت تھے، ان کا نام حافظ امان اللہ ابن نور اللہ بن حسین ہے، بنارس وطن تھا، ملا قطب الدین سہالوی اور دوسرے مشاہیر زمانہ سے درس لے کر فارغ ہوئے، تو عالم گیر نے ان کو لکھنؤ میں مفتی کا منصب دیا، حافظ صاحب کا یہ مرتبہ تھا کہ ملا محمود جون پوری نے ملا باقر داماد استرابادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، حافظ صاحب نے دونوں کے درمیان محاکمہ لکھا ہے، شاہ خوب اللہ آبادی کے وہ ایسے مرید تھے جس پر خود پیر کو فخر تھا، ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی، ان کی خانقاہ، مدرسہ اور مسجد بنارس میں اب تک یادگار ہے، اور میں نے اس کی زیارت کی ہے۔

ملا نظام الدین فرنگی محلّی | ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد شاہ عالم گیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ میں شاہی مقبوضات میں سے ایک بڑا مکان مرحمت کیا، جس میں کبھی ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا اور اسی مناسبت سے وہ فرنگی محلّی کہلاتا تھا، یہی وہ فرنگی محلّی ہے جو آگے چل کر پورب کا سب سے بڑا دارالعلوم بنا۔

ملا قطب الدین کے کئی صاحب زادے تھے، مگر ان میں سب سے نام ور ملا نظام الدین ہوئے جن کی نسبت سے عربی کا درس نظامی مشہور ہے، موصوف کا سب سے پہلا چشمہ فیض خود ان کے والد ماجد کا آغوش تربیت ہے، باپ کی شہادت کے بعد پورب کے متعدد علما کے فیوض و برکات کو اپنے دامن میں سمیٹا، اپنے والد کے شاگردوں ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی سے پڑھا اور آخری تکمیل شیخ غلام نقش بندی لکھنوی سے کی، ان تمام نسبتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ملا نظام الدین کی ذات گرامی میں پورب کے تمام مستند سلسلے آکر جمع ہو گئے، یہی سبب ہے کہ پورب کا گوشہ گوشہ ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوا، میر آزاد بلگرامی جو ملا صاحب کے ہم عصر ہیں، اپنے تذکرہ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں: ”وتمام عمر بتدریس و تصنیف اشتغال و رزید و اعتبار و اشتہار عظیم یافت، امر و زعمائے اکثر قطر ہندوستان تلمذ بہ مولوی دارند، وکلاہ گوشہ تقاخری شکند، وکسے کہ سلسلہ تلمذ بادی رساند بین الفضلا علم امتیازی افزاد و مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردہ اند، و برائے اعتبار خاتمہ فراغ از مولوی گرفتند“ ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی، ابدی آرام گاہ لکھنؤ ہے۔

مدرسین فرنگی محلّی | ملا نظام الدین کے زمانہ سے لے کر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتمۃ العلماء مولانا حاشیہ شرح ملاحسن از مولوی عبدالحکیم لکھنوی، معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کو قطبین یعنی ملا قطب الدین سہالوی اور ملا قطب الدین شمس آبادی میں جو دونوں استاد شاگرد ہیں، التباس ہو گیا ہے۔

عبدالرحمن فرنگی مہلی المتوفی ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمہ فیض یکساں جاری رہا اور اب بھی اس کی برکتوں کا سلسلہ بحمد اللہ قائم ہے۔

ملائقہ الدین کے مشہور صاحب زادہ ملا عبدالعلی ہیں، جن کے دم سے یہ چشمہ فیض بڑھ کر دریائے فیض بن گیا، دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا، یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رام پور سے ہوتا ہوا خلیج بنگال کے پاس بوبار پہنچا، اور وہاں سے مدراس ہو کر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا، مدراس میں ۱۲۳۵ھ میں وفات پائی۔

ملائقہ الدین سہالوی کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں میں بڑے بڑے نام ور پیدا ہوئے، جن کے ناموں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں، ان میں سے ملا کمال الدین، ملا حسن، ملا مبین وغیرہ مشاہیر روزگار ہیں، اور ان میں سے ہر ایک خود ایک مستقل سلسلہ کا بانی ہے۔

ملا کمال الدین اور ملا محمد اللہ | ملا بحر العلوم کے علاوہ ملا نظام الدین کے دو اور باکمال شاگرد ہیں، ایک ملا کمال الدین فرنگی مہلی المتوفی ۱۱۵۷ھ اور دوسرے ملا محمد اللہ سندیلہ المتوفی ۱۱۶۰ھ یہ ملا محمد اللہ ہی ہیں جن کی کتاب حمد اللہ مشہور ہے، انہوں نے سندیلہ میں اپنی درس گاہ جمائی جس سے بہت سے نام ور پیدا ہوئے۔ ملا باب اللہ جون پوری اور ملا غلام مہکی بہاری | ملا محمد اللہ کے ایک نام ور شاگرد ملا باب اللہ جون پوری ہیں اور ملا باب اللہ کے شاگرد ملا غلام مہکی بہاری ہیں جن کا حاشیہ ”غلام مہکی بر میر زاہد“ درس نظامی میں لیاقت کی آخری منزل ہے، اکیس نام ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور بہار میں مخدوم شرف الدین کے احاطہ مزار میں دفن ہوئے، ۱۱۸۶ھ سال وفات ہے۔

سلسلہ خیر آباد | ملا کمال الدین کے ایک مشہور شاگرد ملا محمد اعلم سندیلہ ہیں، فضل و کمال کا یہی وہ نخل بارور ہے جس سے خیر آباد کی وہ شاخ نکلی ہے جو پھیل کر خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے، اور جو سلسلہ خیر آباد کے نام سے مشہور ہے، ملا محمد اعلم قصبہ سندیلہ کے شیوخ فاروقی میں ہیں، ملا نظام الدین سہالوی فرنگی مہلی کے دو شاگردوں ملا محمد اللہ سندیلوی اور ملا کمال الدین فرنگی مہلی سے کسب فیض کیا، اور طلبہ کو اپنی تصنیف و تدریس کی دولت سے مالا مال کیا، اور بارہویں صدی کے آخر میں ۲۳ محرم ۱۱۹۸ھ کو اس دنیا کو الوداع کہا، ملا محمد اعلم کے

۱۔ تاریخ علمائے ہند، ص ۱۵۹ میں ۱۱۲۸ھ لکھا ہے، یہ صریحاً غلط ہے کیوں کہ وہ حضرت مرزا جان جانا علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور مرزا صاحب ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے ایک رسالہ پر تقریباً لکھی ہے، یہ ظاہر وہ سترہ برس کی عمر میں مرشد مبین بن سکتے تھے اور نہ تقریباً لکھ سکتے تھے، مرزا صاحب نے خود اپنے ایک خط میں ان کا واقعہ ارتحال نقل فرمایا ہے، اور تاریخ ۱۱۸۶ھ لکھی ہے، (کلمات طبیبات خطوط مرزا صاحب، ص ۷۰) ۲۔ یہ گاؤں نگر نرسہ ضلع پٹنہ کے قریب ہے۔

شاگردوں میں ان کے بھانجے مولوی سید عبدالواجد خیر آبادی کامل ہوئے اور بعضوں کا بیان ہے کہ ملا محمد علم کے شاگرد ملا ارشد تھے، اور ملا ارشد کے شاگرد مولوی عبدالواجد خیر آبادی، ملا عبدالواجد سے ملا نظام العالم اور ملا نظام العالم سے مولانا فضل امام خیر آبادی نے پڑھا، مولانا دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر الصدور تھے، بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمد نامہ ان ہی کی آمد طبع کا نتیجہ ہے، ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔

مرحوم کے جانشین، صاحب زادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی تھے، جن کے دم عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونگی کہ ابن سیناے وقت مشہور ہوئے، دیار اطراف سے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا، شروح و حواشی کی بڑی بڑی کتابیں جو متاخرین کی نتائج طبع تھیں، داخل درس ہوئیں، فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ وغیرہ کتابیں عربی طلبہ کی تعلیم کے لیے لکھیں اور مقبول عام ہوئیں، غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کے تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی، اور وہ بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے، ان بزرگوں میں سے تین ارباب کمال کی درس گاہوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی، مولانا عبدالحق خیر آبادی خلف الصدق مولانا فضل حق خیر آبادی مولانا برکات احمد بہاری، ٹونکی مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری جون پوری، مولانا عبدالحق خیر آبادی نے روسائے رام پور کی قدر وانی سے رام پور کو اپنے فضل و کمال سے منور کیا، مولانا برکات احمد صاحب صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے، ان کے والد حکیم داعم علی صاحب ٹونک جا کر رہ گئے تھے، مولانا برکات احمد صاحب نے رئیس ٹونک کی قدر شناسی سے ٹونک کو علم و فن کا مرجع بنایا، مولانا ہدایت اللہ خاں رام پور سے جون پور آئے اور مدرسہ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلس آراستہ کی، ان میں سے ہر ایک کی درس گاہ سے سیکڑوں علما تعلیم پا کر نکلے۔

فرنگی محل کا اخیر دور | اس اخیر زمانہ میں بھی فرنگی محل کے دارالعلم میں فضل و کمال کی بیسیوں بساطیں بچھی رہیں، ان ہی میں سے مفتی یوسف صاحب فرنگی محلی کی درس گاہ ہے، مفتی صاحب مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابوالرحم صاحب فرنگی محلی کے صاحب زادہ اور جانشین تھے، ان کے والد مفتی محمد اصغر صاحب ملا قطب الدین سہالوی شہید کے صاحب زادہ ملا محمد سعید کے سلسلہ میں تھے، اور لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں سرکار اودھ کے مفتی تھے، والد کے بعد ان کی جگہ یہ مفتی ہوئے، روز و شب طلبہ کو درس اور ساتھ ہی منصب افتا کی خدمت

۱۔ مشہور شایع شدہ آمد نامہ نہیں۔

انجام دیتے، جب ۱۸۵۶ء میں سلطنتِ اودھ کی بساطِ الٰہی تو علم کا یہ مرکز جون پور کے مدرسہ امام بخش میں منتقل ہو گیا، یہاں سے وہ حج و زیارت کو حجاز تشریف لے گئے اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں ابدی نیند سو گئے۔ مفتی احمد ابوالرحم کے دوسرے صاحب زادہ کا نام مولوی اکبر تھا، ان کے بیٹے مولوی امین اللہ اور ان کے بیٹے مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی تھے، مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی نے اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے علماء، مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد اصغر، مولوی نعمت اللہ اور خصوصاً مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے کسب فیض کیا اور یہ شہرت حاصل کی کہ علمائے ان کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، ۱۲۶۰ھ میں نواب ذوالفقار بہادر نواب باندہ کی طلب پر باندہ گئے اور کئی برس رہے، وہاں سے واپس آ کر جون پور کے مدرسہ امام بخش میں مدرس ہوئے اور نو سال تک جون پور ان کی شمع وجود سے پر نور رہا، ۱۲۸۴ھ میں ایک عالم کو شہنائم علم سے معطر فرما کر حیدرآباد میں وفات پائی۔

ان ہی کے صاحب زادہ مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی لکھنؤی ہیں، زیادہ تر علم کی دولت اپنے والد ماجد سے وراثت میں پائی، باندہ میں ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے، دس برس کی عمر میں حافظ ہو کر سب سے پہلے جون پور کی جامع مسجد میں تراویح پڑھائی، سترہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت اور درس و تدریس شروع کیا، کتابیں لکھیں، بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے، فقہ و حدیث و اصول کی معرکہ الآرا کتابیں چھپوائیں، علماء سے مناظرے کیے، ان کی شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر اطراف عالم میں پھیلی اور سینکڑوں علمائے اعلام ان کی درس گاہ سے کامل ہو کر اٹھے اور ملک ملک میں پھیلے، ۱۳۰۴ھ میں چالیس برس کی عمر میں عالم جاودانی کا سفر کیا، علما کو مولانا کی ناگہانی وفات کا وہ صدمہ ہوا کہ شمس العلماء مولانا سعید عظیم آبادی نے یہ تاریخ وفات کہی مع شہ فرنگی محلی ز علم تھی مولانا عبدالحلیم صاحب کے بعد فرنگی محلی میں مولانا محمد نعیم صاحب کی ہستی یادگار سلف تھی، یہ ملا بحر العلوم کے پوتے اور اپنے والد مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔

اخیر زمانہ میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی اسی محفل کے چراغ سحر تھے۔

علمائے جون پور | پورب کے دوسرے علمی مرکز جون پور کا نام بار بار آیا ہے، مگر ابھی تک وہاں کے ارباب کمال کی داستانِ تھنہ بیان ہے، تیموری حملہ کے بعد ۸۰۹ھ میں جب جون پور میں شرقی سلطنت کا تخت بچھا تو اسی کے ساتھ ساتھ یہاں علم و فضل کی مسند بھی بچھی، اس مسند کے سب سے پہلے مسند آرا

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور ان کے معاصرین ہیں، لیکن اس سے چند سال پہلے جون پور سے چند میل کے فاصلہ پر پورب کی طرف ظفر آباد نام قصبہ آباد ہو چکا تھا۔

علمائے ظفر آباد | یہ پہلے گزر چکا ہے کہ ظفر آباد شہزادہ ظفر خاں کے نام پر بسا تھا، مگر یہ اس قصبہ کی شاہانہ تاریخ ہے، اسلامی آبادی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی، کہتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۹ھ میں جب قنوج کی فتح کے بعد بنارس کا قصد کیا تو شاہی فوج کے ساتھ ملا مرتضیٰ کوئی ایک مرد مجاہد بھی شریک تھا، اس وقت ظفر آباد کے مقام پر راجہ اودے پال نام ایک راجہ تھا، اس مجاہد نے راجہ سے مقابلہ کیا اور شہید ہوا، یہیں دفن ہوا، بعد کو مسجد بن گئی، ”صحن شہیداں“ کے نام سے مشہور ہوئی اور اس وقت یہ مزار موضع شمس خاں پور کے رقبہ میں داخل ہے۔^۱

مخدوم شیخ صدر الدین چراغ ہند نام ایک بزرگ ملتان میں، ۶۹۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، شیخ رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے مرید تھے، شیخ رکن الدین کا یہ رتبہ تھا کہ بادشاہ وقت ان کے ہر اشارہ کی تعمیل کو عزت سمجھتے تھے، شیخ صدر الدین پیر کے حکم سے پورب کی ولایت پر مامور ہو کر ظفر آباد میں قیام پذیر ہوئے، مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق نے ان سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا تھا اور ان کے لیے ظفر آباد میں محل بنوایا تھا، جو ”چراغ ہند کے محل“ کے نام سے اب تک مشہور ہے، اس عمارت پر فارسی کا یہ کتبہ منقوش ہے:^۲

بنائے شرع را از عدل بانی	بہ عہد ملک ذوالقرنین ثانی
سلیمان خاتم د جمشید افسر	غیاث الدین و دنیا بو المظفر
کہ بردی شد جہاں داری مسلم	شہ آفاق تغلق شاہ اعظم
کہ در رفعت گزشت از فرق کیواں	بر آمد این حصار چرخ ایواں
ربیع الاولیٰ ماہ ستودہ	دو مشنبہ بست (و) ہشتم روز بودہ
ز ہجرت سال ہفصد بست و یک بود	ہمایوں ساعت و در وقت مسعود
ظفر آباد نامش بودہ در دہر	مظفر شد چو شد معمور این شہر

اس کتبہ سے یہ پوری طرح ظاہر ہوا کہ ۲۸ ربیع الاول ۷۲۱ھ میں سلطان غیاث الدین تغلق

نے اس کو بسایا تھا۔

۱۔ تجلی نور، تاریخ جون پور، ص ۲۹، ۲ فرشتہ، ذکر حضرت رکن الدین ۳۱ شاہان شرقی کی یادگاریں (انگریزی) خان بہادر فصیح الدین مرحوم، کلکتہ جون پور، ص ۱۰۵، ۳۔ اس مقام پر فرشتہ ص ۱۱۹ اور سمارک شاہی ص ۹۲ کی اس غلطی کو دور کرنا ہے کہ انہوں نے غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ یکم شعبان ۷۲۱ھ لکھی ہے، مگر اس کتبہ کی بنا پر یہ تاریخ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جو فیروز شاہی ص ۲۲۵ میں ضیاء برنی نے اور تاریخ بدایونی ص ۲۲۱ میں ملا بدایونی نے لکھی ہے یعنی ۷۲۰ھ۔

چنانچہ اسی کے بعد سے ظفر آباد کا نام تاریخوں میں آتا ہے، تا تاریخوں کے حملہ کے زمانہ میں ایک بزرگ مع اپنے صاحب زادوں کے ہندوستان میں وارد ہوئے، بعد کو ان کے ایک صاحب زادہ سید تاج الدین کڑھ کے ناظم مقرر ہوئے اور دوسرے صاحب زادہ مخدوم اسد الدین نے پورب میں ظفر آباد کو اپنے قدم سے سرفراز کیا اور ”مخدوم آفتاب ہند ظفر آبادی“ کے لقب سے شہرت حاصل کی، اور ۹۳ھ میں وفات پائی، ان کا مزار اور ان کی اولاد اب تک ظفر آباد میں ہے۔

تاج الدین کے بیٹے ظہیر الدین نے شعر و ادب میں نام پیدا کیا اور دتی جا کر تعلق کے دربار میں پہلے شاعروں کی صف میں داخل ہوئے، پھر میرنشی مقرر ہوئے اور آخر میں ترک منصب کر کے حضرت نظام الاولیا کے حلقہ میں آئے، دیوان فارسی اور تصوف میں رموز المعانی یادگار چھوڑا۔

پورب میں علمی ترقی کے چار دور | پورب میں درحقیقت علمی ترقی کے چار دور ہیں، ایک سلطنت شرقی کا عہد دوسرا لودیوں کا تیسرا تیموری سلاطین اور خصوصیت سے شاہ جہاں اور عالم گیر کا زمانہ اور چوتھا اودھ کی نوابی کے ختم پر۔

شرقی سلطنت کا دور | پہلا دور ۸۰۴ھ سے شروع ہو کر ۸۸۱ھ پر ختم ہوتا ہے اور اس دور کا طلائعی عہد سلطان ابراہیم شرقی اور اُس کے بیٹے سلطان محمود شرقی کا زمانہ ہے۔

یہ عہد حکومت نہ صرف پورب بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فن کی بہار کا زمانہ تھا، قنوج سے لے کر پٹنہ تک گاؤں گاؤں میں شرفا کی آبادیاں قائم ہو رہی تھیں، قصبوں میں قاضیوں، مفتیوں اور شیوخ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جا رہی تھیں اور ہر جگہ علم و فضل کی مسندیں بچھی تھیں، اور طلبہ کے قافلے اس سرے سے اُس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آ جا رہے تھے، آج بھی ان اطراف میں شرفا کے جو خاندان آباد ہیں، ان کے بزرگ اسی عہد کی یادگار ہیں اور جس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ انہی شرقی بادشاہوں کا فیض ہے یا پھر آخر میں سلطان عالم گیر کے عطیے ہیں، سادات اور صدیقی، فاروقی اور انصاری شیوخ کی نوآبادیاں قنوج سے لے کر جون پور سے گزر کر غازی پور تک پھیلی تھیں، خانقاہیں اللہ والوں سے اور درس گاہیں

۱۔ گنجی نور، نور الدین ظفر آبادی، جلد دوم، ص ۹ ۲۔ سلاطین شرق کے نام اور زمانے یہ ہیں:

- | | | | |
|---------------------------|-----------|------------------------|-----------|
| ۱۔ سلطان الشرق خواجہ جہاں | ۸۶۶ھ-۸۰۲ھ | ۲۔ سلطان محمود شرقی | ۸۴۳ھ-۸۶۲ھ |
| ۲۔ مبارک شاہ شرقی | ۸۰۲ھ-۸۰۴ھ | ۵۔ سلطان محمد شاہ شرقی | ۸۶۲ھ-۸۶۲ھ |
| ۳۔ سلطان ابراہیم شرقی | ۸۰۴ھ-۸۴۴ھ | ۶۔ سلطان حسین شاہ شرقی | ۸۶۲ھ-۸۸۱ھ |

علم کے طلب گاروں سے بھری پڑی تھیں، بشرتی سلطنت کے فروغ نے ظفر آباد اور جون پور کے درود یوار کو پر نور بنا دیا تھا، علما اور اہل ہنر دور دراز ملکوں سے کھینچے چلے آتے تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱- نور الدین ابی محمد بن محمد و م سید اسد الدین التونی ۸۲۶ھ۔

۲- قطب الدین ابوالغیب بن نور الدین ابی محمد شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی،

۸۶۹ھ میں وفات پائی۔

۳- ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفر آباد التونی ۸۳۹ھ۔

۴- قاضی تاج الدین ناصحی ظفر آباد التونی ۸۳۱ھ۔

۵- قاضی نصیر الدین گنبدی قاضی جون پور، شاگرد قاضی عبدالقادر دہلوی التونی ۸۱۷ھ۔

۶- ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، دنیا بادشاہان اسلام کی اس علمی قدر دانی

کو یاد رکھے تو اچھا ہے کہ ملک العلماء جب ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو آیا، مزاج پرسی کے بعد پانی کا ایک پیالہ لے کر مولانا کے سر پر پھر کر یہ دعا مانگی، کہ خداوند یہ بلا ان سے دور کر کے اس کے بدلہ میں میری جان صدقہ میں قبول فرما آخر دونوں آگے پیچھے ۸۴۰ھ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

۷- ملا شیخ عبدالملک عادل فاروقی بن نواب عماد الملک وزیر سلطنت شرقی، شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی التونی ۸۹۶ھ۔

۸- ملا علماء الدین عطاء الملک برادر شیخ عبدالملک شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی، قاضی

صاحب نے اپنی فارسی شرح کافیہ میں اپنے شاگرد کا ذکر کیا ہے کہ اسی کے پاس خاطر سے یہ لکھی گئی۔

۹- شاہ ابوالفتح جون پوری نمبرہ قاضی عبدالقادر دہلوی، التونی ۸۵۸ھ۔

۱۰- شیخ محمد عیسیٰ جون پوری شاگرد قاضی دولت آبادی۔

۱۱- قاضی سماء الدین قتلغ خاں وزیر سلطان شرقی التونی ۸۱۳ھ۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ظفر آباد اور جون پور کے بعد فیض آباد کے اطراف اور لکھنؤ میں علما اور

مشائخ اپنی درس گاہیں اور خانقاہیں اور شرقا اپنے گھرانے آباد کر رہے تھے، چنانچہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام شیخ

سعد اللہ فراز کندوری التونی ۸۲۹ھ، شیخ قوم الدین التونی ۸۴۰ھ، شیخ سارنگ التونی ۸۴۲ھ، شیخ محمد اعظم

لکھنوی، شیخ سعد الدین لکھنوی المتوفی ۸۸۱ھ، شیخ ضیا لکھنوی، شاہ ضیا المتوفی ۸۴۰ھ، خیر آباد میں، شیخ سعد الدین خیر آبادی المتوفی ۸۸۳ھ، رودولی میں مخدوم احمد عبدالحق المتوفی ۸۳۳ھ، شیخ امین الدین المتوفی ۸۳۳ھ، شیخ صفی الدین ان کے بھائی قاضی رضی الدین اور بیٹے شیخ ابوالکارم اسماعیل المتوفی ۸۶۰ھ کچھوچھ (فیض آباد) مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ، دریاباد میں شیخ محمد مخدوم آب کش المتوفی ۸۴۰ھ اور اجودھیا میں شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ تعلیم و ارشاد کی مسندوں پر جلوہ آرا تھے۔

مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں ایک خط قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام ملتا ہے، جس میں سلطان ابراہیم شرقی سے کسی سفارشِ خیر کا تذکرہ ہے، شیخ سعد الدین لکھنوی اور سلطان شرقی کے وزیر ساء الدین قتلغ خاں کے درمیان دوستی کے تعلقات مستحکم تھے، شیخ کے صاحب زادہ شیخ امین الدین لکھنوی کے مکتوبات میں ایک خط وزیر موصوف کے نام موجود ہے، جس میں شیخ سعد الدین لکھنوی کی وفات کا پورا حال لکھا ہے، ساء الدین قتلغ خاں گوریز تھے، مگر اپنے زمانہ کے مشہور علما میں تھے۔

لودیوں کا زمانہ | اگرچہ سلطان حسین شرقی کی نالائقی اور غرور و نخوت سے ۸۸۳ھ میں سلطان بہلول لودی کے ہاتھ سے شرقی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، مگر خوش قسمتی سے اس وقت لودیوں کا جو خاندان ولی کے تخت پر فرما رہا تھا وہ علم و فن اور فضل و کمال کا پورا قدر شناس تھا، ان کے زمانہ میں ہندوستان نے علم و تہذیب اور صنعت و زراعت کے کاموں میں بڑی ترقی کی، بلکہ شرقی بادشاہوں نے اس سرزمین میں تہذیب و تمدن کے جو پودے لگائے تھے وہ لودیوں کے عہد میں پوری طرح بار آور ہوئے۔

غازی پور میں پھول اور پھل لگائے گئے، سکندر پور (بلیا) سلطان سکندر لودی کی آب یاری سے چنبیلی (وہاں کے قلعہ کی چنبیلی اب تک مشہور ہے) اور گلگاہوں کا تختہ بن گیا، جون پوران پھولوں کے تیلوں اور عطروں سے مشام جاں کو مد نظر کرنے لگا اور اب تک کر رہا ہے، یہی عطر بیڑی علمی میدانوں میں بھی ہوئی یعنی علم و فن کے گلستانوں میں نئے سرے سے بہا آئی، تیموری باد صصر نے جن پودوں کو مرجھا دیا تھا، ان میں دوبارہ جان پڑی اور دلی سے لے کر جون پور تک علم کے قافلے پھر آنے جانے لگے، ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج بھی اسی زمانہ سے شروع ہوا۔

۱۔ اخبار الاخیار ص ۱۵۷ ۲۔ نسخہ دار المصنفین ۳۔ لودی پٹھانوں کی سلطنت ۸۵۵ھ سے ۹۳۲ھ تک دلی میں قائم رہی، ۹۳۲ھ میں بابر نے آکر لودیوں کا خاتمہ کیا اور تیموری سلطنت کی بنیاد کھڑی کی، لودی سلطانوں کے نام اور زمانے یہ ہیں:

۱۔ سلطان بہلول لودی، ۸۵۵ھ-۸۹۴ھ ۲۔ سلطان سکندر لودی، ۸۹۴ھ-۹۲۳ھ ۳۔ سلطان ابراہیم لودی، ۹۲۳ھ-۹۳۲ھ

لودیوں کے خاندان میں سکندر لودی کا زمانہ سب سے بہتر تھا، غرض اس نے اطراف و دیار سے علما کو جمع کیا اور نئے سرے سے علم کو فروغ دیا، خود شاعر تھا، اور گل رخ تخلص کرتا تھا، اس کے عہد کے مشہور شاعر شیخ جمالی ہیں، جنہوں نے ملکوں کی سیاحت کی تھی اور ملا جامی کی صحبت سے جام فیض پیا تھا، اسی زمانہ میں دو بھائی ملتان سے ادھر آئے، شیخ عبداللہ تلمیسی اور شیخ عزیز اللہ تلمیسیؒ، پہلے نے دہلی کو اور دوسرے نے سنبھل (مراد آباد) کو اپنا مرکز بنایا، ملا بدایونی لکھتے ہیں ’’واذ جملہ علمائے کبار در زمان سلطان سکندر شیخ عبداللہ تلمیسی در دہلی و شیخ عزیز اللہ تلمیسی در سنبھل بودند، و اس ہر دو عزیز ہنگام خرابی ملتان بہ ہندوستان آمدہ علم معقول را در اں دیار رواج دادند، قبل ازیں بغیر از شرح شمسہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شایع نہ بود‘‘ ملا بدایونی اپنے بزرگوں سے سن کر کہتے ہیں کہ ایک شیخ عبداللہ کی درس گاہ سے میاں لادن جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوئیاری اور میران سید جلال بدایونی وغیرہ جیسے چالیس علمائے تبحر پڑھ کر نکلے، سلطان لودی خود درس میں شریک ہوتا اور اس خیال سے کہ سلسلہ درس میں شاہی آداب و تکلفات سے خلل نہ پڑے، چپکے سے صف پائیں میں آکر بیٹھ جاتا تھا اور آخر میں سلام سنون کر کے رخصت ہو جاتا تھا۔

شیخ عبداللہ نے ۹۲۲ھ میں وفات پائی۔

پورب میں ان دونوں عزیزوں کی درس گاہ سے دو کامل نکلے، ایک میاں حاتم سنبھلی المتوفی ۹۶۸ھ اور دوسرے ملا اللہ داد جون پوری المتوفی ۹۶۲ھ، پہلے کی نسبت ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ انہوں نے عمر میں تیس دفعہ سے زیادہ مفتاح کا اور چالیس دفعہ سے زیادہ مطول کا درس دیا، اور دوسرے کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے فقہ میں ہدایہ کی، نحو میں کافہ کی شرحیں اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا۔

مولانا اللہ داد جون پوری اس عہد میں وہی حیثیت رکھتے تھے، جو شرفیوں کے زمانہ میں قاضی دولت آبادی کی تھی، پورب مولانا اللہ داد کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں سے معمور ہو رہا تھا، جون پور کے محلہ رضوی خاں میں مولانا کی درس گاہ تھی، مگر اب نشان تک نہیں، ان کے صاحب زادے شیخ بھکاری جون پوری تھے، سلطان سکندر کا عہد پایا تھا۔

۱۔ دیباچہ اخبار الاخبار، شیخ دہلوی، ص ۹ مطبوعہ احمدی مطبع دہلی، ۱۳۰۰ھ ۲۔ یہ تلبہ ملتان میں ایک گاؤں تھا۔

۳۔ تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی ص ۵ ایضاً ۵ ایضاً۔

سکندر لودی کے زمانہ میں عرب سے ایک اور خطر طریقت کا ورود ہندوستان میں ہوا، یہ سید رفیع الدین محدث شیرازی ہیں، یہ معقولات میں محقق جلال الدین دوانی کے اور حدیث میں حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد تھے، ۹۵۴ھ میں وفات پائی، ان کی ذات معقول و منقول دونوں کا مرجع البحرین تھی۔

ان بزرگوں کے علاوہ پورب کی زمین اس زمانہ میں حسب معمول اکابر کے وجود سے فیض یاب تھی۔

۱- شیخ معروف چشتی جون پوری مرید مولانا الہ داد جون پوری۔

۲- شیخ دانیال جونپوری استاد سید محمد جون پوری۔

۳- شاہ تھن غازی پوری میر عدل غازی پور المتوفی ۹۰۵ھ۔

۴- سید محمد جون پوری المتوفی ۹۱۰ھ۔

۵- شیخ حسن بن طاہر بہاری جون پوری المتوفی ۹۰۹ھ دہلی میں مزار ہے۔

۶- شیخ محمد حسن بن شیخ حسن جون پوری المتوفی ۹۳۳ھ دہلی میں دفن ہوئے۔

۷- قاضی صلاح الدین ظلیل جون پوری، نبیرہ قاضی نظام الدین کیکلانی۔

تیموریوں کا زمانہ | ۹۳۲ھ سے تیموری سلاطین کا دور شروع ہوا، علم و فن نے ملک میں وسعت پائی، سلاطین اور امرا کی قدر دانی نے ہر جگہ علم کے بازار کو رونق پر رونق دی، اس عہد میں سید عبدالاول جون پوری ذکر کے قابل ہیں، جو شاید ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی، قاضی صلاح الدین ظلیل کے شاگرد تھے اور غالباً حدیث کا فیض گجرات اور عرب کے سفر سے لائے، بیرم خان خانان کی دعوت پر دہلی آئے اور آخر وہیں کی خاک ان کی ابدی خواب گاہ ہوئی، ۹۶۸ھ وفات کی تاریخ ہے۔

دوسرے بزرگ ملا یوسف مشہور بہ قاضی خاں ظفر آبادی ہیں، شیخ حسن بن طاہر سے فیض علم پایا، ہمایوں نے ہر چند چاہا کہ وہ اس کی نذر قبول فرمائیں، مگر دست قاعدت شرمندہ احسان نہ ہوسکا، ۹۷۷ھ وفات کا سال ہے۔

۱۔ تجلی نور، ص ۴۳۔

تیوری عہد کا شباب شاہ جہاں کا زمانہ ہے، پورب کی سرزمین اس زمانہ میں علم و فن کے ستاروں کی کثرت سے آسمان بنی ہوئی تھی، ان ستاروں میں آفتاب کی حیثیت استاد الملک ملاح محمد افضل جون پوری کو حاصل تھی، ان کے پدر بزرگ وارد مادند سے چل کر ہندوستان آئے اور ہندوستان میں بھی یہ سعادت نطفہ پورب کو حاصل ہوئی، وہ رودولی میں مفتی مقرر ہوئے، ۷۹ھ میں یہیں ملاح محمد افضل کی پیدائش ہوئی، اپنے والد ماجد سے ابتدائی کتابیں پڑھ کر پچھتم کا رخ کیا، دہلی پہنچ کر ملا شیخ حسین شاہ کر، ملا طاہر لاہوری سے فن کی کتابیں پڑھیں اور حدیث کا درس ملا ابوحنیفہ شاگرد مخدوم الملک و حکیم علی گیلانی سے لیا، علوم و فنون کی تکمیل کے بعد جون پور کو اپنے فیض و برکات کا مرکز بنایا، اس درس گاہ کے فیض نے جون پور کو دارالعلم بنا دیا اور شاہ جہاں کی زبان سے وہ فقرہ کہلوادیا جو اب تک یادگار رہے گا،

”پورب شیراز ماست“

اس مطلع علم سے جو علمائے وقت چمکے ان میں دو آفتاب و ماہتاب ایسے ہیں جن کے علم کی روشنی کبھی ماند نہ ہوگی، ایک دیوان عبدالرشید المتونی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملاح محمد جون پوری المتونی ۱۰۶۲ھ، استاد اکثر کہا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد دو ایسے علمائے وقت کبھی اکٹھا نہیں ہوئے، دیوان عبدالرشید وہ ہیں جنہوں نے فن مناظرہ میں رشیدیہ لکھی جو ہمارے نصاب درس میں داخل ہے، شاہ جہاں کے بار بار اصرار پر بھی خلوت خانہ قناعت سے باہر قدم نہیں رکھا، ملاح محمد نے دنیا کو فلسفہ میں شمس بازنہ اور بلاغت میں فراند جیسی کتابیں دیں، پہلے شاہ جہاں کے دربار میں تھے، پھر ایک درد لیش (ملا میر لاہوری) کا طعنہ سن کر جون پور میں درس گاہ جما کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے۔

استاد الملک کے دوسرے شاگرد ملاح ضیاء الدین محدث شیخ چندین محدث اور ملا شیخ احمد زین زاہد المتونی ۹۶۳ھ ہیں، استاد الملک کی نسبی نسل آگے نہیں چلی، البتہ ان کے بھائی شیخ محمودان کے بیٹے شیخ خاندان کے بیٹے ملاح محمد یوسف، ان کے پوتے شیخ احمد اور ان کے بیٹے قاضی سلطان قلی خاں، قاضی کوڑہ جہاں آباد وغیرہ ایک دوسرے کے بعد دیے سے دیا جلاتے رہے۔

عہد شاہ جہانی و عالم گیری میں قاضی محمد حسین جون پوری (جو فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین میں سے ایک ہیں) ملاح محمد ثانی جون پوری شاگرد دانش مند خاں، شیخ محمد ماہ جون پوری، شیخ شمس الدین جون پوری،

۱۔ تجلی نور، ص ۴۹ ۲۔ ایضاً، ص ۵۲۔

ملانور الدین جون پوری اور آخری دور میں ملا باب اللہ جون پوری، شیخ محمد افضل سید پوری (غازی پوری) الہ آبادی علم و فن کے نام و درماں روا گزرے۔

عالم گیر کے زمانہ میں سہانی کا آفتاب بلند ہوا، یعنی ملا قطب الدین، ملا نظام الدین، ملا کمال الدین اور ان کے اساتذہ اور معاصرین شیخ محبت اللہ صدر پوری الہ آبادی، قاضی آصف صدر پوری الہ آبادی، ملا حمد اللہ سندیلوی، ملا امان اللہ بنارس، ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا محبت اللہ بہاری وغیرہ ممتاز ہوئے جن کے بدولت اودھ کے حدود سے لے کر بہار کی اخیر سرحد تک علم و فن اور فضل و کمال کی بہار پُربہارتھی۔

غرض اس وقت شاہ جہاں اور عالم گیر کی فیاضی اور علمی قدر دانی کے بدولت قصبہ قصبہ اور دیہات دیہات تک میں علما اور مدرسین پھیلے تھے، بادشاہوں کی طرف سے ان کو جاگیریں اور معافیاں ملی تھیں، جس کے سبب سے وہ بے نیاز ہو کر علم و فن کی خدمت میں لگے تھے، ان میں کچھ ایسے مستغنی بھی تھے، جنہوں نے یہ درد سر نہیں خریدا اور اپنا سارا کاروبار خدا کے لیے کرتے رہے، اس زمانہ میں اور اس کے بعد جب جگہ جگہ نوابیاں قائم ہو گئی تھیں، پورب کے جو قصبے اپنی مردم خیزی میں نام ور ہوئے، ان کے نام ترتیب سے یہ ہیں، بدایوں، امر وہہ، سنہیل، مراد آباد، رام پور، بریلی، شاہ جہاں پور، فرخ آباد، قنوج، شمس آباد، سندیلہ، بلگرام، خیر آباد، صدر پور، بلج آباد، کاکوری، نصیر آباد، (رائے بریلی) دلمکو، نالک پور، سلون، الہ آباد اور خاص پورب میں جون پور، غازی پور، سید پور، گھوسی، بھیرا، چریاکوٹ، شمس پور، متو پور وغیرہ۔

جون پور کے مدرسے | ملک العلما شہاب الدین دولت آبادی کے عہد سے لے کر اخیر زمانہ تک جون پور میں جو درس گاہیں علمائے مدرسین کے زیر اہتمام عہد بہ عہد قائم ہوتی رہیں، ریاض جون پور کے مصنف نے اپنی کتاب کے آخر میں حسب ذیل فہرست دی ہے اور لکھا ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ تک وہ قائم تھیں۔

۱- مدرسہ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی ۳- مدرسہ ملا عبد الباقی

المتوفی ۸۳۹ھ ۵- مدرسہ ملانور الدین

۲- مدرسہ مولانا الہ داد المتوفی ۹۲۳ھ ۶- مدرسہ مفتی سید مبارک

۳- مدرسہ ملا محمود صاحب شمس بازغہ المتوفی ۱۰۶۲ھ ۷- مدرسہ ملا محمد حفیظ

۱۔ مولفہ سید محمد مہدی جون پوری، مطبوعہ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۱ء۔

- ۸- مدرسہ ملا شیخ حامد
۹- مدرسہ ملا شیخ محمد ماہ
۱۰- مدرسہ ملا معمر، اکبر سے محمد شاہ تک
۱۱- مدرسہ ملا محمد اعلیٰ، اکبر سے محمد شاہ تک
تجلی نور تاریخ جون پور کی تلاش سے چند مدرسوں کے نام اور معلوم ہوئے ہیں:
- ۱۲- مدرسہ میر محمد بلج
۱۳- مدرسہ ملا صدر جہاں ۱۱۹۰ھ
۱۴- مدرسہ ملا شمس الدین ۱۱۹۰ھ
۱۵- مدرسہ حافظ غلام شاہ
۱۶- مدرسہ میر محمد عسکری، ۱۱۱۹ھ
۱۷- مدرسہ مولوی ثناء اللہ
۱۸- مدرسہ مولوی عطاء اللہ
۱۹- مدرسہ سید ضیاء الدین خاں
۲۰- مدرسہ معین الدین حکاک
۲۱- مدرسہ استاد الملک المتوفی ۱۰۶۲ھ
۲۲- مدرسہ شیخ زکین الدین المتوفی ۱۱۲۱ھ
۲۳- مدرسہ ملا عبد الباری خضریٰ ۱۰۳۶ھ
۲۴- مدرسہ خانقاہ مداریہ، ملا مداری المتوفی ۱۰۷۶ھ
۲۵- مدرسہ ملا شمس پور المتوفی ۱۰۴۷ھ
۲۶- مدرسہ ملا شیخ محمد صادق المتوفی ۱۰۷۳ھ
۲۷- مدرسہ ملا خلیل المتوفی ۱۰۷۹ھ
۲۸- مدرسہ ملا باب اللہ
۲۹- مدرسہ ملا جمیل المتوفی ۱۱۲۳ھ

اودھ کی نوابی کا زمانہ | تیموریوں کے اخیر دور میں لکھنؤ میں شیوخ نے طاقت پائی تھی، عالم گیر کے زمانہ میں فدائی خاں یہاں کے حاکم تھے، ان کے بعد شیوخ میں سے نواب ابوالکارم خاں نے جن کے نام سے لکھنؤ میں مکارم نگر کا محلہ آباد ہے، لکھنؤ کی حکومت پائی، مگر عایان کی سخت گیری سے چیخ اٹھی، یہی وہ وقت ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ میں برہان الملک سعادت خاں (المتوفی ۱۱۵۱ھ نے) ۱۱۳۶ھ میں اودھ کی

۱۔ نوابان اودھ کا سلسلہ حکومت یہ ہے:

- ۱- برہان الملک سعادت خاں ۱۱۳۶ھ-۱۱۵۴ھ
۲- ابوالمنصور خان صفدر جنگ ۱۱۵۴ھ-۱۱۶۷ھ
۳- نواب شجاع الدولہ ۱۱۶۷ھ-۱۱۸۸ھ
۴- آصف الدولہ بیکھی خاں ۱۱۸۸ھ-۱۲۱۲ھ
۵- نواب سعادت علی خاں ۱۲۱۲ھ-۱۲۲۹ھ
۶- نواب غازی الدین حیدر ۱۸۱۳ء-۱۸۲۴ء
۷- نصیر الدین حیدر ۱۸۲۴ء-۱۸۳۳ء
۸- محمد علی شاہ ۱۸۳۳ء-۱۸۳۷ء
۹- امجد علی شاہ ۱۸۳۷ء-۱۸۴۳ء
۱۰- واجد علی شاہ ۱۸۴۳ء-۱۸۵۹ء

صوبہ داری پائی، وہ مذہباً شیعہ تھا، اس نے اپنے صوبہ میں بہت سے علمی خاندانوں کی جاگیریں، معافیاں اور وظیفے ضبط کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خاندان جو درس و تدریس اور علم کی اشاعت میں مصروف تھے، نوکری اور سپاہ گری کی خدمت پر مجبور ہوئے، برہان الملک کے بعد اس کا بھانجا اور داماد صفدر جنگ صوبہ دار ہوا، ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کا صوبہ بھی اسی کے سپرد ہوا، جس میں جون پور وغیرہ قصبات داخل تھے، نواب نے یہاں کے علما اور شرفا کی جاگیریں اور معافیاں بھی ضبط کیں اور اہل علم کے خاندان تباہ حال ہو گئے، میر آزاد بلگرامی، آثر الکرام میں لکھتے ہیں ”برمتقتان این اوراق و حقائق جو بیانِ انفس و آفاق جلوہ پیر اباد کہ سرزمین پورب از قدیم الایام معدن علم و علماست سید محمد کرمانی صاحب سیرالاولیا کہ مرید سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی است قدس سرہ می گوید کہ مولانا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ بود، مولانا علماء الدین نیلی اودی پیش شیخ الاسلام قاری کشاف بود، مولانا شمس الدین تکی و دیگر علمائے اودھ سماح بودند“ ترجمہ مولانا شمس الدین تکی در اوائل این فصل گذشت اگرچہ جمع صوبہ جات ہندیہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند، سیما حصار پائے تختِ خلافت کہ بہ واسطہ مرجعیت صاحب کمالات ہر قسم در آنجا فراہمی آید، و از تراکم افکار و اجتماع عقول اہل ہر عصر کمالاتِ نفسِ ناطقہ را چہ علم عقلی و نقلی چہ غیر آں بہ پایہ بالاتر می رسانند، اما صوبہ اودھ والد آباد خصوصیت دارد کہ در بیچ صوبہ نہ تو اہل یافت، چہ تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ بیخ کردہ نہایت دہ کردہ تخمیناً آبادی شرفا و نجاست کہ از سلاطین و حکام و وظائف و زمین مدد معاش داشته اند، و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسانِ عطر در ہر جا ابواب علم بہ روئے دانش پڑوہاں کشادہ، و صلای اطلبوا العلم در دادہ و طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند، و ہر جا موافقت دست بہم دادہ بہ تحصیل مشغول می شوند، و صاحب توفیقاں ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ می دارند و خدمت این جماعت را سعادتِ عظمی می دانند، صاحبقران ثانی شاہ جہاں انار اللہ بر ہانہ می گفت ”پورب شیراز مملکت ما است“ و تا حدود ۱۱۳۰ھ ثلاثین و مایہ و الف ہنگام علم و علماء درین گل زمین گرمی داشت“ تا آنکہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اودھ شد، و اکثر بلا عمدہ صوبہ الہ آباد نیز مثل دارالخو رجون پور و بنارس و غازی پور و کٹرہ مانک پور و کوڑہ جہاں آباد وغیر ہا ضمیمہ حکومت گردید و وظائف و سیور غالات خانواد ہائے قدیم و جدید یک قلم ضبط شد، و کار شرفاء و نجبابہ پریشانی کشید، و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم با

زداشتہ در پیشہ سپاہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل باں درجہ نہ ماند، مدار سے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمن ہائے ارباب کمال بیشتر بر ہم خورد اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ و بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادہ او ابوالمصور خاں صفدر جنگ رسید و ظائف و اقطاعت بہ دستور زیر ضبط ماند و در او آخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ تسخیر و ختمین و مایہ و الف صوبہ داری، الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد و تتمہ وظائف آں صوبہ کہ تا حال از آفتِ ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط در آمد و در عہد احمد شاہ صفدر جنگ، بہ پایہ وزارت اعلیٰ صعود نمود، و نائب صوبہ کار بر ارباب و ظائف تنگ و تر گرفت، و تا جنین تحریر کتاب این دیار یا مالِ حوادث روزگار است، لَعَلَّ اللّٰہُ یُحَدِّثَ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا، با وجود این خرابیہا رواج علم خصوص معقولات بہ کیفیتی کہ آنجاں است در قلمرو ہندوستان پیچ جانیت، ہنوز علمائے فحول جلوہ طرازند، و بہ وصول اقصی مراتب کمال ممتاز مصرع

”با صد جہاں کدورت باز این خرابہ جائے است“ (آثار الکرام آزا صفحہ ۲۲۱)

بنگالی مورخ مشرلاً اپنی کتاب ”ترقی تعلیم ہند بہ عہد مسلمانان“ میں لکھتا ہے:

”تذکرۃ العلماء اور سیر الملوک میں جن کے اقتباسات تذکرہ میں موجود ہیں، اس شہر کے متعلق

دل چسپ تفصیلات ہیں، جن سے نہ صرف وہاں کے علماء اور طلبہ کی نجی زندگی، بلکہ دوسرے حالات پر بھی

- کافی روشنی پڑتی ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے اس شہر کی بنیاد ڈالی گئی، ہندوستان کے تمام حصے

خصوصاً صوبہ اودھ اور الہ آباد کے لوگ یہاں تحصیل علم کے لیے جمع ہوتے تھے، سلطان ابراہیم شرقی کے

عہد میں یہ شہر اس کا پایہ تخت ہوا، اس وقت یہاں سیکڑوں مدرسے اور مسجدیں تھیں، طلبہ اور اساتذہ کو

جاگیریں ملتی تھیں تاکہ وہ تمام مادی ضرورتوں سے بے فکر ہو کر علم و فن میں مشغول رہیں، ہمایوں کی حکومت

میں بھی جون پور علم و فن کے مرکزی حیثیت سے مشہور رہا، اس کی شہرت جہاں گیر اور شاہ جہاں کے زمانہ

میں بھی قائم رہی، شاہ جہاں نے تو اس کو شیرازہ ہند کا نام عطا کیا، بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد

تک یہ دستور تھا کہ دہلی کے فرمان رواں جون پور کے حاکم کے پاس برابر فرامین بھیجا کرتے تھے کہ وہ شہر کے

اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں، جون پور کے واقعہ نگار ہر مدرسہ کی

روداد احتیاط سے مرتب کیا کرتے تھے، اگر روداد سے کسی مدرسہ کی کوئی احتیاج معلوم ہوتی تو امداد دی

جاتی، شہزادے اور امرا جب اس شہر سے گزرتے تو یہاں کے مدرسوں کا معائنہ کرتے اور مسلمانین دہلی کو

خوش کرنے کے لیے ان کو عطیے دیتے، ۱۱۲ھ/۳۵ء میں نواب سعادت خاں نیشاپوری اودھ، بنارس اور جون پور کا صوبہ دار مقرر ہوا، ایک بار وہ اس شہر میں آیا، لیکن یہاں کے علماء اس سے ملنے نہیں آئے، جس سے اس نے اپنی اہانت محسوس کی، انتقاماً اُس نے ان کی تمام جاگیریں اور وظائف ضبط کر لینے کا حکم جاری کر دیا، حکم کی تعمیل ہوئی، جس کے بعد جون پور پر اوبار آ گیا، طلبہ اور اساتذہ منتشر اور مدرسے خالی ہو گئے، ۱۱۵ھ (۱۷۷۳ء) میں نواب آصف الدولہ نے مختار الدولہ کی مرضی کے مطابق ان جاگیروں کو واپس کرنے کا حکم دیا، لیکن پانچ خاں نے احتجاج کیا، اسی زمانہ میں جون پور انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔ (پرموشن آف مڈن ارننگ ازان، ان لا ۳-۱۰۲۰۳)

اس کے بعد ارکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے حوالہ سے وہ کہتا ہے:

”دارن ڈیپٹیگنر نے شاید اس شہر کا معائنہ کیا تھا، سرائیکوٹ تو اس شہر میں ضرور آیا، ۱۸۷۸ء میں ڈکن کی آمد کا ذکر روداد (PROCEEDINGS) کی ان جلدوں میں موجود ہیں، جو بنارس کے کلکٹر اور کمشنر کے کاغذات کی الماریوں میں سڑگل رہی ہیں، وہ اس شہر کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتا ہے، اس کے زوال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا مرکز اور اربابِ علم مستقر تھا، اسی لیے اُس کو ہندوستان کا شیراز کہتے تھے۔“

یہاں کے مدارس کی گزشتہ شہرت کے قصوں کے سوا اور کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے، لیکن مسٹر ڈکن کے مذکورہ بالا بیان کے علاوہ اور بھی بہتر اسباب موجود ہیں، جس کی بنا پر ہم اس شہر کو ہندوستان کا شیراز یا ازمندہ وسطیٰ کا پیرس کہہ سکتے ہیں، فیروز شاہ نے اپنے بھائی کی شہرت اور عظمت کے مطابق اس کو علوم و فنون کا مرکز بنانا چاہا، جون پور کے ہر حکم راں نے فنون کی سرپرستی کرنا اپنے لیے باعث افتخار سمجھا، چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں شاہی پایہ تخت میں جب ہنگامے شروع ہوئے، تو شہر کے علماء اور فضلا منتشر ہو گئے، اسی زمانہ میں جون پور کی پُرامن اور ہر سکون فضا میں علوم و فنون کا فروغ ہوا، محمد شاہ کے عہد میں بھی جون پور میں مشہور مدارس تھے، اب ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں، ان مدارس میں سے ایک کے بانی کا انتقال پندرہویں صدی کے وسط میں اور دوسرے کا سترہویں صدی کے وسط میں ہوا، یہاں صرف مدارس کے علوم ہی کا فروغ نہیں ہوا، بلکہ ابراہیم اور حسین کی مساجد فن تعمیر کی ترقی کی بھی شہادت دیتی ہیں۔ (ارکیولوجیکل سروے آف انڈیا، جلد اول (جون پور کی شرقی تعمیرات) از فہر (۱۸۸۹ء ص ۲۲، ۲۱)

بہر حال ان سیاسی و مذہبی حوادث کے طوفان میں بھی علم و فضل کی وہ شمعیں روشن رہیں جن کی روشنی شاہانہ عنایتوں کے چشمہ نور سے مستعار نہ تھی، اس زمانہ میں پورب کا خطہ اور خصوصیت کے ساتھ جون پور اور غازی پور کے اطراف میں ایسی ممتاز ہستیاں تھیں، جن کے بوریا نئے فخر کی بلندی مسندِ شاہی سے کم نہ تھی، جیسے مولانا محمد احسن چریاکوٹی شاگرد ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہ ابوالغوث گرم دیوان ساکن بھیرا (اعظم گڑھ) المتوفی ۱۷۸۸ھ و مولانا شاہ محمد علی بھیروی نبیرہ شاہ ابوالغوث گرم دیوان (اعظم گڑھ) شاگرد ملا بحر العلوم، ملا باب اللہ جون پوری شاگرد ملا احمد اللہ سندیلوی، شاہ ثار علی جون پوری المتوفی ۱۲۱۵ھ شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی، مولوی کرامت اللہ چریاکوٹی شاگرد میر عسکری جون پوری و ملا احمد اللہ سندیلوی، شاہ محمد افضل غازی پوری الہ آبادی، المتوفی ۱۱۲۳ھ، ملا محمد ماہ دیوگامی (اعظم گڑھ) شاگرد ملا رکن الدین بہریا بادی و دیوان عبدالرشید جون پوری، قاضی خوب اللہ جون پوری المتوفی ۱۱۰۰ھ، قاضی حسن سعید خاں جون پوری المتوفی ۱۱۵۵ھ، مولانا میر محمد عسکری شیعہ المتوفی ۱۱۱۹ھ، مولوی عبدالقادر سوگھر پوری، اعظم گڑھ، المتوفی ۱۲۱۲ھ، مولانا غلام حسین جون پوری مصنف جامع بہادر خانی المتوفی ۱۲۰۵ھ، ملا ابوالخیر بن قاضی ثناء اللہ (ساکن اٹاواہ پرگنہ منڈیاہو، ضلع جون پور) وغیرہ

دلی کے آخری خانوادہ علم کا اثر پورب پر | آخری زمانہ میں جب دلی میں تیوریوں کا چراغ گل ہو رہا تھا، رشد و ہدایت کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا، جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھا اور دلوں میں علم و فن کی خدمت کا نیا ولولہ پیدا ہوا، دلی کے خانوادہ میں اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۱۷۶ھ کے صاحب زادہ شاہ عبدالعزیز صاحب المتوفی ۱۲۳۹ھ اور ان کے بھائیوں اور عزیزوں کا دور تھا، دور دور سے طلبہ دلی آتے تھے اور عقل اور نقل کے چشموں سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب کا خانوادہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے ذریعہ معقولات میں میرزا بہرہ ہروی کا اور حدیث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے واسطے سے مدینہ منورہ کے علما اور محدثین سے فیض یاب تھا اور مرج البحرین کا یہی رنگ نکھر کر ان کے اخلاف میں نمایاں تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب ۱۲۳۲ھ، شاہ رفیع الدین صاحب ۱۲۳۹ھ، شاہ عبدالغنی صاحب اور ان کے اخلاف میں شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ۱۲۶۲ھ نواسہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور مجددی خاندان کے ایک اور بزرگ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کے دم سے نئی رونق پیدا ہوئی، اور وقت آیا کہ ہندوستان میں اسلام کا چہرہ ان

تمام بدعات و خرافات کے داغ سے پاک ہو جو جہالت اور غیر قوموں کے میل جول سے پیدا ہو گیا تھا، تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں شاہ صاحب کے خاندان میں دو نئے مجتہد الوقت پیدا ہوئے، مولانا اسماعیل صاحب شہید دہلوی (۱۲۴۳ھ) اور مولانا عبدالحی صاحب دہلوی، مولانا شاہ اسماعیل شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے اور شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے تھے، اور شاہ عبدالحی صاحب المتوفی ۱۲۴۳ھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد اور امام الزماں مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی کے مرید اور داعی تھے۔

اس دو آتھہ تحریک نے جو عوام میں وہابیت کے نام سے مشہور ہے، مسلمانوں میں مراسم شرک، غیر شرعی رسم و رواج اور بدعات کے مٹانے میں بڑا کام کیا، ان بزرگوں کے شاگرد اور شاگرد کے شاگرد سارے ملک میں پھیل رہے تھے، جس سے پورب کا خطہ خاص طور سے متاثر تھا، خاص جون پور اور اس کے اطراف میں متعدد بزرگ اس نیک کام میں لگے ہوئے تھے۔

۱- مولوی سید کرامت علی جون پوری نے اپنے لیے بنگال کے علاقہ کو پسند کیا اور یہ کہنا بے جا نہیں کہ بنگال میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح کا کام ان سے بڑھ کر کسی نے انجام نہیں دیا، اروفقہ میں مفتاح الجزیہ ان کی مشہور کتاب ہے، ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی، اس خاندان کے اخلاف نسلاً بعد نسل اب تک اس فرض کو کسی نہ کسی طرح انجام دے رہے ہیں۔

۲- مولانا محمد فصیح صاحب غازی پوری جو شاہ افضل سید پوری غازی پوری الہ آبادی کے پڑپوتے تھے، بنارس میں حضرت سید احمد صاحب بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا، بہار، بنارس اور اعظم گڑھ وغیرہ میں ان کے ذریعہ دین کی خدمت ہوئی، ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی، شاہ امانت اللہ صاحب یحییٰ غازی پوری، ان کے بیٹے اور شاہ ابوالخیر صاحب یحییٰ غازی پوری ان کے پوتے تھے۔

۳- مولانا سخاوت علی صاحب جون پوری، منڈیا ہو ضلع جون پور کے رہنے والے تھے، حضرت شیخ محمد کونی ظفر آبادی کی اولاد میں تھے، مولانا فضل رسول صاحب بدایونی اور مولانا احمد اللہ انامی شاگرد مولانا شاہ اسحاق دہلوی اور دوسرے بزرگوں سے پڑھا اور آخر مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی صاحب دہلوی سے علوم کی تکمیل کی کچھ دنوں باندہ میں نواب باندہ کے ہاں رہے، آخر جون پور

آکر طرحِ اقامت ڈالی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، کچھ دنوں کے بعد جاز تشریف لے گئے اور وہیں حج و زیارت کے بعد ۱۲ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذاتِ بابرکات سے پورب کے خطہ میں بڑا فیض پھیلا یا، سینکڑوں علما آپ کے درس سے کامل ہو کر نکلے اور دور دور تک دین کے اثر کو وسیع کیا، بدعات کو مٹایا اور علمِ دین کو رواج بخشا، اس بابرکت فیض سے اعظم گڑھ کے اس طبقہ میں بھی جس میں اب تک عربی اور مذہبی تعلیم کا رواج نہ تھا (یعنی اعظم گڑھ کی نو مسلم برادری) عربی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اور آپ ہی کی تحریک سے جون پور میں منشی امام بخش صاحب نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

ان کے مشاہیر تلامذہ میں حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں، مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا رجب علی جون پوری، مولانا کر امت علی جون پوری، مولانا شیخ محمد مچھلی شہری، مولانا سید محمد یعقوب دیسوی بہاری، مولانا مصطفیٰ شیر بہاری، مدرس مدرسہ خانقاہ سہرام، مولانا شجاعت حسین بہاری، مولانا ولی محمد صاحب سکوری (اعظم گڑھ) مولانا محمد عمر غازی پوری، مولانا فیض اللہ منوی اعظم گڑھی، (استاذ مولانا شبلی مرحوم) مولانا رحیم اللہ ساکن بہتی وغیرہ۔

اہل حدیث اور خالص حنفی | دہلی کے اس خانوادہ کے فیضِ تعلیم سے دواہم سلسلے چلتے ہیں، ہندوستان میں اب تک ترکستان و خراسان کے اثر سے صرف فقہ حنفی کا رواج تھا، عرب سے خال خال شافعی آتے تھے، مگر ان کا اثر سواہل تک محدود تھا، اکبر اور جہاں گیر کے زمانہ میں جب سمندر کی طرف سے عربوں کی آمد و رفت کا دروازہ کھلا تو ہندوستان اور عرب میں علمی تعلقات کا آغاز ہوا، چنانچہ شیخ بہلول حضرت مجدد الف ثانی کے شیخ الحدیث اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس فیض کو وہیں سے لائے، اس سے حنفیت کے غلو کے ساتھ حدیث و سنت کی پیروی کا خیال دلوں میں پیدا ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے جب عرب کا سفر کیا اور مختلف مذاہب کے علما سے فیض پایا تو ان کا مشرب زیادہ وسیع ہو گیا، علما گو حنفی ہی رہے، مگر نظری اور علمی حیثیت سے وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، اس شان کا علانیہ جلوہ ان کی مسؤی و مصفیٰ شروح موطا میں نظر آتا ہے، بانگی پور کے مشہور کتب خانہ میں صحیح بخاری کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس پر شاہ صاحب کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے، جس میں انہوں نے اپنے کو علما حنفی اور علما

۱۔ یہ خاک سار کے دادا کے بھائی تھے۔ ۲۔ زبدۃ القامات۔

و تدریسا حنفی و شافعی لکھا ہے، اور اپنی بعض تالیفات میں قرأت فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کو ترجیح دی ہے، جو فقہ حنفی کے خلاف ہے۔

شاہ صاحب کے بعد یہ رنگ اور نکھر گیا، مولانا شاہ اسحاق صاحب، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، مولانا شاہ اسماعیل صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب دہلوی نے ردّ بدعت اور توحید خالص کی اشاعت میں جو جد و جہد فرمائی، اس نے دلوں میں سنت کی پیروی کا عقیدہ راسخ کر دیا، ان کے شاگردوں میں یہ دونوں رنگ الگ الگ ہو گئے، شاہ اسحاق صاحب کے نام ور شاگردوں میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر اور مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری ہیں، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے ممتاز شاگرد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ (بانی مدرسہ دیوبند) ہیں اور پورب میں مولانا شاہ اسماعیل صاحب کے شاگرد مولانا سخاوت علی جون پوری وغیرہ ہیں، اس سلسلہ میں ردّ بدعت اور توحید خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا، مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ایک دوسرے شاگرد مولانا سید نذیر حسین صاحب بہاری دہلوی ہیں، اس دوسرے سلسلہ میں توحید خالص اور ردّ بدعت کے ساتھ حنفی کی تقلید کے بہ جائے بہ راہ راست کتب حدیث سے بہ قدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا اور اسی سلسلہ کا نام اہل حدیث مشہور ہوا۔

۱۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی اہل حدیث و احناف میں ماہہ النزاع بن گیا ہے، احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازہ حاصل تھا، اور اہل حدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں، مجھے نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا، جس میں یہ تصریح مذکور ہے کہ ۱۲۳۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے، عبارت یہ ہے، ”دوڑھے میں سال (سید الف و ماتین و تسع و اربعین) حدیث شریف از مولانا محمد اسحاق مرحوم و منقول شروع فرمودند و صحیح بخاری و صحیح مسلم بہ شراکت مولوی محمد گل کابلی و مولوی عبید اللہ سندھی و مولوی نور اللہ سروانی و حافظ محمد فاضل سورتی و غیر ہم حرفا حرفا خواندند و ہدایہ و جامع صغیر بہ معیت مولوی بہاء الدین دکنی وجد امجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی و نواب قطب الدین خاں دہلوی و قاری اکرام اللہ وغیر ہم، کنز العمال ملا علی مرتضیٰ علیحدہ شراخ فرمودند و دوسرے جز خواندند و سنن ابی داؤد و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و موطا امام مالک تمامہ بر مولانا محمود عرض نمودند و اجازۃ از شیخ افاق حاصل نمودہ، البتہ شاہ صاحب سے سند و اجازت تحریری انہوں نے ۲۱ شوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی ہے، جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز جا رہے تھے۔

تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی قدیم روش پر قائم رہا اور اپنے کو اہل السنۃ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علمائے تھے۔

مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ سے اہل حدیث کے سلسلہ کو بڑی ترقی ہوئی، موصوف کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا، انہوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اپنے طریقہ کی اشاعت کی، ان کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں، پنجاب میں مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا محمد حسین بنالوی اور مولانا عبدالمنان وزیر آبادی وغیرہ پورب کے خطہ میں مولانا امیر حسن سہوانی، مولانا بشیر صاحب قنوجی، مولانا عبداللہ صاحب مٹھی غازی پوری، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی عظیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی (درجہ گنگہ) مولانا سلامت اللہ صاحب جیراچپوری، عظیم گڑھی، عظیم گڑھ کے ضلع پر خصوصیت کے ساتھ مولانا فیض اللہ صاحب مٹھی شاگرد مولانا سخاوت علی صاحب جون پوری، مولانا عبداللہ غازی پوری اور مولانا سلامت اللہ جیراچ پوری کا زیادہ اثر پڑا، ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ان تینوں فریقوں میں مدتوں مناظرہ کا بازار گرم رہا، یہی وہ مذہبی ماحول ہے جس میں مولانا شبلی مرحوم کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ پورب کے دو نئے مدرسے انگریزی عہد میں جب انگریزی عمل داری شروع ہوئی تو پورب میں پھر سے نئے مدرسوں کی بنیاد پڑی، جن میں سے بعض بعض نے بڑی شہرت پائی، ان میں سے دو ذکر کے قابل ہیں، مدرسہ اسلامیہ امام بخش جون پور، اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور۔

مدرسہ اسلامیہ امام بخش جون پور | جون پور میں منشی امام بخش ایک رئیس تھے، انگریزوں کی شروع عمل داری میں جب سررشتہ داری بڑی اہمیت رکھتی تھی، وہ غازی پور میں فوج داری کے سررشتہ دار تھے، اس سے بڑی نیک نامی اور دولت پیدا کی، مولانا سخاوت علی صاحب کی تحریک سے غالباً ۱۲۶۷ھ میں انہوں نے جون پور میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، ۱۲۷۸ھ میں انہوں نے اپنی تمام املاک کا چوتھائی حصہ وقف کر دیا اور بقیہ جائیداد اپنے بیٹے مولوی حیدر حسین صاحب وکیل ہائی کورٹ کے سپرد کر کے ہجرت کے قصد سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے، وہاں ایک ہی سال کے بعد ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی، ان ہی مولوی حیدر حسین کے فرزند و جانشین نواب عبدالجید خاں بیرسٹر مرحوم تھے، اور اب ان کے صاحب زادے اب سر محمد یوسف

۱۔ القول الجلی فی تذکرہ سخاوت علی۔

ہیں، مولوی حیدر حسین خاں نے اپنے والد کی وفات کے چودہ برس بعد ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا، مولوی حیدر حسین صاحب کے زمانہ میں پانچ سو ماہانہ مدرسہ کے مصارف کے لیے دیے جاتے تھے، مدرسہ میں دو مدرس تھے اور سو کے قریب طالب علم پڑھتے تھے۔

اس مدرسہ میں صدر مدرس کی خدمت کے لیے مولانا سخاوت علی صاحب نے ۱۲۶۷ھ میں فرنگی محل کے نام ور عالم مولانا عبدالعلیم صاحب فرنگی محلی کا انتخاب کیا جو باندہ میں مولانا کے ساتھ رہتے تھے، اور جنہوں نے بہت کچھ مولانا سے کسب فیض کیا تھا، موصوف نو برس تک یہاں مدرس رہے، مولانا عبدالحی صاحب مرحوم فرنگی محلی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں گزرا، ۱۲۷۶ھ میں مولانا عبدالعلیم صاحب لکھنؤ جا کر ۱۲۷۷ھ میں حیدر آباد گئے، اُن کی جگہ پر مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی جو مولانا عبدالعلیم صاحب کے استاد تھے، مدرسہ میں آئے، موصوف کے زمانہ میں مدرسہ کی دھوم دور دور بچنی اور لایق و مستعد طلبہ کا ہجوم ہوا، ان ہی میں مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی ہیں جنہوں نے بہین مفتی صاحب سے علوم و فنون کے سبق لئے اور مشہور روزگار ہوئے، مفتی صاحب نے چند روز کے بعد جاز کا سفر کیا اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی، موصوف کے حواشی بر ملا حسن و میرزا ہد کے چند نسخے دارالمصنفین میں ہیں، جن میں سے ایک پر مولانا عبدالعلیم صاحب فرنگی محلی کے دست خط بتاریخ ۱۲۷۳ھ ثبت ہیں۔

۱۔ مثنوی تذکرہ مہدی، ص ۹۵ جون پور ۲۔ ریاض جون پور، ص ۵۰۔ ۳۔ القول الجلی، فی تذکرہ مولانا سخاوت علی
۴۔ مولانا فاروق صاحب نے ۱۲۸۶ھ میں اپنے استاد کی مدح میں ایک مثنوی لکھی تھی اور ان کی خدمت میں پیش کی تھی، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

دل در شوق زلفش نالہ ساز است چہ می نالم غم زلفش دواز است
آگے چل کر ہے:

جناب استاد کعبہ جاہ دلیل راہ مردان حق آگاہ
چہ یوسف مصر متنی را عزیزے نیرزد ملک جم پیشش بہ چیزے
ادب گیرد بہ بتائش ارسطو بہ پیشش بو علی تہ کرد زانو

تاریخ علمائے ہند، ص ۲۰۹۔

اس مدرسہ کے آخری نام ورمدرس مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری شاگرد مولانا فضل حق خیر آبادی تھے، جن کے فضل وکمال کے آوازہ سے ابھی تک ہندوستان پر شور ہے، ۱۸۷۰ء میں مدرس ہوئے، ان کے لایق شاگردوں میں مولانا شیرعلی صاحب، مولانا احسن صاحب بہاری، مولانا سلیمان اشرف صاحب بہاری، مولانا لطف الرحمن صاحب بردوانی وغیرہ تھے، مولانا شبلی نے بھی چند روزان سے پڑھا تھا اور ان سے راہ و رسم رکھتے تھے، ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔

مولوی لطف الرحمن صاحب بردوانی ۱۸۵۲ء میں مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے تھے، جب یہ خیر مولانا شبلی کو معلوم ہوئی تو اپنے ایک شاگرد کو جو جون پور میں پڑھتا تھا اور جس نے یہ خبر دی تھی، لکھا ”از نامہ ات بحال مدرسہ دلم بہ درد آمد کہ سپہردوں لطف الرحمن وغیرہ را بہ کارِ تعلیم و تعلم گماشتہ است، آوخ از دست فلک کہ ہماں جائے از افادت مفتی محمد یوسف صاحب انکوں این شعر بر زبان حال وارد“

از ہجوم چند درویرانہ ما جانماند آنقدر آ باد شد آخر کہ مای خواستم

(۵ نومبر ۱۸۵۲ء)

مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور | فرنگی محل کے آسمان کا ایک ستارہ غازی پور میں طلوع ہوا، نام مولانا رحمت اللہ صاحب تھا، جو چار واسطوں سے ملّا قطب الدین سہالوی کے سلسلہ اولاد میں تھے، اپنے چچا ملّا ظہور اللہ سے تعلیم پا کر غازی پور میں قیام کیا اور چشمہ رحمت کے نام سے وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور درس و تدریس میں مصروف ہوئے، ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی، مشہور اردو شاعر شمشاد لکھنوی فرنگی محلی، التونی ۱۹۱۷ء میں اس مدرسہ کے استاد تھے، جن کا ذکر مکاتیب شبلی کے ایک نامہ فارسی میں ہے، اس مدرسہ کے دوسرے مشہور استاد مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری (شاگرد مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی و مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی و مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی و مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی) ہیں، ایک زمانہ میں اس مدرسہ کی بڑی دھوم تھی، پورب کے اچھے اچھے طلبہ نے یہاں پڑھ کر فراغ حاصل کیا اور فروغ پایا، مدرسہ اب تک چل رہا ہے، مگر اب اس کی شہرت اگلی سی نہیں۔

کہیں بولا جاتا ہے، امیر خسرو دہلوی قرآن السعدین میں کہتے ہیں ع رادتِ ثروپین زن و خارا شگاف (ص ۳۶ مطبوعہ علی گڑھ) مرہٹی میں رادت سوار سپاہی کو کہتے ہیں، اور وہ بہت سے خاندانوں کا سرنام ہے۔

اعظم گڑھ | گڈھ ہندی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری جز گڑھ ہے، ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا، یعنی کسی زمین داریاریس نے اپنے اور اپنی رعایا کے لیے کوئی گڑھ بنایا اور اس کو اپنے نام کی طرف منسوب کر دیا، اعظم گڑھ بھی اسی قسم کا شہر ہے، راجہ اعظم جن کے نام کی طرف یہ نسبت ہے، اعظم گڑھ کے مسلمان راج پوت راجاؤں میں سے تھے، اس راجہ کا خاندان یہاں اب بھی موجود ہے، اور اس کا قلعہ عرف عام میں کوٹ (قلعہ) کہلاتا ہے اور اس کے آس پاس کی آبادی کا نام محلہ کوٹ ہے۔

اعظم گڑھ کا بانی | روایت یہ ہے کہ جہاں گیر کے زمانہ میں اس خاندان کا مورث اعلیٰ آگرہ جا کر مسلمان ہو گیا، جہاں گیر نے اس کی بڑی قدر کی اور دولت خاں کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا اور چوبیس پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی، یہ ۲۴ پرگنوں سے زیادہ تر موجودہ اعظم گڑھ میں واقع تھے، تزک جہاں گیری کے سال چہارم میں دولت خاں نام ایک امیر کا ذکر موجود ہے، شہنشاہ لکھنؤ ہے ”دولت خاں بھوجداری صوبہ الہ آباد پر کارجون پور تعین یافتہ بود آمدہ ملازمت نمود بر منصب او کہ ہزاری بود پانصدی افزودہ شد“ (تزک جہاں گیری جشن ہفتہمیں نوروز)

اس خاندان میں ایک شاہی فرمان بہ طور یادگار باقی تھا، جس کی نقل شروع انگریزی عمل داری میں شامل مسل ہو کر ڈسٹرکٹ گز بیٹیر میں محفوظ ہے، اس فرمان کی اصل عبارت یہ ہے:

”دریں وقت مینت اقران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شدہ کہ اچھمن سگھ زمین دار مینگر، نظام آباد از بندہ مقبول بارگاہ والا جاہ بدیں اسلام در آمدہ نظر بر استحقاق بہ خطاب راجہ نادر دولت خاں ممتاز شدہ بست و دو پرگنہ از صوبہ الہ آباد ابتدا، نیسیاں خریف سقا توکیل حسب الضمن مرحمت فرمودیم باید کہ فرزندان نامدار کا مدار والا تار و زرائے ذوی الاقتدار و حکام کرام و عمال کفایت فرجام و متصدیان مہمات دیوانی و متکفلان معاملات سلطانی و جاگیر داران حال و استقبال ابدامو بدادر استنقرار و استرار این حکم مقدس و معلیٰ کوشیدہ بر زمین داری پرگنات بہ خطاب مذکورہ نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن خالدا و مخلصاً بحال و برقرار داشتہ بہ زربائے مشخص مال واجب سرکار مبلغ یک لک و بست و بیچ ہزار روپہہ ناکسار بر قبولیت

بجز دادہ باشند کہ مع سرحد و سر دیہہ وغیرہ ابواب زمین داری صرف معیشت خود پر و از دواز تصادم تغیر و تبدل
این امر مقدس مصون و محروس دانستہ سند مجدد نہ طلبند از رینج کرامت تبلیغ والا انحراف نہ دارند؛ (یازدہم شہر ربیع
الآخرہ چہارم جلوس فقط)

پشت پر ضمنی عبارت یہ ہے ”بر کتاب حسب ضمنی بست و دو پر گنہ نافکار یک لک ۲۵ ہزار پر گنہ
نظام آباد، پر گنہ کوڑیہ، پر گنہ تہنی، پر گنہ گوپال پور، پر گنہ سگودی، پر گنہ محمد آباد گوہنہ، پر گنہ گھوسی، پر گنہ
چکسیر، پر گنہ نقو پور، پر گنہ چریا کوٹ، پر گنہ قریات متھو پور، پر گنہ بلہا بانس، پر گنہ دیوگاؤں، پر گنہ مسو ناتھ
بھجن، پر گنہ شادی آباد، پر گنہ بہری آباد، پر گنہ چچوتر، پر گنہ سید پور بھتری، پر گنہ طہور آباد، پر گنہ بھو داؤں،
ابواب زمین داری ہی صدویک روپیہ۔“

یہ جن پر گنوں کے نام لکھے ہیں ان میں سے اکثر اب اعظم گڑھ میں اور کچھ غازی پور میں ہیں۔
راجہ دولت خاں مینہ نگر میں لا ولد فوت ہو گئے، وہیں ان کی قبر ہے، وہ اپنے بعد اپنے ہندو بھتیجے
ہرنس کور ریاست کا مالک بنا گئے تھے، آگے کے سلسلہ میں ایک نام ور کبرماجیت نامی ہوا جس نے پھر اسلام
قبول کیا، اس کے دو بیٹے ہوئے، اعظم خاں، اور عظمت خاں، اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڑھ کی بنیاد
ڈالی اور عظمت خاں نے اپنے نام سے عظمت گڑھ بسایا جو اب تک اسی نام سے اسی ضلع میں آباد ہے۔
جب سرکار جون پور میں اودھ کی نوابی قائم ہوئی تو اعظم گڑھ کے راجوں اور اودھ کے نوابوں
میں کئی دفعہ لڑائیاں ہوئیں۔

عظمت خاں کے بیٹے مہابت خاں بڑے دبدبہ کے راجہ ہوئے، مدھو بن پر گنہ گھوسی سے لے
کر پر گنہ اترولیا، ضلع گورکھپور تک ان کی حکومت قائم ہوئی، آخر نواب سعادت علی خاں سے لڑ کر گورکھپور
میں قید ہوئے، جہاں ۱۳۱۷ء میں وہ فوت ہو گئے، ان کے بیٹے ارادت خاں نے صفدر جنگ نواب
اودھ کے مقابلہ میں نواب احمد خاں بنگلش والی فرخ آباد کی مدد کی۔

۱۷۶۱ء میں ارادت خاں کی جگہ اس کا بیٹا جہان خاں ریاست کا مالک بنا، لیکن ارادت خاں
کے رہتے ہی جہان خاں کے چچا جہاں گیر خاں کے بیٹے اعظم خاں ثانی نے ریاست پر قبضہ کرنا چاہا اور
آخر ناکام رہ کر جون پور میں پناہ لی، جہاں خاں اور نواب اودھ کے عامل نظام آباد کے درمیان ۱۳۱۷ء
میں لڑائی ہوئی، جس میں دونوں مارے گئے، اور فضل علی خان حاکم غازی پور نے اس پر قبضہ کر لیا۔

محمد آباد گوہنہ (ضلع اعظم گڑھ) میں حضرت غلام فرید صاحب فاروقی ایک فاضل اجل اور خداریسید بزرگ تھے، جب فضل علی خاں نے اعظم گڑھ پر قبضہ کیا تو موصوف کو بڑی تمناؤں سے لکھا کہ آپ تشریف لائیں اور اس خطہ کی حکومت قبول فرمائیں، انہوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

بیچارہ خر آرزوے دُم کرد
نایافتہ دم دو گوش گم کرد

آخر فضل علی خاں تین برس کے بعد غازی پور اور اعظم گڑھ دونوں سے الگ کر دیے گئے۔

شجاع الدولہ نے جب ۱۷۶۳ء میں بکسر میں انگریزوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو اعظم خاں ثانی نے اپنی موروثی جائداد پر قبضہ کر لیا، یہ اعظم خاں ہندی کا شاعر تھا، ”سنگار در پن“ اس کی ہندی کی تصنیف ہے، ۱۷۶۷ء میں وفات پائی، اس کے درباری شاعر برجومصرانے اعظم خاں کی تعریف میں اعظم خانی ستاسائی لکھی، جس کے صلہ میں شاعر نے ۱۷۶۹ھ/۱۷۷۷ء میں راجہ کے بھائی جہاں یار خاں سے ۵۲ بیگہ زمین انعام میں پائی، اس کے کچھ دنوں کے بعد نواب اودھ کے وزیر ایلچ خاں نے اس علاقہ کو جہاں یار خاں سے چھین کر نوابی میں شامل کر لیا، اور یہ اودھ کی حکومت کا ایک چکلا (ضلع) بن گیا۔ نواب کی طرف سے ایک عامل رہنے لگا، نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں یہاں مرزا عطا بیگ خاں کابلی عامل تھے، لکھنؤ اور جون پور کے بیچ میں اعظم گڑھ کا علاقہ پڑتا تھا، اس لیے اعظم گڑھ کے عامل اس راستہ کی حفاظت کرتے تھے، ۱۸۰۱ء تک یہ چکلا دار یا عامل اس علاقہ پر حکومت کرتے رہے، نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ کا ایک تاریخی پتھر اس وقت لکھنؤ کے عجائب خانہ میں رکھا ہے، اس میں حکومت کے تمام شہروں کے درمیان کا فاصلہ ریاضی کے قاعدہ سے کھدایا ہے، اس میں لکھنؤ اور الہ آباد کے بعد تیسرا نام اعظم گڑھ کا ہے۔

۱۔ تجلی نور، ص ۹۶ میں تین برس کا تین گز بیڑی میں ہے۔ ۲۔ اعظم گڑھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۳۵ء، ص ۳۹۔ ۳۔ محمد علی تمنا خلف خولجہ عبداللہ تائید عظیم آبادی اس زمانہ کے ایک نہایت مشہور و ممتاز ادیب و شاعر و مورخ تھے، ریاض المنہج ان کے خطوط کا مجموعہ ہے، جس میں دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، مرشد آباد وغیرہ کے امرا اور دوسرا اور دوسرے ممتاز اشخاص کے نام خطوط ہیں، اس مجموعہ میں میرزا عطا بیگ خاں عامل اعظم گڑھ کے نام بھی ایک خط ہے، اس مجموعہ سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ امیر الدولہ نواب علی ابراہیم خاں عظیم آبادی نے اردو فارسی کے جوتہ کرے صحف ابراہیم وغیرہ لکھے ہیں وہ درحقیقت اسی مجموعہ کے مولف محمد علی تمنا کی محنت ہے، اس مجموعہ کا قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اور صیب گنج میں بھی ہے۔

۱۸۰۱ء میں جب یہ علاقہ انگریزی عمل داری میں شامل ہوا تو جہان خاں کے بیٹے نادر خاں کو جو یہاں کے عالموں سے برسرِ پیکار ہوتا تھا، تین سواہ وار کی پنشن اور بارہ گاؤں کی زمین داری دے کر ضلع میں امن و امان قائم کیا، جہان خاں نے ۱۸۲۶ء میں انتقال کیا، ان کی جگہ ان کے بیٹے مبارک خاں نے لی، جن کو راجہ کا موروثی خطاب دوبارہ ملا، مبارک خاں نے ۱۸۵۸ء میں وفات پائی اور ان کے صاحب زادہ راجہ سلامت خاں مسند نشیں ہوئے، راجہ صاحب گورنمنٹ اور عام پبلک میں نہایت مقبول تھے، مولانا شبلی مرحوم انہی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور اکثر ان کا نام عزت سے لیتے تھے، ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔

اعظم گڑھ کے بعض مردم خیز قصبات اور دیہات | شاہ گنج سے جو شاہ عالم کے نام سے آباد ہے اور جو جون پور میں شامل ہے، دو فرلانگ آگے سے اعظم گڑھ کا ضلع شروع ہو جاتا ہے، شاہ گنج سے چند میل دور بہ سمت مشرق سرائے میر آتا ہے، جس نے حضرت میر عاشقان علیہ الرحمۃ کی نسبت سے سرائے میر کا نام پایا ہے، یہاں ان کا مزار اب تک یادگار ہے اور اب اس کی شہرت کا ذریعہ وہ مدرسہ اسلامیہ ہے جس کا نام مدرسۃ الاصلاح ہے، جس کو ۱۹۰۸ء میں یہاں کے مسلمانوں نے قائم کیا تھا اور جس سے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کو تعلق خاص رہا ہے۔

سرائے میر سے دس میل بہ جانب مشرق نظام آباد کا قصبہ ہے، یہ بہت سے علما و اہل اللہ کا مولد و مسکن رہا ہے، سنا ہے کہ دیوان عبدالرشید صاحب رشیدیہ کا اصل وطن یہی تھا، حضرت میر عاشقانؒ کے پیر حضرت شاہ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ شاہ قدن یہیں مدفون ہیں۔

سرائے میر سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر مینہ نگر ایک مقام ہے جو یہاں کی پرانی آبادی ہے اور جس میں پرانے قلعہ کے آثار اب تک نظر آتے ہیں، دوسری پرانی آبادی ماہل کی ہے، جہاں پرانے اشراف سکونت پذیر ہیں، سرائے میر سے متصل پھر یہاں نام ایک گاؤں ہے جہاں انصار کا ایک گھرانہ آباد ہے، یہی گاؤں مولانا شبلی کا ناہال اور مولانا حمید الدین صاحب کا وطن ہے۔

اس کے بعد اعظم گڑھ کا شہر آتا ہے، اس کی مشرقی سمت میں دوسرے مشہور مواضع اور قصبے ہیں، ان میں سب سے پرانا گھوٹی کا قصبہ ہے، جہاں کے مولانا غلام نقشبند تھے، جو لکھنؤ میں قیام کے باعث لکھنؤی مشہور ہوئے اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے یہاں مولوی عبدالقادر صاحب نام ایک

۱۔ علی بن قوام نا۔ ۹۵۵ھ میں وفات پائی۔ ”س“

مشہور عالم اور زمین دار تھے، جن کو امامت کا دعویٰ تھا اور ہمیشہ گاڑھے کا عمامہ باندھتے اور گاڑھے کی عبا اور کپڑے پہنتے تھے اور اسی لیے ان کی شان میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی نے جو اعظم گڑھ میں زمانہ تک مہتمم ہندوستان رہے تھے، عربی کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا آدھا مصرعہ مولانا شبلی مرحوم کی زبانی مجھے یاد رہ گیا ہے، ع نَعْمَ نَقْمَصْ وَانْتَقْ او تسدبل موصوف کے پاس ایک عمدہ کتاب خانہ تھا، جواب بھی ان کے صاحب زادہ کے پاس ہے۔

انہی اطراف میں اعظم گڑھ کا دوسرا مشہور قصبہ چریاکوٹ ہے، قدیم آبادی ہے، ابو الفضل نے آئین اکبری میں اس کا نام لیا ہے اور اس میں شیوخ اور راجپوتوں کی آبادی بتائی ہے، یہ غازی پور اور اعظم گڑھ کے بیچ میں واقع ہے، عباسی شیوخ جن کو قضا کی خدمت سپرد تھی، یہاں آباد تھے، اسی خاندان سے مولانا قاضی علی اکبر اور ان کے صاحب زادے مولانا عنایت رسول اور مولانا فاروق تھے، اعظم گڑھ اور چریاکوٹ کے بیچ میں مولانا تھہ بھجن واقع ہے، جس کا حوالہ اعظم گڑھ کے راجاؤں کے شاہی فرمان میں ہے، کہتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لیے اس کا شاہی نام جہاں آباد رکھا گیا تھا، شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے کے کاریگروں کو جمع کیا اور ایک جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے حجرے تھے، اس قصبہ نے کپڑے کی کمال صنعت و حرفت کے ساتھ علم و فن کی خدمت بھی انجام دی، قدیم شاہی مسجد میں اب بھی ایک نیا مدرسہ مفتاح العلوم قائم ہے اور اس کے پرانے حجروں کی جگہ اب نئے حجرے بن رہے ہیں، اس قصبہ میں کثرت سے علماء پیدا ہوئے اور اب بھی ہیں، مولانا عبداللہ صاحب غازی پور کا اصل وطن یہی ہے۔

مولانا اعظم گڑھ کے بیچ میں محمد آباد گوہن نام مشہور قصبہ ہے، حضرت مولانا غلام فرید صاحب جن کا ذکر اوپر گزرا، یہیں کے باشندے تھے، انگریزی عہد میں یہاں کے شرفانے تعلیم پا کر اعلیٰ انگریزی عہدے حاصل کیے جن میں قابل ذکر ڈپٹی محمد کریم صاحب ہیں، جو علی گڑھ میں تقرر کے زمانہ میں سرسید کے رفقا میں تھے، اور دوسرا خاندان جسٹس سید عبدالرؤف صاحب کا ہے، اسی قصبہ سے متصل ولید پور کا قصبہ ہے، جہاں کے مولانا محمد کامل تھے، جو ۱۸۵۸ھ میں جون پور میں منصف مقرر ہوئے، اور بعد کو ہستی وغیرہ اضلاع میں اس خدمت پر مامور ہوئے، ساتھ ہی صوفی کامل بھی تھے، مریدی کا بڑا حلقہ تھا، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کی پہلی شادی ولید پور میں انہی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔

۱۔ یہاں ان فرامین میں ہے جو اس قصبہ کے لوگوں کے قبضہ میں اب تک موجود ہیں۔

محمد آباد کے قریب مبارک پور نام بڑا قصبہ ہے جو پرانے زمانہ سے پارچہ بانی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانہ میں چند نام ور علما پیدا ہوئے ہیں۔

حسب و نسب و مولد | اعظم گڑھ کی دوسری سمت میں ایک پرگنہ سگودی ہے، یہ بھی قدیم آبادی ہے، آئین اکبری میں اس کا نام ہے اور اس کو راج پوتوں کا مسکن بتایا ہے، چنانچہ اب بھی اس علاقہ میں راج پوت آباد ہیں، اسی پرگنہ میں ہندول کا قصبہ ہے، جس کو مولانا شبلی کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے، مولانا نے اپنے اس مولد کی تعریف میں تفریحاً یہ شعر کہے ہیں:

فضل ہندول اگر تو نہ شناسی آدمی نیستی تو نسائی
نہ تو اس یافت ہیج جائے چو او خرم و سبز و دلکشائے چو او
ہست از غایت فرح بمرشت مرغزارے مگر زباغ بہشت

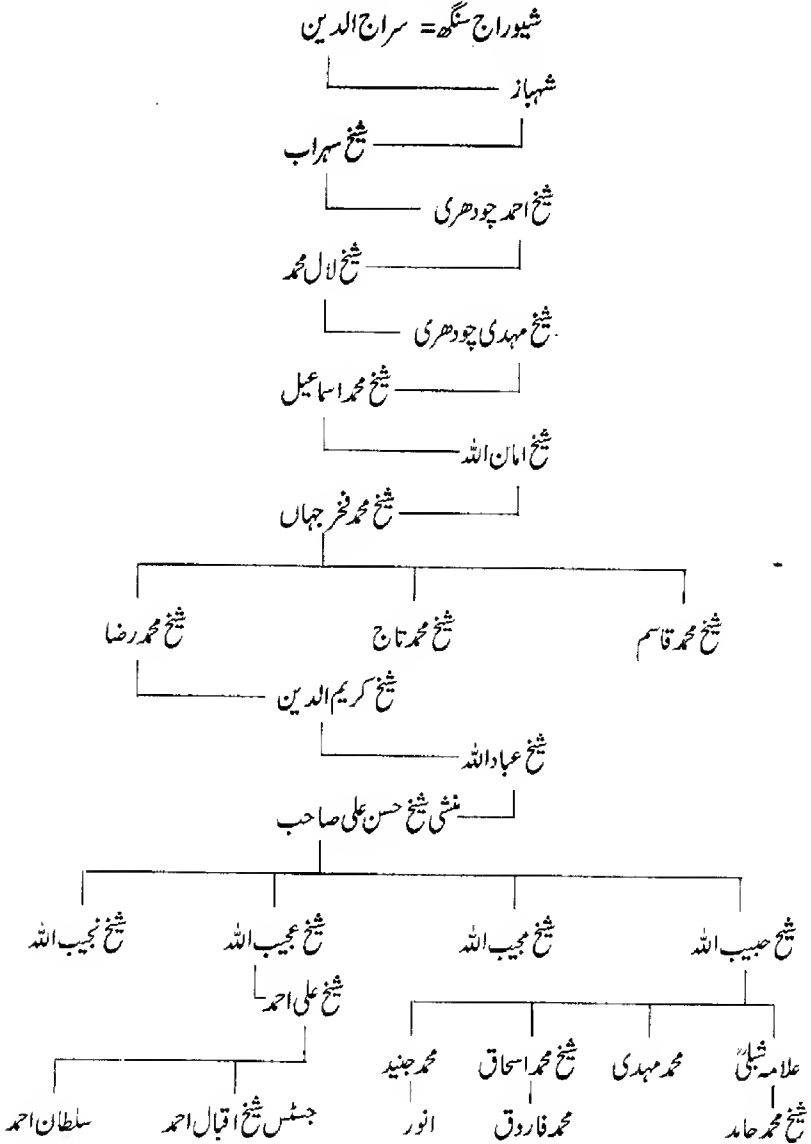
مولانا کی پیدائش سے پہلے چاہے یہ بیان مبالغہ سے خالی نہ ہو مگر ان کی پیدائش کے بعد تو یہ یقیناً مبالغہ سے خالی ہے، اسی کے قریب بالکل ملی ہوئی خانقاہ نام قدیم شرفا کی ایک آبادی ہے، یہی وہ مقام ہے جو ڈپٹی خلیل صاحب اور ان کے صاحب زادہ جسٹس محمد خلیل صاحب (جج ہائی کورٹ الہ آباد) کا اصل مسکن ہے، اسی کے قریب جیران پور بھی ایک آبادی ہے، جس میں متعدد علماء پیدا ہوئے جن میں سے ایک مولانا سلامت اللہ صاحب ہیں۔

خانقاہ میں غالباً صوفیائے کرام کا کوئی خاندان آباد تھا، جس کے سبب سے وہ خانقاہ کے نام سے مشہور ہوا، یہی وہ جگہ ہے جس کی مسجد کا ذکر مولانا کے قصیدہ کشمیر میں ہے اور جس کے لیے اپنی جائداد متروکہ کے ایک حصہ کی وصیت اس میں لکھی تھی۔

خاصہ بر مسجد پارینہ کہ در خانقہ است کہ زبے مہری ماختہ و بے برگ و نواست
نسب | ہندول میں بھی راجپوتوں ہی کی آبادی تھی، جس کے مورث اعلیٰ آج سے چار سو برس پیش تر مسلمان ہوئے تھے، اسی خاندان میں مولانا شبلی مرحوم کی پیدائش ہوئی، کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہندی نژاد راج پوت آگے بڑھ کر اس قابل ہوا کہ رسولِ مطہی و ہاشمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مدارج و معارف سے دنیا کو آشنا کرے، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی سطوت و عظمت کا دلوں میں سکھائے، نعمان بن ثابت کو فی امامِ اعظم رضی اللہ عنہ کے فقہ و قانون کے مصالح و حکم کو نیا جلوہ دے، فصحاء عرب و ایران کی نکتہ سنجیوں

کی شناسا نہ داد دے اور غزالی و رازی اور مولانا کے اسرارِ حقیقت کو برملا فاش کرے، ڈاکٹر اقبال نے جو خود بھی ایک ہندی نژاد برہمن تھے، کیا خوب کہا ہے:

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی برہمن زادہ دانائے رمزوم و تبریز است
مولانا کا خاندانی سلسلہ وہی نو مسلم راج پوتوں کا ہے، جو روات کہلاتے ہیں، شجرہ نسب یہ ہے:



قبولِ اسلام | خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیوراج سنگھ کے قبولِ اسلام کی خاندانی روایت یہ ہے:

”ایک روز شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منہ علاقہ زمین داری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا، اتفاقاً دیر ہو گئی، دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کر کے مکان پر پہنچے، بھوک پیاس سے بے تاب ہو رہے تھے، گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے چلے گئے، یہ خیال نہیں رہا کہ جو تیاں اتار دیں، ان کی بڑھی بھاج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے، اب تک بے آب و دانہ تھیں، گڑ کر بولیں ”کیا نرے ترک ہی ہو گئے جو تے پینے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا بھر سٹ کر ڈالا“ ایک راج پوت پر ایک عورت کے یہ چہیتے ہوئے طعن نے وہ کام کیا جو سینکڑوں علما کے بحث و مناظرہ اور وعظ و تبلیغ سے ممکن نہ تھا، شیوراج سنگھ نے بھاج کا فقرہ سنا تو کبھی بھوکے ہونے کا طعن دیتی ہو تو میں سچ سچ ترک ہوا جانا ہوں، چنانچہ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جا کر نہ صرف اپنی جسمانی پیاس بجھائی بلکہ دین حق کے آبِ حیات سے بھی سیراب ہوئے اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا، خاندان کی دوسری شاخ بدستور ہندو ہی رہی اور اب تک یہ لوگ ہندو کے قریب دھرن نامی ایک موضع میں آباد ہیں“ یہ تو خاندانی روایت ہے، لیکن قرینہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوراج سنگھ خانقاہ کے کسی بزرگ کی صحبت اور تلقینات سے دل ہی دل میں متاثر ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ ہندو دھرم کی بندشوں سے آزاد ہوئے جا رہے تھے، اسی سلسلہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اسی سے بھاج کا طعنہ بھی بہ جاتھا اور دفعۃً شیوراج سنگھ نے خانقاہ کی مسجد کی راہ بھی اسی لیے لی، یہ واقعہ شاہانِ شری کے زمانہ کا ہے۔

خاندانی حالات | سراج الدین نے قبولِ اسلام کے بعد اپنا حصہ زمین داری الگ کر لیا، بعد کو اس خاندان نے مزید رسوخ حاصل کیا، یعنی اس کو آس پاس کے مواضع کی چودھرائی کا منصب مل گیا جو اثر و اقتدار کے لحاظ سے آج کل کی تحصیل داری سے کچھ اونچا تھا، یہ منصب مدت تک اس خاندان میں قائم رہا، سراج الدین کے پوتے سہراب نے دنیاوی عزت کے علاوہ مذہبی اعزاز بھی حاصل کیا یعنی اپنی باطنی کیفیت میں یہ ترقی کی کہ ان کے مرشد نے ان کو بیعت کی اجازت دی اور شیخ کے معزز لقب سے سرفراز کیا، اسی لیے نو مسلم راج پوتوں کے عام دستور کے خلاف یہ لوگ خان کے بہ جائے شیخ کہلاتے ہیں۔

نانہالِ انصاری | شاید اسی لیے نو مسلم راج پوتوں کے عام دستور کے خلاف ان لوگوں نے شادی بیاہ لے سیرت شبلیؒ، از مولوی اقبال احمد خاں سہیل، ایم، اے، ایم، ایل، اے، مندرجہ اصلاح نومبر ۱۹۳۶ء، ص ۵۱، ۵۲۔

میں صرف اپنے ہی خاندان تک محدود رہنے کی پابندی نہیں کی، بلکہ دوسرے مسلمان شرفاء کے خاندان میں بھی شادیاں کیں، چنانچہ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کی شادی انصاری شیوخ کے گھرانے میں ہوئی جو پھر یہاں آباد ہیں، شیخ صاحب کے خسر اور مولانا کے نانا کا نام حاجی قربان قمبر انصاری تھا۔

بزرگوں کے حالات | مولانا کے جد اعلیٰ شیخ کریم الدین صاحب گورکھپور کے ابتدائی انتظام کے زمانہ میں بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے اور اپنی ذاتی آمدنی سے ”بڑھاوا احسام الدین پورنام“ ایک علاقہ خریدا جس میں دس بارہ گاؤں تھے، یہ علاقہ اب تک اسی خاندان کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔

مولانا کے دادا منشی حسن علی مرحوم اور ان کے بھائی منشی وارث علی عدالت کلکٹری اعظم گڑھ میں مختار تھے، اور مولانا کے نانا شیخ قربان قمبر انصاری انگریزی تسلط کے ابتدائی زمانہ میں اعظم گڑھ کے ایک مشہور وکیل تھے، مولانا سے سنا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے تھے، ان کے اشعار بھی سناتے تھے، جو شاید اہل بیت علیہم السلام کی منقبت میں تھے، مولانا حمید الدین مرحوم مصنف نظام القرآن ہی شیخ قربان قمبر انصاری کے پوتے ہیں۔

شیخ حبیب اللہ | مولانا کے دادا نے چار اولاد چھوڑی، حبیب اللہ، مجیب اللہ، عجیب اللہ، نجیب اللہ، مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ تھے، انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی پڑھی اور اس میں خاص ذوق پیدا کیا، چنانچہ مولانا نے شعرا لعلجم میں ان کے اس حسن ذوق کی ایک مثال لکھی ہے، فرماتے ہیں:

”میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:

سر بہ بستاں چو دہد جلوہٴ یغمائی را
اول از سرو کند جامہٴ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لیے شاعر اگر ”کند“ کے بہ جائے ”کشد“ کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا، جامہ کندن گویا ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہو گئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ ”نہیں یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گرمی کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اتارے، دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اترا دئے جائیں یا نچوائے جائیں، فارسی میں ان کے لیے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن، چوں کہ یہاں مقصود یہ

ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سر و کا کپڑا اتار لیتا ہے، اس لیے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی۔^۱

اس زمانہ میں فارسی اور ابتدائی عربی تعلیم کے بعد لوگ قانون کا امتحان دیتے تھے، چون کہ شیخ صاحب کے گھر میں زمین داری اور مقدمات و قانون عدالت کا چرچا تھا، اس لیے الہ آباد ہائی کورٹ کی وکالت حاصل کی اور اس پیشہ میں ان کو ایسا فردغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے۔ ان کی جوانی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا، دوسرے شہروں کی طرح اعظم گڑھ میں بھی شورش پیدا ہوئی، جیل خانہ کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کیا گیا، اس زمانہ میں یہاں دہلیلیس صاحب گلکٹر تھے، ان کے ساتھ مل کر شیخ صاحب نے اپنے پرگنہ سگڑی میں امن و امان قائم کیا، اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں گاؤ کشی کا جو مشہور ہنگامہ اعظم گڑھ میں ہوا اس میں بھی امن و امان قائم کرنے میں گورنمنٹ کو مدد دی، اس کے ایک سال بعد ۱۸۹۴ء میں شہر میں بہت بڑا سیلاب آیا، جس سے شہر خطرہ میں تھا، اس وقت حکام کے ساتھ مل کر شہر اور دریا کے بیچ میں ایک بند بندھوانے میں بڑی مدد دی۔

اسی طرح شہر اور ضلع کے پبلک کاموں میں وہ ہمیشہ شریک اعظم رہے، اس زمانہ میں میونسپلٹی کے صدر (چیرمین) ضلع کے حکام ہوتے تھے، اور ان کی ماتحتی میں شہر کے معززین آزریری سکرٹری ہو کر عملاً تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، شیخ صاحب جب تک ان کی صحت کام دیتی رہی، اس خدمت کو اعزازی طور سے انجام دیتے رہے، فیض فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں محترم تھے، اس زمانہ کی سیاست میں ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی، اس لیے وہ ہندو مسلمان ہر ایک کے کام آتے تھے اور ہر ایک ان کی عزت کرتا تھا۔ اس زمانہ میں نیل کا کاروبار بہت ترقی پر تھا، شرقی اضلاع میں کثرت سے نیل کی کاشت ہوتی تھی، اور چمپارن و گورکھپور سے لے کر اعظم گڑھ تک نیل کی کھیتی کھڑی اور نیل کی کوٹھیاں جاری تھیں، شیخ حبیب اللہ صاحب کی بھی نیل کی کوٹھیاں تھیں، جن سے سال میں خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم کے مکتبہ میں کہیں کہیں اس کا ذکر ہے، اس زمانہ میں زمین دار دیسی شکر بھی بناتے تھے، اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، شیخ صاحب نے بھی دیسی شکر کے کارخانے قائم کیے تھے، بزرگوں کے موردی علاقہ

۱۔ شعر انجم، جلد چہارم، ص ۱۸ ج ۲ مکتبہ شبلی اول سہ ماہی ۱۳۰۳ھ تا ۱۳۰۴ھ فارسی نمبر ۱۳۔

میں اپنی ذاتی آمدنی سے خرید کر بہت کچھ اضافہ کیا تھا، چنانچہ گھاگھرہ کے کنارے دیوارہ کا علاقہ جو اس خاندان کی ملکیت میں ہے، ان ہی کا حاصل کیا ہوا ہے، وکالت و زمین داری اور نیل اور شکر کی تجارت سے ان کی تقریباً تیس ہزار سال کی آمدنی تھی اور سرکار کو چھ ہزار سال کی مال گزاری دیتے تھے۔

غرض علمی قابلیت، قانونی لیاقت، اخلاقی شرافت، دنیاوی وجاہت، ہر دل عزیز، دولت و ثروت اور سعادت مند اولاد ہر طرح کی نعمت شیخ صاحب کے حصہ میں آئی تھی، مذہبی مذاق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مولوی محمد کامل صاحب کے ولید پور کے مرید و خلیفہ الہی شاہ صاحب (ساکن سبر بد ضلع جون پور) کے مرید تھے۔

شیخ صاحب کے دوسرے بھائیوں نے فارسی کی تعلیم پائی تھی اور اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق فارسی کا ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مکاتیب میں مولانا کا ایک فارسی خط ان کے ایک چچا کے نام جو غالباً شیخ عجیب اللہ ہیں موجود ہے^۱، جس میں پوری انشا پردازی صرف کی گئی ہے، شیخ عجیب اللہ صاحب کے نام ایک اردو خط بھی مکاتیب میں ہے، اس میں بھی شاعرانہ تکلفات ہیں اور ان کو علی گڑھ آنے کی دعوت اور بعض علمی اطلاعات درج ہیں، انہی شیخ عجیب اللہ صاحب کے پوتے جسٹس محمد اقبال ہالی کورٹ الہ آباد کے جج ہیں۔

شیخ حبیب اللہ صاحب کو اپنے بھائیوں کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی، چنانچہ انہوں نے جاگد ایں حاصل کیں وہ صرف اپنے نام نہیں رکھیں بلکہ برابر برابر سب بھائیوں کو بانٹ دیں۔
والدہ ماجدہ | مولانا کی والدہ جو حاجی قربان قنبر انصاری مرحوم کی صاحب زادی تھیں، نہایت نیک اور دین دار بی بی تھیں، تہجد تک ناعد نہیں کرتی تھیں، مولانا اکثر اپنی والدہ مرحومہ کی نیکیوں کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کو سحر خیزی کی عادت ان ہی کے حسن تربیت سے پڑی، شیخ صاحب نے غیر کفو میں جو شادی کر لی تھی، اس سے وہ بہت دل گیر رہا کرتی تھیں اور آخر اسی غم میں ۱۸۸۶ء سے پہلے وفات پائی، مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے مرثیہ میں دو چار شعر اور لکھے جن کو بعد میں کاٹ دیا تھا، انہی میں ایک بند کا مصرعہ یہ تھا ع ماتم مادر دل گیر بھی دیکھا میں نے

۱۔ مکاتیب دوم نامہ فارسی ۱۲ میں ان کا ذکر ہے۔ ۲۔ مکاتیب دوم نامہ فارسی ۳۔ ۳۔ مکاتیب اول میں مولانا نے ۲۸ جنوری ۱۸۸۶ء کو اپنے ایک عزیز کو جن کی والدہ کا ابھی انتقال ہوا تھا، ایک تعزیت کا خط لکھا ہے جس میں اپنی ماں کی وفات کے سانحہ پر احساس غم کا تذکرہ کیا ہے۔

اور ان کی یادگار میں اپنے نیشنل اسکول میں جو آج کل شبلی جارج ہائی اسکول اعظم گڑھ ہے ۱۳۱۶ھ - ۱۸۹۸ء میں صدر المنازل کے نام سے ایک ہال بنوایا ہے۔

اولاد | شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کے ان کی ان بیوی سے چار بیٹے ہوئے اور ایک بیٹی، بیٹی جوان ہو کر شادی کے بعد شیخ صاحب کے سامنے ہی مرچکی تھی، بیٹوں میں سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے، ان سے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے، ان کی غیر معمولی ذہانت و طباعی اور خردانہ اطاعت و پاس ادب کا اعتراف مولانا کو ہمیشہ رہا اور مولانا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی، چنانچہ جب اپریل ۱۸۸۵ء میں وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولانا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی، جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرع پر تھا، مع ”بہ سلامت روی و باز آئی“ اس نظم کے صرف دو شعر اقبال سہیل صاحب کو یاد رہ گئے:

خار در دیدہ عدو شکنی حاسداں را جگر گداز آئی

ماہ نادیدہ در رہت باشیم کہ تو تا گداز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد میر سٹری پاس کی، اس نواح میں چوں کہ یہ نیا واقعہ تھا اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے (امنگ) اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی، اس لیے ۸ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ان کی واپسی پر بڑی دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا تھا، اور اس تقریب میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا کہ سات روز تک مسلسل اہل شہر کی دعوت کی گئی،

۱۔ اس ہال پر حسب ذیل کتبہ لکھا ہے:

ہوالہ

ایں ایوان دل کشا کہ صدر المنازل ایں مدرسہ ہست

از زر عطیہ خاص

مولوی محمد شبلی صاحب

المخاطب بہ

شخص العلماء

سکرٹری ایں مدرسہ و فیوآف یونیورسٹی، الد آباد

بہ یادگار

والدہ مرحومہ ایشان اتمند اللہ بقرانہ

بہ ماہ دسمبر ۱۸۹۸ء شعبان ۱۳۱۶ھ

تعمیر یافت

جو اعظم گڑھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا، افسوس کہ یہ ہنگامہ سرور زمانہ کی نظر بد سے بچ نہ سکا اور جو تو قعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں، پوری نہ ہو سکیں، ولایت ہی میں ان کی صحت خراب ہو چلی تھی، جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی، مجبوراً اپنی حیثیت سے اتر کر ۱۸۹۲ء میں ان کو منصفی قبول کرنی پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۹۶ء میں اعزہ کو داغ مفارقت دے گئے، مرحوم کی یادگار ایک صاحب زادی تھیں، جو مولانا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں، وہ بھی ۱۹۲۷ء میں مکہ معظمہ میں لاؤلفوت ہوئیں۔

مولانا کے بھٹلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے، اور قابلیت قانونی کے علاوہ اپنی پختہ مغزی اور وسعت غلق کی بنا پر نہایت مدد دہ رہے، مگر انہوں نے بھی جوانی میں اگست ۱۹۱۲ء میں وفات پائی، مرحوم نے ایک بیٹا عزیز می محمد فاروق سلمہ اور دو صاحب زادیاں یادگار چھوڑیں، بڑی صاحب زادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے اور چھوٹی مولانا حمید الدین صاحب کے چھوٹے صاحب زادے محمد عباد سے بیاہی تھیں، چھوٹی نے چند سال ہوئے اور بڑی نے اسی سال ۱۹۳۹ء میں وفات پائی۔

مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جوان مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کے لیے ناقابل برداشت تھا، جس کا شاہد حال ان کے مرثیہ کا ایک ایک شعر ہے، اور آخر یہ کاٹانا کی جان لے کر نکلا۔

مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولانا کے صاحب زادے حاجی محمد حامد صاحب کے ہم عمر تھے، کچھ دنوں اعظم گڑھ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے اور تقریباً بیچپن برس کی عمر میں جب کہ وہ بہ مقام کان پور سب جج تھے، دہلی میں جہاں وہ بہ غرض علاج گئے تھے، ۱۹۳۳ء میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے، یہی وہ جنید ہیں جن کی نسبت مولانا نے مولوی اسحاق کے مرثیہ میں یہ لکھا تھا:

ع ”خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرابھائی جنید“

مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی، جن سے ایک صاحب زادے محمد مرحوم تھے، یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے اور گریجویٹ ہو چکے تھے،

۱۰ تاریخ وفات ۲۹ جون ۱۸۹۶ء ہے، دیکھئے (صفحہ ۴۱)۔

مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری میں ان کے انتخاب کی اطلاع آئی، اس دن چند گھنٹے دودن کی علالت میں وفات پا چکے تھے، مہدی مرحوم کی وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کو یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا، ایسے سعادت مند اور کام یاب بیٹے کی مرگ ناگہاں وہ بھی عین عنفوان شباب میں انتہائی جاں کاہ حادثہ تھا۔ مرحوم نے ایک بچہ مظفر حسین اپنی یادگار چھوڑا، اس حادثہ کے بعد قدرتی طور پر شیخ صاحب مرحوم کی تمام دل بستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی ناز برداریاں کرتے، چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے پدر بزرگ وار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اس کی جانب اشارہ ہے۔

مہسند اس کی کہ نیکس و بے خانماں شود ہاں آں قدر بہاں کہ مظفر جو اں شود

ولادت | مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھانک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔

نام | والدین نے بچہ کا محمد شبلی نام رکھا، عجب نہیں کہ نام شیخ صاحب نے اپنے صوفیانہ ذوق سے رکھا ہو، چھوٹے کا نام جنید رکھا تھا، وہ بھی اسی ذوق کا پتہ دیتا ہے، شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شبلی بغدادی المتوفی ۳۳۳ھ کا نام مشہور ہے، مگر درحقیقت یہ نام نہیں، ان کا نام ابو بکر دلف بن مجدد بتایا جاتا ہے اور شبلی ان کے وطن شبلیہ (واقع اشروسندہ ترکستان) کی طرف منسوب ہے، یہ نسبت ان پر ایسی غالب آئی کہ اس نے نام کی جگہ لے لی۔

ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد کو صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ

نعمانی لکھنے لگے،

لطیفہ: مولانا شروانی صاحب فرماتے ہیں میرے بڑے پھوپھا عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکن پور سرسید کے ابتدائی ہم دردمخصلوں میں تھے، ان کی عنایت کی یادگاریں اب بھی یونیورسٹی میں قائم ہیں، علامہ شبلی کے تقرر کے ابتدائی دور میں جب موصوف نے شبلی و جنید نام سے تو کہا کیا یہ بغداد سے آئے ہیں۔

۱ مئی کے بجائے اب ۳ جون کی تاریخ تحقیق ہو چکی ہے۔ ۲ انساب صمعانی۔

”نعمانی“ کی اس نسبت سے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا کہ وہ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی اولاد سے ہیں، یا وہ اپنے کو ان کے خاندان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ دونوں خیال غلط ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابتدا میں سخت خفی تھے اور خفی کہلانا اپنے لیے موجب فخر سمجھتے تھے اور طبیعت جدت پسند تھی، اس لیے خفی کے بہ جائے اپنے آپ کو نعمانی کہا، بلکہ یہ نسبت انہوں نے خود سے اختیار نہیں کی، ان کے استاذ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی نے ان کا لقب نعمانی رکھ دیا تھا، مولانا فاروق مرحوم بھی سخت خالی خفی تھے اور ان دنوں مولانا عبداللہ صاحب (موسیٰ ثم غازی پوری) کے سبب سے جو اسی ضلع کے رہنے والے تھے، مقلد و غیر مقلد کی صداکے ان اطراف میں بلند تھیں اور احناف اہل حدیث میں معرکے برپا تھے، اور طرفین میں مناظرے اور رسالہ بازی جاری تھی، اسی ماحول میں استاذ نے اپنے شاگرد کو نعمانی کہہ کر پکارا جو بعد کو شاگرد کے نام کا جز بن گیا۔

مولانا نے ابتدائے جوانی میں اردو میں اپنا تخلص تسنیم رکھا تھا، فارسی میں شبلی اکثر اور ایک آدھ غزل میں نعمانی بھی رکھا ہے۔

بہ خواری کہ زکوئے تو رفت نعمانی گماں برم کہ ازیں پس دگر نمی آید

دو غزلوں میں پورا نام ہی تخلص میں ڈال دیا ہے،

اے شبلی نعمانی اس پردہ دری از چیست ایسما کہ ز خود گفتی من نیز خبر دارم

ہم ز فیض شبلی نعمانی است اس کہ در ہر شیوہ یکتا بودہ ام

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی صرف وزن کے سبب سے ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ

نعمانی ان کا تخلص تھا۔

بچپن | مولانا مرحوم کا بچپن بہت ناز و نعم میں گذرا، فطرۃ ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا، بہت ہی بچپن کی بعض باتیں سناتے تھے، ایک دفعہ کا اسی عمر کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ چاندنی رات تھی، صحن میں لیٹے تھے اور لوگ اٹھا کر ان کو سائے بان میں لے جانا چاہتے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے، کسی نے کہا اٹھو اٹھو پانی برسے گا، فوراً جواب دیا، واہ چاند تو نکلا ہے پانی کیسے برسے گا، لوگ اس پر ہنس پڑے، مگر اس ذہانت کے ساتھ ان کی اس طفلانہ سادگی کا قصہ بھی سنئے، ہر جمعرات کو مولانا کا ایک پیسہ مقرر تھا، ہر جمعرات کو اس کا انتظار رہتا تھا، شیخ صاحب کا ایک پرانا ملازم ان کو دیکھ بھال کرتا تھا، وہی پیسہ دیا کرتا

تھا، مولانا اگر کبھی پہلے پیسہ مانگ لیتے اور ضد کرتے تو وہ پیسہ کو آگ پر رکھ دیتا اور کہتا کہ ابھی پیسہ بن رہا ہے اور آخروہ بن کر جمعرات ہی کو ملتا۔

تعلیم و تربیت | مولانا کی والدہ مذہبی تھیں اور خود شیخ صاحب بھی اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب و ہوا سے نا آشنا تھے، اس لیے اپنی پہلی اولاد کو خدا کا نام لے کر علم دین کی خدمت کے لیے وقف کیا، بعد میں سرسید مرحوم کی جو بنارس اور غازی پور وغیرہ مشرقی اضلاع میں، بہت دنوں تک حاکم عدالت رہے، تقریر و تحریر کے اثر سے بہت کچھ متاثر ہو گئے تھے، اسی لیے اپنے دوسرے بچوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلوائی۔

شیخ صاحب مرحوم نے قدیم رواج کے مطابق بڑی دھوم دھام سے اپنے بڑے بیٹے کا مکتب کیا، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی، ان کے گاؤں کے قریب جیرا چپور کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب المتونی ۱۳۰ھ/ ۱۸۹۰ء تھے جو مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے شاگرد تھے، وہی پہلے معلم مقرر ہوئے، چنانچہ مولانا نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے پائی اور کچھ دنوں مولوی شکر اللہ صاحب المتونی ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء سے جو سربد ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے، پڑھا۔

فطری آثارِ کمال | مولوی عبداللہ صاحب موصوف بیان فرماتے تھے کہ مولوی شبلی میں بچپن ہی سے آثار کمال پائے جاتے تھے، ایک رات کو میں سو رہا تھا، قریب ایک بجے کا وقت تھا، یک بہ یک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعہ تاریخ لکھ رہے ہیں، حالانکہ ان کا یہ بچپن تھا، مولوی محمد عمر صاحب بزرگان قدیم کی ایک عمدہ یادگار تھے، وہ مولانا مرحوم کے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کے بچپن کے دوست تھے، وہ برسبیل تذکرہ ایک روز فرماتے تھے کہ مولانا میں ادبی مذاق بھی بچپن ہی سے تھا، اس زمانہ میں جب وہ محض مبتدی تھے، کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کے پڑھنے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آ جاتا۔

وہ خود مجھ سے فرماتے تھے کہ بچپن میں وہ فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دوکان پر بسر کرتے تھے، کتابیں الٹے پلٹتے اور شعرا کے دیوان پڑھتے اور مناسبت طبع سے ان کے اچھے اشعار یاد رہ جاتے تھے۔

۱۔ مضمون مولوی محبوب الرحمن صاحب کلیم بی، اے، وکیل اعظم گڑھ، معارف جلد سوم ۱۹۱۸ء۔

مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ | شیخ صاحب اور شہر کے دوسرے اہل استطاعت اصحاب نے مل کر اعظم گڑھ میں علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں پہلے تھوڑے عرصہ تک مولانا سخاوت علی جون پوری مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، مولانا نے اسی مدرسہ میں مولوی صاحب موصوف سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔

مولانا علی عباس صاحب چریاکوٹی سے تلمذ | تذکرہ علمائے حال میں جو ۱۸۹۷ء میں مولانا کے علم اور مشورہ سے لکھا گیا، مولانا کے استادوں میں ایک نام مولانا علی عباس صاحب چریاکوٹی کا لکھا ہے، مولوی علی عباس صاحب چریاکوٹی بن شیخ امام علی، ماں کی طرف سے ملا باب اللہ جون پوری کی اولاد سے تھے، بڑے منطقی مناظرہ پسند اور عربی کے شاعر و ادیب تھے، ۱۳۰۲ھ میں وفات پائی۔

مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جون پور | مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے جو مولانا کی جوانی کے دوست تھے، مولانا کے حال میں لکھا ہے کہ مولانا نے مدرسہ حنفیہ امام بخش جون پور میں غالباً مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری سے جو سلسلہ خیر آباد کے نام و مدرس تھے، چند روز پڑھا تھا، مولانا کے مکاتیب فارسی میں بھی اس مدرسہ کے چند حوالے آئے ہیں، جن سے اس مدرسہ سے ان کے تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن درحقیقت مولانا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب وہ مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

مولانا فاروق صاحب | مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی ان دنوں چشمہ رحمت غازی پور میں

۱۔ یہ مولانا صاحب نے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۸ء میں وفات پائی، ان ہی کے صاحب زادہ مولوی ابوالکارم محمد علی موی تھے، جو مولوی سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے اور جنہوں نے مختلف مسائل پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں، ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں وہ بھی وفات پا چکے۔ ۲۔ مولانا محمد اور اسی صاحب گرامی مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ ۳۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۴ ۴۔ مولانا محمد فاروق عباسی اور مولانا عنایت رسول عباسی چریاکوٹی اس زمانہ کے مشاہیر علمائے تھے، یہ دونوں قاضی علی اکبر ابن قاضی عطار رسول چریاکوٹی کے صاحب زادے تھے اور معقول و منقول و ریاضی ہر قسم کے علوم سے مالا مال تھے، مولانا عنایت رسول صاحب ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے تھے علوم معقول و ریاضی و حساب و ہیئت مولوی احمد علی چریاکوٹی سے اور علوم منقول ملا فضل رسول صاحب بدایونی السنوی ۱۲۸۹ھ سے جو دروس واسطوں سے ملا بحر العلوم کے شاگرد تھے، حاصل کیا اور حدیث مولانا حیدر علی رام پوری شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے ٹونک جا کر پڑھی، واپس آ کر عربی پڑھنے کا شوق ہوا تو اس زمانہ میں کلکتہ جا کر بیہود یوں سے عربی پڑھی اور تورات و انجیل و زبور اور دوسرے صحف بنی اسرائیل پر عبور پایا، آخر وطن آ کر قیام کیا، ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی، سید احمد خاں مرحوم بنارس و غازی پور کے قیام کے زمانہ میں ان کے علم و فضل سے واقف ہوئے اور تورات و انجیل و زبور کے مباحث کے حل کرنے میں ان سے پوری مدد ملی، اور بعض بعض مسائل پر ان سے رسالے لکھوائے، ہر سید کے مطبوعہ خطوط میں ان کے نام بھی چند خط موجود ہیں۔ مولانا محمد فاروق صاحب (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مدرس تھے، ان کی تعلیم و تدریس کا شہرہ دور دور پھیلا تھا اور شیخ صاحب سے خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان کے پیر الہی شاہ صاحب (ساکن بہرہ ضلع اعظم گڑھ) کے پیر مولانا کامل صاحب ولید پوری کے داماد تھے، اس لیے شیخ صاحب نے مولانا کو ان ہی کے پاس غازی پور بھیج دیا، غازی پور میں گنگا کے کنارے قدیم شرفا کا ایک محلہ ہے، جس کو میاں پورہ کہتے ہیں، یہاں شاہ جنید صاحب ایک بزرگ کا خاندان آباد ہے، جو شاہ صاحبوں کا خاندان کہلاتا ہے، شاہ منیر عالم وغیرہ اس خاندان کے مشہور افراد ہیں، مورث اول شاہ جنید کی بنوائی ہوئی مسجد کالب دریا نہایت دل کش منظر ہے، اسی کے قریب اس خاندان کا مکان ہے، مولانا شبلی مرحوم غازی پور میں اسی مکان کی کوٹھری میں رہتے تھے، خاک سار جب غازی پور گیا تھا، تو یہ کوٹھری اسے دکھائی گئی تھی۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) نے اپنے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول سے پڑھا، علاوہ ازیں ہیبت کائنات مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی ٹکلی (بانی چشمہ رحمت غازی پور) سے ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی ٹکلی سے اور حاشیہ زاہد یہ بر شرح ملا جلال مولوی ابوالحسن صاحب منطقی سے اور بعض علوم ملائعت اللہ صاحب فرنگی ٹکلی سے پڑھے، علوم معقول و منقول و ریاضی و ادبیات جملہ علوم پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی ان کو دست رس حاصل تھی، ان کے طرزِ تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علاوہ ہر کفرس مسئلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اس کا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہو جاتا تھا، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے وہ چشمہ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے، پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ میں آئے، کان پور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرس کی، بہرام کے مدرسہ خاتقاہ میں جواب بھی قائم ہے، کچھ دنوں رہے، الٰہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۹ھ میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، خاک سار کو وہیں آپ سے استفادہ کا موقع ملا، اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں جب مولانا شبلی نعمانی مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معتمد مقرر ہوئے، موصوف نے ترک ملازمت کر کے بلیا میں وکالت شروع کی اور بعض شایق آگریز حکام کو عربی پڑھائی، آخر میں ۱۹۰۹ء میں مولانا شبلی مرحوم نے ان کو پھر دارالعلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلایا، چند روزہ کر غازی پور گئے تھے کہ سباسب و سامان یہاں لے آئیں کہ وہیں ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی۔

مولانا فاروق صاحب کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم و نثر میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا اور اس زمانہ کے کمالات کے مطابق صنایع و ہدایح کا خاص شوق رکھتے تھے، مثلاً غیر منقولہ اقصا و اقصیٰ اور خطبہ، مولانا کی تصنیفات میں سے عربی و فارسی نظم و نثر کے بعض رسائل یادگار ہیں، مثلاً منظومہ نحویہ، فارسی خالق باری، کشف الاتقاع عن وجہ الامتاع اور تطلیقات ثلاثیہ کی بحث پر ایک رسالہ جس کا قلمی نسخہ خود ان کے ہاتھ کا لکھا میرے پاس ہے، اردو شاعری بھی کرتے تھے، چنانچہ ان کے دو اردو مسدس چھپے ہیں، ایک مسدس فاروقی جس میں اعظم گڑھ کے ۱۸۹۳ء کے ہنگامہ گاؤ کشی کا واقعہ نظم کیا ہے اور دوسرا مسدس عموالی ہے، جو مسدس حالی کے جواب میں ہے، جسمانی یادگار محل اولیٰ یعنی مولانا کامل صاحب ولید پوری کی صاحب زادی سے دو صاحب زادے ہیں، شمس العلماء مولانا محمد امین صاحب اور مولانا محمد مبین صاحب کنگنی چر یا کوٹی، دوسری شادی غازی پور میں کی تھی جس سے کئی صاحب زادے ہوئے مگر ان میں سے عربی تعلیم صرف ایک نے پائی، یعنی محمد حسین مرحوم نے، ان تینوں نے جو کچھ پڑھا اپنے والد مرحوم ہی سے پڑھا۔

استاد کی نسبت شاگرد کا بیان | اکتوبر ۱۹۰۹ء کے اندر وہ میں مولانا شبلی مرحوم نے اپنے استاد کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، اس سے زیادہ معتبر بیان ان کے متعلق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، لکھتے ہیں:

”مولانا موصوف چریاکوٹ کے رہنے والے تھے، جو اعظم گڑھ کے ضلع میں ایک مردم خیز

قصبہ ہے، انہوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی مہلی

اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی مہلی سے تمام علوم و فنون کی تکمیل کی تھی، علم ادب اگرچہ بطور خود حاصل کیا

تھا، تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم و ناشر تھے۔“

مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی، اس لیے ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے،

نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے، اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے، نہ اس کی

ان کو پروا تھی، علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلیم و تعلم کا سلسلہ

منقطع نہیں ہوتا تھا، بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے

لکھے اور وہ بھی نا تمام رہ گئے، تمام مسائل علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور جب کوئی کتاب

پڑھاتے تھے، تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فرور و گزاشتوں سے تعرض کرتے تھے۔

میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میرزا ہد، ملا جلال مح میرزا ہد، حمد اللہ، شرح مطالع

صدرا، شمس بازغدا نہی سے پڑھیں اور میری تمام تراکیبات انہی کے افادات ہیں، فارسی کا مذاق بھی

انہی کا فیض ہے، اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے۔

چوں کہ ان کی کوئی علمی تصنیف شایع نہیں ہوئی، اس لیے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں، کہ

”مثنیٰ نمونہ از خروارے“

رسیدی در بودی دین و دل در جنبش چشمے بہ یک گردش چو جام بادہ کارم ساختی رفتی

بہ گلشن آمدی و غنچہ را در خوں جگر کردی نسیم آسا سمنند ناز بر گل تاختی رفتی

نہ دارد دل و گر تابہ طہیدن نگاہ خویش را رحم آشنا کن

نہ دارد چشم من تابہ جمالت بیا چوں مرد مک در دیدہ جا کن

زمانہ گر زنجہ حکم تو بہ پیچد سر دو رشنہ شب و روزش بہ تن شود ز تار

مولانا فاروق مرحوم منطق کی تعلیم صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی بھی دیتے تھے، یعنی نسبتاً اربعہ

قضایا اور اشکال سب کی باقاعدہ مشق کراتے تھے اور اس کے لیے شرح مطالع کا درس خاص طور سے دیتے تھے، چنانچہ مولانا شبلی مرحوم کو بھی ان کی مشق کرائی تھی اور اس کا درس دیا تھا، دارالعلوم میں مولانا فاروق صاحب نے ہماری جماعت کو بھی تہذیب اسی اصول سے پڑھائی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا شبلی اپنی تحریر و تقریر میں منطقی ترتیب کے خوگر اور مناظروں میں مشاق ہو گئے تھے اور منطقی اور فن مناظرہ کے اصول سے ان کا ہر قدم اٹھتا تھا اور پڑتا تھا۔

استاد و شاگرد میں اتحاد مذاق کی متعدد جہتیں جمع ہو گئی تھیں، اسی اتحاد مذاق نے استاد و شاگرد کے معنوی ربط کو اور زیادہ قوی کر دیا اور بالآخر جس طرح استاد کی کشش شاگرد کو غازی پور کھینچ کر لے گئی تھی، اب شاگرد کی کشش استاد کو اعظم گڑھ کھینچ لائی، یہ واقعہ غالباً ۱۲۹۰ھ کے پس و پیش کا ہے، اسی مدرسہ میں جو شیخ صاحب نے قائم کیا تھا، مولانا فاروق صاحب مدرس اول ہوئے، باہر سے بھی کچھ طلبہ کھینچ کر آئے، جن میں سے صرف ایک کا نام مجھے معلوم ہے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم جو ڈاکٹر انصاری کے مختصر نام سے معروف تھے اور جو یوسف پور ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے، ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم عبدالوہاب صاحب جو ”حکیم نابینا“ کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، اسی زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے پڑھتے تھے، شاید ۱۹۲۳ء میں حکیم صاحب سے بمبئی میں میری ملاقات ہوئی تھی تو وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے اور اس مدرسہ کا حال پوچھتے تھے۔

مولانا شبلی جیسا طبائع تلیند اور مولانا فاروق کا ساتھ استاد فیض تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، چند ہی دنوں میں یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں اور ہونہار شاگرد استاد کے لیے مایہ ناز بن گیا، چنانچہ مولانا فاروق صاحب اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے تھے، اَنَا اَسْتَدٌ وَاَنْتَ سَيِّدِي (میں شیر ہوں اور تو چیرہ شیر) اس میں شبلی کی تلمیح قابل توجہ ہے۔

فلسفہ کی تعلیم پر استاد نے پوری ہمت صرف کی تھی اور شاگرد نے بھی پوری محنت سے حاصل کی تھی، ایک خط میں خود لکھتے ہیں، میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہا (شروانی-۲۳) اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے علم کلام کی مہارت اور دل چسپی میں اس فن کی مہارت نے خاص طور سے مدد دی۔

۱۔ افسوس کہ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق مئی ۱۹۴۱ء میں دہلی میں وفات پائی۔

مولانا کو سا لہا سال کے بعد بھی جب فلسفہ کا مشغلہ چھوٹ گیا تھا، فلسفیانہ مباحث پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ۱۹۰۵ء میں ہمارے درجہ میں شمس بازنہ کا سبق شروع ہوا اور اس اہتمام سے شروع ہوا کہ ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب پوری تیاری سے اس کو پڑھاتے تھے اور مولانا درجہ میں آکر اس پر اعتراض وارد فرماتے تھے اور دونوں میں دیر تک رد و قدح جاری رہتی تھی اور ہم لوگ جو تمنا کرتے تھے، ہمارے عزیز دوست مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ان دنوں ٹونک میں سلسلہ خیر آباد کے مشہور مدرس مولانا حکیم ابوالبرکات سے فلسفہ پڑھتے تھے، جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتے تو راستہ میں لکھنؤ میں ہم لوگوں کے پاس ٹھہر جاتے، مولانا کا قیام اس زمانہ میں ندوہ ہی میں تھا، مولوی مناظر احسن صاحب ان کے پاس دو ایک دفعہ ملنے گئے تو سلسلہ خیر آباد کے تعلق سے ان سے بعض فلسفیانہ مسائل امتحاناً پوچھے اور اس کے بعد ان پر ایسی اچھی بحث فرمائی کہ مولوی مناظر احسن صاحب اب تک اس کی مدح فرماتے ہیں۔

مدرسہ اسلامیہ اعظم گڑھ کی ویرانی کا منظر | مولانا نے قریب قریب درجہ فراغ تک اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے تعلیم پائی، یہ مدرسہ اعظم گڑھ کی موجودہ آبادی سے دکن طرف پرانی تحصیل سے متصل واقع تھا، اب یہاں کوئی آبادی باقی نہیں رہی ہے اور یہ سارا حصہ کھیت ہو گیا ہے، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ مولانا مرحوم آخر عمر تک جب کبھی اعظم گڑھ آتے تو اکثر اس موقع پر تشریف لے جاتے اور تاثر کی جو کیفیت اس وقت مولانا پر ہوتی، وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، زبانِ قلم اس کی صحیح مصوری سے عاجز ہے، ایک مرتبہ وہ بھی ساتھ تھے، شام کا وقت تھا اور غالباً جنوری یا فروری کا مہینہ، سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے، بہار کا ولولہ انگیز موسم، شام کا سہانا وقت، کھیتوں کی طراوت بخش ہریا دل ایک ایسا روح پرور سماں تھا کہ مغموم سے مغموم دل بھی تھوڑی دیر کے لیے باغ باغ ہو جاتا، مگر مولانا تھے کہ چلتے چلتے دفعہ ایک کھیت کی مینڈ پر رک گئے، آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے اور اپنے دل گداز لہجہ میں یہ اشعار ترنم فرماتے رہے:

جائیکہ بود آں ولستاں در بوستاں بادوستاں	شد زان و کرگس رامکاں شد مرغ و ماہی را وطن
از فر یار خرگبی ایواں ہی بینم تہی	وز قد آں سرو سہی خالی ہی بینم چہن
بر جائے رطل و جام سے گوراں نہا دستد پے	بر جائے چنگ دنائے ونے آواز زان است و ذن

جب ذرا سکون ہوا تو ارشاد فرمایا میری نگاہوں میں تو وہ سماں پھر رہا ہے، جب اسی مقام پر مولانا فاروق مرحوم شرح مطالعہ کا درس دیا کرتے تھے، آج یہ عالم ہے کہ درود دیوار کے نشان تک باقی نہیں رہے۔

ققا نیک من نذکرئ حبیب و منزل

رام پور اور لاہور کے تعلیمی سفر ۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۲ھ | علامہ مرحوم نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولانا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن ان کے ذوق علمی نے ان کو دوسرے خرمونوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانہ عصر سمجھے جاتے، ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامن گیر ہوا، مولانا کے والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے، علاوہ بریں وہ باضورت شدید اپنے نوردیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے، مگر مولانا کی والدہ نے جو بہت باہمت خاتون تھیں، مولانا کی بے تابی شوق کو ناکام دیکھنا گوارا نہ کیا، ان ہی کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولانا نے طلب علم کے شوق میں دیار وطن کی دل چسپیوں کو خیر باد کہا۔

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا، زیادہ تر مشاہیر علما اپنی اپنی جگہ پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے، یہی آستانے اس وقت کی یونیورسٹیاں تھیں، لکھنؤ میں مولانا عبدالحق فرنگی محلی مرحوم کے دم سے بہار علم تازہ تھی، سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث اور یوبند میں مولانا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز مرحوم کا سلسلہ فیض جاری تھا، رام پور میں خلد آشتیاں نواب کلب علی خاں کی جو ہر شناسیوں نے ہر فن کے ارباب کمال یک جا کر دیے تھے، راقم نے خود استاذ مرحوم کی زبانی سنا ہے کہ اول اول ان کو مولانا عبدالحق فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی، مگر علامہ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کے بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اس لیے زانوے ادب سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے اور رام پور کا رخ کیا، یہاں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتاے روزگار تھے، معقولات میں سلسلہ خیر آباد کے خاتم مولانا عبدالحق خیر آبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی، ابتداءً مولانا کی خواہش تھی کہ دونوں سے استفادہ کریں، مگر ان بزرگ و اروں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقہ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا، مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا۔

مولانا ارشاد حسین رام پوری | معقولات میں مولانا فاروق کے فیض سے خود علامہ مرحوم کی بصیرت

اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی، اس لیے صرف مولانا ارشاد حسینؒ کے شرفِ تلمذ پر اکتفا کی، علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعتِ نظر، اصابتِ رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر برسبیل تذکرہ ان کے کمالِ فہم و ادراک اور قوتِ تفقہ کے واقعات بیان فرماتے، مولانا ارشاد حسین نہایت متشددِ حنفی تھے، مولوی نذیر حسین صاحب کی معیارِ الحق کے جواب میں انحصارِ الحق انہی نے لکھی ہے اور علامہ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا، غالباً یہ بھی ایک وجہ انتخاب ہوئی ہو، بہر حال مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے حلقہٴ درس میں بیٹھ کر فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی، یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی۔

دیوبند کی حاضری | اس زمانہ میں دیوبند کے مدرسہ میں مولانا کے چند ہم وطن اور ہم عمر دوست جیسے مرزا محمد سلیم جو بعد کو وکیل ہوئے، پڑھتے تھے، اس کشش سے وہ دیوبند گئے اور ایک مہینہ کے قریب رہے، تعلیم میں شرکت نہیں کی، مگر فرائض کا علم یہیں سیکھا، یا فرائض کا رسالہ یہیں پڑھا، مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ سے بعض کتابیں اس زمانہ میں پڑھنے کو ملی تھیں جن پر مولانا نے اپنا نام لکھا تھا، وہ کتابیں وہاں اب تک ہیں اور ان پر ان کا نام لکھا اب تک موجود ہے۔

مولانا فیض الحسن لاہور | اس زمانہ میں مولانا فیض الحسنؒ ٹیہار پوری پروفیسر اور ٹیٹل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امامِ الادب پیدا کیا ہو، طلب علم کی لے مولانا ارشاد حسین صاحب حضرت مجددِ الف ثانی کی اولاد میں تھے، کتب معقول لکھنؤ میں پڑھی تھیں، اور باقی علوم ملا نواب صاحب افغانی سے جو اس عہد کے بڑے باکمال عالم تھے، حاصل کیے تھے، شاہ احمد سعید جو دیوبندی دہلوی کے مرید تھے، ظاہرِ باطن دونوں آراستہ تھے، نواب کلب علی خاں مرحوم ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی، تفصیل کے لیے دیکھئے تذکرہ کاملانِ رام پور، حافظ احمد علی خاں شوق، ص ۳۰۔ ۲ مولانا فیض الحسن صاحب سہارن پوری سلسلہ خیر آباد کے حلقہٴ زیریں میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے، مولانا خیر آبادی معقولات اور ادب عربی دونوں کے استاد تھے، عربی قصائد ان کی یادگار ہیں، موصوف نے ۱۲۷۸ھ میں قید فرنگ میں جزیرہ انڈمان میں وفات پائی، مولانا فیض الحسن صاحب کا بڑا فیض یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں انقلاب پیدا کر دیا اور متاخرین سے ہٹ کر طلبہ کو قدیم شعرائے ادب کی طرف متوجہ کیا، حماسہ کا درس ان ہی نے رائج کیا، اور حماسہ کی شرح فیضی کے نام سے ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۴۷ء میں لکھی، ان کا عربی دیوان ان کے شاگرد مولانا حمید الدین صاحب نے ۱۳۳۳ھ میں حیدرآباد میں چھپوایا ہے، اور خود مولانا فضل حق صاحب نے یہ فیض حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے حاصل کیا تھا، حضرت شاہ صاحب عربی کے ایسے ادیب و شاعر تھے کہ خود عربی کے اہل زبان ان کا لوہا مانتے تھے۔

تفنگی نے اس چشمہ فیض سے بھی شاد کام ہونا چاہا اور سفر پنجاب کے لیے کمر بستہ ہو گئے، اولاً مولانا کے والد اتنے لمبے سفر کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے، دوسرے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ تعلیم ختم ہو چکی اب وکالت کے امتحان کی تیاری کریں، مگر آخر کار مولانا کے عزم و استقلال کو یہاں بھی فتح ہوئی اور صرف پچیس ۲۵ روپیہ زادراہ لے کر لاہور چل کھڑے ہوئے، ان دنوں اعظم گڑھ تک ریل نہ تھی، اعظم گڑھ سے جون پور تک تین روپیہ کا ایک کرایہ کیا، اس پر آئے، جون پور سے سہارن پور تک سات روپیہ کا اور سہارن پور سے لاہور تک پانچ روپیہ کا ٹکٹ لیا، طبیعت چوں کہ ہمیشہ خوددار اور غیور تھی، اس لیے عربی کے عام طالب علموں کی طرح خانہ خدائیں ناخواندہ مہمان بن کر جاگیر کی روٹیوں سے شکم سیری گوارا نہ کر سکے، ایک روپیہ مہینہ کے کرایہ کا ایک چھوٹا سا مکان یا کمرہ لیا اور آٹھ دس روپیہ میں دو مہینے کسی نان بانٹی کی دوکان سے کھانے کا بندوبست کیا اور اتنے زمانہ تک تنگ دستی کی تکلیف کو ہنسی خوشی جھیل لیا، مگر والد بزرگ وار کو اس لیے زحمت نہ دی کہ وہ اس سفر پر دل سے راضی نہ تھے۔

یہ پوری داستان خود مولانا کی زبان سے سننے، دو مہینوں کے بعد جب ہاتھ بالکل خالی ہو گیا تو مجبوراً اپنے والد ماجد کو لکھا، ”مرا دو ماہی گذر کہ ترک وطن کردہ ام و بہ بے بانگاں بسر بردہ ام بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود سہ روپیہ کرایہ یکہ از اعظم گڑھ تا جون پور رفت ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارن پور شدہ بود پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دہ روپیہ باقی ماند، اول کہ دریں جا رسیدیم در یک روپیہ بہ حوائج ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید صرف شد۔“

مکانے بہ کرایہ یک روپیہ گرفتیم، دو ماہ را در روپیہ کرایہ می شود، آنچه باقی می ماند بہ صرف طعام آمد، اگر انصاف رود بہ چنداں کفایت بسر بردہ ام کہ پیش از و تصور نیست چوں مزاج عالی اند کے برہمی داشت از تکلیف ارسال صرف باز ماند، انکوں کار مشکل افتادہ است، دیگر چہ گویم (مکاتیب نامہ فارسی) اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دل وادگان کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں، اسی سلسلہ میں طریق درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے بزرگوں میں علمی شغف کتنا تھا، موجودہ دور کے آرام طلب طالب علم اور عیش پسند استاد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مولانا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے، اس لیے زیادہ وقت وہیں صرف ہو جاتا، بقیہ وقت

بھی خالی نہ تھا، کیوں کہ متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کر رہے تھے، جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا، اور ہر ایک کے اوقات مقرر تھے، اس ماحول میں اگر کوئی اور استاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کرتا اور مولانا کے بہ جائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا، جس کو ان ہی وقتوں کا سامنا کرنا پڑتا، تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا، مگر ایک طرف تو مولانا شبلی کا عزم راسخ بے ٹیل مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، دوسری جانب مولانا فیض الحسن کا ذوق افزا ایسے مشتاق و مستعد طالب علم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا، آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے، اسی میں مولانا ادبیات کا درس لیا کریں، یعنی آنے جانے میں معلم یا معلم کا جو قدم بھی اٹھے، وہ بھی افادہ و استفادہ علم سے خالی نہ ہو۔

بیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

اسی تعلیم کے زمانہ میں تعطیل ہوئی اور مولانا فیض الحسن صاحب دو ماہ کے لیے سہارن پور اپنے وطن تشریف لے گئے تو اس خیال سے کہ ناعنہ ہوشا گردنے بھی ساتھ ہی سفر کا ارادہ کیا، اپنے والد کو لکھتے ہیں:

”حضرت استاذ بہ وطن خویش یعنی سہارن پور تشریف خواہند برد این قدر ناعنہ نتواں کرد، مرا ہم عزم سہارن پور است دیگر ہر انچہ مرضی باشد“ مولانا کے لیے مولانا فیض الحسن صاحب کی یہ صحبت بہت موثر ثابت ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ اس درس نے مولانا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حد کمال کو پہنچایا، مولانا فاروق مرحوم نکتہ آفرینی کے دل دادہ تھے اور وہ متاخرین شعرائے عرب کو جن کا سرخیل منتہی ہے، شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کا بھی ابتدائی مذاق غالباً یہی رہا ہوگا، مگر لاہور آئے تو دنیا بدل گئی، شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ اور رفتہ زبان دل میں اتر گئی، یہاں تک کہ مولانا نے حماسہ گویا حفظ کر ڈالا اور آخر عمر تک بلا ناعنہ صحیح کوحماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔

جمہرۃ العرب شعرائے جاہلیت کے قصائد کی دوسری کتاب تھی، جو مولانا فیض الحسن صاحب کے ذریعہ سے ان تک پہنچی اور پڑھی اور اس کو استاد سے مانگ کر ساتھ لائے اور مولانا فاروق صاحب کو دیکھنے کو دی، ایک خط میں لکھتے ہیں ”نامہائے حضرت مولانا فیض الحسن پے در پے می رسند، جمہرۃ العرب از مولوی فاروق صاحب طلب دار دو بہ من بنویس“ (نامہ فارسی-۲۳)

مولانا کو سادہ عربی نگاری کا شوق جا حظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا جو انہیں علی گڑھ آنے کے بعد ملیں، مگر پھر بھی اس کا تخم مولانا فیض الحسن صاحب ہی کی صحبت میں پڑ چکا تھا، چنانچہ اسی زمانہ کا ان کا ایک عربی خط مجھے ملا ہے، جو آگے نقل ہوگا۔

مولانا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی، مولانا فیض الحسن صاحب اسی اصول سے قرآن پاک کا با محاورہ اردو ترجمہ اپنے خاص طالب علموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے، مولانا شبلی مرحوم میں یہ ذوق الخیر تک رہا، ندوہ کے ایک جلسہ کی تقریر میں جو چھپی ہوئی ہے ادھر اشارے ہیں، حیدرآباد میں اس موضوع پر پوری تقریر فرمائی، دارالعلوم ندوہ میں آ کر چند طالب علموں کو جن میں یہ خاک سار بھی تھا، قرآن پاک کے اعجازی نکتوں پر متعدد درس دیے۔

غرض اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا فیض الحسن صاحب کے قلیل المدت درس کا نقش علامہ مرحوم پر کس قدر گہرا پڑا تھا، یہی وجہ تھی کہ استاذ مرحوم کو اپنے اساتذہ میں سے مولانا فیض الحسن صاحب کے ساتھ مخصوص شیفتگی تھی، مولانا کے ان جذبات کی ہلکی سی جھلک اس مرثیہ میں صاف طور پر نمایاں ہے، جو مولانا فیض الحسن مرحوم کی وفات پر خاص عالم تاثیر میں لکھا ہے، اس مرثیہ کا پہلا بند ان اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

دریں آشوبِ نمِ عذرم بند گرنالہ زنِ گریم	جہانے را جگر خوں شد ہی تنہا نہ منِ گریم
بہ تخمینِ صبوری چند بفر تہی مرا ناصح	دے بگذار تا در ماتم فیض الحسنِ گریم
بہ مرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد	ہنر بر خویشتن گرید چون بر خویشتنِ گریم
گہے بے خود بہ برہم گشتن بزمِ ہنر نالم	گہے بے خویش بر روز سیاہ علم و فنِ گریم

آگے چل کر دوسرے بند میں فرماتے ہیں:

نہ گویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید	عرب رازندہ کردن و آنگہ از ہندوستان بودن
بہ آئینِ دری بر جادۂ پیشینان رفتن	بہ آہنگِ حجازی یادگارِ پاستاں بودن

مولانا فیض الحسن صاحب نے ۱۳۰۴ھ سے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی، سید سجاد حیدر صاحب (علیگ) بیان کرتے تھے کہ مولانا کو اس سانحہ کا حال کالج میں عین درس میں معلوم ہوا، سننے کے ساتھ آنکھیں ڈبڈبا

آئیں اور ہم طالب علموں سے کہا کہ چلے جاؤ، اور اسی اثر میں ان کا وہ مرثیہ لکھا جو ان کے کلیات میں ہے۔ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری سے تعلیم حدیث اس زمانہ کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم و فنون سے فراغت پالیتے تھے تب حدیث پڑھتے تھے، اسی اصول پر مولانا نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پا کر حدیث کی طرف توجہ فرمائی اور جس طرح انہوں نے دوسرے فنون کی تعلیم کے لیے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو اس فن میں ریگانہ تھے، اسی طرح حدیث کے لیے بھی انہوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث کا انتخاب کیا، مولانا اپنے شیخ حدیث کو اکثر ہمارے مولانا کہا کرتے تھے۔

مولانا احمد علی سہارن پوری اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے، پہلے ہندوستان میں مولانا شیخ وجیہ الدین صدیقی سہارن پوری اور مولانا عبدالحی (تلمیذ مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے) حدیث پڑھی، پھر ۱۲۶۱ھ میں مکہ مکرمہ جا کر حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی مہاجر سے دوبارہ پڑھی اور سند و اجازت حاصل کی، اُس زمانہ میں علمائے احناف میں موصوف سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، علاوہ درس و تدریس سے مولانا سہارن پوری کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کر کے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شایع کی، مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ استاذ مرحوم نے بیس برس کا حل بخاری کی تصحیح و تخریج میں بسر کیے، اس زمانہ کے اکثر بڑے بڑے علمائے احناف محدث سہارن پوری کے شاگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ ^{عفت} وکست کی برکت بھی عطا فرمائی تھی، پہلے کتابوں کی تصحیح و طباعت کی، پھر دوسری تجارتوں میں مصروف ہوئے، بایں ہمہ مولانا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ وہ بے حد منکسر، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور جماعت میں شامل ہو کر واپس آ جاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے، مولوی شبلی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دفعہ بازار میں مولانا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہولیا کہ سودا میں لے لوں، مگر مولانا کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے لے کر گھر واپس آئے۔

۷ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو سہارن پور میں وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی مال و دولت سے بھی متمتع فرمایا تھا، حج سے واپس آ کر دہلی میں مطبع قائم کیا اور کتب حدیث کی طبع و اشاعت فرمائی، اس کام میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی، مگر ۱۸۵۷ء کے غدر

میں سب کچھ لٹ گیا دو برس تک اپنے مکان ہی میں بیٹھ کر درس دیتے رہے، پھر شیخ الہی بخش صاحب رئیس کپ میرٹھ کی طرف سے کلکتہ جا کر کاروبار جاری کیا، جس سے آپ کو پانچ سو ماہ وار کی آمدنی تھی، اس زمانہ میں بھی شیخ صاحب کی اجازت سے صبح سے ۹ بجے تک مسجد حافظ جمال الدین صاحب میں جا کر درس دیتے تھے، تقریباً دس برس کلکتہ میں قیام رہا، اس کے بعد جب آپ کی عمر ساٹھ برس کی ہوئی تو استعفادے کر کلکتہ سے چلے آئے اور پھر وطن میں بیٹھ کر ہمدن درس حدیث میں مصروف ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بھی برکت بخشی اور سیکڑوں علما اس فیض سے سرفراز ہوئے۔

آپ کی سند حدیث کو ہم یہاں تبرکاً اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا شبلی کی سند بھی اپنے استاد سے اسی سلسلہ میں ہو سکتی تھی۔

سند حدیث | الحمد لله رب العالمین، والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی الہ وصحبہ اجمعین، اما بعد فیقول العبد الضعیف محمد اسحق عفی عنہ ان الشیخ الناسک الحافظ احمد علی السہارنفوری قد حصل قراءة كتب الحديث وسمعها عندي في مكة المعظمة زاد الله شرفاً وتكريماً بهذا التفصيل، إن الحافظ الموصوف قرء طرفاً من الصحيح البخاری وطرفاً سمع بقراءة الغير علی وكتاب تيسير الاصول والجامع لابی عيسى الترمذی وشمائله وكتاب النسائی وابن ماجة القزوينی والمؤطا للامام محمد بن الحسن الشيباني ومسند ابی حنيفة من رواية الخصكفي والعدد لمحمد بن محمد الجزري صاحب الحصن الحصين قرأه علی من اولها الى آخرها بلا مشاركة الغير في القراءة وكتاب الصحيح لمسلم وسنن ابی داؤد ايضاً اسندهما علی بتمامها قراءة وسماعة ومسند الدارمی قرأ علی قدراً معتداً وشيئاً من الجامع الصغير للسيوطی ومشكوة المصابيح والحصن الحصين والحرب الاعظم والورد الافخم لعلی القاری وايضاً سمع بقراءة الغير علی شرح النخبة في اصول الحديث وقرأ علی من التفاسير شيئاً من المعالم للبعثي والبيضاوي والجلالين وجامع البيان وتفسير الرحمانی وحصل لي الاجازة والقراءة والسماعة من الشيخ الاجل والحبر الاجل الذي فاق بين الاقران بالتمييز اعنى الشيخ عبدالعزيز رحمه الله تعالى وحصل له الاجازة والقراءة والسماعة

۱۔ یہ سند اور مولانا احمد علی صاحب کے حالات میں نے ان کے صاحب زادہ مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری مرحوم سے خط لکھ کر منگوائے تھے۔ ”س“

من والده الشيخ ولى الله بن الشيخ عبدالرحيم الدهلوى واسانيد اكثر الكتب موجودة فى تصانيفه وقد اجزت الحافظ الناسك الشيخ احمد على قراءة الكتب المذكورة ان يشتغل بها ويعلم المستفيدين بالشروط المعبرة عند اهل الحديث والله المستعان وعليه التكلان وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

محمد اسحاق ۵۱۲۵۸

طالب علمی میں مناظروں کا شوق | مولانا کی تعلیم میں منطق کی عملی مشق کی جو کوشش مولانا فاروق صاحب نے فرمائی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر بلکہ ہر مدعیانہ گفتگو میں منطقی ترتیب، استدلال اور اصول مناظرہ کو پیش نظر رکھتے تھے اور اس حیثیت سے ان کے عہد کے طالب علمانہ حلقوں میں ان کا نام خاص امتیاز رکھتا تھا، وہ جب طالب علموں کی کسی مجلس میں پہنچ جاتے کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث چھیڑ جاتی اور یہ اس زمانہ کا عام طرز تھا کہ طلبہ میں بات بات پر مناظرے ہوتے تھے، اس طرز میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ تیز اور ذہین طلبہ کی علمی مشق اس کے ذریعہ سے بڑھ جاتی تھی، مسائل زبانی یاد رکھنے کی عادت پڑتی تھی، باہمی منافست اور مسابقت میں طالب علم شروع و حواشی پڑھنے، سوال و جواب کرنے اور ہر روز کچھ آگے بڑھنے کے خوگر ہو جاتے تھے۔

مولوی حافظ شاہ تجل حسین صاحب (دیسوی بہاری) جو مولف کے ہم وطن اور رشتہ میں چچا تھے، وہ مولانا شبلی مرحوم کے ساتھی اور بعض بعض مدرسوں میں ان کے رفیق تھے، ایک دفعہ لکھنؤ میں میرے سامنے دونوں کی ملاقات ہوئی اور بے تکلفی کی طالب علمانہ زندگی شروع ہو گئی، مولانا نے حافظ صاحب ۱۔ حافظ شاہ تجل حسین صاحب مرحوم نے بڑے بڑے علما کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے واقعات و حکایات دہراتے تھے تو سننے والے کو بڑا کیف آتا تھا، مولانا شاہ فضل رحمن صاحب گنج مراد آبادی کے مرید و خلیفہ تھے، بڑے باغ و بہار آدمی تھے فکر و غم کبھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا، باتیں بہت ظریفانہ کرتے تھے، ہر محفل اور مجلس میں وہ دل چسپ ثابت ہوتے تھے، اونچے اونچے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں تھیں، منشی امتیاز علی صاحب دزیر کے زمانہ میں جو پال میں یہ ضمن علما ان کا وظیفہ تھا، اور وہیں رہتے تھے، وہ کبھی کسی سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے، اور کبھی کسی کی کڑی سے کڑی بات کا جواب نہیں دیتے تھے، ہمیشہ ہنس کر نال دیتے تھے، مولانا شاہ فضل رحمن کی مدتوں صحبت اٹھائی تھی، ان کے حالات میں فیض رحمانی وغیرہ کئی کتابیں ہیں، 'مولد ابی قاسم' سیرت میں ان کا چھوٹا سا رسالہ ہے، عمر بھر جہاں رودی میں بسر کی، اخیر عمر میں اپنے وطن (دینہ، ضلع پٹنہ) میں بڑی عمر پا کر ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ کو وفات پائی اور وہیں وہاں کی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے، مکاتیب شبلی فارسی ۶ میں انہی حافظ تجل حسین صاحب کا ذکر ہے۔

سے فرمایا کہ تم میرے شاگرد ہو میں نے تم کو قطبی (منطق کی ایک کتاب) پڑھائی تھی، حافظ صاحب نے جواب دیا تم مجھے قطبی پڑھاتے تھے کہ بڑا خوش بنا کر اپنی منطق صاف کرتے تھے، پھر حافظ صاحب نے اپنا دوسرا احسان یاد دلایا کہ وہ یاد ہے جو سہارن پوری کی جامع مسجد میں تم سے اور مفتی عبداللہ ٹوکنی سے مناظرہ ہوا تھا اور پنجابی طلبہ ان کے ساتھ اور پوری تمہارے ساتھ تھے اور آخر مناظرہ نے مجادلہ کی صورت اختیار کر لی اور ہم لوگ تم کو اپنی حفاظت میں لے کر قیام گاہ پر لوٹے وہ یہ کہہ رہے تھے اور مولانا مسکرا رہے تھے۔

مولانا نے خود بھی مکاتیب میں مفتی عبداللہ صاحب ٹوکنی کو اپنا ہم سبق لکھا ہے (شروانی - ۹۱)

ہم سہتی سہارن پوری میں ہوئی، جب وہ اور مولانا دونوں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری سے پڑھتے تھے، مفتی صاحب کے صاحب زادہ مفتی انوار الحق صاحب کی کتاب اثبات الوجود پر الزمہ (ستمبر ۱۹۱۰ء)

میں لکھتے ہیں ”وہ زمانہ یاد آگیا جب ہم اور مولانا نے ممدوح (مفتی عبداللہ صاحب) ایک ساتھ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے فیض سے خوشہ چینی کرتے تھے، سہارن پور جانے کے لیے جب مولانا گھر سے نکلے تو پہلی منزل لکھنؤ پڑی، یہاں ان کے بعض احباب فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب سے پڑھتے بھی تھے، وہ طالب علموں کے مجمع میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں جا کر ٹھہرے اور مناظرے شروع ہو گئے، مولانا نے جب اسکاٹ المعتدی لکھی ہے تو اس کے جواب میں مولوی نور محمد صاحب ملتان نے ۱۲۹۸ھ میں تذکرۃ المستنبی لکھی، اس کے دیباچہ میں مولانا کے متعلق عربی میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ یہ مسجد لکھنؤ میں چوک کے بیچ میں اب بھی ہے، اوپر مسجد ہے نیچے دوکان ہے، مسجد میں ایک دو چھوٹے حجرے ہیں، یہ مسجد ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے ایک طرف فرنگی محل ہے جہاں عربی کے طلبہ پڑھتے تھے اور دوسری طرف جمہوری ٹولہ ہے، جہاں طب پڑھنے والے پڑھتے ہیں، اس لیے یہاں علوم عربیہ اور فنون طبیہ کے طالب علموں کا ہمیشہ ہنگامہ رہتا تھا، کوٹھریوں میں طلبہ کا مختصر سامان رہتا تھا، صحن میں ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا تھا، گوحالات بدل گئے ہیں مگر مسجد کی یہ خصوصیت اب بھی کسی قدر باقی ہے، طالب علمی میں سیکڑوں علاقے جید کے قیام کا شرف اس کو حاصل ہے۔

استاذی مولانا حفیظ اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ حیدر بخش مرحوم واجد علی شاہ کی کسی بیگم کی سرکار میں داروغگی

کی خدمت پڑوس چندرہ روپے کے ملازم تھے، داروغہ اس زمانہ میں نگران کا کو کہتے تھے، اس زمانہ میں بیگمات جو پاپوش پہنتی تھیں ان میں موتی نکلے رہتے تھے یہ پاپوشیں پرانی ہونے پر داروغہ صاحب کو مل جاتی تھیں، وہ ان کے موتی الگ کر کے جوہریوں کے ہاتھ بیچ دالتے تھے، اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے، اور اس سے بڑی دولت پیدا کر لی تھی، انہی نے یہ مسجد غالباً ۱۷۸۰ء کے قریب بنوائی تھی، اور مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے اس کا افتتاح اپنے وعظ سے فرمایا، مولوی حفیظ اللہ صاحب اسی زمانہ میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے پڑھنے کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے، اور مولانا عبدالحی صاحب کی سفارش سے اس کا ایک حجرہ ان کو رہنے کے لیے ملا، فرماتے تھے کہ اس وقت وہ بالکل تازہ بنی ہوئی تھی۔

”مصنف اسکاٹ السعدی کی جب اپنے رام پوری استاد (مولانا ارشاد حسین) کے پاس جا رہا تھا تو لکھنؤ میں ٹھہرا، اور یہاں طالب علموں کی گرفت میں آ گیا تھا، طالب علموں سے مناظرہ کرتا تھا اور اس میں غیظ و غضب ظاہر کرتا تھا اور گفتگو میں بند ہو جاتا تھا تو جس کا حال طالب علموں کے مقابلہ میں ایسا ہو وہ علما کے مناظرے کے قابل ہے؟“

مولانا جب رام پور پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب رام پور میں مولانا عبدالحق خیر آبادی بن مولانا فضل حق خیر آبادی کے سبب سے معقولات کا بڑا شہرہ تھا، ہر طرف منطق اور فلسفہ کے بیچ در بیچ مباحث پر علما کی آستینیں چڑھی رہتی تھیں، یہی اثر وہاں کے طلبہ پر بھی تھا، مولانا رام پور پہنچے تو ہر طرف سے طالب علموں نے گھیر لیا، آخر ہر طرف سے سمٹ کر مولانا ارشاد حسین صاحب کے درس میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شکر لکھتے ہیں کہ جب مولانا شبلی علی گڑھ سے جا رہے تھے تو لکھنؤ ٹھہر گئے اور میں وہیں داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا اور ان کے چہرہ سے محسوس کرتا تھا کہ یہاں کے طلبہ میں سے ہر ایک کو وہ وحشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے، مگر باوجود اس وحشت کے طلبہ ہی میں سے تھے، جس وحشت و بدگمانی کا ذکر مولانا شرفر فرماتے ہیں، وہ اسی مناظرانہ عادت کا اثر تھا۔

تکمیل | مولانا احمد علی صاحب کا آستانہ علم مولانا کی آخری درس گاہ تھی، اس وقت سنن ترمذی کا درس ہو رہا تھا، کہ مولانا کے والد اور خاندان کے بعض اعزہ نے حج کا قصد کیا، مولانا کو بھی اس سفر کا شوق دامن گیر ہوا مگر ادھر حدیث رسول ﷺ کی کشش تھی اور ادھر روضہ رسول ﷺ کی، اس کشش میں مولانا نے خود اپنے شیخ کو اپنا رہبر بنایا اور ان سے مشورہ چاہا فرمایا کہ پڑھنا تو ہر وقت ہو سکتا ہے اور یہ سفر ہر وقت میسر نہیں آ سکتا، چنانچہ مولانا نے بھی عزم سفر کیا اور سہارنپور سے بمبئی کو روانہ ہو گئے۔

اس وقت مولانا کی عمر ۱۹ برس کی تھی اور کل مدت تحصیل چودہ برس ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۷۹ھ/۱۸۶۳ء سے تعلیم شروع اور ۱۸۷۳ھ/۱۸۶۶ء میں تمام ہوئی۔

سفر حج ۱۸۷۳ھ/۱۸۶۶ء | بمبئی سے حاجیوں کے اس مقدس قافلہ کے ساتھ مولانا بھی حجاز کو روانہ ہو گئے، اس واقعہ کا ذکر مولانا نے اپنے اس قصیدہ کے ایک شعر میں کیا ہے، جس میں انہوں نے ۱۸۹۲ء میں سفر قطنیہ کے واقعات کو نظم کیا ہے۔

فارغ از حج و زیارت چومرا کرد خدائے خواستم تا بسوئے روم شوم راہ مپہر
تذکرہ علمائے حال مولوی ادریس صاحب نگر امی، مطبوعہ نول کشور و انگریزی مضمون شاہ منیر عالم صاحب غازی پور

شایع شدہ مسلم ریویوالہ آباد، اگست ۱۹۱۰ء، ص ۵۲۔

مولانا کے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض سے ایک مثنوی کے وہ چند شعر ملے ہیں، جن کو مولانا نے روضۃ الطہر کے سامنے پڑھا تھا:

اے بہ کرم کار جہاں کرد ساز مر ہمہ را پیش تو روے نیاز
چو بہ درت آمدہ ام با امید از کرم خویش مکن نا امید
چوں بہ درت آدم امیدوار سایۂ لطفی ز سرم بردار

اس مذہبی سفر میں مولانا کی علمی تگ و دو بھی جاری رہی، چنانچہ مدینہ منورہ میں جو کتب خانے ہیں، ان سب کی سیر کی، فرماتے تھے کہ فنون حدیث کا جو ذخیرہ وہاں دیکھا کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آیا، ابن عبدالبر کی کتاب التمهید کا جو مؤطا امام مالک کی شرح اور حدیث کی دائرۃ المعارف ہے، ایک مرتبہ ذکر آگیا تو فرمایا ”میں نے مدینہ منورہ میں اس کا قلمی نسخہ دیکھا تھا۔“

اس سفر کے بعض عجیب اثر انگیز واقعات سنایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ ایک صاحب حال ہندی حاجی کے والہانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ برہنہ پا کوے یار کی منزلیں ملے ہو رہی تھیں، تلوے کاتوں سے چھلنی ہو رہے تھے، وہ چلتے چلتے تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تھے اور مونچھوں سے کانٹے نکال رہے تھے، مولانا بھی جا کر سامنے کھڑے ہو گئے، بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نہایت پرسوز لہجے میں یہ شعر پڑھا:

آبلے روتے ہیں خون، رنج بڑا ہوتا ہے کوئی کاٹا جو کف پا سے جدا ہوتا ہے

اس سفر میں اہل عرب کی فیاضی، سادگی، غیرت مندی اور شریفانہ اخلاق کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا، چنانچہ مثال کے طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی میں اپنے شتر بان کو کھانے کی کوئی چیز دیتا تو وہ ہرگز تنہا نہ کھاتے اور ہلٹوا کہہ کر اس پاس کے اور بدوں کو جمع کر لیتا اور سب کو تقسیم کر لینے کے بعد خود کھاتا، امتحاناً ایک مرتبہ اس کو صرف ایک بوٹی دی گئی جو کسی طرح قابل تقسیم تھی، مگر شتر بان نے اب بھی دوسرے ساتھیوں کو بلا کر ایک ایک ریشہ تقسیم کیا، تو مولانا نے اس سے پوچھا کہ آخر اس سے کیا نتیجہ ہوا، نہ تمہیں کو مزالمانہ تمہارے کسی ساتھی کو، شتر بان نے اس کا جواب دیا، اس سے عرب کی شرافت قومی کا پتہ چلتا ہے، اس نے کہا یا شبلی هذا عار علینا ان ناکل وحدنا (اے شبلی! کیلے کھالینا ہمارے لیے عار ہے) مردانہ غیرت و خودداری اور شریفانہ عنف و درگزر کی مثالوں میں یہ واقعہ بیان فرماتے کہ ایک بار کسی منزل میں مولانا کے ساتھیوں نے ہانڈی چڑھا رکھی تھی، ایک بڑھابڈہ بار بار

ادھر سے گزرتا اور اس سے گرداڑتی تھی، جو بانڈی میں پڑتی تھی، مولانا کے ایک رفیق سفر نے بار بار منع کیا، مگر وہ نہ مانا، عاجز آ کر انہوں نے اس بدو کو ایک تھپڑ کھینچ مارا، بدو کے لیے یہ تو بہن ناقابل برداشت تھی، غصہ میں جو اس نے ایک آواز دی تو آس پاس کے تمام بدو جمع ہو گئے، یہ بڑھادو جو شہ انتقام میں بے تاب تھا، زمین سے تھوڑی سی خاک لے کر کنبِ دست پر رکھتا اور پھونک مار کر اڑاتا کہ اس طرح تم کو برباد کر دوں گا، مولانا نے اس سے بہت لجاجت سے معافی مانگی تو معاف کیا، بہت ممکن ہے کہ علامہ مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر کی مصوری اسی واقعہ سے ماخوذ ہے:

یا رمی پر سید شبلی را کہ چون بزباد رفت
مشت خاکے در ہوا پیشش پریشاں کردہ ام

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ غافل ۱۸۹۹ء میں وہ علامہ مرحوم سے حسامہ پڑھتے تھے، ایک دن ابنِ زیبا نے التیمی کا یہ شعر سبق میں تھا:

الرمح لا املأ کفّی بہ
والقبد لا اتبع تزوالہ

نیزہ کو مٹھی بھر کر نہیں پکڑتا
اور زین کے کھینکنے سے میں نہیں کھسکتا

اس شعر کی شرح میں مولانا نے حج کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بدوی نے ان کو نیزہ بازی کا طریقہ عملاً سکھلایا، تب جا کر اس شعر کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ میں آیا، فرمانے لگے کہ اہل عرب نیزے کے ڈنڈے کو مضبوط نہیں پکڑتے، بلکہ گرفت ڈھیلی رکھتے ہیں اور ہتھیلی اور انگلیوں سے جو حلقہ نیزہ کی گرفت کے لیے بناتے ہیں اس میں قصداً خلا چھوڑتے ہیں، اور نیزہ بازی کے وقت سارا زور بازو کی جنبش پر صرف کرتے ہیں تاکہ حریف کے جسم میں نیزے کی انی کافی حد تک پیوست ہو سکے، اسی طرح اصلی اور کتابی زبان کا فرق بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ دورانِ حج میں جب مجھے عربی میں گفتگو کرنی پڑی تو سخوکی پوری پابندی کرتا اور گفتگو میں بھی اعراب کا پورا پورا لحاظ کرتا، یہ دیکھ کر جمال نے آخر ایک روز کہا کہ ”یا شبلی انت نحوی“ میں نے یہ وجہ ناواقفیت پہلے اس کو اپنی علمی لیاقت پر محمول کیا، مگر بعد کو پتہ چلا یہ تعریض تھی نہ کی تحسین۔

پہلا تو قومی کام ۱۸۷۷ء | جس زمانہ میں مولانا تعلیم سے فارغ ہوئے، دنیائے اسلام میں ایک بہت بڑی تحریک پھیل رہی تھی، وہ ”اتحادِ اسلامی“ کی تحریک تھی، اس تحریک کے پہلے داعی سید جمال الدین افغانی مرحوم تھے، جنہوں نے آخر میں قسطنطنیہ میں قیام کر لیا تھا، یا قیام کرنے پر مجبور تھے، بہر حال

سلطان عبدالحمید خاں نے جو ”سلطانِ روم“ کے نام سے اس زمانہ میں مشہور تھے، اس تحریک سے فائدہ اٹھایا اور دنیائے اسلام کی عظیم الشان سلطنت کے فرماں روا کی حیثیت سے ان کو ہر جگہ خلیفہٴ اسلام اور امیر المؤمنین تسلیم کیا گیا اور ان کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، جس وقت یہ تحریک اٹھی تو اس نے جس کی حریص نگاہیں آب نائے باسفورس کی زریں شاخوں پر ہمیشہ پڑتی رہتی تھی اور جس کی سلطنت میں تین کروڑ ترک مسلمان بستے تھے، جن سے وہ ڈرتا تھا، اس بات کا تہیہ کر لیا کہ وہ اس سلطنت کو مٹا کر دم لے گا، انگریزوں کو باسفورس کے ساحل پر روسیوں کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، لیکن دل سے چاہتے تھے کہ ترک کسی طرح مضبوط ہونے نہ پائیں، تاکہ کروڑوں مسلمان جو اس کی سلطنت میں بستے ہیں وہ ترک سلطان کے ایک اشارہ پر بغاوت کے لیے آمادہ نہ ہو جائیں، حالانکہ یہ خیال مراب سے زیادہ بے حقیقت تھا۔

انہی حالات میں ۱۸۷۷ء میں روس اور روم (ترک) کی جنگ شروع ہوئی، اس جنگ نے اسلامی دنیا میں آگ سی لگا دی، ہر جگہ سلطان کی فتح و نصرت کی دعا مانگی جانے لگی، زمینوں کے لیے چندے جمع کیے جانے لگے، اور سلطان کی حمایت میں بڑے زور و شور سے تقریریں ہونے لگیں، اور تحریریں لکھی جانے لگیں، مولانا شبلی مرحوم کا آغاز شباب تھا، اس چنگاری نے ان کے تمام قوی کو مشتعل کر دیا تھا، انہوں نے بڑی مستعدی سے اعظم گڑھ میں چندہ جمع کرنا شروع کیا اور ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ جن کا نام حسین حبیب آفندی تھا، قسطنطنیہ روانہ کیا، اپنے دوست حکیم محمد عمر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”چندہ این شہر تا بہ دو ہزار و شش صد رسید، امید قوی است کہ از سہ ہزار پیشتر گرد آید،..... سپاس ایزد کہ روسیان تہہ کار در زوز پیکار کہ با عثمان پاشا کردہ بودند، ہشت ہزار طعمہٴ حجیم شدن و بست و چہار ہزار زخم ہائے گراں برداشتہ بر بستر خاک طہیدن، نسیم فتح و ظفر بر پرچم علم سلطانی وزید، و برادر شاہ گرینڈ ڈیوک نکلسن از نسیم ضربت دلیران ترک از میاں رمید۔“

سفر نامہ میں لکھتے ہیں ”حسین حبیب آفندی جو کسی زمانہ میں بمبئی میں ٹرکس کا نسل تھے، اور اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے کہ محاربہٴ روس میں نے بہ حیثیت سکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ سے قسطنطنیہ کو روانہ کی تھی“ اسی سفر نامہ میں عثمان پاشا کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں جو ان کے سفر نامہ کی تاریخ ہے،

۱۔ مکاتیبِ شبلی فارسی۔

۱۸۷۱ء کی جنگِ پلونا کے شیر عثمان پاشا کے شجاعانہ کارناموں کی یادان کے دل میں کس طرح باقی تھی، یہ وہی نام ورجزل ہے، جس نے پلونا میں ۲۳ ہزار روسی، مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کیے تھے جس کے مقابلہ میں شہنشاہ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہ روس نے اس کے کسر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا، یہ واقعات اسی زمانہ میں اخبارات کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے اور بچہ بچہ اس نام ورجزل کے نام سے واقف ہو گیا تھا، قسطنطنیہ میں اگرچہ کسی فوجی افسر سے نہیں ملا، لیکن یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ایسے نادرہ روزگار کے دیکھنے کا شوق دل میں نہ ہوتا، مولانا مرحوم کے دل میں اسی زمانہ سے جس اتحادِ اسلامی کا جذبہ پیدا ہوا، واقعات بتائیں گے کہ اخیرِ اخیر وقت تک وہ ان کے دل سے نہیں نکلا، بلکہ وقتاً فوقتاً اور اندر ہی اندر چڑ پکڑتا گیا۔

ان ایام میں مولانا کے علمی اور ادبی مشاغل ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک | مولانا ۱۸۸۲ء تک اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں رہے، کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمین داری کا کام دیکھا، مگر ان تمام بے اطمینانیوں اور ہنگاموں کے ساتھ ان کے علمی، ادبی، مذہبی اور قومی مشاغل ہر حال میں جاری رہے۔

تعلیم و تدریس کی خدمت ہمارے علما کی زندگی کا لازمی جز رہا ہے، خواہ کوئی وزارت کی کرسی پر ہوں یا قضا و افتا کی مسند پر یا اور کسی سرکاری خدمت پر کیوں کہ یہ مشاغل دنیا ان کو اپنے اصلی فرض سے غافل نہیں رکھتے تھے، چنانچہ فرنگی محل کے وہ اکثر علما جو نوابی کے زمانہ میں افتا کی خدمت پر مامور تھے، یہاں تک کہ مولانا کے استاذ الاستاذ مفتی محمد یوسف صاحب بھی جب تک لکھنؤ میں مفتی رہے، درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، یہی حال اس زمانہ کے دوسرے سرکاری عہدہ دار علما کا تھا، مثلاً مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی سررشتہ دار دہلی، مفتی عنایت احمد صاحب، مفتی صدر الدین صاحب دہلی، مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادی وغیرہ یہ سب لوگ اپنے سرکاری عہدوں کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف تھے، مولانا کے استاذ مولوی محمد فاروق صاحب کبھی کبھی وکالت کیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہیں مقدمات کے کاغذوں کے ساتھ طلبہ کے اسباق کی کتابیں بھی کھلی رہتی تھیں۔

۱۔ سفر نامہ غازی عثمان پاشا کی ملاقات۔

شاہ منیر عالم صاحب غازی پوری مرحوم نے اگست ۱۹۱۲ء کے مسلم ریویوالہ آبادی میں مولانا شبلی کے حالات پر انگریزی میں جو مضمون لکھا ہے اور جس کے واقعات خود مولانا کے بتائے ہوئے ہیں، اس میں لکھا ہے ”تکمیل سے فراغت کے بعد انہوں نے دو برس درس و تدریس اور مناظرہ و تلقین میں بسر کیے۔“ اس زمانہ میں مولانا جن لوگوں کو پڑھاتے رہے، ان میں سب سے پہلا اور بڑا نام تو خود مولانا کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کا ہے، جو عمر میں مولانا سے سات آٹھ برس چھوٹے تھے، دوسرے صاحب مولوی محمد سمیع صاحب مرحوم ہیں جو مولانا کے نہایت عزیز اور مطبوع شاگرد تھے، ان کی کتابیں پوری نہیں ہوئیں، لیکن ان کا فارسی مذاق بہت اچھا تھا، وہ اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۸۲ء میں عدالت میں نقل نو لیس ہوئے اور بعد کو ترقی کر کے ججی کے محافظ دفتر ہو گئے تھے۔

مولانا کے اکثر پرانے خطوط اور قصائد ان ہی کے پاس محفوظ تھے، تیسرے صاحب دینا پارہ (اعظم گڑھ) کے مولوی محمد عمر صاحب تھے، جو بعد کو جون پور کے مدرسہ میں چلے گئے، مولانا کی ابتدائی فارسی غزلیں اور نامے انہی سے ملے، اسی زمانہ میں اپنے دلی دوست وہم وطن حکیم مولوی محمد عمر صاحب بندولی کو فارسی میں خط لکھتے ہیں، ”دریں فرصت بہ ادب کار دارم، خود چیزے از ادب می خوانم، دو دیوان حساسہ بدیگرے می آموزم۔“

معلوم نہیں یہ حساسہ کس کو پڑھاتے تھے، اکبر صاحب اور عثمان صاحب وغیرہ بعض دوسرے عزیزوں کو بھی اس زمانہ میں کچھ نہ کچھ پڑھایا کرتے تھے، ۱۰ مارچ ۱۸۸۱ء کو اپنے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب دینا پاروی کو لکھتے ہیں ”دریں روز ہادکان کشادہ ام دن بہ آموختن کسان در دادہ“ (نامہ فارسی-۱۳) اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا شغل شعر و شاعری تھا، اس زمانہ کے بعض سربراہ آوردہ علما جیسے مفتی صدر الدین آزرہ جو غالب کے ہم عصر اور دوست تھے، فارسی کے ساتھ اردو کے بھی شاعر تھے، مولانا فیض الحسن صاحب عربی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے، مولانا فاروق صاحب خود بھی شاعر تھے اور نہ صرف شاعر تھے، بلکہ موسیقی کا فن بہت اچھا جانتے تھے، مولانا فرماتے تھے کہ مولوی صاحب اکثر شرات کے تیسرے پہراٹھا دیتے اور پوچھتے شبلی بھیرویں سنو گے؟ پھر گا کرتا تے، قومی جلسوں میں مولانا شبلی مرحوم جس پد اثر لے میں اپنے قصیدے پڑھتے تھے، فرماتے تھے کہ وہ بھی استاد ہی کا فیض تھا۔

۱۔ استاد کی وفات کے دو برس بعد ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔

اس زمانہ میں عموماً فارسی غزلیں کہتے، فارسی قصیدے لکھتے، فارسی نامے بڑی محنت سے انشا کرتے اور اردو شاعری کا تو ان دنوں عام چرچا تھا، خود اعظم گڑھ میں مشاعرے کرتے، غزلیں پڑھی جاتیں، واہ واہ کا شور بلند ہوتا۔

ان کی اسی زمانہ کی ایک چیز رزمیہ کا بل و قندز ہے، ۱۵ صفر ۱۳۰۰ھ یعنی تقریباً ۱۸۸۲ء کی لکھی ہوئی، اس کی نقل ہمارے سامنے ہے، اعظم گڑھ میں کوئی انگریز تھا، جس نے محاربہ کا بل و قندہار میں شرکت کی تھی اور انگریزی شعر میں اس کا کچھ حال نظم کیا تھا، اس نے مولانا کے والد سے خواہش کی کہ اس کو کوئی اردو نظم میں ترجمہ کر دے، یہ کام مولانا نے اپنے ذمہ لیا، اردو ترجمہ نثر میں سن لیتے اور اس کو نظم کر لیتے، شروع کے شعر یہ ہیں:

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں راہت و طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں شاہ کے اعزاز و شان کی داستاں

حکمرانِ بحر و کاں کی فتح ہے

قیصر ہندوستان کی فتح ہے

والیٰ کا بل نے جب کی سرکشی ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیر سے ڈالا تھا طرحِ آشتی ہو چلا تھا کچھ خیالِ خود سری
روس پر تھا جو گمانِ اختیار ہاتھ سے چھوٹی عنانِ اختیار
سننے ہی فرمانِ دارائے جہاں ہوگی آراستہ فوجِ گراں
تھا رسالہ آٹھواں بنگال کا ساتھ جس کے ہم ہوئے تھے رہ گزا

اس کے بعد انگریز افسروں کا اور سفر کی منزلوں کا اور واپسی کا تذکرہ ہے، جزل بیس اور

ڈاکٹر رائٹ کے نام اس میں خصوصیت سے لئے گئے ہیں۔

اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا کام غیر مقلدوں کا رد تھا، اس رد میں جوان کو غلو تھا، اس کی پرورش میں ان کے استاد مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص ہاتھ تھا، بندول اور جیراج پور دونوں گاؤں بالکل ملے جلتے ہیں، بیچ میں شاید ایک میل سے بھی کم کا فصل ہو، بندول مولانا شبلی کا اور جیراج پور مولانا سلامت اللہ علیہ السلام اللہ صاحب حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری (استاذ جامعہ ملیہ دہلی) کے والد بزرگ دار تھے، مولانا سلامت اللہ صاحب آخر میں نواب صدیق حسن خاں کی طلب پر پھوپال چلے گئے تھے، نواب صاحب نے وظیفہ کر دیا تھا، اور پھوپال کے بعض مدرسوں کے اہتمام کی خدمت سپرد کردی تھی، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۳ء میں وفات پائی، ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب بھی ان کے ابتدائی شاگردوں میں ہیں۔

صاحب کا وطن تھا، مولانا سلامت اللہ صاحب نے پہلے جون پور کے مدرسہ میں جا کر مفتی محمد یوسف صاحب سے علوم کی تکمیل کی، پھر بنارس میں پڑھا اور پھر دہلی پہنچ کر مولانا سید نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی اور اس کے بعد نہایت انہماک کے ساتھ اپنے وطن واپس آ کر ترک تقلید اور آمین بالجبر، رفع یدین اور قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کی اشاعت کے لیے وعظ و تبلیغ شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اعظم گڑھ کے اطراف میں تقلید و عدم تقلید اور ان فقہی مسائل کا شور مچ گیا۔

خود مولانا شبلی کے حقیقی ماموں اور مولانا حمید الدین صاحب کے عم محترم مولوی محمد سلیم صاحب جو پھر یہاں ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی، قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری اور مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، پورے غیر مقلد تھے (مکاتیب میں ان کا ذکر ہے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۶ء میں وفات پائی) ان کے سب سے گویا یوں کہئے کہ خود مولانا شبلی کے خاندان میں آ کر تفرقہ پڑ گیا تھا۔

غرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا شبلی نے غیر مقلدین کے رد کے لیے کمر ہمت چست باندھی، سنا ہے کہ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی، اپنے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے، جن میں بعض چھپے اور بعض قلمی رہے، ادھر سے مولانا سلامت اللہ صاحب اور رواں ضلع اعظم گڑھ کے مولوی اسد اللہ صاحب التونی ۱۳۳۹ھ جو مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، مقابلہ کو نکلے، دونوں طرف سے رسالے لکھے گئے، مناظرے ہوئے، اشتہارات ہوئے اور وہ سب کچھ ہوا جو ہونا چاہیے۔

اس عہد میں مولانا شبلی مرحوم نے جو رسالے لکھے، ان میں سے صرف ایک کا مجھ کو علم ہے اور وہ ”دظل الغمام فی مسئلۃ القرآۃ خلف الامام“ ہے، یہ چالیس صفحات کا اردو رسالہ ہے، جو ۱۲۹۲ھ میں کان پور کے مشہور مطبع نظامی میں چھپا تھا، یہ مولانا سلامت اللہ صاحب کے کسی رسالہ کے جواب میں ہے، اس میں پہلے اپنے مدعا یعنی ترک قرأت کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہے اور آخر میں مخالف کے حدیث و فقہ کے حوالوں اور دلیلوں کی غلطی دکھائی ہے۔

اس رسالہ کا دیباچہ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

”کیا عبرت کا مقام ہے، افسوس کا وقت ہے، زمانہ کا دور آخر ہے، اہل بزم اٹھتے جاتے ہیں، محفل برہم ہو چلی، سحر ہونے کو آئی، وہ روشن اور بزم افروز شمع اسلام سنبھالا لے رہی ہے، ادھر باد مخالف کے جھوکے چلنے لگے، اب تک تو خیر تھی کیوں کہ شمع ہنوز حمایتِ علما کی فانوس میں اغیاروں کے دستِ ستم سے محفوظ تھی، لیچے اب اپنے بیگانے ہو گئے، خود محفل والوں میں سے حضرات غیر مقلدین چاروں طرف سے اُسے گل کرنے کو دوڑے، وَاللّٰهُ مُبْتَلٰی نُوْرِهِ وَاَلُوْا كِبْرَةَ النَّجْدِ مُؤْنًا ط

جمعیتِ اسلام برہم ہو چکی تھی، اعدانے دین کو بے کس و بے چارہ سمجھ کر دستِ تعدی دراز کر رکھا تھا، وقت یہ تھا کہ ہم سب ایک بننے، دینی عزت کو دنیاوی جاہ و وقار کے ساتھ حاصل کرتے، لہجوں کے تیر باراں اعتراضات کو استدلال و احتجاج کی سپر پر روکتے، جس طرح اسلام ہمیشہ مظفر و منصور رہتا آیا ہے، آج بھی اُس کے نقارہٴ فتح و ظفر کی صداٴ غنیم کے لشکر میں گونجتی، مگر بے دردوں کو اس سے کیا غرض انہوں نے نام و نمود کے پیچھے جمعیتِ اسلام کو وہ درہم برہم کیا کہ جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان ہل گئے اور اس کی مضبوط پائے دار بنا متزلزل ہو گئی، جمعہ جماعت میں تفرقہ پڑ گیا، سب و شتم سے گذر کر طعن و ضرب کی نوبت پہنچی، رفتہ رفتہ گورنمنٹ کو دخل دینا پڑا اور ہماری مذہبی نزاع جس میں علما اور مجتہدین کے فیصلے ناقابلِ تسلیم قرار دیے گئے تھے، اب احکام انگریزی نے فیصل کیے، فَاغْتَبِدْ وَاٰنَا اَوْلٰی الْاَبْصَارِ۔ غیر مقلدین اگر اپنے استنباطات کو صحیح سمجھتے تھے، سمجھتے اور اس پر کار بند ہوتے، مگر یہاں تو وہ مثل ہے

ع ”میں تو ڈوبا ہوں ولے تجھ کو بھی لے ڈوں گا“

اشتہار جاری ہوئے، رسالے چھپے، آخر اس پر دم لیا کہ ہم مذہبِ حنفی پر اعتراضات رکھتے ہیں، جو جواب دے وہ انعام لے، علمائے حنفیہ کو اول تو درس و تدریس و دیگر مشاغلِ علمی سے فرصت کہاں دوسرے وہ سمجھے کہ قلم اٹھائیے تو کس پر، جواب لکھئے تو کس کا؟ اس تمام فرقہٴ جدیدہ میں دو ایک کے سوا کسی نے درسِ نظامیہ کی پوری کتابیں بھی نہیں پڑھیں، نہ کسی کا اعتمادِ علما میں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا احمد علی محدث مرحوم و جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس دیوبند و جناب مولانا محمد عبدالحئی صاحب وغیرہم کو بہت کم اس بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا، ادھر یہ بھی خیال کہ کس سے مقابلہ کیجیے، مسلمانوں سے:

لے آیت قرآنی میں قصداً تجد لی کردی ہے۔ ”س“۔

رازِ مستوق نہ افشا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
حضرات غیر مقلدین اس بے اتفاقی اور عدم اعتنا کو داخلِ عجز سمجھے اور بھی تیز ہوئے، خم ٹھوک
میدانِ مناظرہ میں کود پڑے، مگر علمائے حنفیان چھوٹی جوڑوں کے مقابل آنے کیوں لگے، تاہم اگر کسی
عالم حنفی نے عنانِ التفات ایک ذرا ادھر پھیر دی تو مدتوں کے لیے فرصت ہوگئی، ایک انتصار الحقی کا جواب
مرہٹ کر الناسیدھا، آٹھ دس برس میں تیار ہوا، سو بھی کیا، کاغذ بادی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہر چند اس
شور و فتنہ انگیزی پر بھی ہم کو خانہ جنگی سے احتراز رہا ہے، مگر صرف اس خیال سے کہ (شعر سعدی)
چو باسفلہ گوئی بہ لطف و خوشی
فزون گدوش کبر و گردن کشی
مناسب معلوم ہوا کہ تھوڑی سی دارو گیر کر دی جائے، اس پر بھی اگر باز نہ آئے تو پھر پوری خبر لی جائے۔

اصل مقصود

واضح ہو کہ اس فرقہ نو کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم قرآن و حدیث کے پیرو ہیں اور بہ مقابلہ حدیث
نبوی ﷺ کسی امام و مجتہد کے قول کو سند نہیں لاتے، اس رسالہ میں بہ ضمن مسائل قرأت فاتحہ خلف الامام دو
باتوں کا ثابت کرنا منظور ہے، ایک یہ کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب قرآن و حدیث سے صاف صاف ثابت
ہے، پس غیر مقلدوں کا یہ بیان کہ چوں کہ امام صاحب کا مذہب احادیث سے خلاف ہے، اس لیے ہم
اس پر عمل نہیں کرتے، بالکل ازراہ فریب و مکر ہے، دوسرے یہ کہ حضرات غیر مقلدین حدیثوں میں کس
قدر کذب و افترا کو کام میں لاتے ہیں اور عوام کو دام فریب میں پھنساتے ہیں، اے برادران اسلام اس
رسالہ کو خوب غور و فکر سے دیکھو اور جب تمہیں ثابت ہو جاوے کہ یہ لوگ حدیثوں کی سند میں فریب اور
کذب اختیار کرتے ہیں، تو ان سے بے زار ہو جاؤ اور پھر ان کے دام فریب میں نہ آؤ۔

امر اول واضح ہو کہ غیر مقلدین کا یہ دعویٰ ہے کہ ”مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنا امام کے پیچھے
واجب ہے، ہر نماز میں خواہ وہ سڑی ہو خواہ جہری، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو کسی قسم کی نماز میں قرأت
فاتحہ کرنا مستحب بھی نہیں اور واجب کا تو کیا مذکور، اب ہم وہ دلائل پیش کرتے ہیں، جس سے ہمارا مدعا
ثابت اور ان کا دعویٰ باطل ہوتا ہے۔“

اس مقدمہ کو میں نے یہاں اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ علی گڑھ جانے
سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اردو انشا پر دازی کا کتنا زور تھا، نیز یہ کہ دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سرسید کی

ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا، دعویٰ اور دلیل کی ترتیب اور الجھے ہوئے مسکوں کو سلجھا کر کہنے کا سلیقہ ان میں فطری تھا، تیسری بات اس سے ان کا وہ تاثر ظاہر ہوتا ہے، جو اس نازک زمانہ میں باہمی فرقہ آرائیوں سے ان کے دل کو پہنچتا تھا۔

احناف میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی صاحب فرنگی محلی ”قرأت خلف الامام“ کے مسئلہ میں ایک معتدل روش رکھتے تھے، یعنی ان کو اس مسئلہ میں وہ غلو نہ تھا، جو اس زمانہ کے دوسرے علمائے احناف کو تھا، مولانا موصوف نے ۱۲۹۴ھ میں ”امسام الکلام فی ما يتعلق بالقرأة خلف الامام“ کے نام سے ایک مفصل کتاب بہ طور محاکمہ کے لکھی تھی اور اس میں فقہائے اربعہ کے مسلک کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا اور نتیجہ یہ نکالا تھا کہ ائمہ احناف کے نزدیک امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا پڑھنا متفق علیہ مسئلہ نہیں ہے، جیسا کہ سمجھا جاتا ہے، بلکہ بعض پڑھنے کے بھی قائل ہیں اور کم از کم یہ کہ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا نہ حرام ہے نہ مکروہ، بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شافعیوں کی طرح اس کا پڑھنا ہر حال میں واجب نہیں سمجھتے، آخر میں مولانا عبدالحی صاحب نے اپنی تحقیق یہ ظاہر فرمائی ہے کہ جبری میں امام کے سکات یعنی سورہ فاتحہ پڑھنے میں جہاں جہاں امام چپ ہو اور سرزی میں عام طور سے مقتدی سورہ فاتحہ پڑھے۔

عام علمائے احناف کی طرح مولانا شبلی مرحوم کا یہ خیال تھا کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، اسی بنا پر ”اسکات المعتدی علی انصاف المعتدی“ کے نام سے ۲۴ صفحات کا ایک مختصر رسالہ عربی میں لکھا اور مشہور مطبع نظامی کان پور میں ۱۲۹۸ھ میں اس کو چھپوایا، اس کے چھپوانے کا خرچ ان کے چچا شیخ مجیب اللہ نے اپنے ذمہ لیا (نامہ فارسی-۲۴) رسالہ چھپا اور شائع ہوا، اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، یہاں تک کہ ہندوستان سے نکل کر مصر و شام اور روم تک پہنچ گیا، ۱۳۰۹ھ -۱۸۹۴ء میں جب مولانا نے اسلامی ملکوں کا سفر کیا، تو اس رسالہ کے مصنف کی حیثیت سے بعض علما نے ان کی بڑی قدر کی تھی، مولانا نے اپنے سفر نامہ میں اس واقعہ کا خود ذکر کیا ہے۔ (ص ۳۶)

اس رسالہ میں مولانا شبلی نے تین میں قال بعض العلماء لکھ کر مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کی تحقیق کا رد کیا تھا اور بین السطور میں مولانا عبدالحی صاحب کے نام کی بھی تصریح کر دی تھی، لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، رسالہ کی زبان بہت ہی ادیبانہ ہے، دیباچہ میں مشکل الفاظ قصد آلائے گئے ہیں جو ایضات کے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے ”لکنہ لساکن ظن العوام انه قد اصاب فی مارام علی انه لا یکاد ان یحوم حول المرام صرفت الیہ عنان العنایة“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے مولانا شبلی کے رسالے کو پسند کیا تھا اور ان کی مقبولیت ہو چکی تھی۔

خاص مولانا فاروق صاحب کا ڈھنگ تھا۔

یہ رسالہ لکھے جب مولانا عبدالحی صاحب اور ان کے شاگردوں تک پہنچا تو انہوں نے اس کے جوابات لکھے اور چھپوائے، ان میں سے پہلا جوابی رسالہ مولانا عبدالحی صاحب کے شاگرد مولانا نور محمد صاحب ملتانی نے لکھا، رسالہ کا نام ”تذکرۃ المنتہی فی رد الاسکات المعتدی“ ہے، ان ہی کا دوسرا مختصر رسالہ ”الافادات فی رد الاسکات“ ہے اور تیسرا ”التنبیہات علی ہفوات الاسکات“ ہے چوتھا رسالہ ”الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات“ حافظ ملا شعیب حنفی کا بلی باجوری کا ہے، یہ مجموعہ ۱۲۹۸ھ میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں چھپا، اس کے آخر میں حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری کے ایک شاگرد و عزیز کی مدحیہ تاریخ ہے گو خود مولانا عبدالحی صاحب نے اس رسالہ کا بہ راہ راست جواب نہیں دیا، لیکن چند سال کے بعد انہوں نے اپنے رسالہ ”امام الکلام“ کو دوبارہ چھپوایا، تو غیث الغمام کے نام سے اس پر ایک حاشیہ بڑھایا، جس میں من جملہ اور دوسری باتوں کے مولانا سے تعرض کیے بغیر ان کے اعتراضوں کے جواب دیے ہیں۔

مولانا فرماتے تھے کہ ان ہی دنوں میں ایک دفعہ مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محللی سے جا کر ملا تھا، تو مولانا مدوح نے احناف کی باہمی خانہ جنگی پر افسوس ظاہر کیا، اور فرمایا کہ ہم آپس میں لڑتے ہیں اور اہل حدیث کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ جہ کس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے رہتے اور کام کرتے ہیں، مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ:

”مولانا کا اشارہ میرے رسالہ کی طرف تھا، اس لیے مجھ ندامت ہوئی۔“

اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جو ان کے فضل و کمال کا طرہ امتیاز تھیں، موجود ہیں، ایک منطقیانہ ترتیب و حسن استدلال اور دوسری عربی انشا پر دازی، اسی لیے جن لوگوں نے اس کے جواب لکھے، انہوں نے بھی اپنے جوابی رسالوں میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا ہے، مولانا ان جوابی رسالوں کے جواب کے لیے بھی پوری طرح تیار تھے، نامہ فارسی ۱۴ میں ۷۱ اراکتور ۱۸۸۲ء کو لکھتے ہیں:

”انشاء اللہ ورنہ اندک زمانے از عہدہ رد تذکرہ بدری آیم مردمان گویند کہ ایماضات و رسالہ دیگر ہم از

حافظ صاحب است، تا حال بر علم و استعداد حافظ صاحب اعتماد سے داشتیم، اکنون آں ہم بر خاست، انشاء اللہ ورنہ

قریب وقتے بہ غازی پوری رسم و دریں اغلاط و پالغزبائے مصنف تذکرہ و ایماضات ہمہ باز خواہم گفت۔“

اس تذکرہ اور ایماضات سے اوپر کے وہی دونوں رسالے المقصود ہیں۔

اردو زبان و ادب کی طرف گوان دنوں مولانا کی توجہ بہت کم تھی، پھر بھی مولانا کے شباب کا یہ عہد وہ تھا جب لوگ ادھر متوجہ ہو چکے تھے اور ہر قسم کے اخبارات اور رسالے نکلنے لگے تھے، ۷۷ء کے ۸۷ء سے منشی سجاد حسین صاحب مرحوم کا ظریفانہ اخبار اودھ پنچ نکلا شروع ہو چکا تھا، اس زمانہ میں اس اخبار میں اچھے اچھے ادیب اور شاعر مضمون لکھا کرتے تھے، اخبار سیاسیات میں کانگریس کا حامی تھا اور سرسید کی مخالفت میں نہایت شوخ مضامین لکھا کرتا تھا، مولانا مرحوم اس اخبار کو ان دنوں بڑی دلچسپی سے پڑھا اور زبان کا لطف اٹھایا کرتے تھے، میر اکبر حسین (یعنی اکبر الہ آبادی) سے مولانا کی واقفیت اسی اخبار کے ذریعہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہو چکی تھی اور اودھ پنچ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں مولانا کو اخیر زمانہ تک یاد تھیں اور خود مجھے سنائی تھیں۔

اس زمانہ میں لکھنؤ سے اردو غزلیات کا ایک دل چسپ ماہ وار گل دستہ پیام یار کے نام سے منشی ثار حسین نکالا کرتے تھے، چوک میں داروغہ حیدر بخش کی مسجد کے پاس ان کی دوکان تھی اور مسجد کی سامنے والی گلی میں ان کا عطر کا کارخانہ تھا، اور اسی میں ان کے اس گل دستہ کا بھی دفتر تھا جو ہر مہینہ مشام روح کو

۱۔ مرزا محمد عسکری صاحب بی، اے (لکھنؤ) مترجم تاریخ ادب اردو جو مولانا کے پرانے ملنے والے تھے، اپنی اس کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: ”منشی ثار حسین مرحوم اڈیٹر ”پیام یار“ مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھے، ان کی چوک میں عطر کی دوکان تھی، جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروش ہوتے اور سہ پہر کو منشی ثار حسین کی دوکان پر جو قریب ہی تھی، آ بیٹھتے تھے، یہاں اکثر احباب کمال کا مجمع ہوتا تھا، جس میں مولوی عبدالحلیم شرر، شوق، قدوائی، لدن صاحب خورشید، الو صاحب جلیس، سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور بے تکلف احباب جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے، وزیر تبولی کی خوش ذائقہ گلوں اور حسین بخش ساتی کے معطر حقہ سے احباب کی ضیافت کی جاتی، کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ بتلون ڈانٹے، عینک لگائے، آنکھیں چمکاتے اور ہنستے اس جلسہ میں شریک ہو جاتے، اور اپنی پر لطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے، ایک دن جب کہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے، شاید چھٹیس یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی، وقت ۷-۸ بجے شام، چوک میں بڑا مجمع تھا تقریبیے مع جلوس اور باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے، شور وغل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی، سب لوگ اس سیر میں مشغول، مگر مولانا دوکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مطالعہ میں جو کسی کا تب سے لکھائی گئی تھی، اس قدر مشغول و منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا، اور اپنا کام کرتے رہے، یہاں تک کہ پوری کتاب اسی حالت میں تقریباً ۱۰-۱۱ بجے تک ختم کر دی، غالباً علی گڑھ کے ابتدائی قیام کا واقعہ ہے۔

اپنے کلام سے معطر کرتا تھا، مولانا اس کو بھی پڑھتے تھے اور شاید اس تعلق سے ان ہی منشی نثار حسین صاحب کے ذریعہ سے مولانا کی مثنوی ”صبح امید“ اور ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ پہلی دفعہ چھپی۔ اس زمانہ کی بعض اردو غزلیں مکاتیب میں ملتی ہیں اور بعض پرانے شاگردوں کی بیاضوں میں نقل ہیں۔

کتابوں کا مطالعہ اور نادر کتابوں کی تلاش مولانا کا فطری ذوق تھا جو اس زمانہ میں بھی موجود تھا، اس زمانہ کا نقطہ نظر کچھ اور تھا، فرماتے تھے کہ ”عظیم گڑھ میں کتابوں کی کوئی دکان تھی، مولانا اکثر اس میں چلے جاتے اور شام تک علمی کتابیں پڑھا کرتے، یاد دواوین دیکھا کرتے، اس زمانہ کے خطوں میں بھی اس کا تذکرہ ہے، مولوی محمد عمر صاحب دینا پاری کو فارسی میں ۱۷ مارچ ۱۸۸۱ء کو بستی سے جہاں وکالت کر رہے تھے جون پور لکھتے ہیں:

”در آنجا کتاب ہائے نایافت فراہم آرز“ (نامہ فارسی-۳)

”ابن ابی جلیہ تمسانی حنفی التونی ۶۶ھ کی ایک تالیف کا نام دیوان الصبا ہے، اس میں اس نے عرب عشاق کے واقعات اور عشق و محبت کی لطیف عربی نظمیں اور غزلیں جمع کی ہیں، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مولانا شبلی کے پاس تھا، جو اس وقت دارالمصنفین میں ہے، اس دیوان کے اوراق میں مولانا کے دستِ خاص کا ایک عربی خط کسی کے نام لکھا ہوا رہ گیا ہے، اس نسخہ پر سعد الدین حیدر علوی ۱۲۳۹ھ کی مہر ہے اور آخر میں سعد الدین حیدر صاحب کی تحریر ہے کہ ”یہ نسخہ میرے ماموں سید محمد حسن خاں نے ۱۲۳۳ھ میں مجھے عنایت فرمایا، بہر حال اس دیوان کے اوراق میں مولانا شبلی مرحوم کی حسب ذیل عربی تحریر ہے۔“

سلام علیکم

سَلَامٌ عَلَیْكُمْ

یہ دیوان الصبا آپ کے پاس جا رہا ہے، میں خود نہ آسکوں گا، اس لیے نہیں کہ میں کسی غیر مفید مشغل میں مصروف ہوں اور میری ہمت بیٹھ گئی ہے اور میں نے عنانِ توجہ دینے دینی کی طرف موڑ دی ہے اور علم و ادب میں حصولِ کمال کی کوششوں سے میں نے اپنی ذمہ داری اٹھا لی، میں بجز اللہ اس طرح بنا ہوں کہ فضل و کمال کے حصول کا

هَذَا دِيْوَانُ الصَّبَابَةِ يَصِلُ إِلَيْكُمْ
وَأَمَّا أَنِي فَلَا يُمْكِنُنِي حُضُورُ لَدَيْكُمْ لَا
لَأَنِّي اشْتَغَلْتُ بِأُمُورٍ غَيْرِ طَائِلَةٍ وَقَعْدَتِ
هَمَّتِي، وَصَرَفْتُ عَنِّي الْعَنَاءَ إِلَى الدُّنْيَا
الدُّنْيَا وَبَرَأْتُ مِنْ تَحْصِيلِ كَمَالِ الْعِلْمِ
وَالْأَدَبِ ذِمَّتِي فَسَانِي بِحَمْدِ اللَّهِ خَلَقْتُ وَ

كسب الفضل سيط من دمی، فهو لا
يفارقنی ان شاء الله فی حالتی و جودی
و عدمی، بل لانی لملازمتی لهذه العهدة
الرزيلة ادم اتفكر فی حالتی فیزید همی
ویزداد ملالتی و یبیدكم الانصاف، ما
هذا الا الجور و الاعتساف فبصر جمیل
وهو حسبی و نعم الوکیل. (۱۲-ش نعمانی)

جذبہ میرے خون میں ملا ہے، جو انشاء اللہ مجھ سے نہ جیتے نہ
مرے کبھی جدا ہوگا، بلکہ میرے نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ میں
نے جو یہ معمولی سی ملازمت کر لی ہے، اس کے سبب سے میں
ہمیشہ اپنی نسبت سوچتا کرتا ہوں، اس سے میرا حزن و ملال
بڑھ جاتا ہے، انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے، اور میری
نسبت اس کے سوا کچھ مجھنا صریح عظیم ہے، ہمیں اس حالت میں
خوب ہے، اور اللہ تعالیٰ مجھے بس ہے، اور کیسا کار ساز ہے۔

یہ خط غالباً ۱۸۸۱ء یا ۱۸۸۲ء کا ہے، کیوں کہ مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض دیکھنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ ”ش نعمانی“ کر کے دست خط وہ اسی زمانہ میں کرتے تھے، اس خط سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں،
ایک تو یہ کہ ان کی عربی انشاء اسی زمانہ میں کیسی صاف دل چسپ، فصیح اور خالص عربی میں ہونے لگی تھی اور
جو ہندوستانیت اور متاخرین کے تکلفات بارہ سے بالکل پاک ہے، دوسرے نادر کتابوں کے دیکھنے اور
پڑھنے کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ ان کا مرع ہمت اپنے لیے ہمیشہ بلند آشیانہ کا طالب تھا۔
اسی دور ابتلا میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:

”نفسے چند کہ از پیش گاہ ایزدانا و دویعت آورده ام سزائے آن است کہ سر رشتہ اش ہر ایں چنین
کار ہابند باشد، و گھراں نہ داغم تا در سرچہ دارند من خود دریں خیال از کنگش و آویزش فکر فارغ نشستم ام کہ
بایں ہمہ خوار بیہا ہماں شبلی ام کہ بودہ ام و اگر گاہے ہستم یاوری کردہاں خواہم بود کہ ہستم“ (نامہ فارسی ۱۲)

وکالت کی تعلیم ۱۸۷۹ء و ۱۸۸۰ء | ہر باپ کی طرح مولانا کے والد بھی یہ چاہتے تھے کہ پڑھنا
پڑھانا جوان کے نزدیک بے شغلی کا ایک کام تھا، چھوڑ کر وہ کسب معاش کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے
لیے مولانا کے والد کی نگاہ میں وکالت کا پیشہ موزوں نظر آیا، کیوں کہ اعظم گڑھ میں اس وقت مولانا کے والد
اور ماموں بڑے کام یاب وکیل تھے، اس لیے قدرتی طور پر مولانا کے والد نے یہی شاہ راہ عمل ان کے لیے
تجویز کی، مگر خود مولانا کی بلند فطرت اور مذاق سلیم کو یہ چیز کھکتی تھی، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں:

”از تقاد دل دہر بہ حفظ قانون مشغول ہستم، ہلیم سروی ہم درین کار اند“ (نامہ فارسی ۸۰)

بایں ہمہ باپ کے حکم سے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ قانون کی ورق گردانی شروع کی، ہر روز

کچھ قانونی دفعات یاد کر لیتے اور اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کو جو اس زمانہ میں انگریزی پڑھ رہے تھے، سنا دیا کرتے، امتحان کا وقت آیا تو مولانا امتحان دینے کے لیے تیار نہ تھے، مگر والد کے اصرار سے امتحان کی فیس بھیجی گئی، اتفاق یہ کہ اتنی ہی تیاری پر مسٹر مہدی مرحوم کو بھی تفریحاً امتحانِ وکالت میں شرکت کا خیال پیدا ہوا اور فیس بھیج دی، حالانکہ نہ ان کا ارادہ وکالت کا تھا نہ انہوں نے پوری تیاری کی تھی، صرف مولانا کے اسباق سن کر کچھ مسائل حافظہ میں رہ گئے تھے۔

مولانا کو غالباً اپنے جوابی پرچوں کی کم زوری کا احساس تھا، اس لیے امتحان دے کر وہ الہ آباد میں کالون صاحب سے جو ان کے والد کے دوست تھے اور جو ان دنوں اس امتحان کے ممتحن ہوا کرتے تھے، ملے لیکن جب ان سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سال ممتحن نہیں تو ملول ہوئے، دیوانِ حافظ میں قال دیکھی تو یہ شعر نکلا:

آنچه سعیت من اندر طلبت بنمودم
 ایں قدر ہست کہ تغیر قضا نتواں کرد
 اس شعر نے اور بھی افسردہ خاطر کیا اور لوگوں کا یہ طعن کہ انگریزی کے بغیر کوئی بڑی نوکری نہیں مل سکتی دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا، اپنے بھائی مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں:

”حیاک اللہ دی با کالون صاحب بر خوردم از نام و نسب پر سید، ہمہ باز گفتیم، بہ تعظیم تمام پیش آمد و معذرت خواست کہ اس سال صحب اردو مگر بستن نہ خواہم، دل زدہ بخاندہ رسیدم و از دیوان غیب تقاول خواستم، ایں شعر بر آید“

آنچه سعیت من اندر طلبت بنمودم
 ایں قدر ہست کہ تغیر قضا نتواں کرد
 نا امیدی را خیر مقدم گفتیم و در پس زانوے حرمان نشستیم، ہمانا درد دل خواہی گفت کہ بایں ہمہ آزادی بہ بیتے دل بستن و کاسہ آرزو بر سر پاش شکستن، یعنی چہ؟ مگر چہ تو ان کرد کہ بسنگ آمد و فتح خانہ دل از تراکم افکار جنگ آمد، دوسہ سالے است کہ پائے طلب و دردا من کشیدم و پیکیزے نہ رسیدیم، عزیزان گویند کہ بغیر از تعلم انگریزی نخواہی بسر برد و ایں خود چہ حرف است جمعے را بیں کہ بیچ از انگریزی نخواہند اند، و باز بمناسب جلیلمی رسند، آخر در تحصیلداری وغیرہ او خود مشروط نیست، فی الجملہ ستیزہ خرچ آویزش بخت بر آئم آورد کہ نختے از عمر بہ بادیہ پیمائی و ہرزہ درائی گذارم، بہر حال نتیجہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا، مولانا امتحان

۱۔ مکاتیب نامہ ہائے فارسی، ۴۔

میں ناکام یاب رہے، اور عجیب بات یہ کہ مہدی حسن پاس ہو گئے، اس واقعہ سے مولانا کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی اور تہیہ کر لیا کہ اب وکالت پاس کر ہی کے دم لیں گے، چنانچہ اس غرض کے لیے انہوں نے پہلے قانون کی ایک ایک کتاب کو بلاستیعاب پڑھ کر اصولی کلیات مرتب کیے اور دفعات کے جزئیات کو محفوظ رکھنے کے خیال سے چند مختصر اشارات وضع کیے، اس طرح پر ایک اپنا خلاصہ مرتب کیا، اس دماغی کاوش کی بدولت مسائل قانونی پر خود عبور ہو گیا، اور دوسرے سال ۱۸۸۰ء میں پاس ہو گئے، مولانا کا یہ خلاصہ اتنا کار آمد ثابت ہوا کہ اس کی مدد سے ان کے چند احباب بھی وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

اعظم گڑھ میں وکالت ۱۸۸۱ء | کامیابی کے بعد اپنے والد کے اصرار سے وہ وکالت پر آمادہ ہوئے، مگر اس راہ میں ان کی ایمان داری اور سچائی کی بنا پر ہر قدم پر ان کو مشکلات کا سامنا ہوا، اُن کے یہ دن عجیب کشمکش میں گزرے، علی گڑھ جانے کے بعد ۱۶ جنوری ۱۸۸۲ء کو اپنی موجودہ چھوٹی نوکری سے گھبرا کر دوبارہ وکالت کا خیال کر کے کانپتے تھے، اپنے چچا کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”والد قبلہ را جز بوکالت روئے در اہے نیست و بایں آزادہ دلی اگر بوکالت نہ ساختہ باشم در نظیر انصاف مرادیں میانہ گناہے، نخواہد بود، در ظل والد قبلہ ہستیم بچشمیں خواہد بود، آہ! ازاں ہنگام کہ دولت روئے گرداند، و کار بدست من اقتدو در ان آشوب، ولے بر جانے ندرام و خواست و ناخواست روے بوکالت آرم، و خویش را اندازہ نہ نم، مردماں را بہ ہرزہ ولادت فریب دہم و ایں خواری بخویش در پذیریم و ہم بدین ذلت و خشکی حسد و شکم باز دہم“ (۳) بہر حال مولانا نے والد کے کہنے سے ۱۸۸۱ء میں اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی، مگر اس عزم و ارادہ کے ساتھ کی کہ ایک حرف بھی حق و صداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا، ظاہر ہے کہ ضلع کی وکالت ان شرائط کے ساتھ نبھ نہیں سکتی تھی، چند دنوں کے تجربہ نے خود مولانا کے والد پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس درع و تقویٰ کے ساتھ ان سے یہ وکالت کا پیشہ جو قدم قدم پر رنگ آمیزی کا محتاج ہے، چل نہیں سکتا۔

ملازمت ۱۸۸۲ء | وکالت کے بعد پڑھے لکھے آدمیوں کا شغل ملازمت سمجھا جاتا ہے، اور اس زمانہ میں تو چھوٹی سے چھوٹی سرکاری ملازمت بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، نواب وقار الملک وغیرہ بہت سے مشہور اکابر قوم نے ان ہی معمولی ملازمتوں سے ترقی پائی تھی، شیخ صاحب کا خیال بھی قدرتی طور پر اسی جانب مائل ہوا اور مولانا کو عدالت کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت و لوادی، تنخواہ دس روپے ماہ وار تھی، جس میں سے نو روپے تو مکان سے کچہری تک کرایہ آمد و رفت میں اٹھ جاتے تھے،

اس کے بعد قرق امین کی اسامی عارضی طور پر خالی ہوئی تو اس کی بھی قائم مقامی کی اور امانت کے فرائض اس دیانت سے انجام دیے کہ اہل معاملہ کے ہاں پانی پینا تو بڑی چیز ہے ان کے سایہ دیوار میں آرام کرنا بھی معصیت سمجھتے، گرمیوں کا موسم، رمضان کا مہینہ، تپتی ہوئی دوپہر اور جھلسا دینے والی دھوپ میں روزہ رکھے ہوئے، گاؤں گاؤں گھوڑے پر سوار پھرا کرتے تھے، افطار و سحر کا کوئی سامان نہ ہوتا، سائیس وال و چاول ابال دیتا، اسی کو کھالیتے، ان مصائب کو پھر بھی وکالت پر ترجیح دیتے۔

چنانچہ اپنے ایک عزیز کو اسی زمانہ میں ۲۵ اگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط لکھا ہے، جس میں فرماتے ہیں: ”ماہے دو درکار امانت روز از شب نشتنا ختم و در راہ طلب از غایت جد و جہد تاب و توان در با ختم غریب تر حالیت منکہ از آشفته سری و شوریدہ مزاجی تن بآیزش کسے نمی دادم انکوں از فرنی طالع و ہمایونی بخت کارم بخار و خس افتادہ است، مگر من و خدائے من کہ اس ہمہ محنت پر دہی و نفس گذاری از اس دوست تر دارم کہ تر ہاتے چند در ہم با فند و دروغ راست مانا را پیش کساں جلوہ ظہور و فروغ قبول دہند،“ (نامہ فارسی-۲۰) مولانا مصیبتیں جھیل سکتے تھے اور محنت و دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکتے تھے، مگر ان افسروں کی دربارداری کا سلیقہ کہاں تھا، اور اس کے بغیر ملازمت اور وہ بھی ماتحتی کی، بلقی کیوں کر، اور بل بھی جائے تو چلتی کے دن، چنانچہ امانت کے اس چند روزہ دوادوش کا انجام خود انہی کی زبانی سنئے، اسی خط میں فرماتے ہیں: ”وہر چند کہ دریں راہ پر خطر دوا سپہ تا ختم و در آنجا اس کار سر کس و ناکس ساختم مگر بایں ہمہ بہ جائے نہ رسیدم و خواست و ناخواست پائے ارادت در دامن قناعت کشیدم فرمان تقرر ہم نہ دادند تا بہ سند کار گذاری چہ رسد۔“ (نامہ فارسی-۲۰)

نیل کا کام ۱۸۸۲ء | مولانا کے والد زمین داری کے ساتھ نیل سازی کی تجارت و وسیع پیمانے پر کرتے تھے اور اپنے علاقہ میں نیل کے متعدد کارخانے (جو ان اطراف میں گودام کہے جاتے ہیں) کھول رکھے تھے، مولانا کی بے شغلی دیکھ کر ان کے والد نے اس کام کی نگرانی ان کے سپرد کی، صبر و شکر کے ساتھ کچھ دنوں یہ کام بھی سر انجام دیا، ایک دوست کو لکھتے ہیں: ”چو ازیں کشکش فارغ نشستم دیگرے روئے داد، یعنی کارم بہ گودام و متعلقات او افتاد و ہر چند آں چناں کارے سزائے اس بیج کارہ نبود، مگر مر از امتثال امر حضرت قبلہ گا ہی چارہ نہ بود۔“ (نامہ فارسی-۱۳)

یوں پھر اس اہل کمال آشفته حال افسوس ہے اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

بستی میں وکالتِ اخیر ۱۸۸۲ء | اس زمانہ میں ضلع بستی میں مولوی محمد کامل صاحب ولید پوری منصف تھے، وہ اتفاق سے اعظم گڑھ آئے اور مولانا کو وکالت کے لیے اپنے ساتھ بستی لے گئے، چنانچہ ۱۸۸۲ء میں چند مہینے بستی میں وکالت کی۔

مولانا کا اپنی طالبِ علمانہ زندگی پر اپنا آپ تبصرہ | خوش قسمتی سے ہم کو مولانا کا ایک خط جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری کے نام لکھا گیا تھا، مل گیا، مکتوب الیہ نے یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپوایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں ”علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا، خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے، اس زمانہ کی طالبِ علمی بہت مشکل تھی، یکہ پر سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا، یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا، دودفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا، یہ خاص انتظام رہا، (اور اس میں منفرد تھا) کہ ہرفن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لیے ان ہی علما کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے، مثلاً حدیث کے لیے مولانا احمد علی سہارن پوری، ادب کے لیے مولانا فیض الحسن لاہور میں۔

والد اور تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں، چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کام یاب ہوا، چند روز وکالت کی، لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی اور علمی اشغال میں مصروف ہوا اور اس لیے معمولی معاوضہ پر آڈل علی گڑھ کی پروفیسری ۲۰ روپیے ماہ وار پر..... ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی، لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور یہ فطرت تھی، مولانا ان چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور وکالت سے بعد عدم مناسبت کے سبب تنگ دل رہتے تھے، بایں ہمہ ان کی بلند نظری اور علوے ہمت ان کو ان کے روشن مستقبل کی بشارت دیتی تھی، ۲۵/ اگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”بایں ہمہ خوار بہا ہماں شلی ام کہ بودہ ام و اگر گاہے ختم یاد آوری کرد ہماں خواہم بود کہ ہستم“۔ (نامہ فارسی ۲۰)

علی گڑھ کا سفر ۱۸۸۱ء اور سرسید سے ملاقات | آخر وہ وقت بھی آ گیا جو اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کے لیے مقرر تھا، علی گڑھ کی تحریک اس زمانہ میں سب سے پر زور تحریک تھی، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نئی تعلیم سے آراستہ کیا جائے، سرسید مرحوم چون کہ مشرقی اضلاع میں بہت دنوں تک رہے تھے، اس لیے اس تحریک نے ان اطراف کے مسلمانوں میں کافی اثر پیدا کر لیا تھا، اور خود مولانا کے والد شیخ

حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی ہو گئے تھے، اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے مختلے بیٹے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں انگریزی پڑھانا شروع کیا اور ان کو علی گڑھ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لیے بھیجا، جہاں وہ ۱۸۸۱ء تک رہے اور وہیں سے اس سال انٹرنس پاس کیا، اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب مولانا کو لے کر مہدی حسن مرحوم سے ملنے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے، منادی غیب نے آواز دی ”آمد آن یارے کہ مامی خواستیم“ مولانا گئے تو خالی ہاتھ نہیں گئے، سرسید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر ساتھ گئے، سرسید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اس کے تیور، زبان اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڑھ گزٹ (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء) میں چھپوا دیا۔

المجد یصحب علما حیثما یصل
بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے، علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے، حالانکہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے۔
والعلم عن قومنا لازل یرتحل

نالوا من الذل ما لانا لحد
ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ ان میں نہ علم نظر آتا نہ عمل
اذ لا یرى فیہم علم ولا عمل
ولا تزال تری ینشت شملہم
ان کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کے لیے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔
فی کل یوم وقد ضاقت بہم حیل

لا یرغبون الی ما کان ینفعہم
مفید چیزوں کی طرف ان کا میان بھی نہیں ہے، ان کا تمام تر کارنامہ گم راہی اور پریشان رائی ہے۔
فجل صنعہم للغی والخطل

تراہم الیوم فی کسآب و فی قلی
آج تم ان کو رنج و غم میں مبتلا دیکھ رہے ہو ان کے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا۔
فلا افاد فتیلا ما بہ اشتغلوا

لا ینتھون وقد ذاقو وبالہم
باوجود کہ اپنی بد اعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن ان سے باز نہیں آتے، نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔
عن سوء صنع فقد باؤا بما عموا

وہل یجازیہم الا بما اکتسبوا
خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے کیا اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا
من کان من عنده الاحکام تنفصل

فمن سعی الیوم فی اصلاح حالہم
پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لیے کوشش کی، خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا۔
فما للہ جازیہ یوم یقطع الامل

۱۔ علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء جلد ۱۶، نمبر ۸، ص ۱۱۷۔

ان كنت تسألني من هذه صفتها قلت الامام الهمام السيد البطل
اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا، امام سردار، بہادر، سید،
هو الذی فاق فی الافاق منزلةً ونال ما لم تنله الا عصر الأول
وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ بات حاصل کی جو قدامت کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

من اقبل الدين والدنيا عليه معا والآن في نجح ما قدر ام مشتغل
جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کام یابی میں مشغول ہے
نسال المکارم من آباءه ومشى في المكارم على آثار ما فعلوا
اپنے آبا و اجداد سے فضائل حاصل کیے اور اس شاہ راہ میں ان کے نقش قدم پر چلا

فجدة سيد الاعراب والعجم قد قال يا امتي لمانا الاجل
اس کے دادا عرب و عجم کے سردار تھے، اور ان کی موت کا وقت آیا تو صرف اتنی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا۔

وهكذا صنع هذا السيد العلم يقول يا لهف قومي يسيء ما عملوا
اسی طرح اس نام و ر سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا، برا کیا،

يا خير من سيط حب القوم من دمه احسين ولا تبتئس من سوء ما عملوا
اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہو گئی ہے، عمدہ کام کرو اور جو برائیاں تو م نے کیں، ان سے غم زدہ نہ ہو۔

أحسین لیہم ولو جازوك سیئۃ ولا تبال بما قالوا وما فعلوا
ان کے ساتھ احسان کرو، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروا نہ کرو۔

اس قصیدہ میں اگر چہ فن کی بعض کم زوریاں ہیں لیکن اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے جب یہ طرز
ہندوستان میں منفقو تھا اور متنبی وغیرہ شعرائے متاخرین کے تتبع کے سوا ہندوستان کے علمائے ادب کے
سامنے کوئی نمونہ نہ تھا، ادب عربی کی یہ نئی شاہ راہ جو مولانا فیض الحسن صاحب کی رہ نمائی سے ان کو نظر آئی
خاص توجہ کی مستحق ہے، اس قصیدہ میں صاف نظر آتا ہے کہ شاعر خالص عرب شعرا کے کلام کی نقل کرنا چاہتا
ہے، قصیدہ میں سرسید کی طرف دو باتوں کی تعریف ہے، ایک ان کے حسب و نسب و سیادت کی اور دوسرے
ان کے قومی کاموں کی، ان دونوں باتوں کے بیان میں کسی کا مداحانہ غلو اور پیشہ ور شاعروں کی طرح
گدا گرا نہ مذلت وابتدال نہیں اور یہی چیز شاعر کی بلند خیالی، علوئے نفس اور مذہبی برتری کو ظاہر کرتی ہے۔

غالباً اس پہلی ملاقات میں ہلکا اثر سرسید کے دل و دماغ پر اس لیے بھی رہ گیا ہوگا کہ وہ مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے پوری طرح واقف اور ان کے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی کے فضل و کمال کے خوشہ چیں تھے۔

علی گڑھ کالج کا تعلق ۱۸۸۳ء | اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد کالج کے مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت ہوئی، اس وقت اس دھندلی سی یاد کو تیز کرنے کا موقع آیا، مولانا فیض الحسن کی تصدیق و توثیق سے درخواست بھیجی اور ہستی سے جہاں وہ وکالت کر رہے تھے، لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے، اس زمانہ میں محمد آباد اعظم گڑھ کے ڈپٹی محمد کریم صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، مولانا علی گڑھ جا کر ڈپٹی صاحب کے یہاں مقیم ہوئے اور ڈپٹی صاحب کی وساطت سے سرسید کے عزیز دوست اور رفیق کار مولوی محمد سمیع اللہ خاں سے ملے، انہوں نے کالج کی عربی و فارسی تعلیم کے لیے مولانا کا انتخاب کیا اور سرسید سے ملائے۔

بہر حال دونوں کی پسند سے مولانا کا تقرر اسٹنٹ سرک پروفیسر کے عہدہ پر جنوری ۱۸۸۳ء ۱۔ مولوی عبدالعلیم صاحب شرر نے مولانا کی وفات پر جو مضمون دل گداز میں لکھا تھا، اس میں اس موقع پر لکھتے ہیں، علی گڑھ کالج کو عربی کے اچھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی، انہوں (مولانا شبلی) نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی، سید صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول کر لیا، چنانچہ مولانا ہستی اور وہاں کے مشاغل کو چھوڑ کر لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے، میں اس وقت داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا۔ ۲۔ مولوی سمیع اللہ خاں دلی کے عائد میں سے تھے، عربی کے فارغ التحصیل عالم، مفتی صدر الدین خاں آزرہ کے شاگرد، ان کی قانونی نکتہ سنجی مسلم تھی، اولاد ہائی کورٹ میں وکالت کی، نامور ہوئے، انگریزی و ادا و کلاء آئے تو یہ طبقہ بنا، سب ججیاں ان کو دی گئیں، مولوی صاحب کا باوجود یوآئی حاکم ہونے کے رعب اس قدر تھا کہ سارا ضلع مرعوب تھا، ایک بار پنڈت اجودھیا ناتھ کو بحث کرتے وقت سراجلاس ڈانٹا اور پنڈت نے معافی چاہی، بہت وجہ اور شان دار، دارالسلطنت کے اعلیٰ شرفا کا نمونہ تھے، سرسید کے دست راست، آخر میں دونوں میں بعض مسائل پر سخت اختلاف ہو گیا اور وہ علی گڑھ سے علاحدہ ہو کر الہ آباد چلے آئے، اور یہاں الہ آباد یونیورسٹی کے قریب مسلم ہاسٹل کی عمارت بنوائی جو اب تک یادگار ہے، ان کے صاحب زادہ نواب سر بلند جنگ بہادر مرعوب تھے، (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی) ۳۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے مولانا کی وفات پر ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء کے علی گڑھ گزٹ میں اس موقع پر لکھا تھا، ”نوجوانی میں علی گڑھ تشریف لائے، خاں بہادر محمد کریم اس زمانہ میں یہاں کے ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرعوب سے ملے، مولوی صاحب مرعوب کو خداوند تعالیٰ نے جو ہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا، کتنے آدمی ان کی جو ہر شناسی کی بدولت کیا سے کیا ہو گئے، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ان کو کالج کی پروفیسری کے لیے انتخاب کر کے سرسید احمد خاں کے سامنے پیش کیا۔ ۴۔ اس وقت کالج میں عربی پروفیسر مولوی محمد اکبر تھے۔

کی کسی آخری تاریخ میں چالیس روپیے ماہ وار پر ہو گیا اور پہلی فروری ۱۸۸۳ء سے کالج کا کام شروع کیا، کالج میں ایف، اے اور بی، اے کے لڑکوں کو فارسی اور انٹرنس اور سکند کے لڑکوں کو عربی پڑھانے لگے، کالج کے فارسی کورس میں ان دنوں درہ نادرہ اور دیوانِ عربی شامل تھا، یہی دونوں کتابیں پڑھانے کو ملیں۔

بہر حال اس وقت چالیس روپیے ماہ وار کی نوکری مولانا کے حساس دل کے لیے ایک چھپا زخم تھا، اسی زمانہ میں ایک دوست کو لکھتے ہیں: ”اس جا کہ آرمیدہ ام و ایں مذلت برخویش پسندیدہ، نہ دائم کہ تا چرخ رادریں پردہ چہ نیرنگیہا است، مولانا ایک دفعہ فرماتے تھے، کالج میں کوئی تقریب تھی، جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں، اس ترتیب سے مولانا کی کرسی سب سے پیچھے تھی، بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے، مگر آنکھ پُر نم ہوئے بغیر نہ رہی، بہر حال چوں کہ علمی شغل تھا اور علمی صحبت، اس لیے اس لذت کے لیے انہوں نے اس تلخی کو گوارا کیا، آگے چل کر مولانا کی تنخواہ سو روپیے ماہ وار ہو گئی اور عربی کے پروفیسر ہو گئے اور قرآن پاک اور دینیات کا درس بھی دینے لگے، کالج کے علاوہ شہر کے بعض عربی کے طلبہ بھی کبھی کبھی آ کر پڑھتے تھے، اس زمانہ میں علی گڑھ میں مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کی درس گاہ عربی کے طلبہ کا مرجع عام بنی ہوئی تھی، ان سے جو لوگ پڑھنے آتے تھے، ان میں سے جس کو ادب کا شوق ہوتا وہ مولانا سے پڑھنے آتا تھا، مولانا ماجد علی صاحب جنہوں نے بعد کو بہ حیثیت مدرس کے شہرت حاصل کی، وہ مولانا کے ادب میں اسی زمانہ کے شاگرد ہوں گے، مکاتیب میں اتنا ہی ہے کہ ”مولوی ماجد علی میرے شاگرد ہیں، ادب مجھ سے پڑھے ہیں“۔ (شروانی-۹۱)

قیام | مولانا جنوری بھڑ پٹی محمد کریم صاحب کے یہاں مہمان رہے، یکم فروری ۱۸۸۳ء کو شہر میں پانچ روپیے ماہ وار کا ایک مکان لے کر اس میں اٹھ گئے، مولانا کے بھٹے بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم اور ان کے چچا زاد بھائی محمد عثمان صاحب اور ایک اور عزیز عبدالغفور صاحب تعلیم کی غرض سے ان کے ساتھ گئے تھے، چنانچہ یہ مختصر قافلہ اسی مکان میں جا کر مقیم ہوا۔

لیکن اس مکان سے کالج دور تھا، اس لیے آنے جانے کے لیے سواری کا انتظام کیا، مولانا اس

مکان میں کئی مہینے رہے، اس مکان کے قریب خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل علی گڑھ (والد خواجہ عبدالحمید صاحب بیرسٹر) کا مکان بھی تھا، ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو اپنے عزیز شاگرد محمد سمیع صاحب کو ایک خط لکھا جو مکاتیب میں شامل ہے، اس خط سے اس مکان کی وضع، رہنے سہنے کا انداز اور اس زمانہ کے احباب اور مشاغل کا پتہ چلتا ہے۔

علی گڑھ کے ابتدائی مشاغل اور احباب | عام قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر ہوتا ہے تو احباب کو اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ کس مکان میں ہوگا، کیسے بسر ہوتی ہوگی، کیا مشغل ہوگا، دوست احباب کیسے ہوں گے، بھائی یہ خیال تمہیں ہو یا نہ ہو، مگر میں تمہاری طرف سے فرض کر کے اپنے طریق معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم عبارت کی رنگینی اور شان و شوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دو گے اور سادے نقروں پر قناعت کرو گے، میں جس مکان میں رہتا ہوں، شہر کے کنارے پر ہے، یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے، دکن کی طرف ایک خوش نما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے، اس میں خاص میں رہتا ہوں، ایک جانب پلنگ ہے اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے، صدر مقام کے دائیں جانب ٹکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے، دیوار میں لیپ جڑا گیا ہے، جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے، اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں، اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیز سی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے، کمرہ کے متصل جو حجرہ ہے، وہ عزیز سی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے۔

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے اور وہیں ایک شاعر مشہور جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اردو ہیں رہتے ہیں، مجھ سے اکثر ملتے ہیں اور قیس تخلص کرتے ہیں، خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے۔

مولوی سمیع اللہ خاں سے بھی ملتا رہتا ہوں اور بفضلہ عمدہ طور سے ملتے ہیں، میرا کبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے، میرے فارسی اشعار بھی انہوں نے سنے اور داد دی، مدرسہ کے خواجہ محمد یوسف صاحب نے متوسطات تک عربی تعلیم پائی تھی، مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے، نیز مولوی سمیع اللہ خاں کے، قانون میں ان کا تفوق مسلم تھا، خصوصاً قوت جرح میں، سرسید کے ہوا خواہ و معاون تھے، اختلاف کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں کا ساتھ دیا۔ (حبیب الرحمن)۔

لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں۔

انسوس کہ میرے قصیدہ کی متعدد کاپیاں نہیں، ایک پرچہ جو میرے پاس تھا وہ اس قدر سارے مدرسہ میں ہفتوں تک دست بہ دست پھرا کہ مل ول کر پرزے پرزے ہو گیا، اگرچہ بہت لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کر لیں، مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا۔

مرثیہ^۱ (جو تم دیکھ چکے ہو گے) جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے، از بس پسند فرمائی ہے، میر اکبر حسین^۲ صاحب بھی ان میں داخل ہیں۔

یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہلمدحکمہ کلکٹری ہیں، یہ صاحبِ یوان ہیں اور کتابوں کے بڑے شائق ہیں، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوادی ہیں اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بے چارے فخریہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں۔“

سرسید سے میل جول | مولانا چوں کہ کالج کے احاطہ سے باہر رہتے تھے، اس لیے دونوں کو باہم ملنے جلنے کا موقع کم ملتا تھا، مگر جیسے جیسے یہ ایک دوسرے سے ملتے گئے، ایک دوسرے کی قدر پہچاننے لگے، مولانا کو سرسید کے کتب خانہ کی محبت تھی اور سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو عقلی مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کو مدد دے سکے، سرسید کے بنگلہ کے قریب ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس کا نشان اب بھی باقی ہے، سرسید نے مولانا کو اس میں جگہ دی اور وہ شہر سے اٹھ کر اس بنگلہ میں چلے آئے، یہاں آجانے کے بعد دونوں کی روزانہ ملاقات ضروری ہو گئی، اگر مولانا کسی دن نہ جاسکتے تو آدمی بھیج کر بلواتے، اور مختلف علمی اور قومی مذاکرے درمیان ہوتے۔

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ سید صاحب بوعلی سینا کی اشارات جو فلسفہ کی اہم کتاب ہے، دیکھ رہے تھے، کوئی الجھاؤ ایسا تھا جس کو وہ حل نہیں کر سکتے تھے، اتنے میں وہ جا پڑے، سید صاحب نے کہا خوب آئے، یہ مقام سمجھ میں نہیں آتا، مولانا فرماتے تھے کہ بلا قصد میری زبان سے نکل گیا کہ آپ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، کہنے کو تو کہہ دیا مگر بے حد شرمندگی ہوئی، سید صاحب چپ رہے، مولانا نے

۱۔ سالار جنگ اول کا مرثیہ مراد ہے، جو دیوان میں شامل نہ ہوا، مگر علی گڑھ گزٹ میں چھپا ہے۔ ۲۔ مشہور شاعر اکبر الہ آبادی مراد ہیں، وہ اس زمانہ میں علی گڑھ میں منصف تھے۔

کتاب کا مطلب سمجھایا، تو ان کے چہرے پر بشارت آئی۔

مولوی عبدالعلیم صاحب شرم مرحوم جو مولانا کے پرانے دوست تھے، اور اس زمانہ میں جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، مولانا شبلی کے پاس علی گڑھ جا کر کبھی کبھی مہمان ہوتے تھے، اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”علی گڑھ میں سید صاحب نے انہیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا، اور ایک خاموش مقام تھا، ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط ضبط بڑھایا، اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلاناغہ مولانا اور سید صاحب میں گفتگوں صحبت رہتی۔“

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور امور خانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لیے انہیں اکثر حدیث و فقہ اور تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی، اس کام کو انہوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا قائل ہوتے جاتے تھے اُس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش و جستجو اور جہلپ روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے، اس زمانہ میں مجھے بار بار مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریک صحبت رہنے کا موقع ملا، مولانا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بے تکلفی تھی، اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں، سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے، اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم جو ان دنوں شائع ہوئی تھی ”صبح امید“ ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پر لطف اور موثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے اور اسی زمانہ میں علی گڑھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انہوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔“

علی گڑھ میں ابتدائی مشاغل | تعلیم و تدریس کے علاوہ علی گڑھ میں مولانا کے ابتدائی مشاغل شعرو شاعری تک محدود معلوم ہوتے ہیں، ان ہی لوگوں سے ان کو دل چسپی تھی جن کو شعر و سخن سے دل چسپی تھی، فارسی نامے اب بھی لکھے جاتے تھے، مگر اب قلم نے اردو خط کا بھی آغاز کر دیا، فارسی میں غزل اور قصیدے

اور اردو میں صرف غزل لکھتے تھے، ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کے مذکورہ بالا خط سے ان کا شاعرانہ ذوق بالکل نمایاں ہے، اردو غزلیں بھی لکھ لکھ کر وطن کے عزیزوں اور دوستوں کو بھیجتے، مکاتیب جلد اول میں محمد سمیع صاحب کے خطوط میں کئی اردو غزلیں نظر آئیں گی، ان غزلوں میں کوئی خاص بات نہیں، ۱۸ جنوری ۱۸۸۳ء کے خط ۵ میں لکھتے ہیں ”آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں، مگر اتنا ہے کہ اس کی بہ دولت کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں، رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی، دو تین شعر مزے کے ہیں، تمہیں بھیجتا ہوں۔“

پھر ۲۶ جنوری ۱۸۸۳ء کے خط میں اپنی دو اردو غزلیں محمد سمیع صاحب کو اور ایک فارسی مولوی حمید الدین صاحب کو بھیجتے ہیں ۸ فروری ۱۸۸۳ء کو پھر ایک اردو غزل محمد سمیع صاحب کو ان کے خط ۸ میں سنائی جا رہی ہے، اسی تاریخ کے خط میں ایک قصیدہ عید یہ کے لکھے جانے کی بشارت ہے، جو ۱۸۸۳ء میں لکھا جا چکا تھا اور گزٹ میں چھپا تھا اور دیوان میں بھی شامل ہے، اسی خط میں اپنے فارسی دیوان کے مرتب کیے جانے کے خیال کا بھی اظہار ہے، ۲۷ مارچ ۱۸۸۳ء کو یہ خیال اتنا غالب ہوتا ہے کہ اپنے استاد مولانا محمد فاروق صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کے فارسی کلام کو دیکھ لیں، کیوں کہ وہ چھاپا جائے گا، اسی تاریخ کے خط میں ایک فارسی واسوخت اور ایک اردو نامہ لکھے جانے کی خبر دی ہے، فرماتے ہیں ”قابل دید ہیں، خود اپنی زبان سے سناؤں گا“ (سمیع-۱۰) ۲۳ اپریل ۱۸۸۳ء کے خط (سمیع-۱۲) میں فرماتے ہیں: واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں، یعنی ۳۵ شعر اور اسی قدر نامہ اردو کے حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا، میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سردست چھپ جاتا، مگر روپیہ نہیں۔“

کالج میں مولانا کے شاعرانہ کمال کا شہرہ | اب کالج مولانا کے شعر و سخن کے چرچوں سے چپکنے لگا، ان ہی دنوں اپریل ۱۸۸۳ء میں ”حیران و فراوان“ کے قافیہ اور ”چہ کنم“ کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی، لڑکوں میں چرچا ہوا، کچھ نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے کیا حاصل؟ آخراں زمانہ کے دو مشہور فارسی شاعروں خواجہ عزیز الدین لمصنف قیصر نامہ پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ اور غالب کے شاگرد نیر دہلوی کو حکم مان کر مولانا اور حزیں دونوں کی غزلیں بہ حذف منقطع بھیجی گئیں، دونوں نے تسلیم کیا

۱۔ خواجہ صاحب کشمیری الاصل تھے، لکھنؤ میں اس زمانہ میں ان کی فارسی دانگی کی دھوم تھی، ان کا فارسی کلیات چھپ گیا ہے، ان سے آگے چل کر مولانا کے عزیزانہ و بزرگانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، مولانا لکھنؤ جاتے، ان سے ملتے، بلکہ ان کے پاس ٹھہرتے، اخیر زمانہ میں غالباً ۱۹۰۸ء میں ایک بار خاک سار بھی مولانا کی ہم راہی میں خواجہ صاحب کے یہاں گیا تھا، بڑے اہتمام سے انہوں نے کشمیری چائے پلائی تھی، ۸۵ برس کی عمر پر ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔

کہ مولوی شبلیؒ نے جو لکھا وہ اہل زبان کا کلام ہے، حضرت نیر نے تو بہت تعریف کی اور لکھا کہ سلف کے کلام کا ہم پلہ ہے۔ (مکاتیب اول ص ۱۲-۱۳)

مولانا کی یہ غزل دیوان میں نہیں، صرف دو شعر ہیں:

خود گرفتہم کہ بہ بلفش نفروشم دل و دین در بغاوت برد آن ز گس قتان چہ کنم
چاکے از دست جنون بہرہ من باشد دگر ار مغالاش نفرستم بہ گریاں چہ کنم
لیکن مولانا کے ایک پرانے شاگرد کے ذریعہ سے ہم کو یہ پوری غزل مل گئی ہے، مطلع یہ ہے:
گر کم عقل نہ گیرم من حیراں چہ کنم می دہد منچہ ام بادہ فراواں چہ کنم
یہ پوری غزل دوسرے موقع پر ہدیہ ناظرین ہوگی۔

اسی واقعہ کا یا اسی قسم کے دوسرے واقعہ کا ذکر مولانا ذکاء اللہ صاحب نے اپنے اس تبصرہ میں کیا ہے، جو انہوں نے مولانا کے مجموعہ نظم فارسی کے پہلے ایڈیشن پر لکھا تھا اور جو ۸ ستمبر ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ گزٹ میں چھپا تھا وہ لکھتے ہیں ”مجھے ایک دفعہ کا ذکر خوب یاد ہے کہ انہوں نے (مولانا شبلی نے) اپنی غزل کے اور شیخ علی حزیں کی غزل کے اشعار ملا کر لکھے اور قدر شناسانِ سخن ذوالقدر خاں بہادر خواجہ غلام غوث صاحب اور جناب نواب ضیاء الدین خاں فردوس مکاں کے پاس اس درخواست سے بھیجے کہ جو اشعار غزل میں آپ کو زیادہ پسند آئیں اور اچھے معلوم ہوں، ان پر صاد لکھ کر میرے پاس عنایت فرمائیے، ان مبصرانِ سخن نے مولوی صاحب کی استدعا کے موافق غزل کے اشعار پر صاد لکھ کر کے واپس بھیج دیا تو زیادہ تر صاد مولوی صاحب ہی کی غزل پر تھے، اس حوصلہ افزائی کا غالباً یہ اثر ہوا کہ مولانا نے حزیں کے تتبع میں اور بھی غزلیں لکھیں۔ (ص ۱۲-۱۳)

مولانا کی ان شاعرانہ جولانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کا کوئی جلسہ ہوتا اُس کے پروگرام میں مولانا کی نظم ایک ضروری چیز ہوگئی جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

نیارنگ | اب مولانا ایسی آب و ہوا میں تھے جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات، قدیم و جدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گرد و پیش تھے، ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے تھے کہ ان کے علاحدہ کرنے کے لیے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی، بحمد اللہ کہ مولانا میں یہ بصیرت موجود تھی۔

جدید تعلیم پر مولانا کا پہلا تبصرہ | اب تک جدید تعلیم کے محاسن و معائب کی خبریں مولانا دور سے سنتے تھے اور اب اُن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اپنے جانے کے چند ہی مہینوں کے بعد اپنے وطن میں ایک عزیز کو لکھتے ہیں: ”یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش بہ رائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی پیمائش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت (اس زمانہ میں بی اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے، لاحول ولا..... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے، سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تہہ ملی نہیں پیدا کرتی۔“ اس بے باکانہ اظہار و بیان سے معلوم ہو گا کہ نئی تعلیم کی ظاہری چمک دک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اور حق و باطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی۔

علی گڑھ کے اثرات، موضوع شعر میں تغیر | بہر حال علی گڑھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انہوں نے بہت جلد قبول کر لیا، ان میں سے سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے، ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن و عشق کی جھوٹی کہانیوں سے لب ریز ہوتے تھے، اب قوم و ملت کے عشق سے خون افشاں ہونے لگے مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے، یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا، اسی سال ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی وہ ان کو خون کے آنسوڑ لاگئی، ایک قصیدہ عید لکھا جس میں عید کی آمد کی خوشی، سامان اور دو گانہ عید کی کیفیت کے بعد ملت کے درد پر جو آنسو بہائے ہیں، ان کے چند قطرے یہ ہیں:

چہ کند عید بدر دے کہ بود صبر گداز	حیف کیں شور و طرب یک دلفس پیش نماز
خود چو کج باخت بایشاں فلک عربہ ساز	جمع اسلام چو باشد ہدف تیر بلا
آہ از فتنہ گری ہائے سہم کج باز	فرق نبود محققیت ز محرم تا عید
خود ہماں قوم کہ بودہ است بہر پایہ فرراز	خود ہماں جمع کہ می داشت بہم تیغ و قلم
خود بہ بیس تا چہ انجام رسید آں آغاز	ایک آں قوم بحالیست کہ نتواں گفتن
شب بود کو تہ و افسانہ درازست دراز	شرح ایں حادثہ از شبلی دل خستہ نخواہ

۱۔ مکاتیب صحیحہ -۱۔

یہ اثر روز بہ روز تیز ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۵ء میں مثنوی ”صبح امید“ لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پروردادستان کی شرح کے بعد سرسید کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبح امید کے طلوع کی خوش خبری سنائی، مثنوی بار بار چھپی اور مقبول عام ہوئی۔

سرسید نے ایک بار نمائش گاہ کے موقع پر علی گڑھ میں ایک قومی تماشے کا جلسہ کیا، جس میں قوم کے حالیہ زار کا پُر اثر منظر دکھایا، اس میں خود سرسید اور دوسرے اکابر نے تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں، مولانا نے اس میں اپنا وہ اردو مسدس پڑھا جو اسی مثنوی کے ساتھ چھپا ہے، انہوں نے اس مسدس کو اپنے پُر درد و ہر سوز لہجہ میں جب پڑھا تو سب کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں، تفصیل آگے آتی ہے۔

بہر حال اس وقت سے مولانا کی نظموں کا موضوع سخن بدل گیا، کالج کے یونین میں، ایجوکیشنل کانفرنس میں اور ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں وہ نظمیں پڑھیں کہ جب وہ پڑھی جاتی تھیں تو صدر سے لے کر پائین تک سارا مجمع اثر میں ڈوب جاتا تھا، ان کی یہ نظمیں دیوان میں موجود ہیں اور ہر شخص آج بھی ان کو پڑھ کر ان کی تاثیر کا امتحان کر سکتا ہے۔

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس | علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر اظہار ہو گئی، اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انہوں نے خود شروع کیا، ان کے مکتب میں ان کے عزیزوں کے نام کے خطوط انگریزی تعلیم کی طرف انہماک اور اس کے حصول کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں، علی گڑھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ اپنے شہر میں وہ انگریزی تعلیم کا ایک اسکول جاری کریں، چنانچہ ۲۰ جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ شہر اعظم گڑھ میں قائم کیا، خود سرکریٹری ہوئے اور عزیزوں کو ممبر بنایا، ان کے والد بزرگ وار اور دوسرے عزیزوں اور ہم دردوں نے اس کی امداد میں شرکت کی، اس کی عمارت اور تعمیر کے لیے اپنے خاندان کی ملکیت سے زمین دلوائی، اعزہ اور برادری کے لوگوں سے چندے لیے اور صرف ایک ماسٹر اور تین طالب علموں سے کام شروع ہوا، رفتہ رفتہ مدرسہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۷ء میں مڈل اسکول اور ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول ہو گیا، مولانا کے مکتب میں ان

۱۔ مولانا شرادائی فرماتے ہیں، ”میں بھی اس تماشے میں بہ حیثیت تماشاگاہی شریک تھا، علامہ کی پرورداد و ازاب تک دل کے کانوں میں گونج رہی ہے۔“ ۱۲۔

کے عزیزوں کے نام کے خطوط میں اس اسکول کا جس کثرت سے ذکر ہے اور اس کی طرف اپنے عزیزوں کو جس شدت کے ساتھ ملقت کیا ہے اس سے ان کے انہماک کا پتہ چلتا ہے، جو ان کو قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔

برادری کے لوگوں کی سالانہ ترقی کی جانچ کے لیے موازنہ ”ترقی قومی“ کے نام سے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی جس کی طرف سے ہر سال برادری کی تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے، مولانا کے مکاتیب میں اس موازنہ قومی کا ذکر بار بار آیا ہے۔

ایک دوسرا اسکول اپنے گاؤں بندول میں قائم کیا جو غالباً ابتدائی تھا اور آگے نہ بڑھ سکا (صفحہ ۶) شہر پٹنہ میں سرسید کے رہنا میں سے قاضی رضا حسین صاحب اور دوسرے اعیان شہر کی کوشش سے ”انگلو عربک اسکول“ قائم ہوا تھا، جو اب تک قائم ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں کا خاص مدرسہ ہونا اور اس میں آٹھ لڑکوں میں سے پانچ مسلمان لڑکوں کا انٹرنس پاس کرنا ایسا واقعہ تھا، جس پر خوشی کی جاتی تھی، چنانچہ ۸ مئی ۱۸۸۸ء کو مولانا فخر و مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع اپنے عزیزوں کو بھیجتے ہیں، ”اب کی پٹنہ مجھن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان ہیں“ (صفحہ ۲۲) مولانا کو انگریزی کی ضرورت کا احساس اتنا ہو گیا تھا کہ علما کے لیے بھی اس کا جاننا ضروری سمجھتے تھے، اس احساس ضرورت کا ایک دل چسپ واقعہ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں ایک تقریر میں بیان فرمایا تھا، علما کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت کے سلسلہ میں فرمایا ”جب میں ترکی سے واپس آیا تھا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی، ایک رات کو ۱۲ بجے تار آیا، میں نے اس کو کھولا، دل میں دُبدھا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے، خدا جانے کیسا تار ہے، خیر میں دوڑا ہوا سرسید مرحوم کے نواسہ کے پاس گیا، انہوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے، وہ آپ کو ترکی سے بہ خیریت واپس آنے پر مبارک باد دیتے ہیں، یہ حال ہم مولویوں کا ہے“، اسی لیے وہ ندوہ کے نئے مدرسہ میں انگریزی کے پڑھانے پر بہ ضد تھے، چنانچہ دارالعلوم ندوہ کے نصاب میں اس کے داخل کیے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی (شروانی ۲۱ و ۲۲) مگر کام بائی نہ ہوئی، آخر ان ہی کے اصرار سے ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے شریک کی گئی، غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے کہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم

۱۔ روداد ندوہ، اجلاس لکھنؤ، ۱۹۱۲ء، ص ۱۵۶۔

کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے، مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں، ان کو انگریزی کیا کام آئے گی، فرمایا عجیب بات کہتے ہو، اگر فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے، اصل یہ ہے کہ مولانا کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے، اس لیے ”من نہ کردم شاحذر بکنید“ کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علماء ایسے ہوں جو اس خدمت کو بجالائیں۔

تاریخی ذوق | اب تک مولانا کا تاریخی ذوق نمایاں نہ تھا، لیکن کالج پینچنے کے ساتھ یکا یک ان کا تاریخی ذوق ابھر آتا ہے، مولانا کی طبیعت میں اس ذوق کا بیج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر لائیٹنر (G. W. LAITNER) کی کتاب سنین اسلام کے مطالعہ سے پڑا، ڈاکٹر لائیٹنر عربی و فارسی کے مشہور عالم اور ٹیبل کالج لاہور کے بانی اور پرنسپل تھے، انہوں نے عربی کے طالب علموں کے لیے ۱۸۷۶ء میں سنین اسلام کے نام سے اردو میں اسلام اور عرب کی ایک مختصر سیاسی اور علمی تاریخ دو جلدوں میں لکھی تھی، اصل کتاب کی تالیف اور اضافہ میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارن پوری پروفیسر اور ٹیبل کالج اور مولوی غلام مصطفیٰ صاحب نے مدد دی تھی اور اس کی اردو زبان کے درست کرنے کا کام مولانا محمد حسین آزاد نے انجام دیا تھا، غالباً تاریخ کی پہلی کتاب تھی جو عربی خواں طالب علموں کے ہاتھوں میں آئی اور غالباً مولانا کو یہ کتاب ان کے لاہور ہی کے زمانہ قیام میں ہاتھ آئی، میں نے سنا ہے کہ مولانا اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات کے واقعات پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مولانا جب علی گڑھ پہنچے تو اس کتاب کی یاد ان کو پھر آئی، اس کا نسخہ مولانا سے ان کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب نے لے لیا تھا، ۲۷ مارچ ۱۸۸۴ء کو وہ اپنا نسخہ ان سے منگواتے ہیں (صفحہ ۱۱۰-۱۱۱) اس سے پہلے ۲۶ جنوری کو مولانا محمد حسین صاحب آزاد کو لکھا ہوا ہے کہ کتاب کا ایک نسخہ الہ آباد ایک صاحب کے پاس بھیج دیا جائے، (صفحہ ۶) اس سے ایک سال پہلے ۱۸۸۳ء میں مولانا نے جو فارسی عید یہ قصیدہ لکھا تھا، اس میں تاریخ اسلام کے بعض ممتاز شہروں اور نام ور خاندانوں کے حوالے ہیں۔

اب تک مولانا کے تاریخی معلومات اسی قسم کی کتابوں کے ذریعہ سے تھے، جب وہ علی گڑھ پہنچے اور سرسید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ و جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں، تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا۔

تصنیفی ذوق | مولانا میں تصنیفی ذوق تو پہلے سے موجود تھا، ان کی پہلی عربی تالیف اسکاٹ المحدثی اور فقہ حنفی کے بعض دوسرے مناظر اندر رسالے چھپ چکے تھے، یہاں آکر ان کے تصنیفی ذوق کا محور بدل گیا، مولانا مجھ سے فرماتے بھی تھے اور مکاتیب میں اڈیٹرز مانہ کے ایک استفسار نامہ کے جواب میں بھی لکھتے ہیں: ”تصانیف کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا، جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی ایک جالی تھیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔“

یہ ایک جاکتا میں سرسید کا کتب خانہ تھا، فرماتے تھے کہ سرسید نے مجھے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کے دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی، تو میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا، سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی، اس حکایت کی تصدیق مکاتیب سے بھی ہوتی ہے، ۱۹ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں: ”سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں یورپ میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں“ (سہج-۳) یورپ والوں کے طرز پر تاریخی واقعات کی ترتیب اور نتائج کے استنباط کا نمونہ مولانا کے سامنے لگن کے رومن امپائر کا اردو ترجمہ ہے جس کو سرسید نے اپنے لیے کرایا تھا، ایک خط میں ۱۹ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں ”لگن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپے کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے“ (سہج-۳) اس کے بعد دوسری کتاب جو ان کے ہاتھ میں آئی وہ مشہور عربی داں انگریز مسٹر پامر کی حیات ہارون الرشید ہے، تاریخ لگن کے ترجمہ کا یہ مسودہ کالج کی لائبریری میں تھا، جو سرسید کے بعد چوری ہو گیا، اور آخر مولانا حالی کو اس کا پتہ لگا، مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی نے وہ نسخہ لا کر مولانا حالی کے حوالہ کیا، مولانا حالی ایک خط میں مولانا صاحب الرحمن خاں شروانی کو لکھتے ہیں، ”۲۳۷ صفحہ کی ایک ضخیم جلد ہے، حنفی قلم سے لکھی ہوئی ہے جس کے ترجمہ کی اجرت سید صاحب نے مولوی ابوالحسن صاحب کو جو حیدرآباد میں نوکر ہیں، ایک ہزار روپیہ دیا تھا، کالج کی مہرین جاہ جاگی ہوئی ہیں، مگر چونے نے بعض کو جو حاشیہ پر تھیں، کتر کرواں اور کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، اور اکثر جگہ پہلے مہر کی سرخی کو سیاہ قلم سے کاٹا ہے اور پھر کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، مگر ہر ایک کی چنی چھٹی کھانی ہے، اس کے سوا اس مسودہ کے بہت سے آدمی پہچاننے والے موجود ہیں، بہر حال یہ مسودہ میرے قبضہ میں آ گیا ہے، کہنے تو محسن الملک کے پاس بھیج دوں، اور کہنے آپ کے یا مزل اللہ خاں صاحب کے پاس روانہ کر دوں مگر مجھ کو آپ کی نگہداشت پر زیادہ اطمینان ہے، اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی کی خدمت میں بھیجوں۔ (مکتوبات حالی، جلد اول، ص ۱۳)

اس کا ترجمہ مولانا کے زیر نظر تھا، جس کی شہادت مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ نے جوان کے معاصر ہیں، دی ہے، مولانا نے المامون میں گبن کا کئی مقامات پر اور پام صاحب کا ایک دو جگہ ذکر کیا ہے۔

تصنیف کی تیاری | ان کتابوں کے مطالعہ سے مولانا کو پہلے پہل ایک مکمل اسلامی تاریخ کا خیال آیا اور پھر وہ گھٹ کر تاریخ بنی عباس تک محدود ہو گیا اور غالباً اس کے لیے ان کے سامنے سنین اسلام کا نقشہ تھا، چنانچہ اس دوران میں انہوں نے وطن سے سنین اسلام کا نسخہ منگوا یا (سج-۱۱۰) اور اسی سال ۱۸۸۳ء میں تاریخ بنی عباس کا کام بڑی محنت سے شروع کیا (سج-۱) اور ۹ اپریل ۱۸۸۴ء کو خلیفہ مقتضم کے حالات تک وہ پہنچ چکے تھے (سج-۱۱) لیکن یہ کام اتنا لمبا تھا کہ اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیر و کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس کو نام و فرماں رو یا ان اسلام کے سلسلہ سے موسوم کیا۔

مثنوی صبحِ امید | بہر حال ۱۸۸۷ء تک کا زمانہ انہوں نے کامل مطالعہ اور تصنیف کی تیاری میں گزارا، اس وقت تک ان کی جو چیز منظر عام پر آئی وہ ان کے فارسی قصائد تھے، ۱۸۸۵ء میں سب سے پہلے ان کی مثنوی صبحِ امید چھپ کر شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا افسانہ اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا خوش آئند مرقع ہے، جس کو صبحِ امید سے انہوں نے تعبیر کیا تھا، مولانا نے گو بعد کو اس مثنوی کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے یہ اب بھی تعریف کے قابل ہے۔

یورپ کی تحقیقات علمی سے آگاہی | کالج پہلا مقام تھا جہاں اس وقت مشرق و مغرب کے اساتذہ یک جاتھے، اور ایک دوسرے کے خیالات و معلومات سے متاثر ہو رہے تھے، مولانا کو کالج آ کر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا، اس کے لیے سب سے پہلا مسالہ تو سرسید کے کتب خانہ سے ان کو ہاتھ آیا، اس کے بعد خوش قسمتی سے اس وقت کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسا ایک انگریز عالم یہاں موجود تھا، پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کے تعلقات کی دلچسپ داستان ایک ”شاہد یعنی“ کی زبان سے سننے کے لائق ہے، مولانا شروانی لکھتے ہیں ”بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا، یہ دونوں دل دادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف المون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں، پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا، یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں، علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب

نہیں ہوئے، بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا جو اصول عمدہ تھے، ان کو اخذ کیا، نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا، نمائشی چیزوں کو رد کر دیا، پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جو ہر آب دار موجود ہیں، اگرچہ گرد آلود ہو کر ننگا ہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف ”پریچنگ آف اسلام“ کی صورت میں عیاں ہوا، علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فریج بھی سیکھی، علامہ مدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلے کا حل کرنے والا ہے، کالج میں پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی ایسے گل مل گئے تھے کہ اجنبیت اور بے گانگی دور ہو گئی تھی، پروفیسر مدوح روزانہ ان کو فریج پڑھانے ان کی اقامت گاہ پر آیا کرتے تھے اور وہ خود مولانا سے عربی پڑھتے تھے، اس سلسلہ میں تعلیم کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے خیالات اور معلومات سے بھی روزانہ واقف ہوتے تھے، مولانا اپنی مجلس میں پروفیسر صاحب کے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ پڑھنے پڑھانے کا جو وقت انہوں نے مقرر کیا تھا اس میں ایک منٹ کا فرق کبھی نہیں پڑتا تھا، ایک دفعہ چند منٹ کی دیر ہو گئی تو اتنی معذرت کی کہ مجھے شرمندگی معلوم ہوئی اور کہنے لگے کہ یورپ میں وقت کی بڑی قیمت ہے، فرماتے تھے کہ آرنلڈ صاحب نے انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی عربی گرامر لے کر چپکے چپکے از خود عربی صرف و نحو کے مسئلے پڑھنے شروع کیے، چند روز کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے میں عربی عبارت پڑھتا ہوں، کہیں غلطی تو نہیں ہوتی، اس کے بعد عبارت پڑھی ایسی صاف اور صحیح پڑھی کہ حیرت ہو گئی، پروفیسر صاحب کا ایک عربی خط مولانا کے پاس تھا، اور مجھے دکھایا تھا اس کی عربی کی تعریف کرتے تھے، اس کا ایک فقرہ مجھے اب تک یاد ہے، و خلیفتی تقدأك السلام (میری بیوی آپ کو سلام کہتی ہے) یہ فصیح ترین عربی ہے، اس کے بعد یہ مضمون اگر کوئی مولوی لکھتا تو شاید یہ لکھتا ”و زوجتی تسلّم عليك“

پروفیسر آرنلڈ اور مولانا کے ان ہی تعلقات کا اثر تھا کہ پروفیسر صاحب ۱۸۹۲ء میں جب ۱۔ پروفیسر آرنلڈ کالج میں دس برس رہ کر فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے لاہور کو رنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے، وہیں انہوں نے عربی لغت میں ”سواء السبیل فی معرفة المعرب والدخیل“ لکھی، لاہور کے قیام میں ان کے سب سے لائق شاگرد ڈاکٹر اقبال ہوئے، ڈاکٹر اقبال اور مولانا میں تعلقات کی توجیہ وہی تھی، علی گڑھ سے ان کے رخصت ہوتے وقت کالج میں ایک الوداعی جلسہ ہوا تھا جس میں مولانا شبلی مرحوم نے حسب ذیل تقریر کی تھی، ”یہ یورپ کی تلوار نہیں جس نے دنیا کی تمام قوموں کو مغلوب اور حلقہ بہ گوش کر لیا ہے، بلکہ یورپین قوموں کی خوش اخلاقی ہے، جس نے تمام دلوں کو تسخیر کیا ہے، اور آرنلڈ اس خوش اخلاقی اور پسندیدہ خصال کی ایک زندہ تصویر ہے۔“ مولانا نے اس زمانہ کا جب وہ آرنلڈ صاحب سے فریج پڑھا کرتے تھے، ایک واقعہ بیان فرمایا ہے، جو انہوں نے آرنلڈ صاحب کے نیک اخلاق کی (بقیہ حاشیہ ص ۱۳۸ پر)

انگلستان جانے لگے تو مولانا بھی ان کے ساتھ قسطنطنیہ کے سفر کے لیے آمادہ ہو گئے اور آخر ان ہی کے ساتھ پورٹ سعید تک سفر کیا، اور وہاں سے آگے تہا گئے اور ان ہی کے متعلق اپنے سفر روم کے قصیدہ میں یہ شعر لکھا ہے، ع ”آرنلڈ آنکھ رفیق است و ہم استاد مرا“

آرنلڈ اور شبلی کے سلسلہ کلام کی دو حکایتیں مولانا کی زبان سے سنی ہوئی مجھے اور یاد ہیں، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ کوئی یورپین فاضل علی گڑھ آ کر مجھ سے ملا، اس کو فارسی ادب کا ذوق تھا، اس سے اس موضوع پر باتیں ہوئیں تو اس کی واقفیت بہت محدود معلوم ہوئی، دو سال کے بعد اس نے فارسی ادب (بقیہ حاشیہ ص ۱۳۷) شہادت میں پیش کیا، یعنی آرنلڈ صاحب ہر روز صبح ۶ بجے میرے پاس مکان پر مجھے سبق پڑھانے کو تشریف لایا کرتے تھے، ایک دن چھ پر صرف پانچ منٹ زیادہ گزر گئے، اور میں دیکھتا کیا ہوں کہ مسٹر آرنلڈ سر پٹ بھاگے چلے آ رہے ہیں، مکان پر پہنچتے ہی میرے سامنے عاجزانہ کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ، ”مولوی صاحب ہم آپ کا بحر ہے، ہم نے آج دیر کی، آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں،“ مولوی صاحب نے بڑے افسوس سے فرمایا کہ وہ اس نظم کو تیار نہ کر سکے جو ان کا ارادہ تھا کہ آرنلڈ صاحب کی جدائی پر لکھیں گے، لیکن اس نظم کے بہ جانے اس وقت صرف دو اشعار پڑھے اور وہ ہیں:

آرنلڈ آن کہ دریں شہر و دیار آمد و رفت دلبرے بود کہ مارا بکنار آمد و رفت

آمد آن گو نہ بہ کالج کہ یہ گلزار نسیم رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

لوگوں کو یہ شعر اس قدر پسند آئے کہ تین تین دفعہ پڑھوا کر سنے۔ (کالج میگزین فروری ۱۸۹۸ء، ص ۷۱)

وہ لاہور سے ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس گئے، مولانا اس زمانہ میں حیدرآباد تھے، ان کو پہنچانے حیدرآباد سے بھیجی گئے، اور کوئی تحفہ دیا (حمید، ۲۵) انگلستان پہنچ کر وہ انڈیا آفس میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے، اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں کے سرکاری مشیر ہوئے اور ۱۹۲۰ء سے آخر تک وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

مولانا کی زبان سے پروفیسر آرنلڈ کا نام میں نے اتنی دفعہ سنا تھا کہ جب مجھے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے سلسلہ میں انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی ملاقات کا شوق تھا، اتفاق یہ کہ وہ خود ملنے آئے اور مولانا شبلی کی نسبت سے بہت محبت سے ملے، وہ اس زمانہ میں انڈیا آفس کے مشرقی صیغہ میں ملازم تھے، ہندوستان میں سرسید اور ان کے دوستوں کے جو خیالات خلافت عثمانیہ کے بارہ میں تھے، اور مولانا شبلی نے جو مضمون علی گڑھ میگزین میں لکھا تھا، وہ ان سب سے واقف تھے، وہ بار بار آ کر مجھے مولانا کے اس مضمون کی طرف متوجہ کرتے تھے، اور میں جواب دیتا تھا کہ اس کی حیثیت تاریخی ہے، مذہبی نہیں، اس زمانہ کے وزیر اعظم مسٹر لڈ جارج کے سامنے جب ہمارے وفد نے اس مسئلہ کو پیش کیا تو وزیر اعظم کی امداد و مشورہ کے لیے پروفیسر صاحب بھی وہاں موجود تھے، ان کے ذریعہ سے مجھے انڈیا آفس کے کتب خانہ کے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔

وہ ۱۹۳۰ء میں مصر کے جامعہ مصریہ میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ پر لکچر دینے مصر آئے تھے، یہاں سے واپس جا کر ۹ جون ۱۹۳۰ء کو اوجا تک انتقال کیا، (ان کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھئے معارف اپریل ۱۹۳۱ء) ان کی زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ”پریچنگ آف اسلام“ کی تصنیف اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب میں شرکت ہے۔

پر کوئی کتاب لکھ کر میرے پاس بھیجی، جو بہت غنیمت تھی، مولانا فرماتے تھے کہ اس کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا، میں نے اپنے اس تعجب کا ذکر پروفیسر آرنلڈ سے کیا، انہوں نے پوچھا کہ آپ ان سے کب ملے تھے، فرمایا دو سال ہوئے جواب دیا، مولانا یورپ کا آدمی دو سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ فرماتے تھے کہ میں نے آرنلڈ صاحب سے کہا کہ ہم لوگ اپنے استادوں کی جیسی عزت کرتے ہیں وہ آپ لوگ نہیں کرتے، آرنلڈ صاحب نے کہا ”بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں علم ہر روز آگے کو بڑھ رہا ہے، اس لیے ہر شاگرد اپنے استاد سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے، اس لیے وہ اس کی رسمی عزت کہاں تک کرے۔“

یہ دونوں واقعے اس بات کا نمونہ ہیں کہ یورپ کے سیاسی لوگوں کو چھوڑ کر ان دنوں یورپ کے فضلا بھی اپنی قوم کی دماغی فضیلت اور ذہنی برتری کا سکہ کس طرح ایشیا والوں کے دلوں میں بٹھاتے تھے، حالاں کہ آرنلڈ صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ مجسم علم تھے اور علم کی خدمت کے سوا ان کا کوئی اور مطمح نظر نہ تھا، مولانا شبلی مرحوم نے سفر نامہ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے اس کی تصدیق ہوگی، لکھتے ہیں ”لیکن دوسرے ہی دن ایک پرخطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر تک مجھ کو سخت پریشان رکھا، ارمنی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا، میں نے دیکھا تو واقعی کیتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے، انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا، میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا، دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا، وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے، بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رازبگاز کرنا بالکل بے عقلی ہے، ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا، آٹھ گھنٹہ کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا، مولانا کالج میں رہ کر کسی قدر انگریزی سے حرف شناس ہو گئے تھے اور معمولی عبارت سمجھ لیتے تھے، آرنلڈ صاحب سے انہوں نے فرنج سیکھنی شروع کی، کیوں کہ اسلامی مباحث پر اکثر کتابیں فرنج اور جرمن میں تھیں، اس لیے ان دو میں سے کسی ایک زبان کے جانے بغیر اسلامیات کے متعلق اہل یورپ کی تحقیقات

اور کاوشوں سے براہِ راست واقفیت ممکن نہ تھی، مولانا آرنلڈ صاحب سے موسیو سید یو کی کتاب ”تمدنِ اسلام“ سبقتاً پڑھتے تھے اور جس نسخہ میں پڑھتے تھے وہ تبرک دار المصنِّفین کے کتب خانہ میں اب تک موجود ہے۔

مولانا کو یورپین تصانیف اور مطبوعات سے جو واقفیت ہوئی، اس کا ایک دوسرا ذریعہ بھی تھا جس کا تعلق علی گڑھ سے نہیں بلکہ حیدرآباد سے ہے، مولوی سید علی بلگرامی جو عربی اور انگریزی کے علاوہ فرنیچ اور جرمن وغیرہ بہت سی زبانیں جانتے تھے اور جو یورپ کے فضلا اور ان کی تصنیفات سے براہِ راست تعلقات رکھتے تھے اور ان کے کتب خانہ میں ان معلومات کا بڑا سرمایہ تھا، ان سے اور مولانا سے ملاقات گولہ ۱۸۹۱ء میں ہوئی، مگر تعارف کا آغاز المامون کی اشاعت سے ہو گیا تھا، یہ تعارف ملاقات کا اور ملاقات تعلقات کا ذریعہ بن گئی، مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے مولانا کو یورپ کی مطبوعات کے بہت سے نسخے بھی نذر کیے تھے، جو مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں تھے، اور جن کو بعد کو انہوں نے ندوہ میں وقف کر دیا اور اس وقت وہ وہاں موجود ہیں، فہرست ابن ندیم کا نسخہ اسی زمانہ میں مولانا کو ان ہی سے ملا تھا، سید علی بلگرامی نے اس کے یونانی ناموں کے صحیح تلفظ انگریزی میں اس کتاب پر اپنے قلم سے لکھے تھے، مولانا کا مضمون ”تراجم“ اسی نسخہ پر مبنی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی سید علی صاحب بلگرامی جب حیدرآباد سے الگ ہو کر ہردوئی میں رہنے لگے تھے تو مولانا سے ملنے لکھنؤ آئے، اسی زمانہ میں مولانا دارالعلوم ندوہ کے معتمد تھے، مدرسہ میں ان کی تقریر کا انتظام ہوا، اس تقریر میں انہوں نے فرمایا تھا ”اگر آپ کو یورپ کی کوئی زبان علم کی خاطر سیکھنا ہے تو فرنیچ یا جرمن پڑھئے، انگریزی تو بیویوں کی زبان ہے۔“

مولانا نے کتب خانہ اسکندریہ کی تحقیق پر جو رسالہ لکھا تھا اس میں بعض یورپین مستشرقوں کے مضامین کا ترجمہ مولوی سید علی بلگرامی ہی نے کر کے دیا تھا، جو رسالہ مذکور کے ساتھ ان ہی کے نام سے چھپا ہے۔

علی گڑھ کی مرکزیت کے سبب سے یورپ میں اسلام اور تاریخ اسلام پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھیں، مولانا ان کے مضامین سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور قابلِ اعتراض باتوں کا جواب دیتے تھے۔

چنانچہ مسٹر پامر نے انگریزی کتاب ہارون الرشید کی لائف میں مسلمان بادشاہوں پر مذہبی تعصب کا جو الزام قائم کیا تھا، مولانا نے المامون میں ضمناً اس کا پورا جواب دیا ہے، اسی طرح پروفیسر شیڈون ایموز (Sheldon Amos) نے جو اس زمانہ میں لندن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے، اپنی کتاب ”رومن سول لا“ میں فقہ اسلامی کا رومن لا سے ماخوذ ہونا ثابت کیا تھا، مولانا نے سیرۃ النعمان کے ایک حاشیہ میں اس کا مدلل جواب لکھا ہے، ان کتابوں کا یا ان کے مفید مطلب ابواب کا ترجمہ ان کے شاگردان کے لیے کر دیا کرتے تھے۔

مصری مطبوعات کا سرمایہ | اسی سلسلہ میں کالج پہنچ کر مصر کی نئی عربی مطبوعات اور تصنیفات سے بھی مولانا کو آگاہی ہوئی، مصر کی حالت اس لحاظ سے ہندوستان سے بہتر تھی کہ وہ ہندوستان کی طرح انگریزوں کا پورا غلام نہ تھا اور نہ وہاں کے علمی حلقہ پر انگریزی کا تسلط تھا، یورپ کی قوموں اور زبانوں میں سے مصر کو سب سے پہلے فرانسیسی سے سابقہ پڑا، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں جب مصر پر قبضہ کیا تو وہ قبضہ گو بہت جلد اٹھ گیا، مگر اس کا علمی و ادبی تسلط اس سرزمین سے نہیں اٹھا، اس لیے مصر کو یورپ کی زبانوں میں سے ”نیوں کی انگریزی زبان“ سے واسطہ نہیں پڑا، بلکہ یورپ کی ایک ایسی زبان سے واسطہ پڑا جو سرتاپا علمی تھی، اور جس میں اسلامی معلومات و تحقیقات کا بڑا سرمایہ تھا، بہر حال مولانا مرحوم کے پاس مصر و شام کے مصنفوں اور ادیبوں کی کتابیں بہ راہ راست آتی تھیں اور وہ خود بھی وہاں سے ہر نئی کتاب جو مطبع سے چھپ کر نکلتی تھی، منگوا کر لیتے تھے، جدید فلسفہ، جدید ہیئت، جدید طبیعات اور عربی صرف و نحو بلاغت پر نئی نئی طرز کی جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ ان کے پاس پہنچتی تھیں اور مولانا ان کے ذریعہ سے یورپ کی جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کرتے تھے، اسی طرح قدما کی تصانیف جو متاخرین کی کتابوں کا ماخذ ہیں اور جو متاخرین کی کج مح اور پیچیدہ منطقیانہ طرز تعبیر کے بہ جائے زیادہ واضح اور صاف ہیں، مولانا ان کے پورے قدر دان تھے، وہ جہاں سے مل سکتیں، ان کو منگواتے تھے اور پڑھتے تھے، قلمی ہوتیں تو ان کی نقلیں لیتے۔

عربی اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا اور سمجھنا اس زمانہ میں ہر مولوی کا کام نہ تھا، تمام ہندوستان میں شاید مولانا پہلے شخص تھے، جنہوں نے ان کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا، بلکہ الہلال وغیرہ مصر کے عربی رسالوں میں ان کے مضمون بھی چھپتے تھے، ایک خط میں وہ اپنے عربی اخباروں اور اپنے یہاں آنے والے رسالوں کے یہ نام لکھ کر بھیجتے ہیں، ثمرات الفنون، قسطنطنیہ، السلام، اطرابلس، الموید

المسارء الہلال، المحفوظ، (ریاض حسن خان-۱)

آگے بڑھ کر جب مولانا کے فضل و کمال کا شہرہ یورپ کے علما تک پہنچا تو انہوں نے بھی مولانا سے تعلقات پیدا کیے اور وہ یورپ کی مطبوعات ان کو کبھی کبھی ہدیہ بھیجتے تھے، چنانچہ ڈوزی کا مشہور عربی لغت انگلستان سے مسٹر تھارٹن (Thorton) نے اپریل ۱۸۹۸ء میں ہدیہ بھیجا تھا، اس کتاب کے پہلے حصہ پر مولانا کی یہ یادگار تحریر ہے:

اهدی الیّ هذا الكتاب مسٹر تھارٹن (Thorton) احد كبار الانكليز في عاصمة لندن

شبلی نعمانی ۱۶/اپریل ۱۸۹۸ء، ۲۵/ذیقعدہ (۱۳۵ھ)

مولانا کی یہ بھی عادت تھی کہ جب انگریزی کی نئی کتابوں کے معلومات کی ضرورت ہوتی تو کتابیں منگوا کر عزیزوں اور دوستوں سے ان کے ترجمے سنتے، انگریزی داں دوستوں سے فرمائش کرتے کہ فلاں مقام یا بحث کا خلاصہ لکھ کر بھیجو، کبھی یہ لکھتے کہ اس مضمون کے متعلق نئے معلومات اگر تمہاری نظر سے گذرے ہوں تو مطلع کرو، چنانچہ مکاتیب میں ان کے خاص خاص دوستوں اور شاگردوں کے نام جو خطوط ہیں، ان میں یہ باتیں اکثر نظر آئیں گی۔

کالج پر مولانا کے اثرات | محمدن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک پرائیور یا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تھا، جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے تمدن و تہذیب کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکا یک آیا اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا، یہ بہ جائے خود ایک کمال ہے اور کالج نے قدیم و جدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا اور وہ چپقلش اور کشاکش نہ ہونے پائی جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا۔

اس بزم میں گو دوسرے علما بھی شریک تھے، مگر وہ جہاں تھے، وہیں رہے، لیکن مولانا شبلی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھا رہے تھے اور ہر علمی بحث میں ان کا قول فیصل تھا، وہ اپنے فضل و کمال بنا پر بہ جائے اس کے کہ نئے علوم و فنون کے اہل کمال سے مرعوب اور اپنے علوم ان کی نگاہوں میں پے قدر ہوتے، انہوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا اور اپنے قدیم علوم و فنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل

پر مجبور کر دیا اور ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفانِ خیر سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔

کالج کوئی پرانے طرز کا عربی کا مدرسہ نہ تھا، جہاں عربی شروع و حواشی کا درس دیا جاتا، وہ سرتا پدید علوم و فنون کے ہوش ربا مناظر کا تماشا گاہ تھا، اس فضا میں طلبہ کے اندر اپنے پرانے علوم، فارسی ادب اور عربی زبان کا ذوق پیدا کر دینا مشکل کام تھا، مگر مولانا نے کالج میں اس مشکل کام کو ایسا انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں نام وری حاصل کی، مولوی حمید الدین صاحب، مولوی بہادر علی صاحب، مولوی داد د بھائی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں

مولانا نے آگے چل کر کالج کے طلبہ کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا اور اس درس کو ایسا دل چسپ بنا دیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا، محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ ”میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانہ کی یادگار ہے“ سید سجاد حیدر صاحب کہتے ہیں کہ مولانا قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصولِ بلاغت اور صنایعِ بدائع کو بتاتے تھے اور ان صنایع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے۔

طلبہ میں ذاتِ پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حسنِ عقیدت اور واقفیت پیدا کرنے کے لیے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدءالاسلام لکھا اور وہ کالج کے نصابِ تعلیم میں داخل ہوا اور شایاں تک ہے، اسی سلسلہ میں مولانا نے کالج میں میاں کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، شروع شروع میں یہ جلسہ خود اپنے ہنگام پر کرتے تھے اور تھوڑے سے آدمی مدعو ہوتے تھے، نشست کرسی اور میز پر ہوتی اور مولانا خود سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کسی پہلو پر تقریر فرماتے تھے، رفتہ رفتہ ان جلسوں سے دل چسپی بڑھنے لگی تو ۳۰ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو سیرت و میاں کا پہلا عام جلسہ نہایت شان و شوکت سے سالار منزل میں ہوا اور کچھ عرصہ بعد اسٹریٹیجی ہال میں ہونے لگا۔

انگریزی کے طالب علموں میں جہاں کی فضا ہی کچھ اور ہوتی ہے، مذہبی رنگ پیدا کرنا کتنا مشکل کام ہے، مگر مولانا نے کالج میں اس کام کو جس طرح انجام دیا اس کا بیان خود انہی کی زبان سے سنئے:

۱۔ کانفرنس گزٹ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء از مضمون خاں صاحب میر ولایت حسین صاحب۔

”اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعاً آپ سنے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرسہ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں، مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے، لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ لجنۃ الصلوٰۃ کہتے ہیں، ایک بی اے سکرٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے، الصلوٰۃ خیر من النوم یا بچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ کھنص اپنی خواہش سے بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آئین زور سے کہتے ہیں، ان کے آئین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے، میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں، مسجد بننے کی تیاری ہے، سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانہ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے، وہ مہتمم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ خود دیں گے، میں نے بھی ۵۰ روپیہ دیے ہیں، سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاو ڈالیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے، لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ ہے۔

مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوشِ مذہبی کا برا بیچنے کرنا میری قسمت میں بھی تھا، اس جوشِ مسرت میں اور بھی لکھتے مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحاق و عثمان یاد آگئے اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا، جس طرح طاؤس کا اپنے پاپنے دیکھنے سے۔ ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرہ فخر صرف لاد مذہبی کو سمجھا ہے، حالانکہ لیاقت بھی کچھ دنیا سے نرالی نہیں، خیر خدا توفیق دے۔“ (مکاتیب محمد عمر-۱)

مولانا نے کالج میں بیٹھ کر تالیف و تصنیف کا جو کام انجام دیا، اس نے کالج کے ماحول کو سرتاپا علمی رنگ میں رنگ دیا، اس زمانہ میں مولانا حالی بھی اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے اور بھی دوسرے اہل علم کی آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس کا مجموعی اثر اور بھی زیادہ تھا، طلبہ میں بھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا اور ان کی زندگیوں میں علمی رنگ نمایاں ہوا، مولوی عزیز مرزا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم اور مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو (یہ شرطے کہ وہ مانیں) اسی آب و ہوا کی پیداوار ہیں، جن طالب علموں میں تحریر و انشا کا ذوق تھا، وہ ذوق بھی مولانا کی تحریک سے ابھر کر نمایاں ہوا، اس سلسلہ میں

سید سجاد حیدر صاحب یلدرم مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی اور شیخ محمد عنایت اللہ صاحب وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں، جن طالب علموں کو شعر و سخن کا چمکا تھا وہ مولانا کی سخن سنجیوں سے متاثر ہوئے، مولوی ظفر علی خاں، مولوی بدایت اللہ صاحب (سی پی) اور چودھری خوشی محمد صاحب ناظر کی سخن وری، اگر تنہا مولانا کی نہیں تو مولانا شبلی اور مولانا حالی دونوں کی دو گوند تاثیروں کی رہین منت ہے، ان صاحبوں میں سے جنھوں نے مولانا کے اس فیض اثر کو تسلیم کیا ہے، ایک قابل ذکر ہستی مولوی مسعود علی صاحب بی اے المتخلص بہ مجوی کی ہے، جو حیدرآباد دکن میں پہلے حج تھے اور اب دارالترجمہ میں ہیں اور فارسی کے خوش مذاق شاعر ہیں، ان کا مجموعہ نظم فارسی نذر عقیدت کے نام سے ۱۳۵۶ھ میں شائع ہو چکا ہے، اس کے مقدمہ میں مولانا مرحوم کے فیض صحبت اور فیض تعلیم کا اعتراف فرمایا ہے، لکھتے ہیں: ”علی گڑھ کالج کے بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قآنی کے چند قصائد داخل تھے، مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولانا مرحوم ان نادرا الوجود استادوں میں تھے، جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دل چسپی پیدا کرنے میں منکہ رکھتے تھے، مولانا مرحوم مغفور کی دل چسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے پاک و صاف ہو گئے اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کام یاب نہ ہو سکا“ (دیباچہ د) مولانا شروانی فرماتے ہیں: ”مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی صحبتوں کے اثر سے تاریخ و ادب فارسی کا ذوق بہیں نشوونما پذیر ہوا ہے اور جو طلبہ شاعر نہ بن سکے، وہ مولانا کے ترنم کی نقل اتار کر ایسی نظم خوانی کرنے لگے کہ جس مجلس میں پڑھتے، اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہتے، مولانا شرر لکھتے ہیں: ”ان چیزوں نے انہیں فارسی اور اردو کا ایک مقبول عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے پسند کیا اور طلبہ نے اسے اختیار کر کے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبول عام دھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا“ مولانا کی یہ شاعری کی قوت بھی کالج کی نام وری میں بہت کام آئی ہے، جتنے اکابر اور امرایہاں اس زمانہ میں آئے، ان کو درد ملت سے آشنا اور کالج کی ہم دردی اور اعانت کی طرف ملتفت کرنے میں مولانا کی شاعری نہیں،

ساحری بڑا کام دیتی تھی، چنانچہ وہ اس کو کبھی غرناطہ، کبھی بغداد اور کبھی صفہاں بتاتے تھے اور مسلمانوں کی علمی ترقیوں کی امید گاہ ٹھہراتے تھے:

برسد بر در او ہر کہ بود طالب فن	آنکہ گو ہر طلبد جانب عمان گذرد
گر بدیں گونہ بود گرمی ہنگامہ او	خود ز غرناطہ و بغداد و صفہاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب و گرمی گردد	اند کے باش کہ ایں قطرہ گہری گردو
تا خود از دانش و فن نام و نشان خواهد بود	بوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواهد بود
تا ابد طالب فن روے بد و خواهد کرد	تا ابد قبلہ دانش طلباں خواهد بود

ذاتی طور پر مولانا نے ہمیشہ امر کی مدح سرائی کو عارض سمجھا، لیکن قومی ضرورت کی بنا پر وہ اس تنگ کو گوارا کر کے فرمائشوں کی تعمیل کرتے تھے، مگر یہ بات اُن کو دل سے پسند نہ تھی، اس لیے یہ فرمائشی نظمیں ان کے فارسی کلیات میں جگہ نہ پاسکیں۔

ابھی مولانا کالج میں گئے ہی تھے کہ چند روز کے بعد فروری ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور مدیر مدارالمہام سر سالار جنگ اول نے انتقال کیا، سالار جنگ محسنین کالج کے قافلہ سالار تھے، اس لیے ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور کالج ان کے ماتم میں ایک روز بند ہو گیا۔ (مکاتیب فارسی-۲۵) اور اظہار غم کے لیے ایک خاص جلسہ ہوا، مولانا نے اس سانحہ پر فارسی میں مرثیہ لکھا تھا جس کو اس موقع پر پڑھ کر سنایا:

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوہ گر	ایں آہ چہ ماتم است کہ خوں شد دل و جگر
تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر	ہم شرع را نمائند کنوں معنی دگر
سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر	
شادی زدل رمیدہ و دل زان رمیدہ تر	

۱۔ اس بند کے بعد مرثیہ کے دوسرے اشعار حسب ذیل ہیں:

ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار	کز یمن او نظام ریاست شد استوار
آئین و رسم و داد اذو بود برقرار	بیداد ہیں کہ گردش چرخ ستم شعار
آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است	ہر کس چو شمع ز آتش غم در گرفتہ است
	(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۷ پر)

یہ مرثیہ شاید اس لیے بھی کلیات میں جگہ نہ پاسکا کہ مولانا کے مخصوص انداز سے اس کا رنگ ہلکا اور مزہ پھیکا ہے، لیکن بہر حال اس کو مولانا سے نسبت ہے اور اس کا علی گڑھ سے دکن تک پورا اثر ہوا تھا، اس لیے یادگار کے طور پر حاشیہ میں یہ پورا مرثیہ نقل کر دیا جاتا ہے، یہ بہت ابتدائی کلام ہے، اس لیے صرف زبان اور شاعری کی حیثیت سے اس کو پڑھا جائے۔

مارچ ۱۸۸۶ء میں مدبر الملک وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کالج میں آئے تو مولانا نے کھانے کے بعد سید محمود کی فرمائش سے فارسی کے چند بند پڑھے جن میں پہلا بند یہ تھا:

اے دلِ ایں مایہ انتظار کہ بود آخر ایں سستی از خمار کہ بود
چشمِ شوقت بہ رہ گذار کہ بود ہوں سرمہ غبار کہ بود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶)

آں کو فلک بہ درگہ اور سرنہادہ است
چرخش کنوں بجاک برابر نہادہ است
تا ایں خبر بکوپچہ و برزن فتادہ است
ایں سرورے کہ مثل نبوش کسے بدہر
ہم دانشش نصیب و ہم از داویش بہر
درنگ نائے تیرہ مفاک آرمیدہ است
امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود
زیب و طراز مسند افسر جز او کہ بود
انکوں اگر کنارہ ازیں خاک داں گرفت
آں کس کہ بود دولت و دیں در پناہ او
انکوں کہ گشت خلد بریں جلوہ گاہ او
مرگ کسے کہ ثانی و ہمتا نہ داشتست
آں دادر جہاں کہ بہ دانش یگانہ بود
فرزانہ مہترے کہ مثل در زمانہ بود
خار است اینکہ بر ہمہ را در جگر نشست
در رفتش اگر چہ جہانے بجاں بود
باشد ہماں چہ سود بود چہ زیاں بود
کورا بود بہ رحمت پروردگار جائے

افسر بہ فرق خود زمرہ و خور نہادہ است
طرح بجائے تازہ سنگر نہادہ است
کار جہاں بنالہ و شیون فتادہ است
آئینہ دار طلعت او بودہ ماہ و مہر
شاہے چنیں نگر کہ بہ یک جنبش سپہر
خورشید زیر پردہ خاک آرمیدہ است
پشت و پناہ شرع پیہر جز او کہ بود
با آساں بجاہ برادر جز او کہ بود
آوازہ اش محیط زمیں و زماں گرفت
آں کس کہ آساں نہ رسیدے بجاہ او
رحم است بر ریاست و روز سیاہ او
دردے کہ بود بیچ مداوا نہ داشتست
پاکیزہ مشربے کہ بہ عالم فسانہ بود
تا بنگریم تیر اجل زا نشانہ بود
بارغم است اینکہ فلک را کمر نکست
اما ہر انچہ خواست آساں بود
انکوں دعائے شبلی دل خستہ آں بود
خود زیر سایہ حرم کردگار جائے

ایں بہ میں خانہ جلوہ گاہ کہ بہست
پردہ دیدہ، فرشِ راہ کہ بہست

مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”اس بند کے پڑھتے وقت عجیب سماں بندھ گیا تھا، حضار مجلس حقیقت میں بے تاب ہو گئے، سید محمود اٹھا اٹھ کر ہر بند کو کئی گنی بار پڑھواتے تھے، وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ ”افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے، ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا“۔ (سمجھ-۲۰) ۱۸۹۵ء میں نواب اقبال الدولہ وقار الامراء المہام حید آباد دکن کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے موقع پر سرسید کی تحریک پر ایک قصیدہ لکھا اور پڑھا، جس میں مسلمانوں کے ادبار، علی گڑھ تحریک اور کالج کی خصوصیات اور امیدوں کا دل چسپ اور موثر بیان تھا، یہ قصیدہ بھی کلیات میں شامل نہیں، مگر مطالعہ کے قابل ہے، کالج کی تعریف میں اور پر جو شعر نقل کیے گئے وہ اسی قصیدہ کے ہیں، یہ پورا قصیدہ آپ کو حاشیہ میں ملے گا۔

۱۔ قصیدہ خیر مقدم نواب وقار الامراء بہار

در جہاں چوں سخن از شوکت و از شاں گذرد
صدر جم مرتبہ نواب وقار الامراء
اسے خوشا بخت کہ آں داور جمشید حشم
ایں دبستان بہ مثل تازہ گلستانے بہست
گذر افتادہ ہما کو کہہ جاہش را
ابر دیدی کہ گہر ریز رود بر سر خاک
بہ مثل واقعہ مور و سلیمان باشد
داد را مدح تو اندازہ مانیت دلی
یادگار کرم دولت آصف جانی است
میوزیم کو شرف نسبت نامش دارد
خاص و عامی حمد از فیض کنش سیراب اند
صاحب! گوش بہ من دار کہ تا شرح وہم
بود روزے کہ گراں پایگی رسبہ ما
حالیا کار باں بے سر و پائی بہ کشید
بگذرد از غم و آزار پیاپے بر ما
ہر چہ از بے کسی و ذلت و خواری بینی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

اسی طرح جب ۱۳۰۵ھ-۱۸۸۸ء میں نواب آسماں جاہ بہادر وزیر اعظم حیدر آباد دکن علی گڑھ آئے تو مولانا نے سرسید کی فرمائش سے روڈ کی کئی مشہور قصیدہ پر ایک قصیدہ لکھ کر پڑھا، خود مولانا نے شعر العجم جلد اول میں روڈ کی کے بیان میں ایک حاشیہ دے کر لکھا ہے ”جس زمانہ میں میں علی گڑھ میں پروفیسر تھا، آسماں جاہ (وزیر ریاست حیدر آباد دکن) علی گڑھ میں آئے، سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاس نامہ کے بہ جائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے اور وہ تم لکھ دو، میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسماں جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸)

گر نہ ایں کتب و ایں مدرسہ بر پائی گشت	تیم آں بود کہ ایں درو ز در ماں گذرد
ایں مسیحا نہ اگر بہر مداوی خواست	تیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد
بہ رسد بر در او ہر کہ بود طالب فن	آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گذرد
گر بدیں گو نہ بود گرمی ہنگامہ او	خود ز غرناطہ و بغداد و صفایاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب و گرمی گردد	اند کے باش کہ ایں قطرہ گہری گردد
تا خود از دانش و فن نام و نشان خواهد بود	جوئے ایں فیض بدیں گو نہ رواں خواهد بود
تا ابد طالب فن روئے بدو خواهد کرد	تا ابد قبلہ دانش طلباں خواهد بود
گر بدیں گو نہ بود ماندہ فیض دراز	یک جہاں زلہ ربائے سرخواں خواهد بود
دوست انسانہ شادی بزباں خواهد راند	خصم را دیدہ حیرت نگراں خواهد بود
بہت چون در کف قیصر و دارائے دکن	ایمن از فتنہ و آسیب زماں خواهد بود
ملک و ملت ہدف تیر حوادث بودہ است	آستانش حرم امن و اماں خواهد بود
آرزو ہاست در اندیشہ راز فضل خدائے	انچہ اندیشہ نمودیم ہماں خواهد بود
گر بہ آئین سلف بہرہ ربانیم ز علم	رخش اقبال دگر در تہ راں خواهد بود
باز در راہ طلب گرم بخیریم ز جائے	خواب دو شبینہ ما چند گراں خواهد بود
می تو اں غلغلہ اوج و ترقی آنکجنت	تا کیے بر لب ما آہ و نغماں خواهد بود
بود آں ہم کہ بہ ما نیز گمہ یار شود	چرخ تا چند بکام دگراں خواهد بود
ہاں ہستی کہ نژاد عرب و آل لوسے	ایں چینیں خستہ و رسوائے جہاں خواهد بود
آں چمن زار کہ پروردہ ابر کرم است	ہاں معینیش کہ تاراج خزاں خواهد بود
بس بود ایں کہ نہ داریم سر تاج و کلاہ	بخت زیں پیش چہ در فکر زماں خواهد بود
با ہمہ محنتگی آں فطرت آبا باقی است	خاک گشتیم و ہنوز آں سر و سودا باقی است

ہم چناں باشیم گرم گفتگو
قاصد از در ناگہاں آید ہی
افگند شورِ مبارکباد و بس
ایں حدیثش بر زباں آید ہی
آسماں جاہ از سوائے ملک دکن
جانپ ہندوستان آید ہی

مولانا کا ذخیرہ ادب جب تک زندہ ہے کالج کے وہ تاریخی مواقع اب بھی زندہ روزگار ہیں اور رہیں گے۔

علاوہ ازیں مولانا کے پے در پے محققانہ مضامین، تعلیمی کانفرنس کے خطبے اور عالمانہ تصانیف نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کالج کا نام روشن کرنے میں بڑی مدد دی، اس زمانہ میں کالج ہر قسم کی علمی و ادبی تحریکات کا مرکز تھا، یہیں سے نئی کتابیں نکلتی تھیں، نئی تصنیفات شائع ہوتی تھیں اور نئے نئے محققانہ مضامین کی اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان سے نکل کر روم، شام، مصر مولانا جہاں گئے علی گڑھ کالج کی شہرت کے دائرہ کو بڑھاتے چلے گئے، اس زمانہ میں ریاست بھوپال وغیرہ میں کالج کا نام اور اس کے ساتھ حسن ظن اور ریاست کی امداد کا خیال مولانا کی ان ہی تصنیفات کا نتیجہ ہے، اسی طرح حیدرآباد میں نواب عماد الدین سید حسین بلگرامی کو کالج کی طرف جس معجزانہ کارنامہ نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی مولانا کی یہی تصنیفات ہیں، اس کا ذکر سرسید کے ان خطوط میں ہے، جو انہوں نے نواب عماد الملک کو لکھے ہیں۔

مولانا نے اپنی تصانیف کے ذریعہ جو کالج کے زمانہ میں کیں، کالج کی صرف معنوی ترقی میں مدد نہیں کی، بلکہ جہاں تک ہوسکا انہوں نے اس زمانہ کی اپنی تمام تصنیفات کالج کے نذر کر کے اس کی مالی امداد میں بھی حصہ لیا، چنانچہ ان کی یہ فیاضی یاد رکھی جائے گی کہ کالج کے زمانہ قیام تک انہوں نے اپنی تصانیف سے ایک حصہ کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تین تین مہینوں میں ان کا پہلا ایڈیشن ختم ہو جاتا تھا، ایک بار مولانا کے ایک دوست نے ایک کلب قائم کیا اور اس کے لیے ان سے ان کی تصنیفات ہدیہ مانگیں تو ان کو افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑا ”میں اپنی تصنیف نذر نہیں کر سکتا، میری تصنیفات جو اس وقت معرض بیع میں ہیں، المامون والجزیرہ ہیں، یہ دونوں کتابیں سید صاحب نے کالج کے لیے چھاپی ہیں، مجھ کو حق تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا تھا، وہ دے نہیں سکتا، اس وقت تک میں نے اپنی کسی تصنیف کو نہ خود چھاپا، نہ اس سے فائدہ اٹھایا“ اس کی تصدیق خود سرسید کے ایک خط سے ہوتی ہے، جو انہوں نے ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک بلگرامی کے نام لکھا ہے، لکھتے ہیں

”پچاس نسخے المامون کے میں نے خدمت عالی میں روانہ کیے ہیں“ گزشتہ تعلیم مسلمانان کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں، اس لیے وہ نہیں بھیج سکا، آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا غالباً آپ کو خیال ہوگا کہ ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حق تصنیف وغیرہ کالج کے نذر کر دی ہیں، ان کی قیمت یا منافع سے ایک حصہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا اور آئندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، صرف کالج کے فائدہ کے لیے لکھتے ہیں، اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں، ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انہوں نے چند نسخے المامون کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے، میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے، لے لو، ہرگز نہ مانا، مجھ سے خرید لیں اور اپنے دوستوں کو بھیج دیں۔“ (خطوط سرسید ص ۱۳۸)

کالج میں عربی زبان کی ترقی اور طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کا شوق دلانے کے لیے انہوں نے ایک لجنہ الادب کی بنیاد ڈالی، اس لجنہ الادب میں طلبہ بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے، اور عربی کے طالب العلم عربی میں تحریریں پڑھتے تھے، نظمیں سناتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، دوسری انجمن اخوان الصفا کے نام سے قائم تھی، جس میں اردو کے عام مضامین پڑھے جاتے اور تقریریں کی جاتیں تھیں، اس میں بھی مولانا کا حصہ تھا، ان ہی دونوں انجمنوں نے مل کر شمس العلماء کے خطاب پر مولانا کو تہنیت دینے کے لیے ۱۹ جنوری ۱۸۹۳ء کو جلسہ کیا تھا، جس میں تمام اکابر شریک تھے۔

یہاں طلبہ کی سب سے بڑی مجلس کا نام یونین تھا اور جواب بھی ہے، مولانا اس میں بھی حصہ لیتے اور طلبہ میں حسن تقریر کا سلیقہ پیدا کرتے تھے، یہ وہی یونین ہے جس نے سفر روم و مصر و شام سے واپسی پر مولانا کے لیے ۶ دسمبر ۱۸۹۳ء میں بزم دعوت ترتیب دی تھی اور جس میں مولانا نے یہ قصیدہ پڑھا تھا:

قاصد خوش خبر امروز نوا ساز آمد	کز سفر یار سفر کردہ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید	با مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد
کالج امروز باں فزہ و شان است کہ بود	بزم را گر می ہنگامہ همان است کہ بود
یونین آنکہ بما شیوہ گفتار آموخت	ہم بدانساں ہنر آموز بیان است کہ بود

ایک دفعہ ۱۹ نومبر ۱۸۹۳ء میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گزشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا، مولانا نے اپنی ایک مدلل تقریر میں یہ بات ثابت کیا کہ بے شبہ مسلمانوں کا گزشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا، یہ تقریر ایسی موثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا

ساتھ دیا، یہاں تک کہ مسٹر سید محمود نے بھی ان سے موافقت کی۔ (سج-۳۷)

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے، یا شخص؟ جلسہ میں سید صاحب بھی موجود تھے، مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی، یہ امر سید صاحب کے مذاقِ سیاست کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی بلکہ ایک مضمون بھی لکھا، تب جا کر کہیں ان کی طبیعت کی بھڑاس نکلی، سر سید نے اپنا یہ مضمون ایشیائی اسلامی طرز حکومت کے عنوان سے ۲۸ جون ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا۔

۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے کتب خانہ اسکندریہ کا مضمون لکھا ہے اور اس سے چار برس پہلے ۱۸۸۹ء میں الجزیرہ پر جو مضمون لکھا تھا، جس نے تحقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی، تو سر سید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، ان کے جواب اور تصحیح کے لیے ایک مجلس بنائی جائے، چنانچہ ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ میں سر سید نے اس کا اعلان کیا اور مولانا مرحوم کے یہ مضامین اس سلسلہ میں داخل کیے گئے اور مولانا کو اس صیغہ کا سرکاری بنایا گیا، ان کے ان مضامین کے ترجمے انگریزی اور عربی میں بھی شائع کیے گئے، عربی میں خود مولانا نے اپنے قلم سے اپنے رسالہ الجزیرہ کا ترجمہ کیا، اسی سلسلہ کا مولانا کا لکھا ہوا مشہور مقالہ ”حقوق الذمیین“ ہے۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ کالج کی طرف سے جڈن اینگلو اور نیل کالج میگزین کے نام سے ایک ضمنی رسالہ نکلتا تھا، جس میں کالج کے حالات، مجلسوں کی رودادیں، انجمنوں کی تقریریں اور اکابر کالج کے مضمون چھپتے تھے، ۱۸۹۳ء میں یہ مستقل علمی رسالہ بنا، اس نئے انتظام میں مولانا مرحوم نے اس کے اردو حصہ کی ایڈیٹری قبول فرمائی اور اس کا مقصد خود مولانا کے الفاظ میں یہ قرار پایا: ”اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو اور زیادہ وسعت دینی چاہی، تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے، جس میں کالج کی علمی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم و فنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پر زور مضامین لکھے جائیں، اس غرض سے اس کے ۲۳ صفحے اردو کے لیے مخصوص کر دیے گئے اور اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا، میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا“ مولانا کا خیال تھا کہ اسلامی سلطوں کے اہم تمدنی اور انتظامی صیغوں پر اس میں مضامین لکھے جائیں اور جب وہ معتدبہ حد تک پہنچ جائیں تو ان کو مستقل

کتابوں کی صورت میں شائع کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا مضمون انہوں نے جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں اسلامی حکومتیں اور شفا خانے کے عنوان سے شائع کیا اور اس کے دیباچہ میں اس مقصد کی پوری توضیح کی، یہ رسالہ پوری طرح کامیاب ہوا اور اس میں مولانا شبلی کے علاوہ مولانا حالی اور مولانا ذکاء اللہ صاحب وغیرہ کے مضامین ماہ بہ ماہ چھپتے رہے، اس کے جون نمبر میں مولانا وہ خطبہ چھپا جو انہوں نے ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء کو ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس میں ”علمائے فرائض“ پر دیا تھا، ۱۸۹۶ء میں ”حقوق الذمیین“ کا معرکہ الآرا مضمون اسی کے اپریل اور مئی نمبر میں شائع ہوا، اس آخری نمبر میں قدیم اسلامی کتابوں کی اشاعت کی تجویز مولانا نے پیش فرمائی اور ندوۃ العلماء کے تیسرے سالانہ جلسہ کی روداد اپنے قلم سے لکھ کر شائع کی ان کے علاوہ اس رسالہ میں ”املا اور صحت زبان“ اور ”سر سید اور اردو لٹریچر“ وغیرہ مضامین ان کے قلم سے نکلے غالباً اس رسالہ میں مولانا کا یہ آخری مضمون تھا جو جون ۱۸۹۸ء کے پرچہ میں نکلا، اس سے تین ماہ پہلے سر سید وفات پا چکے تھے اور کچھ روز کے بعد مولانا بھی علاحدہ ہو گئے۔ رع آں قدح بشکست وآں ساتی بماند

کانفرنس کی خدمت | مجڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام پہلے سر سید نے ایجوکیشنل کانگریس رکھا تھا، چنانچہ ۱۸۸۹ء تک وہ تعلیمی کانگریس کہلاتی تھی (خطوط سر سید بدنام عماد الملک ۱۳۵) مگر جب انڈین نیشنل کانگریس نے شہرت پائی تو پروڈینس مارہسن کے مشورہ سے کانگریس کے بدلہ یہ کانفرنس بن گئی، بہ ہر حال تعلیمی مجلس مولانا کے علی گڑھ جانے کے چند سال بعد ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی اور اس کا پہلا ابتدائی اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں ہوا جس میں کل ساٹھ ستر آدمی شریک تھے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صدر نشین، اس اجلاس میں مولانا کی شرکت بعض رزولوشنوں کی تحریک و تائید تک رہی، دوسرے اجلاس میں جو ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو لکھنؤ میں ہوا، مولانا نے اپنا مشہور مقالہ ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ لکھ کر پڑھا، جس سے مسلمانوں کی اپنی پچھلی تاریخ کا کارنامہ سن کر آنکھیں کھل گئیں، اس اجلاس کی اخیر تاریخ میں انہوں نے اپنا قصیدہ عید یہ جس کو وہ ۱۸۸۳ء میں لکھ چکے تھے، اپنے خاص انداز میں پڑھ کر سنایا، یہ قصیدہ کلیات میں شامل ہے، اس میں تشبیب کے موقع پر دو گانہ عید کی کیفیت، نمازیوں کا جھوم، اسلامی جوش کا سماں دکھایا ہے، پھر گریز کے موقع پر مسلمانوں کی موجودہ عبرت انگیز حالت کا نقشہ کھینچا ہے، مولانا نے جلسہ میں جب یہ قصیدہ پڑھا تو تمام حاضرین ایک عجیب اثر سے متاثر ہو گئے، اسی لیے پہلی دفعہ یہ قصیدہ ”گزشتہ تعلیم“ کے ضمیمہ

۱۔ ضمیمہ گزشتہ تعلیم، مطبوعہ قومی پریس، لکھنؤ۔

کے طور پر چھپا ہے، اسی اجلاس میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ انگریزی کے جو چھوٹے چھوٹے اسکول جا بجا قائم ہو رہے ہیں، یہ قوم کے لیے مضر ہیں، اس پر مخالف و موافق تقریریں ہوئیں، مولانا نے بھی گویا مخالفت ہی میں تقریر کی اور سرسید کی تجویز بڑی اکثریت سے نامنظور ہو گئی۔

کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ہوا، اس میں غالباً مولانا نے شرکت نہیں کی، چوتھا اجلاس ۱۸۸۹ء میں پھر علی گڑھ میں ہوا، مولانا نے اس میں اپنا وہ ترکیب بند پڑھا جس کا مطلع ہے:

حیرتم می بردایک کہ بدیں زینت و ساز چیست کیس بزم بآئین دگر بست طراز
باہمہ فترہ دفر باہمہ تمکین و شکوہ چار میں مجلس تعلیم نہاوند کا آغاز

کانفرنس کے آسمان پر اس وقت مولانا حالی، مولانا نذیر احمد اور مولانا شبلی، تین آفتاب دماہتاب جمع تھے، تینوں کا تذکرہ اس شان سے اس ترکیب بند کے دوسرے بند میں آیا ہے اور اپنا ذکر کس خاک ساری لیکن کس خوب صورتی سے کیا ہے:

نگہ از مہر سوئے حالی آزادہ فلکن داں نذیر احمد طوطی شکر خا بنگر
آن کیے رابلب، آن نغمہ جاں سوز بہ بیس داں دگر را بکف آں دفتر انشا بنگر
پس ازاں پابہ فرد آئی وہ پائین بسیاط شبلی دل زدہ را زمزمہ پیرا بنگر

پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا، اس کانفرنس کے متعلق اپنے ایک عزیز کو لکھا، ”اب کی کانفرنس میں مجمع میں تو بہت نہ ہوگا، لیکن بڑے بڑے لائق آدمی جمع ہوں گے اور اپنا جو ہر کمال دکھائیں گے“ (صفحہ ۲۸) اس کانفرنس میں مولانا شریک ہوئے اور یہ تجویز پیش کی ”اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو علم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کیے تھے، اُن پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کیے، اس رسالہ میں ہر ایک امر اور مسائل و مباحث کو بالتفصیل بہ حوالہ اسناد ثابت کیا جائے۔“

اس تجویز کو پیش کرتے وقت انہوں نے اس پر ایک مختصر سی عالمانہ تقریر کی، جو کانفرنس کی اس سال کی روداد میں ہے، سرسید نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا ”یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت

۱۔ نواب محسن الملک حیدرآباد سے آکر اس میں شریک ہوئے تھے۔ ”شروانی“۔

بڑی ضرورت ہے تمام علمی مجالس اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں، مگر بحث اس میں ہے کہ اس کے لکھے گا کون؟ ہمارے ہاں ایک مثل ہے ”جو بولے وہی گھی کو جاوے“ پس مولوی شبلی ہی اُس کو لکھیں گے، شبلی ہی لکھیں گے، تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے، مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔ اس تجویز کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ۱۸۸۷ء ہی میں آچکا تھا، چنانچہ گزشتہ تعلیم کے ایک حاشیہ پر انہوں نے لکھا تھا ”اگر زمانہ نے مساعادت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اور اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمان کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے، اور ان کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا، ایک مستقل رسالہ میں لکھوں گا اور شاید اسی اٹھمن (کانفرنس) کے کسی دوسرے جلسہ میں پیش کرنے کا اتفاق ہو۔“ (صفحہ ۱۷) مگر مولانا کو اس کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ اس تجویز کی تعمیل میں کوئی مستقل کتاب لکھی، البتہ بعد کو اندوہ میں یونانی منطق اور یونانی فلسفہ کے مختلف مسلوں پر متعدد مضامین لکھے۔

۱۸۹۲ء میں کانفرنس پہلی دفعہ دہلی میں ہو رہی تھی، مولانا نے ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اس میں شرکت نہیں کریں گے، فرماتے ہیں: ”دسمبر میں شاید آنے کا قصد اس لیے ہے کہ کانفرنس دہلی میں شریک ہو سکوں، لیکن میرا قصد خود شرکت کا نہیں ہے، کانفرنس غالباً اب کی پھینکی ہوگی، مولوی حشمت اللہ و میرزا حیرت کی بڑ بہت سن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے، مولوی نذیر احمد صاحب بھی غالباً چپ رہیں، اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا۔“ (احاق-۴) ۱۸۹۳ء کی کانفرنس میں مولانا نے ایک اردو ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کے شروع کے شعر یہ ہیں:

بجائے آج اگر اس بزم میں یہ زب و سماں ہیں یہ ان کی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہماں نوازی جن کو پہنچی ہے ہزاروں کوں سے آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

مولانا نے خلاف معمول یہ قصیدہ اردو میں لکھا اور ترنم کے بغیر سادہ رنگ میں پڑھا، میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا شبلی چون کہ فارسی میں کہتے ہیں، جس میں ایک خاص قسم کی شان ہے اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں، جس سے سننے والوں پر خاص اثر پڑتا ہے، ورنہ فی نفسہ ان کی شاعری میں کوئی کمال نہیں، مولانا نے یہ سن کر اس دفعہ اپنا قصیدہ بھی اردو میں لکھا اور سنایا بھی سادہ طریقہ سے، مگر محفل پر رنگ وہی چھایا رہا، اس نظم کا مضمون بھی مولانا حالی کی نظموں سے ملتا جلتا ہے۔

سرسید کی وفات کے بعد بھی مولانا کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے، ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے اصرار کیا کہ اسماعیل رام پور کی کانفرنس میں وہ شریک ہوں (اسحاق - ۱۷۱) ۱۹۰۱ء میں خیال تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کر دینا چاہتی ہے، اس لیے اس سال کی کلکتہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ ”بی اے کی ڈگری کے لیے فارسی بہ طور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے، اور یہ کہ نصاب تعلیم جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے، اس میں اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے“ مولانا نے اس تجویز کی تائید میں ایک نہایت پر زور اور مدلل تقریر کی جس میں انہوں نے مخالفین کے اس اعتراض کا کہ فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں، اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم و فنون اور حقیقی شاعری ہے، ایسی خوبی سے جواب دیا کہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے، انہوں نے بتایا کہ علوم و فنون کی وہ تمام شاخیں جو عربی میں ہیں، وہ فارسی میں بھی موجود ہیں، فلسفہ، منطق اور علم و ادب کی مکمل تصانیف اس میں ہیں، اور مسلمانوں کے پچھلے عہد زریں کی تاریخ کی وہی تنہا سرمایہ دار رہی، پھر انہوں نے مسلمان بادشاہوں کی فارسی میں خودنوشت سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا جس کا جواب کسی زبان میں موجود نہیں، اس کے بعد انہوں نے فارسی کی فلسفیانہ شاعری کو بڑی خوبی سے بیان کیا، ساتھ ہی ساتھ مثال کے طور پر فارسی کے بیسیوں اشعار پڑھ کر سنائے، سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا تھا، اسی سلسلہ میں مولانا نے ”ہفت بند کاشی“ کے اشعار جب اپنے خاص انداز میں پڑھے ہیں تو کانفرنس مجلس ماتم بن گئی، اس وقت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر اوڈرن بھی اجلاس میں موجود تھے، انہوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی اس تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ ”مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولانا شبلی کی طرح ہر تاثیر تقریر کر سکوں“۔

۱۹۰۲ء کی کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی اور مولانا اس کے پہلے سکرٹری مقرر ہوئے، ۱۹۰۴ء میں دہلی میں تاج پوشی کے موقع پر جو کانفرنس ہوئی اور جس کے صدر ہز ہائینس آغا خاں تھے، ”اسلام کی بے تعصبی“ پر ایک عالمانہ لکچر دیا، اس لکچر کو مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر نے جلسہ ۱ میں نے یہ واقعہ اس کانفرنس کے ایک شریک منشی محمد صدیق صاحب مختار دستوی بہاری سے سنا جو میرے ہم وطن مندوم تھے، اور سرسید کے معتقدوں اور ان کی تحریک کے پرانے حامیوں میں تھے، مولانا شروائی فرماتے ہیں، ”میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا، لفظ گورنر نے خاص طور پر مولانا شبلی سے درخواست کی تھی کہ وہ کلکتہ آئیں، اور مدرسہ عالیہ کو مفید بنانے کی کوشش کریں، مولانا نے وعدہ کیا مگر اسی زمانہ میں کلکتہ میں طاعون پھیلنا، اس لیے نہ جا سکے۔

میں کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ سے قلم بند کر لیا تھا اور بعد کو چھاپ کر شائع کیا، لیکن چون کہ تقریر، ادھوری تھی اور مطالب بھی ناقص تھے، اس لیے مولانا نے اخباروں میں لکھا کہ یہ ان کی بعینہ تقریر نہیں۔

۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ خاں نواب ڈھا کہ اور محسن الملک کے اصرار سے ڈھا کہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور میرزا شجاعت علی خاں کونسل ایران کی صدارت میں ۲۲ دسمبر کو تاریخ اسلام پر لکچر دیا۔ (ریاض حسن-۱۰)

اس کے علاوہ بھی کانفرنس کے مختلف جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اس کی دل چسپی کو بڑھاتے رہے، غالباً صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے عہدِ نظامت میں کانفرنس سے ان کی دل چسپی بہت کم ہو گئی اور اس کی جگہ ندوہ کے اجلاس نے لے لی۔

منی تال کا سفر مئی ۱۸۸۷ء | مئی ۱۸۸۷ء کی گرمیوں میں سرسید نئی تال گئے تھے، یہ رمضان کا مہینہ تھا، مولانا بھی ان کے ساتھ منی تال گئے اور سرسید صاحب کے ساتھ ایک کوشی میں ٹھہرے، چون کہ کسی پہاڑی مقام کا یہ پہلا سفر تھا، اس لیے ایک خط میں پہاڑی منظر کی دل چسپ کیفیتیں لکھ کر بھیجیں، موقع کے لحاظ سے مولانا کا یہ خط اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے، تمام راستہ قدرت الہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے، باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق، ہول ناک غاروں کا سلسلہ ہے، اگر اس پہاڑ میں سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دواز السلطنت ہوتے۔“

ان قدر ترقی مناظر کی دل چسپیاں ایک طرف مگر ایک غیر معمولی ذہانت کے مالک کی نظر ان ظاہر داریوں سے ہٹ کر ان کی معنویت کی طرف منتقل ہونے سے باز نہیں رہ سکتی، ان پہاڑوں کا کائنات ان میں راستے بنانا، کج و بیچ بلکہ پُر بیچ راستوں سے اوپر چڑھنا اور ان پر بڑے بڑے مکانات بنانا، پانی اور روشنی کا انتظام کرنا، ان باتوں کا ذہن انگریزوں کی بے روک ہمت اور پر جوش محنت کا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایک ترقی یافتہ قوم کا اصلی جوہر ہے، اس کے علاوہ انہوں نے دوسرا نتیجہ جو نکالا وہ ان ہی کے لفظوں میں یہ ہے ”یہاں جو کچھ آرام ہے وہ یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عمل داری نہیں ہونے پاتی، یہی بات ہے جس کے لیے انگریزوں نے لاکھوں کروڑوں روپے صرف کر دیے ہیں، درحقیقت ہم کو

انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہیے، کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے، اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں، رمضان تو خوب گزرے گا، مجھ کو اگر دلچسپی ہے تو اسی سے“ ایک دوسرے عزیز کو لکھتے ہیں ”مجھ کو نبی تال میں کچھ دل چسپی نہیں، بس اتنا ہے کہ روزے یہاں گرمی نہیں دکھاتے۔“ (سج-۲۲)

ان پہاڑوں پر جو لوگ گئے ہیں ان کو تجربہ ہے کہ یہ پہاڑی مقامات و حقیقت انگریزوں نے اپنی بے تکلف زندگی کے لیے بنائے تھے کہ وہ کھلے بندوہاں عیش و لطف اٹھا سکیں، اس لیے ہر چیز وہاں انہوں نے اپنے مذاق کی بنائی ہے، انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے بھی وہاں جانا شروع کیا اور وہ انگریزوں کے لیے وہاں یارِ شاطر نہیں، بارِ خاطر بن گئے ہیں، اور جو ہندوستانی ان کے یارِ شاطر بنے وہ اپنے سے کھو گئے، اس حیثیت سے اس مقام کا جو اثر مولانا کی طبیعت پر پڑا وہ یہ تھا ”مجھ ایسے ایشیائی خیال کے آدمی سے یہ امید رکھنا عجب ہے کہ میں اس کو فرحتِ زاہمی مان لوں گا، ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں، اُن کا مذہب کیا پوچھنا ع ہر چہ پیدا دردمِ غیر نیست (مکاتیب بنام شیخ حبیب اللہ)

اس سفر کا ایک تاریخی پہلو یہ ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف ”مسلمان کی گزشتہ تعلیم“ کا پہلا خاکہ مولانا کے ذہن میں یہیں آیا، یہ مئی کا مہینہ تھا اور دسمبر میں اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا، یہیں سے ۸ مئی ۱۸۸۷ء کو مولانا نے اپنے ایک عزیز کو اس مضمون کی اطلاع دی۔ (سج-۲۲)

قصیدہ بہار یہ جو ۱۸۸۸ء میں مکمل ہوا، بلکہ ناقص ہی رہا، اس کا خیال بھی پہلے اسی بہارستان میں آیا تھا، اور اسی کے لیے کلیاتِ غالب کا نسخہ یہاں منگوا یا تھا، تاکہ تو اردنہ ہو۔

تصنیف کا آغاز

۱۸۸۳ء میں مولانا نے علی گڑھ میں قدم رکھا تھا، اس وقت سے لے کر اب تک وہاں ان کے جو کمالات ظاہر ہوئے تھے، وہ شاعری تک محدود تھے، مگر وہ اندر ہی اندر اسلام کی خدمت کا صحیح راستہ جو اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موزوں ہو تلاش کر رہے تھے، بالآخر ان کو نظر آیا کہ یورپ کی چیرہ دستی کا جو عرب مسلمانوں پر چھا گیا ہے اور جس کے مقابلہ میں ان کو نہ صرف اپنا حال بلکہ ماضی تک تاریک نظر آتا ہے، اُس کو دور کیا جائے، اس وقت یورپ کے اہل قلم اور مصنفین کا یہ کارنامہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ پر جو ناز تھا، اس کو مٹانے کے لیے اسلامِ سلاطین اسلام اور علومِ اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ لکھ کر لوگوں میں پھیلا رہے تھے، تاکہ مسلمانوں کی نئی پودہ کو خود اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ ان کے دماغی قومی ہمیشہ کے لیے مضطرب ہو جائیں، چنانچہ ان کی تدبیر کارگر ہو چلی تھی اور مسلمانوں کو خود اپنی تاریخ سے گھن آنے لگی تھی اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھ کر ان کو چکا چوندہ لگ رہی تھی، مولانا نے ان کی اس تدبیر کو سمجھا اور اسی کے مقابلہ کے لیے اپنے قلم کو جنبش دی۔

اس سلسلہ میں مولانا نے اپنی پہلی تصنیف جس کا نام ”مسلمان کی گزشتہ تعلیم“ ہے، ۱۸۸۷ء میں لکھی، اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ اس سال لکھنؤ کے ممتاز وکیل منشی امتیاز علی صاحب (والد منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری) کی دعوت پر ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑے زور شور سے لکھنؤ میں ہونے والا تھا، اس لیے سرسید نے اپنے دائرہ کے مختلف اہل علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمائش کی (سرسید بہ نام عماد الملک ص ۱۳۶) مولانا نے ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ کا عنوان اپنے لیے پسند کیا، سرسید نے اس عنوان کا عام اعلان کیا، ۸ مئی ۱۸۸۷ء کے ایک خط میں مولانا نے منشی تال سے لکھے ہیں ”مؤذن تعلیمی مجلس اس سال لکھنؤ میں ہوگی، اشتہار میں شائع کیا گیا ہے کہ شبلی مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا، شاید یہ مضمون جی لگا کر لکھوں اور گراں مایہ لکھوں“ (سبع ۲۲) یہ گراں مایہ مضمون لکھا گیا اور ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں جو مقام اجلاس تھا، پڑھ کر سنایا گیا، مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی، سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی، یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا، اس خطبہ میں مولانا نے تفصیل سے مسلمانوں کے طریقہ

تعلیم اور اسلامی مدرسوں کے نام اور خصوصیات و حالات بیان کیے تھے، یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی، اس لیے خطبہ ہی خطبہ نہ رہا، بلکہ الگ رسالہ کی صورت میں چھپا، اسی لیے مولانا نے اس کو اپنی سب سے پہلی تالیف قرار دیا ہے، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں ”اب سید صاحب کی توجہ دلا نے سے وہ (یعنی مولانا) تاریخی تحقیق و تنقید میں مصروف تھے، جس کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پران کا لکچر تھا، جسے انہوں نے محمد بن ابوجیشٹل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا، لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا، چنانچہ جب اس پر دلگداز میں ریو یو ہوا ہے، تو کوئی نہ تھا کہ اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو، ۱۸۸۶ء میں نئی طرز کی پہلی سوانح عمری حیات سعدی مولانا حالی نے لکھی اور مولانا شبلی نے پسند کی، ایک خط میں ۱۰ مارچ ۱۸۸۶ء کو لکھتے ہیں ”ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفہ بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دل چسپ محققانہ سوانح عمری ہے“۔ (سج-۱۵)

دوسری تصنیف المامون | اس کے بعد اردو کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری المامون ہے، جو ۱۸۸۷ء میں نکلی، یہ مولانا کی پہلی مستقل تصنیف ہے جو ان کے نام و فرماں روایان اسلام کی پہلی کڑی ہے، اس کو تاریخ بنی العباس کا نچوڑ کہنا چاہیے، یہ تصنیف ایسی مقبول ہوئی کہ مولانا فرماتے تھے کہ تین مہینے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور دوبارہ چھپا۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں: (گزشتہ تعلیم کے بعد) اسی نوعیت کی ان کی دوسری کتاب المامون تھی جو علی العموم پسند کی گئی اور اس کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آئندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں ”المامون کی تصنیف کی تحریک میں مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کو بھی دخل ہے جس کو پڑھ کر مولانا کے دل میں المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کے لیے تریاق کا خیال آیا۔

مولانا شروانی سے تعلقات | المامون اہل علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری، اس پر اخباروں میں بہت سے ریویو نکلے، ان میں سے قابل ذکر ریویو ”اس زمانہ کے ایک خوش مذاق نوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا تھا، جس کو ملک اب نواب صدربار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام سے جانتا ہے، مولانا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اس کے ایڈیٹر کے پے درپے اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتہ میں جکڑ دیا جو ایک کے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا، مولانا شروانی لکھتے ہیں ”علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۸۸۷ء میں

ہوئی، آغازِ تعارف اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا، بعض اہم مسائل پر اعتراض تھا، غالباً یہی ایک ریویو تھا، جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا:

رسی آنگہ بدر دمن چومن خامہ گیری و حرف بزگاری

رام پور کے سرکاری کتب خانہ مدرسہ عالیہ میں ۱۸۸۸ء | رام پور سے مولانا کو پرانا تعلق تھا، ان کی طالب علمی کا زمانہ یہاں بھی گزرا تھا، ان کے استاد مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی اب تک زندہ تھے، اور ان سے نیاز مندی کی وابستگی بھی تھی، اب ان کے تعلق کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہوئی، اس زمانہ میں نواب کلب علی خاں والی رام پور کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی جگہ نواب مشتاق علی خاں مسند نشیں تھے اور ریاست کا سارا نظم و نسق جنرل عظیم الدین خاں مرحوم مدار المہام کے ہاتھ میں تھا، یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس زمانہ میں سرسید کی طرح جدید انگریزی طور طریق و تمدن کو اختیار کیا تھا، بڑی شان و شوکت اور دبدبہ و عظمت کے آدمی تھے، نجیب آباد کے خاندان کے تھے، سیر و شکار اور فنون جنگ میں بڑا نام پیدا کیا تھا، سرکار انگریزی میں ان کو بڑا اقتدار حاصل تھا، اور جنرل کے عہد سے ممتاز تھے، ساری ریاست میں ان کے قومی پنچہ اور مضبوط دست و بازو کی دھوم تھی، اور لوگ ان کے نام سے کانپتے تھے، موصوف نے اپنے زمانہ میں جو بڑے بڑے کام کیے، ان میں سے ایک مدرسہ عالیہ رام پور کی تنظیم ہے، ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب جو مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے، اس کے مدرس اول مقرر ہوئے۔

مولانا شبلی کے رسالہ ”گزشتہ تعلیم“ نے عربی مدرسوں میں اصلاح کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اس بنا پر کہ تصنیف رام مصنف نیکو کند بیان خود مولانا سے اصلاح پسند حکام نے مشورہ چاہا، چنانچہ جنرل مدوح نے اس مدرسہ میں سالانہ امتحان لینے اور مدرسہ کے متعلق رائے دینے کے لیے جن علما کو تکلیف دی تھی،

۱۔ مولانا حفیظ اللہ صاحب ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے، خدر ۱۸۵۵ء میں چھ ماہ کے تھے، اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندی قریب محمد آباد جائے سکونت ہے، فارسی تعلیم گھر حاصل کی تھی، اور اس کی تکمیل چشمہ رحمت غازی پور میں کی، عربی تعلیم بنارس جا کر شروع کی، جہاں مولوی سلامت اللہ صاحب جیراج پوری عربی کی اعلیٰ کتابیں اس وقت پڑھ رہے تھے، ایک سال کے بعد پھر وہاں سے غازی پور پہنچے، اور مولانا غلام جیلانی صاحب نامی ایک فاضل وقت سے جو مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی (والد ماجد مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی) کے شاگرد تھے، متوسلے تک تعلیم پائی، اس کے بعد غالباً ۱۸۷۷ء میں وہ لکھنؤ جا کر فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور وہیں علوم کی تکمیل کی، مقولات اور ریاضیات میں خاص طور سے کمال پیدا کیا، فراغت کے بعد استاد کے حسب الحکم کا کوری ضلع لکھنؤ کے مدرسہ میں مدرس قبول کی، وہاں سے مولانا عبدالحی صاحب کی سفارش پر وہ مدرسہ عالیہ رام پور میں صدر مدرس ہوئے، (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۲ پر)

ان میں ایک مولانا شبلی مرحوم تھے۔ مولانا کی دلچسپی کی بڑی چیز دہان کا کتب خانہ بھی تھا، المامون کی اشاعت نے اس راز کو بھی فاش کیا کہ مولانا کو نوادر کتب سے نہ صرف واقفیت بلکہ عشق ہے، اس لیے نوادر قلمی کتابوں کی قدر و قیمت اور ترتیب کے لیے وہی سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ جنرل صاحب موصوف نے ۱۸۸۸ء میں مولانا مرحوم سے اس کتب خانہ کی ترتیب و اصلاح و ترقی پر ایک مفصل رپورٹ لکھنے کی خواہش کی، چنانچہ مولانا نے تین روزہ کر اور کتب خانہ کو ہر طرح دیکھ کر ایک رپورٹ ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو لکھ کر پیش کی، اس میں المامون کی ترتیب، فہرست لکھنے کا طریقہ، کتابوں پر نمبر ڈالنے کی کیفیت، نوادر کے انتخاب اور حفاظت کے طریق اور دوسری ضروری ہدایتیں درج فرمائیں اور شی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم نے فہرست کا جو نمونہ بنایا تھا، اس کو کسی قدر اصلاح کے بعد پسند فرمایا اور اسی طریق پر پورے کتب خانہ کی کتابوں کی از سر نو ترتیب کا مشورہ دیا، کتاب خانہ کی ترتیب میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کتابیں حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی تھیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کلیات رند اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف دونوں ایک صف میں تھیں، مختلف علمی رسائل کے مجموعے بے جوڑ رسالوں کے ساتھ مجلد تھے، نوادر کا انتخاب صرف خوش خطی اور حسن ظاہری کی بنا پر کیا گیا تھا اور اچھی اچھی کتابیں چھانٹ دی گئی تھیں، مولانا نے فن اور مطالب کے لحاظ اور دوسری معنوی خصوصیات کی بنا پر نوادر کے دوبارہ انتخاب کی رائے دی، کچھ دنوں بعد نواب مشتاق علی خاں کا انتقال ہوا اور نسل قائم ہوئی اور جنرل صاحب موصوف کو نسل کے صدر ہوئے، (اس وقت نواب حامد علی خان نابالغ تھے) تو مولانا شبلی مرحوم کی تجویز پر (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۱) اور مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی سے ان کے مناظرے رہے، زمانہ قیام رام پور میں شی امیر احمد صاحب امیر مینائی سے خاص تعلقات پیدا ہو گئے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں علم ہیئت کی کتاب تصریح پر نواب حامد علی خاں کے ابتدائی عہد میں حاشیہ لکھا جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، وہ دس برس کے قریب رام پور میں رہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد وہ دارالعلوم میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اور ۱۹۰۸ء تک برابر اس عہدہ پر قائم رہے، اس کے بعد وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مدرس عربی ہوئے، اور شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب ہوئے، ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پشٹن پا کر جاز گئے اور فریضہ حج ادا کیا، واپسی کے بعد لوگوں کے اصرار سے پھر دارالعلوم ندوہ کی صدر مدرس قبول کی، اور کئی سال تک مفوضہ خدمت انجام دے کر ۱۹۳۰ء میں وطن واپس آئے جہاں اب تک بجمہ اللہ حج وصال میں ہیں۔

مولانا عبدالحق صاحب مرحوم کی شاگردی کے باوجود آخر عمر میں وہ عامل بالحدیث ہو گئے ہیں، عدم تقلید کا میلان پہلے سے تھا، جو شاید عوامل عمر میں مولوی سلامت اللہ صاحب کی صحبت کا اثر ہو، غرض دس بارہ برس سے اب وہ عامل بالحدیث ہیں۔

مولانا کی توانائی قابل رشک تھی، اور اب بھی ہے، سیر و شکار و فننگ اندازی کا شوق ہے، جو عجب نہیں کہ جنرل عظیم الدین خاں کا فیض ہو۔

پوری طرح عمل ہوا، فن وادار جسر بنائے گئے اور ۱۸۹۱ء میں کتب خانہ کے لیے ایک نئی عمارت کی بنیاد ڈالی گئی اور ۲۳ مارچ ۱۸۹۳ء کو اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، (دیباچہ اول فہرست کتب خانہ رام پور) مگر افسوس کہ جنرل صاحب موصوف اس سے ایک سال پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

۱۔ جنرل موصوف کی موت بلکہ شہادت کا واقعہ بھی عجیب ہے، ۱۸۹۱ء کی بات ہے وہ رات کو ایک تقریب سے تہانم نم پرواپس آرہے تھے کہ چند آدمیوں نے ان پر ٹپچے سے ایک ساتھ فائر کیا، گولی ٹھیک نشانہ پر پڑی، اور اس پر بھی ان میں اتنا دم تھا کہ وہ چند قدم چل کر ایک دوست کے دروازے تک پہنچے، اور وہیں گر کر ٹھنڈے ہو گئے، اس واقعہ کا اثر سارے ملک پر پڑا، ایک عالم اور شاعر کا دل ایسے علم دوست مصلح کے ساتھ سے کیسے متاثر ہوتا، چنانچہ مولانا نے ان کا مرثیہ لکھا جو ۲۷ مارچ ۱۸۹۱ء کے انشٹیوٹ گزٹ میں مولانا کے اس خط کے ساتھ چھپا ہے:

”جناب اڈیٹر صاحب اگرچہ ہم خاک نشینوں کو کئی ارکان سے بہت کم واسطہ رہتا ہے تاہم جو واقعہ عالم آشوب اور جاں گداز ہوتا ہے وہ کسی کو بے اثر نہیں چھوڑتا، اور اس قحط الرجال میں جنرل عظیم الدین خاں سے جو بہادرانہ اور ملکی قابلیتیں ظہور میں آئیں، ان کے لحاظ سے ان کی عبرت انگیز موت عجیب افسوس ناک حادثہ ہے، مجھ کو اس مرحوم سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا، لیکن ان کے مردانہ اوصاف اکثر سنے اور دیکھے تھے، اس خبر کے سننے سے نہایت قلق ہوا اور یقین ہو گیا کہ خدا ہی کو منظور ہے کہ ہماری قوم میں لائق لوگ نہ رہنے پائیں، اس رنج و قلق میں کچھ اشعار مرثیہ کے موزوں ہوئے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں مرسل ہیں، امید ہے کہ اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دی جائے“:

مرثیہ کلیات میں شامل ہے، موقع کے لحاظ سے چند شعر یہ ہیں:

تا کے زغم نہاں نہ گویم	گویند گو چساں نہ گویم
در ماتم خاں اعظم الدین	جز قصہ خوں چکاں نہ گویم
در خاک شد آں امیر ذی جاہ	یا تہمتن او فقادہ در چاہ
مہماں یکے بہ شب شد وفات	تا باز رود بسوئے بنگاہ
کم حوصلگان سفلہ چند	بودند نشستہ در کہیں گاہ
کالکہ چو در مقابلہ آمد	آں کج روشاں دوں بہ ناگاہ
یک بار برو کشاد دادند	شش تیر دیکے خطا نہ شد آہ
برجہہ صبر چہیں نیکنند	با آں ہمہ زخمہائے جانکاہ
بر خاک فقادہ ہاتر بر خاست	پس طے بے نمود پارہ راہ
آسود دے براہ وزاں پس	افسانہ عمر گشت کوتاہ
اے کشیہ ظلم ہاں خبر گیر	ایں نالہ ما گہوش در گیر
بر خیز و ہماں بہ رسم پیشیں	ہم تیغ بدست و ہم سپر گیر
ترکانہ کلہ بفرق بھگن	چار آئینہ و زرہ بہر گیر
آں رونق رام پور باز آں	آں آئینہ را دگر بہ زر گیر

کتاب خانہ رام پور کے موجودہ ناظم مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا بیان ہے کہ مولانا کی اصلاحی تجویزوں پر عمل کیا گیا، کتابیں زبان اور فن پر منقسم ہوئیں، متعدد مجموعے بھی از سر نو مرتب کیے گئے۔ مولانا نے اس کے بعد بھی کئی دفعہ اس کتب خانہ کو دیکھا اور اس سے فائدہ اٹھایا، سب سے آخری بار ۶ اپریل ۱۹۱۴ء کو اس کو ملاحظہ فرمایا اور اپنے ہاتھ سے اس پر چند سطریں لکھیں، جن میں اس کتب خانہ کی اہمیت کا اعتراف فرمایا۔

مولانا نے کتب خانہ کی ترتیب اور فہرست کی تحریر پر جو رپورٹ لکھی ہے وہ آج معمولی بات معلوم ہوگی، مگر آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ سامنے لائیے، جب مشرقی کتب خانے نئی ترتیب سے آشنا نہ تھے اور علما کے سامنے اس کام کا کوئی نمونہ نہ تھا، اس کتب خانہ کی اس علمی ترتیب سے جو فیض علما اور اہل علم کو پہنچا اور پہنچ رہا ہے، وہ ان ہی جنرل مرحوم کی کوشش اور مولانا کے حسن تجویز کا فیض ہے۔

لطیفہ: آج کل مجھے (۱۹۴۰ء میں) رام پور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے بزرگوں کی زبان سے ایک دلچسپ حکایت سننے میں آئی، جس سے اُس زمانہ کا ماحول اور علما کے حسن اخلاق اور سادگی مزاج کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، مولانا کسی تقریب سے رام پور میں وارد تھے، جنرل صاحب مرحوم نے اس حسن اتفاق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ ایک عام جلسہ کیا اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، جس میں بعض علما بھی تشریف لائے، جلسہ میں جب مولانا تشریف لائے تو جنرل صاحب نے ان کی آمد پر چیر زدیے، اور ساتھ ہی سب نے تالیاں بجائیں، علمائے حاضرین میں سے ایک بزرگ نے اپنی پرانی تہذیب کے مطابق یہ سمجھا کہ لوگ اس طرح تالی پیٹ کر مولوی شبلی کی توہین کر رہے ہیں، انہوں نے چپکے سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ”مولوی شبلی کیسے ہی بددین سہی، مگر وہ ہمارے مہمان تھے، جنرل صاحب کو ان کی یہ توہین کرنی نہیں چاہیے تھی“ اب جب جنرل صاحب مقرر کے تعارف کو کھڑے ہوئے تو خدان بزرگ نے تالیاں بجائیں اور اپنے ساتھ والوں سے بھی کہا کہ خوب تالیاں پیٹو، انہوں نے مہمان کی توہین کی ہے، ان کی بھی توہین کرو اور اس طرح مہمان کی توہین کا انتقام لے کر وہ ناراض ہو کر جلسہ سے اٹھے، اور اپنی پاکی پر بیٹھ کر واپس جانے لگے، جنرل صاحب کو ان کی ناراضی کا علم ہوا تو جا کر معذرت کی اور بتایا کہ ”یہ مہمان کی توہین نہیں، بلکہ اس کو شاباشی دی گئی ہے، قاعدہ ہے کہ جب کسی سے تعریف کے قابل کوئی بات ہوتی ہے، تو اس کی بیٹھ ٹھوکتے ہیں،

۱۔ مولوی امتیاز علی صاحب عرشی نے مولانا کی روداد اور معائنہ کی دونوں تحریریں معارف اکتوبر ۱۹۳۴ء میں چھپوا دی ہیں۔

اب اگر ہر شخص اس کی پیٹھ ٹھونکنے تو اس کی پیٹھ ہی زخمی ہو جائے، اس لیے اب یہ کرتے ہیں کہ اپنے ایک ہاتھ کو اس کی پیٹھ فرض کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے اس کو ٹھونکتے ہیں، یہ تالی نہیں ہے، اس تاویل سے ان نیک نہاد بزرگ کی تسکین ہوگئی اور جلسہ میں واپس تشریف لے آئے۔

تیسری تصنیف سیرۃ العثمان | مولانا نے اس کے بعد جیسا کہ انہوں نے سیرۃ العثمان کے دیباچہ میں لکھا ہے، ”الفاروق“ کی طرح ڈالی، مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس کا کام تھوڑے دنوں کے لیے روک دیا اور سیرۃ العثمان کی طرف توجہ کی، ۱۸۸۹ء میں اس کی بنیاد پڑی اور اخیر سال یعنی دسمبر ۱۸۸۹ء میں اس کا پہلا حصہ ختم کر دیا اور دوسرا حصہ جو بہت محنت سے لکھا گیا تھا، اس کا کام ۱۸۹۰ء میں شروع ہوا اور اسی سال کے اخیر یعنی دسمبر ۱۸۹۰ء میں وہ بھی ختم ہوا، ۱۸۱۹ء کے اخیر میں کتاب پہلی بار چھپی اور ۱۳ جنوری ۱۸۹۲ء کو اس کے نسخے اعظم گڑھ بھیجے گئے۔

۱ (سج-۲۵) ۲ (محمد عمر-۲) ۳ (سج-۲۸) ۴ (سج-۲۹) مصنف نے یہ کتاب جس محنت سے لکھی ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اثنائے مطالعہ میں جو بات سمجھ میں نہیں آئی، اس کے بارے میں اساتذہ وقت سے انہوں نے استفسارات کیے، چنانچہ انہوں نے اپنے استاذ مولانا ارشاد حسین صاحب سے جو استفسار کیا تھا، اس کی نقل مع جواب مولانا ارشاد حسین صاحب کے مجموعہ فتاویٰ ارشاد یہ میں نظر سے گزری، استاد شاگرد دونوں کے خطوں کو تیر کا یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

مولانا شبلی مرحوم کا خط اپنے استاذ مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی کے نام اور ان کا جواب

مخدوم و مطاع مادامت انضمام۔ پس از ادائے مراسم تحیت و تسلیم آنکہ ملازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جدوجہد سے امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں جس کے لیے میں نے بہت سے مواد تاریخی فراہم کیے، اس وقت جو جروزیر تحریر ہے، وہ ان کے فتاویٰ ہیں، عقودالجمان میں ان کے چند فتاویٰ مذکور ہیں، لیکن دو جگہ مجھ کو شک پیدا ہوا، اس لیے ان کو عرض کرتا ہوں کہ تشریح فرمائی جاوے، اصل عبارت لکھ کر شبہ لکھتا ہوں، ”قال یا ابا حنیفة یا ابا الخطاب ما تقول فی رجل غاب عن اہله عواماً ونعی الیہا فظننت امراتہ انہ میت فتزوجت ثم قدم زوجها الاول وقد ولدت ولدا فنفا الاول و ادغاه الثانی، اکل واحد منهما قد فهمام الذی انکر الولد“

مجھے اس میں شبہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں سے کسی نے اس کو زانیہ نہیں کہا، پھر تذف کے کیا معنی، باقی یہ امر کہ ولدیت کے ادعا اور انکار سے ضمناً تذف لازم آتا ہے، اس پر دو سوال ہیں، ۱- کیا ایسی دلالت التزانی سے تذف کا جرم قائم ہو سکتا ہے؟ ۲- وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی تو کیا واقعیت کا اظہار تذف میں داخل ہے؟ ایسا تفصیلی جواب عنایت ہو جو اصل مسئلہ کو حل کر دے اور امام صاحب کے اس سوال کی حقیقت کھول دے۔

دوسرا فتویٰ یہ لکھا کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھے تھے، ایک شخص پر سانپ آکر گرا، اس نے دوسرے پر پھینک دیا، اسی طرح تین چار آدمی تک نوبت پہنچی، آخر میں اس نے ایک شخص کو کاٹ لیا اور وہ مر گیا، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر کرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تو اخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی، اور اگر وقفہ ہوا تو کسی پر نہیں، (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۶)۔

یہ کتاب درحقیقت مولانا کے اسی ذوق و شوق کی دوسری شکل ہے، جو ان کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا، بقول مولانا کے ع شیخ ہمان است، لکن دیگر است، مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں، اعظم گڑھ اور دیہات و اطراف میں اس کتاب کے بہت سے نسخے شایع ہونے چاہئیں، حنفیوں کی مزید اطلاع کا باعث ہوگا، چندا اشتہارات بھی بھیج دیے ہیں، کچھری کے عمال اور سودا گروں کو اس سے واقف ہونا چاہیے، (سج-۲۹) یہ کتاب بھی کالج کی طرف سے چھپی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی، یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں ”سیرۃ العثمان کب کی ہو چکی، دوسری بار چھپ رہی ہے“ (سج-۳۱)۔

گزشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ العثمان نے ملک میں مولانا کو کافی حد تک روشناس کر دیا تھا اور لوگ اس نادر روزگار کو جو اپنی قومی تاریخ کے ان قابل فخر کارناموں کو منظر عام پر لا رہا تھا، ایک نظر دیکھنے کے مشتاق ہو گئے تھے۔

حیدرآباد کا سفر ۱۸۹۱ء | سرسید نے کالج کے چندہ کے لیے حیدرآباد کا پہلا سفر ۱۸۸۲ء میں کیا تھا، جب حیدرآباد میں سرسید کے دست و بازو نواب وقار الملک انتصار جنگ، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک سید حسین بگلرامی معزز عہدوں پر مامور تھے، دوسرا سفر ۱۸۹۱ء میں اُس وقت کیا جب یہ اکابر سرکار نظام کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، اس سفر میں سرسید تہانہ تھے، بلکہ انہوں نے ایک وفد ترتیب دیا، جس میں ان کی تحریک کے بہت سے عمائد اور ارکان شریک تھے ان میں سے ایک مولانا شبلی بھی تھے۔

اس سفر میں مولانا شبلی کی ہمراہی اس حیثیت سے تعجب انگیز ہے کہ وہ کوئی ایسا سرکاری امتیاز یا شان ریاست نہیں رکھتے تھے جس کی بنا پر وہ اس وفد کے رشتہ میں منسلک ہو سکتے، مگر واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد میں اس وقت دو بگلرامی ایسے تھے جو علم کے حقیقی قدردان اور شیدائے تھے، یعنی مولوی سید علی بگلرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بگلرامی، سرسید نے نومبر ۱۸۸۹ء میں نواب عماد الملک کو اپنی تعلیمی (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۵) اس پر یہ شبہ پیدا ہوا کہ جس شخص نے پھینکا، یہ اس کا اضطرابی فعل تھا، اس اضطرابی فعل پر وہ کیوں ماخوذ ہوا، فقہ میں اس کے متعلق کیا امر قرار دیا ہے، جواب جلد ترجمت ہو در میر اخرج ہوگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ از محمد ارشاد حسین عفی عنہ، مولوی صاحب محبی و مخلص مولوی محمد شبلی صاحب فقہم و فہم اللہ سبحانہ الرضائے، پس از سلام مسنون مطالعہ نمائید، رقیہ کریمہ بورو و مسعود باعث مسرت و کاشف مندرجہ شد، حال کم فرصتیا نے فقیران مخلص رام معلوم است، پس بقدر ضرورت جواب و رفع اشتباہ کلمہ چندو شتم و تفصیل آن بروقت ملاقات و حصول فرصت موقوف است..... الخ، یہ پورا جواب فتاویٰ ارشاد یہ مطبوعہ میں مذکور ہے۔

کانفرنس کی رپورٹ بھیجی تو اس کے ساتھ مولانا کا رسالہ ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ بھی بھیجا اور ساتھ ہی خط میں یہ لکھا ”مولوی شبلی صاحب نے تاریخانہ مضمون ”گزشتہ تعلیم مسلمانان“ اختیار کیا، وہ رسالہ مرسل ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہوگی“ (خطوط سرسید بہ نام عماد الملک ص ۲ ص ۱۳۶) اس کے بعد ان کے پاس المامون بھیجی گئی اور وہ بھی قدر و منزلت سے دیکھی گئی، ساتھ ہی الفاروق کی تالیف کا خیال بھی پیش کیا گیا، نواب عماد الملک مرحوم نے ان کی تصنیفات کی قدر کی، المامون کے پچاس ۵۰ نسخے منگوائے اور ان کی مدح و توصیف فرمائی، اس سلسلہ میں سرسید نے ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک کو ایک لمبا خط لکھا جس میں ارقام فرماتے ہیں ”ان کو (مولوی شبلی صاحب کو) آپ کی ملاقات کا نہایت شوق پیدا ہوا ہے، میرے دل میں کچھ خیالات خام سفر ہندوستان کے پیدا ہوئے ہیں، ان خیالاتِ خام کا جن میں غالباً امید کامیابی نہیں ہے، پھر کسی وقت ذکر کروں گا، مگر وہ خیالات پختہ ہو گئے ہیں، اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا بھی ہے، اگر ممکن ہو تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدرآباد لائے گا، تاکہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں، اور جان لیں کہ آپ کون ہیں اور کیسے ہیں“ (ص ۱۲۸) مولوی عبدالحکیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ وہ سرسید کے گردہ کے ایک نام و در بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔“

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے اس سفر کے حالات ایک فارسی قصیدہ میں ذکر کیے ہیں، جو ان کے کلیات فارسی میں چھپا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ سے سرسید کے ساتھ نہیں چلے تھے، بلکہ وہ شاید اپنے وطن میں تھے، وہاں سے لکھنؤ اور کانپور ہو کر اس سفر کے لیے روانہ ہوئے، سرسید کا قافلہ اس سے پہلے چل چکا تھا، اس لیے راہ میں ملاقات نہیں ہوئی، اس سوء اتفاق سے مولانا پریشان خاطر تھے، اتفاق سے ریل میں دو اور معزز مسلمان مسافر ساتھ سوار ہوئے، جو مولانا کے غائبانہ مشتاق تھے، انہوں نے مولانا کا نام سنا تو بڑے تپاک سے ملے اور راستہ بھر خدمت کرتے رہے، مولانا جب بھوپال پہنچے تو معلوم ہوا کہ کل وہ قافلہ یہاں سے آگے کو روانہ ہو گیا، وہ آگے بڑھے اور آخر تین رات دن کے سفر کے بعد حیدرآباد پہنچے۔

حیدرآباد میں سرسید اور ان کے رفقا کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، سرکاری مہمان خانہ میں اتارے گئے، احباب نے دعوتیں کیں، جلسے ہوئے، اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے جنھوں نے

ابھی ابھی اختیار پایا تھا، وفد کو حضوری کا شرف بخشا، اور ایک ہزار ماہوار کی پہلی شاہانہ امداد کو دو چند یعنی دو ہزار ماہانہ کرنے کا حکم فرمایا، نواب اقبال الدولہ وقار الامرا کی صدارت میں بشیر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں سرسید اور ان کے رفقاء نے تقریریں کیں، مولانا حالی نے اپنا اردو اور مولانا شبلی نے اپنا مشہور فارسی قصیدہ پڑھا، جس میں یہ تمام واقعات یعنی بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا، وقار الامرا کا آگے بڑھ کر فرمان پڑھنا اور دو ہزار ماہوار کا حکم ہونا سب مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کی تکمیل حضور میں پیشی کے بعد حیدرآباد میں کی گئی ہے، مولانا فرماتے تھے کہ حیدرآباد میں قیام گاہ کی چھت پر میں چلا گیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ کوئی وہاں نہ آئے اور وہیں ٹہل ٹہل کر شعر کہہ رہا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی یہ کہتے ہوئے سیدھے پہنچ گئے کہ کسی کے روکے نہیں رک سکتا، یہ ان سے پہلی ملاقات تھی، یہ قصیدہ جب جلسہ میں پڑھا گیا تو ایک سماں بندھ گیا تھا، اس قصیدہ کے شروع میں اس دور دراز سفر کی غرض کی تمہید، پھر مسلمانوں کی تہ حالی کی تصویر اور اس کے بعد علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی تشریح ہے، آخر میں دربار میں پہنچنے اور باریاب ہونے کا کیسا اچھا مرقع کھینچا ہے:

پس بفرمودہ دانش ز علی گڑھ آخر	کارواں شد سوسے اقلیم وکن راہ گراے
بہ نیایش بہ در دولت سلطان رھیم	ہم بفرمان او ب پشت نمودیم دوتاے
از پس کرنش و تسلیم بہ آداب نیاز	عرض مطلب نمودیم و ستادیم بہ پائے
شاہ از لطف اشارت بہ نشستن فرمود	امر چوں فوق ادب بود نشستیم بہ جائے
پس از ان معتمد شاہ عماد الدولہ	کہ دبیرے ست ہنر پرورد معنی پیرائے
بہ ادب آمد و توقع ہمایوں بر خواند	ما ہمہ گوش بر آوازش و او نکتہ سرائے
شد بدستور گرانمایہ فرستاد پیام	کا بیک آں مبلغ پیشیدہ دو چندان فرمائے
بسکہ زیں مژدہ جاں بخش بخود بالیدیم	غنجہ ساں در بر ما تنگ ہی گشت قبائے
چوں بما بیش ز اندازہ خواہش بخشید	بیش ز اندازہ خواہش دہش اجر خدائے
شاہ تہما نہ کرم کرد و نوازش فرمود	کہ شدیم از ہمہ اعیان دکن بہرہ رباے
آسماں جاہ فلک پایہ بشیر الدولہ	بازوے دولت و دستور شد و ملک آرائے
واں وقار الامرا زبدہ اعیان دکن	آں ہنر پرورد نادان دل و فرخندہ لقائے

پایہ ما بفرودند و کرم فرمودند
شایگان گشت توانی وازیں چاره نبود
شکرِ این منت و احسان چہ توان کردارائے
خوشتر آن ست کہ انکوں کنم آہنگِ دعائے
تا ابد باشد و گردوں بدرش ناصیہ سائے
خویش را گر بہ دعایا و کنم ہست بہ جائے

یعنی از نسبتِ آں شاہِ گرامی ہاشم
شہ نظام ست و بہ زبید کہ نظامی ہاشم

مقطع میں حضور نظام کے لقب شاہی کی مناسبت سے نظام اور نظامی کی کیسی اچھی مناسبت

پیدا کی ہے۔

مولانا شبلی اپنی نظمیں جس دلکش انداز میں پڑھتے تھے، وہ بیحد مؤثر تھا، یہ قصیدہ پڑھا تو درد دیوار سے تحسین و آفرین کی صدا بلند ہوگی، نواب وقار الامرانے اپنے محلِ فلک نما میں مولانا حالی اور مولانا شبلی کو بلوا کر دوبارہ اُن کے قصیدے سنے اور بیحد متاثر ہوئے اور آخر حضور تک یہ روداد پہنچی، اور مولانا سے سنا ہے کہ خود اعلیٰ حضرت نے مولانا سے اس قصیدہ کو اپنے سامنے پڑھوا کر سننا چاہا، مگر ریاستوں میں ہر چیز سیاست اور سازش بن جاتی ہے، دراندازوں نے یہ زور لگایا کہ یہ تجویزِ عمل میں نہ آسکی۔

حیدرآباد سے واپسی کے وقت نواب سید علی حسن خاں مرحوم خلیفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اصرار سے چند روز یہ قافلہ بھوپال ٹھہرا اور کیوں کر ٹھہرا، اس کی تفصیل اس حیثیت سے خاص دلچسپی رکھتی ہے کہ اُس زمانہ میں بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے سرسید اور علی گڑھ تحریک کی نہایت سخت مخالفت تھی، گو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا اس سے ایک سال پہلے ۱۸۹۱ء میں انتقال ہو چکا تھا، مگر شاہ جہاں بیگم مرحومہ والیہ بھوپال خود نواب صاحب مرحوم کے اثر سے سرسید کی تحریک کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں، ایسی حالت میں سرسید اور اُن کے رفقا کا یہاں ٹھہرانا مشکل کام تھا، میں نے نواب علی حسن خاں مرحوم کے عزیز خاص خواجہ سید رشید الدین صاحب مودودی سے جو ان دنوں وہیں نور محل میں رہتے تھے، یہ پوری روداد اس طرح سنی ہے۔

بھوپال میں قیام | اس زمانہ میں بھوپال نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے علما و فضلا کا مرکز تھا، نواب صاحب مرحوم اور دوسرے علما کے نزدیک سرسید کا نام لینا بھی جرم تھا، اور والیہ بھوپال نواب

شاہ جہاں بیگم مرحومہ بھی اسی خیال کی تھیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے چھوٹے صاحب زادے حسام الملک صفی الدولہ نواب سید علی محمد حسن خاں صاحب کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی، لیکن وہ فطرت کی طرف سے مذاق سلیم لے کر آئے تھے، فارسی کے خود بھی شاعر تھے اور شعر و سخن کے قدر دان بھی تھے، پہلے پہل اسی تعلق سے مولانا شبلی کا نام ان کے کانوں تک پہنچا، اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں مولانا کی گزشتہ تعلیم، ان کی نظر سے گزری اور اس کے بعد المامون ان تک پہنچی، ان کتابوں کو دیکھ کر ان کی حالت ہی عجیب ہوئی، ان کتابوں کے متعدد نسخے چپکے چپکے ڈاک سے منگوائے جاتے اور قدر دانوں میں تقسیم ہوتے، اس کے ذریعہ سے کالج کے ساتھ ان کی دل چسپی اور ہم دردی بڑھتی گئی، اب ۱۸۹۱ء میں جب سرسید کا قافلہ بھوپال سے گزرا اور حیدرآباد سے کامیاب واپس ہوا تو نواب صاحب مددوچ نے منشی محمد امتیاز علی صاحب کے ذریعہ سے جو اس زمانہ میں بھوپال میں وزیر تھے، بیگم صاحبہ کو یہ سوچھایا کہ سرسید اپنے عقیدہ میں کیسے ہی ہوں، مگر چوں کہ بڑے بڑے انگریزی حکام سے ان کی دوستی ہے، اس لیے ریاست میں ان کا مہمان ہونا انگریز حکام کی خوش نودی کا باعث ہوگا، اس رائے کو بیگم صاحبہ نے بھی پسند فرمایا اور واپسی میں سرسید اور ان کے رفقا کو بھوپال میں سرکاری مہمان بنا کر روک لیا گیا اور بیگم صاحبہ ان سے ملنے پر راضی ہوئیں، ملاقات میں سرسید نے قوم کی بیکسی اور تباہی کی ایسی پُر درد تصویر کھینچی کہ وہ بے اختیار ہو گئیں اور کالج کو دس ہزار روپیہ اپنی طرف سے اور دس ہزار اپنے جاگیرداروں کی طرف سے عنایت کیا اور سرسید ہنسی خوشی علی گڑھ روانہ ہوئے۔

مولانا شبلی مرحوم یہاں نواب علی حسن خاں صاحب کے پاس ٹھہر گئے، اس وقت ان کے علم و فضل کے یہ نئے مناظر علما میں اچنبھے کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، شہر کے اکثر علما اور شعرا نے ان سے ملاقاتیں کیں، دن دن بھر یہ صحبت اتنی طول کھینچتی کہ مولانا گھبرا جاتے تھے، مولانا کی اور نواب صاحب کی یہی پہلی ملاقات ہے جو بڑھتے بڑھتے محبت اور قدر شناسی کی اخیر حد تک پہنچ گئی تھی اور جس کے کچھ شواہد و مکاتیب شبلی میں نواب صاحب کے نام کے خطوط میں نظر آئیں گے۔

مولانا نے جو فارسی تصیدہ حیدرآباد دکن میں پڑھا تھا وہ پہلی بار اسی سفر میں اور اسی بھوپال

میں صاف ہوا اور چھپا تھا۔

سلسلہٴ علالت کا آغاز اور سفر کشمیر کا خیال | اپریل ۱۸۹۲ء | علی گڑھ کی آب و ہوا مولانا کے

مزاج کے موافق نہ تھی، خصوصاً سرسید کے جس بنگلہ میں وہ رہنے لگے تھے، وہ نشیب میں تھا اور وہاں پانی مرتب تھا، اس لیے وہ جگہ ملیر یا تھی اور مولانا کو ملیر یا کی شکایت پیدا ہوگئی جس کے حملے اخیر اخیر تک ہوتے رہے، اُس کا پہلا حملہ ۱۸۹۲ء میں شروع ہوا، چنانچہ یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو وہ مولوی حمید الدین صاحب کے قلم سے لکھواتے ہیں ”تین چار مہینے سے اکثر صحیح نہیں رہتا، آج پانچواں دن ہے کہ بہت سخت بخار آیا، ایک سوچھ درجہ پر حرارت تھی، چار دن تک یکساں حالت رہی، اور نہایت سخت تکلیف رہی..... کوئین جو بہت سی کھلا دی ہے، تو کان سے بہت اونچا سننے لگا ہوں“ (صفحہ ۳۱) پھر ۱۵ اپریل کو لکھواتے ہیں ”بخار کے دورے ہو جاتے ہیں، آج ڈاکٹر نے بڑے سرو سامان سے بخار کے روکنے کے لیے تیاریاں کی ہیں، مگر دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے“۔ (صفحہ ۳۲) ناممکن ہے کہ مولانا کی نگاہ میں کشمیر کی تعریف میں عربی کا یہ شعر نہ ہو:

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید گرم مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

مولانا کو خیال ہوا کہ اس ”سوختہ جانی“ کی حالت میں کشمیر کا سفر کیوں نہ کیا جائے، چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۸۹۲ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھواتے ہیں ”میں انشاء اللہ اگر اچھا ہو گیا تو اسی مہینہ میں کشمیر جاؤں گا، اور ڈیڑھ دو مہینہ رہوں گا، اگر تم کشمیر تک چلو تو ضرور چلے آؤ، سفر کا خرچ جو تقریباً چالیس پچاس ہوگا تمہارے ذمہ، باقی اقامت کا خرچ میرے ذمہ، علاوہ میری ہمرہی و ہمدردی کے کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں، یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں اگر چہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئے گا، مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے“ (صفحہ ۳۲) ذرا کشمیر کی بدست آب و ہوا کا قیاس کیجئے کہ صرف اس کا تخیل ایک شاعر کو کتنا بدست بنا سکتا ہے، اس کے پانچ دن بعد ۱۷ اپریل کو ان ہی کو لکھتے ہیں ”اپنے ارادہ سے جلد مطلع کرو، میں انشاء اللہ اسی مہینہ کے آخر میں روانہ ہو جاؤں گا،..... کشمیر میں جانے سے ممکن ہے کہ تمہارے ظاہری رنگ میں فرق آئے، یعنی نتواں شستون از رنگی سیاہی غلط ہو جائے“ یہ مزاج کی بہار بھی اسی علالت میں اسی کشت زعفران کے خیال کا اثر ہے، مگر بہر حال اس سفر کی فال اس سال نہ نکلی، تبدیل آب و ہوا کی، اس سے بہتر صورت نکل آئی، یعنی صحت کے بعد مئی ۱۸۹۲ء میں روم و شام کے سفر پر روانہ ہو گئے اور کشمیر کا سفر کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا۔

سفر قسطنطنیہ مئی ۱۸۹۲ء | علمی شوق کے پورا کرنے کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کرنا، اگرچہ

۱۔ یہ خط مکاتیب میں نہیں، مولوی سمیع مرحوم کا رنگ اچھا خاصہ سیاہ تھا۔

ہمارے اسلاف کا قدیم ترین شیوہ تھا، لیکن موجودہ علمی دور کے تنزل اور انحطاط میں یہ صرف ایک افسانہ ہی افسانہ زہ گیا تھا، جو ہمارے خون کے بہ جانے صرف ہماری علمی صحبتوں میں گرمی پیدا کر سکتا تھا۔

تینکانے اعظم گڑھ سے نکل کر اگر چہ علی گڑھ میں مولانا کے پر پرواز کے لیے ایک وسیع فضا مل گئی تھی، تاہم کتابوں سے جو عشق ان کو پیدا ہو گیا تھا، اس کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع فضا کی ضرورت تھی۔

اب ان کو علمی تشنگی بھگانے کے لیے کنوؤں اور نہروں کا پانی نہی سمندر درکار تھا، الفاروق جس کے لکھنے کے لیے وہ بے تاب تھے، اس کے لیے ہندوستان کے کتب خانے کافی نہ تھے، اس لیے مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے کنگھانے کی حاجت تھی، اس ک علاوہ ان کے دل میں گزشتہ شاہانہ اسلامی شان و شوکت کی واحد یادگار ترکی کے ساتھ جو عقیدت و محبت تھی، اس نے بھی ان کو مجبور کیا کہ وہ عمر میں ایک دفعہ دیارِ محبوب کی سیر کر لیں۔

اپنے سفر نامہ کے دیباچہ میں وہ خود اپنے اس ذوق و شوق کا اقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں ”قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا“ انہوں نے مئی ۱۸۹۱ء میں قسطنطنیہ کے سفر کا ارادہ کیا اور اپنے ساتھ اپنے ایک عزیز کو بھی لے جانا چاہا، چنانچہ ان کو ایک خط میں لکھا کہ ”ہاں وہ ضروری امر جو اس خط لکھنے کا باعث ہے، یہ ہے کہ میں انشاء اللہ مئی ۱۸۹۱ء میں ضرور قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤں گا اور غالباً چھ مہینے وہاں قیام کروں گا، میں چاہتا ہوں کہ تم ساتھ چلو، صرف راہ سے تم کو تعلق نہیں، تم کو بلا تنخواہ چھ مہینے کی رخصت بھی مل سکتی ہے، تم اس تجویز کے ہر پہلو پر غور کر کے مجھ کو جواب لکھو، میرا سفر ہر طرح قطع ہو چکا ہے۔“ (سبح) لیکن چند در چند اسباب سے اس سال یہ سفر ملتوی رہا، بلکہ یہ عزم ایک ضعیف سا خیال ہو کر رہ گیا، لیکن ۱۸۹۲ء میں اس سفر کی تکمیل کے چند قدرتی اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ دوبارہ اس خیال کو تحریک ہوئی، ان دنوں مولانا اکثر بیمار رہے، یہاں تک کہ علاج سے تنگ آ کر تبدیل آب و ہوا کا ارادہ کیا اور مکان وغیرہ کے بندوبست کے لیے الموزہ اور کشمیر میں دوستوں کو متعدد خطوط لکھے اور کشمیر کا خیال جیسا کہ گزر چکا، زیادہ غالب تھا، اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ آج ہی کل میں ولایت جانے والے ہیں، اب دفعہ مولانا کو خیال آیا کہ مصر و روم کا سفر، آب و ہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کی رفاقت، خوش قسمتی سے یہ سامان جمع ہو گئے ہیں، اس موقع کو ہرگز

ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، چنانچہ اسی وقت صاحب موصوف کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے نہایت خوشی ظاہر کی اور سفر کے ضروری کاموں میں کافی مدد دینے کا وعدہ کیا۔

اس وقت جہاز کی روانگی کو کل تین چار روز باقی رہ گئے تھے، اعزہ و احباب نے سنا تو سخت متعجب ہوئے اور اکثروں نے کہا کہ اس عجلت اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا لمبا سفر کون سی دانش مندی کی بات ہے؟ لیکن مولانا کا جواب صرف یہ تھا:

ع انچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم

کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی تھی اور مولانا کو تین مہینے کی رخصت کا مزید حق حاصل تھا، اس طرح چھ مہینے کی رخصت لی اور ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے روانہ ہو گئے، جہانسی سے مسٹر آرنلڈ کا ساتھ ہوا اور بمبئی پہنچ کر حاجی رحمت اللہ بن داؤد کے باغ میں قیام کیا۔

بمبئی پہنچنے کے دوسرے ہی دن جہاز روانہ ہو گیا، پہلی مئی کی صبح کو نو بجے جہاز پر سوار ہوئے، ۱۲ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا اور مولانا نے چھ مہینے کے لیے ہندوستان کو خیر آباد کہا۔

راستہ میں مسٹر آرنلڈ نے مولانا سے عربی پڑھنی شروع کی، اس سے جو وقت بچتا وہ دریائی سفر کے سیر تماشے میں صرف ہوتا۔

مناظر کی خوش آئند دلچسپی نے شاعر کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کی، مولانا نے سفر کے حالات پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ کہنا شروع کیا، جو سفر نامہ اور کلیات دونوں میں موجود ہے۔

۷ مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا، عدن میں مولانا کو مسافروں کی دلچسپی کی ایک بڑی چیز یہ نظر آئی کہ سہالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈوگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، کچھ ناچتے گاتے ہیں اور کچھ آپس میں مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے اور بگلیں بجاتے ہیں، ان کا بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ دو آئی چوٹی پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے ہیں، وہ سمندر میں پھینک دیتے ہیں اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے ہیں، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزہ آتا تھا، مگر ایک درد مند دل تھا جو اس منظر کو دیکھ کر بے تاب ہو رہا تھا، یہ مولانا شبلی تھے، مؤرخ اسلام کے دل کو نہیں لگی کہ وہ عرب جو کبھی دنیا کے فاتح اور کشور کشا تھے آج ان کی یہ

حالت ہے کہ وہ اپنے حریفوں کے سامنے مخزگی کر کے پیٹ پالتے ہیں، یہ خیال آتا تھا کہ مولانا کی زبان سے بے اختیار ”تم یا عمر“ کے الفاظ نکل گئے، بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ عرب نہیں سمالی ہیں تو تسکین ہوئی۔

۱۳ مئی کو جہاز سوز پہنچا، خواجہ اور پھیری والوں میں سے ایک نے مولانا کو ہندوستانی سمجھ کر اردو میں گفتگو شروع کی، مولانا کو بڑا تعجب ہوا اور جب دریافت سے معلوم ہوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی تو اردو کی عالم گیری پر اُن کو اور بھی تعجب ہوا (مجھے بھی ۱۹۲۰ء میں یورپ جاتے ہوئے پورٹ سعید میں یہی اتفاق پیش آیا، جس ڈوگی پر بیٹھ کر جہاز سے ساحل پر آیا، اُس کا ملاح بے تکلف اردو بولتا تھا، حالانکہ وہ یہاں کبھی نہیں آیا تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے جہاز ہر روز یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، اُن ہی جہازیوں سے ملنے جلنے میں اُن سے یہ زبان سیکھ لی)۔

۱۴ مئی کو جہاز پورٹ سعید پہنچا، جہاز سے اتر کر جب مولانا نے ساحل پر قدم رکھا تو ہر چیز کو بڑے شوق اور حیرت کی نگاہ سے دیکھا، کیوں کہ یہ حرمین محترمین کے بعد پہلا موقع تھا کہ انہوں نے سلطنتِ اسلام کی آبادی دیکھی، یہاں سے مسٹر آرنلڈ الگ ہوئے، وہ یورپ کو روانہ ہوئے اور مولانا قسطنطنیہ کے جہاز پر سوار ہوئے، یہاں سے مولانا کی دلچسپی کا نیا سامان یہ پیدا ہوا کہ مسلمان اور شامی عرب مسافروں کی صورتیں جہاز میں نظر آنے لگیں، اتنے دنوں میں مسلمانوں کی صورت کو ترس گئے تھے۔

۱۵ مئی کو جہاز یانا پہنچا جو شام کا ساحلی شہر ہے اور ۱۶ مئی کو بیروت، گو وقت نہ تھا مگر ایک ایسے اہم شہر کے دیدار سے محرومی جس کو خیال کی آنکھوں سے وہ تاریخ کے صفحات پر بارہا دیکھ چکے تھے، گوارا نہ ہوئی، اور ایک آدمی کو ساتھ لے کر شہر کی سیر کر آئے، ۱۷ مئی کو جہاز ساپرس پہنچا، جس کو عربی میں قبرص کہتے ہیں، قبرص وہ مقام تھا جو ایک اسلامی مورخ کی نگاہ میں دلچسپی کا بڑا سامان رکھتا تھا، مولانا اُس کے شہر لہما مون میں اترے، سب سے پہلے جامع مسجد میں گئے، مسجد ہی سے متصل ایک اسلامی مکتب نظر آیا، اُس میں چلے گئے، وہاں کے مدرس سے جو ایک عالم تھے، ملے، اُس نے بڑی تعظیم و تکریم کی اور ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا، اُس نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، تو مولانا پر بے حد اثر ہوا، ان کو خیال آیا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان اور کہاں بحرِ روم کا یہ دور دراز جزیرہ، اس مقدس کلام میں کیا تاثیر تھی، کہ مشرق سے مغرب تک برقی رو بہن کر دو گئی۔

۱۸ مئی کو جہاز روڈس پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا، یہ بھی ابتدائی اسلامی تاریخ کا دلچسپ

موضوع ہے، اسی لیے مولانا اُس کی سیر کے بہت مشتاق تھے، لیکن اتفاق سے رات کا وقت تھا اس لیے اس کی سیر سے محروم رہ گئے، ۲۰ مئی کو صبح کے وقت از میر (سرنا) پہنچے، اور یہاں جہاز دو روز تک مقیم رہا اور مولانا نے تفصیل کے ساتھ یہاں کی سیر کی، جمعہ کی نماز جامع حصار میں پڑھی، مسجد سے متصل ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، نماز سے فارغ ہو کر اس کتب خانہ میں گئے، وہاں چند علما اور ترکی محکمہ تعلیم کے کچھ افسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور متعہ کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، یہ لوگ فارسی سمجھتے تھے، ان کی اجازت سے مولانا نے اس مسئلہ پر ایسی عمدہ تقریر کی کہ سب نے پسند کی۔

یہاں سے ۲۱ مئی کی شام کو روانہ ہو کر ۲۳ مئی کو صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے، اور قلیوں اور ملاحوں کی کشمکش سے رہائی حاصل ہونے کے بعد ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے آئے، اسی کشتی میں شیخ عبدالفتاح سے ان کی ملاقات ہوئی اور یہی اتفاقی ملاقات ان کی تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی، دونوں نے ساتھ سرائے میں جا کر قیام کیا، چھ سات دن تک اس سرائے میں رہے، پھر باب عالی کے پاس ایک اچھا مکان کرایہ پر لیا اور چند روز کے بعد دوسرا مکان لیا اور اخیر تک اُسی میں مقیم رہے۔

شیخ عبدالفتاح جن سے مولانا نے دوستی پیدا کی تھی، شام کے ایک خاندان سے تھے، جن کو ہندوستان سے بھی ایک طرح کا تعلق تھا، حضرت خالد نقشبندی جو خالد رومی کے نام سے بھی مشہور ہیں وہ ملک شام سے ہندوستان آ کر دہلی میں حضرت شاہ غلام علی علیہ الرحمہ کے مرید ہوئے تھے اور یہاں سے نقشبندی طریقت کی تعلیم پا کر اپنے وطن واپس تشریف لے گئے اور ہندوستان کی اس دولت کو روم و شام میں جا کر لٹایا اور نقشبندیہ طریقت کو جاری کیا، شیخ عبدالفتاح کا نام سن کر ان کی زیارت کے لیے شامی عربوں کا گروہ درگروہ آنا شروع ہوا اور اس ذریعہ سے مولانا کی ملاقات بھی ان سے ہونے لگی، انہی آنے والوں میں ایک نوجوان شامی عالم شیخ علی ظہیان تھے، ایک دن وہ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے تو مولانا بھی پاس ہی بیٹھے تھے اور سامنے مولانا کی عربی تصنیف اسکات المعتمدی رکھی تھی، شیخ علی ظہیان کی نظر اس پر پڑی تو کہا ”آہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا اور انہوں نے اس کے مصنف کے بارے میں کہا تھا ”شکر اللہ مساعیہ“، شیخ علی ظہیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس رسالہ کے مصنف یہی ہیں تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے، مولانا کو اس بات سے کہ ان کی ایک معمولی سی تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے نگاہ قبول سے دیکھا

نہایت مسرت ہوئی، شیخ علی ظہیان سے مولانا کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے اور وہ اس سفر میں اُن کے بہت مدد و معاون ثابت ہوئے، چند روز کے بعد انہوں نے مولانا سے منطوق پڑھنی شروع کی، ان کے ساتھ فواد یک وغیرہ چند اور نوجوانوں نے بھی شرکت کی۔

کتب خانوں کی سیر | اس سفر سے مولانا کا اصلی مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا، قسطنطنیہ میں کتب خانے بہت در دور واقع تھے، مولانا ایک ایک کتب خانہ اور ہر کتب خانہ کی ایک ایک نایاب کتاب جو ان کے مقصد سے تعلق رکھتی تھی، دیکھتے پھرتے تھے اور اس غرض سے ان کو روزانہ تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا تھا، لیکن یہ نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ روزانہ یہ تکلیف اٹھاتے تھے اور نہایت سرگرمی کے ساتھ ان کتب خانوں کی سیر کرتے تھے، چنانچہ قسطنطنیہ سے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں ”اس وقت بلکہ زمانہ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔“ (سر سید ۱۰)

یہاں جو کتابیں نظر سے گزریں، ان میں سے سر سید کو ان کے فلسفیانہ مذاق کے مطابق جن تصنیفات اور مصنفوں سے باخبر کیا ہے، اس کا تھوڑا سا حال سر سید کے نام کے خطوں میں ہے، ۲۲ مئی کو وہ قسطنطنیہ پہنچے اور تین ہی روز کے بعد ۲۵ مئی کو وہ انہیں خط لکھتے ہیں، سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپیے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے، لے لی جائے یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جاسکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جاسکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور ابوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں.....

معتزلہ کی کتابیں یہاں بھی نہیں.....

پھر ۱۵ جون ۱۸۹۲ء کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ”دقلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں، (یعنی خریدنے کے لیے نہیں ملیں) مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، صرف مطبوع کتابیں خریدی جاسکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتدبہ ہے، یہاں امام غزالی کی کتابیں اور رسالے موجود ہیں، مکاتبات کا نسخہ بھی ہے، ابوعلی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی، ارسطو وغیرہ کے اصلی ترجمے نہایت قدیم لے سر سید نے مکاتبات امام غزالی کا جو نسخہ شائع کیا ہے، وہ ہمیں سے منگوا لیا گیا تھا۔

خط میں موجود ہیں، معتزلہ کی کتابیں! البتہ ناپید ہیں، عبد القاهر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں.....

۱۵ جون ۱۸۹۲ء کو اپنے والد ماجد کے نام لکھتے ہیں ”کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہو سکتیں، نہ حافظان کے لیے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل پیادہ سفر کرتا ہوں کیوں کہ کتب خانے دور دور واقع ہیں، ماموں صاحب سے فرمادیتے تھے کہ آج کل یہاں یعنی بخاری کی شرح چھپ رہی ہے، نو جلدیں چھپ چکیں، نہایت عمدہ چھپ رہی ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ بعض تحقیقات ان میں ایسی ہیں جو فتح الباری میں نہیں مل سکتیں، قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی، ایک مشترکہ کمپنی ڈیڑھ دو لاکھ کے سرمایہ کی ہے، جس نے عظیم الشان مطبع قائم کیا ہے، اسی میں یہ کتاب چھپ رہی ہے۔“

سفر نامہ میں مولانا نے یہاں کے کتب خانوں کے علمی سرمایہ پر جو رائیں ظاہر کی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کتب خانوں میں کیا کیا دیکھا، فرماتے ہیں ”میرا خیال تھا کہ دولت عباسیہ کے عہد میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے، دنیا سے ناپید ہو گئے، لیکن یہاں آکر اس خیال کی غلطی ثابت ہوئی، اگرچہ جس کثرت سے ترجمے ہوئے تھے، اس کے اعتبار سے تو موجودہ سرمایہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، تاہم جس قدر موجود ہے، یہ بھی غنیمت ہے“ اسی سلسلہ میں ابن سینا کی حکمت مشرقیہ کا ذکر کیا ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں ”مشہور حکما اور ائمہ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں، امام غزالی، بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کم یاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہیں، اکثر یہاں موجود ہیں، اسی سلسلہ میں مولانا نے تاریخ و ادب کی حسب ذیل نادر کتابوں کا تذکرہ کیا، اسرار البلاغہ، دلائل الاعجاز جرجانی، البیان والتبيين للجباز، تذکرہ ابن حمدون، معجم الادبا، یا قوت، کتاب الاشراف، بلاذری تاریخ کبیر امام بخاری، کتاب القضاة و کعب، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ الاسلام ذہبی، تاریخ الحکما قفطی، تجارب الامم ابن مسکویہ، منتظم ابن جوزی، مرآة الزمان، سبط ابن جوزی، مسالک الابصار ابن فضل اللہ، عقد الجمان، بدر الدین عینی، تاریخ دمشق ابن عساکر، رحلۃ ابن خلدون، نہایت الادب نویری، طبقات کبریٰ ابن سعد، طبقات الامم صاعد اندلسی، سیرۃ العرین ابن جوزی، کتاب الصنائعین عسکری، شرح تبریزی بر حماسہ، دیوان ابونواس مکمل، سرقات المستنسی ابن عمید، مجموعہ رسائل ابواسحاق وغیرہ۔

کیا زمانہ کی نیرنگی ہے جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے یہ محنتِ شاقہ اٹھائی تھی، وہ انہی کے زمانہ سے چھپ کر عام ہونے لگی تھیں، اور اب تو شاید ان کی ان پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو نہ چھپی ہو، ایک منتظم اور تاریخ کبیر بخاری تھی، وہ بھی دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ رہی ہے، تاہم اس سے مولانا کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کہ ہر فن میں ان کی نگاہ انتخاب اسی پر جا کر رکھی، جو انتخاب کے قابل تھی اور وہ مولانا ہی تھے جنہوں نے ان کتابوں کے ناموں سے ہندوستان کو سب سے پہلے روشناس کیا۔

الفاروق کے لیے جن کتابوں سے معلومات اُن کو مل سکتے تھے، ان کو مطالعہ کیا، اور ان سے ضروری اقتباسات لکھ کر اپنے ساتھ لائے، جن میں طبقات ابن سعد، سیرۃ العمرین امام جوزی، انساب الاشراف بلاذری، اخبار القضاة محمد بن خلف اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل وغیرہ کے حوالے الفاروق میں موجود ہیں اور مصنف نے الفاروق کے مقدمہ اور حاشیہ میں بھی اس کی تصریح کر دی ہے۔

مدارس کا معائنہ | کتب خانوں کے بعد یہاں کے مدارس دیکھنے کی چیز تھے اور مولانا کو جو شوق و آرزو یہاں تک کھینچ کر لائی تھی اس میں اس چیز کا مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھا، سفر نامہ میں فرماتے ہیں ”اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرزِ تعلیم اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا“ چنانچہ اسی لیے اس پر بہ نسبت اور باتوں کے زیادہ توجہ کی اور جہاں تک ہو سکا اس کے لیے کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، وہ چند بار سررشتہ کے دفتر میں گئے، تعلیم کے افسروں سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں، بڑے بڑے اسکول اور کالج خود جا کر دیکھے، ٹیچروں اور پروفیسروں سے ملے، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں، وہ ہندوستان کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں تھے جو مسلمانوں کی نئی امیدوں کا مرکز تھی اور خود پرانی تعلیم کے مدرسوں کی پیداوار تھے، اس لیے دونوں کے حسن و فحش سے واقف تھے اور یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، قدیم و جدید کو کس طرح پیوند دیا گیا ہے، لیکن جب یہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ یہاں بھی قدیم، جدید کے درمیان وہی حد فاصل قائم ہے تو ان کے دل کو چوٹ لگی، ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں، افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا یہاں نہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا، اس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے، لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں اور جب

تک یہ ڈانڈے نہیں ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی، یہی کمی ہمارے ملک میں ہے، جس کا رونا ہے“ نئے طریقہ کے جو اسکول اور کالج تھے، مولانا نے ان کو ایک ایک کر کے دیکھا، مکتبِ حریہ (ملٹری کالج) مکتبِ الحقوق (لا کالج) مکتبِ الصنائع (ٹیکنیکل کالج) مکتبِ بحریہ، مکتبِ الزراعة (ایگریکلچر کالج) مکتبِ سلطانیہ، مکتبِ ملکیہ (سول سروس کالج) وغیرہ میں گئے، وہاں طلبہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کو غور سے دیکھا، ان کے بورڈنگ کے انتظام اور طور و طریق پر غائر نگاہ ڈالی اور ان میں جو باتیں قابل ذکر تھیں ان کو سفرنامہ میں ذکر کیا ہے، تاکہ وہ کالج میں رائج کی جائیں۔

اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ”یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی، ہر کالج کا خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام ہوتا ہے، مجھے یہ بات بہت پسند ہوئی ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے“ مولانا حالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس کے رواج دینے کی کوشش کی، اس وقت کالج میں جو یونیفارم کارواج ہے وہ اسی تجویز کی ادھوری تعمیل ہے، حیاتِ جاوید میں ہے ”پھر محمدن کالج کے بورڈروں کے لیے اس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عمل درآمد ہے، یونیفارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا، لیکن محمدن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آ کر رہتے ہیں، بغیر کسی جبر کے اپنے سرچشموں کو دیکھ کر خود بخود دُرُکُش لباس اختیار کر لیتے ہیں۔“ (ج ۲، ص ۹۴)

اسی طرح مولانا سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں ”ہر کالج میں غریب، طالب علموں کی متعدد تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر آمد اددی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں، اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جا کر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے، طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے اور غربا کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت کا حاصل ہونا اور ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے، بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسہ العلوم یاد آتا تھا اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا، میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر، کلینہ ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطیوں آج

کالج میں قائم ہیں، بالکل منادی جائیں، اگر نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں“ (سفر نامہ -۶۰) مکتب ملکیہ یعنی سول سروس کے کالج میں جب وہ گئے ہیں تو اتفاق سے ظہر کی نماز کا وقت آ گیا، اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے وہ سماں مولانا پر اثر کر گیا، لکھتے ہیں ”اس اثنا میں ظہر کا وقت آ گیا، مسلمان لڑکوں نے نماز کی تیاری کی، عموماً کوٹ پتلون پہننے ہوئے تھے اور اس لباس میں ان کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا اور وقار و احترام کے ساتھ قطار در قطار مسجد کو جانا میرے دل پر عجیب اثر کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزیلی ہزار درجہ بہتر ہے“ (ص ۷۷) ترکی کے مصنفین اور ادبا سے بھی ملاقاتیں کیں اور جدید ترکی ادب کا جو سرمایہ پیدا ہوا تھا اس کا بھی اندازہ لگایا، یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور علمی رسائل دیکھے اور ان کی ظاہری شکل و صورت، چھاپہ کی خوبی، ٹائپ کی خوبصورتی، صفائی اور مضامین کے تنوع اور بلندی سے ان کو خوشی ہوئی، مگر یہ دیکھ کر افسوس کیا کہ حکومت نے سیاسیات کے میدان کو اتنا تنگ اور محدود کر دیا ہے کہ اس نمک کے بغیر وہاں کا ہر بہتر سے بہتر کھانا بھی بدمزہ ہو رہا ہے۔

یہاں ہر طرف ترکی زبان کا ماحول دیکھ کر مولانا نے ترکی پڑھنی شروع کی، چنانچہ اپنے والد کو لکھتے ہیں ”ترکی پڑھنی میں نے شروع کر دی ہے، دیکھنے پوری بھی کر سکتا ہوں یا نہیں۔“

ملا محمد آفندی موصل کے رہنے والے ایک عرب تھے، جو فارسی اچھی طرح جانتے تھے، مولانا نے ان ہی سے ترکی سیکھنی شروع کی، مولانا نے گوسفر نامہ میں لکھا ہے کہ جو ٹوٹی پھوٹی ترکی میں نے ان سے سیکھی تھی وہ بھی اب محفوظ نہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ اتنی ترکی سیکھ گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ایک استاذ زادہ مولانا محمد امین صاحب چریاکوٹی خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کو اس زبان میں اپنا شاگرد بنایا اور وہ بعد کو ترکی اچھی طرح سیکھ گئے، اخیر اخیر زمانہ تک مولانا کا یہ حال تھا کہ ترکی اخبار ہم لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے اور عربی لفظوں کے سہارے سے اس کا کچھ حاصل نکال لیتے تھے۔

یہاں کے نئے طرز کے اسکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر مولانا کو جو خوشی ہوئی، اسی قدر یہاں کے پرانے عربی مدرسوں کو دیکھ کر ان کو تکلیف ہوئی، بلکہ یہاں تک ان کی رائے ہوئی کہ موجودہ (پرانی) تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام سرتوں اور خوشیوں کو بر باد کر دیتا تھا، وہ اس قدم تعلیم کی اہتری تھی۔ (سفر نامہ -۷۸)

قططنیہ میں مولانا کے علم کے مطابق اس وقت عربی اور مذہبی علوم کے طالبان کے رہنے کے حجرے تنگ و تاریک صحنِ مختصر، مکاناتِ بند بند، ذریعہ آمدنی زکوٰۃ و خیرات، بایں ہمہ مولانا نے ان مدرسوں کو دیکھ کر ترکوں کی اس علمی فیاضی کا اعتراف کیا کہ وہ ہر چند کم حیثیت سہی تاہم آج سینکڑوں علمی یادگاروں کا وجود تو ہے اور انصاف یہ ہے کہ یہ مدرسے جس زمانہ کی یادگار ہیں اس وقت کی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ناموزوں بھی نہیں، ہمارے ہندوستان میں تو اس وسعت اور فراخی کے ساتھ کہ بہ جائے خود ایک اقلیم ہے، حکومتِ اسلام کی شش صد سالہ مدت کی ایک علمی یادگار بھی موجود نہیں۔ (سفر نامہ ص ۸۰)

اس تفاوتِ حال کا سبب تو ظاہر ہے کہ ترکوں کی اسلامی سلطنت باقی تھی اور ہندوستان کی مٹ چکی تھی، بہر حال یہ تو دل کے بہلانے کی باتیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم مدارس کی اس حالت کو دیکھ کر ان کو بڑا درد ہوا، آج ترکی میں جو مذہبی و تمدنی انقلاب برپا ہے، وہ حقیقت یہ ہے کہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری کا نتیجہ ہے اور ہر قدیم کو منا کر ہر جدید کی طلب کا جو شوق جنون کی حد تک مصطفیٰ کمال پاشا کے دور میں پیدا ہوا، وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدیم و جدید تعلیم کے درمیان تطبیق کی کوشش اتنے زمانہ تک وہاں نہیں کی گئی، میں نے اپنے سفر افغانستان میں افغانستان کے وزرا اور امریکی خدمت میں یہی عرض کیا تھا اور اسی نتیجہ میں ان کو ذرا یاد تھا۔

مولانا کے دل کو ترکی میں جس دوسری چیز سے تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ یہ ساری رونق، یہ ساری چہل پہل، یہ ساری ترقی جو کچھ تھی وہ سلطنت کے دم سے تھی، اس میں ترکی قوم کی کوشش و عمل اور جد و جہد کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ اسی طرح سُست و ساکن اور بے خبر تھی، جیسی خود ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم، یہ دیکھ کر ان کے دل پر جواثر ہوا، اس کو سفر نامہ میں ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

”سیاسی قید و بند کا یہ بھی اثر ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں ابھی تک وہ زندہ دلی، آزاد خیالی، حوصلہ مندی، بلند نظری نہیں پیدا ہوئی جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے، اس سے بڑھ کے افسوس یہ ہے کہ تمام کالج اور اسکول جن کام میں نے ذکر کیا، حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دارالسلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گونگتنی ہی مقتدر اور دولت مند ہو، لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں، جس قوم کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے، اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں، (ص ۶۳)

مولانا کی دور رس نظر نے ترکی کی جس بیماری کا اُن دنوں احساس کیا تھا، اسی کا علاج مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی حکمت اور تدبیر سے کیا، یعنی ترکی سلطنت کو ترکی شہنشاہی سے نہیں، ترکی قوم کے ذریعہ سے زندہ کرنا، البتہ اس راہ میں مصطفےٰ کمال سے جو بے اعتدالی ہوئی، اس کا افسوس ہے۔

قسطنطنیہ کے سفر میں جو چیز انہوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم اور حاکم کا تفاوت اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیاتوں کا فرق ہے، وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہم وطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خود غرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے، ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور زیوں حالی کا احساس اور قوی ہو گیا، تاہم جس اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں، اس کے بچے کھچے آٹا کو بچشم خود دیکھ کر روح مضطرب کو جو سرمایہ نشاط حاصل ہوتا اور دل بے تاب سے جوش سرور کی موج میں اٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے، ہر جمعہ کو رسم سلاطین کا دلفروز سماں اور عید کے موقع پر موکب سلطانی کا پر شکوہ منظر اس درجہ روح پرور تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لیے ایک بے خودی سی چھا جاتی، مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکب سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے، جس کا ہر لفظ خوشی و مسرت کا ایک چھلکتا سا غر ہے، اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بگذرا زیں حرف و مکثر مپرس خواب خوشے دیدم و دیگر مپرس

تند مئے بود خرابم ہنوز دیدہ من باز و بخوابم ہنوز

مگر یہ کیفیت کیوں تھی، کیا محض اس لیے کہ دولت و ثروت اور جاہ اقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کر دیا تھا؟ نہیں بلکہ اس لیے کہ اس جاہ و حشم کے آئینہ میں ان کو اسلام کی حیات ملی کا تاب ناک چہرہ نظر آ رہا تھا، عید گاہ میں جہاں سلطان کی آمد کا سماں دکھایا ہے، فرماتے ہیں:

غلفہ برخاست کہ بادا نوید مہر جہاں تاب خلافت دمید

قاعدہ دولت و دیں را مدار آئینہ رحمت پروردگار

شاہ فلک کو کیہ عبد الحمید آیدہ اللہ بنصر مزید

فرہ شاہی بہ جبین آشکار حاشیہ بوساں بہ بیمین و یسار

آگے چل کر دعائیہ اشعار میں ان کے جذبات اور نمایاں ہو جاتے ہیں:

جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ آنکہ بود شرعِ نبی را پناہ
تازگی بدر و جنین از تو ہست زیب و طرازِ حرین از تو ہست
چرخِ بدایں مایہ کہ گردندہ است زندہ ہماں کز تو جہاں زندہ است
یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی نہ ممدوح کو سنا کر صلہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی، بلکہ
قومی حیات کی رجز خوانی تھی اور ملی تفاخر کا جوش تھا، جو بے ساختہ زبانِ قلم سے تراوش کر لیا ہے۔

رسمِ سلامت دیکھنے کے بعد مولانا پور جو کیف طاری تھا، اُس کی تصویر ان کے سفر نامہ سے زیادہ
ان کے ایک مکتوب میں ہے، جو مکاتیب میں شامل ہے، یہ خط چوں کہ عین اسی دن لکھا گیا ہے، اس لیے
اس سے ان کے تاثرات کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے، ۱۹ جون ۱۸۹۲ء کے خط میں اپنے والد ماجد
کو لکھتے ہیں:

قبلام!

آج میں نے ”عجیب دل آویز“ خواب دیکھا ہے، ”عجیب“ اس لیے کہ دوپہر کا وقت تھا اور
آنکھیں بیدار تھیں، اور ”دل آویزی“ کی کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک
آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے، مفصل سنئے، آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکبِ سلطانی کا
نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا، جامعہ حیدریہ میں داخل ہوا، سلطان المعظم بڑی شوکت و شان
سے آئے، لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا، کیوں کہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گزرگاہِ سلطانی پر
پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔

محلِ سلطانی سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک نہایت بُر تکلف جامع مسجد ہے جو سلطان کے نام
سے حیدریہ مشہور ہے، اس گزرگاہ میں ایک مکان ہے اور دور دور ملکوں سے آئے ہوئے معزز سیاح یا عہدہ دار
موکبِ ہمایونی کی سیر کرنا چاہتے ہیں، وہ کسی معزز شخص کے ذریعہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں اور اُس
مکان کی چھت پر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے، کیوں کہ سواری کے وقت
دور تک چاروں طرف فوج کا دائرہ ہوتا ہے اور کوئی شخص اُس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا، حسین حبیبؑ
آندری (سابق سفیرِ بھٹی) نے مجھ کو اجازت دلانے کا وعدہ کیا تھا، مگر اتفاق سے وہ دیر میں آئے، ادھر سواری

۱۔ جنگِ روم و روس میں مولانا نے چندے ان ہی کے ذریعہ سے قسطنطنیہ بھیجے تھے، یہی ذریعہ تعارف تھا۔

کا وقت قریب آ گیا اور طلحہ قوال اور دورر باش کی صدائیں بلند ہونے لگیں، مجبوراً میں مسجد میں داخل ہوا اور صرف اول میں جا کر بیٹھا، سلطان کی گاڑی زینہ تک آتی ہے، اور وہ اتر کر فوراً مسجد کے بالائی حصہ پر جہاں نہایت مقرب اور مخصوص لوگوں کے سوا کوئی نہیں جاسکتا، تشریف لے جاتے ہیں، وہاں ایک مقصورہ ہے جس کا دروازہ مسجد کے منبر کے بائیں طرف ہے، یہ سلطان کے نماز کی جگہ ہے، جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو اطمینان پر دے چھوڑ دیے جاتے ہیں، اور کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا، خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے یہ کہا کہ

اللہم انصر مولانا السلطان الغازی عبدالحمید خان تو میرے بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ اُٹھ چلا آتا تھا، خطیب نے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کا نام پڑھا اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اتر آیا تا کہ ظاہر ہو کہ سلطان اگر چہ آج ظل اللہ ہی تا ہم ان کا رتبہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کچھ نسبت نہیں رکھتا، نماز کے بعد حسین حبیب آندری نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا اور مسجد کے صحن میں جہاں پاشا اور سرداران فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے، لے جا کر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے، سلطان مقصورہ سے اتر کر زینہ کے قریب پردہ کے اوٹ میں بیٹھے اور فوجیں سامنے سے گزرنی شروع ہوئیں، دو گھنٹہ کاٹل ایک عجیب تماشا نظر آتا رہا، قریباً دس ہزار فوج تھی، مختلف رسالے اور ہر رسالے کے تمام ساز و اسلحہ جدا جدا تھے، میں کیا کہوں، ترکی جو انوں کی دلیرانہ صورتیں، چمکتے ہوئے اسلحہ، موزوں اور باقاعدہ رفتار گھوڑوں کی جست و خیز، پاشاؤں کا زرکار لباس، چمکتے ہوئے تمغے عجیب سماں تھا، جو کسی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا، اخیر میں دونوں شہزادے آئے، بڑے کی عمر نو دس برس کی ہے، لیکن جس شان و شوکت سے وہ گھوڑے پر سوار تھا، بڑے بڑے دلیروں کے وہ تیور نہیں ہو سکتے، فوجیں گزر چکیں تو سلطان گاڑی پر سوار ہوئے اور ہمارے سامنے سے گذرے، سواری مقابل آئی تو تمام حلقہ نے رکوع کے قریب جھک کر سلام کیا، سلطان دونوں ہاتھوں سے ان کا جواب دیتے تھے، حالاں کہ یہ معمولی چیز ہے اور ہر جمعہ کو ہوتی ہے، عید کے دن کہتے ہیں کہ قیامت کا سماں ہوتا ہے، خدا وہ دن بھی دکھلائے۔

خدا نے یہ دن بھی ان کو دکھایا، اس دن سلاطین نہ تھی، اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی،

لیکن شان و شوکت، جاہ و جلال، جوش و اثرِ سلاطین سے بھی کچھ بڑھ کر تھا، تقریباً ۸ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تانتا بندھا رہا، اُس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں، لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے کیا مقصد ہے، یکا یک دور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں، معلوم ہوا کہ تمام وزرا پاشا افسران فوج اور بڑے بڑے عہدہ دارانِ ملکی سلطان کے جلو میں پیادہ پا آرہے ہیں، یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں، ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا، شانوں پر زین پھول، دامن اور آستینوں پر کلاہتوں کی تحریر، سینے صرصر اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوئے، ان سب پر آفتاب کا عکس تمام میدان جگمگا اٹھا، یہ صف جا چکی تو سلطان کا جمال جہاں آرا نظر آیا، گھوڑے پر سوار تھے، لباس بالکل سادہ تھا، چند بڑے بڑے فوجی افسر رکاب میں تھے، گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا اور ہر قدم پر اس زور سے بادشاہم چوق بیٹا (زندہ باد) کا نعرہ بلند ہوتا تھا کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا۔“ (سفر نامہ روم و مصر دہشام)

مولانا عید کا یہ سماں دیکھ کر واپس آئے تو ان کا دل شاعرانہ جذبات سے معمور تھا، چاہا کہ جو تماشا انہوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں کو بھی دکھائیں، مثنوی عید یہ کے نام سے یہ نظم ان کے سفر نامہ اور کلیات میں درج ہے، اسی مثنوی کے وہ چند شعر ہیں جو اد پر گزر چکے۔

مولانا کا یہ سفر خالص علمی اور تعلیمی مقصدوں کے لیے تھا، ویسے ہی تائیدِ نمیبی نے اُن کی عزت افزائی کا ایک ایسا سامان پیدا کر دیا جس کے حصول کی کوشش کیا وہم و گمان بھی کسی غیر ملک کے آدمی کو نہیں ہو سکتا تھا اور جس کے عطا میں اعترافِ کمال کے سوا دینے والے کی کوئی سیاسی مصلحت بھی نہیں ہو سکتی۔ جنگ روم و روس کی وجہ سے شیر پلونا غازی عثمان پاشا کا نام ان دنوں بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اور اس جنگ سے جو ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی، مولانا کو جو دلچسپی تھی اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس لیے قسطنطنیہ پہنچ کر اس نام و رتر کی سپہ سالار کی زیارت کا شوق ان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوا، یہی کشش ان کو غازی موصوف کے در دولت تک کھینچ لے گئی۔

پہلی ملاقات کے بعد پاشائے موصوف نے مولانا سے دوسری ملاقات کی خواہش کی، مولانا نے اس ملاقات کا پورا حال سفر نامہ میں موجود ہے، مگر ایک واقعہ ایسا ہے جو صرف سید بہ سید حاصل ہے، مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ ”غازی عثمان پاشا کی ملاقات کا ایک واقعہ خود مولانا نے مجھ سے بیان کیا تھا، ملاقات کے وقت جب ایک کاتب دوسرے کے ہاتھ میں تھا، مولانا نے غازی سے درخواست کی کہ جس ہاتھ سے آپ نے کفار کو قتل کیا تھا اس کے چومنے کی اجازت دیجیے، پاشا نے کہا کہ آپ کا ہاتھ چومنے کے قابل ہے جس نے ظلمی خدمات انجام دی ہیں اور یہ کہہ کر مولانا کا ہاتھ چوم لیا۔“

نے دوسری بار ان سے ملاقات کی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تپاک سے ملے اور کہا کہ جب یہاں سے جائیے گا تو مجھ سے مل لیجیے گا، اسی اثنا میں انہوں نے مولانا کے لیے سلطان سے ”تمغہ مجیدی“ کے عطا ہونے کی درخواست کی تھی اور وہ منظور ہو گئی تھی، لیکن مولانا کو خود اس کی خبر نہ تھی، ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اپنے مکان میں سو رہے تھے کہ ان کے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے اور مولانا کو جگا کر کہا ”یا شبلی واللہ لقد طلع لك النيشان“ مولانا کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا، لیکن قرأت خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو یہ خبر صحیح نکلی، دوسرے دن تمام احباب مبارک باد دینے آئے اور مولانا نے اس خوشی میں ایک مختصر سا جلسہ دعوت ترتیب دیا، دعوت کی صبح کو مولانا عثمان پاشا کی ملاقات کو گئے تو سب سے پہلے دربان نے کہا ”تمغہ مجیدی مبارک“ پاشائے موصوف نے بھی ملاقات کے ساتھ ہی مبارک باد دی، تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا، بکس سے نکال کر پہلے انہوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مولانا کے حوالہ کیا، مولانا سر و قد کھڑے ہو گئے اور سلطان کو دعوتی، رخصت کے وقت پاشائے موصوف نے مولانا کو اپنی عکسی تصویر بھی عنایت کی، تمغہ کے ساتھ ایک فرمان بھی عطا ہوا جو سفر نامہ میں نقل ہے۔

اس تمغہ اور فرمان کے ملنے کی تاریخ ۱۳/ محرم ۱۳۱۰ھ ہے، مولانا نے ہندوستان پہنچ کر اس تمغہ کو استعمال کرنا چاہا، لیکن گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ۲ مئی ۱۸۸۶ء کے قانون کے مطابق اس کی اجازت نہیں دی۔

قسنطنیہ سے روانگی | قسنطنیہ میں مولانا قریب قریب تین مہینے تک رہے، ان تین مہینوں کا ہر روز کسی نہ کسی کتب خانہ یا کالج یا مدرسہ کے دیکھنے میں صرف ہوا، جس کے تفصیلی حالات سفر نامہ میں مذکور ہیں، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، اس سے فراغت ہو گئی تو یہاں سے طبیعت ایسی اچاٹ ہوئی کہ قسنطنیہ میں ہر سال صفر کی آٹھویں رات کو جو سلطان کی تخت نشینی کی رات ہے، بڑی دھوم سے جشن ہوتا ہے، لیکن مولانا اس کا بھی انتظار نہ کر سکے اور ۲۶ محرم ۱۳۱۰ھ کو چل کھڑے ہوئے۔

بیروت | اساتوین دن بیروت پہنچے اور ایک ہفتہ تک بیروت میں مقیم رہے، بیروت میں قیام کی اصلی وجہ شیخ طاہر جزائری کی ملاقات کا شوق تھا، یہ شیخ رہنے والے تو شمالی افریقہ کے کسی ملک کے تھے مگر زیادہ تر یہ مصر اور شام میں رہتے تھے، یہ زندہ کتب خانہ تھے قلمی کتابوں اور کتب خانوں کی نادر کتابوں کے نام کی نوک زبان تھے، ان کی یادداشت (کناشہ) میں ہر کتاب خانہ کے نوادرات کے نام

درج تھے، توجیہ النظر وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں۔

بیروت خود بھی اس وقت شام میں شامی عرب عیسائیوں کی جدید علمی و ادبی تحریکوں کا مرکز تھا، علمی انجمنیں، ادبی مجالس اور نئے علم و فن کے کالج، اچھے اچھے عربی مطبعے قائم تھے، جن سے عربی ادب کی عمدہ عمدہ کتابیں چھپ کر شائع ہو رہی تھیں اور ان ہی مطبعوں سے عربی اخبار اور رسالے نکل رہے تھے، اور عربی زبان میں نئے علوم اور نئے خیالات کے لیے الفاظ بن رہے تھے، مولانا نے ان سب پر غائر نظر ڈالی اور وہاں کی علمی ترقیوں سے پوری واقفیت حاصل کی، جس کا پورا موقع سفر نامہ میں موجود ہے۔

بیت المقدس | بیروت سے مولانا کے شامی دوست شیخ علی ظلیان اپنے والد کے اصرار سے دمشق چلے گئے اور مولانا نے ۸ صفر ۱۳۱۷ھ کی شام کو بیت المقدس کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر وہاں کے ہندوستانی زاویہ میں قیام کیا اور وہاں کی مقدس عمارتوں کی زیارت اور وہاں کے مفتی شہر سید طاہر اور دوسرے علما و فضلا سے ملاقاتیں کیں اور بعض مجلسوں میں علمی مسائل پر گفتگو کی، یہاں سے فارغ ہو کر مصر کا رخ کیا اور اسکندریہ سے ریل پر بیٹھ کر قاہرہ پہنچے۔

قاہرہ | قاہرہ میں مولانا نے مصر کے قدیم تعلیمی مرکز جامع ازہر میں رواق الشامیین کے ایک حجرہ میں قیام کیا اور وہاں ایک مہینہ سے زیادہ مقیم رہے، چونکہ قاہرہ قدیم و جدید دونوں قسم کی تعلیم کا مرکز ہے، اس لیے مولانا نے یہاں کے نظامِ تعلیم کو نہایت غور سے دیکھا اور ان کو نظر آیا کہ جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے، یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔

مولانا کو صرف ایک کالج جس کا نام دارالعلوم تھا، نظر آیا جو مولانا کے خیال میں دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا تھا، اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی پورے طور کا مہیا نہیں ہوا تھا، دارالعلوم کے علاوہ مولانا نے متعدد مدرسے اور کالج مثلاً مدرسۃ الحقوق، مدرسۃ الترحمہ، مدرسۃ الطب وغیرہ دیکھے اور ان کے متعلق مفید و مستند معلومات حاصل کیں۔

مصر میں سب سے زیادہ مولانا کی دلچسپی کی جو چیز تھی، وہ جامع ازہر تھا، مولانا نے اسی میں قیام کیا تھا، لیکن دورانِ قیام میں وہ جس نتیجے پر پہنچے، اُس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے ”مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا، کسی چیز سے نہیں ہوا“

ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد ۱۲ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بہ جائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے، تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں، اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش، ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے جن کے عزیز اور نہایت قریب عزیز (چچا ماموں وغیرہ) خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چونکہ طلبہ ازہر میں رہتے ہیں، اس لیے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی، طالب علموں کی دنائت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کھجڑے کو تم دلاتے جاتے ہیں کہ براس سیدنا الحسین یعنی تجھ کو امام حسینؑ کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا، کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے، ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں، ازہران سے بھی گیا گزرا ہے، اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے، یہاں مستقل اور اصلی طور پر صرف فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لیے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں، منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گو یا درس میں داخل نہیں، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی و بیان کی تعلیم ہے، لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلم کے کسی طرح شایان شان نہیں، مدارس کے ساتھ مولانا کا ایک بڑا مطبخ نظر کتب خانے تھے، مصر میں سب سے بڑا کتب خانہ خدیو یہ تھا، جو اب کتب خانہ مصر یہ کہلاتا ہے، مولانا نے اس کو جا کر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ ”ترتیب و خوش اسلوبی، زیب و زینت، حسن انتظام، خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے“ اس وقت اس کتب خانہ میں ہر علم و فن کی چودہ ہزار سات سو پانچ عربی کتابیں موجود تھیں، (اب تو اس کی تعداد اس سے دو گنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے) مولانا نے اس کتب خانہ کو بڑی تفصیل سے دیکھا، اور ہر علم و فن کے نوادر کتب کی ایک فہرست مرتب کی، جوان کے سفر نامہ میں موجود ہے، تاریخ و ادب جن نادر کتابوں کو مولانا نے اس وقت چنا تھا ان میں سے اکثر آج کل چھپ چکی ہیں، البتہ تفسیر اور حدیث کی جن کتابوں کے نام لیے ہیں، ان میں سے اکثر اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

مدارس اور کتب خانوں کے ساتھ مولانا نے مطابع، اخبارات، انجمن، کلب اور مصر کے عجائبات

وغیرہ دیکھے، مصر میں قدیم و جدید تعلیم ساتھ ساتھ جاری تھی اور دونوں تعلیم کے اکابر وہاں موجود تھے، مولانا اس موقع کو غنیمت جان کر دونوں سے ملے، نئے تعلیم یافتوں میں سے علی پاشا مبارک، علی پاشا ابراہیم، امین بک فکری اور احمد زکی سے اور پرانے تعلیم یافتوں میں سے شیخ حمزہ فتح اللہ اور شیخ محمد عبدہ، سے خاص طور پر ملے اور ان سے عربی تعلیم اور عربی مدارس کے نظام پر گفتگو کی۔

مصر میں عربی زبان پر جو نئے انقلابات آئے اور نئے خیالات، نئی چیزوں اور نئی باتوں کے لیے جو نئے عربی لفظ بن گئے تھے، یہاں مولانا کو ان کی واقفیت کا پورا موقع ملا، اور غالباً ہندوستان کی عربی دنیا میں عربی کے نئے نئے الفاظ کی واقفیت کا پہلا براہ راست ذریعہ مولانا ہی کی ذات تھی، مولانا نے اپنے سفر نامہ کے آخر میں بہت سے نئے الفاظ کی فہرست شامل کر دی ہے۔

صحت پر عمدہ اثر | مولانا کے اس سفر کی ایک ضمنی غرض صحت کی بحالی تھی، بحمد اللہ کہ اس سفر میں یہ غرض بھی پوری ہوئی، مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ ”میں نے دیکھا کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تن درست تھے، ایسی تن درستی پھر ان کو نصیب نہیں ہوئی۔“

واپسی اور سفر کے تاثرات اور نتائج | مولانا کا یہ علمی سفر مصر میں تمام ہو گیا، وہ وہاں سے سیدھے ہندوستان تشریف لائے اخیراً اپریل ۱۸۹۲ء سے ان کا سفر شروع ہوا تھا اور اسی سال کے شروع نومبر میں ختم ہوا، ان چھ مہینوں میں دنیائے اسلام کے ان ممتاز حصوں کو دیکھ کر جن کو اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، مولانا کے حساس دل کو اسلام کی گزشتہ علمی یادگاروں کو دیکھ کر جہاں مسرت ہوئی، وہیں مسلمانوں کی موجودہ پست حالت کو دیکھ کر ان کو بزارنج ہوا، قسطنطنیہ میں مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر مولانا نے اپنے والد ماجد کو لکھا، ”اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی و قوت کی نسبت بالکل برباد ہو گئی ہیں، کیوں کہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں تاہم سفر بے شبہ ضروری تھا، جو اس سفر سے میرے دل پر ہوا وہ ہزار کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا، انسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چار دیواری میں بسر ہو جاتی ہے۔“

ان نظروں سے اندازہ ہوگا کہ کیا چیز ان کو ہندوستان سے کھینچ کر اس بحر و بر اور دشت و جبل میں لے گئی تھی، ان کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لیے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا

۱۔ مضمون انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، ۱۷ جنوری ۱۹۱۵ء۔

نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی اور طریقہ تربیت اور درس گاہوں کا ماحول تمام تر مذہبی ہو، اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درس گاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر بٹ کر اس کی جگہ نئے علوم و فنون کی تعلیم لے لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پر رہیں، اور نصاب میں متاخرین کی شروع و حواشی کے بدلے قدما کی اصلی کتابیں جو فن کی جان ہیں پڑھائی جائیں، درس گاہیں عالیشان، رہنے کے کمرے صاف ستھرے اور ترتیب ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی، حوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو، لیکن یہ چیز ان کو نہ قسطنطنیہ میں ملی نہ شام میں اور نہ مصر میں، سفر نامہ میں لکھتے ہیں: ”اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی..... ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں نہ ہو، اس کی بے سرو سامانی قدرتی بات ہے، لیکن قسطنطنیہ، شام اور مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔ (ص ۸۷)

مولانا کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام و دستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا، جس نے دارالعلوم کا یہ مربع (مسودہ) جس کو سیاح روم و شام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے، اُس کو نظر آئے گا کہ روم و شام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے، اس کی تصویر ہندوستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا نے اپنے سفر نامہ کے شروع میں اپنے اس سفر پر خود تبصرہ کیا ہے، جس سے بہتر تبصرہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، فرماتے ہیں: ”ترکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا، اس کا یہاں ظاہر کرنا چنداں ضروری نہیں، اس سفر نامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے، البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے، وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں، کرتے نہیں، ہمت،

غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے کل قوم پر (من حیث الالغلب) افسردگی ہی چھائی ہوئی ہے، جو شخص جس حال میں ہے، اسی پر قانع ہے، موجودہ حالت تو یہ ہے لَعْلًا اللَّهُ يُخَدِّثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا۔“

کالج میں خیر مقدم | کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا، اس لیے جب مولانا ہندوستان واپس آ کر کالج میں پہنچے تو وہاں ہی سفر کی مبارک باد میں متعدد جلیے منعقد ہوئے، سب سے پہلے ۱۲ نومبر ۱۸۹۲ء کی شام کو اسکول اسٹاف کی طرف سے مولانا کو ایک دعوت دی گئی، جس میں سرسید اور کالج کے پروفیسر بھی شریک تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے ایک مختصر تقریر میں مولانا کے دور دراز سفر سے ہجرت واپس آنے کا شکر ادا کیا اور مولانا کے علوئے ہمت اور سفر کی تکالیف کی ہنسی خوشی برداشت کی تعریف کی اور ان کے ان احسانات کا ذکر کیا جو ان کی تحقیقاتِ علمی سے قوم اور قومی کالج کے لیے منظور تھے، اور آخر میں مولانا کو ”تمغہ جمیدی“ ملنے پر مبارکباد دی، ان کے بعد چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے جو ان دنوں وہاں فورٹھ ایر کلاس میں پڑھ رہے تھے، مندرجہ ذیل نظم پڑھی:

باز وقتِ گرمی بزمِ سخن آید ہی بلبلِ گم گشتہ در صحنِ چمن آید ہی
زیبتِ ہر بزمِ دزیبِ انجمن آید ہی آل ادیب و شاعر و ستورین آید ہی
مورخ

واپس آئے سیرِ روم و شام، مصروفِ نگ سے آشیاں بلبل کو لایا سینکڑوں فرسنگ سے
ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دیے تپ کی شدت تھی مگر کونین کھا کر چل دیے
ہجرتِ احباب سے دامن چھڑا کر چل دیے ایک فقرے سے ہمیں ڈھارس بندھا کر چل دیے
ہر چہ بادِ باد من کشتی در آب انداختم خانہ بر موج سمندر چوں حباب انداختم
اس کے بعد ۶ دسمبر ۱۸۹۲ء کو کالج اسٹاف کی طرف سے مولانا کو ایک شان دار ڈنڈا دیا گیا

جس میں مولانا نے ایک ترکیب بند پڑھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

قاصدِ خوشِ خبرِ امروزِ نوا ساز آمد کز سفرِ یارِ سفرِ کردہ ما باز آمد
از سفرِ شبلی آزادہ بہ کالج بہ رسید یا مگر بلبلِ شیراز بشیراز آمد
دوستانِ مرثدہ کہ آں بلبلِ خویش لہجہ دگر اندر یں تازہ چمنِ زمزمہ پرداز آمد
رفت ہر چند بے بے سرو سامان اتنا شکر ایزد کہ بایں برگ و بایں ساز آمد
پورا قصیدہ کلیات میں موجود ہے۔

سفر نامہ، کلیات اور رسائل

۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۷ء تک

سفر نامہ | اس سفر سے واپسی کے بعد احباب کا تقاضا ہوا کہ سفر کی سوغات لائیے، یعنی سفر نامہ لکھئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ سفر میں تو مولانا کو یہ خیال تھا کہ وہ اپنا سفر نامہ ترتیب دیں گے، چنانچہ ۲۵ مئی ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں ”حالات دلچسپ ہیں اور سفر نامہ کے لیے بہت سامان مل جائے گا“ (سرسید-۱) لیکن واپسی کے بعد مولانا نے احباب کے اصرار کے باوجود اس خیال کو ترک کر دیا، ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں ”سفر نامہ کے لیے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آئی شروع ہو گئی ہے، لیکن میرا ارادہ اب تک لکھنے کا نہیں ہے، جس کے متعدد اسباب ہیں“ (اسحاق-۲) مولانا نے ان احباب کی تشریح نہیں کی، لیکن ان متعدد اسباب میں سے صرف ایک سبب کا ذکر سفر نامہ کے شروع میں کیا ہے، یعنی یہ کہ سفر نامہ کے لیے جس قسم کی اطلاعات لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے، ان میں سے ایک چیز بھی اس سفر نامہ میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتد بہ واقعات ہیں، اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں، جس قدر ہونے چاہئیں، غرض جو شخص سفر نامہ کو سفر نامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہے، ان کی دعوت میں یہ حاضر پیش ہے۔

لیکن ان اسباب میں سے جو اصلی سبب تھا، اس پر اب بھی پردہ پڑا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس کے زمانہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دلچسپی ترکی کے ساتھ بڑھ رہی تھی، حالانکہ اس جنگ میں انگریزوں نے ترکوں کا ساتھ دیا تھا اور انہی کے اشارے سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کے لیے چندے کیے تھے اور بڑا جوش پھیلاتا تھا پھر بھی انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی کے ساتھ یہ عقیدت دل سے پسند نہ آئی، اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں کی ہمدردی سراسر یونانیوں کے ساتھ تھی، مگر کام یابی ترکوں کو نصیب ہوئی، اس کام یابی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر معمولی خوشی ہوئی، اور تمام ہندوستان میں دھوم دھام سے اس کی خوشی منائی

گئی، جس کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کا منہ چڑھایا گیا، اسی لیے سرسید نے جو ہر حال میں انگریزوں کو راضی رکھنا چاہتے تھے، مسلمانوں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا اور اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ٹرکی کی یہ عقیدت جاتی رہے اور اتحادِ اسلامی کی جو تحریک جڑ پکڑ رہی ہے وہ کم زور پڑ جائے۔

مولانا کا ٹرکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو، پھر بھی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان اور ٹرکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھی اور مولانا اسلامی ہندوستان کے پہلے سفیر تھے جو ٹرکی گئے۔

قطنطنیہ کے قیام کے زمانہ میں اپنے جوش و خروش کو پوری طرح دبانے کے باوجود وہ شیر پلو ناجزل عثمان پاشا تک پہنچ ہی گئے، اور وہاں سے ”تمغہ مجیدی“ کا تمغہ ہندوستان لائے، اس واقعہ نے اندر ہی اندر انگریزی حکومت کے اربابِ بست و کشاد کو چراغ پا کر دیا، اب جب مولانا واپس آئے تو اسلامی ہندوستان کے سیاسی مصلحت شناسوں کے حق میں یہ سمجھا گیا کہ معلوم نہیں اس سفر نامہ میں کیا کیا زہر ہوا اور اس کا اثر کالج کی زندگی پر جو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی، کیا سا پڑے۔

بہر حال جب یہ طے ہو گیا کہ اس سفر نامہ میں شہد ہی شہد رہے گا، کوئی زہریلی چیز نہ ہوگی، تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی اور لکھا گیا، ۲۶ مارچ ۱۸۹۳ء کو لکھتے ہیں ”میں آج کل محدود رہا، پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سفر نامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ٹرکی کی محبت کا نیا بیج نہیں بودیا“ اور اسی لیے انگریزوں نے مولانا کے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا، جس کی تفصیل آگے کہیں آئے گی۔

مولانا کو خیال تھا کہ اس ادھ کئے سفر نامہ سے لوگوں کو پوری دلچسپی نہیں ہوگی، اسی لیے اس کی مقبولیت کی طرف سے دل میں شبہ تھا، ۱۱ اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں ”معلوم نہیں اس سفر نامہ سے ملک کو کہاں تک دلچسپی ہوگی، اس کا اندازہ ہوتا تو اسی حساب سے جلدیں چھپتیں، اب تک مولانا کی ساری تصنیفات کالج نے اپنی طرف سے چھپوائی تھیں، مگر یہ سفر نامہ ان احتیاطوں کے باوجود بھی شاید اس بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ٹھہرا، اس کا پہلا اڈیشن مفید عام آگرہ میں جو اس زمانہ کا اچھا مطبع تھا، ۱۸۹۴ء میں چھپا، مہدی افادی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں ۲۷ اکتوبر ۱۸۹۴ء کو لکھتے ہیں ”سفر نامہ میرے ہاں سے ملتا ہے، مگر میں آج سفر میں تھا، اب علی گڑھ پہنچا ہوں، لیکن سر دست اس کی جلدیں یہاں نہیں رہیں، آگرہ کو لکھا

ہے کہ جس وقت کتابیں آئیں گی، فوراً تعمیل ارشاد ہوگی، آپ تار وار نہ سمجھیں۔“ (مہدی افادی-۶) یہی وہ کتاب ہے جس سے کالج اور مولانا کی تصنیفات میں ہذا فداق بیسیں و بیفک کا اصول جاری ہوا اور مع من تو شدم تو من شدمی من تن شدم تو جاں شدمی کی پرانی شریعت منسوخ ہوئی۔

کلیاتِ فارسی ۱۸۹۳ء | ابھی اس زمانہ کو کچھ زیادہ نہیں گزرے تھے، جب فارسی کا ایک دیوان اس عہد کے اہل ذوق کے سلسلہ تصنیفات کی پہلی کڑی ہوئی تھی، اسی لیے مولانا کو اپنی فارسی نظموں کے جمع اور طبع کرنے کا خیال بہت دنوں سے تھا، مگر چوں کہ طبیعت میں ابھی جھجک باقی تھی، اس لیے چاہا کہ سارا کلام استاد کی نظر سے گزر جائے، کالج میں جانے کے دوسرے ہی سال ۲۷ مارچ ۱۸۸۴ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھا ”میں نے حضرت مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کسی قدر چھاپا جائے گا، اس واسطے اگر آپ اُسے دیکھ لیں تو بہتر ہے، حضرت موصوف نے منظور فرمایا ہے، میرے پاس جو کلام ہے میں بھیج دوں گا، مگر فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمہارے پاس ہیں، نہایت جلد مولانا کے پاس اس نشان سے بھیج دو، بلیا، ’عدالتِ منصفیہ‘ مولانا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے، ان کے کلام کا ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا، مولانا نے غازی پور میں ایک جلد ساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دی تھی، اور وہ وہاں سے غائب ہو گئی، لوگوں کو غازی پور کے ایک نوجوان فارسی شاعر ابوالقاسم عرقی مرحوم پر شبہ تھا، جو بعد کو حیدرآباد میں شعرا کے سلسلہ میں منسلک ہو گئے تھے، اور جوانی ہی میں وفات پائی، لوگ کہتے تھے کہ وہ انہی نظموں کو حیدرآباد میں اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے۔“

پھر اسی قسم کا واقعہ ۱۸۸۷ء میں پیش آیا اور کسی نے مولانا کی بیاض کے آدھے حصہ پر ڈاکہ ڈالا، ۱۷ جولائی ۱۸۸۷ء کو ایک عزیز کو لکھتے ہیں ”میری بیاض کا تقریباً آدھا حصہ چوری ہو گیا، نہایت افسوس ہے“ (سیح-۲۴) مولانا نے کالج میں آکر جو قصائد لکھے اور خصوصیت کے ساتھ سفرِ روم میں جو نظمیں لکھیں، اُس نے فارسی کے اہل ذوق میں آگ سی لگا دی، اردو میں نئی شاعری کی بنیاد خواہ مولانا ساحلی نے ڈالی ہو یا شمس العلماء آزاد نے، مگر ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی اور اُس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی، مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے آبِ حیات بن گئی۔

۱۔ بیروایت میں نے جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب (برادرِ نسبی نواب سید علی حسن خاں) سے سنی جو مولانا کے پرانے دوست ہیں۔

مولانا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب نے جو خود بھی فارسی کے شاعر اور اس زبان کے جوہری تھے، مولانا کو لکھا کہ ”وہ ان انمول موتیوں کا ہاراہل نظر کے بازار میں پیش کرنا چاہتے ہیں، یعنی وہ خود اس کو چھپوانا چاہتے ہیں“ مولانا نے یہ سمجھ کر کہ شاید وہ اس طرح میری امداد کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس خط کا برامانا اور ان کو لکھا کہ ”ہم لوگ اتنے سستے داموں نہیں بکے“ نواب صاحب نے دوبارہ لکھا کہ مقصود یہ نہیں ہے، بلکہ آپ کی متفرق نظموں کے جمع اور طبع کرنے کی تحریک کرتا ہوں، مولانا نے ان کی اس تجویز کو پسند کیا، نواب صاحب نے ان کے کلام کا جو حصہ جمع کیا تھا، ان کے پاس بھیج دیا، کچھ اخباروں سے جمع ہوا، اپنے وطن میں ایک عزیز شاگرد کو ۲۶ مارچ ۱۸۹۳ء کو یہ لکھا ”میرا مجموعہ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لیے گیا اور امید ہے کہ جلد تیار ہو جائے“ اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہو سکا، اشعار جمع کیے گئے، جس کے محرک بلکہ جامع نواب سید علی حسن خاں فرزند نواب صدیق حسن خاں مرحوم ہیں۔

میاں مہدی کے واپس آنے پر میں نے مشن اسکول کے جلسہ کے لیے ایک نظم لکھی تھی ”آمدہ“ اس کی ردیف ہے، اگر تم اس کو بہم پہنچا کر بھیج دو تو وہ بھی چھپ جائے، تمہارے ذریعہ سے اگر اس مجموعہ میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہو تو اٹھانہ رکھو، لیکن اس کے ساتھ جلدی شرط ہے، کیوں کہ عید تک چھپ کر شائع ہو جانا مقصود ہے“ (سیح-۳۳) مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس سے کچھ سرمایہ نہیں نکلا، آمدہ والی نظم بھی دیوان میں شامل نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بھی نہ مل سکی، مہدی مرحوم اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ولایت گئے تھے، اسی لیے اسی زمانہ میں یہ نظم کہی گئی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے قصداً اپنے کلام کا انتخاب بڑی بے دردی سے کیا اور صرف وہی نظمیں اور غزلوں کے وہی شعر لیے جو ان کے انتخاب میں آئے، جیسا کہ دیوان کے حصہ تشبیب و غزل کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ”چہ کتم“ والی غزل کے بھی دوہی ایک شعر لیے،

۱۔ بہ روایت جناب خولید سید رشید الدین صاحب ۲۔ اس نظم کے دو شعر مہدی مرحوم کی تعلیم کے سلسلہ میں اوپر لکھے گئے ہیں:

خار در دیدہ عددو شکنی حاسداں راج گر گداز آئی

ما بہ نا دیدہ در رہت ہاشیم کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

عجب نہیں کہ اسی نظم کے چند اشعار کو خفیف رد و بدل کے ساتھ عطیہ فیض بیگم کے سفر یورپ کے موقع پر ان کو لکھ کر بھیجے تھے جو خطوط شبلی میں موجود ہیں۔

اور خود انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں اس میں جگہ پائیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مدنیہ نظمیں جو صرف کالج کے خیال سے بعض امرا کے خیر مقدم یا مرثیہ میں لکھیں وہ چون کہ طبعِ غیور پر بارتھیں، اس لیے ان کو بقائے دوام کا خلعت پہنانا نہ چاہا۔

بہر حال اس قطع و برید کے بعد ایک مختصر سا مجموعہ ”نظمِ شبلی“ مرتب ہوا، اور نثری رحمت اللہ صاحب رعد کے نامی پریس سے جو ان دنوں اپنی صفائی اور چھپائی کے حسن و خوبی میں ممتاز تھا، بڑے اہتمام سے چھپا اور اہل ذوق میں مقبول ہوا۔

رسائلِ شبلی | ۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۸۹۸ء تک مولانا کے قلم سے بہت سے محققانہ تاریخی مضامین نکلے اور ملک کے مشہور رسالوں میں چھپے، یہ مضامین زیادہ تر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے متعلق تھے، ان میں یا تو اسلام کے آئینہ سے اس گرو و غبار کو صاف کیا گیا ہے، جو یورپین تعصب کی آندھی نے اس پر ڈالا تھا یا مسلمانوں کے عہد زریں کے مرقع کی کوئی پرانی تصویر جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، دوبارہ منظر عام پر لائی گئی ہے۔

یورپ نے تمام علمی دنیا میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انہوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے وہاں قائم تھا، جلا کر خاک کر دیا اور دنیا گزشتہ انسانی دماغوں کے معلومات سے محروم رہ گئی، مولانا نے اس کی تردید میں ۱۸۹۲ء میں کتب خانہ اسکندریہ پر مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے فتح مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، اس لیے یہ مسلمانوں پر سراسر افترا ہے اور اس افترا کا بانی چھٹی صدی ہجری کا ایک عیسائی مورخ ابوالفرج معلیٰ ہے، اس مضمون کے ساتھ مسٹر کرمل وغیرہ بعض یورپین مستشرقوں کے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شائع ہوئے جن میں مسلمانوں کے سر سے اس الزام کی تردید کی گئی تھی، یہ مضمون اتنا جامع اور مدلل تھا کہ مخالفین تک کو بھی اس کے ماننے سے چارہ نہ رہا، اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا۔

مولانا کے اس مضمون کے بعد سے خود یورپ کے عیسائی فاضلوں نے اس الزام کی تردید میں بہت سے فاضلانہ مضامین لکھے ہیں، جن میں اکثر کے ترجمے الندوہ لکھنؤ، معارف اعظم گڑھ، اردو حیدرآباد وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں اور اب کوئی لکھا پڑھا آدمی اس الزام کو نہیں ڈہراتا۔

اسی سال ۱۸۹۲ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور علمی رسالہ ”حسن“ میں اسلامی کتب خانوں کی تاریخ پر مولانا کا محققانہ مضمون شائع ہوا اور معلوم ہوا کہ دنیا کے کس کس حصہ میں مسلمانوں نے علم و فن کی کتنی دولت جمع کی تھی، رسالہ کے دستور کے مطابق مولانا کو اس مضمون پر ایک اشرفی انعام ملی۔

۱۸۹۳ء میں علی گڑھ میگزین کی ایڈیٹری کی ذمہ داری جو مولانا کے سر ڈالی گئی اس سے مجبور ہو کر بھی مولانا کو اس زمانہ میں متعدد مضامین لکھنے پڑے، جن میں ایک ”اسلامی حکومتیں اور شفا خانہ“ والا مضمون ہے، جو جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں چھپا اور اسلامی سلطنتوں کے تمدنی شعبوں کے سلسلہ کا ایک حلقہ بنا۔

مسلمان بادشاہوں پر بڑا الزام تھا کہ انہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر جزیہ کا ظالمانہ ٹیکس لگا کر بڑی توہین کی، ہندوستان کی تاریخوں میں بھی اُس کو بار بار دہرایا گیا ہے، تا کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت بیٹھ جائے، مولانا نے رسالہ ”الجزیہ“ لکھ کر اس خوبی سے اس کی حقیقت واضح کی کہ علمی دنیا پر اس تحقیق سے حیرت چھا گئی، سرسید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اور خود مولانا نے اپنے قلم سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس طرح مشرق و مغرب دنیا کے دونوں حصوں میں یہ آواز پھیل گئی، یہاں تک کہ مصر کے مشہور اخباروں، رسالوں اور تصنیفوں میں اس کے خلاصے اور اقتباسات چھپے۔

۱۸۹۶ء کے شروع میں ترکی کے صوبہ آرمینیا میں بغاوت ہوئی، تو ترکوں نے اس کو بزور دبا یا، اس پر یورپ کے اخباروں نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ اسلام نے ہمیشہ اپنی غیر مسلم رعایا پر ایسا ہی ظلم کیا ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں مسئلہ آرمینیا پر ایک سیاسی مضمون ۲۱ فروری ۱۸۹۶ء کے اخبار ”آزاد“ لکھنؤ میں چھپوایا جس میں ترکوں کے عدل و انصاف اور آرمینیا کے مسئلہ کی حقیقت ظاہر کی، ساتھ ہی اس عنوان پر کہ ”اسلام کے قانون میں ذمی (غیر مسلم) رعایا کے کیا حقوق ہیں“، ایک نہایت مفصل مضمون لکھا جو علی گڑھ میگزین کے مارچ اور اپریل ۱۸۹۶ء کے پرچوں میں چھپا اور شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

الغرض ۱۸۹۶ء تک اس قسم کے اہم مضامین کا ایک مجموعہ فراہم ہوا اور رسائلِ شبلی کے نام سے ملک میں شائع ہوا، مولانا کے قلم سے یکم فروری ۱۸۹۸ء کا لکھا ہوا، مقدمہ اس میں لگا ہوا ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان مضامین کے لکھنے کا کیا باعث ہوا، فرماتے:

”مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا نغلمہ سب سے پہلے اس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ

کہلاتا ہے، اگرچہ اس مقصد کے لیے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا، لیکن چون کہ قوم کو حوصلہ افزائی اور غیرت دلانے کے لیے اس سے زیادہ کوئی افسوں کا رگ نہ تھا، کہ ”تمہارے اسلاف نے یہ یہ کارہائے نمایاں کیے تھے، تم کو بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، اس لیے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے، تو خواہ مخواہ ان کو اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا، رفتہ رفتہ ان پر فخر واقعات کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہوتی گئی، یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتدا ہوئی اور بعض بعض اہل قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے لیکن چون کہ یہ ان کا اصلی کام نہ تھا اس لیے جو کچھ ہوا وہ ایک سرسری کارروائی سے زیادہ نہ تھا۔“

اسی اثنا میں ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک سے میں نے ایک رسالہ لکھا جس میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی کیا کیا زبانیں سیکھیں اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم و فنون کے ترجمے کیے، نیز یہ کہ مسلمانوں نے دنیا میں ہر جگہ کس قدر بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم تعمیر کیے، یہ رسالہ اگرچہ نا تمام تھا، یعنی پہلی بحث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا، تاہم چون کہ ہماری زبان میں اس وقت تک اس مضمون کے متعلق اس قدر سرمایہ بھی نہیں مہیا ہوا تھا، نہایت مقبول ہوا اور یونانی تراجم کی صدائیں تمام ملک میں گونج اٹھیں۔

قبول عام کی بنا پر مجھ کو خیال ہوا کہ قوم میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہو گیا ہے، جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہے، لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دھوکا تھا، مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخوان فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے، اس لیے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے خواہ مخواہ اس کو قبول ہو جاتا ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود اس شور و غل کے جو اسلامی ترقیوں کی نسبت کیا جاتا ہے، تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، بلکہ وہی چند واقعات ہیں جو سیکڑوں پیرایہ میں بار بار بیان کیے گئے ہیں، اور کہے جاتے ہیں، نئی تحقیقات کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔

قوم کی بد مذاقی کے خیال نے مجھ کو بالکل افسردہ کر دیا تھا، لیکن یورپ میں جو اورینٹل کانفرنس قائم ہے، اس کی کارروائیوں نے ایک نئی تحریک دل میں پیدا کی، اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جس میں مسلمان بھی داخل ہیں) ہر قسم کی علمی و عملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے، چنانچہ

پہلے سال جو اس کا اجلاس ہوا اس میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم و ادب، فلسفہ اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ تیار کیا جائے، کانفرنس کے سلسلہ سے الگ یورپ میں اور بھی بہت سے لوگ اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک جرمنی عالم نے نہایت تحقیقات کے ساتھ ایک مبسوط کتاب اس عنوان پر لکھی ہے، کہ مسلمانوں نے خاص علم طب کی کیا کیا کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں، یہ دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ جو کام اور قومیں کر رہی ہیں، وہ دراصل ہمارا کام ہے اور یہ بے غیرتی کی بات ہے کہ ہم اپنے کام میں دوسروں کا احسان اٹھائیں، اس خیال سے میں نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا اور مختلف عنوانوں پر مضامین لکھے۔“

مصر کے عیسائی مؤرخ جرجی زیدان نے ”تمدنِ اسلامی“ کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کی تیسری جلد اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر ہے، بدگمانی نہیں کرتا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے، اور ان ہی کو دیکھ کر اسی رنگ سے واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے، اُس نے یہ مرقع تیار کیا ہے۔

الفاروق کی تصنیف پر اختلاف رائے ۱۸۹۳ء | مولانا نے الفاروق لکھنے کا ارادہ المامون کے بعد ہی کیا تھا، بلکہ کچھ لکھ بھی لیا تھا اور اس کی شہرت لوگوں میں پھیل چکی تھی، لیکن تاریخِ طبری جو اس کے لیے بہت ضروری کتاب تھی، وہ چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، اس لیے کچھ دنوں کے لیے رُک جانا پڑا، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں جو جنوری ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی وہ رقم طراز ہیں:

”المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض

مجبوریوں سے چند روز کے لیے اُس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینیوں نے عجیب عجیب

بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے ضروری ہیں، اور یورپ

میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں۔“

کوتاہ بینیوں کی جن بدگمانیوں کی تردید اس بیان میں مولانا نے کرنی چاہی ہے، اُن میں سے کم از کم ایک بدگمانی بے اصل نہ تھی اور وہ کالج کی وہی مصلحت بینی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سنی اور شیعہ کا فرق پیدا کر دے، اُس زمانہ میں کالج کے ہمدردوں میں سب سے قابلِ تعظیم نام نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کا تھا، ہر سید کا خیال تھا کہ چوں کہ وہ شیعہ ہیں اس

لیے یہ کتاب کالج سے ان کی بد مزگی کا سبب ہوگی، یہ بات اندر ہی اندر چل رہی تھی اور ہنوز فیصلہ نہیں ہو پایا تھا، لیکن مولانا نے اس کے لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، اس لیے وہ اس مصلحت پر کاربند ہونا نہیں چاہتے تھے، بالآخر یہ طے پایا کہ یہ مسئلہ خود نواب صاحب ممدوح کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

چنانچہ سرسید نے ان کو خط لکھا، ان کا جواب جیسا کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا، یہ آیا کہ اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے، اور حریف ہے کہ اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے، اور ساتھ ہی مولانا شبلی کی تعریف و تحسین بھی کی۔

اتفاق سے سرسید کے خطوط میں نواب عماد الملک کے نام ایک خط لکھا گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب عماد الملک کو الفاروق کی تالیف سے جتنا اختلاف تھا، اس سے زیادہ خود سرسید ہی کو تھا، یہ خط کافی بڑا ہے، مگر پڑھنے کے لائق ہے، یہ خط ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء کا ہے، ابتدائی تمہید کے بعد ہے:

”جناب مولوی شبلی صاحب کی نسبت جو فقرہ آپ نے تحریر فرمایا تھا، وہ میں نے ان کو سنایا ان پر چار

حالتیں گزریں، جب تک میں پڑھتا رہا حیرت میں رہے اور تردد رہا کہ درحقیقت یہی الفاظ لکھے ہیں، پھر

میں نے ان کو وہ خط دیا کہ اس فقرہ کو وہ خود پڑھ لیں، جب کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ وہی الفاظ ہیں تو ان کو

ندامت اور افتخار اور سرسید تین حالتیں ایک ساتھ جمع ہو گئیں، ندامت تو اس لیے تھی کہ وہ اپنے نزدیک اپنے

تئیں اس لائق نہیں سمجھتے، جس طرح ان کی نسبت آپ نے اپنے خیالات ظاہر فرمائے، افتخار اس لیے تھا کہ

آپ جیسے شخص نے ان کی تصنیفات کی اس قدر قدر فرمائی اور درحقیقت ان کا یہ فخر نا واجب نہ تھا، فلاں وہماں

کی واہ واہ سے ننان کا دل خوش ہو سکتا اور نہ کچھ فخر ہو سکتا تھا، بلاشبہ آپ کی قدر دانی باعث افتخار ہو سکتی ہے،

سرت ان کو بے انتہا اس لیے ہوئی کہ چون کہ وہ آپ کی نیک طبیعت اور مزاج سے واقف نہ تھے، ان کو دل

میں افسوس تھا کہ آپ ان کی پہلی تحریرات سے کسی قدر آرزوہ خاطر ہیں، دفعہ ان کا وہ خیال زائل ہو گیا اور

بے انتہا سرت ان کو ہوئی، میں نے آپ کا نام کسی قدر بے ادبی سے لیا، کیوں کہ اس وقت جو میرے دل

۱۔ اس کی تائید مولانا شروانی کے ایک بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں، ”مولانا جب سرسید کے روکنے سے الفاروق لکھنے کا مصمم ارادہ ترک نہ کر سکے تو سرسید نے عماد الملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو، انہوں نے جواب میں لکھا کہ، ”اسلام میں دین و دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے، لہذا ان کی سوانح لکھنے سے مولوی شبلی کو ضرر کیے۔“ سرسید نے یہ خط مولانا کے سپرد کر دیا کہ وقت پر کام آوے، یہ واقعہ خود سرسید نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ ”شروانی“

میں آیا، اسی طرح آپ کا نام لینا ادب تھا، میں نے کہا تم سید حسین کو نہیں جانتے، میں نے آج تک ان کا سا نیک دل اور پاک باطن، ظاہر و باطن، حاضر و غائب یکساں، سچا دوست اور ہمہ تن سچائی کسی کو نہیں دیکھا، رنج و کدورت کی ان کے دل میں خدا نے جگہ ہی پیدا نہیں کی، الفاروق کی نسبت جو آپ نے تحریر فرمایا وہ سب درست ہے، مگر اس کے ساتھ فیہ مافیہ بھی ہے، اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ اس فیہ مافیہ کو بھی صاف صاف مثل ایسے مورخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو، لکھے تو بلاشبہ نہایت عمدہ بات ہے، مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے، اگر نہ کریں گے تو کتاب ردی ہوگی، یہی حال اعلیٰ کا ہے، خلافت کی نسبت بدحیثیت انتظام مکی کیا لکھا جاوے اور کون لکھ سکتا ہے، میں تو ان صفات کو جو ذاتِ نبوی میں جمع تھیں، دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوں، ایک سلطنت اور ایک قدوسیت، اول کی خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی، دوسری کی خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ وائمہ اہل بیت کو، مگر یہ کہہ دینا تو آسان ہے، مگر کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب چیزوں کو عارت کر دیا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تو صرف بہ رائے نام بزرگ آدمی تھے، پس میری رائے میں ان کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے، جو ہوا سو ہوا، جو گزرا سو گزرا۔“

ان باتوں کے باوجود الفاروق کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ لکھے جانے سے پہلے ہی ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا، یہ دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کی توجہ تام سے فوری فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے، چنانچہ سرسید ہی کے حلقہ کے ایک صاحب منشی سراج الدین صاحب بیرسٹر راولپنڈی نے ۱۸۹۳ء میں ’سیرۃ الفاروق‘ کے نام سے ایک کتاب لکھ کر بازار میں پیش کر دی، الفاروق کے مشتاقوں کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور بعضوں نے اس کو منشی سراج الدین صاحب کی بدینتی پر محمول کیا، اس موقع پر سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء میں لکھا ہے جس میں مولانا کی تعریف و توصیف اور منشی سراج الدین صاحب کی اس حرکت پر افسوس کے بعد الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں اپنی رائے بھی بے پردہ ظاہر کر دی ہے ”اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیرہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیرہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ ”فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّمْلَةٍ“ تو کچھ تعجب نہ ہوگا، جزیرہ کا ایسا بے جا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک

کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا، ان جرہ الاعلیٰ اللہ بایں ہمہ انہوں نے مثل علمائے متقدمین باخدا الذین لا ینظرون الی الدنیا وحطامہا بل ینظرون الی رحمة اللہ وبرکاتہ والی حالۃ القوم واصلاحہا، کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا بلکہ بالکل یہ مدرسۃ العلوم کو دے دیا، اور جب ان کی حالت معاش پر نظر کی جاوے تو ان کی یہ فیاضی بھی بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی با وقعت ہو جاتی ہے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیت علم اور کیا بلحاظ عمدگی تالیف اور کیا بہ نظر طریقہ ترتیب مضامین میں یادگار سلف ہے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت کچھ اس کا سامان بھی جمع کیا تھا، جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے، نہ ہر ایک شخص کا کام ہے، ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے، تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب کو بلاشبہ مناسب نہ تھا کہ اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے، بلکہ اس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی۔

ہیروز آف اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی لائف کا لکھنا ایک بہت بڑا نازک کام ہے، ممکن ہے کہ ان کی لائف اس طرح لکھی جاوے جو انسانوں کے لیے باعث رحمت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ باعث آفت ہو، یا اس طرح پر پوری لکھی جاوے کہ دونوں فریق سنی و شیعہ کو بہ جز گمراہی کے اور کچھ حاصل نہ ہو۔

سب سے مقدم یہ بات ہے کہ اول اس کا لکھنے والا شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے اور سچا ہسٹوری بن کر ان کی لائف لکھے یا یہ کرے کہ ان امور کو جو دونوں فریق میں متنازعہ فیہ ہیں مطلق نہ چھیڑے اور ان واقعات اور حالات کو اور ان کی اس خصلت و انتظامی قوت کو اور اس برکت کو لکھے جو ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی دنیا کو پہنچی جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے کہ اُس کے ہر ایک فعل کو دو پہلو نیک اور بد سے تعبیر نہ کیا جاسکے، یہ مشکل اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے جب کہ کسی اکابر دین کی جیسے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں، لائف لکھی جاوے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لائف لکھنا ایسا آسان کام نہیں تھا، جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب نے سمجھا، مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے، جب بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے غلطی کی جو کام ان کو نہ

کرنا چاہیے تھا انہوں نے کیا، بلکہ وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے خمدوم و خید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے، مگر کسی بد نیتی یا طمع نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں، نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں اور نہ درست سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک مضمون پر ایک شخص نے کتاب کا ارادہ کیا، اس مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی، اس میں نقصان کیا ہوا، بلکہ جب دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا اور یہ صادق آوے گا، فتقبل من احدہما ولم يتقبل من الآخر یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بے دل ہو گئے ہیں، اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہے، اگر اہل ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر زالی ہوگی، بس ان کو کیا پرواہ ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہے۔

مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگانِ دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے ان کی لائف لکھیں، ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ ان سے متفق ہیں، وہ لوگ فادر آف اسلام ہیں، نہ ہیروز آف اسلام اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں، ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد ”الغزالی“ یعنی لائف امام غزالی کی لکھ دیں، جو نہایت دلچسپ اور بے حد مفید ہوگی، خدا ان کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں، اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو وہ کریں، لیکن اگر اس کے بعد بھی انہوں نے الفاروق لکھی تو ہم اس وقت ان کو کہیں گے جو کہیں گے۔“

ان تمام حوصلہ شکن واقعات کے باوجود مولانا اپنے عزم سے باز نہ آئے، ۱۱ اپریل ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”الفاروق انشاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا لیکن وقت کی تعیین نہیں کر سکتا۔“ (صفحہ ۳۵)

آخر اگست ۱۸۹۴ء کو مصنف نے اس کتاب کے لکھنے کا قطعی فیصلہ کر لیا، مولانا نے یہ واقعات الفاروق کے دیباچہ میں لکھے ہیں ”الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا تھا، اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا، تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا بھی تیار نہیں ہو چکے تھے کہ

تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔

ادھر ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رک گیا اور اس کے بہ جائے دوسرے کام چھڑ گئے، چنانچہ اس اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں، لیکن جو نگاہیں فاروق اعظم کے کوکبہ جلال کا انتظار کر رہی تھیں ان کو کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہو سکتی تھی، سوء اتفاق یہ کہ الفاروق کی طرف بے دلی کے بعض ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ میں نے اس تصنیف سے گویا ہاتھ اٹھالیا تھا، لیکن ملک کی طرف سے تقاضا کی صدائیں رہ رہ کر اس قدر بلند ہوتی تھیں کہ میں مجبوراً قلم ہاتھ سے رکھ کر اٹھالیتا تھا، بالآخر ۱۸ اگست ۱۸۹۴ء کو میں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور مستقل اور مسلسل طریقے سے اس کام کو شروع کیا، ملازمت کے فرائض اور اتفاقی موانع و قناتو قناب بھی سدّ راہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ متعدد دفعہ کئی مہینے کا ناعد پیش آ گیا، لیکن چون کہ کام کا سلسلہ مطلقاً بند نہیں ہوا، اس لیے کچھ نہ کچھ ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافرنے کچھ دنوں کے لیے آرام کیا۔

شکر کہ جہازہ بہ منزل رسید زورقی اندیشہ بہ ساحل رسید

شمس العلماء کا خطاب جنوری ۱۸۹۴ء | مولانا کی شہرت کا آفتاب اب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا اور لوگوں کو یہ علانیہ نظر آ رہا تھا کہ ہمارے ملک کے اس نادرہ روزگار کی قدر افزائی سلطان روم تو فرمائیں اور انگریزی گورنمنٹ ان کی قدر شناسی کی توفیق نہ پائے، اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحاد اسلامی کے مبلغ اور سلطان روم کے سفیر بن کر ہندوستان آئے ہیں، اس لیے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ سلطان روم کے اس فرضی سفیر کو ممنون منت بنایا جائے، اس کے لیے ابتدا خود سرسید کی طرف سے ہوئی، ڈپٹی سید زین الدین صاحب (علی گڑھ) کا (جو اس وقت کالج کے اونچے درجہ کے طالب علم ہوں گے) یہ بیان ہے کہ سرسید نے ان ہی سے انگریزی میں ایک چٹھی لکھوا کر گورنمنٹ میں بھیجی کہ مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدر دانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغہ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہے اس فرض سے غافل رہے، اس کے بعد جوہوا وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۴ء کو مولانا کو شمس العلماء کا خطاب دینے کا اعلان کیا۔

مولانا کو شمس العلماء کا خطاب ملنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا جس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا

لیکن چون کہ سرسید کے کالج میں اس کے کسی پروفیسر کو سرکاری خطاب ملنے کا پہلا واقعہ تھا اور سرسید کے رفقا میں اس خطاب کی پہلی نظیر تھی، اس لیے اس سے اپنے مقاصد کے اشتہار کا کام لیا گیا، اس وقت تک یہ خطاب نا اہلوں کو نہیں ملا تھا، اس لیے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی اچھی خاصی وقعت بھی تھی، پھر مولانا کو جس سن و سال میں یہ خطاب ملا یعنی ۳۶-۳۷ سال کی عمر میں، ان کے پیش روں اور ہم عصروں میں اتنی کم عمر میں کسی کو نہیں ملا تھا، ان مختلف اسباب نے مل کر اس کو ایک خاص اہم واقعہ بنا دیا اور اس لیے تبریک و تہنیت کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں ملک کے اکابر نے تقریریں کیں، معززین نے مختلف گوشوں سے مبارک باد کے تار اور خط بھیجے اور اخباروں نے تہنیت کے مضامین لکھے۔

کالج میں اخوان الصفا اور لجنہ الادب دو علمی مجلسیں تھیں اور مولانا ان دونوں کے رکن رکین تھے اس لیے ان دونوں نے مل کر ۱۹ جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک بہت بڑا جلسہ ترتیب دیا، جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اکابر سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب منزل اللہ خاں..... پرنسپل پروفیسر آرنلڈ (سکرٹری اخوان الصفا اور جسٹس) سید کرامت حسین جو اس وقت وہاں قانون کے پروفیسر اور مجلس اخوان الصفا کے رکن اور لجنہ الادب کے صدر تھے، شریک تھے۔

حاضرین کی متفقہ خواہش سے نواب محسن الملک اس جلسہ کے صدر قرار دیے گئے اور انہوں نے کھڑے ہو کر حسب ذیل تقریر کی۔

”جناب سرسید و سید محمود صاحب و حاضرین! جو خوشی اس وقت جلسہ میں شریک ہونے اور اس صحبت کے دیکھنے سے ہوئی اس کا اظہار مشکل ہے، صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ دوستوں کا جمع ہونا، احباب کا ملنا، خود ایک ایسی دل خوش کن چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر دوسری چیز اس دنیا میں خیال نہیں کی جاتی، پھر جب کہ وہ ایسے مقصود کے لیے ہو جس کے واسطے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں یعنی اپنے ایک معزز دوست کے خطاب پانے اور جو اعزاز گورنمنٹ نے اسے بخشا ہے، اس پر مبارک باد دینے کے لیے تو اس خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں، ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا فخر ہے، دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے، اگرچہ بہ ظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں، اور اس لیے

۱۔ مولانا نظیر احمد صاحب کو یہ خطاب ۱۸۹۶ء میں اور مولانا حالی کو اس سے بھی بہت بعد ملا۔ ۲۔ اس جلسہ کی یہ پوری روداد اس زمانہ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی، اسی سے ہم نے نقل کیا ہے۔

میں اس وقت اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھ کر اپنے اور عزیز طالب علموں کی طرح اس خوشی میں شریک ہوا ہوں، اے میرے عزیزو! طالب علم کے لیے ضروری نہیں کہ وہ نوجوان اور نوجوان ہو، نہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ بغل میں کتاب دبا کر مدرسہ میں پڑھنے کے لیے حاضر ہوتا ہو، بلکہ طالب علم وہ ہے جسے علم کا شوق ہو، اور جو علم کا طالب ہو، پس اے میرے عزیزو! میں کسی سے علم کی طلب اور علم کے حاصل کرنے کے شوق میں کم نہیں ہوں، بلکہ جس قدر میری عمر زیادہ ہے، اسی قدر تحصیل کے شوق میں تم سے بڑھ کر ہوں، اس لیے میں تمہارے فرقہ میں داخل ہوں، مجھے امید ہے کہ تم میرے اس دعویٰ کو تسلیم کرو گے اور اپنی جماعت میں داخل کرنے سے انکار نہ کرو گے، اے میرے عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمہارے ہی استاد نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے، اگر تم نے چند قاعدے صرف و نحو کے ان سے سیکھے یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر سے بڑے فائدے حاصل کیے ہیں، کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھ سے ہوتا ہو، یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ مہری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو، اس لیے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بہ حیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بہ حیثیت ایک طالب علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا ہے، مبارکباد دیتا ہوں، اے میرے عزیزو! اور اے میرے دوستو! درحقیقت میں نے اس مبارک باد دینے میں ذرا جلدی کی، درحقیقت مجھے اول اپنی گورنمنٹ کو مبارک باد دینی چاہیے، جس نے ایسے مستحق شخص کو خطاب دینے سے دراصل اس خطاب کو عزت بخشی جو ہمارے مولانا کو اس نے دیا ہے اور اپنے امتیاز کی اس قوت کو ثابت کیا جو اس انتخاب میں اس نے ظاہر کی ہے، درحقیقت مولانا مولوی شبلی صاحب کا خطاب دینا وضعِ اشیء فی محلہ ہے، اس لیے سب سے پہلے چاہیے کہ میں گورنمنٹ کو مبارک باد دوں، اس کے بعد قوم اس مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس میں ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو درحقیقت علم کے آفتاب ہیں اور جن کو شمس العلماء کہنا ایک امر واقعی ہے پھر مدرسہ العلوم کو مبارک باد دینا چاہیے کہ اس میں ایسے کامل اور قابل استاد جمع ہیں، جن کو گورنمنٹ ایسے معزز خطاب کا مستحق سمجھتی ہے، اور جن کے علم کی روشنی دور دور پھیل رہی ہے، پس فی نفسہ گورنمنٹ اور قوم اور کالج مبارک باد کا مستحق ہے اور مولانا کو مبارک باد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے، وہ فی ذلہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلماء تھے، صاحبو! جس طرح آفتاب اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی اسے آفتاب کہے، بلکہ آفتاب کا اقرار کرنے والا خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ تیرہ چشم نہیں ہے، اور نہ اس کی آنکھ بند ہے، بلکہ اس میں بینائی کی قوت اور دیکھنے کی طاقت

بے کسی قسم کے ظلل اور عارضہ کے موجود ہے، اسی طرح ہمارے مولانا مولوی شبلی صاحب کو خطاب دینے سے گورنمنٹ نے ثابت کر دیا کہ وہ علم و کمال کی قدر کرنے والی اور اہل علم کو پچھاننے والی اور استحقاق پر لحاظ رکھنے والی ہے، صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے، جن کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہے وہ ان کی ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھرے ہیں اور جن کو ان کی تالیفات و تصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی عاثر اور ان کا علم کیسا وسیع، ان کے خیالات کیسے بلند، ان کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پر زور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تخلیق کیسی عالمانہ ہے، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور نضج کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات اور معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے اور اخبار و روایات کے صدق و کذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا اور ایسے زمانہ میں جب کہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ایسے وقت میں جب کہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے، ہمارے مولانا مجملہ ان دو تین مصنفین کے ہیں، جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی، اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا اور جس نے مشاہیر روزگار کے حالات زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصود بتایا اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈالی فلہذا دُؤہ وعلی اللہ اجرہ۔

صاحبو! ہمارے دوست مولانا مولوی شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی انہوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے، وہ ان چند اعتراضوں کا دور کرتا ہے جو مذہب اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے اور جن سے ہمارا مذہب، انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا، وہ جزیرہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلا نا تھا کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی، لوگوں نے جزیرہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے سے پیشوا بیان اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر دیا تھا، اس ذی ہمت، عالمی دماغ محقق نے جو مدرسۃ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا، ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے

میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی اور چند اوراق کے لکھنے اور مستہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا، اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہب اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی، حقیقت میں یہ کام ہمارے مولانا نے ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اس کی داد دیتا ہے اور خدا اس پر آفریں کرتا ہے۔

میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندر یہ کے کتب خانہ پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدہ کا انہوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت اور علم پر شاہد اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لیے کافی اور ان کے شمس العلماء ہونے کے شاہد تھے، صاحبو! ہماری قوم میں ہزاروں عالم گزرے اور اب بھی خدا کی مہربانی سے سیکڑوں موجود ہیں، مگر ہم تو اس کے قائل ہیں جو کچھ کر دکھائے اور اپنے علم و فضل سے مسلمانوں یا اسلام کو فائدہ پہنچا دے:

شہاد آں نیست کہ موئے میانے دارو بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارو

اے میرے عزیزو! اور اے میرے مدرسۃ العلوم کے طالب علمو! نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد تم کو ملے ہیں اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہنچتی ہے، تم اس زمانہ کو نعمت سمجھو جب کہ تم کالج میں ہو اور ایسے استادوں کی صحبت و تعلیم سے فائدہ حاصل کر رہے ہو، اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھانہ رکھو، تمہارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، تمہارے دلوں کو منور کرنے کے لیے ایک آفتاب روشن ہے، تم ایسا وقت ہاتھوں سے نہ دو اور اپنے استاد کے خصائل اور صفت سیکھنے اور علم کے حاصل کرنے اور پھر اسے کام میں لانے کی کوشش کرو تاکہ ہم اپنی قوم میں نہ صرف ایک آفتاب کو دیکھیں بلکہ ہمارے چاروں طرف سینکڑوں چاند اور ستارے نظر پڑیں، خدا کرے کہ ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے اور اس کا سایہ تم پر پڑے۔“

نواب محسن الملک کی اس فصیح و بلیغ تقریر کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے اپنے

عربی لہجہ میں مولوی داؤد بھائی صاحب ممبر لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کا عربی قصیدہ پڑھا:

حمد لمن جعل النجوم دراریا اس کا شکر جس نے تاروں کو روشن اور سورج
والشمس نوراً للحنادس ماحیا کو روشنی بنایا جو تاریکیوں کو مٹا دیتی ہے،
أشرققت شمساً من سماء معالم تو نشانیوں کے آسمان سے سورج ہو کر چمکا

تا کہ بلندی کے چاندوں کو اور بلندی میں بڑھادے
تیرے فیض سے علم کا چین شاداب ہو گیا
اس کے بعد کہ وہ ایک زمانہ تک مرجھایا ہوا تھا
کوئی شہ نہیں اگر میں تجھ کو اپنے زمانہ کی رون کہہ کر پکاروں
جو علم دین کی بوسیدہ ہڈی میں پھر زندگی پیدا کر رہی ہے۔
علامہ ہے جو قرآن پاک کی آیت سے چھپا بید
اور معنوں کا پتہ لگاتا ہے
کبھی وہ علوم کے رسالے نقش کرتا ہے
اور کبھی فنون کی عمارتیں بلند کرتا ہے
یہ وہ ہے جس کے سیرے کو خدانے کھول دیا ہے
تو وہ اگلے اہل علم کا پیرو ہو گیا
ایسا اچھا مدرس ہے کہ اُس کا درس
ایک سیلاب ہے جو وادی میں چھا جاتا ہے
اپنے وقت کا حجاب جس کے گرد تک کوئی نہیں پہنچ سکتا
کون فر فریڈ کا مقابل ہو سکتا ہے
نصاحت میں جس بن ساعدہ ہے جس کے زہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا
اس روشنی بخشنے والے آفتاب کا ثانی کون ہے
اگر وہ عربی میں شعر کہے تو حسانؑ سے بڑھ جائے
اور اگر فارسی میں کہے تو قافی سے آگے نکل جائے،
اُس کے حسن بیان کا جادو عقل کو لے لیتا ہے
جب وہ خطیب ہو کر یا شاعر ہو کر نغمہ سرا ہو
وہ تاریخ کا اقیام سمندر ہے
جو لوگوں کو مرجان اور موتی دیتا ہے

اس کے بعد نذیر احمد صاحب بی اے نے عربی زبان میں حسب ذیل تقریر کی:

لتمت اقمار العلاء معالیا
اضحیٰ بفيضك روض علم ناضراً
من بعد ان قد كان دهرأ زوايا
لا غرو لو ادعوك روح زماننا
تحی لعلم اللدین عظماً بالياً
علامة مستنبط من آية القرآن
سراً خافياً ومعانياً
حينما يحبر في العلوم رسائلاً
حينما يشيد للفنون مبانيها
وهو الذي شرح المهيم صدره
فغد الابناء المعارف تالياً
لله در مدرسٍ تدرسه
سيل اتى وقد يغشى واديا
سحبان وقت لا يشق غباره
من كان للفرد الوحيد مجاريا
قس الفصاحة لا ينال مقامه
من كان للشمس المنيرة ثانياً
ان قال في العربي شعراً فاق
حساناً وفي العجمي فاق قانيا
قد يخلب الالباب سحر بيانه
اذ ما تصدئ مخاطباً او شادياً
هو حصرم الاخبار غير مساجل
يعطى الوري مرجانة لا ليا

يَا أَيُّهَا السَّادَةُ الْكِرَامُ يَشُقُّ عَلَيَّ أَنْ أَقْرَعَ
أَذَانَكُمْ بَعْدَ إِذْ فَرَعْنَا مِنْ تَنْقَلِ الْفَوَاكِهِ
الشَّهِيَّةِ وَالْأَلْوَانِ اللَّطِيفَةِ وَكَيْفَ يُمْكِنُ لِي
أَنْ أَعْدَّ فُضَائِلَ مَوْلَانَا الْمَكْرَمِ وَأَحْصِيَ
مَحَامِدَهُ مَالِي أَنْ أَقُولَ أَنَّهُ سَحْبَانٌ فِي
الْفَصَاحَةِ وَمَالِي أَنْ أَقُولَ أَنَّهُ قُسٌّ فِي
الْبِلَاغَةِ وَمَالِي أَنْ أَقُولَ أَنَّهُ قَاتَنِي فِي
سَلَاةِ لِسَانِهِ وَلَطَافَةِ نَظْمِهِ، بَلْ أُنْشِدُ هَذَا
الشَّعْرَ لِلْمُتَنَبِّيِّ إِذْ قَالَ:

”خُذْ مَا تَرَاهُ وَدَعْ شَيْئاً سَمِعْتَ بِهِ
فِي طَلْعَةِ الشَّمْسِ مَا يَغْنِيكَ عَنْ زَحْلِ“
تَفْتَخِرُ اللَّجْنَةُ الْأَدَبِيَّةُ بِأَنْ أَعْظَمَ أَرْكَانَهَا
بَلْ بَانِيهَا لُقْبُ بِشَمْسِ الْعُلَمَاءِ تَهْنِئَةً الْآنَ
بِهَذَا الْأَعْزَازِ وَالْأَكْرَامِ، أَخْتَمُ كَلَامِي
بِتَشْكُرُ السَّادَةَ الَّذِينَ شَرَّفُونَا بِقُدُومِهِمْ
وَالَّذِينَ كَرَّمُونَا بِاللُّطْفِ وَالْإِحْسَانِ، وَأَنَّ
اللَّهُ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ.

معزز حضرات! میرے لیے یہ امر تکلیف دہ ہے کہ اس کے بعد کہ ہم لوگ خوش مزہ میوے اور عمدہ ناشتوں سے پیٹ بھر چکے ہیں، آپ کی سع خراشی کریں اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم مولانا کے فضائل گننا میں اور ان کے محامد شمار کریں، میں کیسے یہ کہوں کہ وہ فصاحت میں سحبان، بلاغت میں قس اور سلاست زبان اور لطافت نظم میں قاتنی نہیں، بلکہ میں متنبی کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں:

”جو دیکھتے ہو اس کو قبول کرو اور جو سنتے ہو اس کو چھوڑو، آفتاب نکل آنے کے بعد زحل کی ضرورت کیا ہے“
بجزے اللادب فخر کرتی ہے کہ اس کے سب سے بڑے رکن، بلکہ بانی کوشس العلماء کا لقب دیا گیا ہے، وہ ان کو ان کے اس اعزاز پر مبارکباد دیتی ہے، ہم ان معزز حاضرین کے شکر یہ پر جنہوں نے اس جلسہ میں شرکت کی اور تشریف لائے، اپنی تقریر کو ختم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کی نیکی کو بر باد نہیں کرتا۔

اس تقریر کے بعد ولایت اللہ صاحب طالب علم بی اے کلاس نے مولانا کی مدح میں ایک

اردو نظم پڑھی جو حسب ذیل ہے:

آج یہ کیوں نظر آتے ہیں خوشی کے سماں
درو دیوار سے آثار مسرت ہیں عیاں

۱۔ یہ صاحب سی پی کے تھے، طالب علمی سے فراغت کے بعد وہاں کے معزز عہدہ پر ممتاز تھے، پنشن پا کر اب یہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں، اسی سلسلہ میں ان سے دہلی میں ملا ہوں، ان کو شاعری کا ذوق اب تک ہے، میرا کبر حسین صاحب کے رنگ میں بھی اچھا کہتے ہیں، بہت سے اشعار انہوں نے سنائے، مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا ذکر کیا، اب ان کا مجموعہ کلام اس سال شائع ہوا ہے، اس میں بھی یہ تصدیق موجود ہے۔

ساری دنیا نظر آتی ہے مجھے باغِ جناب
دل کو بھاتا ہے بہت آج کے دن کا یہ سماں
فرشِ اطلس کا مجھے ہوتا ہے ہر لُحظ گماں
باغِ عالم میں جدھر دیکھئے گل ہیں خنداں
نقشہِ خلد ہی پاتا ہوں میں جاتا ہوں جہاں
آج ویرانہ کا معدوم ہے دنیا سے نشاں
شاد و خرم نظر آتا ہے ہر اک پیر و جواں
ابر آیا دُور شہوار سے بھر کر داماں
کچھ سے کچھ کر گئی ایک بارشِ ابر باراں
رحمتِ پاک سے سرسبز ہوا باغِ جناب
اک تماشا پہ تھیں سو جان سے آنکھیں قرباں
جا رہا تھا میں اسی فکر میں غلطاں پچھاں
باعثِ غور ہے کیا کیوں ہوئے ایسے حیراں
مہرماں ہوش میں آؤ ہو تم اس وقت کہاں
واں کے چلنے کا بھی کچھ تم نے کیا ہے سماں
ہو گیا مجھ پہ عیاں صاف یہ سب رازِ نہاں
ساتھ سب لوگوں کے اس سمت ہوا میں بھی رواں
جا رہا تھا میں نہایت خوش و خرم شاداں
مجھ کو دکھلائی دیا دور سے ناگہ وہ مکاں
جس کی صورت سے نمایاں تھی بہت شوکت و شان
ہند کے جملہ اراکین و مشیر و اعیان
عزت و شان کی جن سے کہ بڑھی عزت و شان
جن کے ہاتھوں سے یہ سرسبز ہوا ہند و ستاں
ہے بجا جن کو اگر کہئے کہ ہیں ہند کی جاں

زیب و زینت نہیں کچھ ایک جگہ پر موقوف
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھپا جاتا ہے
دیکھ کر سبز کی ہر سمت بہارِ دلکش
جس طرف جائیے غنچے ہیں تبسم کرتے
باغِ ہو دشت ہو صحرا ہو غرض کچھ بھی ہو
دھوم صحرا میں ہے جنگل میں ہے برپا منگل
سب کے منہ سے ہیں بلند آج خوشی کے نعرے
دستِ قدرت نے گہر بار جو ہونا چاہا
نہ رہی شکل وہ دنیا کی و ما فیہا کی
دشت و صحرا ہوئے گلزار، بہارِ آپہنچی
سر کے بل آگے ہی بڑھتی تھی نگاہِ پُرشوق
سخت حیرت تھی خدایا یہ خوشی ہے کیسی
ناگہاں کان میں آواز یہ آئی میرے
خیر ہے فکر یہ کیسی ہے؟ تعجب کیسا؟
جشنِ نوروز ہے اک دھوم مچی ہے ہر سو
یہ صدا کان سے پہنچی جو اتر کر دل میں
دیکھنے کو جو بہت میری طبیعت چاہی
لیے جاتا تھا مجھے شوق وہاں ہاتھوں ہاتھ
چشمِ مشتاق جسے ڈھونڈ رہی تھی ہر سو
خوش نماد کس و دل چسپ تھی جس کی تمیر
پاس جا کر جو نظر کی تو وہاں پائے بہم
عقل و دانش کو ہوئی جن سے کہ زینت حاصل
عدل سے جن کے ممالک ہوئے معمور تمام
پائی یہ نشو و نما علم و ہنر نے جس سے
۱ اتفاق سے عین جلسہ کے دن بارش ہونے لگی تھی۔

جب کہ دربار میں نافذ ہوا شاہی فرماں ہو گیا پھر ہمد تن گوش ہر اک پیر و جوان دل سے مت پوچھئے کچھ فرط مسرت کا بیاں ہو گیا چار سو اس مژدہ کا فوراً اعلان بلکہ یوں کہئے کہ ہے ہند بھی جن پر نازاں فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہو ملکِ یوناں پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں جب تلک شمس رہے اوج سما پر رخشاں یہ لقب پھولے پھلے آپ کے زیرِ داماں شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر بر تاباں

ناگہاں ایک خموشی ہوئی سب پر طاری بہر تعظیم کھڑے ہو گئے حضار تمام سن کے کچھ پھول گئے مارے خوشی کے احباب ہوئے شمس العلما آج جناب شبلی فخر کرتا ہے بہت جن پہ علی گڑھ کالج مصر اور شام نجل ہیں عربی سن کے اگر فارسی کی جو بھٹک کان میں پڑ جائے اگر تم کو شمس العلما کا یہ مبارک ہو خطاب پس دعا ہے یہ ولایت کی ہمیشہ یا رب سبز و شاداب یہ جب تک کہ رہے باغِ علوم

اس کے بعد ممتاز حسین طالب العلم سکندریہ کلاس اور ممبران اخوان الصفا اور لجنة الادب نے عربی میں تقریر کی، جس کی فصاحت و بلاغت کی سب نے داد دی، پھر مولوی حمید الدین صاحب ممبر اخوان الصفا و لجنة الادب نے اپنا یہ عربی قصیدہ پڑھا:

كاشمس بازغۃ بوسط سما
آسمان کے وسط میں آفتاب کی طرح درخشاں ہو کر
اور ثنہ عن شيمۃ الآبساء
تو نے اپنے اسلاف سے یہ وراثت میں پایا
فلقد نشأت بعزۃ قعساء
کوئی تعجب نہیں کیوں کہ تو نے عزت میں پرورش پائی۔
او يستهل البرق بالألاء
کاٹ رکھتی ہو یا بجلی روشنی لے کر چمکے
ولانست برق لامع بذكاء
اور تو زکاوۃ میں برقِ لامع

ياخير من يسمو الى العلياء
انسان سب میں بہتر، بلندی کی طرف اونچے ہوتے ہیں
قد كنت قدماً للمعالي سامياً
تو پہلے سے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا
فلئن سموت الى المكارم والعلیٰ
تو اگر تو عزت کے مقام اور بلندی کی طرف بڑھا تو
لاغرّو نصل السيف ان يك صارماً
کوئی تعجب کی بات نہیں اگر تلوار کی دھار
فلانست بالعزمات سيف صارم
کیوں کہ تو اپنے پختہ عزم میں شمشیر بڑا ہے

۱۔ ممتاز حسین صاحب مرحوم پیر مہر جن کے نام سے لکھنؤ میں ممتاز دارالستی ہے، جس کو مرحوم نے قائم کیا تھا۔ ۲۔ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم صاحب تفسیر نظام القرآن مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد جو اس وقت کالج میں زیر تعلیم تھے۔

لاذت بجانبك العلوم فانها
 علوم نے تیری پناہ چاہی کیوں کہ
 قد امحلت ارض العلوم واصبحت
 علم و فن کی سرزمین خشک ہو گئی تھی
 لعبت بها هوج الرياح تنوبها
 اس کے چاروں طرف سے آندھیاں اس سے کھیل رہی تھیں
 فضلت تمطرها بسبح واكف
 تو تو ابر باراں بن کر اس میں برسا
 فربت رياض العلم منك نور
 تو علم کی کیاریاں تجھ سے پروان چڑھیں اور
 علمتنا سبل الرشاد وانما
 تو نے ہم کو ہدایت کا راستہ بتایا
 كنا بمهجة يخاف بها الردى
 ہم ایسے خوفناک مقام میں تھے جس میں ہلاکت کا ڈر تھا
 ولأسئلكم الله طول بقاءكم
 اور ہم اللہ سے آپ کی زندگی کی
 واهتئناكم بما اعطيتم
 اور آپ کو اس کی مبارک باد دیتے ہیں کہ آپ کو ہموں نے
 ان كان تلك الشمس سمانها
 اگر یہ آفتاب اپنے آسمان کا سورج ہے
 اذ انت شمس والعلوم سمانكم
 جب آپ آفتاب ہیں اور علم و فن آپ کا آسمان ہے

لولا تصنها الذنبت بفناء
 اگر تو ان کو نہ بچاتا تو وہ فنا ہو چکے تھے۔
 عرصاتها كسماثق البيداء
 اور اس کے میدان صحرا بن گئے تھے
 من كل عناصرفة من النكباء
 اور مصیبت کا طوفان اس پر آرہا تھا
 صوب الربيع بديمة هطلاء
 بہار کی بارش موسلا دھار
 مهتزة بفصونها الخضراء
 ان کی سبز شاخوں میں جھوم کر شگونی نکلے
 كنا كحنا بظ ليل ليلاء
 حالان کہ ہم ایسے تھے جیسے کوئی اندھیری رات
 فهديتنا المحجة بيضاء
 تو تو ہم کو کھلے صاف راستہ پر لے آیا
 حتى كسل بكرتنا وكل عشاء
 ہر صبح اور شام دعا مانگیں گے
 من خير ما وجدوا من الاسماء
 اپنے نزدیک سب سے بہتر لقب سے ملقب کیا
 فلصرت شمس العلم والعلماء
 تو تو علم اور علما کا آفتاب ہے
 فالشمس شمسي والسماء سمائي
 تو آفتاب ہمارا آفتاب ہے اور آسمان ہمارا آسمان ہے

اس کے بعد خواجہ غلام الثقلین اور محمود صاحب نے اردو میں تقریریں کیں، پھر ظفر علی خاں صاحب ممبر اخوان الصفا نے فارسی میں یہ قصیدہ پڑھا، یہ قصیدہ گوان کا ابتدائی کلام ہے مگر سالے کہ نکوست از بہارش پیدا است:

۱۔ مولانا ظفر علی خاں، ایڈیٹر زمین دار، لاہور۔

مکدر مطلع خاطر بد از اندوہ پنبہائی
گہے خواندم حدیث گردش ایام طولانی
گہے کردہ نظر بر معصیت خوردم پیشمانی
کہ درمان دل زارم شود زانسان باسانی
عروس دہر را پیرایہ دیدم چو نورانی
چو زلفِ مہوشاں گیسوے سنبل در پریشانی
دلِ برد و شدہ رومِ نثار صبیح یزدانی
ہی شد از جمالش غرقِ خولِ لعلِ بدخشانہی
مشامِ جاں معطر شد ز بوے مستِ ریحانی
بہ ہر یک عشوہ خاصہ بد از اندازِ ارزانی
شیمِ یاسمین و یاسمن در عنبر افشانی
بصورتِ دلِ با بودند جو تہنیت خوانی
کواکب بر فلکِ مصروف ہر سو در زرافشانی
کہ بہر کیست این آرایش و تزئینِ لاثانی
نمی دانی مگر تو اے غریقِ بحرِ حیرانی
خطابے شد عطا واللہ ز فیضِ جوہِ سلطانی
معطر باغِ دہراست از پے شبلی نعمانی
ز عدلی خسروی شد گرم بازارِ درخشانہی
قطارِ عالماں انجم، میانش شمس تابانی
بیک پا ایستادہ بر خیانتِ پاستاں بانی
سخن را دادہ سرمایہ اے بحرِ خندانہی
سمندِ کلکِ تو ہر گہ شود سرگرمِ جولانی
کجا ہم پایہ ات باشند خاقانی و قاتانی
ز بحرِ عقل و نہمتِ رشخہ ابر یست نیسانی

سحر گاہاں دلِ پامالِ غم بود و پریشانی
گہے بر بے سرو سامانی خود نالہ می کردم
گہے بر کردہ خود انفعالِ دستِ می دادی
چو موجِ غم ز سر بگذشت گشتم عازمِ گلشن
شگفتہ غنچہ دل شد ز فرطِ فرحت و بہجت
گل و بلبلِ بہم جو ادا و عشوہ و غمزہ
خرام نازکبک و رقصِ سرود خندہ گلہا
دمیدہ لالہ حرا کنارے جوے کوثر و شوش
وزید از گلستاں باد صبا آہستہ آہستہ
گلابِ دسترنِ شیو و نسریں ز گس و سوسن
ز شبنمِ لالہ داغِ خود بہ اندازِ نکوشتہ
ہزاراں مرغِ خوش الحانِ نشستہ بر سراغصاں
مہ نوکشتی بہر نثارِ نقرہ پر کردہ
چو این نظارہ را دیدم بحیبِ فکر سر بردم
دریں اثنا مرا از ہاتھِ غیبی ندا آمد
کہ فخرِ قوم و مولاناے شبلی را پے علمش
زمیں ہم آسماں ہم چہرہ افروزند بہر او
بجد اللہ کہ در درجِ حکمت را پس از عمرے
نہ یارائے ثنائے تو قلم رانے ز بانم را
کنند اے کانِ معنی علم و فضل و دانش و حکمت
زمین شعر از فیضت پر از گلہائے بوقلموں
کند پہنائے مضمونِ لطیف و خوش بیکدم طے
برائے دادہ از فکرِ خود عمرنی و صائب را
بہاراں نغمہ باشد ز گلزارِ کمالِ تو

خداوند کریمت لحنِ داؤدی عطا کردہ
نوائے نغمہائے شکر میں تانخیز از گلبن
کئی تخییر دلہا چوں سنی ترتیلِ قرآنی
صدائے بلبل آید تا ز شاخِ سرو بستانی
معین و یاور و ناصر ترا تا نیدِ ربّانی
ز چشمِ زخمِ دوراں در سلامت باشی و ایمن

اس کے ختم ہونے کے بعد لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی شاگرد مرزا غالب مرحوم نے جو مولانا حالی کے ساتھ تشریف لائے تھے، ایک ظریفانہ تقریر کی اور اپنے کو ہندو ہونے کے سبب سے ”آفتاب پرست“ ثابت کر کے شمس العلماء مولانا شبلی کا اپنے کو قدر داں ٹھہرایا، سب سے آخر میں مولانا حالی نے اپنا عربی قصیدہ پیش کیا جو حسب ذیل ہے اور جس کا عنوان تھا، ”من الحبيب الى الحبيب“ یعنی ”ایک حبیب کی طرف سے دوسرے حبیب کو ہدیہ“۔

يسا وحيداً من الكرام فريدا
اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ
انت اولی بان تلقب شمساً
تو اس بات کا زاہد بن دار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے
انت شمس الهدی ولست بشمس
تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں
انت طهّرت ذیل دین مبین
تو نے دین مبین کے دامن کو پاک کیا
ثم دافعت عن امام تقی
پھر تو نے اس امام پاک کی طرف سے مدافعت کی
وعن الحق قد کشف غطاء
اور تو نے حق سے پردہ اٹھایا
سرت فی الارض بڑاً وبحراً
تو نے دنیا کے بجز و بر کی سیر کی

لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے ۱۹۰۸ء میں وفات پائی (مکتوب حالی، جلد اول، ص ۱۶۹)۔ ۲ امام پاک سے عمر بھٹکھنڈ مراد ہیں جن کی طرف اسکندریہ کے کتب خانہ جلانے کی نسبت کی جاتی تھی، اور مدافعت سے اس کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کے رفع الزام کی طرف اشارہ ہے۔

قلّدوك التزام مدرس قوم
تجھ کو قومی مدرسہ کی خدمت سپرد کی گئی
فتقلّدت والتزمت لزوماً
تو نے اس خدمت کو قبول کیا
قمت بالدرس والدراسة فيهم
تو تعلیم اور درس میں مشغول ہوا
وجعلت الكمال غاية هم
اور تو نے کمال کو اپنا انتہائی مقصد قرار دیا
فعلى القوم لازمًا لك حق
پس قوم میں جس قدر اکابر و اعیان ہیں
صانك الله عن مكاره حتى
خدا تجھ کو مکرہات سے بچائے

فيہ یرجى لهم كمال النفوس
جس میں کہ نفوس کی تکمیل کی امید کی جاتی ہے
خدمة المسلمين بالتدريس
اور درس و تدریس سے ان کی خدمت کا فرض ادا کیا
فارغاً عن رياسة و رئيس
ریاست اور رئیسوں سے بے پروا ہو کر
واتخذت الكتاب خیر جلیس
اور کتاب کو عمدہ ہم نشین بنایا
كلهم من وجوههم ورؤس
سب پر تیرا لازمی حق ہے
صرت كالقلب آمناً في الخميس
یہاں تک کہ تو اس طرح محفوظ رہے، جس طرح فوج میں قلب کا حصہ

سب سے اخیر میں مولانا کھڑے ہوئے اور سب کے جواب میں یہ شکر یہ آمیز تقریر فرمائی،
اس تقریر پر اس حیثیت سے نظر رہے کہ بادۂ مدح و توصیف کے اتنے پے در پے بیابانوں کے بعد بھی ان
کا دامعُ برجاً ہے اور اس شاہی خطاب کی وہ وہی حقیقت سمجھتے ہیں جو اس کی حقیقت ہے:

”آپ نے جس مہربانی اور محبت سے عطیۂ خطاب کی تقریب میں مجھ کو ایوننگ پارٹی میں مدعو کیا
ہے اور جس جوش اور خلوص سے آپ نے اس موقع پر مجھ کو اس خطاب پر مبارک باد دی ہے میں نہایت
سچے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، حقیقت میں میرے لیے اس سے زیادہ فخر اور عزت کا کیا موقع
ہو سکتا ہے کہ لجنۃ الادب کا جو اپنی قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اس
مقدس زبان میں ہم کو ابھیچ اور لکچر دینا سکھائے، جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے، جس کے ممبروں میں
مولوی بہادر علی صاحب ایم اے اور کیسے، ایم اے ڈبل ایم اے داؤد بھائی صاحب جیسے ادیب، منزل
اللہ خاں صاحب رئیس، جناب حاجی اسماعیل خاں صاحب ممبر کونسل، جناب سید کرامت حسین صاحب
بیرسٹریٹ لا، مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے گر، اور اس کے آنریری ممبروں میں ہمارے مخدوم مولانا

الطاف حسین صاحب حالی، داخل ہیں، میرے خطاب کی نسبت مبارک بادی دینا ایک ایسا فخر اور ایک ایسی عزت ہے جس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اخوان الصفا کی مجلس جو مسلمانوں کی اس قدیم مجلس کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے، جو چوتھی صدی میں قائم ہوئی تھی، جس کے سکریٹری میرے استاد اور ہمارے کالج کے فرشتہ خصال پروفیسر مسٹر آرنلڈ ہیں اور جس کے ممبر نہایت پاکیزہ اخلاق اور لائق و فائق اشخاص ہیں، ایسی مجلس کا مجھ کو مبارک بار دینا بڑی سے بڑی عزت اور بڑے سے بڑا شرف ہے۔

اے حضرات! اگرچہ میں انگریزی گورنمنٹ کی نہایت قدر اور عزت کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس کے تمام احکام اور قاعدے سیاست اور انتظام کے اعلیٰ اصول پر مبنی ہیں اور اس بنا پر اس خطاب کی بھی جو گورنمنٹ نے مہربانی سے مجھ کو عطا کیا ہے، نہایت قدر اور منزلت کرتا ہوں، لیکن میں آپ کو کافی یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خطاب کی جو قوم کی طرف سے دیا جائے گورنمنٹ کے خطاب سے کچھ کم عزت نہیں کرتا، اور یہ میرے لیے کچھ بے جا بات نہیں، بلکہ اُس زمانہ میں بھی جب کہ خود مسلمانوں کی حکومت تھی، مسلمانوں نے ہمیشہ سلطنت کے خطابات کی بہ نسبت قومی خطاب کی زیادہ عزت کی، اسی کا اثر ہے کہ سلطنت عباسیہ اور دوسری سلطنتوں کے عطا کیے ہوئے خطاب بالکل معدوم ہو گئے اور قوم کے عطا کیے ہوئے خطابات یعنی ”حجۃ الاسلام“ امام غزالی کے لیے، ”امام“ فخر الدین رازی کے لیے ”علم الہدیٰ“ شریف مرتضیٰ کے لیے آج بھی باقی اور قائم ہیں، پس جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جو خطاب کے عطا کرنے کی عزت مجھ کو دی ہے، اس کو آپ لوگ جو قوم کے صحیح قائم مقام ہیں پسند کرتے ہیں اور یہ جا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر میرے لیے فخر اور خوشی کا کیا موقع ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ۶ جنوری کو اگر گورنمنٹ کے حضور سے مجھ کو یہ خطاب ملا تھا تو آج ۱۹ جنوری کو مجھ کو قوم کے دربار سے یہ خطاب ملا ہے

ع . ایٹکنڈی پنم بہ بیداری است یارب یا بہ خواب

اے حضرات! جس طرح میں نہایت سچے دل سے آپ صاحبوں کی مہربانی کا شکر یہ ادا کرتا ہوں، میرا فرض ہے کہ نہایت سچے دل سے گورنمنٹ کی اس پالیسی کی نسبت احسان مندی کا اظہار کروں جو اس نے اس خطاب کے دیے جانے کی نسبت اختیار کی ہے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب حکومت ہوتا ہے تو نئی حکومت پرانی

حکومت کے تمام آثار کو، علوم کو، فنون کو، تمدن کو مٹا دینا چاہتی ہے، قال اللہ تعالیٰ اِنَّ الْعُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعْزَّةً اَهْلِهَا اِذْلَةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ لیکن انگریزی حکومت نے یہ خلاف اس کے پرانی حکومت یعنی اسلامی حکومت اور نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ ہندوؤں کی حکومت کے آثار کو بھی محفوظ رکھنا چاہا ہے، ایشیا تک سوسائٹی نے جو کام کیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے، قدیم عمارتوں کی نسبت جو کچھ اہتمام گورنمنٹ کو ہے، وہ مخفی نہیں، اسی طرح گورنمنٹ نے اس خطاب کے سسٹم کو قائم کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قدیم تعلیم اور قدیم علوم کی ویسی ہی عزت کرتی ہے جس طرح کہ انگریزی تعلیم کی۔

حضرات اگرچہ کسی ایسے شخص کو جو علم کی خدمت کرنا چاہتا ہے، کسی قسم کے خطاب کی خواہش کرنی یا خطابات کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھنا ایک قسم کی تنگ حوصلگی ہے اور اسی بنا پر ہمارے قدیم بزرگوں میں سے بہتوں نے اس قسم کے خطابات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، تاہم کچھ شہ نہیں کہ اس قسم کے اعزاز سے لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کی ہمت بندھتی ہے، ہم کو گورنمنٹ کے سایہ عافیت میں اس بات کا موقع حاصل ہے کہ ہم اپنے قدیم علوم، قدیم زبان، قدیم تہذیب کو محفوظ رکھیں اور اگر ہم کو ایسا کرنے کے لیے قدر دانی اور ظاہری اعزاز کی تمنا اور آرزو ہے تو گورنمنٹ ہماری قدر دانی اور عزت افزائی کے لیے اسی طرح موجود ہے، جس طرح اسلامی عہد میں اسلامی حکومت، مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی، مفتی میر عباسی صاحب مرحوم، مولوی حامد حسین صاحب مرحوم اگر اسلامی حکومت کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کو اسی قسم کے اعزاز کی توقع ہو سکتی تھی، جو انگریزی گورنمنٹ نے ان کو عطا کیا۔

حضرات! جب کہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں تو نہایت ناپسای ہوگی، اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا اصلی سرچشمہ ہے، یعنی ہمارا یہ قومی کالج۔“

اس جلسہ کے بعد ۷ افروری روز شنبہ کو اسٹریچی ہال میں لیڈی زیورین پین افسران روسائے علی گڑھ اور طلبائے کالج کا ایک اور عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرکاری طور پر رسم خلعت و عطاءئے خطاب ادا کی گئی اور مسٹر ہنگلن کمشنر قسمت میرٹھ نے مولانا کو اپنے ہاتھ سے عمامہ، عبا اور تمغہ حوالہ کیا، سرسید نے مولانا کو ۱۔ بے شبہ جب بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو ویران اور اس کے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، اور ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ (قرآن پاک میں ملکہ سبا کا قول نقل ہوا ہے۔) ”س“ ۲۔ ان صاحبوں کو شمس العلماء کے خطاب ملے تھے، مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی، مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کے نام ورجاشین و فرزند مفتی میر عباس صاحب لکھنؤ کے مشہور اديب اور مولوی حامد حسین صاحب لکھنؤ کے مشہور اثنا عشری عالم و مجتہد، اور مولوی ناصر حسین صاحب، مجتہد لکھنؤ کے والد۔

الگ لے جا کر یہ خلعت پہنایا، مولانا خلعت کو زیب تن کر کے وسط ہال میں کھڑے ہوئے، اس وقت مسٹر ہونگٹن نے ان کو مخاطب کر کے ایک تقریر کی جس میں وہ تمام خیالات یک جا ہیں جو اس عطاءے خطاب کے باعث اور اس وقت مسٹر بک پرنسپل اور سر سید مرحوم کے دل و دماغ پر چھائے تھے، اس لیے وہ آج بھی غور سے پڑھے جانے کے لائق ہے، انہوں نے کہا ”مولوی محمد شبلی نعمانی! مجھے اس امر کی نہایت خوشی ہے کہ یہ سند اور خلعت گورنمنٹ آف انڈیا وصوبہ جات ہذا کی طرف سے ایسے وقت میں آئے کہ مجھ کو اس مسرت اور خصوصیت حاصل کرنے کا موقع ملا کہ میں بذات خود اس رسم میں شریک ہوں، جو اس عطیہ خطاب کی غرض سے کی گئی ہے، جس کے لیے یہ سند اور خلعت ثبوت اور علامت ہیں۔

اس خطاب کی تاریخ لارڈ ڈفرن کی اس عبارت سے معلوم ہوتی ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ کیوں کہ ۱۸۸۷ء میں قائم کیا گیا، ہزا کسلنس وائسرائے اور گورنر جنرل نے اس امر پر توجہ فرمائی تھی کہ اب تک کوئی ایسا مناسب ذریعہ موجود نہیں جس سے ہم ان ہندوؤں اور مسلمان اشخاص کی اعلیٰ لیاقت کی قدر شناسی کر سکیں جو ہر مجلسی حضور پر نور قیصرہ ہند کی وفادار رعایا ہیں اور نیز ان کو اس امر کی خواہش تھی کہ جشن جیوبلی کی یادگار قائم رکھی جائے، پس انہوں نے ایک نئے خطاب کی تجویز کی جو ان ہندو اور مسلمان اشخاص کو عطا کیے جائیں، جنہوں نے علوم مشرقی کی ترقی میں کارہائے نمایاں کیے ہوں۔

ہزا کسلنس وائسرائے اور گورنر جنرل نے ہدایت فرمائی..... کہ یہ خطاب مسلمانوں کے لیے شمس العلماء ہوگا، یہ خطاب شخص مخاطب کے نام کے اول میں اضافہ کیا جائے گا..... خطاب شمس العلماء کے ساتھ ایک خلعت بھی عطا کی جاوے گی، جس میں ایک عمامہ اور ایک عبا ہوگی، جن اشخاص کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوگا وہ دربار میں ان اشخاص سے متصل دوسرے درجہ پر پہنچیں گے جن کو نواب کا خطاب ملا ہوگا۔

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی! اس رسم خلعت کے انجام دینے پر اس سند کے نذر کرنے کے ساتھ جس پر ایسے قابل اور عالی دماغ اور راست رو وائسرائے اور گورنر جنرل کا طغرا ہے، جس سے بہتر ہندوستان کی خوش قسمتی کے حصہ میں نہیں آیا، میں (آپ کے لیے) یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی عمر دراز ہو، نہ صرف اس لیے کہ اس سزاوار عظمت سے لطف حاصل کیجیے، بلکہ اس واسطے کہ جس طرح ترقی علوم مشرقی میں آپ نے ایسے کارہائے نمایاں کیے ہیں جس سے یہ امتیاز حاصل کیا، اسی طرح اس سے بھی زیادہ

نمایاں خدمت اپنی قوم اور انگلش قوم کے واسطے کرتے رہے، جس کے ساتھ ساتھ عروج کرنا آپ کی قوم کے لیے مقدر رہے اور اپنے پرزور اثر کو جو آپ کی ممتاز لیاقت سے پیدا ہوتا ہے، اس معزز امر کے استحکام اور وسعت کی طرف مائل رکھے، جس کو آپ کے پرنسپل دل پسند الفاظ (برٹش کی وفاداری، انگلش کے ساتھ دوستی اور جوش، سلف ہلپ کے بلند اور روز افزوں خیالات) کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، یہی تین باتیں مڈن اینگلو اور نیل کالج علی گڑھ میں ایسی ہیں جن کو ان کی علامت اور اثر قدیم اور اس کی روح کہہ سکتے ہیں اور جو اپنی مثال اور اثر سے ہندوستان بلکہ دنیا پر اس سچے اصول کا اظہار کر رہی ہیں جس سے ایک قومی مگر زوال یافتہ قوم اپنی تلف کردہ عظمت کی بنیاد ایسے انداز پر ڈال سکتی ہے جو اس کے لیے باعث عزت اور اس کے فرماں رواؤں کے لیے باعث ہم دردی و اعانت ہو سکے، (اس کالج اور اس کے پیارے اور لایق ادب بانی کی نسبت) میں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ یہ کالج ایسی مستقل ترقی کے ساتھ استحکام کے مدارج حاصل کرتا جائے کہ اس کے بانی کی درخششاں زندگی کے افق پر کالج کے آئندہ حالات کے خیال سے پریشانی کا ابر نہ چھائے اور اُس کے آخری ایام مسرت کے روشن افق پر بسر ہوں، جہاں فرحت بخش امید کا جلوہ ہے اور جہاں سے کام یابی کا میدان سامنے نظر آتا ہے، جہاں اس کی آنکھیں ارض موعود کو دیکھ کر جس کی جانب وہ اپنی قوم کی رہ بری کرتے ہیں، اس طرح پر روشن ہوں جیسا کہ قوم بنی اسرائیل کے اس بڑے فدائی کی چشم تیز میں ہو رہی تھی، جس نے اپنی زندگی کو اس بات پر صرف کر دیا تھا کہ قوم کو کشور غلامی سے باہر نکالے۔“

یہ تقریر اور اس تقریب کی کارروائی اس زمانہ کے پانیرالہ آباد واسطہ فروری ۱۸۹۳ء میں چھپی تھی، جس میں ایک دفعہ چھپ جانا اس عہد کے ہر عزت طلب کی انتہائی آرزو تھی، بقول اکبر

ع ”بیر خدا ہمیں بھی ذرا چھاپ دیجئے“

اس مسرت کے علاوہ جو اراکین و طلبائے کالج نے اس خطاب کے عطا ہونے پر ظاہر کی تھی، تمام ملک کی طرف سے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا، اخبارات نے مضامین لکھے اور اکثر بزرگان قوم نے بذریعہ خط مولانا کو مبارک باد دی، ان سب کے جواب میں مولانا نے حسب ذیل شکر یہ آمیز تحریر شایع کی، جس کا حرف حرف اپنے لکھنے والے کے حوصلہ بلند اور ہمت عالی کا شاہد ہے، اور جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پورے سیاسی ڈرامہ میں جو اٹیجیوں پر کھیلا گیا، اس کی نظر حقیقت کی بلند سطح سے نیچے

نہیں اتری، عطاءے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگان قوم نے مبارک بادی کے جو خطوط لکھے اور میرے رتبہ اور حالت سے بہ درجہ بڑھ کر جن الفاظ میں قدر دانی کا اظہار کیا، ان کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ”ایاز قدر خود شناس“ کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف و عزت کی باعث ہیں اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکر یہ ادا کروں کم ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے، اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت ان بزرگان قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں، اور جن میں افتخار الدولہ فخر الملک صاحب زادہ محمد عبید اللہ خاں بہادر فیروز جنگ سی ایس آئی، نائب ریاست ٹونک، سردار محمد حیات خان بہادر سی ایس آئی، نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان صاحب، نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین، مولوی سید اکبر حسین صاحب، حاجی محمد اسماعیل خاں کے مبارک نام شامل ہیں، سب سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو عطا کی جاسکتی ہے۔

علی الخصوص لسان الملک فخر قوم اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجیدہ کی نظم جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لیے تمغائے فخر اور سند عزت ہے، بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو حاصل ہو سکتی تھی اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔“

تماشا گاہ عبرت فروری ۱۸۹۳ء | مولانا شبلی مرحوم کے ”قومی سدس“ کی تمہید میں اس قومی تماشا گاہ کا ذکر ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں ایک سالانہ نمائش ہوتی ہے، جس میں ضلع کے اکثر رؤسا، بڑے ساز و سامان سے شریک ہوتے ہیں، ان کے خیمے ڈیرے لگتے ہیں، سرسید نے ان میں سے مسلمان رئیسوں کو کالج کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک قومی تماشا گاہ کی طرح ڈالی، لوگوں نے اس کو بنجیدگی کے خلاف سمجھ کر اس کی مخالفت کی، مگر سرسید نے یہ کہہ کر کہ قوم کے لیے سب کچھ گوارا ہے، ۶ فروری ۱۸۹۳ء کی رات کو علی گڑھ کی نمائش گاہ میں چند خیمے کھڑے کیے، اور ایک اسٹیج ترتیب دیا، اس میں سب سے پہلے نواب حاجی اسماعیل خاں جو عرب اور ترکی میں رہ چکے تھے، پاکستان کی وردی میں باہر آئے، ان کے ساتھ چند سپاہی تھے، ان سے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی میں باتیں کیں، پھر سرسید صاحب آئے اور پاکستان سے گفتگو کر کے ایک دل پذیر لکچر دیا اور آخر میں حافظ کی پوری غزل پڑھی:

ساقیا بر خیز و در درہ جام را خاک بر سر کن غم ایام را
اس کے بعد چار انگریز پروفیسر آئے اور انہوں نے ساتھ مل کر ایک انگریزی گیت گایا، پھر
آغا کمال الدین سخر طہرانی نے اپنا فارسی قصیدہ:

اے پیردانِ دینِ حنیفِ پیہری فریاد از ستیزہٴ ایں چرخِ چنبری

بڑی شان سے پڑھا، اس کے بعد آغا محمد حسین نے جو مشہور سیاح تھے اور افغانستان، کوہستان مصر اور
سوڈان میں کچھ دن رہے تھے، بدوی شیخ کی صورت میں آ کر عربی گیت گایا، اس کے بعد خواجہ محمد یوسف
صاحب وکیل نے آ کر تقریر کی اور اپنی اردو مثنوی سنائی، پھر پروفیسر آرنلڈ نے آ کر ایک انگریزی نظم
پڑھی، ان سب کے بعد مولانا شبلی صاحب سبز عبا پہنے اور رنگین عمامہ باندھے اسٹیج پر آئے اور اپنا قومی
مسدس جو اسی موقع کے لیے تصنیف کیا تھا پڑھا ان کے دل میں خود قومی درد تھا، آواز دردا انگیز تھی، مسدس کا
مضمون بھی ویسا ہی قومی درد سے بھرا تھا، سب نے مل کر لوگوں کے دلوں پر جو اثر کیا، اس کو ان ہی لوگوں کا
دل جانتا ہے، جو اس وقت موجود تھے، یا قوتِ خاں طالب علم نے مولانا شبلی کا ایک اردو قصیدہ پڑھا:

بزمِ احباب ہے پر جوش ہے جلسہ کیسا جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیسا

یہ عبرت کا تماشا تو گزر گیا، مگر مولانا کا یہ مسدس آج بھی عبرت کا تماشا دکھا رہا ہے۔ (تاریخ

مدرسۃ العلوم مسلمانان، مرتبہ سید افتخار عالم صفحہ ۷۳ و ۸۳)

لاہور کا سفر ۱۸۹۵ء | ”انجمن حمایت الاسلام“ لاہور کی مشہور انجمن ہے، اکثر اکابر اس کے سالانہ
جلسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں، مارچ ۱۸۹۵ء میں اس کے سالانہ اجلاس میں سید صاحب اور ان
کے دیگر رفقاء نے شرکت کی، اسی سلسلہ میں مولانا بھی تشریف لے گئے تھے، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انہوں
نے اس جلسہ میں کس موضوع پر تقریر کی۔ (مکاتیبِ شبلی، اضافہ طبع دوم ۳۳)

الہ آباد یونیورسٹی کا تعلق ۱۸۹۵ء | اسی سال الہ آباد یونیورسٹی نے مولانا کو اپنی فیکلٹی آف آرٹس
(شعبہ فنون) اور بورڈ آف اسٹڈی (شعبہ تدریس) کا ممبر بنایا اور وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر
ہوئے، مولانا ۱۵ مارچ ۱۸۹۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”رمضان کے بعد ایک مطلق یادداشت کورسوں کے متعلق تیار کروں گا“۔

لے یاد ایام، مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری۔

معلوم نہیں یہ یادداشت کیا تھی اور کیسی تھی، مگر مولانا کے واقف کار سوانح نگار لکھتے ہیں:

”الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے وقت ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا، ایک عرصہ تک جب طلبہ آسانی کے ساتھ اس میں کامیاب ہوتے رہے، تو یونیورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک مضمون ہونے کے ناقابل سمجھی گئی، لیکن عین وقت پر مولانا نے نہایت قابلیت سے ایک کورس تیار کیا، جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ فارسی کا وقار قائم رہ گیا اور اس کا اخراج ملتوی ہو گیا۔“ (صفحہ ۳۳۳)

اس کورس کے نثر کے حصہ میں پہلے نظام الملک طوسی کے سیاست نامہ کے ۲۲۵ صفحے ہیں، پھر ۱۰۰ صفحوں میں ابوالفضل کی آئین اکبری کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں شعرائے اکبری کا تذکرہ بھی شامل ہے، اس کے بعد خالص نظم ہے، نظم میں پہلے شاہ نامہ فردوسی کے ۹۹ صفحے ہیں، اس کے بعد شعرائے متاخرین میں سے قافی کے قصائد کے پچاس ۵۰ صفحے ہیں، پھر قدما میں منوچہری کے قصائد و مسملات و اشعار کے ۹۱ صفحے ہیں۔

اس کورس کی نثر میں چند باتوں کا خیال رکھا گیا ہے، ایک تو یہ کہ وہ خالص فارسی ہو، دوسری یہ کہ وہ روزمرہ کی باتوں کی تحریر کا سلیقہ سکھائے اور تیسری یہ کہ اس سے مسلمانوں کے آئین حکومت اور تمدن کا نقشہ کھینچ جائے اور متقدم اور ایک متاخر نثر دونوں کا نمونہ پیش نظر ہو جائے، نظم میں بھی صحیفہ ایران یعنی شاہ نامہ فردوسی ہے، پھر غزنوی دور کے مشہور قصیدہ گو منوچہری امغانی کا کلام ہے، جس میں ایک خاص قسم کی روانی اور انجام ہے اور متاخرین میں قافی کا نمونہ ہے، جو قافیہ چاری دور کا سب سے بہتر قصیدہ گو تھا اور جس میں لفظوں کی ایسی جا دو گری ہے جو شاید ناموزوں طبع کو بھی موزوں بنا دے۔

یہ کورس سا لہا سال تک شاید ۱۹۰۳ء تک یا اس کے بعد بھی چلتا رہا، مولانا جب تک کالج میں رہے، سو روپے سال اس کی آمدنی سے کالج کو دیے تے رہے۔

www.KitaboSunnat.com

قدیم کتابوں کی اشاعت کی تجویز ۱۸۹۶ء | مستشرقین کی کوششوں سے اس زمانہ میں یورپ کے مختلف ملکوں سے عربی زبان کی نہایت نادر اور قدیم کتابیں چھپ چھپ کر شائع ہو رہی تھیں، اس کو دیکھ کر مولانا کا جی بار بار چاہتا تھا کہ کاش مسلمانوں میں بھی علما کا ایک چھوٹا سا گروہ ایسا ہوتا جو اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو کتب خانوں کے گوشوں سے نکال کر منظر عام پر لانا اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کا نام اونچا ہوتا اور دنیا کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا کیا کیا ہے۔

۱۔ مرتبہ محمد مہدی، نائب مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال شائع شدہ بشیر سیریز اناؤدہ، ۱۹۲۵ء۔

یہ خیال ان کے دماغ میں سب سے پہلی بار ٹرکی اور مصر و شام کے سفر میں آیا، جب نہایت کثرت سے ان کی نگاہ کے سامنے سے اسلاف کے یہ نادر کارنامے گزرے، چنانچہ سفر نامہ میں جو ۱۸۹۲ء میں لکھا گیا ہے اپنی اس آرزو کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے، میں نے کتب خانوں کے بیان میں جو تفصیل کی وہ ایک خاص غرض سے کی، اور میں چاہتا ہوں کہ قوم کو اس کی طرف متوجہ کروں؛ یورپ میں اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں، جن کا مقصد قدیم عمدہ کتابوں کا بہم پہنچانا اور ان کو چھاپ کر شائع کرنا ہے، ان ہی انجمنوں کی بدولت عربی زبان کی وہ قدیم اور نادر الوجود کتابیں ہم کو میسر آئی ہیں جن کے دست یاب ہونے کا خیال بھی نہیں آتا تھا، یہی انجمنیں ہیں جنہوں نے تاریخ کبیر ابو جعفر جریر بطبری کا کامل نسخہ بہ ہم پہنچایا اور اس کی بہت سی جلدیں چھاپ کر شائع کیں، حالانکہ مصر و روم کے علماء اس نایاب تاریخی خزانہ سے بالکل ناامید ہو چکے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے تو یقین دلا دیا تھا کہ وہ دنیا سے ناپید ہو گئی، بے شبہ یورپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے اور ہم کو اس کا علانیہ اقرار کرنا چاہیے، بزرگانِ قوم سے میری درخواست ہے کہ وہ اس قسم کی ایک عظیم الشان انجمن بنائیں، عام چندے سے کافی سرمایہ جمع کیا جائے، قابل اور لائق مصنفین کتابوں کے انتخاب کے لیے ممبر مقرر ہوں، قسطنطنیہ اور مصر سے کتابیں نقل کر کر مگائی جائیں اور چھاپ کر شائع کی جائیں، یہ کام بہ ظاہر عظیم الشان اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، اگر چار کروڑ مسلمانوں میں سے ۱۰۰ مسلمان بھی آمادہ ہو جائیں اور ایک قلیل مقدار چندے کی دینا گوارا کریں تو اس کام کا انجام پانا کچھ مشکل نہیں۔

حیدرآباد میں دائرۃ المعارف الدکنیہ کے نام سے جو انجمن قائم ہے اور جس کے ایک معزز ممبر نواب اقبال یار جنگ بہادر ہیں، ہم کو امید ہے کہ وہ ہماری گزارش پر توجہ کرے گی، ہم شکر گزار ہیں کہ ساتھ ان علمی فیاضیوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہم کو اس سے زیادہ فیاضیوں کی ضرورت ہے اور ہم کو امید ہے کہ دائرۃ المعارف اور زیادہ توجہ اور اہتمام سے اس مقصد پر متوجہ ہوگی۔“

چند سال کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس خیالی آرزو نے اس حد تک ترقی کی کہ اس کو عملی شکل دینا چاہا، چنانچہ مئی ۱۸۹۶ء کی مشغلی میں حسب ذیل تجویز کا اعلان کیا:

”یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں تمام علوم و فنون کو نہایت ترقی دی تھی اور ہر فن میں

اپنے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلم بند کیے تھے، لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر متزلزل ہوتا گیا کہ آج جو تالیفات و تصنیفات عام طور سے رائج ہیں، اکثر وہ ہیں جن میں ایجاد و جدت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی، قدما کی تصنیفات جن میں ہر جگہ اجتہاد و ذاتی تحقیقات سے کام لیا گیا ہے، عموماً متروک ہیں، خال خال کوئی قلمی نسخہ کسی بڑے کتب خانہ میں پایا بھی جاتا ہے تو ہر شخص کو وہاں تک دست رس نہیں اور اس وجہ سے گویا ان کا عدم وجود برابر ہے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمام تر دار و مدار امام محمد کی روایات اور تصنیفات پر ہے جن کو اصطلاح فقہ میں ظاہر الروایہ کہتے ہیں، لیکن ان میں سے بہ جز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے، ایک کتاب بھی موجود نہیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں، اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن نام وروں پر ناز ہو سکتا ہے وہ یعقوب کنہی، فارابی، ابن رشد ہیں، لیکن ان کی تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہے، قرآن مجید کے اعجاز و فصاحت و بلاغت پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے تمام ہندوستان میں ایک کتاب بھی موجود نہیں، تاریخ کی قدیم اور نادر تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے سے آئی ہی نہیں، بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں، لیکن قطع نظر ان کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو بہم نہیں پہنچ سکتیں، ان واقعات کی بنا پر مجھ کو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے، اگرچہ حیدرآباد کی مجلس دارۃ المعارف کا بھی یہی موضوع ہے، لیکن جو تجربہ اس کے ابتدائی قیام سے اس وقت تک ہوا ہے، اس کے لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں کہ وہ اس درد کی پوری دوا نہیں۔

ملک میں عربی زبان کی جو کساد بازاری ہے، اس کے لحاظ سے اگرچہ یہ تجویزی فی الجملہ بے محل معلوم ہوتی ہے، لیکن ۵ کروڑ مسلمانوں میں سے دو چار سو ایسے شائق ضرور نکل آئیں گے جو معمولی قیمت پر کتاب کو خرید لیں اور اگر اتنا بھی ہوا تو ہم اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہیں، بالفعل یہ تجویز ہے کہ اس مجلس میں تین قسم کے ممبر قرار دیے جائیں۔

(۱) وہ لوگ جو ۱۰ سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں اور یہی لوگ اراکین مجلس قرار دیے جائیں گے، اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی، گو کہ ان کی قیمت ان کے چندہ ممبری سے زائد ہو، ان کو دی جائیں گی۔

(۲) وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور واقفیت و تلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابیں بہم پہنچائیں، ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے دستاویزاً مطلع کرتی رہے گی اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی۔

(۳) وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب کے چھپنے پر ایک نسخہ قیمت معینہ پر خرید لیں گے، ان بزرگوں کا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائے اور جو کتاب چھپے گی اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ویلیو پی اے ایل بھیج دیا جائے گا۔

یہ بنیاد بنا بھی ضرور ہے کہ مردست جن کتابوں کا شائع کرنا پیش نظر ہے وہ پانچ روپیہ قیمت سے زیادہ کی نہیں، اس غرض کے لیے جو کتابیں ہیں اس وقت تک ہم بہم پہنچا چکے ہیں، یا جو نہایت جلد بہم پہنچ سکتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

اعجاز القرآن، امام باقلانی، طبقات الشعراء، لابن تہیہ، مناقب الشافعی لمام المرآزی، مجموعہ رسائل فارابی جس میں ۱۵ رسالے شامل ہیں، تلخیص المقال ابن رشد مطبوعہ یورپ، عمدہ لابن رشیق القیروانی، تاریخ صغیر امام بخاری۔

ہم کو ملک کے تمام بزرگوں سے امید ہے کہ وہ اس تجویز کی بابت ہم سے خط و کتابت فرمائیں گے اور ہم کو مطلع فرمائیں گے کہ ان کو تین قسم کے ممبروں میں سے کس قسم کا ممبر ہونا منظور ہے اور یہ کہ ان کے نزدیک کتب مذکورہ بالا میں سے اول کس کتاب کو شائع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

مگر یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، تاہم اس کا یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ ان نادر کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئی، تاریخ صغیر امام بخاری اور رسائل فارابی تو ہندوستان ہی میں چھپے، باقی طبقات الشعراء ابن تہیہ، اعجاز القرآن باقلانی، عمدہ ابن رشیق قیروانی، تلخیص المقال ابن رشد وغیرہ مصر سے چھپ کر نکلیں۔

”دائرة المعارف حیدرآباد دکن“ نواب عماد الملک مرحوم، ملا عبد القیوم مرحوم اور مولانا انوار اللہ خاں صاحب کی کوششوں سے سرکار نظام کی امداد سے تقریباً ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد دکن میں قائم ہوا تھا جس کا مقصد عربی کی قدیم و نادر کتابوں کی اشاعت تھی، مگر وہ ان دنوں زیادہ تر مذہبی کتابوں کی اشاعت میں مصروف تھا، مولانا کی بار بار کی چھیڑ چھاڑ سے اس نے ادھر توجہ کی اور اگست ۱۸۹۳ء میں

داڑی کی طرف سے مولانا سے خواہش کی گئی کہ وہ دائرہ کے کاموں کے لیے ایک ذمہ دار تیار کر دیں، چنانچہ نومبر ۱۸۹۳ء کو مولانا نے ایک مفصل خاکہ بنا کر بھیج دیا، جس میں علوم قرآن کی تحض نادر کتابوں کے پتے اور خصوصیات لکھے، یہ تمام خط و کتابت مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کے بدولت معارف مکی ۱۹۳۰ء میں چھپ چکی ہے، بحمد اللہ دائرہ آج تک برابر اپنے کاموں میں پوری طرح مصروف ہے۔

قدیم حنفی فقہ کی جن بنیادی کتابوں کی طرف مولانا نے توجہ دلائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بھی اسی سرزمین دکن کے ایک مخلص قندھاری عالم کو توفیق بخشی، جس نے بڑی محنت اور ایثار سے حیدرآباد میں ”احیاء المعارف العثمانیہ“ کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے اور اس وقت تک ہندو مصروف و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے متعدد نادر کتابیں بہم پہنچا کر تحلیہ و تصحیح کے ساتھ شائع کی ہیں جزام اللہ خبیر الجزاء اس طرح جو تجویز ایک دردمند دل سے نکلی تھی وہ دردمندوں کو متاثر کر گئی۔

حیدرآباد کا دوسرا سفر اور عطائے وظیفہ ۱۸۹۶ء | مولانا علی گڑھ کی کشفات سے گھبرا کر ایک سوئی اختیار کرنا چاہتے تھے، مگر حالات موزوں نہ تھے، والد بزرگ وار پر بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے، اور کوئی دوسری صورت سامنے نہ تھی، لیکن خوش قسمتی سے حیدرآباد میں اس وقت نواب وقار الامرا بہادر کی وزارت تھی اور مولوی سید علی بلگرامی کو جن سے مولانا کے خاص روابط تھے، نواب صاحب کے یہاں خاص رسوخ حاصل تھا، موصوف نے ان کو حیدرآباد بلایا، وہاں چار پانچ ہفتے جا کر رہے، نواب صاحب ممدوح کی سفارش سے اعلیٰ حضرت نظام الملک میر محبوب علی خاں نے ازراہ قدر دانی سو روپے ماہ وار کا وظیفہ ۳ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ سے منظور فرمایا اور یہ شرط کی کہ آئندہ سے مولانا کی تمام تصنیفات سلسلہ آصفیہ میں شامل ہوں، اس وظیفہ کے ساتھ حسب ذیل فرمان عنایت ہوا، مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں، چار ہفتے سے بلدہ میں مقیم ہیں، مولوی صاحب ایک نہایت قابل اور لایق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں، ان کی قدر دانی گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ روم سے بھی بہ عطائے خطاب و تمغہ ہوئی ہے، اب ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں، مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف کرنا ایک قومی کام ہے اور اس وقت کوئی عالم ہندوستان میں ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے چوں کہ سرکار

سے ایسے شخص کی اعانت ضرور ہے، لہذا سرکار نے بالفعل سو روپیہ کلدار ماہ وار جاری کرنے کے لیے منظوری صادر فرمائی ہے اور یہ بھی حکم دیا ہے کہ ان کی تصنیفات کے دیکھنے کے بعد اضافہ کیا جاوے گا، جو کتابیں مولوی صاحب موصوف تصنیف کریں گے، وہ سرکار آصفیہ کے نام سے مشتہر ہوں گی، پس حسب الحکم سرکار تاریخ حکم سے جو ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ ہے، سو روپیہ کلدار ماہ وار شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے نام جاری کیا جاوے، ایک مئی اس کا مولوی شبلی صاحب کو دیا جاتا ہے۔

یہ قدردانی تو سرکار کی طرف سے ہوئی، دارالسلطنت کے امر اور اکابر اور اہل علم نے بھی قدردانی میں کمی نہیں کی، چنانچہ مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی مسعود علی صاحب بی اے محوی (حال مترجم دارالترجمہ) مولوی عبدالغنی صاحب وارثی بہاری مددگار محاسب سرکار عالی اور مولوی محمد جامع صاحب مددگار معتد عدالت کی کوششوں سے ۱۱ ربیع الاول کو کاساپولیشن ہوئی میں (جس کو اب محسن الملک کی کوٹھی کہتے ہیں) ایک کامیاب جلسہ ہوا، مولوی خدا بخش خاں مرحوم جن کی پٹنہ میں لائبریری مشہور ہے اور جو ان دنوں وہاں کی عدالت عالیہ یعنی ہائی کورٹ میں میر مجلس (چیف جسٹس تھے) جلسہ کے صدر تھے۔

جلسہ میں پہلے مولوی عزیز مرحوم نے ایک ”سپانامہ“ مولانا کی خدمت میں پیش کیا، اس سپاس نامہ پر بعض بڑے بڑے امر جیسے رکن الملک خاں دوراں، ترآب جنگ، عماد نواز جنگ جہاں گیر یار جنگ، تفتشل یار جنگ، حیدر یار جنگ، حسن یار جنگ، انتظام جنگ، بعض اکابر علما جیسے سید شاہ عبدالرحیم قادری، مولوی حکیم عبدالرحمن صاحب سہارنپوری (خلف مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری) مولوی وحید الدین صاحب مدرس دارالعلوم اور بعض وکلاء ہائی کورٹ، جیسے محمد سلیمان بیر سٹریٹ لا، سید ابوالقاسم وکیل ہائی کورٹ، فدا حسین خاں وکیل ہائی کورٹ، محمد عبدالباقی صاحب ہائی کورٹ اور بعض اور معززین جیسے سید محمد مہدی خاں، میر نثار حسین سید لطف علی، محمد زماں خاں، نصیر الزماں، سرفراز حسین وغیرہ کے دست خط ہیں، بعض صاحبوں کے دست خط پڑھے نہیں گئے، سپاس نامہ یہ ہے۔

۱۔ یہ تفصیلی حالات آئندہ نظم کے سلسلہ میں جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی نے معارف کے لیے لکھ کر بھیجے تھے، اور جو معارف اکتوبر ۱۹۲۵ء میں چھپے، اسی قسم کی اطلاع مفتی ظفر الملک صاحب علوی، اڈیٹر الناظر نے جو ان دنوں حیدرآباد میں تھے، اور نواب اکبر یار جنگ بہادر (سابق معتد عدالت سرکار عالی) نے ہم کو بھیجی تھی۔ ۲۔ یہ اصل سپاس نامہ اس وقت تک دارالمصنفین میں موجود ہے اور میرے پیش نظر ہے۔

بہ خدمت فیض درجت جناب فضیلت انتساب شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب

تمغہ مجید یہ دام افضالکم

عالی جناب!

ہم لوگ جنہیں آپ کے ہم وقت ہونے کا افتخار حاصل ہے، اس موقع پر جب کہ آپ شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں تشریف فرما ہوئے ہیں، آپ کے خیر مقدم کے لیے حاضر ہوئے ہیں اور ان احسانوں کو یاد کر کے جو آپ نے قوم اور ملک پر اپنی عالم گیر تصنیفات کے ذریعہ سے کیے ہیں، شکرگزارگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، آپ کی پُر جوش مثنوی ”صبح امید“ نے سب سے پہلے ایک نئے گردلربانہ انداز سے قومی ترقی کے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوش خبری سنائی اور ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ نے ہمارے علمی عروج اور دماغی ترقی کی خوش گوار داستان سنا کر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ جب ہمارے اجداد نے اس تاریکی کے زمانہ میں کچھ کیا تو ہم اس روشن زمانہ میں کیا کچھ نہیں کر سکتے، آپ کی مورخانہ تحقیق نے ناموں الرشید کے حالات اس خوبی سے جمع کیے کہ اسلامی سلطنت کی عظمت و جبروت اور دربار خلفا کی شان و شوکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ گیا اور وہ اسباب جن کے لحاظ سے اس زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے میدان تہذیب و شایستگی میں آگے تھے، خوبہ خود ظاہر ہو گئے، آپ نے سیرۃ النعمان میں نہ صرف ایک ایسے پیشوائے مذہبی کے متبرک حالات سے ہم کو آشنا کیا جس کی بے لوث زندگی بعد میں آنے والوں کے لیے ایک عمدہ نمونہ تھی، بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ شریعت غرائے مصطفوی جس طرح نجات اخروی کے لحاظ سے صراط مستقیم ہے، اسی طرح دنیاوی معاملات کے لیے بھی ایک عمدہ دستور العمل ہے اور یورپین مصنفوں کا یہ خیال کہ وہ رومن جورس پروڈانس کی ممنون احسان ہے، راستی سے کس قدر بعید ہے، آپ نے کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق نہایت عالمانہ تحقیق سے کام لے کر اس دھبہ سے اسلام کے دامن عزت کو بالکل پاک و صاف کر دیا، جو عیسوی تعصب نے ایسے اصرار سے لگایا تھا کہ ایڈورڈ گین جیسے نام ور مؤرخ کی پر جوش کوششیں بھی اس کو نہ مناسکیں، آپ نے یورپین نکتہ چینوں کے مقابلہ میں قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ جزیہ کی بنیاد مذہبی تعصب نہ تھی بلکہ وہ ایک فوجی ٹیکس تھا، جس کی ضرورت اس زمانہ میں بھی مسلم ہے، اور حال میں جب امرنی سازشوں کی بدولت یورپ میں دریائے تعصب ایسا جوش زن ہوا کہ خود اسلام کو بنی نوع انسان کے حق میں قہر الہی سمجھنے لگے، تو یہ آپ ہی کی باریک نظر اور پر زور قلم تھا کہ

جس نے حقوق الذمیین کی تشریح کر کے بتا دیا کہ جیسے فیاضانہ اصول شریعت اسلامیہ میں مفتوحین سے برتاؤ کے متعلق قائم کیے گئے ہیں، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے مل سکتی ہے، آپ نے دراصل تاریخ سے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں روح تازہ پھونک کر ایک ایسا کام لیا ہے جو ہمارے خیال میں بھی نہ تھا اور اس لحاظ سے اردو لٹریچر ہمیشہ آپ کا ممنون احسان رہے گا، آپ نے صرف اپنے قلم اور دماغ ہی سے امت مرحومہ کی حمایت نہیں کی ہے، بلکہ آپ کے علمی ذوق اور اسلامی جوش نے ایک دور دراز سفر اختیار کیا اور وہاں سے ایک ایسا بیٹس بہا تحفہ ساتھ لائے جس نے ہمارے ذخیرہ معلومات میں معتد بہ اضافہ کرنے کے علاوہ ہماری قومی ہم دردی کو وسیع کر کے ترکی سے ہمارے رابطہ اتحاد کو اور بھی مضبوط کر دیا، اگرچہ سلطان المعظم اور سرکار عظمت مدار اور خود ہی ہماری سرکار باد پائدار نے آپ کی بے لوث کوششوں کی قدر دانی میں غفلت نہیں کی ہے، لیکن آپ جیسے بزرگوں کی اصلی قدر دانی وہی ہے، جو پبلک کی طرف سے ہو، آپ کی تصنیفات سے ہم حیدرآبادی بھی اسی طرح مستفیض ہوئے ہیں جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے خطہ کے لوگ ہو سکتے ہیں، اور اس لیے ہم پھر اس موقع پر اپنی دلی احسان مندی کا اظہار کر کے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ مدت دراز تک اسلام اور قوم کی خدمت گزاری کے لیے زندہ و برقرار اور ہمارے لیے باعث افتخار ہیں، آمین ثم آمین، فقط“

اس سپاس نامہ کے پڑھے جانے کے بعد مولانا کھڑے ہوئے انہوں نے پہلے اس سپاس نامہ کے جواب میں دو بندوں کا ایک یہ فارسی ترکیب بند اپنے خاص پرائر لہجہ میں پڑھا:

اے دکن ایکہ جہاں راسر وسودا باتست	اے کہ مجموعہ صدیاس و تمنا بائست
اے کہ صد نقش زہر پردہ بر ایچختہ	اے کہ صد جلوہ گری ہائے تماشا بائست
زاہد اتی کہ سر صدق و صفا ہست ترا	شاہد اتی کہ دلاویز اداہا بائست
ساز نیرنگی و صد نعمہ رنگیں داری	لوح از زنگی و صد پیکر زیبا بائست
یادگار حشم و یلم و سلجوق اتی	مایہ دولت بغداد و بخارا بائست
داستاں ہائے عزیزاں ہمہ از برداری	خبر از قافلہ بیثرب و بطحا بائست

۱۔ یہ ترکیب بند ہمارے پاس پورا نہ تھا، اور کلیات میں بھی نہ شامل ہو سکا، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی (حیدرآباد دکن) کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں اس کو ہمارے پاس بھیجا۔

آں پر اگندہ نژادِ عرب و نسلِ عجم
گرچہ شیرازہ امت ہمہ اتر شدہ است
یعنی آں دفترِ اسلام مجزا با تست
گرچہ زماں میکده اکوں اثرے نیست بہ جائے
آں ورق ہائے پراگندہ بیک جا با تست
جرعہ چند ازماں شیشہ و مینا با تست
باز ہم بوئے خوشے زماں گل رعنا با تست

گرمی صحبتِ آں میکده سر جوش تو هست

مصر و غرناطہ و بغداد در آغوش تو هست

اے بزرگانِ گراں پایہ و ارکانِ دکن
ہر سرے موئے من امروز زبانی شدہ است
اے ہمہ شمع فروزندہ ایوانِ دکن
پائے تا سر ہمہ در بند کرم ہائے شامست
بہ سپاس آوری منتِ اعیانِ دکن
باغریے چوئے این ہمہ الطاف و کرم
می تو اں خواندم از جملہ اسیرانِ دکن
ہم زگیری اخلاقی دل آویز بود
چہ کنم! گر نہ شوم بندہ احسانِ دکن
کہ بود روی و شامی ہمہ مہمانِ دکن
بوئے خلق است کہ ول می بردم ورنہ مرا
نتواند کہ فریبد گل و ریحانِ دکن
یارب آں باد کہ ایں تخت گہ و ولت دوویں
سبز و خرم بوو از فیض سلیمانِ دکن
میر محبوب علی خان نظام آصف جاہ
تاجدارِ دکن و قیصر و خاقانِ دکن
صدر جم مرتبہ نواب وقار الامرا
آنکہ صد پایہ فرود از شرفش شانِ دکن
واں دگر صدر نشینان و عزیزانِ وطن
کہ بود از دم شاہ زینب ایوانِ دکن

ہمہ را بزمِ طرب با سرو ساماں باشد

شبلی خستہ ہم از حاشیہ بوساں باشد

یہ ترکیب بند لوگوں کو اس قدر پسند آیا کہ بہت سے لوگوں نے اس کو حفظ کر لیا اور آج (۱۹۲۵ء) اس کو مزہ لے کر دہراتے ہیں، بعض خوش وقت شاعروں نے اس کا جواب لکھا، قصیدہ کے بعد مولانا نے اعجاز القرآن کے موضوع پر دل آویز تقریر فرمائی، جلسہ میں اہل علم کا کافی مجمع تھا، اس لیے وہ بہت لطف اندوز ہوئے۔

۱۔ یہ بیان بھی ہاشمی صاحب ہی کا ہے، جنہوں نے شرکائے جلسہ کی زبانی سن کر لکھا ہوگا۔

مولانا کے اس سفر سے بعض ارکان کالج کو یہ خیال ہو چکا تھا کہ وہ کالج چھوڑنا چاہتے ہیں، چنانچہ اس سفر کا حال سن کر نواب محسن الملک نے مولانا شبلی کو ایک خط لکھا، یہ خط تو نہیں ملا، لیکن مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ مکاتیب میں داخل ہے، یہ خط معاملہ پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے، غالباً نواب صاحب نے مقصد سفر کے بھانپنے کے لیے یہ لکھا تھا کہ آپ شاید اپنے نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے چندہ کے لیے حیدرآباد گئے ہیں، مولانا ۱۵ ستمبر ۱۸۹۶ء کو حیدرآباد سے ان کو جواب دیتے ہیں۔

جناب من!

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آگئی، آپ لوگ مجھ کو اس قدر بھولا اور سادہ دل سمجھتے ہیں، اسکول کے لیے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا، لیکن یہاں کاروبار ہمیشہ ہمیں خرچ ہوتا ہے، باہر نہیں جاتا، مجھ کو سمر دست ماہ وار سے زیادہ نہیں مل سکتے اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی ہے، خرچ بڑھ جاتا ہے، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتدل، بدحیثیت، بے وقعت ہو کر رہوں تو جس انداز ہو سکتا ہے، باقی وہاں کے لیے یہاں کے لوگوں سے چندہ یہ کس قدر حماقت کا خیال ہے۔

مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں، میں کچھ براہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا تو رداں رداں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہوا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جو توڑ، سازش، دربارداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے کام یابی معلوم،

اس لیے میں نے گوشہ عافیت پسند کیا۔

یہاں مجھ سے میری خواہش کا استفسار ہوا، میں نے کہا موجودہ آمدنی کے ساتھ کالج کے تعلق سے آزادی، چنانچہ اسی قدر ماہ وار کا منصب مقرر ہو گیا، الفاروق کے بعد غالباً ۱۵۰ یا ۲۰۰ روپیے ہو جائے، رو بکار میں بھی اضافہ کا وعدہ درج کر دیا گیا ہے، گو مقدار کی تعیین نہیں، بس میری تہا زندگی کو یہ بہت ہے، تابل کا ارادہ نہیں، زیادہ دھوم دھام کی خواہش نہیں، بے زحمت خدا نے اس قدر دیا تو لاکھ لاکھ شکر ہے، اور یوں توقع کا سہ چشم حریصاں الخ..... رہا قوم کی خدمت کرنی، اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلاؤ۔ بہ جائے اس کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں۔

اس خط کا تیور ذرا ٹیکھا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ بعض ارکان کالج کے طرز عمل سے ان کی

ناراضی کس حد تک تھی۔

مولانا کا یہ خیال کہ الفاروق کے بعد ان کے منصب میں ترقی ہو جائے گی، درست نہیں نکلا، آخر ۱۹۱۳ء میں نواب عماد الملک مرحوم کی سفارش سے حضور نظام میر عثمان علی خاں کے عہد میں یہ توقع پوری ہوئی، اعلیٰ حضرت نے دو سو کا اضافہ فرما کر تین سو کر دیے، اس کے بعد مولانا جئے ہی گئے دن، آخر یہ رقم دارالمصنفین کے کام آئی۔

مولانا سے انگریزوں کی سیاسی بدگمانی | اس زمانہ میں ”پین اسلامزم“ کا ہوا سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سلطان عبدالحمید خاں اس کے مرکز اور دنیائے اسلام کے ہر حصہ میں ان کے نائب موجود ہیں، جو اس تحریک کو چلا رہے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے برخلاف تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد ہو کر کے ان کو اسی طرح بغاوت پر آمادہ کرنا ہے، جس طرح یورپ کی سلطنتیں ترکی کی عیسائی رعایا کو ابھار کر بغاوت پر آمادہ کر رہی ہیں۔

سفر روم سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں مولانا کی طرف سے یہ بدگمانی پھیلی کہ وہ اسی ”پین اسلامزم“ (اتحاد اسلامی کی تحریک) کے داعی اور سلطان عبدالحمید خاں کے سفیر بن کر ہندوستان واپس آئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک ہندوستان میں ترکوں کے متعلق جو معلومات پھیلے تھے، وہ زیاد تر عیسائی مضمون نگاروں اور یورپین اہل قلم کے پھیلائے ہوئے تھے، جن میں بڑا حصہ تعصب کی رنگ آمیزی کا تھا، اس سفر نامہ نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکی کے متعلق بہ راہ راست معلومات کا سرمایہ بہم پہنچایا اور ان کے اخلاق و معاشرت اور علمی و فنی ترقیوں سے آگاہ کیا اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کو مصنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود ترکی سے مربوط ہونے کے لیے تعلقات کی ایک نئی زنجیر پیدا کر دی، انگریز حکام نے ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

اتفاق دیکھئے کہ اسی زمانہ میں کالج میں کوئی جلسہ تھا جس میں مولانا نے اردو کا ایک وہ قصیدہ

پڑھا جس کا مطلع تھا:

بزمِ احباب ہے پُر جوش ہے جلسا کیسا
جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا
اس میں ایک شعر تھا:

نو جوانو! یہ حریفوں کو دکھا دینا ہے
اپنی قوت کو کیا قوم نے یک جا کیسا

اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پر بے اختیار انگلی ان انگریزوں کی طرف اٹھ گئی جو جلسہ میں بیٹھے تھے، سمجھانے والوں نے ان کو سمجھایا کہ یہ اشارہ انگریزوں کی طرف تھا، اور یہ طالب علموں کی بغاوت کا سبق تھا، ایک انگریز نے دوسرے سے کہا اور بات عام ہو گئی، مولانا فرماتے تھے کہ اسی زمانہ میں وہ علی گڑھ سے آتے ہوئے ریل کی کسی بے ترتیبی سے فیض آباد اتر گئے اور وہاں کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہر گئے، بنگلہ کے خانساں نے مولانا کا نام سنا تو ملنے آیا، مولانا نے پوچھا کیسے آئے تو اس نے کہا کہ کچھ صاحب لوگ یہاں آئے تھے، وہ آپ کا نام لے کر کچھ یوں ہی کہہ رہے تھے، اسی سے دیکھنے کو جی چاہا۔

کالج میں مولانا کی سیاسی رائے کئی دفعہ یونین کے جلسوں میں ظاہر ہو چکی تھی، وہ شخصی سلطنت کو مضرت سمجھتے تھے اور جمہوریت کے حامی تھے، اسی عرصہ میں کانگریس کا غلط اٹھا تو وہ اس تحریک کے مداحوں میں نکلے، ابھی یہ آواز دے رہے تھے کہ ۱۸۹۳ء کے اخیر میں ندوۃ العلماء کی آواز اٹھی اور اس زور سے اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی، مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے تھے، ان سب باتوں نے مل ملا کر ان کے خلاف بدگمانیوں کا اچھا خاصہ مسالہ اکٹھا کر دیا، یہی واقعہ آگے چل کر دوسرے واقعات کے ساتھ مل کر مولانا کے کالج چھوڑنے کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ہوا، سید محمود کے بعد نواب محسن الملک جب سکریٹری ہوئے تو انہوں نے لفٹنٹ گورنر سے مل کر مولانا کی نسبت گورنمنٹ کو جو شکوک تھے، ان کے رفع کرنے کی کوشش کی۔

یہ بدگمانی اتنے دنوں تک قائم رہی کہ جولائی ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے شملہ میں جو ایک اور ٹیبل کانفرنس بلائی تھی اور جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس میں غالباً مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ یوپی نے جو اردو فارسی اچھی خاصی جانتے تھے، ان سے پوچھا کہ ”انگریزی“ گورنمنٹ کے متعلق مسلمانوں کی رائے شرعی حیثیت سے کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا ”مسلمانوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ ہر ہفتہ جمعہ میں السلطان ظل اللہ فی الارض پڑھتے ہیں، برن صاحب نے کہا اس سے مراد تو سلطان ترکی ہیں۔“

یہ واقعہ مولانا نے مجھ سے ذکر فرمایا تھا اور کہتے تھے کہ دیکھو اب بھی یہ کانٹا ان کے دل سے نہیں نکلا۔

مولانا کے ساتھ ان ہی دنوں خفیہ جاسوس بھی لگائے گئے، سلطان سے جو تمغہ مجیدی انہیں ملا تھا، وہ نشانِ محبت بھی چوری گیا، خدا جانے یہ چوری سیاسی تھی یا اخلاقی، مگر تو لہ بھر چاندی کی قیمت ہی کیا تھی؟

یہی زمانہ ہے جب سرسید کے مشورہ سے مولانا نے خلافت پر ایک مسلسل مضمون لکھا جس میں ترکوں کی خلافت کی مذہبی حیثیت سے انکار کیا تھا، یہ مضمون علی گڑھ میگزین میں چھپا، مگر چوں کہ یہ آورد تھا، آمد نہ تھا، اس لیے وہ نا تمام ہی رہا، ۱۹۲۰ء میں جب میں رکن وفد خلافت کی حیثیت سے لندن گیا تھا تو پروفیسر آرنلڈ اکثر اس مضمون کو یاد دلاتے تھے، میں کہتا تھا کہ مولانا نے لکھا نہیں، لکھوایا گیا تھا، بہ ہر حال انگریزوں کی یہ بدگمانی بڑھتی ہی رہی، یہاں تک کہ طرابلس، بلقان اور کان پور کے زمانہ میں وہ واقعہ بن کر نمودار ہوئی۔

کشمکش اور اختلاف | ہمارے ناظرین اس کتاب کو جس ترتیب سے پڑھتے آ رہے ہیں، اس سے ان کو پتہ لگ رہا ہوگا کہ اب جیسے جیسے دن گزر رہا ہے، سید اور شبلی میں وہ اگلا سا ارتباط اور وہ پہلا سا اعتراف نہیں رہا ہے اور اب وہ موقع آ رہا ہے کہ ان کو سرسید کے حلقہ سے علانیہ باہر آ جانا پڑے۔

اس اختلافِ حال اور کشمکش کے اسباب گو حیاتِ جاوید میں جگہ نہ پاسکے، مگر وہ تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوئے، ضرورت ہے کہ جہاں تک حیاتِ شبلی کا تعلق ہے، ان اسباب پر ایک نظر ڈالی جائے اور گو خود مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی، مگر ان کی تحریروں کے پردے سے اب بھی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے، اگر ہم ان شعاعوں کو یک جا کر لیں تو ان اسباب پر دن کی سی روشنی پڑنے لگے گی۔

سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی کم زوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم نشینوں سے آمنادہ صدقہ کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی کا نتیجہ ان کی اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی جوانی کے دلی دوست اور معاون تھے، وہ لڑائی ہے جس میں سرسید نے فرانس چل کر ڈوئل تک لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا اور بات اتنی تھی کہ مولوی سمیع اللہ صاحب کالج میں مسلمان بچوں کی تربیت کا کام انگریزوں کے ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتے تھے، اور سرسید نے تعلیم و تربیت دونوں انہی کے سپرد کر دی تھی، کالج میں مشربک پر پھل کی ہمہ گیر حکومت، ڈسٹریبل کی منظوری اور سید محمود کی جانشینی کے مسئلوں میں ان کے بڑے بڑے دوست ان سے الگ ہو گئے اور اس اختلاف کے صلہ میں سرسید کی زبان سے وہ کچھ سنا جس کی توقع ان سے نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۔ حیاتِ جاوید، جلد اول، ص ۲۹۰ میں مولانا حالی نے دے لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے، لکھا ہے کہ: 'اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈپانک طبیعت کے آدمی تھے، اس خصلت کو چاہوان کے برے کاموں کی بنیاد سمجھو، اور چاہوان کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو، بہ ہر حال یہ خصلت ان میں ضرورت تھی۔'

سرسید پر مولانا نے سب سے پہلی تنقید اپنی سب سے پہلی تصنیف ”گزشتہ تعلیم“ میں کی، رسالہ کے بیچ میں تراجم کا بیان ختم کر کے ایک ”ریمارک“ کے نیچے لکھا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ عربوں نے عربی زبان میں دنیا کے علوم کا ترجمہ کر کے اپنے زمانہ میں جو ترقی کی اس قیاس پر آج عمل نہیں کیا جاسکتا، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے بانیوں کو عربی کے اس واقعہ سے دھوکا ہوا، اور وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ترجموں کے ذریعہ سے علوم کو ترقی دی، ہم بھی یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور قوم کو ترقی دیں گے، یہ خیال غلط تھا، کیوں کہ ان ترجموں کے لیے لاکھوں روپے درکار ہیں، جو خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ممکن تھا اور اب غیر ممکن ہے، دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں علوم محدود تھے اور ترقی رُک چکی تھی، جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئی تھیں، یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا تھا اور اس زمانہ میں علوم کی ترقی کی انتہا ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی حد ہے، تیسری بات یہ کہ اس زمانہ میں عربی اسلامی ملکوں میں حکمِ راہِ زبان تھی اور اردو حکمِ راہِ زبان نہیں اور دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ قوم نے اس زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی ہو، جو ان پر حکومت کرنے والی نہ ہو، آخر میں تھا، مگر ہم کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ خود سید احمد خاں صاحب نے جو ”سائنٹفک سوسائٹی“ کے بانی ہیں، متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے یہ ہلکا سا اعتراض جس کی معذرت بھی کر دی گئی تھی، سرسید کو پسند نہیں آیا تھا، کیوں کہ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں اس سرسری سی بات کے جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی اور حاشیہ کا ایک پورا صفحہ اس کے لیے نذر کیا اور بتایا کہ یہ خیال خود سرسید کی تحریروں سے ماخوذ ہے، مولانا شبلی کا آپ پیدا کیا ہوا نہیں، پھر دکھایا ہے کہ آج کل رعایا اپنی طاقت سے وہ کام کر رہی ہے جو کل تک صرف سلاطین ہی کر سکتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ اگر تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں کہ کسی غیر حکمِ راہِ زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی گئی ہو تو ضرور نہیں کہ آئندہ بھی نہ ہو۔

یقیناً مولانا حالی کا بیان صداقت پر مبنی ہے اور جامعہ عثمانیہ کے وجود نے ہمارے اکابر کے ان مخلصانہ جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اتفاق دیکھئے کہ حیدرآباد میں اردو حکمِ راہِ زبان کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس نے خلفائے عباسیہ ہی کی طرح اردو تراجم پر روپیہ بہایا اور اس لیے مولانا حالی اور مولانا شبلی دونوں کے

۱ حیاتِ جاوید، جلد دوم، ص ۳۲۸ (نامی پریس کان پور)

شرائط کے مطابق اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ علوم و فنون کی ترقی کا باعث بنے اور کیا عجیب بات ہے کہ یہ تجویز مولانا شبلی کی اس تحریر کے پینتیس برس بعد خود مولانا شبلی ہی کی تحریک سے عالم وجود میں آئی اور ان کے شاگرد رشید و برادر عزیز مولانا حمید الدین صاحب کے ذریعہ سے تجویز نے عمل کا پیرا ایا اختیار کیا۔

مگر سرسید اور مولانا شبلی کے بیانوں میں ایک ذرا فرق ہے، سرسید نے اپنی تعلیمی شہادت میں یہ تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان میں حکمِ راہِ زبانِ انگریزی ہے، اس لیے ہندوستان میں انگریزی ہی کے ذریعہ تعلیم ممکن ہے اور مولانا شبلی نے یہ نہیں کہا، بلکہ یہیں تک کہہ کر رہ گئے کہ حکمِ راہِ زبانِ ہی کے ذریعہ قوم میں علوم و فنون کی ترقی ممکن ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی قوم اپنی زبان کو علوم و فنون کی زبان بنانا چاہتی ہے، تو اس کو چاہیے کہ پہلے اپنی زبان کو حکمِ راہِ زبان بنائے اور آج واقعات کی روشنی میں ہماری زبان حکمِ راہِ زبان بننے کی کوشش کر رہی ہے، وہ علوم و فنون کے خزانوں سے بھر رہی ہے۔

بہر حال یہ ایک ضمنی بحث تھی، مقصود یہ ہے کہ سرسید پر تنقید کے لیے مولانا شبلی کی زبان کا لُج میں آنے کے چند سال بعد ہی کھل چکی تھی۔

اس کے بعد دوسرا سبب مذہبی اختلاف ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید کی صحبت میں مولانا میں جو پہلے ہی سے علوم عقلیہ سے دل چسپی رکھتے تھے، مذہبی عقل پسندی آگئی تھی اور عقل و نقل کی تطبیق کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور اشاعرہ کے بہت سے مسائل کی خامیاں یا غلطیاں ان کو نظر آنے لگی تھیں، مگر یہ قطعاً غلط ہے کہ وہ معتزلی بن گئے تھے، بلکہ یہ ہے کہ وہ شدید حنفی تھے، اور اسی اصول پر وہ علم کلام کی طرف جھکے تو ماتریدیت پر آ کر رہے، بہر حال یہ بحث اپنے موقع پر آئے گی۔

لیکن اس عقلیت پسندی کے باوجود وہ ماشاء اللہ دینیات پر عبور رکھتے تھے اور کلام و محاورات عرب کے پوری طرح ماہر تھے، اس لیے سید صاحب اپنی تفسیر اور اپنے مضامین میں جو تاویلات کیا کرتے تھے ان کے لیے وہ مولانا سے جس قسم کے معلومات چاہتے تھے، وہ گوان کے لیے مہیا کر دیتے تھے مگر وہ خود ان کی اس قسم کی تاویلات کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی لیے مولانا نے ان کو آہستہ آہستہ عقل پسندی کی آزاد شاہ راہ سے ہٹا کر امام غزالی، رازی، ابن سینا اور قاضی ابن رشد کی تصنیفات سے آشنا اور معتزلہ کے مولانا حالی اپنے مضمون ”سرسید اور مذہب“ مندرجہ علی گڑھ میگزین (مئی ۱۸۹۸ء) ص ۱۳۳ میں فرماتے ہیں، ”مگر اسی کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں، جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیسے ایسے تاویلات بارہ پراٹھینان ہو گیا، اور کیوں کر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں۔“

خیالات سے باخبر کیا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرسید کی آزاد خیالی جس کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی، آخر میں حکما و متکلمین اسلام کے خیالات تک محدود ہو کر رہ گئی۔

ایک دفعہ مولانا فرماتے تھے کہ ”سید صاحب جنات کی حقیقت پر ایک رسالہ لکھ رہے تھے (وہ رسالہ چھپ بھی گیا ہے) اتفاق سے اسی زمانہ میں امام باقلانی کی اعجاز القرآن آئی، ان میں جنوں کے اشعار ہیں اور جاہلی شعرا کے ایسے اشعار ہیں جن میں یہ بیان ہے کہ جنوں سے ہماری دوستی ہے، وہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ہمارے ساتھ کھاتے ہیں، وغیرہ مولانا نے سرسید سے اس کا ذکر کیا تو بولے کہ یہ اشعار ہمارے بڑے کام کے ہیں، ہم کو دیتے ہیں لیکن سرسید ان اشعار کو اس کام میں لائے کہ کلام عرب میں جنوں کے معنی دہقانی، صحرائی یا جنگلی انسان کے ہیں، حالاں کہ مولانا کا یہ نشانہ تھا، وہ جنات کے مستقل وجود کے قائل تھے، ابن تیمیہ کے مضمون میں فرماتے ہیں، جن کے وجود سے انکار نہیں لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جانا نہیں کرتے۔

سرسید کا بڑا کارنامہ خرق عادت کا انکار ہے اور اسی کے لیے دور از کار تاویلوں پر سارا زور ہے، مولانا اس کے متعلق الکلام میں ایک موقع پر لکھتے ہیں ”قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقہ جدیدہ (؟) ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شبہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکار محض بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بہ خوبی واقف ہیں، بے شبہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے کافی ہیں، جو بے چارے عربی زبان اور اس کے طرز و اسلوب سے نا آشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلخچ کیا کام دے سکتی ہے۔“

اسی تصادم سے بچنے کے لیے سرسید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا، کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا، سرسید اپنے تہذیب الاخلاق کے لیے تقاضا کرتے، تو نال جا تے، بہت مجبور کیا تو آخر میں ”المعتزلہ والاعتزال“ کے نام سے ایک تاریخی مضمون شروع کیا، جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ مطابق جولائی ۱۸۹۵ء کے پرچم میں چھپا اور اس کو بھی نا تمام چھوڑ دیا، جس کو مولوی وحید الدین سلیم نے ۱۳ شوال ۱۳۱۳ھ

۱۔ طبع سازی۔

کے پرچہ میں ”مشاہیر معتزلہ“ کے عنوان سے جس طرح اُن سے بنا پورا کیا، اس مضمون میں بھی مولانا نے اپنے چھپانے کا اتنا اہتمام کیا کہ صاف صاف اپنا نام شبلی نعمانی لکھنے کے بجائے شبلی کی جگہ ”الاسدی“ اور نعمانی کی جگہ ”الاعظمی“ لکھا۔

اسی طرح بعض فقہی مسائل کا حال تھا، سرسید عیسائیوں کی گردن مڑوڑ کر ماری ہوئی مرغی کو اس بنا پر حلال سمجھتے تھے کہ اہل کتاب کے ذبح کا یہ موجودہ طریقہ ہے، اور اہل کتاب کا ذبیحہ اسلام میں حلال ہے، سرسید نے اپنے اس مسلک کی تائید میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے، حالانکہ گو اس میں شبہ نہیں کہ اہل کتاب کا کھانا (طعام) اور ذبیحہ حلال ہے، مگر اس شرط کے ساتھ ہے کہ حرمات اسلام میں سے نہ ہو، اور دم گھٹ کر مرنا ہو یا دم گھوٹ کر مارا ہو یا جانور قرآن پاک کی تصریح ”والممنخقة“ کے مطابق اسی طرح حرام ہے جیسے سورج کو سرسید بھی حرام کہتے ہیں اور اس کا کھانا حرام بتاتے ہیں۔

مولانا کو سفر فرم میں جہاز پر یہ موقع پیش آیا تو لکھتے ہیں ”چوں کہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کیے جاتے اور مولوی سبیح اللہ خاں صاحب نے اپنے سفر نامہ میں تجربہ سے اس کی تصدیق بھی کی ہے، میں نے دو تین روز تک پرند کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا، مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب پوچھا میں نے کہا ہمارے مذہب میں محققہ حرام ہے، بولے کہ اس جہاز پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، گردن مڑوڑ کر مارے نہیں جاتے، چوں کہ شرعاً ان کی تمہا شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور اس کی تصدیق کی، ذبح کرنے والا عیسائی تھا وہ ذبح کرتے وقت کچھ پڑھتا تھا، صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا، اگرچہ حنیفوں کے یہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کے لیے میں شامعی بن گیا تھا جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔“ (سفر نامہ، ص ۱۵)

ایک دفعہ سرسید نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تائیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے، فرمایا اس لیے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے، آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں، مغرب کی اذان اور نماز ہو جاتی ہے اور آپ شریک نہیں ہوتے وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے، انہیں کیا معلوم کہ سلسلہ البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں، اور آپ دو نمازیں ملا کر (جمع بین الصلوٰتین) پڑھتے ہیں۔

۱۔ شبلی کے معنی بچہ شیر کے ہیں، اس کا ترجمہ الاسدی اور نعمانی امام اعظم کی طرف نسبت تھی تو اس کو اعظمی کر دیا۔

ایک بات سے دوسری بات پیدا ہوتی چلی گئی، سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی، مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انہوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا، اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی جو اس زمانہ میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنہوں نے سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کیا اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے، مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے گو مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا۔

سرسید دعاؤں کی قبولیت کے قائل نہ تھے اور اس لیے قبولیت کے لیے دعا مانگنے کو فعلِ عبث قرار دیتے تھے، اس مسئلہ پر تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین اور ان کے اور نواب محسن الملک کے سوال و جواب چھپ رہے تھے، اسی زمانہ میں علی گڑھ کے ایک ہندو بزرگ جو اچھے پڑھے لکھے تھے صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڑھ میں پوسٹ ماسٹر تھے، انہوں نے سرسید کے مضمون ”الدعا والاستجابہ“ کی تردید میں ایک دل نشیں رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک نے نہایت عمدہ ریویو لکھا اور اس ریویو کے سلسلہ میں اس پر افسوس کیا کہ سرسید جو نہ صرف مسلمان اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں، بلکہ خانوادہ رسالت کے چشم و چراغ ہیں، وہ تو دعا کو جو بندہ اور خدا میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں اور ایک ہندو جس کو کافر کہا جاتا ہے، اس کی حمایت کو کھڑا ہو، اس رسالہ کی قوت استدلال اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کے مصنف دراصل مولانا شبلی ہیں، اور اس شبہ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اعظم گڑھ میں لکھا گیا جو مولانا کا وطن تھا اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقف کار اور شاہناہ بھی تھے۔

ان واقعات کے ساتھ الفاروق کی تصنیف میں جو اختلاف رائے پیدا تھا، وہ بھی نشا کے لائق ہے، ایک کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم صرف رسول کی حکومت و سلطنت کے نمائندہ تھے اور دوسرے کے نزدیک وہ مع اچھے خنواں ہمدارند تو تہاداری کے مصداق تھے، اس سلسلہ میں سرسید نے یہ دونوں روایتیں مولوی اقبال احمد خان سمیل، ایم، اے (علیگ) کی تحریر مندرجہ الاصلاح سرائے میر سے لی گئی ہیں، جو سالہا سال علی گڑھ میں رہ چکے ہیں اور مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین دونوں کے شاگرد تھے، اور مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کئی سال رہے تھے۔

خلفائے راشدین کی نسبت اپنے نوح کے خط اور اخباری مضمون میں جو رائے ظاہر کی مولانا جیسے شیفتہ اصحابِ رسول ﷺ کے لیے اس کا برداشت کرنا آسان نہ تھا، اسی لیے انہوں نے الفاروق پوری محنت سے لکھی اور سرسید کے اعتراض و اختلاف اور ناراضی کی کوئی پروا نہ کی۔

مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں، اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں، سرسید کو ان کی اس تقریر پر بڑا غصہ آیا، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستہ سے پیچھے ہٹادیں گی جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں، چنانچہ اس کے خلاف انہوں نے سخت مضمون لکھا۔

سرسید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انگریزی طور و طریق اور وضع و قطع اختیار کریں، تاکہ ان میں حاکمانہ روح پیدا ہو، مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ شہر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں بن سکتا، دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی ہی قوم سے دور سے دور تر ہوتے گئے، تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور و طریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سرو سامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے اور وہ تعلیم جو قوم کی دولت مندی کی خاطر ان کو دی گئی تھی وہ اس نقالی کی بدولت تنگ دستی کا ذریعہ بن گئی، جس کی وجہ سے وہ قوم کی امداد و اعانت کے قابل نہ رہے اور نہ وہ ایثار کی کوئی خدمت انجام دے سکے۔

مولانا شبلی مرحوم سرسید کے اس خیال کے تمام تر مخالف تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں ”افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے، میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سرسید صاحب سکھا گئے۔ (مسعود-۲۳)

یہ مولانا کے اخیر خطوں میں سے ہے، جس کے بارہ تیرہ دن کے بعد انہوں نے وفات پائی۔ یہی سبب ہے کہ سرسید کی وفات پر ان کی زندگی کے کارناموں پر جب مختلف مضامین کا لکھا جانا طے ہوا، اور اس سلسلہ میں سرسید اور مذہب کا عنوان مولانا شبلی کے لیے تجویز ہوا، تو انہوں نے اس سے انکار کیا، آخر لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر ”سرسید اور اردو لٹریچر“ کا دوسرا عنوان لیا اور پہلے عنوان پر مولانا حالی نے لکھا، یہ دونوں مضمون ایک ساتھ علی گڑھ میگزین کے مئی ۱۸۹۸ء کے نمبر میں شائع ہوئے ہیں، مولانا حالی کا یہ مضمون غالباً حیات جاوید کے مباحث کا خلاصہ ہے، جس کو وہ اس وقت لکھ رہے تھے۔

خود سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا تھا، اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے، وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں، کیونکہ وہ پاس رہتے تھے، مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے، چنانچہ اس بارے میں جتنی بالواسطہ تحریکیں کی گئیں ان کو مولانا بہ لطائف الجلیل ٹالتے گئے، اسی اثنا میں سرسید کے نام نواب اسماعیل خاں صاحب رئیس و تادلی (علی گڑھ) کا ایک خط مکہ معظمہ سے آیا کہ انہوں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی صاحب آپ کی لائف لکھ رہے ہیں، مولانا کو یہ خط دکھایا گیا، مگر اس ”مقدس خواب“ کی تعبیر بھی صحیح نہیں نکلی، اس کے بعد سرسید مرحوم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے، مولانا اس کو جھنپ لکھتے رہے، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو یہ قرعہ فال مولانا حالی مرحوم کے نام نکلا، اور انہوں نے ۱۸۹۳ء سے اس کو انجام دینا شروع کر دیا۔

عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے جس میں دونوں کو اختلاف تھا، سرسید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ مسلمانوں میں ہزارہی تعلیم کے شیوع کو جوان کو ادھر سے ہٹائے، مسلمانوں کے حق میں مضرت سمجھتے تھے، اسی لیے پنجاب میں ۱۸۸۱ء میں مشرقی تعلیم کا جو نظام بن رہا تھا، انہوں نے اس کی اتنی مخالفت کی کہ اُس کے پزے اڑ گئے، اسی طرح ۱۸۸۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی امتحانات کے اجراء پر ایسی ہی مخالفت کی، چنانچہ ایک زمانہ میں دیہی زبان میں تعلیم کی تحریک کر چکنے کے بعد وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے کہ اس سے بھی ان کے خیال میں انگریزی کی تعلیم کو نقصان پہنچتا، بہ حال ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لیے دل چسپی نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے۔

۱۔ اس اصرار کی یہ تصریح مولانا نے خود اس مضمون کے اخیر میں کی ہے۔ ۲۔ حیات جاوید میں مولانا حالی نے بھی ان کی اخیر عمر کی اس خواہش کا ذکر کیا ہے۔ دیباچہ ص ۱۳، کان پور ۱۹۰۳ء۔ یہ واقعہ اقبال صاحب سہیل نے مولانا سے سنا تھا۔

مولانا کا عقیدہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم نہ رہی تو پھر مسلمان مسلمان رہیں گے کہاں؟ جن کی ترقی کے لیے یہ جدوجہد ہو رہی ہے، سفرنامہ میں قدیم عربی تعلیم کی ابتتری اور اس کی ترقی و اصلاح کے سلسلہ میں مولانا ۱۸۹۲ء میں بے قابو ہو کر لکھتے ہیں، یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے، اور تعلیم قدیم کی ابتتری پر عموماً رنج اور افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج و افسوس ظاہر کرتے ہیں، وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شامت ہے، میں اگر چہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں، تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی ”قومیت“ قائم رکھنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔“ (سفرنامہ، صفحہ ۷۸)

۱۸۹۳ء میں جب ندوۃ العلماء قائم ہوا تو وہ مولانا کی عین تمنا کے مطابق تھا، اس لیے انہوں نے اس صدا پر نہ صرف یہ کہ لبیک کہا، بلکہ اس وقت سے وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا، کالج میں مولانا کی زندگی کا یہ رُخ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا، شاید ۱۸۹۶ء میں جب مولانا کو حیدرآباد میں وظیفہ ملا ہے تو فطرۃً ان کو خوشی ہوئی کہ اب وہ کالج کے حلقہ سے آزاد ہو کر اپنے مذاق کا کام کریں گے، اسی جذبہ میں انہوں نے ایک فارسی قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ ادب طلب اور ردیف است تھی اس میں ایک مصرع یہ تھا:

زیں سپس ندوہ و تدربیس علوم عرب است

یہ قصیدہ کالج کے احاطہ میں قابل اعتراض ٹھہرا اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے مولانا

نے اس کو ضائع کر دیا۔

۱۔ سرسید کی نئی تحریک میں قومیت نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اس لیے یہی لفظ قلم سے نکلا ہے۔ ”س“ ۲۔ سرسید نے ۱۸۸۷ء میں اپنی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اوقاف کی آمدنی سے عربی تعلیم کے قیام کی تجویز منظور کی تھی۔ ۳۔ یہ پورا واقعہ اور یہ مصرعہ مولانا کی زندگی ہی میں مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم وکیل ندوۃ العلماء کی زبانی میں نے سنا تھا، مرحوم بڑے محنتی اور عملی کارکن اور خوش تقریر اور پر جوش مقرر تھے، انہوں نے اپنی جوانی میں ترک دنیا اور فقر اختیار کر لیا تھا، گیر واک پڑا پہنتے تھے، جنگل میں رہتے تھے، اور جنگل کی جڑی بوٹیاں کھاتے تھے، ندوہ کا شور و غل سن کر اس کے بریلی کے جلسہ میں شریک ہوئے، اور ایسے متاثر ہوئے کہ جوگ چھوڑ کر ندوہ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، اور آخر ساری عمر ندوہ کی خدمت میں بسر کر دی، ۱۹۳۳ء میں شملہ میں وفات پائی، اس واقعہ کی دوسری روایت مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس مظفر پور سے سنی جو اس کی تائید میں تھی۔

اختلافات کے قصیدہ کا آخری بند سیاسی اختلاف ہے، سرسید وہ سرسید جنہوں نے اسباب بغاوت ہند لکھا جو آگرہ کی نمائش میں ہندوستانیوں کی عزت کے لیے انگریزوں سے لڑ گئے، جنہوں نے متعدد دفعہ گورنمنٹ کی تجویزوں کی شدید سے شدید مخالفت کی، ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کا وجود ہوا تو وہ اس کے سخت مخالف بن گئے اور ایک سال بعد اپنی تعلیمی کانگریس قائم کی، جس کے دوسرے سالانہ اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۸۸۷ء میں اس کی مخالفت میں نہایت پر جوش تقریر کی اور آخر ۱۸۸۸ء میں کانگریس کے مقابلہ کے لیے ایک پیٹریاٹک ایسوسی ایشن الگ بنائی، جس میں تمام رئیسوں، تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کو ملا کر کانگریس کے مقابلہ کے لیے ایک محاذ جنگ قائم کیا، پھر ۱۸۹۳ء میں مسٹر بک کے ساتھ مل کر مڈن اینگلو اور ٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔

مولانا شبلی مرحوم شاید خلافت راشدہ کے اصول انتخاب کی بنا پر یا فطرۃ جمہوریت پسند تھے، اور سرسید شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے، حالاں کہ دوسری طرف وہ اپنے کو مذہباً مسلمان اور نسلًا عرب ہونے کی بنا پر ریڈیکل کہتے تھے، کہیں آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ کالج میں طلبہ کی ایک مجلس میں ایک دفعہ شخصی اور جمہوری طرز سلطنت پر مباحثہ تھا، مولانا نے جمہوری طرز سلطنت کی تائید کی اور اس پر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے واقعات اور اصول انتخاب سے استدلال کیا تھا، یہ تقریر نہایت کامیاب ہوئی اور طلبہ مولانا کے زور بیان سے بہت متاثر ہوئے، حاضرین میں سرسید مرحوم بھی تھے، انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس پر طبیعت سیر نہیں ہوئی تو مولانا کے دلائل کے رد میں ایک چھوٹا مضمون لکھا جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۸/ جون ۱۸۹۲ء عیسوی کے پرچہ میں ”ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت“ کے عنوان سے مولانا کے سٹریٹری کے لیے روانہ ہو جانے کے بعد چھپا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ تقریر اپریل ۱۸۹۲ء سے پہلے اسی کے کسی قریب زمانہ میں کی ہوگی۔

اس واقعہ سے دونوں کی طبیعتوں کا سیاسی اختلاف مذاق معلوم ہوتا ہے، اسی لیے مولانا سرسید کی ان کوششوں کو جو وہ نیشنل کانگریس کی مخالفت میں کر رہے تھے، پسند نہیں کرتے تھے، اور وہ دل سے کانگریس کے اصولوں کے حامی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ میں دونوں کی راہیں بالکل الگ رہیں اور اگرچہ مولانا نے کبھی سیاست کے عملی کوچہ میں قدم نہیں رکھا، مگر اخیر تک ان کی سیاسی رائے یکی رہی۔

۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں روم و یونان کی جوڑائی ہوئی اور اس میں ترکوں کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف جو فتحِ عظیم ہوئی اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پر جوش بنا دیا تھا، سارے ہندوستان میں اُس کی خوشی منائی گئی اور سبھی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا، سرسید کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور اس جوشِ مسرت کے خلاف دو نہایت سخت مضمون لکھے جو اتحادِ اسلامی کے حامی مسلمانوں کو تیر کی طرح آ کر لگے اور انہوں نے سرسید کی اس انگریز دوستی پر سخت اعتراضات کیے۔

سرسید کے حلقہ میں رہ کر اتنا بڑا اختلاف کوئی معمولی جرم نہ تھا، جس کو سرسید تو بخش بھی سکتے تھے مگر ان کے بعض حامیوں نے اس کو کبھی نہیں بخشا، چنانچہ مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر جو اس زمانہ میں سرسید کی مخالفت سے تابع ہو کر ان کے نہ صرف بڑے حامی بن چکے تھے، بلکہ وہ ان کو مجتہدِ اعظم ماننے لگے تھے اور اسی لیے وہ مولانا شبلی سے ناراض رہنے لگے تھے اور اپنے اخبار میں ان سے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اس مجتہدِ اعظم پر ایمان لائیں اور اسی لیے وہ مدوہ اور عربی تعلیم کے سخت مخالف ہو رہے تھے، اور کانگریس سے بھی ان کو اُس زمانہ میں اسی لیے شدید اختلاف تھا، مولانا کا خیال تھا کہ سرسید کی سیاسی رائے میں جو انقلاب ہوا وہ ان کی ذاتی رائے نہ تھی، بلکہ کالج کے پرنسپل مسٹر بک نے اپنی زبردست شاطرانہ چال سے سرسید کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا کہ کانگریس کی مخالفت اور انگریزوں کی دوستی ہی میں دراصل کالج کا اور مسلمانوں کا فائدہ ہے، اور وہ اس کے اس سحر میں ایسے مسحور ہو گئے تھے کہ اس کے بعد اُن کی اپنی رائے فنا ہو گئی تھی اور اب وہ جو کچھ دیکھتے تھے، مسٹر بک اور انگریز اسٹاف کی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اور جو کچھ سنتے تھے وہ ان ہی کے کانوں سے سنتے تھے، مولانا نے اپنے مشہور مضمون ”پولیٹیکل کروٹ“ میں اس تفصیل کو کس قدر ادبیانہ و معجزانہ اعجاز میں ادا کیا ہے، وہ پر زور دست و قلم جس نے ”اسبابِ بغاوت ہند“ لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل لا کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپینوں کی دھجیاں اڑادی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آریٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوقِ طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پر زور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا، وہ جاں باز جو آگرہ کے دربار سے اس لیے براہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانوں اور

۱۔ سرسید کے آخری مضامین میں ”یونان اور ترک“ اور ”سلطان اور ہندوستان کے مسلمان“ کے عنوان سے یہ مضمون پڑھے۔

۲۔ مثال کے طور پر مقالات شبلی جلد ہفتم میں مدوہ اور البشیر کا مضمون پڑھیے۔

انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا ”میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں، اور صرف ان ہی کی بدولت ہے کہ علم آزادی اور حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی، میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سر تاج ہیں۔“ (دیکھو تقریر پریڈنٹ مسلم لیگ بہ مقام ناگ پور)

حالات اور گرد و پیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا، کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔“

اس کے بعد مولانا نے اس مضمون میں سرسید کی لکھنؤ والی اس مشہور سیاسی تقریر کی ہر دلیل کا جواب دیا ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اسی تقریر کا اثر تھا کہ مسلمان کانگریس سے باز رہے اور جس کو ایک خاص حلقہ میں اتنا پسند کیا گیا کہ مسٹر بک نے پوری تقریر کو تار پر ولایت بھجوا دیا۔

سرسید نے یہ تقریر ۱۸۸۷ء میں کی تھی اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا ان کی اس سیاسی پالیسی کو ابتدا ہی سے صحیح نہیں سمجھتے تھے، اور ان کی رائے تھی کہ علی گڑھ کالج کو مسٹر بک کے ہاتھوں غلط نصب العین کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے۔

مولانا مرحوم اپنے ایک خط میں جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء میں ایک صاحب کو اپنے حالات و سوانح کے استفسار میں لکھا تھا، لکھتے ہیں ”رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں کرتے رہے۔“

یہ اختلاف بھی کالج سے مولانا کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ایک نہایت ثقہ اور معتبر بزرگ (مولانا شروانی) جو مولانا کے بڑے گہرے دوست ساتھ ہی سرسید کی تحریک کے پرانے حامی، اور اس کی جلوت و خلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں، مولانا کے اوراقِ حیات کے ایک مسودہ پر جس میں مولانا کی دل برداشتگی کی تفصیلات تھیں اپنے قلم سے یہ ارقام فرمایا ”دل برداشتگی کی وجہ سیاسی آرا کا اختلاف بھی تھا، مولوی شبلی صاحب اب جدید سیاسی تحریک کے حامی ہو چکے تھے۔“

۱۔ یہ مسٹر بک کی طرف اشارہ ہے۔ ۲۔ یہ پوری تفصیل مضمون ”مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ“ میں ملاحظہ فرمائیے جس کو مولانا نے ۱۹۱۱ء میں شیخ تقییم بنگال کے موقع پر لکھا تھا۔ ۳۔ معارفِ اعظم گڑھ بابت ماہ نومبر ۱۹۲۳ء ص ۳۹۴۔

اسی سلسلہ کی ایک نئی کڑی ندوۃ العلماء کی شرکت کا سبب بن گئی، یہ مجلس اس زور شور سے اٹھی تھی کہ حکام کو خیال ہو گیا کہ اس سے مسلمانوں میں بغاوت پھیل جائے گی، بعض غرض مندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس کو یہ رنگ دے کر لفٹنٹ گورنر تک پہنچایا اور لفٹنٹ گورنر نے بھی مولانا کا علی گڑھ میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔

ندوۃ العلماء

یعنی

علما کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت

دلی کا خانوادہ | دلی میں اسلامی حکومت کا آفتاب جب ڈوب رہا تھا تو اسی کے مطلع سے اسلام کا ایک اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا، یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا خانوادہ تھا، سچ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیشین گوئی کے مطابق اس کے بعد جس کو ملا اور جو کچھ ملا اسی دروازہ سے ملا، ہندوستان میں ردِّ بدعات کا دلولہ، ترجمہ قرآن پاک کا ذوق، صحاح ستہ کا درس، شاہ اسطیعیل اور مولانا سید احمد بریلوی کا جذبہ جہاد، فرقہ باطلہ کی تردید کا شوق، دیوبند کی تحریک، ان میں سے کون چیز ہے جس کا سررشتہ اس مرکز سے وابستہ نہ ہو۔

مولوی بزرگ علی | ماہرہ ضلع ایٹہ کے مردم خیز قصبہ میں ایک بزرگ مولوی بزرگ علی صاحب پیدا ہوئے، جوانی میں تحصیل علم کی اور آخردہلی جا کر اس چشمہ فیض سے میراب ہوئے، جوشاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کی درس گاہوں سے بہ رہا تھا، اُس زمانہ کے علما کے دستور کے مطابق چند روز آگرہ اور کلکتہ میں درس دینے کے بعد علی گڑھ میں جس کا پرانا نام کول تھا، انگریزی حکومت میں بادل ناخواستہ منصفی کا عہدہ قبول کیا، مگر اس عہدہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اسی سلسلہ میں وہاں کی جامع مسجد میں بانی مسجد نواب ثابت خاں نے محمد شاہ کے زمانہ میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اُس کو دوبارہ زندہ کیا اور کچھ دنوں کے بعد منصفی کے عہدہ سے استعفا دے دیا، اس زمانہ میں ان علما کا جو انگریزی تسلط سے بچ و تاب میں تھے، ٹونک مرکز بن رہا تھا، مولانا اسطیعیل شہید کے پراگندہ قافلہ کے مسافر بھی یہیں پناہ گزین تھے، بہر حال نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ٹونک کے اصرار پر ریاست میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا اور وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔

۱۔ مکاتیب شبلی بہ نام مولانا شروانی (۳۱)۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی غیر متوقع حکومت پا کر عیسائی حاکموں اور پادریوں کا ولولہ یہ تھا کہ وہ بالآخر ہندوستان کو عیسائی بنالیں گے، علمائے اسلام اس کے مقابلہ کے لیے اٹھے، ان میں سے کئی بزرگوں کے مبارک ناموں اور کاموں سے ہماری واقفیت ہے، اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی مولانا بزرگ علی ہیں، ردِ نصاریٰ میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے بشارات کا قلمی نسخہ حبیب گنج کے کتب خانہ میں ہے۔

مفتی عنایت احمد | مولانا بزرگ علی کے آغوش میں جو ہونہار پل کر بڑھے ان میں دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ایک سعادت مند مفتی عنایت احمد صاحب تھے، مفتی صاحب ابتدائی کتابیں دوسرے علما سے پڑھ کر دلی گئے اور شاہ اسحاق صاحب سے حدیث کا درس لیا اور وہاں سے آکر علی گڑھ کول میں مولوی بزرگ علی صاحب سے تکمیل کی اور وہیں مدرس ہو گئے، ایک سال کے بعد وہ وہیں مفتی اور منصف مقرر ہوئے، یہاں پلکھنہ ضلع علی گڑھ ایک قریہ سے ایک صاحب زادہ آکر درس میں داخل ہوئے، جن کو آگے چل کر دنیانے استاذ العلماء مفتی لطف اللہ صاحب کے نام سے جانا، مفتی عنایت احمد صاحب بدل کر بریلی پہنچے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا، اس ہنگامہ کی پاداش میں بالزام بغاوت جن علمائے اعلام کو قید و جلا وطنی کی سزا دی گئی، ان میں ایک یہ بھی تھے، چنانچہ نظر بند کر کے جزیرہ انڈمان بھیج دیے گئے، مگر کیا عجیب بات ہے کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمہ شیریں اسی طرح بہتا رہا، چنانچہ وہاں کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے صرف میں علم الصیغہ اور سیرت میں تواریخ حبیب اللہ اور جغرافیہ میں ترجمہ تقویم البلدان مشہور ہیں، آخر یہی تصنیفات رہائی کا ذریعہ بنیں، اور ۱۸۶۲ء میں رہا ہو کر ہندوستان آئے اور پھر چشمہ فیض اسی طرح جاری تھا۔

کان پور میں علم | اس زمانہ میں کان پور نیانیا آباد تھا، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں گنگا کے کنارے یہ انگریزی فوج کا کیمپ تھا کیمپ کے تعلق سے تاجر اور سوداگر آکر آباد ہوئے کیمپ سے کپوہ وا اور کپوہ سے کان پور، مسلمانوں کی اس تہہ حالی میں کان پور کے مسلمان سوداگروں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی جنہوں نے اپنی بابرکت اور نیک کمائیوں کو دین کی نصرت میں لگایا، مفتی عنایت احمد صاحب نے کان پور میں مستقل قیام فرمایا اور اسی سال ۱۸۶۷ء میں مدرسہ فیض عام جاری کیا، دو برس کے بعد اپنی جگہ اپنے دو شاگردوں کو جن میں سے ایک مولوی لطف اللہ صاحب تھے، جانشین بنا کر حج کو روانہ ہوئے، جہاز جدہ کے قریب پہنچ کر ایک پہاڑ سے ٹکرایا اور ڈوب گیا، مفتی صاحب بحالت نماز و احرام غرق و شہید ہوئے، شاگردوں نے مدرسہ

کے کام کو سنبھالا اور مدرسہ کو بڑی رونق دی، اسی مدرسہ کا فیض تھا جو بالآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں نمایاں ہوا۔ مفتی لطف اللہ صاحب | مفتی لطف اللہ صاحب ۷ برس کان پور میں رہنے کے بعد علی گڑھ واپس آئے اور یہاں سے اس مدرسہ میں جس کو ان کے استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب نے زندہ کیا تھا، مدرس ہوئے، علی گڑھ میں درس کا فیض ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ-۱۸۹۵ء تک ستائیس برس مسلسل جاری رہا، ہر سمت سے علم و فن کے طلب گاروں کے قافلے علی گڑھ کا رخ کر رہے تھے، ستائیس برس کی مدت میں سیکڑوں عالم اس درس گاہ سے اٹھے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے، اُس عہد کا مشکل سے کوئی نام ور عالم ہوگا جس کی دستار کمال کا طرہ امتیاز اس باکمال کاتلمذ نہ ہو، جن اکابر کے نام معلوم ہیں، ان میں سے چند کے نام ملاحظہ طلب ہیں، مولوی عبدالغنی صاحب (استاذ اول مولانا شروانی) مولوی احمد حسن صاحب کان پوری، مولوی سید محمد علی (ناظم اول ندوۃ العلماء) مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹوکی، مولوی عبدالحق صاحب تھانی مفسر تفسیر تھانی دہلی، مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، وقار نواز جنگ مولوی وحید الزماں خاں، مولوی فضل حق صاحب رام پوری، مولوی مفتی عبداللطیف (استاذ جامعہ عثمانیہ) مولوی نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور، مولوی ماجد علی صاحب جون پوری (مشہور مدرس) مولوی پیر مہر علی صاحب سجادہ نشین گولڑہ ضلع راولپنڈی، قاضی سعد الدین صاحب کشمیری، مولوی سیف الرحمن صاحب ولایتی، مولوی لطف الرحمن صاحب بردوانی اور خاتمۃ التلامذہ نواب صدربار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں وغیرہ سیکڑوں ارباب کمال ہیں۔

حضرت مفتی لطف اللہ صاحب کی دو اور خصوصیتیں قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ انہوں نے عمر بھر کسی کی تکفیر نہیں کی، دوسری یہ کہ کان پور کے قیام ہی کے زمانہ میں انگریزی سے اتنے حرف شناس ہو گئے تھے کہ تاروار پڑھ لیتے تھے، اس کے یہ معنی ہیں کہ دارالعلوم ندوہ جو بننے والا تھا اس کی صورت مثالی پہلے ہی ذاتِ گرامی میں جمع تھی۔

مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب | اس سلسلہ کا رابطہ عقیدت ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا، جس کا نام نامی حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب مجددی گنج مراد آبادی تھا (گنج مراد آباد کان پور کے پاس ایک قصبہ ہے) یہ فیض بھی دہلی کے اسی خانوادہ سے آیا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی سے شرف تلمذ اور حضرت شاہ محمد آفاق صاحب مجددی سے شرف بیعت حاصل

تھا، تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں یہ ذات گرامی سارے ہندوستان کی روحانی عقیدت کا مرکز تھی، سنت سنیہ، فقر و غنا، نور و معرفت کی تمام خوبیاں اس ایک ہستی میں جمع ہو گئی تھیں، مفتی صاحب کے اکثر تلامذہ گنج مراد آباد کے فیض ارادت سے سرفراز تھے۔

مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے، جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔

انقلاب و حوادث کے جو طوفان ملک میں اٹھ رہے تھے، ان سے حساس مسلمانوں کے دل مضطرب تھے، مدارس اور مکاتب کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان لڑکے کھینچ رہے تھے، سلطنت کے اثر سے عیسائیت کا چرچا تھا، مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے تھے، ان کے یتیم خانے ہر جگہ قائم تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسالے لکھے جا رہے تھے، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح اٹھنے چلے آ رہے تھے، عام علما زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف، کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے تھے اور خواص تقلید و عدم تقلید، قرأت فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ، مجادلہ اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، ایک دوسرے کی تفسیق اور تکفیر پر بڑی بڑی مہریں ہو رہی تھیں، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقہ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بے کار اور نئے زمانے کے لیے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر ہو رہا تھا۔

فیض عام کا فیض | یہ صورت حال تھی کہ حسن اتفاق سے اس خوش قسمت مدرسہ فیض عام کان پور کی چٹائی پر مدرسہ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر چند نفوس قدسیہ اس صورت حال پر غور فرما رہے تھے، یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء تھا، اس مجمع میں جو باکمال نفوس جلوہ افروز تھے، ان کے متبرک ناموں پر ایک نگاہ آج بھی بتا سکتی ہے کہ وہ کس پایہ کے تھے، حالاں کہ ان میں سے بعض کا اس وقت عقفوان شباب تھا۔

۱- استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھ

۲- مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی

۳- مولانا محمد اشرف علی تھانوی مدرس مدرسہ جامع العلوم کان پور

۴- مولانا محمد ظلیل احمد صاحب مدرس دوم مدرسہ دیوبند (بعده مدرس اعلا مدرسہ مظاہر العلوم

سہارن پور)

- ۵- مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (جو اسی سال مدرسہ سے فارغ ہوئے تھے)
- ۶- مولانا نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور (بڑے متقی اور صاحب کمال بزرگ تھے، میں نے زیارت کی تھی)
- ۷- مولانا احمد حسن کان پوری مدرس اول مدرسہ فیض عام کان پور، (محشی مثنوی مولانا نئے روم)
- ۸- مولانا سید محمد علی صاحب (ناظم اول ندوۃ العلماء)
- ۹- مولانا محمود حسن صاحب مدرس اول مدرسہ دیوبند (شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ)
- ۱۰- مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری
- ۱۱- مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام صاحب فتح پوری (نہایت متقی و دین دار، ان کی زیارت سے میری آنکھیں شاد ہوئیں)

۱۲- مولانا عبد الغنی صاحب، منور شید آبادی

۱۳- مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی

۱۴- مولانا سید شاہ حافظ تجل حسین صاحب دیہ سنوی (خلیفہ حضرت شاہ فضل رحمان صاحب

گنج مراد آبادی، میرے رشتہ کے چچا تھے، ندوہ میں تعلیم کے لیے میرا آنا ان ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا)

یہ اسلامی ہندوستان کے گزشتہ دور کے وہ نام نامی ہیں جن پر اس دور کو پورا فخر و ناز ہے، اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علما کی ایک مجلس قائم کی جائے اور آئندہ سال مدرسہ فیض عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تمام ہندوستان کے علما کو اس کے لیے عام دعوت دی جائے، اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء قرار پایا اور اشتہارات و اخبارات کے ذریعہ سے آئندہ جلسہ کا اعلان کیا گیا اور ایک صاحب اس غرض سے مقرر کیے گئے کہ وہ تمام ہندوستان کا معائنہ کر کے اگلے جلسہ میں اپنی رپورٹ پیش کریں، مولانا سید محمد علی صاحب جو مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد رشید اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب کے مرید و خلیفہ، ردنصاری میں متعدد کتابوں کے مصنف اور ردنصاری میں ”تحفہ محمدیہ“ نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، اس نئی مجلس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔

۱ اس رسالہ کے ایڈیٹر میرے حقیقی چچا بھی زاد بھائی مولوی محمد احسن صاحب استھانوی تھے، عزیز می مولوی سید محمد باشم صاحب ندوی کے پدر بزرگوار، مجھے یہی اپنے ساتھ دارالعلوم لائے تھے۔

ندوة العلماء | عام ملک میں جب ندوة العلماء کے مقاصد اور اس کے آئندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو تمام مسلمانوں میں ایک نئے جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، علما ہر طرف سے آ کر شریک ہونے لگے، اس صدا پر سب سے پہلے بلیک کہنے والوں میں ایک نام اُس کا بھی تھا جو ہندوستان کے علاوہ روم و شام و مصر کے مدرسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا اور اس کے دل میں رہ کر ان مدرسوں کی زبوں حالی، ابتری اور ضروریاتِ زمانہ سے بے خبری کا درد اٹھتا تھا، جس کے مضمونوں، تقریروں اور تصنیفوں میں اس کا یہ احساس ہر دفعہ نئے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا۔

ندوہ کا پہلا اجلاس | ندوة العلماء کا پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۳ء میں اسی کان پور میں اور اسی مدرسہ فیض عام میں ہوا، پہلے دن ۱۵ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۸۹۳ء کو صبح کے وقت مدرسہ کے چودہ فارغ التحصیل طالب علموں کی دستار بندی کا جلسہ ہوا، حضرت مولانا لطف اللہ صاحب اس جلسہ کے صدر ہوئے، صدارت کی تحریک مولانا عبد اللہ صاحب ناظمِ دینیات محمدان کالج علی گڑھ (داماد مولانا محمد قاسم صاحب بانی مدرسہ دیوبند) اور تائید مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے فرمائی، مولوی بشیر الدین اڈیٹر نجم الاخبار اٹاواہ نے (جو ان دنوں سرسید کے مخالفوں میں تھے، اور اب ”البشیر“ کے اڈیٹر ہیں) مدرسہ کی سالانہ کارروائی پڑھ کر سنائی، اس کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھولواوی نے سورہ جمعہ کا وعظ اس خوبی سے کہا کہ حاضرین پر وجد طاری تھا۔

ندوة العلماء | ندوة العلماء کا اجلاس اسی دن ۳ بجے سے پہر سے شروع ہوا، شمس العلماء مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی نے مولانا لطف اللہ صاحب کی صدارت کی تحریک کی اور مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے تائید کی، اس اجلاس کی روح پرور کیفیت کا بیان ایک معتبر وثقہ شریک مجلس کی زبان سے سنئے، شوال ۱۳۱۵ھ میں پہلا اجلاس ہوا، یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا، ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے ضنا دید علماء شریک جلسہ تھے، علمائے حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بنا لوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کتوری شریک جلسہ تھے، یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علما بلا تخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و تکریم میں یکساں سرگرم تھے، کرسی صدارت حضرت کے جمال و کمال دونوں پر نازاں تھی، اسی موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا، اس

میں مفتی عنایت احمد صاحب، مولوی لطف اللہ صاحب اور مولوی احمد حسن کی بڑے شان دار الفاظ میں مدح و ثنا کی تھی (استاذ العناص ۳۲، ۳۳، از نواب صدیق جگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی)

اس کے بعد مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے ندوۃ العلماء کے اغراض اور عربی تعلیم کے موجودہ نقائص پر ایک بسیط اور مدلل تقریر فرمائی، یہ تقریر آج بھی اسی طرح حقائق سے لبریز اور صورت حال کے لحاظ سے تازہ ہے، بعد ازیں مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کا دستور العمل پیش کیا مگر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تحریک سے یہ دستور العمل علما کی ایک مجلس کے سپرد ہوا، عصر کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے دینی و دنیوی ترقی اور مذہبی تعلیم پر وعظ فرمایا۔

دوسرے دن ۱۶ ارشوال کی صبح کو مولانا شبلی صاحب کی تحریک اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تائید سے مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رام پوری (راقم کی آنکھیں رام پور کے اتفاقی سفر میں ان کی زیارت سے مشرف ہوئیں، اُس وقت موصوف کے ہاتھ میں دیوان علی کا قلمی نسخہ تھا اور وہ اس کو صاف کر رہے تھے) صدر نشین ہوئے، سب سے پہلے مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک پرزور تقریر کی، پھر مولانا ابراہیم صاحب آروی نے دل پذیر وعظ فرمایا۔

۱۷ ارشوال کی رات کو مغرب کے بعد دستور العمل پر غور کرنے کے لیے جلسہ خاص ہوا، اس جلسہ میں تیس جید علما شریک تھے، کچھ اور اہل الرائے معززین بھی تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب ایک دفعہ پڑھ کر سنانے تھے اور بعد غور و بحث کے وہ منظور ہوتی تھی، اس طرح تمام دستور العمل منظور ہوا جو درج رداد ہے۔

تیسرا جلسہ ۱۷ ارشوال مطابق ۲۳ اپریل کی صبح کو ہوا، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے اٹھ کر کہا کہ آج کے جلسہ میں حسب ذیل تجویزوں کا پیش اور ان پر غور و بحث ہونا قرار پایا ہے:

پہلی تجویز: موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

دوسری تجویز: اس امر کی کوشش کی جائے کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں۔

تیسری تجویز: اس امر میں سعی کی جائے کہ مدارس اسلامیہ جو کثرت سے جاہ جا قائم ہیں،

ان کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لیے دو تین بڑے بڑے مدرسے مثل مدرسہ دیوبند، مدرسہ فیض عام کان پور، مدرسہ احمدیہ آرہ وغیرہ بہ طور دارالعلوم کے قرار دیے جائیں اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں اور ان چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تمام کارروائی ان دارالعلوموں کی نگرانی میں رہے۔ چوتھی تجویز: مدرسہ فیض عام کان پور چوں کہ باعتبار تعلیم نہایت اعلیٰ مرتبہ کا مدرسہ ہے اور بہ تعداد کثیر پڑھنے والے طلبہ اس میں موجود ہیں، لیکن مدرسہ کا مکان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف تعلیم میں حرج ہوتا ہے، بلکہ ان کی آسائش اور آرام کا کافی انتظام نہیں ہو سکتا، لہذا کل ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ لحاظ محبت و ہمدردی ضرور ہے کہ مدرسہ فیض عام کے ایسے مکان بنانے کے واسطے جس میں دوسو پر دہی طلبہ رہ سکیں، حسب حیثیت چندہ دیں اور مستحق ثواب ہوں۔

۱۔ ہندوستان میں اہل حدیث کے نام سے تحریک مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی اور ان کے شاگردوں کے ذریعہ شروع ہوئی، اس تحریک کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ طبیعتوں کا جمود دور ہوا اور جب ایک بندو نانا تو اجتہاد کے دوسرے دروازے بھی کھلے، مولوی نذیر حسین صاحب کے شاگردوں میں مولوی ابراہیم صاحب آروی خاص حیثیت رکھتے تھے، وہ نہایت خوش گو اور پر درد و اعظمت تھے، وعظ کہتے تو خود روتے اور دوسروں کو رلاتے، نئی باتوں میں سے اچھی باتوں کو پہلے قبول کرتے، چنانچہ نئے طرز پر انجمن علماء اور عربی مدرسہ اور اس میں دارالافتاء کی بنیاد کا خیال ان ہی کے دل میں آیا، اور ان ہی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ میں قائم کیا اور اس کے لیے جلسہ مذاکرہ علمیہ کے نام سے ایک مجلس بنائی جس کا سال بہ سال جلسہ آرہ میں ہوتا تھا، اس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی، ندوۃ کے قیام کے بعد ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں اس کا سب سے پہلا جلسہ آرہ سے باہر دہلی جگہ میں ہوا اور وہاں بحث پیش آئی کہ ندوہ کے رہتے ہوئے اس کے قیام کی ضرورت ہے یا نہیں، بہر حال وہ قائم رہا اور مدتوں خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا، ۱۹۰۰ء میں میرے والد مجھے اسی مدرسہ میں بھیجنا چاہتے تھے، مگر تقدیر کچھ اور تھی، یہ تجویز عمل میں نہ آئی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری متوفی ۱۳۳۷ھ سالہا سال تک اس میں پڑھاتے رہے، مولانا عبدالسلام صاحب مبارک پوری، مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری اور ہمارے مرحوم دوست مولانا ابوبکر محمد شفیق صاحب جون پوری اور بہت سے علماء یہاں کے شاگرد ہیں، حافظ صاحب کے بعد مدرسہ پر زوال آیا، ابھی چند سال ہوئے ہیں کہ یہ مدرسہ آرہ سے دہلی منتقل ہو گیا اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے نام سے مشہور ہے، مولانا ابراہیم صاحب نے سفر حجاز میں ۱۳۲۲ھ میں انتقال فرمایا۔

مولانا شبلی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ایک دفعہ مولوی ابراہیم صاحب نے اپنا مدرسہ اور خاص طور پر اپنا بورڈنگ کھایا، میں نے ان سے کہا کہ آپ کبھی علی گڑھ آئیے اور کالج اور اس کا بورڈنگ دیکھیے تاکہ خیال کی بلندی اور سلیفٹھ سہرائی معلوم ہو، بہر حال عربی مدرسوں کی یہ نئی بدعت ان ہی اہل حدیث سے شروع ہوئی۔ ۲۔ مدرسہ فیض عام سے کچھ دنوں کے بعد مولانا احمد حسن صاحب نے الگ ہو کر مدرسہ جامع العلوم قائم کیا تو مدرسہ کی حالت گر گئی، مدرسہ سب بھی کسی نہ کسی حال میں ہے، اب وہ انگریزی کا اسکول ہے اور اس میں عربی کے کچھ درجے ہیں۔

غور کا مقام ہے کہ یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی تنظیم کے لیے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں اور سینتالیس برس کے بعد بھی ہم آج اسی وادی تیبہ میں حیران و سرگرداں ہیں، مدرسہ فیض عام کی جگہ مدرسہ دارالعلوم ندوہ رکھ لیجیے، صورت حال کیا ایکنہ وہی نہیں۔

اس کے بعد پہلی تجویز مولانا شاہ محمد حسین صاحب الد آبادی نے پیش کی، موصوف نے اپنے رنگ میں اصلاحِ نصاب کے مسئلہ کو بڑی جامعیت سے بیان فرمایا، اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے کھڑے ہو کر اس تجویز کی تائید پر ایک عالمانہ بحث فرمائی اور دکھایا کہ اسلام میں آغازِ تعلیم سے طریقہ تعلیم کیا رہا، نصاب کیوں کر بدلتا رہا، علوم معقولات کا رواج کیسے ہوا، درس نظامیہ کی بنیاد کیوں کر پڑی اور موجودہ نصاب میں کیا کیا نقص ہیں، مثلاً معقولات کی کتابیں اس میں ضرورت سے زیادہ ہیں، منطق کی کتابوں میں متاخرین نے البیات کے مسئلہ مخلوط کر دیے ہیں، منطق کی تعلیم کو اس سے پاک رکھنا چاہیے، کتاب کے لفظوں کی نہیں فن کی تعلیم ہونی چاہیے، ادب کی کتابیں بڑھائی جائیں، قرآن پاک اور علوم قرآن کی کتابیں داخل کی جائیں اور طریقہ تعلیم میں اصلاح کی جائے۔

اس تجویز کے بعد اسی سے متعلق مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا، جو شاید مولانا شروانی کی پہلی تقریر ہو، مگر اس میں وہی متانت، وہی زور انشا اور وہی جدید و قدیم معلومات کا خوب صورت میل موجود ہے، جو آج بھی ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

یہ تینوں تقریریں اس سال کی روداد میں موجود ہیں اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

اس کے بعد بارہ علما کی ایک مجلس ترتیبِ نصاب کے لیے مقرر کی گئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق نصاب کے رسالے لکھے اور مولانا نے دارالعلوم کے نصاب کے بہ جائے دارالعلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے، یہ رسالے آج بھی مل سکتے ہیں۔

تیسری تجویز منظور ہو جانے کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا کہ جو دستور العمل منظور ہوا ہے، اس کی دفعہ (۱۱) کے مطابق اس کے جلسہ انتظامیہ کے ارکان کا انتخاب ہونا چاہیے، چنانچہ سولہ ارکان کے نام تحریک و تائید سے چنے گئے اور ندوۃ العلماء کا کالبد قانونی شکل میں جلوہ گر ہو گیا اور مولانا نے ندوہ کی طرف سے حاضرین کا شکر یہ ادا کیا اور ندوہ کا پہلا اجلاس ختم ہو گیا۔

ندوہ کا دوسرا اجلاس | ندوہ کا دوسرا اجلاس جناب منشی اطہر علی صاحب رئیس کا کوری و وکیل لکھنؤ و مشیر قانونی انجمن تعلقہ داران اودھ کی کوششوں سے شوال ۱۳۱۲ھ مطابق اپریل ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں ہوا، مولانا نے اس اجلاس میں بھی شرکت کی اور پہلے روز ناظم کی طرف سے ندوہ کی سالانہ روداد پڑھ کر سنائی، اس کے بعد علما کے فرائض پر ایک مبسوط تقریر فرمائی، جس میں ان کے علمی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی فرائض سے ان کو آگاہ کیا ہے، یہ تقریر مضامین اربعہ کے عنوان سے ندوہ کے دوسرے مضامین کے ساتھ چھپ چکی ہے، یہ تقریر ایسی ہے کہ آج بھی علما کی جماعت کے سامنے اس کے پیش کرنے کی ضرورت اسی طرح قائم ہے۔

اسی اجلاس کے جلسہ خاص میں اس تجویز پر بحث ہوئی کہ علوم زیر درس پر کسی اور علم کا اضافہ ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کیا لیکن اس کے بعد مولوی منصور علی صاحب مراد آبادی نے جب یہ تجویز پیش کی کہ نصاب درس میں علوم جدیدہ کا اضافہ کیا جائے تو اختلاف ہوا، مولانا شبلی مرحوم، مولانا ابراہیم صاحب آرومی اور دوسرے اکثر علما نے ان کے اضافہ کی تائید کی اور مولانا فاروق صاحب اور دو اور علما نے اس کی مخالفت کی لیکن اکثریت سے یہ تجویز منظور ہوگئی، کیا یہ عجیب اختلاف تھا کہ جس میں استاد اوشاگرد دونوں دو صف میں تھے، مدت تعلیم بالا اتفاق دس برس قرار پائی۔

۱۰/۱۱ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کانپور میں مجلس نصاب کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی مدرس مدرسہ کانپور، مولانا عبداللہ صاحب ٹوکنی، پروفیسر پنجاب یونیورسٹی مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رام پور، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولانا شبلی نعمانی نے شرکت اور کئی روز کے بحث و مباحثہ کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا۔ (ص ۳۲ روداد بانس بریلی)

۱۔ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے ارکان جن میں سب سے ممتاز منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کا کوری خلف الصدق جناب منشی امتیاز علی صاحب وزیر سابق بھوپال ہیں، ندوہ کے ہمیشہ سے حامی و مددگار رہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان صاحبوں کو حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب حج مراد آبادی سے نسبت ارادت تھی۔ منشی محمد اطہر علی صاحب کے بڑے صاحب زادہ منشی محمد اطہر علی صاحب وکیل و ممبر اسمبلی زمانہ سے ندوہ کے ممبر ہیں اور جناب منشی محمد احتشام علی صاحب کی دل چسپی بھی ندوہ کے ساتھ اسی زمانہ سے شروع ہوئی جو اب تک بہ دستور قائم ہے۔

تیسرا اجلاس | اسی سال شوال ۱۳۱۳ھ مطابق اپریل ۱۸۹۶ء میں بانس بریلی میں مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کی صدارت میں ندوہ کا تیسرا عظیم الشان اجلاس ہوا، مولانا نے اس کے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسہ خاص میں دارالعلوم کے اجرا کی تجویز منظور ہوئی۔

دوسرے دن ۲۷ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۸۹۶ء کو ندوہ کے عام اجلاس میں مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی اور مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی، جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، مولانا شاہ سلیمان صاحب اور دوسرے علمائے بھی اس سے متعلق تقریریں کیں، یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس (کمیٹی) قائم کی جائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے۔

پٹنہ کو وفد | ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں ندوہ کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولانا شاہ امانت اللہ صاحب غازی پوری مولانا ابوالخیر صاحب غازی پوری اور مولانا شبلی صاحب نعمانی تھے، پٹنہ روانہ ہوا اور مولانا حکیم عبدالباری صاحب کے مکان پر قیام ہوا، وفد کے ممبروں نے دو جلسوں میں دو تقریریں کیں، پہلا جلسہ مولانا شاہ رشید الحق صاحب کی خانقاہ عمادیہ میں شہر پٹنہ میں ہوا، اس میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے مفصل اور مولانا شاہ امانت اللہ صاحب اور مولانا شبلی مرحوم نے مختصر تقریریں کیں، دوسرا جلسہ پٹنہ گورنمنٹ کالج بانگی پور میں ہوا جس میں تقریباً چار ہزار مسلمان شریک تھے، اس میں دوسرے علماء کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے دارالعلوم کی ضرورت پر ایسی پراثر اور مدلل تقریر فرمائی کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات کے دلوں میں اثر کر گئی، یہ وہ تقریر ہے جس سے علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان اسلام کی خدمت کے لیے باہمی اتحاد و معاونت کی راہ نکلی اور جس کی ایک پراثر تصویر ایک سحرنگا رنقاش نے ان لفظوں میں کھینچی ہے، علمائے ندوۃ العلماء نے شروع سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مانوس کرنے کی جو کوشش کی اس کا ظہور اس مقام پر ہوا جو مسلمانوں کی روشن خیالی کا زبردست مرکز ہے، یعنی بانگی پور، گو میں خود حاضر نہ تھا، مگر

۱۔ روداد ندوہ اجلاس میرٹھ، ص ۳۵ ج ۲ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔

میرے ایک نکتہ سنج محترم نے اس موقع کا موقع کھینچا تھا، جب مولوی سید شرف الدین صاحب بالقابہ کے ڈرائنگ روم میں قدیم و جدید تعلیم کے قائم مقام اول مرتبہ ملے تھے، جاڑے کی شب تھی، علما پہلے سے رونق افزا تھے، جب سیاہ اور کوٹوں سے ہال میں تاریکی پیدا ہوئی تو چوں کہ ہمارے محترموں کی نگاہ کے سامنے اول مرتبہ یہ سماں آیا تھا، اس لیے کسی قدر منقبض ہوئے، مگر گفتگو نے جلد اصل حال سے پردہ اٹھا کر ظاہر کر دیا

ع کہ آبِ ہشمہ حیواں درون تاریکی ست

”تاریک کوٹوں کے اندر عقیدت مندی اور نورِ ظلوس سے روشن دل چمپے ہوئے تھے، اسی جلسہ میں

اجلاسِ پٹنہ کی بنیاد پڑی، اس اجلاس نے خیالات قدیم و جدید کے دور دریا اسی طرح باہم ملتے دیکھے جس

طرح گنگا اور سون کے سنگم پر یہ مشہور اور تاریخی شہر واقع ہے۔

چوتھا اجلاس | ندوہ کا چوتھا جلسہ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق مارچ ۱۸۹۷ء میں میرٹھ میں ہوا، ۱۶ شوال مطابق ۲۰ مارچ کو مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے دارالعلوم کی ضرورت اور مقصد پر ایک نہایت مبسوط اور اعلا درجہ کی تقریر کی، جو ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی، اس کا ہر فقرہ بلکہ ہر حرف نقش فی الحجر کی طرح سامعین کے قلوب پر بیٹھا جاتا تھا اور ہر شخص جوش اور فرط انبساط سے محو حیرت ہو گیا تھا مگر افسوس ہے کہ فاضل مقرر نے یہ تقریر پہلے سے قلم بند نہیں کی تھی اور بعد کو جو بھیجی وہ تلف ہو گئی۔

۱۷ شوال کے جلسہ میں مولانا شبلی مرحوم نے نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی اس کوشش کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے نینی تال دو مہینے رہ کر اور حکام سے مل کر یہ تجویز منظور کرائی ہے، کہ ہفتہ میں دو بار نصف نصف گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لیے وقت دیا جائے، اس کا انتظام اور اس کی تعلیم کا نصاب مسلمانوں کی تجویز پر رکھا ہے، اسی اجلاس میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے ایک یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان سے چند مستعد اور ذہین طلبہ کو ندوہ تکمیل علوم کی غرض سے مصر بھیجے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی اور قوم سے اس کے لیے علاحدہ چندہ کی تحریک کی جس میں ۳۵ ماہ وار ایک سو چالیس سالانہ اور ایک ہزار دو سو روپے ایک مشت وصول ہوئے۔

پانچواں اجلاس | ندوہ کا پانچواں اجلاس ۱۵/۱۳ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۸-۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو کان پور

۱۔ روداد میرٹھ، ص ۵۷۔

میں ہوا، اس کے صدر مولانا مسیح الزماں خاں رئیس شاہ جہاں پورا استاد حضور نظام سابق ہوئے، اس کے پہلے اجلاس میں مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے یہ تحریک کی کہ ندوہ کا ایک وفد لکھنؤ بھیجا جائے، جو وہاں جا کر دارالعلوم کے لیے کوئی مناسب زمین تجویز کر کے حاصل کرے اور بالفعل کام شروع کرنے کے لیے کوئی مکان پسند کرے، اس وفد کے لیے حسب ذیل حضرات کے نام انتخاب کیے گئے، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب، رئیس شاہ جہاں پور (استاد سابق حضور نظام میر محبوب علی خاں) مولانا سید محمد علی صاحب ناظم مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولوی حاجی یونس خاں صاحب رئیس و تاویلی، مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری، خلف مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری (مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ پور، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری اور مولانا شبلی نعمانی۔

دوسرے اجلاس میں مولانا شاہ امانت اللہ صاحب فصیحی غازی پوری کی وفات پر افسوس ظاہر کیا گیا، اس فرض کو مولانا شبلی مرحوم نے ادا کیا، فرمایا ”مولانا میں ایسی بہت سی خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ تمام علماء کی جماعت میں ایک ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے، وہ جس عظمت و شان خودداری اور پاس وضع، بلند نظری اور عالی حوصلگی سے بسر کرتے تھے، اس سے اسلامی شان کا جلوہ نظر آتا تھا، جب وہ وعظ و تبلیغ کی ضرورت سے سفر کرتے تھے تو جس طرف ان کا گزر ہوتا تھا، ایک غلغلہ پڑ جاتا تھا اور غیر مذہب والوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، وہ ندوۃ العلماء کے قوت بازو تھے، اکثر جلسوں میں تشریف لاتے تھے۔“

اس تقریر کے یہ فقرے اس لیے میں نے نقل کیے ہیں تاکہ اُس زمانہ کے باوضع علماء کی دنیادی و جاہت کی بھی ایک تصویر آپ کو نظر آجائے۔

اب وہ زمانہ آ گیا ہے، جب ندوۃ العلماء کے آوازہ نے گورنمنٹ کے کان کھڑے کر دیے ہیں اور ارکان کو یہ خیال ہونے لگا ہے کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر صاحب سے مل کر ان کے شکوک کو دور کیا جائے، چنانچہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب وکیل و مشیر قانونی انجمن تعلقہ دارالین اودھ نے آخر نومبر ۱۸۹۷ء میں الہ آباد جا کر لفٹنٹ گورنر سے ملاقات کی اور ندوہ کی طرف سے ایک وفد کی حاضری

۱۔ مولانا مسیح الزماں خاں صاحب اس زمانہ کے مشہور رئیس علماء میں تھے، حضور نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن کے استاذ اور تالیق تھے، مولوی محمد زماں خاں صاحب شہید کے بھائی اور سالار جنگ اول کے پورے معتمد علیہ تھے، جس زمانہ میں نواب محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ حیدرآباد میں تھے، مولانا احمد و بھی تھے اور اعلیٰ حضرت پر بڑا اثر رکھتے تھے آخر میں ریاست سے ان کا پیش قدمی منصب مقرر ہو گیا تھا اور وہ اپنے وطن شاہ جہاں پور چلے آئے تھے، میں نے اخیر زمانہ میں دیکھا تھا، بالآخر، فرہ اندام اور چہرہ پر عجب تھا، ان کے دیکھنے سے لوگوں پر اثر پڑتا تھا، ۱۳۶۸ھ / ۱۹۰۷ء میں شاہ جہاں پور میں وفات پائی۔

کی درخواست پیش کی، لاٹ صاحب نے ایڈریس دیکھنے کے بعد وفد کی پذیرائی کا خیال ظاہر کیا، اس اجلاس میں منشی محمد اطہر علی صاحب نے اس ایڈریس کا مسودہ پڑھ کر سنایا اور مولانا شبلی صاحب کی تحریک سے یہ طے ہوا کہ خان بہادر منشی محمد اطہر علی صاحب اور خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ واسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقہ داران اودھ اس کولاٹ صاحب کی خدمت میں لے جا کر پیش کریں، مولانا سید محمد علی صاحب کی تائید سے سب نے اس کو منظور کیا۔

اس کے بعد مولانا سید محمد علی صاحب نے یہ تحریک کی کہ مجوزہ دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کے ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہونا چاہیے، منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید کی، مولانا شبلی صاحب نے فرمایا کہ علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپے سے نہیں کرتے، اس واسطے میں یہ تحریک کرنا ہوں کہ درجہ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکان انتظامیہ ہو جائیں، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب صدر جلسہ نے تائید کی، چنانچہ حسب ذیل علماء اور بعض ارکان نے اس کے لیے چندہ منظور کیا:

علماء

- ۱- مولوی مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہ جہاں پور ۲۰۰ روپے
- ۲- مولوی محمد یونس خاں صاحب رئیس وٹا ولی ۲۰۰ روپے
- ۳- مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی ۱۲۵ روپے
- ۴- مولوی شبلی صاحب نعمانی ۱۰۰ روپے
- ۵- مولوی سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ ۵۰ روپے
- ۶- مولوی ظیل الرحمن صاحب سہارن پوری ۵۰ روپے
- ۷- مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری (خلف مولوی شاہ امانت اللہ صاحب) ۵۰ روپے
- ۸- مولوی مشتاق علی صاحب، مدرس فیض آباد ۲۵ روپے
- ۹- مولوی حکیم رونق علی صاحب روددولوی ۲۵ روپے
- ۱۰- مولوی محمد داؤد صاحب وکیل مرزا پور ۲۵ روپے
- ۱۱- مولوی مفتی رحیم بخش صاحب مدرس الموڑہ ۲۵ روپے

رؤسا

- ۱۲- خان بہادر منشی اطہر علی صاحب ۱۵۰ روپے

۱۳- مولوی سید اشرف صاحب، رئیس کان پور ۱۲۵

یہ فہرست دو غرض سے یہاں نقل کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ اس زمانہ تک علما میں کس قدر باحیثیت اصحاب موجود تھے، جو اس قسم کی تحریک کے لیے لبیک کو تیار تھے اور آج ذی حیثیت لوگوں میں علم دین کی کتنی کمی آگئی ہے، دوسری غرض ان بزرگوں کے ناموں کو زندہ کرنا ہے، جنہوں نے دارالعلوم کی اس عظیم الشان تجویز کو عمل میں لانے کے لیے سب سے پہلے سبقت فرمائی، ہم جزا اللہ خیر الجزا۔

اس کے بعد پچھلے سال نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی کوشش سے انگریزی اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی جو تجویز گورنمنٹ نے منظور کی تھی، اس کے بارہ میں مولانا سید عبداللہ صاحب مددگار ناظم اور مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی نے تحریک کی کہ اس کام کو ندوہ اپنے ہاتھ میں لے، شہی محمد اطہر علی صاحب نے تجویز پیش کی کہ ابھی صرف کان پور میں یہاں کے مسلمانوں کی کوشش سے اس قسم کا مقامی انتظام کیا جائے، اسی کی تائید مولوی شبلی صاحب نے فرمائی اور کہا کہ میرا قیام اگر کان پور میں ہوتا تو میں نہایت خوشی سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور اس خدمت کو قبول کرتا، اس کے بعد مولوی عبداللطیف صاحب مفتی ندوۃ العلماء سے فرمایا کہ آپ کسی قدر وقت تدریس میں بھی صرف کرتے ہیں، آپ اس دینی خدمت کو بالفعل قبول کر لیجئے، مولوی مفتی عبداللطیف صاحب نے مسرت کے ساتھ اس خدمت کو قبول کیا اور جلسہ کی کارروائیاں اختتام کو پہنچیں۔

۱۔ مولوی مفتی عبداللطیف صاحب کا وطن سنبھل ضلع مراد آباد ہے، مولانا لطف اللہ صاحب کے آخری شاگردوں میں سے اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے رفقاء درس میں سے ہیں، فراغت کے بعد ندوہ میں مفتی کے عہدہ پر مقرر ہوئے، پھر جب ایک سال کے بعد ندوہ نے اپنا دارالعلوم کھولا تو اس میں شوال ۱۳۱۶ھ سے مدرس ہو گئے، خاک سار نے اکثر ابتدائی اور فقہ کی کتابیں موصوف ہی سے ندوہ میں پڑھیں، غالباً ۱۹۰۳ء کے بعد یہ ندوہ کی خدمت چھوڑ کر مولانا محمد علی صاحب کے پاس مونگیر چلے گئے تھے، پھر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں کئی سال تک مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں مدرس رہے، واپسی کے بعد پھر مونگیر میں رہے، اور خانقاہ رحمانی میں تالیف و تصنیف کی خدمت انجام دی، ۱۹۱۶ء میں جب مولانا شروانی حیدرآباد میں صدر الصدور اور جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ہوئے تو انہوں نے مفتی صاحب کو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں پروفیسر مقرر کیا اور آخر مولانا شیر علی صاحب کے بعد وہ شعبہ دینیات کے صدر ہوئے اور اب چند سال ہوئے کہ انہوں نے پنشن پائی، اس سال ۱۹۳۹ء میں وہ مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی جگہ پر مسلم یونیورسٹی میں علوم دینیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ موصوف کو طریقتہ تعلیم اور طریقتہ تفہیم میں کمال حاصل ہے، متعدد کتابیں اردو میں لکھی ہیں، صرف (عربی قواعد) اور عم الفقہ کے چند رسالے لکھنے کے زمانہ قیام میں لکھے، مونگیر میں رہ کر تاریخ القرآن اور سیرۃ امام ابوحنیفہ لکھی، حیدرآباد کے زمانہ قیام میں جامع ترمذی کی شرح لکھ رہے تھے، جو غالباً ابھی ناتمام ہے۔

کالج سے رخصت لینے کی تجویز ۱۸۹۶ء | کئی برس سے آب و ہوا کی ناموافقیت اور کثرت

دماغی محنت کے سبب سے مولانا کا معدہ صحیح نہیں رہا تھا، ۶ مارچ ۱۸۹۶ء کو لکھتے ہیں:

”میں دو ایک مہینہ سے بالکل بے کار رہتا ہوں، دماغ سے کچھ کام نہیں ہو سکتا، اب کی انشاء اللہ مکان پر نہایت مستعدی سے علاج کراؤں گا، میری خواہش ہے کہ تمام تعطیل اعظم گڑھ میں بسر کروں، ہندول دو تین روز سے زیادہ نہ رہوں۔“ (صفحہ ۳۸)

اس سلسلہٴ علالت پر مستزاد سید محمود مرحوم کا عبرت ناک اخیر زمانہ کا سوء مزاج تھا، اب ان کو کالج کے جزو کل پر پورا اختیار ہو گیا تھا، وہ جدھر نکل جاتے، گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر گپ کرتے اور وقت ضائع کرتے، مولانا ان کی اس عادت سے زچ ہو گئے تھے، کیوں کہ الفاروق کی تکمیل کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ ملتی نہ تھی، اسی لیے مولانا نے ان سے ایک دو دفعہ بے زنجی برتی تو ان کو اس سے شکایت پیدا ہو گئی اور وہ بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ انہوں نے مولانا پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا اور ان سے بعض درجے چھین لیے اور کبھی ان کے اس ہنر کو عیب ٹھہرایا کہ یہ دینیات کے سبق اپنے حسن تقریر سے اس قدر دل چسپ بنا دیتے ہیں کہ لڑکے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کم دیتے ہیں۔

مولانا کی پریشانی کی تیسری چیز بک صاحب کی سیاست تھی، انہوں نے ایک مسلمہ مسلمان لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور پردہ کے پیچھے سے سیاست کی کٹ پتلیوں کو حرکت دیا کرتے تھے، مولانا ان کی اس طرزِ سیاست کو جس کا مقصد کالج کو غلامی اور وفاداری کا دل چسپ و دل پذیر سبق پڑھانا تھا، سخت ناپسند فرماتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک بار دیوان حافظ کھول کر فال دیکھی کہ کالج کی قید سے مجھے کب رہائی

نصیب ہوگی، خواجہ حافظ صاحب نے جواب دیا:

وقت آں است کہ پد رود کنی زنداں را

مولانا خواجہ صاحب کی اس نصیحت پر عمل کیا اور ایک سال کے لیے اس قید خانہ سے رہائی کی

درخواست دی، یعنی دسمبر ۱۸۹۶ء سے نومبر ۱۸۹۷ء تک کی رخصت لی اور اعظم گڑھ چلے آئے، مگر

۱۔ حسب روایت سید سجاد حیدر صاحب بیدرم ۲۔ یہ تاریخ مولوی مسیح صاحب کے ایک خط میں ملی، جو درج مکتوب نہیں، ۵ دسمبر کو ملی گڑھ سے ان کو جون پور لکھتے ہیں، تمہید کے بعد خط (کارڈ) یہ ہے، ”میں غالباً ۲۳ یا ۲۴ دسمبر کو یہاں سے روانہ ہوتا ہوں، اگر تمہارا قصد اعظم گڑھ کا ہو تو انتظار کرو کہ میرا ساتھ ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو لکھ بیجو، میں نے سردست سال بھر کی رخصت لی ہے، والسلام، شبلی، ۵ دسمبر ۱۸۹۶ء۔“

یہاں آکر ان کا جی نلگا، فروری ۱۸۹۷ء میں وہ پھر علی گڑھ گئے لیکن پھر واپس آگئے اور جون جولائی اور اگست ۱۸۹۷ء اعظم گڑھ میں گزارے، ان ہی دنوں ۲۷ جون ۱۸۹۷ء کو ان کے منگھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹر و منصف نے اعظم گڑھ میں وفات پائی، یہ غم مولانا کے لیے بڑا سوبانِ روح کا باعث ہوا، (صفحہ ۴۰) اس حالت میں بھی وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے والد ماجد کی جوان دنوں بیماری سے اچھے ہوئے تھے، صحت یابی کی خوشی کا اور موازنہ قومی کا جلسہ کریں (صفحہ ۴۱) اور یہ خیال بھی تھا کہ مرحوم بھائی کی یادگار میں نیشنل اسکول میں کوئی عمارت بنوائیں (حمیدؒ ۳) اس کے بعد افسردگی کے دور کرنے کے لیے کوئی سفر کریں (صفحہ ۴۱) مگر وہ کہیں نہ جاسکے اور اگست بھر یہیں رہ کر نومبر ۱۸۹۷ء میں علی گڑھ واپس چلے گئے اور یہ کوشش شروع کی کہ ان کو کالج سے کافی طویل رخصت مل جائے۔

سر سید اور مسٹر بک اس شرط سے رخصت دینا چاہتے تھے کہ مولانا سال میں چھ مہینے علی گڑھ میں آکر قیام کریں، مگر دفعہ سید محمود جوان دنوں کالج پر حاوی تھے، اس کے مخالف ہو گئے، ۹ نومبر ۱۸۹۷ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ بک صاحب اور سید صاحب وغیرہ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں شش ماہہ قیام کروں لیکن سید محمود دفعہ اس کے مخالف ہو گئے اور اسی اپنی حالت میں بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں لیکن اس قسم کی ان سے اب کسی کوشاکایت نہیں رہی، ہر روز یہاں کے رؤساء، ٹرینیٹرز اور ارکان کالج اس قسم کی باتوں کے متحمل ہو گئے ہیں، میں تو اس دن سے سید صاحب کی کوٹھی پر گیا ہی نہیں، باقی ترک تعلق اس کی یہ کیفیت ہے کہ میں نے سال بھر کی رخصت اسی تجربہ کے لیے لی تھی، میں نے دیکھا کہ اعظم گڑھ سال بھر برابر نہیں رہ سکتا، وہاں کوئی ایسی دل چسپی نہیں کہ سال بھر تک کام چل سکے، اس لیے کچھ یہاں (علی گڑھ) کچھ وہاں (اعظم گڑھ) کچھ ندوہ، اسی طرح بسر کرنے کا ارادہ ہے۔“ (حمیدؒ ۸)

الفاروق کی تالیف ۱۸۹۳ء-۱۸۹۸ء | الفاروق کی تالیف میں اب تک جو انتظار تھا وہ مولانا کی تصریح کے مطابق یورپ میں بعض تاریخی مطبوعات کی تاخیر کے سبب تھا، خصوصاً طبری جو اب تک چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، (مہدی افادی-۵) ۱۸۹۳ء میں جب تاریخ مذکور کا حصہ مطلوبہ تمام ہو گیا تو مولانا نے اس کی تالیف کا عزم مصمم کر لیا، چنانچہ اگست ۱۸۹۳ء سے جیسا کہ الفاروق کے دیباچہ میں تصریح ہے، پورے ۱۔ مکتب کے حاشیہ میں غلطی سے اس یادگار کو مولانا کی مرحومہ بیوی سے منسوب سمجھا گیا ہے۔ (حمیدؒ ۳) ۲۔ مکتب میں ۱۸۹۸ء غلط چھپ گیا ہے۔

عزم کے ساتھ الفاروق لکھنی شروع کی، بیچ بیچ میں نائے بھی ہوتے رہے، اس کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی، ان میں سے ایک طبقات ابن سعد تھی، جو اب چھپ کر شائع ہو چکی ہے، مگر اس زمانہ میں یہ عنقا تھی، ہندوستان میں شاید مولوی ناصر حسین مجتہد لکھنؤ کے کتب خانہ میں تھی، مگر انہوں نے دینے سے انکار کیا، آخر ۱۹ جنوری ۱۸۹۸ء کو مولانا نے مولوی حسین عطاء اللہ صاحب حیدرآبادی کو خط لکھا جن کے پاس قلمی کتابوں کا نادر ذخیرہ تھا اور جن کی نسبت مولانا کو معلوم ہوا تھا کہ ان کے کتب خانہ میں یہ نسخہ موجود ہے، طبقات کا نسخہ مولانا نے قسطنطنیہ میں دیکھا تھا (سفر نامہ) مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ضروری اقتباس نہ لے سکے تھے، اس لیے اس کی تلاش جاری تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کو نہ مل سکی، کیوں کہ الفاروق میں اس کا کوئی حوالہ نہیں، دوسرے یہ کہ جب ابن سعد چھپ کر آئی ہے تو مولانا ندوہ میں تھے، مجھ سے فرمایا کہ ”دیکھو، ابن سعد میرا ہم مذاق تھا، اس نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا حال خوب جی کھول کر لکھا ہے۔“ کتاب کا ایک حصہ تین سال کے بعد جون ۱۸۹۷ء میں تمام ہو کر کان پور کے مطبع نامی میں دے دیا گیا (اسحاق ۷) باقی حصہ زیر تحریر تھا، چنانچہ ۳ جولائی ۱۸۹۷ء کو لکھتے ہیں ”میں نے الفاروق مطبع نامی کان پور میں چھپنے کو دے دی لیکن ابھی اصل کتاب میں ایک ٹکٹ تصنیف کے لیے باقی ہے۔“ (حمید-۳) ایک سال کے بعد ۴ فروری ۱۸۹۸ء کو رقم فرماتے ہیں ”الفاروق حصہ دوم میں نے تیار کر لیا ہے، قریباً نصف چھپ بھی گیا ہے۔“ (حمید-۴)

کالج سے الگ ہو کر جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ چلے آئے اور الفاروق کا کچھ حصہ اسی اعظم گڑھ میں اسی شبلی منزل میں اسی کمرہ میں جس میں یہ تحریر اس وقت قلم سے نکل رہی ہے لکھا اور حصہ دوم کا آخری صفحہ کشمیر میں بیٹھ کر بخاری کی حالت میں پانچ جولائی ۱۸۹۸ء کو حوالہ قلم کیا۔ (خاتمہ الفاروق) مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت یہ اخیر صفحہ تمام ہوا ہے، مصنف بخار سے بے حال ہو کر بستر پر دراز تھا، کتاب میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا، وہ کشمیر سے واپس آ کر اسی شبلی منزل میں جہاں وہ کبھی بیمار ہتے تھے اور کبھی اچھے ہو جاتے تھے اور کبھی سفر کو نکل جاتے تھے، ختم کیا اور یہیں کتاب کا مختصر مقدمہ دسمبر ۱۸۹۸ء کی کسی تاریخ میں لکھا۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۸ء تک اس کے ۳۱۲ صفحے چھپ چکے تھے، رقم طراز ہیں ”الفاروق کان پور مطبع نامی میں بڑے اہتمام سے چھپ رہی ہے، ایک حصہ جس کے ۳۱۲ صفحے ہیں، پورا چھپ کر تیار ہو گیا ہے، لوح طلائی اور لاجوردی چھپ رہی ہے اور اس کا کاغذ اتنا نفیس دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں آج

تک ویسا کاغذ کبھی استعمال نہیں ہوا، جو قدر داں صاحب چرمی کاغذ پر لوح چھپوانا چاہتے ہیں وہ دیکھیں گے تو اس کاغذ کو چرمی کاغذ پر ترجیح دیں گے۔“ (مہدی افادی-۸)

مولانا نے جس حصہ کے ۳۱۲ صفحے لکھے ہیں وہ دوسرا حصہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا حصہ پہلے لکھا گیا اور چھپا، دونوں حصوں کے ہندسے الگ تھے، اس لیے آگے پیچھے ہونا ممکن تھا۔

بھوپال کا دوسرا سفر اور عربی مدارس کی تنظیم، فروری و مارچ ۱۸۹۸ء | بھوپال میں مولانا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب کو حضور شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے ۱۳۱۵ھ میں اپنی ریاست کے تعلیمات کا افراملا (ڈائریکٹر) بنا دیا تھا، اس وقت بھوپال کی ریاست کو اس وجہ سے کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی وفات کو ابھی چند ہی سال ہوئے تھے، عربی تعلیم کی طرف پوری توجہ تھی اور عربی کے پانچ مدرسے شہر بھوپال میں قائم تھے، مگر نتیجہ کچھ نہ تھا، نہ تعلیم کا کوئی سررشتہ تھا نہ قواعد تھے، نہ رجسٹر تھے، نہ کوئی کتب خانہ تھا، نہ امتحان تھا، نہ مدرسین کی حاضری تھی، نہ کوئی نصاب تھا، نہ درجہ بندی تھی، طلبہ پڑھتے اور علما پڑھاتے تھے، نہ کسی سال کوئی طالب علم فارغ ہوتا اور نہ اس کی کوئی فکر تھی، مدرسین کو تنخواہیں اور طالب علموں کو ماہ وار وظیفے ملتے تھے اور ان کے کھانے پکڑے کا انتظام تھا اور یہی ان مدرسوں کا ماحصل تھا، طالب علم روٹیوں کے لیے پڑے رہتے اور ماہ وار وظیفوں کے لیے پڑھتے تھے، ولایتی اور بنگالی طالب علم ایک دور ختم کرتے تو فوراً دوسرا دور شروع کر دیتے، تاکہ تعلیم سے فراغت ہی نہ ہو، جو اس ”جنت“ سے نکلنا پڑے، گویا یہ پڑھنے کی نوکری کرتے تھے اور یہی حالت اس وقت ہندوستان کے ان عام مدارس کی تھی جن کو ارباب خیر نے جاری کر رکھا تھا۔

نواب صاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر ۱۳۱۳ھ میں ”نظارۃ المعارف“ کے نام سے ایک تعلیمی مجلس شوریٰ قائم کی جس میں بھوپال کے علاوہ باہر کے دو ممتاز عالموں کو جو عربی مدارس کی تنظیم و اصلاح کے لیے کوشاں تھے، باہر سے بلوایا، ان میں سے ایک شمس العلماء مولانا شبلی اور دوسرے مولانا ابراہیم صاحب آروی تھے، جنہوں نے آہ میں نئے پرواز پر ایک عربی درس گاہ مدرسہ احمدیہ کے نام سے قائم کی تھی، تعلیم کے ان ماہروں کے مشورہ سے نواب صاحب نے بھوپال کے مدارس کی اصلاح و تنظیم کا کام شروع کیا۔

۱۔ نواب صاحب مرحوم نے اس کی تفصیل اپنی خودنوشت سوانح عمری میں جو معارف ۱۹۳۷ء میں مسلسل چھپی ہے، لکھی ہے اور مارچ ۱۹۳۷ء کے نمبر میں یہ کیفیت درج ہے۔

خوش قسمتی سے نواب صاحب ممدوح کے محفوظ کاغذوں میں مولانا مرحوم کی دو یادداشتیں جن میں ایک ۲۷ فروری اور ۲ مارچ کو اور دوسری ۲ اپریل ۱۸۹۰ء کو لکھ کر نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی، بل گئی ہیں۔

مولانا مرحوم ”نظارۃ المعارف“ کی مجلس شوریٰ کی شرکت سے فارغ ہو کر فروری کے آخر میں علی گڑھ پہنچے، جیسا کہ ۲۷ فروری کی یادداشت میں ذکر ہے، واپس آ کر ۲۷ فروری اور ۲ مارچ کی دو نشستوں میں عام انتظامی معاملات کی ۱۳ دفعات لکھی ہیں، دوسری یادداشت جو مفصل ہے اور جو ۲ اپریل کو مرتب کی گئی ہے، دو کاغذوں پر مشتمل ہے، ایک میں طلبہ کے امتحان اور وظیفوں کے قواعد ہیں اور دوسرے میں پہلے مدرسین کی حاضری اور رخصت کا دستور العمل اور پھر اس کے نصاب کا خاکہ اور تقسیم اوقات کا نقشہ ہے، اس یادداشت کو اس مقام پر اس لیے نقل کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کے عربی مدارس کی اصلاح کا سب سے پہلا تاریخی نقشہ لگا ہوں کے سامنے آجائے۔

”دستور العمل و ہدایات برائے مدرسین“

دفعہ ۱- تمام مدرسین کو ضرور ہوگا کہ وقت معین پر مدرسہ میں آئیں۔

۲- ایک حاضری کی کتاب مدرس اول کے کمرہ میں موجود ہوگی، ہر مدرس مدرسہ میں آنے کے ساتھ اپنی حاضری اپنے قلم سے اس میں لکھ دے گا، اس کتاب میں تاریخ دن وقت نام اور دست خط کے خانے ہوں گے (پنجاب میں یہ طریقہ عموماً جاری ہے)

۳- ہر مدرس اپنے طلبہ کی حاضری لے گا جو طالب العلم غیر حاضر ہو اس پر جرمانہ اور ویر میں آئے تو خفیف تنبیہ کرے گا۔

۴- کسی مدرس کو جائز نہ ہوگا کہ اوقات مدرسہ میں (بہ جز کسی اتفاقیہ خاص ضرورت کے) مدرسہ سے باہر جائے یا ان اوقات میں کوئی شخص اس سے ملنے آئے۔

۵- مدرسین کو ایک دن کی رخصت دینے کا اختیار مدرس اعلا کو ہوگا اور اس سے زیادہ کے لیے بہ توسط مدرس اعلا کے سرشتہ تعلیم کے افسر کے پاس درخواست بھیجنی ہوگی۔

۶- جو مدرس کسی دن مدرسہ میں نہ آئے تو ضرور ہوگا کہ وہ رخصت کی درخواست پہنچے بھیج کر منظوری حاصل کر لے۔

۷۔- تعلیم نقشہ انضباط اوقات کے موافق دی جائے گی اور ہر مہینہ کے اخیر میں ایک کتاب میں جو اسی غرض کے لیے تیار کی جائے گی، ہر مدرس کو یہ درج کرنا ہوگا کہ اس مہینہ میں ہر صف کو کس قدر تعلیم دی گئی۔

۸۔ ہر مہینہ کے اخیر میں ہر مدرس اپنے طلبہ کا امتحان لے گا اور تاریخ امتحان ایک کتاب میں درج کر لے گا۔

۹۔ امتحانات نہایت احتیاط کے ساتھ بلا رورعیابت لیے جائیں گے۔

نقشہ انضباط اوقات بہ تعیین مدرسین

جدول اور خانے وہاں بنا لیے جائیں،

درجہ	۱۰ سے ۱۱ تک	۱۱-۱۲	۱-۲	۲-۳	۳-۴
اول	صرف	حساب	فارسی	صرف	املا و تحریر
دوم	فارسی	صرف	حساب	املا و تحریر	نحو
۳	نحو	منطق و ادب	تاریخ و عقائد	عربی انشاء پر دازی	حساب
۴	حساب	منطق و مناظرہ	فقہ	حدیث و فرائض	ادب
۵	فلسفہ و منطق	فقہ و اصول	عقائد و تاریخ	حساب	ادب
۶	منطق	حساب	فلسفہ	عروض و معانی	ادب

۱۔ یہ نقشہ نصاب تعلیم اور تعداد مدرسین کی مناسبت پر مبنی ہے۔

۲۔ ادب کا ہر روز ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے۔

۳۔ جمعرات کے دن صرف دو گھنٹے جو ہیں اس میں کم ضروری مضامین کو نکال دیا جائے۔

دفعہ دوم میں آپ نے لکھا ہے کہ ”طلبہ کو عربی لکھنی نہیں آتی، اس کے لیے طرزِ تعلیم کے قواعد مقرر ہونے چاہئیں، یہ امر قاعدہ کے نیچے نہیں آسکتا بلکہ مدرسین کے ادبی مذاق پر موقوف ہے لیکن اس کی تدبیر سردست یہ ہونی چاہیے کہ نقشہ انضباط اوقات میں املا و تحریر اور ادب کا ہر روز جو ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے، اس میں ہمیشہ اردو سے عربی میں ترجمہ کرایا جائے لیکن چون کہ مدرسین خود عمدہ عربی نہیں لکھ سکتے ہوں گے اور اس لیے ان کی اصلاح چنداں مفید نہ ہوگی، اس لیے اس کا یہ طریقہ ہے کہ عربی کی ایک کتاب عمدہ عبارت کی جس میں قصے ہوں، پہلے مدرس صاحب اس کا صفحہ آدھ صفحہ اردو میں با محاورہ ترجمہ کر کے وہی ترجمہ طلبہ کو دیں، پھر اصلاح میں اصل عبارت کے موافق اصلاح دیں، با بالکل وہی وصل یا بہ تغیر لیسر، ہاں اس قدر ضرور چاہیے کہ طلبہ کی صرفی و نحوی اور محاورہ کی غلطیوں پر ان کو مطلع نہ کر دیا کریں۔

دفعہ ۳- کا جواب مقدمہ ابن خلدون وغیرہ کے مضامین کا انتخاب میں خود کر کے کل پر سون

بھیجوں گا۔

دفعہ ۴- کا جواب، مختصر تاریخ ہندوستان جہاں گیری^۱ و صدیقی کے لیے قصص الہند مطبوعہ

لاہور نہایت عمدہ اور دل چسپ کتاب ہے، اس کا اسلامی حصہ خاص مولوی محمد حسین آزاد کا لکھا ہوا ہے

اور بہت ہی دل چسپ ہے، مسائل ضروری دینیات کے لیے کیا راہ نجات کافی نہیں؟

دفعہ ۵- ہاں میں نے اپنے ریمارکوں میں بعض جگہ کتابوں کے نام نہیں متعین کیے تھے، وہ

اب لکھتا ہوں، حسب ترتیب ریمارک۔

درجہ دوم- سفر نامہ کے بجائے تاریخ التواریخ کا وہ حصہ جو پنجاب کے فارسی نڈل کلاس میں

داخل ہے، وہ کورس منگوالینا چاہیے، مخزن الفوائد کے بجائے عبدالواسع کے آسان حصے۔

درجہ چہارم- شرح و قیام سے پہلے انتخاب جامع صغیر امام محمد، ادب کی کتاب اس درجہ میں

کلیدہ دمنہ ابن المقفع مطبوعہ بمبئی۔

درجہ پنجم- شرح ہدایۃ الحکمۃ مولوی عبدالحق خیر آبادی مناسب ہے، مولانا لطف اللہ صاحب

مفتی حیدرآباد نے اپنے کورس میں اسی کو منتخب کیا ہے۔

ملاحسن ہرگز نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اس کے بجائے شرح سلم بحر العلوم مطبوعہ دہلی رکھنا

چاہیے۔ (یہ ریمارک پہلے رہ گیا تھا)

ادب کی کتاب اس درجہ میں انتخاب دیوان ابوالعزہ، مطبوعہ بیروت رکھنا چاہیے، ہاں یہ

امر خاص قابل لحاظ ہے کہ تمام میں حساب کی کتاب پی گھوش کے بجائے چکرورتی ارٹھمینگ رکھنی

چاہیے، اب ادھر وہی متداول ہے، ہمارے کالج میں اور دوسرے کالجوں میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے

اور اس کو عموماً ترجیح دی جاتی ہے اردو میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے اور بار بار چھپ چکا ہے۔

فارسی کے درجہ میں مجھ کو سخت اختلاف ہے، ایک کتاب بھی کام کی نہیں، منتخبات نظم و نثر تیار

نہیں کہ اس کو دیکھ کر کوئی رائے دی جاسکے۔

مقامات حمیدی میں نے دیکھی، بلکہ پڑھی ہے، وہ طرز بہ جز حمیدی کے پھر کسی نے اختیار

نہیں کیا اور نہ اس طرز میں کوئی مفید مضمون ادا ہو سکتا ہے۔

۱۔ جہاں گیری و صدیقی جو پال کے دو دروسوں کے نام ہیں۔ ۲۔ یہ فارسی میں مقامات حریری کے طرز کی کتاب

ہے، عبارت متقی، سجع اور لفظی صنایع و بدائع سے بھری ہوئی ہے۔

تختۃ الاحرار جامی، بالکل پست درجہ کی کتاب ہے، اس سے تو مطلع الانوار خسرو کہیں اچھی ہے اور خود جامی اس کے معترف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فارسی کے تین دور ہیں، قدما مثلاً فردوسی، عبد الواسع جبلی، منوچہری، اخیر میں انوری متوسطین مثلاً سعدی، سلمان ساؤجی، کمال اسماعیل، متاخرین، مثلاً نظیری، عرفی، ظہوری، طالب آملی کلیم ان تینوں طبقے کی ایک ایک دودو کتاب پڑھانی چاہیے کہ طالب علم کو ایک عام بصیرت ہو، منوچہری، سلمان، کمال اسماعیل وغیرہ سب چھپ گئے ہیں۔

اس درجہ میں تاریخ کی کتاب نامہ خسرواں موزوں ہے، جغرافیہ کی فارسی تصنیف جام جم ہے لیکن وہ بڑی کتاب ہے اور ۱۳ روپیے اس کی قیمت ہے، جغرافیہ اردو میں پڑھانا کافی ہے، تاریخ میں روضۃ الاحباب بھی اچھی ہے، گو عبارت معمولی ہے۔“

سال دوم	مخزن القوائد اگر وہی قاعدہ کی کتاب ہے جو فائق کی تصنیف ہے تو وہ نہایت معمولی درجہ کی تصنیف ہے اور اس میں غایت درجہ کے ہندی شعرا کے اشعار بھرے ہیں۔	چہارم	رشیدیہ بے فائدہ ہے، مناظرہ کے فن کے لیے صرف اس کی اصطلاحیں اور امثالہ کافی ہیں، ایک مستقل فن بنا کر اصل مسائل سے بعد ہو جاتا ہے، رشیدیہ کا متن کافی ہے، مراتی الفلاح کی کوئی ضرورت نہیں، شرح وقایہ سے پہلے کوئی آسان اور مختصر کتاب فقہ کی رکھنی چاہیے، ادب کی کوئی کتاب اس درجہ میں نہیں ہے۔
---------	--	-------	---

سوم	میں کافیہ اور شرح ملا دونوں کو ناپسند کرتا ہوں، یہ جائے اس کے دستخط کی مفصل ہوتی تو اچھا تھا، لیکن چون کہ مولویوں کے نزدیک یہ کتاب نہایت ضروری اور معیار کمال ہیں، اس لیے مصنفین ان کو قائم رکھا جاسکتا ہے، اس سال تاریخ اٹھلخفا کے ۲۳۰ صفحے بہت ہیں، ۱۰۰ صفحے سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔	پنجم	شرح ہدایہ الکلمت سے اگر میڈی مراد ہے، تو وہ درس میں رکھنے کے قابل نہیں، الہیات میڈی کے ۱۸۰ صفحے نہیں ہیں، بلکہ ساری کتاب بھی شاید اس قدر نہ ہو، اس درجہ میں بھی ادب کی کوئی کتاب نہیں ہے۔
-----	---	------	---

<p>اس درجہ میں فلسفہ قدیم کی کوئی کتاب ہونی چاہیے، مثلاً شرح الحکمت العین کا کوئی حصہ مختصر المعانی کے بہ جائے مفاح سکا کی زیادہ مناسب ہے، بہ شرطے کہ علما ناراض نہ ہوں۔</p> <p>درجہ ششم یا ہفتم میں امام غزالی کے رسائل اربعہ یعنی الجام العوام و متقد من العصال وغیرہ رکھنا مناسب ہوگا۔</p>	<p>ہفتم</p>	<p>جب درجہ چہارم و ہفتم میں کوئی کتاب ادب کی نہیں ہے تو اس درجہ میں مقامات حریری کیوں کر چل سکتی ہے۔</p>	<p>ششم</p>
---	-------------	--	------------

۹ اگست ۱۸۹۹ء کو مولانا نے نواب صاحب کو امیر افغانستان کے مجوزہ حکمہ تراجم کی اطلاع دی اور ساتھ ہی ان کی حوصلہ افزائی کے لیے لکھا ”جب صحرائے افغانستان میں یہ اچھ پیدا ہوئی ہے تو بھوپال کا مرغزار تو بڑی قابلیت رکھتا ہے۔“

غرض ان تنظیمات کے بعد مدارس کی حالت درست ہوئی اور نتیجے توقع کے مطابق نکلے، چنانچہ مارچ ۱۹۰۱ء میں سرکار بھوپال کی پہلی تعلیمی رپورٹ بابت ۱۹۰۰ء اردو اور انگریزی میں شائع ہوئی، اس وقت مولانا حیدرآباد میں مولوی سید علی بلگرامی کے پاس مقیم تھے، روداد دیکھ کر مولانا نے نواب صاحب کو مبارک باد دی اور لکھا ”روداد مرسلہ میں نے دیکھی اور نہایت مسرت ہوئی، خدا کرے روز افزوں ترقی ہو، میں تو چاہتا ہوں کہ واپسی میں خود مدارس کو دیکھ کر ایک یا دو شب لکھوں لیکن آپ فرمائیں تو روداد ہی پر اپنی رائے لکھ کر اخبارات کو بھیج دوں، انگریزی روداد مولوی سید علی صاحب نے لے لی۔“ (علی حسن خان-۳)

سر سید کی وفات مارچ ۱۸۹۸ء | مولانا بھوپال سے فروری کے اخیر میں علی گڑھ واپس آئے، یہ وقت علی گڑھ کی پابلیکس کا بڑا نازک تھا، ان دنوں سر سید ایک طرف اپنے بیٹے کی بد مستی اور بد مزاجی سے نہایت قلمی کوفت اور اذیت میں تھے اور دوسری طرف سید محمود کی چانشینی اور نرسٹیز بل کی منظوری کے سبب سے سر سید کے اچھے اچھے دوست بلکہ دست و بازو ان سے الگ ہو رہے تھے، نواب وقار الملک اور دوسرے اکابر ارکان کی طرف سے بالا اعلان مخالفت کی تحریریں اخباروں میں جا چکی تھیں، یہاں تک کہ نیک صفات مولانا حالی بھی موافقت نہ کر سکے کہ دفعہ چند روز کی علالت کے بعد ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء

کو سرسید نے وفات پائی اور ساری مخالفتانہ کارروائیاں روک دی گئیں، بایں ہمہ اس وقت سرسید کے سانحہ وفات کا جو اثر مولانا پر ہوا اس کا اندازہ اس عربی خط سے ہو سکتا ہے، جو انہوں نے سانحہ کے دوسرے دن نواب علی حسن خاں کو بھجو پال لکھا:

نمی دانم حدیثِ نامہ چوں است
تضعضت ارکان الملة أعی
انتقل السید احمد خان بہادر
الی جوار رحمة ربه وذلك یوم
الاحد ۲۷ ر مارچ وتفرق شملنا،
انی لا اقدر علی ان اشتغل بشئی
الا بعد برهة الزمان (شبلی

ہمی دانم کہ عنوانش بخون است
تومی عمارت کے ستون ہل گئے، یعنی سید احمد
خان بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں
گئے اور یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا،
اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا، میں کچھ دنوں
تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔

نعمانی علی گڑھ) ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء

اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ جس کے مدح انہوں نے پہلے کئی دفعہ لکھی، اس کے مرثیہ میں ایک شعر بھی انہوں نے نہیں کہا، مگر واقعات کی روداد آپ کے سامنے ہے، اس کو پیش نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ مدح لکھنے والے کا دل اب مرثیہ لکھنے کے زمانہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا اور جھوٹی شاعری اس کی افتاد طبع نہ تھی، البتہ سرسید کی وفات کے بعد ان کی انشا پردازی پر ایک مضمون اپریل ۱۸۹۸ء کے میگزین میں ارکانِ کالج کے اصرار سے لکھا جیسا کہ مضمون کے آخر میں ہے۔

رخصت اور ترک تعلق مئی ۱۸۹۸ء | اب کالج سراسر مسٹر بک پرنسپل اور سید محمود کے ہاتھوں میں آ گیا اور سید محمود کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی، ۱۶ اپریل ۱۸۹۸ء کو لکھتے ہیں ”کالج کا حال کشمکش میں ہے، ہر دست بک صاحب نے قبضہ کر لیا ہے، سید محمود کی حالت بہت خراب ہے۔“ (حمید-۶)

مولانا نے فروری ہی میں ارادہ کر لیا تھا کہ وہ پہلی مئی سے چھ مہینہ کی رخصت لیں گے، اس واقعہ کے بعد تو اور ضروری ہو گیا، چنانچہ مئی ۱۸۹۸ء سے پہلے چھ مہینہ کی رخصت لی، پھر استعفا بھیج دیا، اس طرح سولہ برس کی پرانقلاب سبق آموز اور ہنگامہ خیز زندگی کے بعد علی گڑھ کو خیر آباد کہا۔

اعظم گڑھ کو رجعت جون ۱۸۹۸ء | کالج سے رخصت ہو کر مولانا نے جون ۱۸۹۸ء میں

اعظم گڑھ کا رخ کیا، یہاں انہوں نے ۱۸۹۲ء سے پہلے (اسحاق-۳) شہر سے باہر اپنے خاندانی باغ میں ایک چھوٹا سا کچا بنگلہ بنوایا تھا اور جس کو شبلی منزل کا خطاب دیا تھا اور جو اب شبلی کا دفن اور دارالمصنفین کا مسکن ہے، یہیں آ کر قیام فرمایا۔

مولانا نے یہاں بیٹھ کر سب سے پہلے تو الفاروق کے ناتمام حصہ کی تکمیل کرنی چاہی اور اسی کے ساتھ ۱۸۸۳ء میں جس نیشنل اسکول کی بنیاد اعظم گڑھ میں ڈالی تھی، جس نے ان کی برادری میں انگریزی تعلیم کی اشاعت میں بڑی مدد دی تھی، اس کی دیکھ بھال شروع کی، عزیزوں سے اس کے لیے چندے منگوائے، اس کی تعمیر کے اضافہ کا خیال کیا، ماسٹرن اور مدرسوں کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی، آمد و خرچ کو برابر کرنے کی کوشش کی، ان باتوں میں کبھی کبھی ان کا دن دن بھر لگ جاتا تھا، ۹۸ء و ۹۹ء اور ۱۹۰۰ء کے مکاتیب (حمید، اسحاق) میں یہ تذکرے ہیں۔

کتب خانہ کی ایک جانی | مولانا نے اپنا ذاتی کتب خانہ جو ان کی خریدی اور ہدیہ ملی ہوئی کتابوں پر مشتمل تھا اور جس میں اچھا خاصہ حصہ یورپ کے مطبوعات کا تھا، علی گڑھ سے منگوایا اور جو کتابیں یہاں تھیں، ان سے ملا کر کئی ہزار کتابوں کا ذاتی کتب خانہ اب ایک جا کر لیا، میں ۱۹۰۰ء میں جب پہلی بار مولانا کے پاؤں کے حادثہ میں اعظم گڑھ آیا تھا تو اس کتب خانہ کو دیکھا تھا۔ یہ کتب خانہ کیسا تھا، اس کا حال خود مولانا ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

”کتا میں میرے پاس تعداد میں بہت نہیں ہیں لیکن اکثر نایاب مطبوعات یورپ اور بعض نایاب

قلمی کتابیں ہیں۔“ (۲۷)

اس کی قیمت کا تخمینہ بھی اس خط میں تین ہزار بتاتے ہیں۔

علالت | اعظم گڑھ میں سال بھر رہنا مشکل تھا، اس لیے وہ ستمبر ۱۸۹۸ء میں الہ آباد گئے (مہدی افادی) پھر بیمار ہو کر لکھنؤ گئے اور گولڈ گنج میں ندوہ کے مکان میں ٹھہرے اور وہاں کے مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب (بانی مدرسہ تکمیل الطب جھوئی، ٹولہ لکھنؤ) کا علاج کرایا، ۱۹ ستمبر ۱۸۹۸ء کو وہیں تھے، (مہدی افادی) کہ دسمبر ۱۸۹۸ء میں ہم ان کو پھر علی گڑھ میں پاتے ہیں اور عربی کی بعض نئی مطبوعہ کتابوں کے حصول پر خوش ہو رہے ہیں۔ (حمید-۹)

اس تمام چکر میں الفاروق کا کام ساتھ ساتھ تھا اور مزاج کا یہ حال تھا کہ کبھی اچھا اور کبھی برا

اس لیے کسی صحت گاہ کا خیال تھا۔

سفر کشمیر جولائی ۱۸۹۸ء | صحت کی بحالی کے لیے کشمیر کے سفر کا خیال جیسا اوپر گذر چکا ہے، مولانا کو کئی سال سے تھا، اس سال جب وہ کالج کی خدمات سے سبک دوش ہو رہے تھے، اس خیال کو عمل میں لانے کا ارادہ پورا ہو رہا تھا، چنانچہ فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ ہی سے کشمیر کا قصد تھا، (حمید-۵) اب جب وہ جون ۱۸۹۸ء میں کالج کی خدمت سے سبک دوش ہوئے تو اسی مہینہ کے آخر میں کشمیر کے سفر کو تہا روانہ ہو گئے، اس وقت الفاروق جیسی زندہ جاوید تصنیف زیر قلم تھی، جی چاہا ہوگا کہ وہ اسی بہارستان میں ختم ہو۔

کشمیر میں قاضی خواجہ سعد الدین صاحب مرحوم جن کے خاندان میں کشمیر کا عہدہ قضا موروثی تھا، وہ علی گڑھ میں مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم سے پڑھتے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان سے مولانا کے مراسم قائم ہو گئے تھے، مولانا نے کشمیر کا قصد فرمایا تو انہوں نے میزبانی کا فرض ادا کرنا چاہا، مگر مولانا ایک ایسے محلہ میں الگ مکان لے کر رہے جو نہایت نمناک تھا، خواجہ سعد الدین صاحب نے منع بھی کیا، مگر مولانا نے اسی مقام کو پسند کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ہی ہفتہ رہنے پائے تھے کہ نہایت سخت بیمار پڑے، الفاروق جلد دوم کا خاتمہ وہیں ۱۵ جولائی ۱۸۹۸ء کو قلم سے لکھا، مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت ہاتھ نے قلم رکھا ہے، میں بستر پر بیہوش پڑ گیا۔“

کشمیر میں جتنے دن رہے، بیمار ہی رہے، تہا گئے تھے، یہاں تک کہ ملازم بھی ساتھ نہ تھا، مگر کشمیر کے احباب نے اور خصوصیت کے ساتھ قاضی خواجہ سعد الدین صاحب اور مرزا سعد صاحب جو کشمیر کے ایک علم دوست رئیس تھے، بڑی خدمت کی اور ایک طبیب کا علاج ہوا، ایک دفعہ بخار کم ہوا تو سمجھے کہ اچھے ہو گئے، مگر دوبارہ پھر بیمار ہوئے اور جب تک وہاں رہے، بیمار ہی رہے، آخر جب ذرا طبیعت سنبھلی تو وطن کا رخ کیا، ۳۱ جولائی کو وہ گھر پہنچ چکے تھے، گواہ بھی علیل تھے، مگر آنے کے ساتھ ہی نیشنل اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، ۳۱ جولائی ۱۸۹۸ء کو مولوی حمید الدین صاحب سے تعمیر کا چندہ مانگا، (حمید-۷) اور دوسروں سے تقاضے شروع کیے، مگر طبیعت کا یہ انداز تھا کہ ابھی اچھے ہیں، اور ابھی بیمار، سنبھلے بھائی مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے الہ آباد بلا بھیجا تو ۲۲ اگست ۱۸۹۸ء کو یہ لے مکاتیب میں ۲۲ مارچ ۱۸۹۸ء لکھ گیا ہے، مارچ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اس مہینہ علی گڑھ میں تھے اور اچھے تھے اور یہ تاریخ سفر کشمیر سے پہلے کی ہے، ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے وفات پائی ہے تو وہ علی گڑھ ہی میں تھے، اس لیے یہ بوقلم ہے۔

معذرت لکھی ”میں جانتا ہوں کہ تمہارا بار بار کا تقاضا جوشِ محبت کی وجہ سے ہے، مگر کیا کروں کیفیت یہ ہے کہ طبیعت دو چار گھنٹے بھی یکساں نہیں رہتی، بلکہ دو چار مرتبہ بہت خراب حالت ہوگئی، خدا نخواستہ ایسی کیفیت کہیں سفر میں پیش آگئی تو جان کا خطرہ ہے، اس لیے سفر کرنا ایسی حالت میں سخت مخدوش ہے، اگر تمہیں تشخیص طبیعت کے لیے اس قدر اصرار ہے تو حکیم صاحب کو یہاں بھیج دو اور بہر حال بنارس کی ریل کھلنے کا تو انتظار ہی کرنا چاہیے۔“

بہر حال طبیعت سنبھلی تو ۳۰ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ہم ان کو الہ آباد میں پاتے ہیں اور ایسے خوش کہ بیماری کا کوئی تذکرہ ہی نہیں، الفاروق کے دل خوش کن تذکرے ہیں۔ (مہدی افادی-۷)

دفعہ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ہم ان کو لکھنؤ دفتر ندوہ میں دیکھتے ہیں اور بیمار پاتے ہیں، جھوائی ٹولہ کے مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب کا علاج ہو رہا ہے (مہدی افادی-۸) مگر پھر وہ اعظم گڑھ واپس آگئے، کچھ نہ کچھ علاج ہوتا رہا، مگر طبیعت راہ پر نہ آتی تھی، لطف یہ ہے کہ علی گڑھ کے اُن کے بعض دوستوں کو ان کی اس شدید بیماری کا یقین نہیں آتا تھا، یعنی حاجی اسماعیل جاں مرحوم اس کو مذاق ہی سمجھتے رہے، البتہ نواب محسن الملک نے کرم کیا اور خود اعظم گڑھ آئے اور کئی روز رہے، اسحاق مرحوم کو لکھتے ہیں: پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے، نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے، ان کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا لیکن میں اس کو برداشت کر سکا، گرمی کی وجہ سے بدن میں طاقت معلوم ہوتی ہے، تم آنے میں جلدی نہ کرو، میری اس قدر ضرورت خواہش ہے کہ کوئی ماہر طبیب یا ڈاکٹر اعضائے رئیسہ کی تشخیص کر لیتا۔“ (۸)

معلوم ہوتا ہے کہ نومبر و دسمبر ۱۸۹۸ء میں ان کی حالت سنبھل گئی، چنانچہ وہ سفر کے قابل ہو گئے، بعض حالات کی بنا پر جس کی تفصیل نہیں، ۳ دسمبر ۱۸۹۸ء کو وہ علی گڑھ جاتے ہیں، مولوی حمید الدین صاحب کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، خط میں کسی بیماری کا ذکر نہیں، بلکہ طبیعت میں یہ انبساط ہے کہ اس زمانہ میں جو علی کتابیں ہاتھ آئیں ان کی تفصیل حوالہ قلم ہے۔ (۹)

الفاروق کی تکمیل و اشاعت جنوری ۱۸۹۹ء | اسی حالت میں الفاروق کی آخری تکمیل و نظر ثانی اور طباعت کا کام جاری رہا، دسمبر ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ میں اس کا مقدمہ تحریر ہوا، ۸ جنوری ۱۸۹۹ء کو اس کے چھپ جانے کی بشارت دی جاتی ہے، (مہدی افادی-۹) ۸ فروری ۱۸۹۹ء کو اس کے

مطبوعہ اور اُرق ایک ہمہ تن شوق عزیز دوست (مولانا شروانی) کے پاس اس تاکید سے بھیجے جاتے ہیں کہ ابھی کوئی اور دیکھنے نہ پائے، (شروانی-۱) مولانا کو اس کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ تکمیل و اشاعت سے پہلے ان کی کتاب کا مسودہ کوئی دیکھنے نہ پائے، فرماتے تھے کہ ”سر سید مرحوم الفاروق کا مسودہ اور اس کے چھپے ہوئے اجزا دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے“ اور میں مسکرا کر یہ جواب دیتا کہ ”مشاعرہ سے پہلے غزل نہیں سنائی جاتی“، مگر افسوس کہ سر سید اس غزل کو نہ پڑھ سکے اور نہ سن سکے، کیوں کہ وہ اس سے پہلے ہی ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کر چکے تھے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں ”مجھ کو ایک ملاقات میں الفاروق کے ایک حصہ کا مطبوعہ پروف اپنے ہاتھ میں لے کر اس شرط سے دکھایا کہ میں صرف اس کا حسن طبع دیکھوں، پڑھوں نہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سلسلہٴ علالت کا اشتداد | الفاروق جیسی اہم تصنیف سے فراغت کی مسرت ان کو ابھی ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ علالت نے اشتداد اختیار کیا، ۱۵ فروری ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو اپنا یہ حال لکھ کر بھیجے ہیں ”اصل یہ ہے کہ میری تمام بیماریوں کا سبب معدہ کا فساد ہے اور اب تک نہیں گیا، غذا ٹھیک ہضم نہیں ہوتی، کئی کئی وقت بھوک نہیں لگتی، کبھی نفخ رہتا ہے، کبھی قبض اور اکثر بخیر، ان اسباب سے نہ قوت آتی ہے نہ ظاہر حال میں تندرستی آتی ہے، شب و روز پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، ضروری ڈاک کے لیے ایک ملازم مشاہرہ لے کر لکھا گیا ہے۔ (شروانی-۲)

اس عالم کے علمی مشاغل | علالت کے اس تکلیف دہ سلسلہ میں بھی ان کے علمی مشاغل بدستور جاری رہتے ہیں، ۱۸/۱۸ اپریل ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی سے مسٹر آرنلڈ کے لیے منوچہری کا دیوان مطبوعہ یورپ منگواتے ہیں اور المامون کے ریویو لکھنے والے کو الفاروق پر ریویو لکھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ (شروانی-۳) ۱۰ مئی ۱۸۹۹ء کو ریویو تیار ہو جاتا ہے اور معارف علی گڑھ مرتبہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم میں اس کے بھیجنے کا مشورہ ہوتا ہے اور اسی خط میں اپنی اس زندگی سے جس میں بیماری کے تسلسل کی وجہ سے مخلص دوستوں سے ملنا نصیب نہ ہوا، تنگ آ جانا ظاہر کرتے ہیں۔ (شروانی-۵)

علالت کا سخت دورہ مئی ۱۸۹۹ء | اس کے ایک ہی ہفتہ کے بعد بیماری کا ایک نہایت ہی سخت دورہ لے کر مکتب میں میں نے اپنی ہانہی سے اس ”مطبوعہ مسودہ“ کو انجمن ترقی اردو کا کاغذ سمجھا تھا، جو اس وقت تک قائم بھی نہیں ہوئی تھی، یہ دراصل الفاروق کے اوراق ہیں-۱۲۔

پڑتا ہے، یہاں تک کہ اپنی علالت کی شدت سے مجبور ہو کر ۱۰ مئی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں ’اب ادائے حق دوستی کا وقت ہے، حکیم عبدالجبار خاں صاحب کو میرے معالجہ کے لیے خط لکھیے، ان کا جواب آجائے، تو سفر کا قصد کروں، آپ بھی دلی تک چلیں، ظن غالب ہے کہ نواب حسن الملک بھی چلیں گے۔‘ (۶) ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کا علاج اور عارضی صحت ۱۸۹۹ء | بیماری کا حملہ اس دفعہ اتنا شدید تھا کہ مایوس ہو کر وصیت نامہ تک لکھ دیا تھا، حسن اتفاق دیکھیے کہ اسی اثنا میں کہ دلی کے سفر کا سامان ہو رہا تھا، ایک مسلمان ماہر ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب اسسٹنٹ سول سرجن گونڈہ سے بدل کر اعظم گڑھ آئے، مولانا کے بھائی مولوی اسحاق صاحب سے ان کے تعلقات تھے، اس سبب سے یہ سن کر کہ مولانا بیمار ہیں، وہ دیکھنے آئے اور بہت توجہ سے علاج شروع کیا اور یہ تشخیص کیا کہ قلب میں نہایت کم زوری آگئی ہے، اس لیے کوئی دو فائدہ نہیں کرتی، انہوں نے محنت اور جدوجہد سے علاج کا سلسلہ جاری رکھا اور بحمد اللہ کہ ان کے چند ہی روز کے علاج سے فائدہ محسوس ہونے لگا اور دلی کا سفر سر دست ملتوی ہو گیا، (شروانی-۷) ابھی طبیعت درست ہو چلی تھی کہ ندوہ اور نادر کتابوں کی یاد آئی، ارجون کونائیس لکھتے ہیں ’مخط پہنچا، مشکور کیا، ڈاکٹری علاج سے بہت فائدہ ہے، ادب الکا تب ناقص خریدنے کی کیا ضرورت ہے، مصر میں مکمل چھپ گئی ہے، مثل السائر کے حاشیہ پر۔

دارالعلوم کی کل میں نہایت ذلیل پرزے لگائے گئے ہیں کیا قوم کو اس قدر امید دلا کر دیوبند وغیرہ سے بھی گھٹیا مال دینا چاہیے۔

مولانا کی اگلی جیسی ہشاش بشاش گفتگو سے دوستوں کو خیال ہوا کہ اب وہ تندرست ہو گئے، مولانا شروانی نے یہ پوچھا تو جواب دیا ’ابھی تو میں کیا صحیح ہوں لیکن کچھ امید بندھی ہے شاید صحیح ہو جاؤں، آپ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے، آپ کو بھی تکلیف کرنی پڑے گی ندوہ کی بیماری لا علاج ہے۔‘

مولانا شروانی نے آنے کا وعدہ کیا تو خوشی سے اچھل پڑے، ۲۵ مئی کو لکھا ’کیا آپ واقعی یہاں جلوہ فرما ہوں گے اور کیا درحقیقت مع ’میرے ویرانہ میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی‘ نامہ والا کو ۱۔ دہلی کے مشہور شریف خانی طبیب ۱۹۰۱ء میں وفات پائی۔ ۲۔ نواب علی حسن خاں-۳۔

بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں: ”سچ سچ بتایہ حرف ان ہی کے قلم کے ہیں۔“
 بہر حال ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی صحت کا اعلان کیا اور ان ہی کے اصرار سے ایک جلسہ مرتب ہوا، لوگ مدعو ہوئے، شکرانہ میں ۱۰۰ روپے مولانا نے نذر کیے۔

اور نیٹیل کانفرنس اٹلی کا ارادہ جولائی ۱۸۹۹ء | صحت کے بعد تبدیلی آب و ہوا کی ضرورت تھی، حسن اتفاق یہ کہ امسال یورپ کی اور نیٹیل کانفرنس (جو مشرقی اور اسلامی علوم و فنون کی تحقیق کرتی ہے) کا اجلاس اٹلی میں ہو رہا تھا اور اس حسن اتفاق پر حسن اتفاق یہ کہ سفر روم والے رفیق پروفیسر آرنلڈ اسی زمانہ میں ۲۶ جولائی کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اس کی شرکت کے لیے روانہ ہو رہے تھے، انہوں نے مولانا سے بھی سفر کی تحریک کی، وہ آمادہ ہو گئے، اپنے دو عزیز دوستوں نواب سید علی حسن خاں اور مولانا حبیب الرحمن شروانی کو لکھا۔

پہلے ۵ جولائی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھا، ہاں ایک اور بات ہے، اب کی کانفرنس اٹلی میں ہے، آرنلڈ ۲۶ جولائی کو روانہ ہوں گے، مجھ کو بلا تے ہیں، ضعف کی وجہ سے رکتا ہوں، اگر آپ کی ہم سفری کی امید ہو تو میں قومی ہو جاؤں گا، کیا آپ قصد کر سکتے ہیں؟ اسی سیر میں ممالک اسلامیہ کو بھی لپیٹے آئیں گے، پانچ سات سو کا خرچ ہے، آپ چاہیں تو ذرا اٹھہر کر بھی چل سکتے ہیں۔ (۱۱)

۱۳ جولائی ۱۸۹۹ء کو نواب سید علی حسن خاں کو بھوپال لکھا (۱) ایک نہایت ضروری امر گزارش ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ میں علوم مشرقیہ کے علما کا ایک مجمع ہے، جس کو اور نیٹیل کانفرنس کہتے ہیں، یہ نہایت معزز کانفرنس ہے اور تمام یورپ و مصر و شام کے علما جمع ہوتے ہیں، اس دفعہ اس کا اجلاس اٹلی میں ہے، ریاست حیدرآباد نے سید علی بلگرامی کو اس کی شرکت کے لیے بھیجا ہے اور پنجاب گورنمنٹ نے ہمارے مسٹر آرنلڈ کو، میں بھی انشاء اللہ جاؤں گا، آپ قصد کریں، تو متعدد فائدے ہیں، ریاست کی نام وری آپ کو یونیورسٹی کا فیلو بننا آسان ہوگا، آپ کے عہدہ ڈائریکٹری کی گورنمنٹ کے نزدیک نہایت وقعت بڑھ جائے گی، واپسی کے وقت مصر و قاہرہ کی سیر، لطفِ صحبت الگ، خرچ بہت سے بہت ایک ہزار مع خرچ واپسی، جواب سے مطلع فرمائیے۔“

بعد کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ یہ جائے ذاتی خرچ کے قومی خرچ سے جائیں، غالباً نواب صاحب کا اشارہ اس جانب ہوگا کہ وہ خرچ کے متحمل ہوں گے،

مولانا نے جواب دیا آپ کی یہ تجویز کہ میں قوم کے روپیے سے جاؤں، آپ کے علمی مذاق کی دلیل ہے، لیکن اس کے دو پہلو ہیں، ۱- میری مالی اعانت تو اس کی ضرورت نہیں اور اگر کسی قدر ہے تو اس کو ہمیت نفس نے رفع کر دیا ہے، ۲- قوم کی علمی قدر دانی کا ثبوت تو اس قدر دانی کا ثبوت اور لوگوں پر بھی ہو سکتا ہے۔“ مولانا! اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو تو یہ پہلو پیش نظر ہے کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا اور عام زبانوں پر یہ ہو گا کہ ”شبلی در یوزہ گری کر کے یورپ گیا۔“ معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے مجبوری ظاہر کی اور وہ خود بھی دوبارہ بیمار پڑ گئے اور وقت نکل گیا، مگر علم کے شوق کا اندازہ کیجئے کہ اس دیرینہ علالت کے بعد بھی دماغ اُدھر ہی مصروف ہے، اس کا ایک اچھا اندازہ اس زمانہ کے خطوط سے ہو گا۔

امیر کابل کی پیشکش، جولائی و اگست ۱۸۹۹ء | ان ہی دنوں امیر عبدالرحمن خاں والی کابل نے اپنے ملک کے لیے ہندوستان میں ایک محکمہ تراجم قائم کرنا چاہا، جو ہندوستان ہی میں رہ کر ہندوستان کے فضلاء کے قلم سے فارسی میں علوم و فنون کا سرمایہ بہم پہنچاتا، اس کے لیے اپنی حکومت کے اشارہ سے کابل کے سفیر نے مولانا حالی، مولانا نادر احمد اور مولانا شبلی سے خط و کتابت کی، ان بزرگوں نے معلوم نہیں کیا جواب دیا، غالباً معذرت کی ہوگی، مولانا شبلی اس وقت گویا علیلیں ہی تھے، اس لیے چاہا کہ یہ کام مولوی حمید الدین صاحب کے سپرد ہو، اس سلسلہ میں ۳۱ جولائی ۱۸۹۹ء کو انہیں یہ خط لکھا ”آج کل ایک بڑی ریاست بلکہ سلطنت سے ابن خلدون کے ترجمہ کا استفادہ آیا تھا، دس ہزار روپیہ نقد دیتے ہیں، میں نے اپنی صحت کے لحاظ سے انکار کر دیا (حمید-۱۰) ۹ اگست ۱۸۹۹ء کو نواب علی حسن خاں کو ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں ”اسی زمانہ میں سفیر کابل مقیم شملہ نے دس ہزار روپیہ نقد کے معاوضہ پر ابن خلدون کے ترجمہ (بہ حکم امیر صاحب) کے لیے مجھ کو لکھا میں نے انکار کیا، اگر صحیح ہو کر بھی میں نے انکار لکھا۔“ (۳)

پھر شکایات کا عود اور علمی مشاغل ستمبر ۱۸۹۹ء | مولانا کا ڈاکٹری علاج اب بھی جاری رہا، پہلے کے مقابلہ میں اب بہت اچھے تھے اور علمی و قومی مشغولیتیں بھی ساتھ ساتھ تھیں، ایک طرف نیشنل اسکول کی مالی امداد، اس کے آمد و خرچ کے برابر کرنے کی کوشش اور ماسٹروں کے مشاہرہ کے لیے مہاجن سے قرض لینے کے سامان میں دن گزر رہے ہیں (اسحاق-۹، ۱۰، ۱۱) تو دوسری طرف علمی انہماک بھی بڑھتا جا رہا ہے، الفاروق کے بعد اب کسی تصنیف کا خاکہ بن رہا ہے، ۱۰ جولائی کو مولانا شروانی سے معاملہ طے ہو رہا ہے کہ

آپ کیا لکھیں، میں کیا لکھوں یا دونوں مل کر لکھیں، چند عنوان سامنے آتے ہیں، علوم القرآن امام غزالی کی لائف فارسی شاعری کی تاریخ (۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷) ۱۴ اگست کو ندوہ کا جلسہ انتظامیہ ہوتا ہے اور مولانا روانگی کا ارادہ کرتے ہیں کہ پھر شکایتیں عود کر آئیں، ڈاکٹر صاحب موصوف اسی اثنا میں بدل کر گونڈہ چلے گئے تھے، آخر مولانا ستمبر ۱۸۹۹ء میں ان سے علاج کرانے کے لیے گونڈہ روانہ ہو گئے، وہاں سے مولانا شروانی کو اپنی دوبارہ علالت کی اطلاع دیتے ہیں اور اب سیرالصحابہ کی تجویز پیش ہو رہی ہے، ساتھ ہی اٹلی کی اور ٹیل کانفرنس کا خیال اور ندوہ (شروانی) ایک آدھ روز کے لیے لکھنؤ آتے ہیں، وہاں کے کسی کتب فروش کے پاس بعض نادر نسخے تصاویر، قطعات دیکھتے ہیں، تو ۱۸ ستمبر کو شروانی کو کس خوشی سے لکھتے ہیں، اکبر جہاں گیر اور شاہ جہاں کی علمی نفاست پسند یوں کے وہ نمونے آج کل یہاں آگئے ہیں، کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر اور اس میں کتاب الآلات کا بھی ایک نسخہ ہے لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں وہ خوش نویشوں کے قطع اور تصاویر ہیں، خدا بخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کروں گا۔ (۱۷)

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ اس تحریک کی یہ برکت ہوئی کہ بالآخر یہ خزانے حبیب گنج کے کتب خانہ میں داخل ہو گئے، ان میں سے ایک گلکاری کی بابت حال میں امریکہ کے ایک مؤلف نے لکھا ہے کہ ”دنیا میں منصور زمانی کے ہاتھ کی گلکاری کا نمونہ صرف ایک ہے اور وہ حبیب گنج میں ہے“ یہ تھی مولانا کی نقابی، دکھانا یہ ہے کہ مسلسل علالت کے ایام میں بھی دماغ اپنے کاروبار سے خالی نہیں، ۲۸ ستمبر کو گونڈہ کے شفا خانہ سے لکھتے ہیں ”میں صحیح چلا ہوں اور ساتھ ہی دارالعلوم کا خیال آیا، مولوی خلیل الرحمن صاحب عیادت کو آئے تھے اور ابھارا، بہر حال میں نے عالم خیال میں وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں“ (۱۹) مولانا اکتوبر تک گونڈہ کے شفا خانہ میں مقیم رہے، گونڈہ میں ایک لطیفہ پیش آیا، قاضی خادم حسین صاحب جو مولانا سید امیر علی صاحب شہید کی بہن کے نواسے ہیں اور جن کے نانا وپس گونڈہ میں وکیل تھے وہ اس زمانہ میں وہاں طالب العلم تھے اور نوجوان تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ”میں مولانا کی تصنیفات پڑھ کر ان کی زیارت کا بے حد مشتاق تھا، مگر ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی، مولانا کو گونڈہ آنے کا حال سنا تو

۱۔ مولوی خلیل الرحمن صاحب فرزند دوم مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری درکن ندوہ ۲۔ جناب منشی احتشام علی صاحب، رئیس کاکوری کے داماد۔

عقیدت مندانہ حاضر ہوا اور شوقِ ملاقات عرض کیا، فرمانے لگے، اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یہ علالت ایک مخدوم زادہ کی کرامت تھی اور اس طرح مجھے کھینچ کر گونڈہ بلا یا گیا، یہ مقصد پورا ہو گیا اور اب میں جلد اچھا ہو جاؤں گا“ واقعی وہ چند روز کے بعد اچھے ہو گئے اور گونڈہ سے چلے آئے، بہ ظاہر ملیہ ریانے مولانا کے جسم سے مفارقت کی، مگر حقیقت یہ کہ اخیر اخیر تک ان پر اس کے حملے ہوتے رہے، یہاں تک کہ وفات سے ایک سال پہلے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنے ایک عزیز شاگرد کو جو کشمیر میں تھے، لکھتے ہیں، ”ہمیں سے ایک انجمن کا سخت تقاضا آیا ہے، اخیر مارچ میں کوئی جلسہ ہے، کشمیر کا ارادہ تو کرتا ہوں اور کشش کے اسباب بھی ہیں، خصوصاً یہ کہ حکومت کے بڑے بڑے ارکان میرے دوست اور شاگرد ہیں لیکن مارگزیدہ از رہ سمان می ترسد ایک دفعہ اس قدر صدمہ اٹھا چکا ہوں کہ اب تک نہیں سنبھلا۔“ (عبدالباری-۳)

قصیدہ کشمیریہ | مولانا کا یہ سفر کشمیر، علالت کا یہ سلسلہ، مرض کا اشتداد، پھر علاج کا ایک اتفاقی سامان اور صحت مزاج مولانا کی زندگی کی بڑے اہم واقعے ہیں، گویا وہ مرکز پھر جی اٹھے صحت کے بعد مولانا نے ان واقعات کو ایک قصیدہ میں نظم کیا اور اس کا نام ”قصیدہ کشمیریہ“ رکھا اس کے شروع میں کشمیر کے باغ و بہار کی آرائش ہے، اس کے بعد اپنی بیماری کا حال ہے:

بخت بنگر کہ ازاں بزم گہ مستی و ناز
بہرہ ام ہرچہ بود درد غم ورنج و عناست
بعد یک ہفتہ کہ آسود تن از رنج سفر
تپ بہ من تا فتن آورد و بلنیم برخاست
چہ پتے بود کہ فرقی نہ توانستم کرد
کایں مگر آتش سوزندہ بود یا حنی ست
درد آں ما یہ بنفشرد و سراپاے مرا
کہ تو اں گفت کہ یک بہرہ زاندام کاست
اس کے بعد احباب کشمیر کی خدمت اور تیمارداری کا بیان ہے:

گرچہ با من نہ رفیقے بد و نے خاد کے
ایزدم لیک تباہی زدہ و خوار خواست
بہ عزیزان دیار آگہی آمد کہ فلاں
آمد از ہندوزرہ بخوری تپ شکوہ مراست
ہر یک از مہر و داں آمد و از غم خواری
پرس و جوے بہ سزا کرد پنے چارہ نجاست
رسم بیگانہ نوازی بود آئین عرب
می تو اں گفت کہ کشمیر عرب را ماناست
خاصہ آں پیشرو جادہ معنی یعنی
سجد دیں آنکہ پسین قافیہ بیت قضاست
خاصہ مخدوم من و یار من و یار من
میرزا سعد کہ در شہر امیر الامراست

۱۔ قاضی کے گھرانے کے تھے۔

انچہ با من ز سرخستہ نوازی کردہ است ہر بن موعے ہنوزم بہ پاسباش گویاست
اس زمانہ کے ایک خط میں جس وصیت کا ذکر ہے، اس کی تفصیل قصیدہ میں ہے:

چوں یقین شد کہ مرانوبت رفتن بہ رسید بہ وصیت درق و خامہ نمودم درخواست
شکر ایزد کہ دراں حالت آسیمہ سری از زباں ہر چہ برآمد ہمہ آں بد کہ سزا است
ہر چہ از سیم درم بود ز الماک قدیم وال کتب خانہ کہ انوار کتب را داراست
زاں ہمہ بیشترے وقف نمودم کو را صرف آں کارواں کرد کہ در شرع رواست
خاصہ بر مسجد پارینہ کہ در خانقہ است کہ ز بے مہری ماختہ و بے برگ و نواست
خاصہ آں مدرسہ کز پئے انبائے وطن طرحش انگندم و امروز بہ آئین و بہاست
اس کے بعد ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب کی اتفاقی آمد اور ان کے پر شفقت علاج کا تذکرہ ہے:

آخر کار ز لطف و کرم بار خدا مردے از غیب بروں آمد و کارم شدہ راست
مصطفیٰ خاں کہ اسٹنٹ سول سرجن ہست از رہ لطف بہ اعظم کدہ آمد ناخواست
داشت چوں سابقہ معرفتے باسحاق کہ ابن اصغر من ہست و بہر پایہ سزا است
از پئے دیدن من آمد و بر رسم فرنگ دید اعضائے دروں را کہ مرض را میداست
رو بہ من کرد و بہ فرمود کہ از غایت ضعف کار خودی نہ کند دل کہ رئیس الاعضا است
لیک بایں ہمہ از کار نہ رفتہ است ہنوز می کنم چارہ و از ایزدم امید شفاست
از سر مہر بہ تدبیر و علاجم پرداخت ہم بدائ شیبہ کہ طرز دروش اہل صفاست
تا دومہ رسم چینیں بود کہ ہر روز مرا امتحاں کردے و جسے خبر از ہر کم و کاست
بارے از فضل خداوند جہاں بعد سہ ماہ بہ شدم گر چہ ہنوزم اثر ضعف بجا است
اس کے بعد اپنے دوستوں کو اپنی صحت کی خود مبارک بادی ہے:

مژدہ صحت من ہاں برساند کنوں ہر کہے را کہ بہ من دعویٰ اخلاص و وفا است
می توان گفت بہ مہدیؑ و بہ حالی و عزیز ”بہ شد آں بندہ کہ از حلقہ بگوشان شناست“
شبلی امروز بود بلبل بستان سخن کہ از و گلگدہ ہند پر از صوت و نواست
بعد یک عمر کہ از بندغم آزاد شدہ است ہم چناں باز بہ آہنگ کہن نغمہ سراست

۱۔ مولانا کے وطن ہندول کے پاس خانقاہ نام کا چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ۲۔ نیشنل اسکول اعظم گڑھ جس کا ب نام ”شبلی جارج اسکول“ ہے۔ ۳۔ مہدی سے مراد نواب حسن الملک مولوی محمد علی خان اور عزیز سے مقصود خواجہ عزیز الدین لکھنوی ہیں۔

مولانا حالی کا قطعہ تہنیت | مولانا نے یہ قصیدہ چھپوا کر دوستوں کو تقسیم کیا، معلوم نہیں کہ مہدی و عزیز نے کیا جواب دیا، مگر مولانا حالی نے اس قصیدہ پر مختصر سا مبارک باد کا قطعہ لکھ کر بھیجا جس کو میں نے ان کے قلم سے لکھا ہوا بھی دیکھا تھا اور جوان کے ضمیمہ کلیات فارسی میں بھی چھپ گیا ہے:

نہد الحمد پس از ناخوشی و رنجِ دراز
شبلی ما بہ مراد از سرِ بالینِ برخواست
آنکہ نامش بہ کمالاتِ سمر در گیتی ست
آنکہ مشہور در آفاق بہ شمس العلماء ست

داستان

آنکہ گر سر کند افسانہ فضل و ہنرش
آنکہ خوانندش اگر فخر زمان خود و بس
بود در علت او علت قومی مضمہر
بسکہ او روح دمیدہ است بتاریخ سلف
زندہ تا دیر ہما ناد کہ بر قد کے
خامہ مشکل کہ بہ پایاں بردش بے کم و کاست
کردہ باشند عدول و اہل سخن از رہ راست
لا جرم صحت او بہر ہمہ قوم شفا ست
ہر قدر فخر بہ ذاتش بہ کند قوم رواست
بعد از و خلعت تحقیق نمی آید راست

ندوہ کی یاد نومبر و دسمبر ۱۸۹۹ء | اس دیرینہ بیماری سے صحیح ہوئے تو ندوہ کی یاد نے ستایا، گوئدہ ہی

سے ۲۸ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شرانی صاحب کو لکھ چکے تھے کہ اگر آپ یا اور ارکان (ندوہ) مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں تو بتائیں کہ میں کیا کام کروں، میری جو تجویزیں ہیں، وہاں چلنے نہ پائیں گی، البتہ یہ ہوگا کہ گروہ بندیاں اور نزا میں قائم ہوں، پھر لڑنے جھگڑنے سے کیا فائدہ؟ سوچ سمجھ کر جواب لکھیے اور مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوہ سے مشورہ کیجیے۔“ (۱۹)

پھر ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لکھا ”اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ندوہ کی خدمت کر سکوں تو دس پندرہ روز کے لیے لکھنؤ میں آکر قیام کیجیے، میں کارروائی اور طرز عمل کا نقشہ پیش کروں گا، اس پر رائے دیجیے اور ارکان بھی پورے غور و فکر کے ساتھ بحثیں کریں، پھر جو امر منقح قرار پائے، اس پر عمل کیا جائے اور اس کا خاکہ ڈالا جائے، اس وقت جس طرح کام ہو رہا ہے، اس میں شریک ہونا قومی گناہ سمجھتا ہوں اور لطف یہ کہ بڑے بڑے ارکان کے نزدیک وہی معراج خیال ہے، پھر میری کھپت وہاں کیوں کر ہو سکتی ہے، اتمام حجت کے لیے لکھنؤ جانے والا ہوں۔“ (۲۰)

گزشتہ جلسہ انتظامیہ میں جو غالباً اگست ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا، مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی زبان کے داخل کرنے کی تحریک کی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب عام مسلمانوں کا انگریزی پڑھنا

تو کفر نہیں رہا تھا، مگر علما کا انگریزی سیکھنا تو جرمِ عظیم سمجھا جاتا تھا، مولانا اس جرمِ عظیم کے مرتکب ہوئے، انہوں نے تحریک کی اور مولوی یونس خاں صاحب (رئیس و تاؤلی علی گڑھ) نے تائید کی مگر اس وقت علما کی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منظور نہ ہو سکی، تب مولانا نے یہ فرمایا کہ ”اچھا تو یہ تحریک درج رودادو کر لی جائے اب جو رودادو چھپ کر آئی تو اس تحریک کا ذکر تک نہ تھا (شروائی-۲۱) ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا میں اور مولانا شروائی میں اس مسئلہ پر تحریری گفتگو تک نوبت پہنچی اور لکھا کہ ”مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہے۔“ (شروائی-۲۲) تفصیل آگے آئے گی۔

سفرِ ایران کا قصد دسمبر ۱۸۹۹ء | صحت کے بعد تفریحِ خاطر کے لیے کسی بیرونی ملک کی سیر و سیاحت کا خیال پھر آیا، اٹلی کا موقع نکل چکا تھا، ایران کا خیال آیا، ان دنوں مولوی حمید الدین صاحب مدرسۃ الاسلام کراچی میں تھے، ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو انہیں لکھا کہ ”بو شہر اور بصرہ جانے والے جہازات کو تھے دن بھایا کرتے ہیں، سکنڈ کلاس کا کرایہ نو شہر یا بندر عباس تک کیا ہے، قرظینہ کہاں کہاں ہوتا ہے“ (حمید-۱۱) جواب کیا آیا معلوم نہیں، مگر سفر نہ ہو سکا اور ہندوستان سے باہر نہ جاسکے بلکہ اپنے وطن ہی میں رہنے پر مجبور ہوئے۔

شبلی منزل میں ۱۹۰۰ء | یہ سال انہوں نے زیادہ تر اپنے وطنِ اعظم گڑھ اور اپنے بنگلہ شبلی منزل میں بسر کیا، بعض خانگی ضرورتوں نے بھی ان کو اس قیام پر مجبور کیا، پانچ برس ہوئے کہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، اب تک دوسرا نکاح نہیں کیا تھا اور نہ ارادہ تھا، مگر ان کے معالج ڈاکٹر مصطفیٰ خاں نے دوسرے نکاح کا مشورہ دیا اور یہ مشورہ قبول ہوا اور مولوی محمد سمیع صاحب کی ماموں زاد بہن سے نسبت ٹھہری، عقد ثانی کا یہ ارادہ مولانا کے اکلوتے صاحب زادہ حامد حسن صاحب کو ناگوار گزرا اور وہ چپکے سے لاپتہ ہو گئے اور درج بھنگے پہنچ کر باپ کو خط لکھ دیا کہ ”اب آپ ہم سے مایوس ہو جائیے“ باپ کو اپنے اس یوسف کے گم ہو جانے کا بڑا صدمہ ہوا، دو روز تک کھانا پینا چھوڑ دیا اور روتے رہے، یہاں تک کہ نکاح کی تاریخ گزر گئی، بیٹی والوں نے اس کو برا مانا، مگر مولانا نے اس کی پروا نہ کی، ایک صاحب کے نام ایک خط مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۰۰ء میں جو درج مکاتب نہیں، یہ پوری کیفیت خود اپنے قلم سے لکھی ہے ”حامد کے مفروضہ ہونے کا قصہ تم نے پہلے سنا ہوگا، ۱۱ اپریل کو میرے پاس ان کا خط آیا کہ ”مجھ کو اب بھول جائیے“ اس خط سے اس قدر پریشانی ہوئی کہ میں بالکل بدحواس ہو گیا، چار وقت تک کھانا نہ کھایا گیا اور ہر وقت رویا کرتا تھا۔

۱۔ یہ وہی ہیں جن کے نام کے اکثر خطوط آپ پڑھتے آئے ہیں-۱۲۔

اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آئی، لوگوں کو اصرار تھا کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہیے لیکن مجھ کو دل پر قابو نہ تھا، نہ جاسکا ادھر مہمان وغیرہ آچکے تھے اور اس وجہ سے ان لوگوں کی بہت سبکی ہوئی، وہاں سے سمیع آئے کہ اعظم گڑھ ہی میں نکاح ہو جائے میں اس پر بھی راضی نہ ہوا، البتہ زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا۔

میاں حامد چند روز درجہ نگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چل دیے اور بالکل پتہ نہیں اور غالباً مہینوں پتہ نہ لگے۔“

بہر حال حامد صاحب درجہ نگہ سے قصبہ بہار شریف پہنچے، وہاں حضرت مخدوم شیخ شرف الدین محلی میری کا جن کی مکتوبات مشہور ہے، مزار اور خانقاہ ہے، اس خانقاہ کے اس وقت سجادہ نشین شاہ امین احمد صاحب ایک مشہور بزرگ تھے، علاوہ فقر و تصوف کے وہ فارسی زبان کے بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے، حامد صاحب ان کے جا کر مرید ہوئے اور گہروا کپڑا پہن کر ترک دنیا کیا، ایک آدھ مہینہ تک تو فقرو فائدہ سے زندگی بسر کی، پھر جی نہ مانا تو شاہ صاحب سے والد ماجد کا نام لیا، وہ سن کر بہت مہربان ہوئے اور مولانا کو خط لکھ کر مطلع کیا اور ساتھ ہی اپنی بعض فارسی مثنویاں مولانا کی خدمت میں بھیجیں، جن میں سے ایک مثنوی کا ذکر مولانا مجھ سے فرماتے تھے، جو بہاء الدین املی کی مثنوی ”نان و حلوا“ کے جواب میں لکھی تھی، شاید اس کا نام ”شہد و شیر“ ہے۔

بیٹے کی اطلاع پا کر مولانا نے ایک دو معتبر آدمیوں کو بھیجا اور شاہ صاحب نے حامد صاحب کو سمجھا بھجا کر ان کے ساتھ کر دیا، وہ اس وقت جس حلیہ میں آئے، اس کا ذکر مولانا نے ایک خط میں کیا ہے جو ۵/ مئی ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کے نام لکھا ہے، ”شفیع ماسٹر اس کو جا کر لے آئے لیکن جس لباس میں اس کو دیکھا وہ گہروا کرتے اور گہروا تہمتھا، اس نے فقرا اختیار کیا اور صرف اس وجہ سے یہاں آنے پر راضی ہوا کہ اس کے پیر نے اطاعت والدین پر اس کو مجبور کیا، وہ پھر جانے کے لیے مصر ہے اور کسی طرح نہیں ٹھہرتا، فقر عمرہ چیز ہے لیکن وہ جو گیانہ قالب میں جانا چاہتا ہے اور اس میں کوئی ریا کاری نہیں، صرف دماغ کی خرابی کا قصور ہے اور اصل چیز میری قسمت!“

بہر حال حامد صاحب پھر واپس نہیں گئے، یہیں رہے، مولانا نے جون ۱۹۰۰ء میں نکاح بھی کر لیا، شبلی منزل والے بنگلہ میں ایک زمانہ حصہ بھی اٹھالیا، تاکہ رخصتی کے بعد وہ یہاں رہ سکیں۔

درس | ان دنوں اعظم گڑھ میں رہ کر بعض شائق عزیزوں کو ادب کی بعض کتابوں کے سبق شروع کرائے، ہمارے دوست مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل نے جو بعد کو علی گڑھ سے ایم، اے، ایل، ایل، بی، ہوئے اور اب ماشاء اللہ ہمارے صوبہ کے ایم ایل اے ہیں اور فارسی اور اردو کے ممتاز شاعر اور کامیاب وکیل ہیں، یہیں اسی زمانہ میں ان سے حماسہ وغیرہ کے اسباق پڑھے اور ان کی صحبت میں رہ کر فارسی شاعری کا مذاق پیدا کیا۔

الغزالی کا خاکہ | مولانا اب تاریخ کے دیکھے بھالے کوچہ سے ہٹ کر فن کلام کی طرف متوجہ تھے اور غالباً انہوں نے اسی زمانہ میں یہیں بیٹھ کر علم کلام کا ایک خاکہ تیار کیا، جس کا ہیولی جولائی ۱۸۹۹ء سے ان کے ذہن میں تیار ہو رہا تھا، (شروانی-۱۳، ۱۴) اور علم کلام کے سلسلہ میں بھی غالباً امام غزالی کی لائف پیش نظر تھی، جس کی تحریک ۱۸۹۳ء میں سرسید نے کی تھی، اب بارگاہ فاروقی کے جلوؤں سے فرصت پا کر امام غزالی کا دربار سجانے کی فکر لاحق ہوئی، ۸ جون ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کو لکھتے ہیں ”لوئی کی ہسٹری آف فلاسفی میں لکھا ہے کہ اگر احواء العلوم کا ترجمہ فرینچ میں ہو چکا ہوتا تو ضرور یہ گمان کیا جاتا کہ ویکارٹ کا فلسفہ اخلاق غزالی سے ماخوذ ہے“ اور دوسری کسی کتاب میں (اس کا ذکر تم نے کیا تھا) ہے کہ کتاب مذکور کا ترجمہ فرینچ میں ہو گیا تھا“ ان دونوں عبارتوں کا ترجمہ لفظ بہ لفظ صحیح دو، بہت ضرورت ہے۔“

ندوہ کے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں عدم شرکت | ندوہ کا چھٹا اجلاس ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق مارچ ۱۸۹۹ء میں شاہ جہاں پور میں اور ساتواں اجلاس رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں پٹنہ میں ہوا، ان دونوں اجلاسوں میں مولانا شریک نہ تھے، کیوں کہ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، یہ ان کی زندگی کے نہایت سخت سال گزرے، ۱۸۹۹ء میں وہ اکثر بیمار اور ۱۹۰۰ء میں وہ اپنے خانگی معاملات میں نہایت سرگرداں و پریشان رہے۔

پھر افغان دارالترجمہ جولائی ۱۹۰۰ء | امیر کاہل فارسی کتابوں کے لیے جو دارالترجمہ ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ سفیر صاحب کاہل نے پیش قرار معاوضہ پر بعض کتابوں کے ترجمہ کے لیے مولانا کو لکھا اور مولانا نے انکار کیا، اس کے بعد کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بعض اعزاء و احباب نے یہ دیکھ کر کہ اس بے کاری سے بہتر یہ ہے کہ اس بے کاری کو قبول کر لیا جائے اور مولوی حمید الدین کو جو عربی و انگریزی دونوں کے ماہر تھے، اس کام میں لگایا جائے، اس بنا پر مولانا

نے سفیر صاحب کو پھر اپنی رضا مندی لکھ بھیجی، سفیر صاحب نے یہ معلوم کر کے کل ترجمہ اور اس کا سارا اہتمام مولانا کے سپرد کر دیا اور اس کے لیے سر دست دس ہزار کی رقم منظور کی۔

اسی کے ساتھ امیر کابل نے یہ چاہا کہ کلکتہ میں وہ انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا محکمہ قائم کریں جس میں چار انگریزی اور سولہ ہندوستانی ملازم ہوں اور اس محکمہ کے سکریٹری مولانا ہوں، مگر انہوں نے اس سے انکار کیا اور معاملہ انجام نہ پایا۔ (حمید-۱۳)

نیشنل اسکول | ان دنوں نیشنل اسکول کے اہتمام و انتظام کے لیے فکر و پریشانی کا سلسلہ جاری ہے۔ **علی گڑھ کی مجلس دینیات اور ندوہ** | علی گڑھ کالج میں دینیات کی ایک کمیٹی بنی تھی، جس کے ناظم مولانا شروانی قرار دیے گئے تھے، اس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوئے، ۲۶ محرم ۱۳۲۰ھ کو اس کی یادداشت پر رائے ظاہر فرمائی اور مولانا شروانی کو لکھا کہ اس کے نصاب میں حدیث کا انتخاب قطعاً شامل ہونا چاہیے، (شروانی-۲۳، ۱۸) جولائی ۱۹۰۰ء میں ندوہ کا جلسہ انتظامیہ درپیش ہونے پر اس کی نسبت شروانی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ (شروانی-۲۳)

ندوہ کی طرف سے حکومت کی سیاسی بدگمانی کا زمانہ ۱۹۰۰ء و ۱۹۰۱ء | مولانا اعظم گڑھ میں ان دنوں اپنے خانگی حالات میں ایسے مصروف رہے کہ ان کے مخلص دوستوں کو بھی ان کی اطلاع نہیں رہی، یہ وہ زمانہ تھا کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر مگڈلنڈ صاحب تھے، ان کی نظر مسلمانوں کی طرف کچھ یوں ہی تیز تھی، اس پر یہ ندوہ کی تحریک کے اوج کا زمانہ تھا، ہماری بد قسمتی اکثر ذاتیات سے شروع ہوتی ہے، لکھنؤ میں ندوہ کے بڑے حامی منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم کا کوروی تھے، جو وہاں کے مشہور و ممتاز وکیل اور انجمن تعلقہ داران اودھ کے مشیر قانونی تھے اور ان کے حریف چودھری نصرت علی صاحب سندیلہ تھے، چودھری صاحب نے منشی صاحب کو شکست دینے کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور جیسا کہ سنا جاتا ہے انہوں نے لفٹنٹ گورنر تک ندوہ کی تحریک کی سیاسی بدگمانیوں کی شکایتیں پہنچائیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ برطانی ہندوستان کو چھوڑ دیا، منشی اطہر علی صاحب مرحوم حیدرآباد چلے گئے، ندوہ کے ناظم اور روح رواں مولانا سید محمد علی صاحب بھی ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۸ھ میں حجاز تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی قائم مقام ناظم ہوئے، مگر انہوں نے قیام دہلی ہی میں رکھا، پھر بعد کو وہ بھی ایک ہی سال کے اندر مستعفی ہو گئے۔

مولانا شبلی مرحوم کی حالت سے بے خبری کے سبب سے ان کے دوستوں کو ان کے متعلق بھی تشویش تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۶ جولائی ۱۹۰۰ء کو مولانا شروانی کو خط لکھا ”مدت سے شمس العلماء مولانا شبلی کا حال معلوم نہیں، ندوۃ العلماء کی نسبت عجیب عجیب افواہیں سنی جاتی ہیں، مگر معتبر ذریعہ سے کوئی بات آج تک نہیں سنی گئی، نواب لفتنٹ گورنر کے دل میں اس کی طرف سے شکوک کا پیدا ہونا معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے؟“

مولانا کا معاملہ گواس بدگمانی سے بہت آگے نکل چکا تھا، تاہم وہ اس وقت وطن میں یا علیل تھے، یا خانگی افکار میں مبتلا۔

والد کی علالت اور خانگی پریشانی ۱۲ نومبر ۱۹۰۰ء | صحت کے بعد اب وقت آیا تھا کہ مولانا آرام کریں یا سیر و تفریح کے لیے کہیں باہر تشریف لے جائیں، مگر قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا، اسی اثنا میں ان کے والد ماجد ایک سخت علالت میں مبتلا ہوئے جو آخر کو مرض الموت ہی ثابت ہوا، نومبر میں ان کی حالت بہت خراب ہوئی، ۱۰ نومبر ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں ”استقلال و متانت کی حد ہوگئی، والد کی حالت نیم و امید کی ہو چکی ہے، بلکہ نیم کا پہلو غالب ہے، تمام اطراف کے آدمی روزانہ ان کو دیکھنے آتے ہیں، مستورات سب آئیں، خود والد ہر وقت تم کو پوچھا کرتے ہیں۔“ (۱۶)

مولانا برابر ان کی تیمارداری و دوا و علاج میں مصروف رہے، مگر حکمہ تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا، ۱۲ نومبر ۱۹۰۰ء کو انہوں نے وفات پائی، خاندان بلکہ تمام شہر میں کھرام مچ گیا، حکام تک متاثر ہوئے، عدالتیں بند ہو گئیں، پورے ضلع نے ان کے وجود سے محرومی کا غم کیا، یہ صرف ایک کامیاب وکیل کی موت نہ تھی بلکہ ایک فیاض، ہر دل عزیز اور قوم کے ایک ممتاز و نام و رز بر دست فردِ نرید کی موت تھی، بیٹے پر اس حادثہ کا جو اثر پڑا وہ مرثیہ سے ظاہر ہے:

ہاں اے پدر نہ گویمت این درزواں مکن	زنہار عزمِ رہرو آں جہاں مکن
دستاں سرائے بزمِ طرب بودہ ام بہ دہر	مارا بہ نوحہ، زمزمہٴ سنجِ فغاں مکن
کوہِ غمِ فراق تو اغم کہ بر کشم	با چوں منے شکستہ وزاریں گماں مکن
پیرانہ روئے روشن تو آفتاب بود	ایں آفتاب از نظر ما نہاں مکن
رفتی و حالِ قوم نہ دانی کہ چوں شدہ است	دلہا تمام از غم و از غصہ خوں شدہ است

ایوانِ قوم کز تو سرش چرخ سود بود
در جنبش است و ننگر ہائش نگوں شدہ است
آں قوم کز تو پایہ جاہش بلند بود
زار و زند و حسہٴ خوار و زبوں شدہ است
آں صفہائے دفتر اقبال پارہ گشت
آں کاسہ ہائے خوانِ نعم و اثر گوں شدہ است
در شہر کیست کز غم تودیدہ تر نہ کرد
یکدل نبودہ است کہ صد نالہ سر نہ کرد
دانستہ پاس خاطر ایشان نہ داشتی
یا کس ترا ز حالِ عزیزاں خبر نہ کرد
آخری ہند میں موت کے وقت کا عجیب دلدوز پرائر نقشہ کھینچا ہے:

آہ آں زماں کہ درد تنش زانزار کرد
آہار مرگ بر رخ و نبض آشکارا کرد
عم بزرگ وار کہ آسیمہ سرد دید
حالش بدید و گریہ بے اختیار کرد
شبلی رسید و نالہ زد و بسمل افتاد
اسحاق آمد و مژہ را اشکبار کرد
مستور خانہ آمد و از سینہ برکشید
آں تیر آہ کز دل گردوں گزارا کرد

غم زدہ بیٹے نے مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم مددگار ناظم ندوہ کو اس زمانہ میں اپنے والد کی وفات کی خبر ایک کارڈ پر لکھ دی تھی، اتفاق سے ندوہ کے دفتر کے بے کار کاغذات میں وہ کارڈ مجھے مل گیا تھا، ایک ہی سطر تھی، ”دریغاً کہ یتیم گشتم“۔

اس اختصار کی بلاغت پر طولی بیان کی ہزاروں سطریں قربان!

خانگی مصائب دسمبر ۱۹۰۶ء | شیخ صاحب کی موت ایک تنہا مصیبت نہ تھی، بلکہ بہت سی مصیبتوں کا مجموعہ تھی، وہ ایک ہرے بھرے، سرسبز و شاداب خاندان کے سرپرست تھے، ان کی سرپرستی کی محرومی سے سارے خاندان پر زوال آیا، شیخ صاحب نے پہلی بیوی (مولانا اوران کے بھائیوں کی والدہ) کے علاوہ غیر کفو میں جو شادی کی تھی، اپنی زندگی ہی میں ۱۸۹۲ء میں اپنی جائیداد کا ایک حصہ اُس بیوی کے نام ہبہ کر دیا تھا، جس سے مولانا اوران کے بھائیوں کو سخت اختلاف تھا، اس کی تفصیل مکاتیب کے ایک خط (اسحاق-۳) میں مذکور ہے، شیخ صاحب نے اپنی چھ سات ہزار کی آمدنی کی جائیداد کے ساتھ تیس ہزار کا قرض چھوڑا، قرض کے سوا شیخ صاحب کا بڑا کارخانہ پھیلا تھا، جس کو قائم رکھنے کے لیے ماہانہ آمدنی کی ضرورت تھی، سو تیلی ماں اوران کے طرف داروں سے الگ جھگڑے کی صورت تھی۔

۱۔ شروانی-۲۷، جمید-۲۰ میں غلطی سے تیس ہزار چھپا ہے، تیس ہزار چاہیے۔

باپ کی زندگی بھر مولانا اپنی سوتیلی ماں سے ملنا کیا معنی ان کے نام سے بیزار تھے، ان کا ذکر سننا نہیں چاہتے تھے، مگر باپ کی وفات کے بعد یہ انقلاب ہوا کہ وہ خود چھانڈونی میں جہاں وہ رہتی تھیں، تشریف لے گئے، ماں کے قدموں پر گرے، عمر بھر کی معافی مانگی اور ایسی سعادت مندی دکھائی کہ اپنے بیٹے سے بھی ممکن نہیں، یہ بھی مولانا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔

بہر حال مولانا چوں کہ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، اس لیے تمام مشکلات کا بار ان ہی کے سر پڑا، قرض خواہوں اور مہاجنوں نے ہر طرف سے آکر ان کو گھیرا، مقدمات شروع ہوئے اور مقدمات کی پیروی چھڑی، اسی حالت میں مولانا نے فرمایا ”کاش والد ایک جذبہ نہ چھوڑتے، مگر یہ قرض تو نہ چھوڑ جاتے“ بہر حال یہ وہ صورت حال تھی، جو ان کے بالکل برخلاف تھی اور ان کی پریشان دلی اور پراگندہ خاطر کی لیے بالکل کافی تھی، مگر اس ذمہ داری کو بھی جس سے عمر بھر ان کو لگاؤ نہیں رہا، پوری طرح اٹھایا، ۱۵ دسمبر ۱۹۰۰ء کو بھائی کو الہ آباد جہاں وہ وکالت کر رہے تھے، لکھا ”دیوارہ میں اگر تقسیم کا انتظار کرو گے تو اس سال کی تحصیل بھی غارت جائے گی، میری دانست میں مناسب ہے کہ ابھی سے اپنا خاص کارندہ مقرر کرو، جو اس سال کے اپنے حصہ کی تحصیل کرے اور اسامی بٹ کے طور پر کاغذات بھی درست کرتا رہے، باقی علاقہ جات، گاؤں پٹی، جگدیش پور، ڈرکی، بلریا وغیرہ ٹھیکہ دے دینا چاہیے، مصارف سیر^۳، مشاہرہ ملازمان، خرچ مقدمات، خرچ ڈیوڑھی، بندول کا ایک موازنہ (بجٹ) بنا کر مجھے بھیج دو تا کہ ماہ بہ ماہ اس کے مہیا کرنے کا بندوبست کر سکوں۔ (اسحاق-۱۷)

اس کے بعد ۲۰ دسمبر کے خط (۱۸) میں اسحاق مرحوم کو زمین دار کے کاغذات، مقدمات مصارف اور تمام دشواریوں کو ذکر کر کے بلایا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں ”افکار کا ایک گھنگھور بادل چھایا ہے، دیکھیے کیوں کر چھٹتا ہے۔“

لیکن یہ گھنگھور بادل مولانا کے حسن نیت کی برکت سے چھٹ گیا، مولانا نے مظفر کو جو مرحوم و محبوب تھا، اپنی جائیداد میں شریک کر لیا اور اس کا نام بھی وراثت کی رضا مندی سے حصہ داروں میں داخل ۱۔ اظہم گڑھ میں زمین داری کے عملہ کے مکان کو جس کو ہماری طرف زمین داری چھری کہتے ہیں، چھانڈونی کہتے ہیں، اظہم گڑھ محلہ پہاڑ پور میں شیخ صاحب کا ایک بڑا مکان تھا، جس کو اس لیے چھانڈونی کہتے تھے، شیخ صاحب کی دوسری بیوی اسی مکان میں رہتی تھیں، اسی لیے وہ چھانڈونی والی کہلاتی تھیں، مکاتیب (الحق-۳) وغیرہ میں ان کو ارباب چھانڈونی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ۲۔ گھاگھرا کے کنارے مواضع کا ایک سلسلہ ہے۔ ۳۔ جو کاشت خود کی جائے۔

کرادیا، بچہ کی دادی یعنی مولانا کی سوتیلی ماں نے مولانا کا یہ برتاؤ دیکھ کر یہ کیا کہ جو جانداد شیخ صاحب ان کو بہہ کر گئے تھے، واپس کر دی، یہ واپس شدہ جانداد قرض خواہوں کو دے دی گئی اور قرض کے بڑے حصہ کے بوجھ سے وہ ہلکیو گئے، باقی قرض کی ادائیگی کی فکر بھی ان کو دامن گیر ہوئی، ان ہی دنوں مسٹر آرنلڈ نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، ان کو لاہور میں ایک خدمت پر بلوایا، جو غالباً اورینٹل کالج لاہور میں عربی یا فارسی کی پروفیسر کی ہوگی، مگر انہوں نے وہاں جانے سے انکار کیا اور اعظم گڑھ ہی میں رہے، مگر قرض خواہوں اور مقدمات سے چپراسیوں کی آمد و رفت سے پریشان خاطر تھے، آخر فروری ۱۹۰۱ء کی کسی تاریخ کو ایک دن جیسا کہ مولانا خود فرماتے تھے، شہر سے نکل گئے، پہلے تو یوں ہی غازی پور کا ٹکٹ لیا، وہاں سے دفعۃً علی گڑھ چل کھڑے ہوئے، علی گڑھ میں نواب محسن الملک نے حیدرآباد کا مشورہ دیا اور وہ حیدرآباد روانہ ہو گئے، ممکن ہے کہ اس سفر کی عجلت اور حیدرآباد کے انتخاب کے مشورہ میں بعض سیاسی اسباب سے جن کا اشارہ اوپر گذر چکا، برطانی ہند سے دور ہو جانے کی مصلحت بھی شامل ہو۔

حیدرآباد میں قیام، فروری ۱۹۰۱ء فروری ۱۹۰۵ء | مولانا نے فروری ۱۹۰۱ء کے آخر میں حیدرآباد کا رخ کیا، راستہ میں بھوپال پڑا، ان کا جی چاہا کہ نواب سید علی حسن خاں کی ملاقات کے لیے وہاں ایک دو دن ٹھہر جائیں، مگر چونکہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ بھوپال بیمار تھیں، اس لیے وہ بھوپال نہیں ٹھہرے اور سیدھے حیدرآباد چلے آئے۔

مولانا حیدرآباد پہنچ کر مولوی عزیز مرزا مرحوم کے جو اس وقت ہوم سکرٹری تھے، مہمان ہوئے، دوسرے روز جب مولوی سید علی بلگرامی کو اس کی اطلاع ملی تو وہ جا کر خود ان کو اپنے گھر لے آئے، لوگوں کو خبر ہوئی تو ہر طرف سے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا، مارچ میں مولانا کی تقریر کے لیے ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع ہوا، وزیر عدالت جلسہ کے صدر تھے، مولانا نے علم کلام پر ایک مبسوط محققانہ تقریر فرمائی، یہ تقریر گوزبانی تھی، مگر مولانا کی تقریر بھی مقالہ کی شان رکھتی تھی، ایک صاحب اس تقریر کو قلم بند کرتے گئے اور جتنا حصہ قلم بند ہو گیا، اس کی اشاعت کا خیال ہوا۔

امور مذہبی کی نیابت | نواب مدار الہمام بہادر یعنی وزیر اعظم نے نہایت احترام سے مولانا کو شرفِ لے لے کتابت حالی، جلد اول، ص ۴۱ | علی حسن خاں، ص ۲۱۳ | سیرۃ المصنفین، ص ۲۶۳ | ص ۴۷ | علی حسن خاں، ص ۴۔

نیاز بخشا اور ان کو حیدرآباد کے قیام کی ترغیب دی، حیدرآباد میں امور مذہبی کا محکمہ حکومت کا بہت بڑا صیغہ ہے، جس کا بجٹ کئی لاکھ کا ہوتا ہے اور جس کے ماتحت ریاست کے تمام مذہبی ادارے، مساجد، منار، آتش کدے، گرجے، گردوارے وغیرہ املئہ مذہبی اور اوقاف ہیں، نواب مدارالمہام نے اپریل ۱۹۰۱ء میں اس صیغہ کی خدمت مولانا کو سپرد کرنی چاہی لیکن مولانا نے اس کو منظور نہیں فرمایا۔

مولانا نے اپنے خطوط میں اس بات کی تصریح نہیں کی ہے کہ امور مذہبی کا کون سا عہدہ ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا لیکن مولانا حالی نے اپنے ایک خط میں (مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے حوالہ سے جو ان دنوں حیدرآباد میں تھے، مولوی عبدالحق صاحب (موجودہ سکریٹری انجمن ترقی اردو) کو حیدرآباد یہ لکھا ہے: ”شش العلم مولانا شبلی نعمانی کا تقرر مدگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر عزیز سی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا خوشی ہوئی، اگر آپ ان سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہہ دیجیے کہ اگر چہ آپ کے علم و لیاقت کے مقابلہ میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا، مگر بہر حال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے، میرے نزدیک بہت بہتر ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملے گا اور قوم کو آپ زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے۔“

مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مولانا نے اس عہدہ کو قبول نہیں فرمایا، شاید اس کی ایک وجہ تنخواہ کی کمی ہو، اس عہدہ کی تنخواہ چار سو روپے مولانا کو دی جانے والی تھی، ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی اسحاق کو لکھتے ہیں ”مجھ کو جو کچھ (جو عہدہ) دیتے ہیں اس میں اس وقت مجھ کو ۳۲۵ روپے ملیں گے، لیکن میں نے اس سے انکار کیا چونکہ نواب مدارالمہام اس سے زیادہ کے مجاز نہیں ہیں، اس لیے حضور میں بڑے زور کے ساتھ تحریری سفارش بھیجی ہے، اس کا جواب نہیں آیا اور بہت کم توقع ہے کہ آئے، حضور اور مدارالمہام کی ناچاقی بڑھتی جاتی ہے۔“

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ”بڑی کام یابی ہوتی لیکن بد قسمتی سے وزیر اعظم اور حضور کے تعلقات کشیدہ ہیں اور وزیر اعظم کے اختیارات حسب قانون حضور نے گھٹا دیے ہیں اور اس وجہ سے ہر کام میں حضور سے اجازت لیننی پڑتی ہے، یہ صرف چند روز سے ہوا ہے۔“

بات یہ ہے کہ حیدرآباد کے سیاسی حالات اس وقت سخت نازک تھے، حضور نظام میر محبوب علی خاں

اور مدارالہمام سر وقتار الامرا کے درمیان سخت چپقلش تھی، مولوی عزیز مرزا مرحوم اور مولوی سید علی بلگرامی مرحوم دونوں کے وہی مربی اور سرپرست تھے اور ان ہی دونوں کے ذریعہ سے مولانا حیدرآباد میں توسل کے خواست گار تھے، اسی زمانہ میں سید علی حسن (نواب محسن الملک کے بھائی) کو جو نواب مدارالہمام بہادر کے سب سے بڑے رکن تھے، حضور نے دفعۃً موقوف کر دیا، ان کے ساتھ ایک انگریز کو بھی مولانا لکھتے ہیں ”حیدرآباد میں اس وقت زلزلہ آ گیا ہے، تمام لوگ کانپ اٹھے ہیں، خصوصاً ہندوستانی خاص طور پر مسرور و عتاب ہیں۔“ (اسحاق-۱۹)

دماغی کشمکش | ان حالات میں مولانا ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھے، کبھی یہ چاہتے تھے کہ یہاں کی نوکری قبول کر لیں اور کبھی نوکری کی قید و بند کو سونپتے تو قناعت کی زندگی کا خیال آتا، اس حال میں ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی اسحاق مرحوم کو اپنا ارادہ بتاتے ہیں ”اب میرا ارادہ سنو:

”میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روڈ پنے ہیں، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا اس سے غریبانہ زندگی خاص طرح بسر ہو سکتی ہے لکھنؤ یا علی گڑھ میں بستر ہوگا اور ندوہ یا کالج کا مشغلہ تنہائی اور بے تعلق میں انشاء اللہ قوم کی خدمت اچھی طرح بن آئے گی، کالج تو میری مدد کا محتاج نہیں لیکن ندوہ کام کرنے کی جگہ ہے اور بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔“

پھر ۱۲ اپریل ۱۹۰۱ء کو سمیع مرحوم کو لکھتے ہیں ”بہر حال دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے، بے شبہ اگر ملازمت کر سکتا اور کسی قدر دنیا داری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے لیکن میاں سمیع عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا، چند برسوں کے لیے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی، بلند ہی رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا ورنہ میں اپنے گوشہ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔“

۱۷ جون ۱۹۰۱ء کو ان ہی کو پھر لکھتے ہیں ”میں یہاں آ کر ایسا پھنس گیا کہ ع نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے، ہمت کہتی ہے ع بے تامل آستیں افشاندن از دنیا خوش است،
 ۱ حیدرآباد والا وظیفہ ۲ چھاؤنی سے تصدو سو تلی ماں ہیں، اور عالیہ مہدی مرحوم کی بیوہ کا نام ہے اور اسکول سے نیشنل اسکول تصدو ہے، مولانا ان سب کو کچھ ماہ وار دیا کرتے تھے، یہ اسی کا حساب بتا رہے ہیں۔ ۳ حیدرآباد کی مشہور شاہی عمارت۔

مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں، ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔

سلسلہ آصفیہ اور سررشتہ علوم و فنون | الفاروق کے پڑھنے والوں کو سلسلہ آصفیہ کی تھوڑی سی تاریخ معلوم ہے، مولانا شبلی مرحوم الفاروق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، ہمارے معزز اور محترم دوست شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی ^{مجموع} القابہ کو تمام ہندوستان جانتا ہے، وہ جس طرح بہت بڑے مصنف، بہت بڑے مترجم، بہت بڑے زبان داں ہیں، اسی طرح بہت بڑے علم دوست اور اشاعت علم و فن کے بہت بڑے مربی اور سرپرست ہیں، اس دوسرے وصف نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے جناب نواب محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک سروقار الامرا بہادر مدار الہمام دولت آصفیہ خلد باللہ تعالیٰ کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ حضور پر نور مظفر الہما لک فتح جنگ ہر ہائس نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک (آصف جاہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے سایہ عاطفت میں علمی تراجم و تصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا جائے جو سلسلہ آصفیہ کے لقب سے ملقب ہو اور وابستگی دولت آصفیہ کی جو تصنیفات خلعت قبول پائیں، وہ اس سلسلہ میں داخل کی جائیں۔

جناب نواب صاحب ممدوح کو علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کی طرف ابتداء سے جو التفات و توجہ رہی ہے اور جس کی بہت سی محسوس یادگاریں اس وقت موجود ہیں، اس کے لحاظ سے جناب ممدوح نے اس درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کیا، چنانچہ کئی برس سے یہ مبارک سلسلہ قائم ہے اور ہمارے شمس العلماء کی کتاب ”تمدن عرب“ جس کی شہرت عالم گیر ہو چکی ہے، اس ملک کا ایک بیش بہا گوہر ہے، خاک سار کو ۱۸۹۶ء میں جناب ممدوح کی پیش گاہ سے عطیہ ماہ وار کی جو سند عطا ہوئی اس میں بھی یہ درج تھا کہ خاک سار کی تمام آئندہ تصنیفات اس سلسلہ میں داخل کی جائیں۔“

مولوی عبدالحق صاحب مولوی سید علی بلگرامی کے حال میں لکھتے ہیں ”مرحوم مولوی سید علی بلگرامی نے نواب سروقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدر داں امیر تھے، ایک سررشتہ علوم و فنون قائم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے، (سید علی) مرحوم اس سررشتہ کے نگران مقرر ہوئے اور ان کی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لیے کوئی

لائق شخص انہیں نہ ملا تھا، لہذا انہوں نے شمس العلماء مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمتِ ناظم سررشتہ علوم و فنون پر بہ مشاہرہ چار سو ہوا اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا، مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں۔ (چند ہم عصر از مولوی عبدالحق صاحب ص ۷۲)

اس متن کی شرح نواب جیون یار جنگ بہادر کے اس مقدمہ میں ہے جو انہوں نے تمدنِ عرب کے دوسرے اڈیشن پر ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے ”سروکار الامرا بہادر کے عہد وزارت میں ڈاکٹر سید علی کی سعی و کوشش سے حکومت نے سررشتہ علوم و فنون کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا، مقصد اس کا یہ تھا کہ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ اردو میں علمی کتابیں مہیا کی جائیں اور ان کو خاص اہتمام کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا جائے، اس سررشتہ کے نگران کار ڈاکٹر سید علی مقرر ہوئے، نظامت کے لیے مولانا محمد مرتضیٰ فلسفی کا انتخاب ہوا، چار سال کے بعد ۱۹۰۱ء میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کو یہ خدمت ملی، یہ سررشتہ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۳ء تک قریباً دس سال قائم رہا۔“

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مولوی سید علی بلگرامی کی تحریک سے ۱۸۹۴ء میں حیدرآباد میں سررشتہ علوم و فنون کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کے سب سے پہلے ناظم مولانا محمد مرتضیٰ صاحب مقرر ہوئے تھے جو اپنے کو فلسفی کہتے تھے اور معقولات کا بڑا دعویٰ رکھتے تھے، ان کا اصل وطن نونہرہ ضلع غازی پور تھا، مولانا کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد وہ اس عہدہ سے ہٹا کر مال کے صیغہ میں بھیج دیے گئے اور یہ جگہ خالی ہو گئی۔

سررشتہ علوم و فنون کی نظامت | بہر حال جب مولانا نے امور مذہبی کی خدمت سے انکار کیا تو

۳ صفر ۱۳۱۹ھ (۲۲ مئی ۱۹۰۱ء) کو سررشتہ علوم و فنون کی اسی خالی شدہ نظامت کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا،

۱۔ اس عرصہ میں حسب ذیل کتابیں اس کی طرف سے شائع ہوئیں، ان میں سے پہلی پانچ کتابوں کی ڈاکٹر سید علی نے نگرانی کی،

- | | | | |
|---|-------|-----------------------------------|-------|
| ۱- سیاحت نامہ موسیو میوریز، مطبوعہ آگرہ | ۱۸۹۶ء | ۶- انفرانی، شبلی، کان پور | ۱۹۰۱ء |
| ۲- سیاحت نامہ موسیو تھیونو، مطبوعہ آگرہ | ۱۸۹۷ء | ۷- علم الکلام، شبلی، علی گڑھ | ۱۹۰۲ء |
| ۳- تاریخ دکن، جلد اول، مطبوعہ آگرہ | ۱۸۹۷ء | ۸- تاریخ دکن، جلد سوم، آگرہ | ۱۹۰۳ء |
| ۴- تاریخ دکن، جلد دوم، مطبوعہ آگرہ | ۱۹۰۰ء | ۹- الکلام، شبلی، کان پور | ۱۹۰۴ء |
| ۵- نظام اکبری، حیدرآباد، مطبوعہ آگرہ | ۱۹۰۱ء | ۱۰- موازنہ انیس و دیر، شبلی، آگرہ | ۱۹۰۴ء |

۲۔ مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نونہروی ایک وسیع النظر شیعہ عالم تھے، علم کلام میں معراج العقول نام عربی میں ایک مبسوط تصنیف یادگار چھوڑی ہے، یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں انہوں نے شائع کی، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے اپنے الہلال میں اس پر مدحانہ تبصرہ کیا تھا۔

پہلے ۳۱ صفر والے فرمان میں ان کی قائم مقامی کی نصف تنخواہ دوسورپیے مقرر ہوئی، اس کے بعد ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ (۲۷ جولائی ۱۹۰۱ء) کو اس عہدہ کی پوری تنخواہ چار سورپیے ماہ وار کا فرمان ہوا، بعد کو مولوی عزیز میر زمر حوم وغیرہ کی کوشش سے پانچ سورپیے ماہ وار ہو گئے لیکن سورپیہ ماہ وار کا گزشتہ وظیفہ جو سرکار آصفیہ سے ان کو ملا کرتا تھا، بند ہو گیا اور چون کہ یہ صیفہ مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں تھا اور وہ محکمہ تعمیرات و معدنیات ریلوے کے معتمد تھے، اس لیے سررشتہ علوم و فنون کا یہ صیفہ بھی اسی محکمہ تعمیرات و معدنیات کے ماتحت تھا اور یہی سبب ہے کہ الکلام کے شروع میں مولوی کاظم علی صاحب قائم مقام معتمد محکمہ تعمیرات کا مقدمہ شامل ہے۔

اس عہدہ کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ مولانا نے علم کلام پر متعدد تصنیفوں کا خاکہ تیار کر لیا، ان کی زندگی کے جو پچھلے حالات آپ نے پڑھے ہیں ان سے اندازہ ہو رہا ہوگا کہ وہ تاریخ سے نکل کر علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھ رہے ہیں اور سرسید نے ان سے الغزالی لکھنے کی جو فرمائش کی تھی، وہ اس کے لیے کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دوڑ نکل گئے اور علم الکلام کا ایک وسیع خاکہ ان کے ذہن میں آ گیا، چنانچہ الغزالی کے شروع میں وہ رقم طراز ہیں: علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتمم بالشان علم اور ان کا سرمایہ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کے چار حصے قرار دیے ہیں۔

۱- علم کلام کی ابتدا اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترتیبیں۔

۲- علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کام یابی

حاصل کی۔

۳- ائمہ کلام کی سوانح عمریاں۔

۴- جدید علم الکلام

پہلا حصہ بقدر معتمد بہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجہ چند رک گیا اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا، اس حصہ میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہو گئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی، چون کہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا، مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔“ پہلے حصہ یعنی الکلام کے شروع میں علم کلام کی تاریخ لکھنے کی وجہ ہے اور بتایا ہے کہ اس کے لکھنے میں وہ اپنی تاریخ کی حد سے باہر نہیں نکل رہے ہیں، فرماتے ہیں ”تاریخ کے فن میں اہل مغرب نے جو

نئے نئے برگ و بار پیدا کیے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اشخاص اور اقوام کی تاریخ سے گزر کر علوم و فنون کی تاریخ لکھتے ہیں، مثلاً فلاں علم کب پیدا ہوا، کن اسباب سے پیدا ہوا، کس طرح عہد بہ عہد بڑھا، کیا کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں اور کن وجوہ سے ہوئیں، اس قسم کی کوئی تصنیف اردو بلکہ عربی و فارسی میں بھی موجود نہ تھی، میں نے ابتدائے زمانہ تصنیف سے اپنی تصنیفات کا موضوع تاریخ قرار دیا ہے، چنانچہ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں وہ تاریخ ہی تھیں، اس بنا پر علم کلام میرے دائرہ سے خارج تھا، علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک طرف اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے، دوسری طرف یہ تصنیف جو درحقیقت علم کلام کی تصنیف ہے، تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہے اور میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا گنہگار نہیں رہتا۔“

اس میں شک نہیں کہ مولانا نے تاریخ ہی کی تقریب سے علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھا، مگر یہ کوچہ ان کو ایسا پسند آیا کہ وہ پھر عمر بھر اس سے نہیں نکلے، وہ کہتے تو ہیں کہ ان کے علم کلام کی کتابیں تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہیں، مگر اہل نظر کو معلوم ہے کہ ان کی تاریخی کتابیں بھی علم کلام ہی کے دائرہ میں ہیں، اس لیے وہ علم کلام لکھنے سے اپنی حد سے تجاوز کرنے کے گنہگار نہ پہلے تھے اور نہ اب ہوئے۔

اس خدمت کے قبول کرنے کے بعد ہی حیدرآباد کی اندرونی سیاسیات میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوا، شخصی سلطنت میں کسی اعلامرکزی شخصیت کے ہٹنے سے اس نظامِ شمس کے سارے ستاروں پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔

مولوی سید علی بگرامی کی حیدرآباد سے | مولوی سید علی بگرامی مرحوم میں جہاں بہت سی خوبیاں
علاحدگی اور سررشتہ علوم و فنون کا تذبذب | تھیں، کچھ کم زوریاں بھی تھیں، یعنی انہوں نے طبیعت
سیاسی پائی تھی، اس لیے ان کے ہاں ہمیشہ جوڑ توڑ لگا رہتا تھا، کبھی وہ اس میں دوسروں کو پھنساتے تھے اور
کبھی وہ اس میں خود پھنس جاتے تھے، اسی قسم کا ایک موقع ۱۹۰۱ء کے آخر میں پیش آیا، نواب وقار الامرا
بہادر مدار المہامی سے مستعفی ہوئے اور ان کی جگہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو وزارت کا قلم دان سناہت ہوا، اس
کے نتیجہ میں مولوی سید علی بگرامی بھی ستمبر ۱۹۰۱ء میں بائیس سال کی کارگزاری کے بعد ملازمت سے سبک
دوش کر دیے گئے، مولوی صاحب کا اپنی جگہ سے ہٹنا کوئی معمولی بات نہ تھی، بیسیوں اشخاص کا تعلق صرف
ان کی ذات سے تھا، اس لیے ریاست کی الجھی ہوئی سیاستوں کے سبب سے ان کا متاثر ہونا ضرور تھا، ۲۷

ایسے قدر شناس سے چھپے رہ سکتے تھے، چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بھی اس ”سررشتہ“ کے کاموں سے دل چسپی لی، اور اس کا انتظام پختہ اصول پر کرنے کی طرف مائل ہوئے، جناب نواب شہاب جنگ مختار لدولہ افتخار الملک بہادر معین المہام سرکار عالی اس کے افسر اعلا اور سرپرست اور مولوی سید علی بگڑائی کی جگہ پر قائم مقام معتمد تعمیرات میر کاظم علی صاحب نگرماں کار مقرر ہوئے (مقدمہ الکلام) اور تصنیف و تالیف کا کام بدستور جاری رہا۔

قیام حیدرآباد کی تصنیفات | مولانا شبلی مرحوم حیدرآباد میں کل چار برس رہے، یعنی فروری ۱۹۰۱ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک، اس میں بھی ۱۹۰۱ء کے چند مہینے امیدوار یوں میں گزر گئے، غالباً جولائی یا اگست ۱۹۰۱ء میں وہ سررشتہ علوم و فنون کی نظامت پر بحال ہوئے اور فروری ۱۹۰۵ء میں اس سے الگ ہو گئے، اس بنا پر ان کی نظامت سررشتہ مذکور کی مدت ساڑھے تین برسوں سے زیادہ نہیں اور یہ شب و روز بھی اکثر روزانہ کے انقلابات اور سیاسی مدد جزر کے نذر ہوتے رہے اور اطمینان خاطر بہت کم نصیب ہوا، اس پر یہ دیکھ کر سخت تعجب آتا ہے کہ بے اطمینانی کے ان ساڑھے تین برسوں میں انہوں نے ایسی پانچ کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں ہر کتاب مستقل پانچ برس کی محنت، مطالعہ اور مراجعت کی محتاج ہو سکتی ہے، مگر تعجب اس لیے نہیں کہ جو لوگ حقیقی صاحب فکر مصنف ہوتے ہیں، وہ کاغذ کے صفحوں پر اپنے خیالات جب بھی قلم بند کریں، مگر وہ خیالات ان کے دماغوں میں سالہا سال کے مطالعہ، مراجعہ اور محنت کے بعد مخزوں ہوتے رہتے ہیں اور موقع ہاتھ آنے کے بعد وہ کاغذ کے صفحوں پر آسانی سے منتقل ہو جاتے ہیں۔

الغزالی | سررشتہ میں مولانا کی سب سے پہلی کتاب الغزالی تصنیف ہوئی جو ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء تک ختم ہو کر مطبع جاچکی تھی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ چند مہینوں میں ترتیب پائی، آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کتاب کا خیال ان کے دماغ میں کتنے دنوں تک پک رہا تھا، گزر چکا ہے کہ ۱۸۹۳ء میں جب وہ الفاروق کی تصنیف کے لیے تیار ہو رہے تھے، تو سرسید نے الفاروق کے بہ جائے الغزالی لکھنے کی فرمائش ان سے کی، الفاروق سے فرصت پانے کے بعد ان کا خیال امام غزالی کے سوانح اور فلسفہ و کلام کی طرف کلینہ منتقل ہوا، ان کی کتابیں دیکھتے، ان کا فلسفہ سمجھتے اور ان کے خیالات کو ترتیب دیتے رہے، یہی سبب ہے کہ حیدرآباد میں ان کی تقریر سننے کے لیے جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں انہوں نے علم کلام ہی پر تقریر فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت یہی خیالات و معلومات ان کے دل و دماغ پر چھائے تھے،

اس لیے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ فرمائی۔

۱۰ جولائی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو تصنیف کے چند موضوعوں سے ایک موضوع امام غزالی کی لائف بتاتے ہیں، لکھتے ہیں ’امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا ریویو ہو، تا کیوں کہ موجودہ علم کلام کے موجود وہی ہیں۔‘ (شروانی-۱۲)

پھر ۱۶ جولائی کو انہیں لکھتے ہیں ’امام غزالی کی لائف کا پہلا حصہ گو تفصیل طلب ہے لیکن آپ اس کو بخوبی انجام دیں گے، میں تمام ماخذ عرض کروں گا لیکن اصل چیز ان کی کتاب تہافت الفلاسفہ کا ریویو ہے جس پر ابن رشد نے رد لکھا ہے، میں نے فلسفہ بڑی محنت اور ترقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہا، (علی گڑھ آنے سے پہلے) باوجود اس کے میری سمجھ میں وہ کتاب نہیں آئی، مولوی فاروق صاحب سے پڑھنا چاہا، وہ بھی کترا گئے، میں نے چند دفعہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیئے کہ ان کتابوں پر ریویو نہ ہو سکا تو کیا فائدہ، اس کے علاوہ پورے علم کلام کی تاریخ اور اس پر ریویو لکھنا پڑے گا، اس کے سامان کے لیے میں مصر سے کتابیں نقل کرانا چاہتا ہوں، اس کا بھی ابھی سامان نہیں، فارسی کے لیے میں ابھی سے تیار ہوں۔‘

اس کے بعد ۲۶ جولائی ۱۸۹۹ء کو سوسہ بارہ ان ہی کو لکھتے ہیں، ’امام غزالی کی علمی حالت سنئے، فقہ شافعیہ کی علمی تدوین و ترتیب کی بنیاد امام الحرمین نے ڈالی، پھر امام غزالی نے تین کتابیں وسیط، بسیط و جبر نکھیں، ان کے بعد ان کتابوں کی بے انتہا شرحیں لکھی گئیں اور بعد کی تمام تصنیفات ان ہی سے ماخوذ ہیں اور ان ہی کی تغیر شدہ شکلیں ہیں، اصول فقہ میں نئے طریقہ کی سب سے پہلی کتاب امام صاحب نے لکھی جس کا نام مخول ہے اور جو مدتوں میرے مطالعہ میں رہی ہے، یہ نہایت زور کی کتاب ہے اور بہ خلاف امام کی اور تصانیف کے عبارت اس کی دقیق ہے، اصول میں اور بھی ان کی کتابیں ہیں مرنے سے ایک برس پہلے اسی فن میں ایک کتاب مستصفیٰ لکھی جو میری نظر سے گزر چکی ہے، تصوف میں بے شمار کتابیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے، علم کلام کے وہ خیال خود موجود ہیں اور اس میں ان کی بہت سی تصنیفیں ہیں، ان کے بعد شیخ الاشراف نے فلسفہ اشراقی کے نام سے کتابیں لکھیں، ان میں حکمت الاشراف سب سے عمدہ ہے جو میرے مطالعہ میں بہت رہی ہے اور ان کے بعد امام رازی نے مطالب عالیہ نہایت العقول الربیعین مباحث مشرقیہ لکھیں، یہ سب کتابیں ضخیم ہیں اور بہ جز دو کے سب میری نظر سے گزری ہیں، امام غزالی نے

فلسفہ و منطق کو بھی صاف کر کے لکھا، اس میں ان کی یہ کتابیں ہیں، بحک النظر، مقاصد الفلاسفہ، منتخل وغیرہ۔ عیسائیوں کے رد اور انجیل کی تحریف میں بھی ایک کتاب لکھی ہے، جس کو میں دیکھ چکا ہوں، یہ کتابیں جب تک مہیا نہ ہوں اور جب تک ان پر بلکہ اصل علوم پر ریونیو نہ کیا جائے، ان کی لائف لکھنی بے کار ہے، ریونیو کے لیے اصل فن پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، گو لکھا کم جاتا ہے، مگر وہ بہت وسعت نظر اور خوض و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک بات یہ ہے کہ فلسفہ شرعیہ کے بہت سے مسائل کی نسبت ان کا طرزِ تحریر یہ ہے کہ وہ مسائل ان کی ایجاد ہیں، حالاں کہ متعدد تحقیقات کو میں نے بعلی سینا کی کتاب میں پایا، اس لیے ان کے کہنے پر اکتفا نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر جگہ سے پتہ لگانا پڑے گا، ان مشکلات کو خیال کر کے قلم اٹھائیے، میں بہت کچھ اس کے لیے تیار ہو چکا ہوں، تاہم ہمت نہیں پڑتی، بیسیوں صفحے لکھ کر چھوڑ دیے ہیں، امام صاحب کی جن تصنیفات کا میں نے نام لکھا ہے، گو اکثر میری نظر سے گزری ہیں لیکن نہایت نایاب ہیں اور مشکل سے بہم پہنچیں گی، مستعار لمانا بھی مشکل ہے۔

خطوط کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ ان دنوں ان کے غور و فکر کا سب سے بڑا موضوع یہی تھا، حیدرآباد پہنچ کر اس سلسلہ میں ان کو بعض نئی کتابیں ملیں جن میں ایک فرنیچ اور دوسری جرمن مصنف کی تھی، جن کا حوالہ انہوں نے الغزالی کے دیباچہ میں دیا ہے اور جو غالباً مولوی سید علی بنگرامی کے کتب خانہ میں دیکھی ہوں گی، بہر حال یہ کتاب ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کو منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کے مطبع نامی کان پور میں چھپنے کو جا چکی تھی، (حمید-۱۶) اور اگست ۱۹۰۲ء میں یہ چھپ کر شائع ہوئی، اس کا یہ پہلا ایڈیشن بہت آب و تاب سے چھپا اور ہاتھوں ہاتھ لیا اور پڑھا گیا۔

علم الکلام | الغزالی کے بعد علم الکلام کا نمبر آیا، علم کلام کی تاریخ کا ابتدائی خاکہ بھی علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں اس وقت ان کے سامنے آیا تھا، جب ۱۸۹۵ء میں تہذیب الاخلاق میں "المعتزلہ والاعتزال" کے نام سے مضمون لکھا تھا، اس کے بعد بھی وہ اس پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، چنانچہ ۸ فروری ۱۸۹۹ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: "میں نے علم کلام پر لکھنا شروع کر دیا ہے، اس فن کی کتابیں دور دور سے آرہی ہیں۔" ۱۸ مارچ ۱۹۰۲ء کو وہ ختم ہو رہی تھی (مہدی-۱۰) اور اس وقت خیال یہ تھا کہ علم الکلام اور الکلام دونوں حصے ایک ساتھ چھپیں گے اور اسی لپیٹ میں دونوں حصے ایک ساتھ زیر تالیف تھے اور کس بے اطمینانی میں اس کا اندازہ حسب ذیل فقروں سے کیجئے، جو ۱۸ مارچ ۱۹۰۲ء کو لکھے گئے ہیں، میں

۱۔ مکاتیب میں اس خط کی تاریخ ۱۹۰۱ء غلط چھپی ہے۔

الغزالی لکھ چکا اور مطبع میں جا چکی، علم کلام کی تاریخ بھی ختم ہو چکی، اب جدید علم کلام پر لکھ رہا ہوں، یہ دونوں جیسے ساتھ چھپیں گے، اگر یہاں اطمینان سے رہنا پیش آتا تو بڑے بڑے کام انجام پاتے لیکن ہر وقت رکاب میں پاؤں ہے، جو گھڑی ٹلتی جاتی ہے، اسی پر حیرت ہے، مولوی سید علی پرسوں میرے پاس تشریف لائے تھے، ۲۲ مارچ کو ولایت جاتے ہیں، ع

دوستاں رفند و من ہم میروم (مہدی-۱۰)

مولانا علم الکلام کی تکمیل کے وقت بیمار ہو گئے تھے، بخار اور لرزہ میں مبتلا تھے، ضعف خاصہ ہو گیا تھا، فرماتے تھے کہ فرش پر پڑا پڑا تکیہ کے سہارے ذرا سا سر اٹھا کر لکھا کرتا تھا، اسی حال میں علم الکلام کو فروری ۱۹۰۲ء میں جس طرح بنا تمام کیا (حمید-۱۶) اور اسی لیے اس کتاب میں بہت سی کیاں رہ گئیں، مثلاً فرماتے تھے کہ ”اس میں ماترید یہ یعنی حنفی علم کلام کا حصہ بہت ہی مختصر ہے، اس کو جی کھول کر بڑھانہ سکے، کیوں کہ ماترید یہ کی تصنیفات بہت کم ہیں، اس لیے اس پر تفصیل سے لکھنا بڑی محنت کا کام تھا، غالباً ان کے ایک مکتوب کا یہ فقرہ اسی تفصیل کا اجمال ہو، میں نے علم کلام نہایت نا تمام کتاب لکھی اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے۔“ (حمید-۱۷)

بہر حال وہ کتاب ۲۱/۱۲ اپریل ۱۹۰۲ء کو صوفی محمد علی کے پریس مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لیے بھیجی گئی، چنانچہ اسی تاریخ کو نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں: ”الغزالی کان پور چھپ رہی ہے، افسوس ہے کہ نشی رحمة اللہ عدد دو دن کا کام برسوں میں کرتے ہیں، چھ مہینے ہو چکے ابھی تک ۱۲۷ صفحے لکھے گئے ہیں، اسی وجہ سے میں نے اپنی ایک تازہ تصنیف یعنی علم کلام کی تاریخ آگرہ چھپنے کے لیے آج روانہ کی ہے، یہ انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی، جدید علم کلام زیر تصنیف ہے، (مکاتیب اول بہ نام وقار الملک)

۱۱ مئی ۱۹۰۲ء کو مہدی مرحوم کے نام لکھتے ہیں ”تاریخ علم کلام آگرہ چھپنے کے لیے جا چکی،

رعذرغزالی ہی سے عہدہ برآ نہ ہو سکے، اسی لیے دوسری طرف رخ کرنا پڑا۔“ (مہدی-۱۳)

مارچ ۱۹۰۳ء سے کچھ پہلے یہ چھپ کر شائع ہوئی۔ (حمید-۱۷)

۱۔ مولانا کی علالت اس وقت اور اس کے بعد بھی جاری رہی، دیکھیے، شروانی ۳، مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۰۲ء اور مہدی، ۱۳ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۰۲ء مکاتیب میں اس کی تاریخ ۱۹۰۵ء غلط چھپی ہے۔ ۲۔ مکاتیب شبلی میں ۱۹۰۵ء لکھ گیا ہے، جو قطعاً غلط ہے، ۱۹۰۲ء ہونا چاہیے۔

الکلام | علم کلام کی تاریخ کے بعد الکلام یعنی جدید علم کلام کی باری آئی وہ ۱۹۰۲ء میں اس کتاب کے کچھ ابواب لکھ رہے تھے اور اس وقت یہ خیال تھا کہ یہ دونوں حصے علم الکلام اور الکلام ساتھ چھپیں گے، (مہدی-۱۰) لیکن علم الکلام کے علاحدہ مستقل چھاپے جانے کے فیصلہ کے بعد پہلے علم الکلام پوری کر دی اور اس کے بعد الکلام کو پورا کرنا شروع کیا، جدید علم کلام پر لکھنے کے لیے ان کو انگریزی کتابوں کے فلسفیانہ معلومات کی ضرورت پیش آئی، مگر یہ مدد ان کو حسب توقع نہ مل سکی، اس پر اپنے عزیز شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی، اے کو جو فلسفہ جدید میں پروفیسر آرنلڈ کے ممتاز شاگرد تھے، ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں ”الغزالی ختم ہو کر مطبع میں جا چکی، شاید سیرۃ العثمان کے لگ بھگ ہو جائے، علم کلام کی تاریخ لکھ رہا ہوں، وہ بھی قریب الختم ہے، اب کلام جدید کا مرحلہ ہے، کوئی انگریزی داں دوست ہوتا تو بڑا کام نکلتا جو حکمائے یورپ روح و واجب الوجود کے قائل ہیں، ان کے دلائل سے کتاب کی بہت رونق ہوتی، تم سے زیادہ کون اس مصرف کا تھا، انگریزی داں تھے، عربی داں تھے، عزیز تھے لیکن ان سب کچھ ہونے کے ساتھ بھی کچھ نہیں، بہتیرا کہا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچا ہی کھڑا کر دو تو بہت بصیرت ہو، تم کو کس کی پروا ہے، حالانکہ جو حصہ لکھ رہا ہوں، اس میں مدد دینا ایک مذہبی اور قومی کام ہے۔ (حمید-۱۶)

اسی حالت میں مصر کے ایک نئے تعلیم یافتہ فرید وجدی کے رسائل ”الاسلام فی عصر العلم“ مصنف کے بہت کام آئے اور انہوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، جدید کلام کا مرحلہ دشوار گزار تھا، اس لیے قدیم طرز کے کسی سنجیدہ بزرگ سے بھی اس میں مشورہ مناسب تھا، چنانچہ اس کام کے لیے ان کی نظر مولانا شروانی پر پڑی، چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۰۲ء کو انہوں نے ان کو لکھا، ہاں ایک بڑا ضروری امر یہ ہے کہ علم کلام کا خاص حصہ لکھ رہا ہوں، آپ کے پاس بھیجوں گا (اور اس شاگردی کی نسبت میں نے آج تک کسی کے ساتھ گوارا نہیں کی) آپ دیکھ کر بتائیے گا کہ کون سا حصہ رکھنے کے قابل ہے، کون سا نہیں لیکن اس وقت دریافت طلب امر یہ ہے کہ عقائد کے مسائل ہیں کیا تو حید لکھ چکا ہوں، نبوت لکھ رہا ہوں، اس کے بعد صرف معادہ جاتا ہے، باقی کیا لکھوں کتب کلام میں جو عقائد لکھے ہیں وہ درحقیقت عقائد میں داخل نہیں، مثلاً حدوث عالم، صفات باری، لائین، لا غیر ہونا، وغیرہ وغیرہ، اس لیے درخواست ہے کہ آپ کے نزدیک جو مسائل عقائد ضروری الحدیث ہوں، ان کے عنوان لکھ بھیجئے۔“ (شروانی-۳۷)

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا شروانی نے ان کو جواب میں کیا لکھا، مگر الکلام میں بقیہ عقائد کا عنوان قائم کر کے ان عقائد کو گنا دیا ہے، جن کو مناظرانہ علم کلام نے پیدا کیا ہے اور جن کی اصل کتاب وسنت میں نہیں اور اس کے بعد روحانیات یا غیر محسوسات کا عنوان قائم کر کے ان بقیہ عقائد کو لکھا ہے جن کی تصریح کتاب وسنت میں موجود ہے، مگر مصنف کے خیال میں ان کی کیفیت قرآن پاک میں مذکور نہیں، اس لیے ان کی تصریح مختلف اسلامی فرقوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے اور اس سلسلہ میں اجمالاً ملائکہ، وحی اور واقعات قیامت پر امام غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ کے اقتباسات درج کیے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ باب بے حد مختصر، مبہم اور ناتمام ہے۔

۲۱ اپریل ۱۹۰۲ء میں یہ کتاب زیر تصنیف تھی (وقار الملک) بلکہ ایک سال کے بعد ۱۹ مارچ ۱۹۰۳ء میں بھی وہ ناتمام تھی، البتہ اس کا بہت حصہ لکھا جا چکا تھا اور جو لکھا جا چکا تھا اس سے مولانا خوش تھے، (حمید-۱۷) بہر حال اسی سال کتاب تمام ہوئی اور ۱۹۰۴ء میں منشی رحمت اللہ عد کے مطبع نامی سے چھپ کر شائع ہوئی۔

سوانح مولانا نائے روم | مولانا کی طبیعت کو تصوف سے کبھی لگاؤ نہ تھا، اس لیے بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ وہ مولانا نائے روم کے گرویدہ کس طرح ہوئے، مولانا کے ایک محرم اسرار نے جنہوں نے ان کی سوانح مولانا نائے روم پر تبصرہ لکھا ہے، اس راز سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے، علامہ کی حقیقت پسند طبیعت نے ابتداءً وہ میدان انتخاب کیا جو حقائق و واقعات کا غالباً دنیا میں سب سے بواذخیرہ ہے، یعنی مسلمانوں کی تاریخ اس انتخاب کے نتائج وہ گوہر شاہوار نہیں جو الفاروق، سیرۃ النعمان اور المامون وغیرہ کے نام سے آویزہ گوش روزگار ہوئے، اس کے بعد انہوں نے علم کلام کی طرف توجہ کی، الغزالی، الکلام، علم الکلام، اس کاوش کے جوہر ہیں، اس وقت تک ان کی تصانیف میں ظاہری پہلو غالب تھا، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ الفاروق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی دینی زندگی اس اہتمام سے نہیں لکھی گئی جس کے وہ مستحق تھے، سلسلہ میں سلسلہ پیدا ہوتا ہے، امام غزالی کی زندگی کا آغاز ظاہری طمطراق یعنی مناظرہ اور مباحثہ سے معمور تھا، انجام باطنی عظمت و تجمل پر ہوا، یعنی معرفت اور تصوف پر، یہی واقعہ ان کے سوانح نگار کو پیش آیا، علامہ شبلی نے جب الغزالی کی تالیف شروع کی تو وہ تصوف سے اس قدر بے گانہ تھے کہ امام غزالی کی زندگی کا یہ مہتمم بالشان پہلو بالکل ان کی نظر سے مخفی تھا، ایک دوست کی توجہ دلانے سے

انہوں نے امام ممدوح کی صوفیت کا مطالعہ کر کے ایک باب ”الغزالی“ میں اضافہ کیا، مبارک تھا وہ وقت جب ان کی توجہ تصوف، کی طرف مائل ہوئی، کیوں کہ اسی توجہ کا بیش بہا نتیجہ وہ تصنیف ہے جس پر ہم یہ تبصرہ لکھ رہے ہیں، امید ہے کہ آئندہ اس سے بھی بڑھ کر نتائج پیدا ہوں گے۔

مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا، اس کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں، بہت سے خلاصے ہوئے لیکن (جہاں تک معلوم ہے) صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی، کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے۔

مولانا شردانی کی یہ عبارت ان کی تقریظ بر سوانح مولانا روم سے لی گئی ہے، جو الندوہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں چھپی ہے، اس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ تبصرہ نگار کے اس حسن تلاش کو مصنف نے بھی تسلیم کر لیا تھا اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عقلیات کی تلاش نے مولانا کو امام غزالی کی درسگاہ تک پہنچایا، امام غزالی کی تلاش ان کو مولانا روم کے آستانہ تک لے آئی، خود الغزالی میں بھی اس دریافت کا ایک حوالہ موجود ہے، یعنی تصوف کی حقیقت کے اظہار میں امام غزالی کے بعد مثنوی کے چند اشعار کا حوالہ آتا ہے۔

میرے خیال میں ان کے اس موضوع کے انتخاب میں حیدرآباد کے مقامی ذوق کو بھی تعلق ہے، حیدرآباد کے رگ و پے میں تصوف اور وحدۃ الوجود کے مسائل سرایت کیے ہوئے ہیں۔

بہر حال ۱۹۰۴ء میں انہوں نے مثنوی پر تقریظ لکھنی شروع کی، ۱۸ فروری ۱۹۰۴ء کو مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں ”تم نے ایک زمانہ میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولانا روم غور سے پڑھی اور ان کے اصول اور پرنسپلز متعین کیے، اگر خیال میں ہوں تو لکھ بیجو۔ (حمید-۲۵)

۲۱ اپریل ۱۹۰۴ء کو نواب سید علی حسن خاں کو لکھتے ہیں (۵) ”میں آج کل مثنوی مولوی روم پر ایک بڑا مفصل ریویو لکھ رہا ہوں، مع سوانح عمری مولانا روم“۔

۲ مئی ۱۹۰۴ء کے خط بدنام مہدی حسن میں ہے (۱۲) ”میں مثنوی روم پر تقریظ لکھ رہا ہوں، ایک نئی کتاب ہوگی۔“

۱ غلطی سے مکاتیب میں ۱۹۰۲ء چھپا ہے، جو صریحاً غلط ہے، کیوں کہ اس میں اشمن ترقی اردو کا ذکر ہے، جو ۱۹۰۳ء میں اور الندوہ کا اشارہ ہے، جو ۱۹۰۴ء میں نکلا، ۱۲۔

الکلام کے شروع میں معتمد سررشتہ کی طرف سے جو دیباچہ ہے، اس میں اعلان ہے کہ ”الکلام اس سلسلہ آصفیہ کی نویں جلد ہے اور دسویں موازنہ دہر و انیس اور گیارہویں سوانح عمری مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ“ مگر اشاعت کی ترتیب الٹ گئی، یعنی سوانح عمری مولانا روم پہلے اور موازنہ بعد کو چھپی۔

سوانح مولوی روم اسی سال یعنی ۱۹۰۴ء میں ختم ہو کر منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع میں چھپنے کو بھیجی گئی، ۲۲ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں ”تقریظاً مثنوی کبخت رعد کے قبضہ غصب میں ہے، دو برس ہو چکے۔“ (مہدی-۱۴)

ابھی یہ کتاب مطبع ہی میں تھی کہ مولانا ۱۹۰۵ء کے شروع میں حیدرآباد چھوڑ کر ندوہ کی خدمت کے لیے لکھنؤ آگئے، چنانچہ ہمیں کے قیام کے زمانہ میں اگست ۱۹۰۶ء میں وہ چھپ کر آئی۔ (حمید-۳۴) چار قسم کے کاغذوں پر چھپی تھی، قیمت درجہ خاص مجلد ۳ روپیہ ہے، درجہ اول ایک روپیہ چار آنہ، درجہ دوم ۱۴ آنے، درجہ سوم ۱۰ آنے، یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، یہ اپنی آنکھوں کا مشاہدہ ہے کہ ہر روز اس کی طلب کے بیسیوں خطوط آتے اور کتاب اطراف ملک میں بھیجی جاتی۔

حیدرآباد کی ادبی دل چسپیاں | مصنف کا قلم لگا تار تین چار برس فلسفہ و کلام کی بیچ در بیچ کوچہ گردیوں سے گھبرا کر خالص ادبیات کے سرسبز و شاداب میدان کا طالب ہوا اور مثنوی مولانا نے روم کی شاعری سے کسی دوسرے شاعرانہ موضوع کی طرف نکل آنے سے تصنیفی ارتقا کا حلقہ اتصال بھی قائم رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس حلقہ اتصال کے پانے میں حیدرآباد کی سرزمین کو بھی ایک گہرا تعلق ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت داغ کے وجود سے ”حیدرآباد آج کل گلزار ہے“ ملک میں داغ اور امیر کی مقابلانہ شاعری، اہل نظر کی گفتگو اور بحث کا مستقل موضوع بنی ہوئی تھی، مولانا مرحوم داغ کے طرف دار اور مداح تھے، داغ کے سیکڑوں اچھے شاعران کی زبان پر تھے، داغ سے ملتے بھی رہتے تھے اور ان کے بعض تذکرے بھی فرماتے تھے، حیدرآباد میں ۱۹۰۱ء میں دکن کو خطاب کر کے جو فارسی نظم لکھی تھی، اس میں بھی داغ کو پوری عزت کے ساتھ اپنے پہلو میں جگہ دی ہے:

ہاں تو دعویٰ کن و مانیز مسلم داریم | شبلی سحر فن و داغ غزل خواں ازتست

حیدرآباد میں ان کا حلقہ ادب | اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے ایک خوش مذاق عزیز (سمیع مرحوم) گو حیدرآباد کی دعوت دیتے ہیں، ان کی ترغیب کے لیے لکھتے ہیں، ”داغ، شرر، سید علی بلگرامی، سید حسین یادگار ان زمانہ کو دیکھنا چاہو گے، تو سب ہی موجود ہیں۔“ (سمیع-۳۹)

ان چند ممتاز اصحاب کے علاوہ حیدرآباد میں مولانا کا ایک خاص حلقہ احباب تھا، جن میں سے بعضوں کے نام معلوم ہیں، جیسے مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم جنہوں نے بہت سے ادبی و تاریخی مضامین اور سیرۃ محمود گادوال اور درگم اروسی لکھی ہے، مولوی سید عبدالغنی صاحب وارثی (استھانوی بہاری) جو عربی و انگریزی دونوں کے عالم تھے اور بوز اسف و بلوہر طبقاتِ شعرانی اور تاریخِ آندلس وغیرہ کے ترجمے کیے، نواب ضیاء جنگ بہادر مفتی عدالت عالیہ، موصوف درسیات کے فاضل اور فارسی میں شاعری کا مذاق رکھتے ہیں اور اب تک مشقِ سخن جاری ہے، ان کے علی گڑھ کے بعض خوش مذاق شاگرد جیسے مولوی مسعود علی صاحب محوی، مولوی ظفر علی خاں، مولوی سید محفوظ علی بدایونی، مولوی عبدالحق صاحب وغیرہ۔

یہ لوگ اکثر جمع ہوتے، ادبی دل چسپیاں رہتیں، شعر و شاعری کے تذکرے رہتے، اچھے اچھے اشعار پڑھے جاتے اور سنے جاتے، مولوی عبدالحق صاحب، مولوی سید علی بگرا می مرحوم کے حال میں لکھتے ہیں 'چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں (سید علی) مرحوم کے یہاں مدعو تھے، بارہ بجے کھانا کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے اشعار سناتے رہے، جس سے سامعین بہت محفوظ ہوئے۔ (چند ہم عصر ص ۷۹)

نواب ضیاء جنگ بہادر خود مجھ سے مولانا شبلی کی ادبی اور شاعرانہ صحبتوں کا ذکر فرماتے تھے، مولوی شیخ غلام قادر گرامی، مرحوم جنہوں نے ۱۹۳۳ء میں وفات پائی، فارسی کے مشہور شاعر تھے، وطن جالندھر تھا، مگر حیدرآباد میں رہتے تھے، آخر عمر میں جب وہ وطن چلے آئے تھے مجھ سے مولانا مرحوم کی صحبتوں کا تذکرہ فرماتے تھے۔

یہ صحبتیں کبھی رنگین بھی ہو جاتی تھیں، اسی قسم کی ایک رنگین صحبت میں مولانا نے وہ اردو غزل کہی تھی جس کا مقطع ہے مع کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی، مزہ ہے طرزِ علیٰ حزین کا

انیس و دبیر | ان ادبی محفلوں میں جس طرح داغ و امیر کے مقابلے ہوتے رہتے تھے، میر انیس اور مرزا دبیر کے باہمی مقابلہ کی گفتگوئیں بھی ہوا کرتی تھیں، مولانا میر انیس کے مداح اور ان کے محاسنِ کلام کے دلدادہ تھے اور یوں بھی اقلیمِ سخن کے ان دونوں تاج داروں کے مقبوضات اور مفتوحات کی وسعت اور ہمہ گیری کی داستان سے ملک کی ساری ادبی محفلوں میں ہنگامہ برپا تھا، مولانا نے موازنہ کے مقدمہ میں اس تصنیف کی تقریب ان لفظوں میں کی ہے، 'مدت سے میر ارادہ تھا کہ کسی

ممتاز شاعری کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے، شکر ہے کہ آج اس ارادہ کے پورے ہونے کی نوبت آئی اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیش کش ہے، اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام ”موازنہ“ ہے۔

اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں دو مقابل شعرا کے درمیان اس قسم کا موازنہ مشہور و معروف ہے، اس قسم کی ایک مشہور کتاب حسن بن یحییٰ آمدی التوفی ۳۰۰ھ کی کتاب ”الموازنہ بین ابی تمام والبحتری“ ہے، جس میں آمدی نے ان دونوں ممتاز شاعروں کے کلاموں کا موازنہ کیا ہے اور دونوں کے کلاموں کے عیب و نثر کو ظاہر کیا ہے، یہ کتاب ۱۲۸ھ میں مطبع الجواہر قسطنطنیہ میں سب سے پہلی دفعہ چھپی تھی۔

مولانا کے خطوط میں ان کی تصنیفات کے موضوع، تصنیف سے سالہا سال پہلے بیان اور تذکرہ میں آتے رہتے ہیں اور اس کے بعد جا کر وہ کتاب تالیف پاتی ہے، مگر موازنہ کی نسبت اس قسم کا کوئی سابق تذکرہ ان کے خطوط میں نہیں ملتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھنے کا خیال خواہ پرانا ہو، مگر میر انیس و دبیر کے موازنہ کا خیال بہت پرانا نہ تھا، اس موضوع کا ذکر سب سے پہلے نومبر ۱۹۰۱ء کے ایک خط میں آتا ہے، میں نے میر انیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے، جو ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔“ (سج-۵۲)

۲۴ مئی ۱۹۰۴ء کو لکھتے ہیں ”دبیر و انیس پر مجا کہ مدت ہوئی تیار ہے لیکن یہاں کچھ ایسی الجھنوں میں پڑ کر اب تک مطبع میں نہیں گیا، شاید عنقریب نوبت آئے، تقریباً ۳۰۰ صفحے ہو گئے ہیں“ (مہدی-۱۲) اسی خط میں آگے چل کر ”مثنوی مولوی روم پر تقریظ“ لکھے جانے کی بھی اطلاع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ موازنہ، سوانح مولانا روم سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھی، مگر اس کے چھپنے کی نوبت پیچھے آئی، ۲۷ نومبر ۱۹۰۴ء کو مولوی سید ابوالکمال صاحب دسنوی کے جواب میں لکھتے ہیں، ”موازنہ انیس و دبیر ابھی مطبع میں نہیں گئی۔“ (ابوالکمال-۱)

اس کے بعد مولانا ۱۹۰۵ء کے شروع میں حیدرآباد سے لکھنؤ چلے آئے اور کام چھڑ گئے، شعر العجم

میں بھی ہاتھ لگ گیا، مگر موازنہ کا مسودہ معتد تعمیرات کے ملبہ میں دبا رہا، نہ وہ چھپواتے تھے اور نہ دیتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مولانا نے دوبارہ اس کو مرتب کرنا شروع کیا، مارچ ۱۹۰۶ء میں لکھتے ہیں ”تقریظِ مثنوی چھپ گئی ہے، البتہ موازنہ مدتوں کے لیے رک گیا، مسودات پھر سے مرتب کرنے سے اور سر دست اس قدر فرصت نہیں، مبیضہ حیدرآباد میں ہے اور وہاں سے ملنے کی امید نہیں،“ (مہدی-۱۹) بالآخر ستمبر ۱۹۰۶ء میں اس کے کچھ اجزا درست ہو کر صوفی محمد علی کے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لیے دے دیے گئے، ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ایک دوست کو اطلاع دیتے ہیں ”موازنہ انیس نہایت عمدہ چھپ رہا ہے، مسودات کی ترتیب نے شعر العجم میں ہرج ڈال دیا ہے، چار مہینے سے کچھ نہیں لکھا گیا“ (مہدی-۲۷) ان چار مہینوں کی تحدید سے معلوم ہوا کہ جون یا جولائی ۱۹۰۶ء سے موازنہ کی دوبارہ ترتیب شروع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۰۶ء میں وہ جا کر تمام ہوئی، ۱۵ نومبر ۱۹۰۶ء کو وہ شروانی صاحب کو لکھتے ہیں ”موازنہ سے بہمہ وجوہ نجات ملی اب جس قدر وقت ملے گا، شعر العجم پر صرف ہوگا۔“ (شروانی-۵۶)

اسی زمانہ میں مولانا نے مولانا حالی کو سوانح مولانا روم کا ایک نسخہ ہدیہ بھیجا تھا اور خط میں موازنہ کے چھپنے کی اطلاع دی تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۱۵ نومبر ۱۹۰۶ء کو اپنے گرامی نامہ میں موازنہ کے اس مسودہ کے متعلق جو حیدرآباد میں پڑا تھا یہ ارقام فرمایا، ”موازنہ انیس ودبیر کا مسودہ میں نے میر کاظم علی صاحب معتد تعمیرات سرکار عالی سے بڑے تقاضوں کے ساتھ حیدرآباد میں منگوا کر دیکھا تھا اور جس رقعہ کے ساتھ ان کے دفتر میں اس کو واپس بھیجا تھا اس میں ان کو بہت غیرت دلائی تھی کہ اب تک اس کے شایع کرنے کا یہاں کسی کو خیال نہیں آیا، یا تو سرکار کی طرف سے آپ اس کو چھپوادیں یا بعض اشخاص جو اس کے چھاپنے پر آمادہ ہیں، ان کو اجازت دیں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اس مسودہ کو خود مولانا کے پاس بھجوادیں، کیوں کہ اس میں جا بجا کورے اور اق چھوڑ دیے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس میں کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہے، میر کاظم علی صاحب نے بہت دن کے بعد اس کا یہ جواب دیا کہ سرکار سے اس کے چھاپنے کی منظوری لے لی گئی ہے لیکن باوجود اس کے کہ میں اس کے بعد کئی مہینہ تک وہاں ٹھہرا ہوا، میرے سامنے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، بفرض محال وہاں چھپتا بھی، تو بالکل مسخ ہوتا، آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں چھپنے کو دے دیا، جب موازنہ بالکل چھپ جائے تو ازراہ عنایت اس کی بھی ایک جلد سکرپٹری و کٹوریہ میموریل لائبریری کے نام ضرور بصفیہ ویلوے ایبل بھجوادیتے گی۔“

۱۔ مولانا حالی کا خط بہ نام مولانا شبلی، معارف دسمبر ۱۹۱۱ء میں چھپا ہے۔

سررشتہ کی دوسری کتابیں | مولانا کے عہدِ نظامت میں سررشتہ کی طرف سے بعض دوسری کتابوں کے لکھوانے اور چھپوانے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

کتاب الآلات | سررشتہ میں قدم رکھنے کے ساتھ مولانا کو کتاب الآلات کے چھپوانے کا خیال آیا، لکھنؤ کے ایک کتب فروش کی دوکان سے کتاب الآلات کا جو نسخہ ستمبر ۱۸۹۹ء کو ہاتھ آیا تھا اور جس کے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے خرید فرمایا تھا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یہ کتاب عربی میکائیس پر تھی، مولانا نے جب سررشتہ علوم و فنون کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو مولوی سید علی بگڑامی کے مشورہ سے اس کتاب کو سررشتہ کی طرف سے چھپوانا چاہا، شروانی صاحب کو لکھا، کتاب الآلات علوم و فنون کی طرف سے چھپوانا مقصود ہے، آپ وہ نسخہ بھیج دیجیے، اور اگر اپنے نسخہ منقولہ میں تصویریں بنوانی ہوں تو وہ بھی یہاں بہت اچھی بن سکتی ہیں۔“ (۲۵)

پھر ۲۵ مئی ۱۹۰۱ء کو لکھا ”کتاب الآلات کی تصاویر کے لیے رعد کو لکھیے وہ انتظام کر دیں گے۔“ مگر اس کے چند ہی مہینوں کے بعد حیدرآباد کے سیاسی انقلاب کے بعد اس کتاب کے چھپوانے کا خیال جاتا رہا۔

دکن کی تاریخیں | اس سررشتہ سے مولانا سے پہلے فرینچ سیاح موسیو ٹیوریز کے سفرنامہ دکن کے دو حصے ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۷ء میں اور تاریخ دکن کے دو حصے ۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئے تھے، جن کا ذکر مکاتیب (صفحہ ۵۰) میں بھی ہے، مولانا کے زمانہ نظامت میں نظام اکبری ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد میں اور تاریخ دکن کی تیسری جلد آگرہ میں ۱۹۰۳ء میں چھپی۔

حیدرآباد کی سیاسی کشمکش اور مولانا کی دل برداشتگی ۱۹۰۲ء-۱۹۰۳ء | حیاتِ شبلی کے جو پچھلے صفحے آپ کی نظر سے گزرے ہیں، ان میں یہ چیز آپ کو ملی ہوگی کہ مولانا نے ہندوستان سے دکن کا رخ کس اضطراب اور گھبراہٹ کے عالم میں کیا تھا۔ یعنی اپنے والد کی وفات کے بعد جن مشکلات سے ان کو دوچار ہونا پڑا اور قرض کا جو بوجھ ان کے سر پر آکر پڑا، اس نے ان کو پریشان کر دیا اور اسی پریشانی کے عالم میں حیدرآباد چلے آئے، قدر شناسوں نے قدر کی اور ان کے اطمینان کے لیے ایک معقول جگہ کا انتظام کیا، مگر ابھی انتظام پوری طرح ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ سیاست کا مرکز بدل گیا اور بے اطمینانی کے اسباب پیدا ہو گئے، اس زمانہ میں انہوں نے چاہا کہ قرض کے بوجھ سے اب بھی کسی طرح سبک دوشی ہو جائے تو

۱۔ شروانی، ۱۷، ح ۲ شمس رحمت اللہ رعد، مالک مطبع نامی، کان پور، ۱۲، ح ۳ شروانی، ۲۸، ۲۹، ۳۰۔

ملازمت کی زنجیر کو پاؤں سے نکال دیں، ۵ فروری ۱۹۰۲ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں، ”میں اچھا ہوں مگر پریشان ہوں، یہاں برسوں میں ایک چیز کا فیصلہ ہوتا ہے، میرے سررشتہ اور دائرۃ المعارف پر ایک کمیشن بیٹھی ہے، اس کی رپورٹ پر فیصلہ ہوگا لیکن میں پہلے ہی یہاں کی سازشوں سے سخت گھبرا گیا ہوں۔

اگر دیہات بک کر قرض ادا ہو جاتا تو میں دو ہزار پر بھی یہاں کی بلکہ کہیں کی ملازمت نہ کرتا، میں نے ندوہ میں رہنے کا عزم جازم کر لیا ہے، دیکھیے یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے، مولوی سید علی بلگرامی ۸ مارچ کو ولایت روانہ ہوں گے۔“ (سج-۵۰)

دسمبر ۱۹۰۲ء میں ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے ذاتی کتب خانہ کو جو عظیم گڑھ میں ہے، فروخت کر کے قرض کے بوجھ سے سبک دوش ہو جائیں، اس کتب خانہ کا قدر دان ان کے خیال میں ان کے دوستوں میں ایک ہی شخص تھا، اس کو خط لکھا ”ایک راز کی بات کہتا ہوں، اپنے ہی تک رکھیے گا، آپ کو معلوم ہے والد قبلہ نے تیس ہزار قرض چھوڑا تھا، اس میں سے اب چھ ہزار اور رہ گئے ہیں، اس کے بارے میں غریب کی خاک چھانتا پھرتا ہوں اور کس کم بخت کو نوکری کی غرض ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنا کتب خانہ کل فروخت کر ڈالوں..... باقی تین ہزار کا اور کچھ سامان کر لوں گا، اگر یہاں (حیدرآباد میں) استقلال ہو جاتا، تو میں کل سامان کر لیتا، لیکن ہر نفس نفس واپس ہے۔“ (شروانی-۴۷)

نواب محسن الملک کی علی گڑھ کے لیے اس کشمکش میں نواب محسن الملک نے اس بات کی کوشش کوشش اور گورنمنٹ سے صفائی ۱۹۰۲ء کی کہ وہ کالج میں دوبارہ آجائیں، اس راہ میں سب سے بڑی مشکل مولانا سے گورنمنٹ کی ناراضی تھی، نواب صاحب ممدوح نے لفٹنٹ گورنر سے مل کر اس کی صفائی کر لی اور اس کی اطلاع مولانا شبلی کو بھی دی، مولانا لکھتے ہیں ”اس ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط آیا ہے، کہ وہ نواب لفٹنٹ گورنر سے ملے اور معلوم ہوا کہ لفٹنٹ صاحب نے میرے متعلق جو گورنمنٹ کو شکوک تھے، رفع کر دیے اور یہ بھی کہا کہ اب ان کو علی گڑھ کالج اگر بلانا چاہے تو بلا سکتا ہے، محسن الملک نے مجھ کو اس اطلاع کے بعد لکھا کہ کالج میں آ جاؤ، وظیفہ حیدرآباد بھی جاری ہو جائے گا اور سو روپیے کالج سے بھی ملیں گے لیکن میں نے منظور نہیں کیا اور کوشش میں تھا اور ہوں کہ وظیفہ جاری ہو جائے تو ندوہ میں آ جاؤں۔“ (شروانی-۴۱)

قرض سے نجات اور نوکری سے سبک دوشی کی کوشش | معلوم ہو چکا ہے کہ دسمبر ۱۹۰۲ء تک ان

پر چھ ہزار قرض کا بوجھ تھا مگر چند مہینوں کے بعد پانچ ہزار کسی طرح ادا ہو گئے اور صرف ایک ہزار رہ گیا، یکم جون ۱۹۰۳ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں ”خدا کا شکر ہے کہ قرض ہائے کثیر میں سے اب صرف ایک ہزار اور رہ گیا ہے، جس کو میں ماہ وار ادا کر رہا ہوں، باقی سب ادا ہو گئے، مجموعی قرضہ (والد مرحوم) کی تعداد تیس ہزار تھی۔“ (حمید-۲۰)

اس سے ایک گونہ ان کو اپنی پابندی کی زنجیریں ڈھیلی نظر آئیں اور اس خیال میں کہ ان کا سو روپیہ والا گزشتہ وظیفہ بحال ہو جائے تو وہ خود استعفا دے دیں اور زیادہ چٹنگی آگئی۔

ندوہ کی یاد | ۱۹۰۱ء میں مولانا ایک نئی ملازمت کی قید میں گرفتار ہو چکے تھے، اس لیے وہ اس سال بھی ندوہ کے سالانہ جلسہ میں جو ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶ شعبان ۱۳۱۹ھ مطابق ۶، ۷، ۸، ۹ دسمبر ۱۹۰۱ء کلکتہ میں ہوا تھا، شریک نہیں ہوئے لیکن انہوں نے ایک خط کے ذریعہ سے جلسہ میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ عنقریب سب چھوڑ چھاڑ ندوہ کے آستانہ پر آ بیٹھیں گے، یہ خط جیسا کہ کلکتہ کی روداد صفحہ ۱۰ میں چھپا ہے، حسب ذیل ہے: ”رخصت ملنے کی توقع نہیں، اس لیے شاید کلکتہ نہ پہنچ سکوں لیکن اب کی مرتبہ ندوہ میں اعلان کر دیجیے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانہ پر آ بیٹھوں اور اپنی تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کر دوں۔“

مولانا اپنے نچ کے خطوں میں تو بارہا اپنی اس خواہش کا ذکر فرما چکے تھے، مگر یہ پہلا موقع ہے کہ انہوں نے پبلک میں اس کا برسر عام اعلان کیا۔

شوال ۱۳۱۹ھ مطابق فروری ۱۹۰۲ء میں دارالعلوم ندوہ نے ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی اس کے ابتدائی تین درجوں کے بعد چوتھا درجہ متوسط سال اول کے نام سے کھلا اور شوال ۱۳۲۰ھ مطابق جنوری ۱۹۰۳ء میں متوسط کے دوسرے درجہ کا اور شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۳ء میں متوسط کے تیسرے درجہ کا افتتاح ہوا، دارالعلوم کے درجے پر درجے سال بہ سال کھلتے جاتے تھے اور مولانا کی دل چسپی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا لیکن نصاب درس کی ترتیب و ترمیم کے واسطے اب تک کوئی خاص مجلس نہ تھی، بلکہ جلسہ انتظامیہ اس خدمت کو خود ہی ان حضرات کے مشورہ سے جن کو تعلیم کا پورا تجربہ حاصل ہے، انجام دیتا تھا، ۱ یہاں خط میں تیس ہزار غلط چھپا ہے، تیس ہزار ہونا چاہیے۔ ۲ روداد ندوہ امرتسر باب ۲۰/۱۹۰۲ء نمبر ۳۰ روداد مدراس ۱۹۰۳ء، ص ۲۸۔

۱۳۱۹ھ-۱۹۰۲ء میں اس کام کے لیے ایک خاص مجلس قائم ہوئی تھی، جس میں مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی اور مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی جیسے تجربہ کار حضرات مقرر کیے گئے تھے اور اس مجلس کے معتمد مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی منتخب ہوئے تھے، اس میں خاص لحاظ کے قابل بات یہ ہے کہ اس میں مولوی شبلی صاحب کا نام نہیں، اسی زمانہ میں ندوہ کی طرف سے ایک ماہ وار رسالہ نکالنے کا خیال ہوا، مگر اس میں بھی مولانا سے مشورہ نہیں لیا گیا، یہ گواقتی بات ہوگی، مگر مولانا کو اس سے یہ شبہ ہوا کہ ندوہ کے کارکن میری شرکت نہیں چاہتے، اس بنا پر ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء کو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو انہوں نے لکھا ”ندوہ کی نسبت ہمیشہ میرا یہی خیال رہا اور سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لیے میں نے کالج چھوڑا تھا، گواقتی اتفاق کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہ ہوا۔

یہ تو میری حالت ہے، اب آپ لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جس کام پر میں نے برسوں غور کیا ہے، اس کے سامان بہم پہنچائے ہیں، اس کو اچھی طرح کر سکتا ہوں، اس میں بھی آپ ہاتھ لگانے نہیں دیتے، رسالہ ندوہ اور نصابِ تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپ نے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و نام و درمی مقصود ہوتی تو اس کے لیے علی گڑھ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پائے لیکن آپ لوگ ایسا ڈرتے ہیں کہ میں شریک ہوا اور میں نے مذہب کو اور طرزِ تعلیم کو الٹ دیا، بہر حال مجھ کو کسی کے ظن اور خیال پر اعتراض نہیں لیکن جب یہ کیفیت ہے تو بے فائدہ دخل در معقولات سے کیا حاصل ہے، مجھ کو اب ندوہ سے معاف کر دیجیے، مجھ سے صرف نقارچی کا کام لینا مقصود ہے تو اور بھی بہت لوگ ہیں، افسوس ہے ہم مسلمانوں کے قلوب کی یہ کیفیت رہ گئی ہے، اب کی جلسہ کے لیے میں نے سامان کر لیا تھا لیکن ایسے مجمع میں شرکت سے کیا فائدہ جہاں سب لوگ مجھ سے بدظن ہوں۔

اس خط کے جواب میں جناب مولانا شروانی نے غالباً یہ لکھا کہ ”اگر آپ ندوہ سے الگ ہوتے ہیں، تو میں بھی ہوتا ہوں“ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ”آپ کی اس علاحدگی سے ندوہ کو جو نقصان پہنچے گا، اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ چند ماہ کے بعد امرت سر میں ندوہ کا اجلاس ہوگا، اس میں دارالعلوم کے نصاب کے مسئلہ کو طے کر لیجیے“ اور یہ بھی لکھا کہ ”آپ حیدرآباد چھوڑ کر آئیں تو ساری مشکلیں حل ہوں“ اس کے

جواب میں ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں، میں نے یہ کب کہا کہ آپ بھی ندوہ سے علاحدہ ہوں، آپ پر ندوہ کو پورا اعتبار ہے، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں، اور آپ کو کرنا چاہیے، میرے لیے پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں حیدرآباد چھوڑ دوں اور یہ شرط خود آپ کے اس عنایت نامہ میں بھی درج ہے، نصاب کا کام لاہور سے انجام ہو سکتا ہے اور حیدرآباد سے نہیں ہو سکتا۔

میں ندوہ کا دشمن نہیں ہوں کہ اپنی علاحدگی سے اس کے نقصان رسانی میں مدد لوں، میں امرتسر آؤں گا لکچر میں کبھی لکھ کر نہیں دے سکا، اس لیے اگر زبانی منظور ہو تو حاضر ہوں ورنہ معاف۔ ندوہ میں جو لوگ میرے خلاف ہیں، ان میں خود میرے ہم وطن اور عزیز بھی ہیں اور جس وجہ سے خلاف ہیں اس سے بھی میں واقف ہوں لیکن ان باتوں کی طرف توجہ کرنے سے کیا حاصل، البتہ آپ سے تعجب ہے کہ ہر قسم کے کام کے لیے ترک معاش کی شرط کو ضروری قرار دیں۔“

اس کے ایک مہینہ کے بعد ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا، ندوہ کا یہ سب سے پہلا جلسہ تھا جس میں مولانا نے اپنے خیالات کو ایک نالہ موزوں کی شکل میں پیش کیا جو سراپا درد ہے، یہ فارسی ترکیب بند تھا، جو پہلے ہی نہایت اہتمام سے نسی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی میں چھپوایا گیا تھا، پہلے ہی اجلاس میں روداد کے بعد مولانا اپنا یہ ترکیب بند سنانے کو کھڑے ہوئے، اس کا مطلع تھا:

ایکہ پرسی چہ کسانیم و چہ ساماں داریم انچہ با تہج نیزد بجاہاں آں داریم

اس ترکیب بند میں سات بند ہیں، پہلے دو بندوں میں علما کی قناعت و فضیلت کا بیان ہے، تیسرے اور چوتھے میں مسلمانوں کے زوال کی تصویر ہے، پانچویں اور چھٹے میں نئی تعلیم کے نقائص کا بیان ہے اور ساتویں میں ندوہ کے مقاصد کی تشریح ہے، یہ ترکیب بند جس وقت جلسہ میں پڑھا گیا ہے، حاضرین کی کیفیت کیا ہوئی، اس کا مختصر بیان اس جلسہ کی روداد میں مذکور ہے ”شیخ عبدالقادر صاحب صاحب بی اے (موجودہ سر شیخ عبدالقادر) جس وقت اپنی تقریر تمام کر چکے معزز حاضرین نے بے چینی سے شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی کی طرف نگاہیں دوڑائیں، و فو رشوق اور شدت انتظار کے جھرمٹ میں مولوی صاحب ممدوح اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنا ترکیب بند ایسے موثر اور درد انگیز لہجہ لے لیا اشارہ مفتی عبداللہ صاحب ٹوکی رکن مجلس نصاب کی طرف ہے، جولاہور میں رہتے تھے۔

میں پڑھا جس کو سنتے وقت سامعین ہمدن گوش اور سراپا حیرت بن گئے تھے، خصوصاً دو بنداول کے کچھ ایسے پڑھے گئے جنہوں نے علما پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دی اور جہاں تک دریافت ہوا ہے، اس کا مزہ اب تک لوگ نہیں بھولے، اس ترکیب بند پڑھنے سے پہلے مولوی صاحب نے ایک مختصر تقریر بھی کی تھی اور درمیان میں بھی جا بہ جا حالت اور موقع کے مناسب تقریر کرتے جاتے تھے، جس سے سامعین کو زیادہ لطف آتا تھا، اس ترکیب بند کو مولوی صاحب نے کانپور میں چھپوایا تھا، جس کی ۱۰۰ کاپیاں اس وقت موجود تھیں، ان کو حاضرین نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔ (ص-۳۸)

زیارت کا پہلا موقع | یہ (۱۹۰۲ء) پہلا موقع ہے کہ میرے (راقم الحروف) ہوش و حواس کے کانوں نے مولانا شبلی کا آواز سنا، امرتسر سے جب مولانا واپس ہوئے تو لکھنؤ آ کر ٹھہرے اور میں نے سب سے پہلی دفعہ ان کی زیارت کی، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی اس وقت دارالعلوم میں مدرسِ اعلا تھے، وہ بھی امرتسر تشریف لے گئے تھے وہ واپس آئے تو شاگرد (مولانا شبلی) کے اس ترکیب بند کے ان چند شعروں سے بہت خفا تھے، جن میں فلسفہ قدیم پر اور علما کی جدید فلسفہ سے بے خبری پر تعریف تھی:

تاچہ سودت دہداں فلسفہ عہد قدیم تاچہ سودت دہداں ہیئت پارینہ نہاد

از عناصرہ و شصت آمدہ ایک بہ شمار تو ہماں درگرد آتش و آبستی و باد

ہم لوگ اس وقت مولانا فاروق صاحب سے فلسفہ و منطق کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے، پھر بھی وہ ہم لوگوں کے سامنے بڑے جوش سے ان ۶۳ عناصر کے نظریہ کی تردید فرماتے تھے، اور سمجھاتے تھے اور خیال آتا ہے کہ اس کے جواب میں چند شعر بھی کہے تھے۔

بجانب میں اس زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوؤں کی وجہ سے ختم نبوت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، شاید اسی سبب سے مولانا نے اپنی تقریر کا موضوع ”ختم نبوت“ قرار دیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اس موضوع پر تقریر کریں، حسب دستور ندوۃ العلماء کی ضرورت پر ایک مدلل تقریر فرمائی، جو روداد میں مذکور ہے، اس تقریر میں جدید اور قدیم دونوں گروہوں کو مخاطب کر کے ندوہ کی ضرورت ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ اب ایک ایسی درس گاہ کی ضرورت ہے جو نیا علم کلام پیدا کرے اور علما کو نئے علوم و فنون کی تعلیم دے۔

۱۔ راقم الحروف شوال ۱۳۱۹ھ مطابق فروری ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوا تھا۔

اس تقریر میں وقت اتنا گزر گیا کہ مولانا نے چاہا کہ وہ ختم نبوت والی تقریر کو چھوڑ دیں، مگر حاضرین کے بے حد اصرار سے ختم نبوت پر تقریر شروع فرمائی، روداد میں ہے ”شش العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی چاہتے تھے کہ صرف اسی تقریر پر اکتفا کریں، مگر حاضرین جلسہ کے بے حد اصرار سے ”ختم نبوت“ پر تقریر شروع فرمائی جس پر واز پر تقریر فرما رہے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تقریر نا تمام رہے، باوجودیکہ ایک گھنٹہ صرف اسی عنوان پر تقریر فرماتے رہے مگر تقریر کے بعض بعض حصے چھوٹ گئے، بعض مجمل طریقے پر بیان ہوئے، تاہم جس قدر بیان ہوئے وہ ایسا فاضلانہ مضمون تھا جس کے سننے کے لیے سامعین ہمدن گوش ہو رہے تھے اور اس عالم خاموشی میں بھی حسن بیان کا یہ اثر تھا کہ سبحان اللہ اور جـ ذاک اللہ کی صداؤں سے تمام ہال گونج جاتا تھا، افسوس ہے کہ اردو میں اب تک آواز نویسی کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا، اس وجہ سے ایسی دلاویز تقریریں اسی وقت تک کے لیے ہوتی ہیں، جب تک ان کی آواز کانوں میں گونجتی رہی، یہ تقریر اس قابل تھی کہ حرفاً حرفاً قلم بند کی جاتی مگر باوجود کوشش کے نہیں ہو سکی، جس قدر حصے قلم بند ہوئے وہ ایسے نامربوط ہیں جن میں زیادہ لطف نہیں آ سکتا، مولوی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس تقریر کو مستقل رسالہ کی صورت میں قلم بند کر دیں گے۔“ (ص-۱۰۸)

افسوس ہے کہ مولانا کا یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا اور حقائق و معارف کے ایک بحرِ خازن کی موجیں پیدا ہو کر فنا ہو گئیں، اسی زمانہ میں ”ویکیل“ امرتسر میں اس کے نا تمام خلاصے جلسہ کی روداد کے ضمن میں چھپے تھے، مگر اس وقت وہ نا تمام خلاصے بھی سامنے نہیں۔

تبدیلِ نصاب کی کوششیں ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء | امرتسر میں علما کی مجلسِ خاص میں نصاب کے مسئلہ پر نہایت طولِ طویل بحثیں ہوئیں اور بالآخر مولانا کی جیت ہوئی اور کثرتِ رائے سے درسِ نظامی میں ترمیم منظور ہوئی اور اصولی طور سے بعض اصول طے ہوئے، جن کا ذکر مکاتیبِ شبلی میں ہے، مگر اس پر بھی ندوہ میں وہی پرانا نصاب عملاً جاری رہا، جس پر ۲۲ جون ۱۹۰۳ء کو مولانا نے ناظمِ مجلسِ نصاب مولانا شروانی کو لکھا ”آج ایک نقشہ نصابِ جاریہ دارالعلوم ندوہ کا آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں، ملا جلال، شرح جامی، فضولِ اکبری، کافیہ، میبذی، شافیہ۔ (۴۸)

مکرمی! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنا سکیں گے، آپ نصاب کے ناظم ہیں، کیا اس لیے؟ مانا کہ نصاب کے متعلق بعض چیزوں میں

اختلاف تھا لیکن جن میں اتفاق تھا وہ کہاں ہیں، مدرسوں کو کہیے کہ یہ کیا کر رہے ہیں، افسوس، افسوس!“ پھر ان ہی کو جولائی ۱۹۰۳ء میں لکھتے ہیں، میں نے مدرس اعدا دارالعلوم کو نہایت سخت خط لکھا تھا کہ قدیم نصاب کیوں پڑھایا جاتا ہے، امرتسر میں جو طے ہوا وہ کیوں نہیں پڑھایا جاتا، وہاں سے جواب آیا، کہ جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھلایا تک نہیں گیا، ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں، آپ نے مدرسہ میں غالباً نصاب نہیں بھیجا جس کی وجہ یہ ہوگی کہ نصاب میں کچھ اختلافات تھے لیکن بہر حال کچھ کتابیں متفق علیہ عام تھیں، ان کی اطلاع تو آپ کو دینی چاہیے تھی، یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ کیٹیٹی نصاب کے ناظم اور آج تک وہی اندھیرے؟

خدا کے لیے فوراً دارالعلوم کے نصاب مقررہ سے مطلع کیجیے اور تاکید کیجیے کہ اس کو درس میں رکھیں جو کتابیں مختلف فیہ ہوں، ان کو رہنے دیجیے۔“ (۵۰)

پھر اسی زمانہ میں ان کو دوبارہ لکھتے ہیں ”جلسہ انتظامیہ میں یہ تو اصولاً طے ہو گیا تھا کہ کسی علم کو مخلوط کر کے نہ پڑھایا جائے، اس سے شروع مسلم وغیرہ خود خارج ہوتی ہیں، اس کے علاوہ میں تو یہ ہوں کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ مثلاً کتب ذیل کی نسبت تمام ممبروں سے پوچھیے کہ درس میں رکھی جائیں یا نہیں، شافیہ، فضول اکبری، شرح ملا، ملاحسن، میرزاہد، ملا جلال وغیرہ۔

تمہید میں یہ وجہ لکھیے کہ زمانہ درس کا اختصار ضروری ہے، اسی کے ساتھ ہر فن کی ایسی کتابیں جو تمام مسائل کو حاوی ہوں اور اس میں دوسرے علوم کی بحثیں بیچ میں نہ آئیں، میں پوچھتا ہوں کہ آخر جب ندوہ بھی دیوبند ہے تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جا رہا ہے۔

مولانا شروانی کے اس جواب پر کہ نصاب مجوزہ پر ابھی تک ارکان کا پورا اتفاق نہیں ہوا، ۱۳ ستمبر ۱۹۰۳ء کو رقم فرماتے ہیں: ”مسلمان سود بے تکلف دیتے ہیں لیکن لیتے نہیں، حرام دونوں ہیں لیکن پہلی صورت میں چوں کہ نقصان ہے، اس لیے اس کے مرتکب اور دوسری صورت میں چوں کہ فائدہ ہے اس لیے اس سے اجتناب ہے، بعینہ یہی حالت ندوہ کی ہے اور ایک خاص حصہ کے متعلق یہ حالت آپ کی وجہ سے ہے۔ ندوہ میں سیکڑوں امور بے ضابطہ ہوتے رہتے ہیں، اس کی تو کچھ پرس و جو نہیں لیکن نصاب کی نسبت آپ کو اس قدر ضابطہ کی پابندی ہے کہ ایک ایک حرف پر سب کا اتفاق جب تک نہ ہو لے کچھ کیا نہیں جاسکتا۔

مکرمی! اس طرح کام نہیں چلتا، سید صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا، امرتسر میں اصولی مراتب طے ہو چکے تھے، مثلاً یہ کہ مخلوط الفتن کتابیں خارج کردی جائیں گی، اس کے مطابق آپ ملا حسن، میرزاہد، حمد اللہ، قاضی کونورا خارج کر سکتے ہیں، شرح ملا وغیرہ بہ تصریح خارج ہو چکی ہیں، میں مدرسین کو لکھتا ہوں تو وہ لکھتے ہیں کہ بغیر معتمد کے حکم کے ہم کیوں کر تبدیلی کریں، آپ فوراً لکھ بھیجئے کہ فلاں فلاں کتابیں موقوف اور ان کے بجائے فلاں فلاں کتابیں اور اگر آپ اتفاق کی راہ دیکھتے رہے تو خدا کی قسم قیامت تک کچھ نہ ہوگا، ایسی حالت میں معتمدی نصاب کا نام کیوں بدنام کیجئے۔“ (۵۲)

۱۲ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو پھر انہیں ایک مفصل خط لکھا، جس میں فرماتے ہیں ”آپ کی اس تحریر سے کہ آپ غزل گوئی کی تاریخ لکھ رہے ہیں، نہایت خوشی اور انبساط ہوتا لیکن اسی خط میں وہ ناپاک اور نجس کورس بھی تھا، جو ندوہ میں جاری ہے۔“

میرے محبوب! کیا آپ کا یہ کام تھا کہ سال بھر سے وہ کتابیں جو قطعاً امرتسر میں خارج کردی گئی تھیں، جاری رہیں اور آپ مکمل نصاب کے متفق علیہ ہونے کا انتظار کرتے رہیں، خیر اب سنیے۔

۹۔ درجہ متوسط سال سوم میں سے ملا حسن، میرزاہد، رسالہ میرزاہد، ملا جلال، قاضی مبارک، صدر، سب خارج کر دینا چاہیے، ان کے بجائے شرح مطالع کے بعض حصے، حمد اللہ، شرح ہدایۃ الحکمت از خیر آبادی، رسائل ابن رشد مطبوعہ مصر، حماسہ، اعجاز القرآن باقلانی اور ہدایۃ معاملات (بشرط گنجائش) ہونا چاہیے۔

درجہ متوسط سال دوم میں سے میہدی (یہ سب سے زیادہ نا لائق کتاب ہے) شرح عقائد نسفی، تصریح الافلاک خارج ہونی چاہیے، موطن امام محمد، سبغہ معلقہ، جلالیس قائم رہنا چاہیے، اور رسائل اربعہ امام غزالی، الفوز الاصفیٰ ابن مسکویہ مطبوعہ بیروت جو لکھنؤ میں بھی مطبع یوسفی میں مل سکتی ہے، پڑھانا چاہیے۔

درجہ متوسط سال اول میں مشکوٰۃ کی ضرورت نہیں، مختصر معانی قطعاً خارج کر دینا چاہیے اور حسن التوسل فی صناعت التوسل کا مطبوعہ مصر اس کے بجائے رکھنا چاہیے، منقحی الا بحر کی بھی ضرورت نہیں، دیوان ابوالعتاہیہ اس میں اضافہ کرنا چاہیے۔

درجہ ابتدائی سال سوم تخصیص اور دیوان علی (جو محض موضوع ہے) بالکل خارج، مشکوٰۃ کی بھی ضرورت نہیں، حدیث کافن مستقل اخیر میں رکھا جائے گا۔

درجہ ابتدائی سال دوم اور سال سوم سے شافیہ، کافیہ، شرح جامی قطعاً خارج، ان کی جگہ اس درجہ میں ہدایہ الخولا نا چاہیے، اور مفصل زنجیری اضافہ کرنا چاہیے، نیز کلیلہ دمنہ ابن المقتفع مطبوعہ بہمنی۔ لیکن خدا کے لیے پھر پینچایت پر معاملہ نہ اٹھا رکھیے گا، کوئی کتاب نئی قائم کی جائے خواہ نہ کی جائے لیکن کافیہ، شافیہ، شرح جامی، میرزا ہد، ملا حسن، ملا جلال، قاضی، یہ تو قطعاً نکلوا دیجیے، خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ندوہ کے تمام وعدوں کا خدا کے ہاں ہم اور آپ کیا جواب دیں گے۔“

اس ساری خط و کتابت اور سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ اصلاحِ نصاب کے ہفت خواں کو مولانا مرحوم نے کن مشکلوں سے طے کیا اور عربی تعلیم کے لیے ایک نئے راستہ کی تجویز منوانے میں ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔

ندوہ کا انتشار | اس زمانہ میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی صاحب ندوہ کی نظامت کی خدمت کے بار سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے، کئی سال سفر حجاز میں رہے، ۱۳۲۱ھ-۱۹۰۳ء میں مولانا سید الزماں خاں صاحب شاہ جہاں پوری ان کے قائم مقام ہوئے اور ندوہ کا دفتر شاہ جہاں پور کو منتقل ہوا اور اسی سال ۱۷ شعبان ۱۳۲۱ھ-۱۹۰۳ء میں دارالعلوم کی معتمدی اور نگرانی جناب منشی محمد اطہر علی صاحب رئیس کا کوری کو سپرد ہوئی، یہ زمانہ ندوہ کے سخت انتشار کا تھا اور مولانا شبلی مرحوم اس زمانہ میں جھلّا جھلّا کر ندوہ کے دوستوں کو سخت خط لکھتے رہے۔

ندوہ کا سالانہ اجلاسِ مدراس میں شوال ۱۳۲۱ھ جنوری ۱۹۰۴ء | خوش قسمتی سے آئندہ سال ۱۳، ۱۵، ۱۶ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۳، ۵، ۷ جنوری ۱۹۰۴ء میں ندوہ کا سب سے پہلا اجلاسِ مدراس میں ہوا جس میں دوسرے عمامہ کے علاوہ مولانا شبلی بھی شریک ہوئے، بلکہ اس کے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۷ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۶ جنوری ۱۹۰۴ء کی صدارت بھی کی، پروگرام میں (سر) شیخ عبدالقادر لاہوری کی تقریر کے بعد خود مولانا کی تقریر کا وقت تھا اور موضوع وہی تھا جو ان کے دل سے لگا تھا، یعنی دارالعلوم کی ضرورت، ۱۷ روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۳۰، منشی صاحب موصوف کچھ دنوں تک دارالعلوم کی نگرانی کا فرض اس طرح ادا کرتے رہے کہ باوجود رئیس ہونے کے خود دارالعلوم کے محکم میں آکر رات کو آرام فرماتے تھے، ۳۰ رمضان ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۷ نومبر ۱۹۰۶ء کو وہ حج بلکہ ہجرت کے ارادہ سے حجاز کو روانہ ہوئے اور وہیں مدینہ منورہ میں ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹ کو وفات پائی اور جو ارحمت میں جگہ پائی، ان کی وفات پر میرا ایک عربی مرثیہ میرے عربی دیوان میں ہے۔ ج روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۸۱۔

روداد کے الفاظ یہ ہیں، اس (شیخ عبدالقادر کی) تقریر ختم ہونے پر پہلے سے کچھ زیادہ شوق اور بے چینی کے آثار جلسہ میں پیدا ہو گئے، ہر شخص کے ہاتھ میں جلسہ کا نظام تھا اور صدر نشین کی طرف نگاہیں تھیں، کیوں کہ یہ وقت جلسہ کے صدر نشین مولانا شبلی نعمانی کی تقریر کا تھا اور آپ دارالعلوم کی ضرورت پر بیان فرمانے والے تھے، مولانا ممدوح کھڑے ہوئے، ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، جس میں چند عنوانات لکھے ہوئے تھے، حسب عادت ممدوح نے یہ تقریر پہلے سے قلم بند نہیں فرمائی تھی۔

اسی سلسلہ میں مولانا شبلی نے یہ تحریک فرمائی کہ دارالعلوم کی تعمیر میں ایک کمرہ صرف علما کے چندہ سے بنے، جناب ملا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی نے اس کی تائید کی، چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی، مولانا شبلی، مولانا مسیح الزماں خاں، مولوی ضیاء الدین صاحب، ملا عبدالقیوم صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب صوبہ دار گلبرگ، مولوی احمد علی الدین صاحب مدراس نے سوسورویسے، مولوی عبدالرب صاحب خواہر زادہ ملا عبدالقیوم نے ڈھائی سوا اور باقی علما نے دس بیس پچیس کے چندے لکھوائے۔

مدراس کے جلسہ سے یہ فائدہ ہوا کہ مولانا کو ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم اور دوسرے ارکان سے دو بدو گفتگو کرنے کا موقع ملا اور باہمی غلط فہمیاں دور ہوئیں، نصاب کا مرحلہ طے ہوا کہ ملا عبدالقیوم مولوی سید عبدالحئی صاحب اور مولانا شبلی باہم مل کر بنائیں، اندوہ کی تجویز بھی مکمل ہوئی اور مولانا کا نام اڈیٹروں میں شامل ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے دفتر ہٹانے کی وجہ کیا تھی؟ مولانا شردانی کو ۱۲ جنوری ۱۹۰۴ء کو لکھتے ہیں ”مدراس میں جو کچھ ہوا وہیں کے لیے ہوا، دارالعلوم یا ندوہ کو دو چار سو بھی ہاتھ نہیں آئے، میں نے اس دفعہ مولوی مسیح الزماں صاحب وغیرہ کو الگ جلسہ میں بلا کر ختم گفتگو کی، یعنی اگر چلانا ہے تو ٹھیک طرح سے چلائیے، ورنہ کم سے کم میں الگ ہو جاتا ہوں، مولوی مسیح الزماں صاحب نے صاف کہا اور مولوی عبدالحئی صاحب وغیرہ نے بھی موافقت کی کہ دارالعلوم جب تک شہر لکھنؤ میں منشی اطہر علی کے زیر اثر ہے کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم نے دارالعلوم ان کے سر مارا، باقی اشاعت اسلام کا کام شاہ جہاں پور میں انجام دوں گا، مولوی عبدالحئی صاحب نے یہ بھی

۱۔ روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۹۶ ۲۔ جناب ملا عبدالقیوم حیدرآبادی علما میں تھے اور سرکار نظام میں متعدد ذمہ دار و معزز عہدوں پر سرفراز ہے، جناب مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہ جہاں پوری استاذ حضور نظام کے برادر نسبتی یعنی سالے تھے، نہایت روشن خیال تھے، دائرۃ المعارف دکن کی تالیس میں ان کا ہاتھ بھی شامل تھا، اس زمانہ میں کانگریس کے بڑے حامیوں میں تھے۔ ۳۔ روداد مدراس ۱۹۰۴ء، ص ۹۷۔

بیان کیا کہ مولوی حبیب الرحمن صاحب سے بار بار نصاب مانگا گیا لیکن وہ نہیں بھیجتے نہ تمام لوگوں کو آپ سے سخت شکایت تھی، لوگ کہتے تھے کہ ویسا ہی مسودہ بھیج دینا تھا۔

میری بھی یہ رائے ہے کہ جس کام کو آپ قلت فرصت یا اور کسی وجہ سے نہ کر سکتے ہوں اس سے استعفا دینا بہتر ہے، ورنہ محض انتساب کے فخر سے کیا حاصل۔

رسالہ کے لیے اب تک مولوی مسیح الزماں صاحب درخواست دینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔

پھر ۲۲ جنوری ۱۹۰۴ء کو لکھتے ہیں ”خانہ ملاب در چین است و کشتی در فرنگ۔“

میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا وہ دفتر میں پڑا رہا، ناظم نے مدراس میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی، آپ کا نصاب بھی پونہ کی کہیں پڑا تھو کریں کھاتا ہوگا، منشی صاحب مہتمم ہیں، نصاب ان کے پاس کیا ہوگا، وہ کیا کر سکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوگا ع اب کی بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے۔

مولوی عبدالحی صاحب کے دو عملہ قیام کی وجہ سے خط نہ لکھنے کے پتہ سے پہنچتا ہے نہ شاہ جہاں پور کے پتہ سے، آپ اتنا کیجیے کہ فوراً ناظم صاحب کو خط لکھ کر ہدایت کیجیے کہ نصاب منگوا کر جاری کر دیں، یا فیصلہ اخیر کے لیے میرے پاس بھیج دیں، کیوں کہ جلسہ انتظامیہ مدراس میں یہی طے پایا تھا کہ فیصلہ اخیر کے لیے نصاب میرے پاس بھیج دیا جائے تاکہ ارکان ندوہ موجودہ حیدرآباد سے اس کا فیصلہ کرایا جائے جلدی فرمائیے دیر کی حد ہو چکی، ورنہ یہ سال بھی آپ کی نذر ہوگا۔“ (شروانی)

مولانا نے اس سال یہ عزم کر لیا کہ دارالعلوم میں نیا نصاب جاری کر دیا جائے اور کچھ دن لکھنؤ رہ کر دیکھیں کہ دارالعلوم میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور ان کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟ چنانچہ ۵ ستمبر ۱۹۰۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا ”ندوہ کا اب نفس واپس نظر آتا ہے، اس بنا پر بہ طور حرکت ندوہ جی کے یہ ارادہ ہوتا ہے کہ دو مہینہ کی رخصت لے کر لکھنؤ آؤں اور کم از کم دو چیزوں کو درست اور جاری کر دوں، نصاب اور رسالہ ماہانہ، اس کے سوا عام تدابیر بھی سوچی جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کم از کم ایک مہینہ لکھنؤ میں آکر رہیں، میں بغیر آپ کے کچھ کام نہیں کرنا چاہتا اور نہ کر سکتا۔

اگر آپ اپنے کام کا ذاتی ہرج کر کے آسکیں تو فوراً لکھیے، ورنہ ندوہ کو الوداع کہیے، میرا اس وقت آنے میں سخت نقصان ہے، تنخواہ کی لمجرائی الگ، میری ملازمت کے استقلال کا مسئلہ اس وقت

۱۔ مکاتیب میں ۱۹۰۲ء غلط چھاپا ہے۔ ۲۔ جناب منشی اطہر علی صاحب مرحوم ۳۔ مکاتیب میں ۱۹۰۲ء غلط چھپ گیا ہے۔

پیش ہے، اس کو چھوڑنا الگ نقصان رساں ہے، زنا نہ کا الگ کبھی ٹرا ہے لیکن غالباً ان سب کو میں برداشت کر سکوں گا، آپ فوراً جواب دیجیے۔ *

میں مدت قیام لکھنؤ میں ہر روز کسی فن پر طلبہ کے سامنے لکچر بھی دوں گا، قدمائے طریقہ پر

(شروانی-۴۲)

اسی خیال سے اواخر ستمبر ۱۹۰۳ء میں وہ حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور دو تین ہفتے دارالعلوم کی پرانی عمارت میں جو گولہ گنج میں واقع ہے اور اب ”خاتون منزل“ کے نام سے مشہور ہے، اس کمرہ میں جو اب ہمارے دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی فرود گاہ ہے، قیام فرمایا اور ۲۸ ستمبر ۱۹۰۳ء کو مولانا شروانی کو لکھا ”میں ندوہ میں آ گیا ہوں، میری عیادت اور مہمات امور کے طے کرنے کے لیے فوراً تشریف لائیے اور ہفتہ دو ہفتہ یہاں قیام کیجیے۔“

مولانا شروانی اس وقت نہ آسکے اور تب مولانا مقیم رہے یہ پہلا موقع تھا کہ خاک سار اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، مولانا کے حلقہ میں بیٹھے اور مولانا نے اپنی بزرگانہ شفقت سے نوازا، مولوی محمد امین صاحب، خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوئی بھی اپنے والد بزرگ وار کے ساتھ ان دنوں ندوہ میں ٹھہرے تھے، وہ بھی حاضر رہتے تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے مولانا سے مجھے روشناس کیا، نومبر کے آخر میں جب وہ حیدرآباد واپس گئے تو میرے ایک عزیز نے میری صلاحیت کی نسبت ان سے دریافت کیا تو جواب میں ۲۷ نومبر ۱۹۰۳ء کو وہ فقرہ لکھا جو میرے لیے ہمیشہ طغرائے فخر ہے، ملازمت نے مجھے حیدرآباد آنے پر مجبور کیا، مولوی سید سلیمان چند روز تک میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا، وہ جوہر قابل ہیں۔“ (عبدالحکیم-۱)

اب مولانا نے دارالعلوم کو دیکھ بھال کر حیدرآباد سے قطع تعلق کر کے قیام ندوہ کی تجویز پر عمل کرنے کا عزم فرمایا، مگر ابھی تصفیہ حالات کے لیے انتظار کے چند مہینے باقی تھے۔

انجمن ترقی اردو کی نظامت جنوری ۱۹۰۳ء | کوئی غیر قوم جب کسی دوسرے ملک پر حکومت کرتی ہے تو اس کی سلطنت کا سب سے کام یاب و صول یہ ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کے افراد اور طبقوں میں اختلافات پیدا کر دے، ہندوستان کے مسلمان اور ہندو صدیوں کی جنگ و جدل اور لڑائی بھڑائی کے بعد وحدت ملکی کی ایک سطح پر آ گئے تھے، جن کا لباس قریب قریب ایک تھا، تمدن یکساں ہو گیا تھا، زبان

ایک ہو گئی تھی، مگر انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا کام یہ کیا کہ فارسی کو سرکاری دفتروں سے خارج کر کے اردو کو اس کی جگہ دی، اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر اردو کے ساتھ ایک نئی زبان کا لہجہ تیار کیا اور اس کا نام ہندی رکھا، پہلی مسلمانوں کی اور دوسری ہندوؤں کی زبان قرار دی، اختلاف کا یہ اثر آگے کو پھیلا اور رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھا گیا۔

۱۸۶۶ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ذریعہ ملک میں دیسی زبان کی ایک یونیورسٹی کی تحریک کی، اس وقت اردو سرکاری زبان تھی، اس لیے ظاہر تھا کہ دیسی یونیورسٹی کے معنی اردو یونیورسٹی کے تھے، یہ سمجھ کر بعض ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر اردو کی کوئی یونیورسٹی بنے تو ہندوؤں کے لیے ہندی کا انتظام کیا جائے، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی یونیورسٹی کی تجویز ناکام رہی۔

اس کے بعد صوبہ بہار اور صوبہ متحدہ کے ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ سرکاری دفتروں میں ہندی رائج کی جائے، بہار میں ان کی یہ تجویز کامیاب ہوئی، یہ دیکھ کر صوبہ متحدہ کے ہندوؤں نے ایک محضر تیار کر کے اس پر ہندوؤں کے دستخط کرانے شروع کیے، سرسید نے اردو کی حمایت کے لیے ۹ ستمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں ایک سنٹرل کمیٹی بنائی اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں قائم کرنے کی تجویز کی، اس کے جواب میں ۱۸۷۳ء میں علی گڑھ میں بھاشا سمر دہن سہا بنائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بہ جائے ہندی زبان اور ناگری حروف کا رواج ہو۔

ہندی پسند ہندوؤں کی یہ کوششیں برابر جاری رہیں، یہاں تک کہ سرانٹونی مگنڈل جو صوبہ بہار میں سوپلیٹن رہ چکے تھے، اس صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے، وہ ہندی کی محبت صوبہ بہار سے لے کر یہاں آئے تھے، انہوں نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں ایک سرکاری فرمان جاری کیا جس کے ذریعے عدالتوں میں ناگری حروف کی اجازت دے دی گئی، اس اجازت سے اردو کے حامیوں میں عام بے چینی پھیل گئی، ۲۹ اپریل ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں اردو ڈیفنس سنٹرل کمیٹی بنی اور ۱۲ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں نواب لطف علی خاں بہادر رئیس چھتاری کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا اور نواب محسن الملک نے جواب سرسید کے بعد ان کے قائم مقام تھے، ایک مؤثر تقریر کی اور طے پایا کہ حکومت میں ایک یادداشت بھیجی جائے۔

اس کے بعد لکھنؤ میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اہتمام سے ۸ اگست ۱۹۰۰ء کو پرانے درمالا بیری ہال میں ایک بڑا شاندار جلسہ ہوا جس میں مختلف مقامات

سے بہ کثرت نمایندے آکر شریک ہوئے اور بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں، اس جلسہ میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو اور عیسائی بھی شریک تھے، ان اختلافی جلسوں اور تجویزوں سے نقشہ گورنر صاحب کے مزاج گرامی کو بڑی برہمی ہوئی اور اردو کے بہت سے حامی معتوب بارگاہ ٹھہرے اور آخر اس عتاب کی تاب نہ لا کر اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کو زندہ دفن کر دیا۔

آخر دسمبر ۱۹۰۲ء اور اوائل جنوری ۱۹۰۳ء میں شاہی دربار کے موقع پر دہلی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا، اس میں کانفرنس کے متعدد شعبے قائم ہوئے، جن میں سے ایک اردو کا شعبہ بھی تھا، جس کا نام انجمن ترقی اردو پڑا، اس شعبہ کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے:

صدر: مسٹر آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔

نائب صدر: شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب

نائب صدر: شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب

نائب صدر: شمس العلماء مولوی الطاف حسین صاحب حالی

سکرٹری: شمس العلماء شبلی نعمانی

مولانا نے اجلاس کے بعد فوراً ہی حیدرآباد دکن میں بیٹھ کر ترقی اردو کا کام شروع کر دیا، احباب کو خطوط لکھے، دوستوں سے رکنیت کی فرمائشیں کیں، عربی فارسی و انگریزی سے لایق ترجمہ کتابوں کا انتخاب کیا، مترجموں کو مقرر کیا، اخباروں کے ایڈیٹروں کو انجمن کا رکن اشاعت بنایا، متعدد مصنفوں نے اپنی کتابیں انجمن کو بھیجیں اور بعض نے تکمیل کے بعد بھیجنے کا وعدہ کیا، اس زمانہ میں انجمن کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینہ اس کی رپورٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں چھپتی تھی اور ملک میں اردو کے متعلق اس قدر جوش پیدا ہو گیا تھا کہ اخبار ہندوستانی لکھنؤ نے جس کے ایڈیٹر گنگا پرشاد دورما تھے، یہ شکایت چھاپی کی کہ انجمن نے اردو کے کام میں ہندو جماعت کو علاحدہ رکھا، اس پر سکرٹری (مولانا شبلی مرحوم) نے اخباروں میں یہ تحریر شائع کی کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو اردو تصنیف پر دیا، وہ ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد دورما) کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی، یعنی کتاب پیغمبران ہند

۱۔ یہ کتاب انجمن کی طرف سے ”رہنمایان ہند“ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

”جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد ہیں۔“
اس تحریر کا اثر یہ ہوا کہ بعض ہندو بزرگوں نے بھی انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اس کی
ممبری قبول کی۔

اس زمانہ میں فلسفہ اور سائنس کی کتابیں اردو زبان میں بہت کم تھیں، اس لیے ان علوم کی
ابتدائی اور سہل کتابیں ترجمہ کے لیے انتخاب کی گئیں، مگر افسوس ہے کہ لائق مترجم نمل سکے، چنانچہ ۱۳
اگست ۱۹۰۳ء کو مولانا شبلی نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں ”یہ مہینہ مشہور کتابوں کے ترجمہ کے امتحان کا
مہینہ تھا، جو کچھ ظہور میں آیا اس سے قومی مسائل کے متعلق مہتمم بالشان نتیجے حاصل ہوئے ہیں، جس
وقت انجمن کی تجاویز ملک میں شائع ہوئی تھیں، تو اطراف ہند سے اس قدر درخواستیں آئی تھیں کہ گمان
ہوتا تھا کہ ہندوستان عباسیوں کا بغداد بن گیا ہے لیکن جب مقررہ کتابوں کا اشتہار چھپا تو ہر طرف سناٹا
تھا، کتاب النبائات اور طبقات الارض کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگا، کتاب الروح کا صرف ایک ترجمہ اور
سولسٹم کے تین ترجمے آئے، آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ مترجمین انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں،
لیکن بہ جز ایک کے تمام ترجمے ناقص اور اہتر ہیں، کیا اس نتیجہ کے بعد بھی ہمارا قومی کالج علی گڑھ سائنس
اور عربی زبان کی تعلیم پر خاص توجہ مبذول نہیں کرے گا.....؟“

انجمن کا پہلا سال بہت کامیاب رہا، کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی تھیں کہ ان کے خریداروں
کی تعداد ۱۰ سے زیادہ ہو گئی اور دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب محض ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو
اس شعبہ کی رپورٹ علاحدہ چھاپی اور شائع کی گئی، مولانا کی یہ رپورٹ بڑی دل چسپ اور پڑھنے کے
لائق ہے، انجمن کا دوسرا سال بھی کامیاب رہا، اس کے ارکان میں متعدد اضافہ ہوا، مصنفین و مؤلفین کو
معاوضہ ادا کرنے کے لیے کچھ رقم چندہ کے طور پر جمع ہوئی، نصاب تعلیم اردو کی طرف بھی انجمن نے توجہ
کی، اس وقت حسب ذیل ترجمے یا تالیفات زیر قلم تھے:

- ۱- ”ترجمہ ایجوکیشن“ ہربرٹ اسپنسر
- ۲- ترجمہ کان فلکٹ بٹوین ریجن اینڈ سائنس، از ڈر پیر
- ۳- ترجمہ میکس مولر لکچرز
- ۴- ترجمہ ہیروز اینڈ ہیروروشپ از کارلائل
- ۵- کتاب الالہیات
- ۶- نامہ دانشوران
- ۷- معارف ابن قتیبہ
- ۸- رہنمایان ہند

۱۔ انسٹیٹیوٹ گزٹ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔

۱۲- قدیم فارسی

۹- المرق

۱۳- سوانح عمری میر انیس

۱۰- تاریخ تمدن یعنی بکھرہسٹری آف سویٹزرلینڈ

۱۴- طریقہ حکومت انگریزی

۱۱- سوانح عمر امیر خسرو دہلوی

مولانا گوانکار میں مبتلا تھے، اس پر بھی انجمن کا کام نہایت مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہا، ۱۱ اپریل ۱۹۰۳ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو جو اس زمانہ میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں تھے، لکھتے ہیں ”اردو سائنس کی کارروائی زور شور سے شروع کرتا ہوں۔ (۱۸) پھر ۱۱ مئی ۱۹۰۳ء کو لکھتے ہیں ”انجمن ترقی اردو کی کاپی بھیجتا ہوں، ارکان اعانت اور خریداروں کے نام بھیجنے چاہئیں۔“ (۱۹)

مولانا حمید الدین صاحب نے کراچی سے انجمن کے ممبروں کے نام لکھ کر بھیجے (حمید-۲۰) پھر ۱۷ جون ۱۹۰۳ء کو انہیں لکھا ”اردو نے اب تک جو کام کیا وہ علی گڑھ گزٹ میں اس ہفتہ چھپے گا، اس میں دیکھنا تم بتاؤ کہ عربی زبان سے کون سی کتابیں ترجمہ کے قابل ہیں۔“ (حمید-۲۱) ۱۱ مئی ۱۹۰۳ء کو ممتاز انشا پرداز مہدی صاحب افادی کو جو یوپی میں نائب تحصیل دار تھے، یہ لکھ کر بھیجا ”اردو ادب کے ساتھ آپ کو جو عشق ہے، اب اس کے اظہار کا موقع ہے، دستور العمل ارسال ہے، جو کچھ ہو سکے کیجیے۔“ (مہدی-۱۱)

۲۲ جون ۱۹۰۳ء کو صوبہ بہار میں اردو کے لائق ادیب و شاعر مولوی ریاض حسن خاں صاحب خیال کو لکھا کہ انجمن کے لیے ارکان اعانت بنائیں اور فارسی تذکرہ علمایں ایک مشہور جدید کتاب ”نامہ دانشوراں“ کے ترجمہ کے لیے ان کا انتخاب کیا اور اس سلسلہ میں ان کو لکھا ”آپ کا نام ارکان اعانت کی فہرست میں درج کیا گیا اور مستقل خریداروں کے رجسٹر میں درج کیا گیا، آپ کے خط کے آنے سے پہلے دو جگہ سے اطلاع آئی، ایک اور صاحب نے نامہ دانشوراں کا ترجمہ شروع کر دیا ہے لیکن ابھی دفتر میں نمونہ نہیں آیا، اطلاعاً عرض ہے، نامہ دانشوراں کے ترجمہ میں بعض بعض جگہ ابہام و تفصیل کے لیے اور کتابوں کی طرف بھی رجوع کرنا پڑے گا، غالباً آپ نے خود اس کا اندازہ کیا ہوگا، کتاب مذکور مدت تک میرے استعمال میں رہی لیکن اس وقت پیش نظر نہیں، اس لیے صفحات کی تعداد محض تخمینی لکھ دی گئی، اس کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہوگئی ہے۔“ (۲)

اسی صوبہ بہار میں مولوی ابوالکمال دستوی کو ۲۷ نومبر ۱۹۰۳ء کو اطلاع دیتے ہیں، کتب مشترکہ میں سے ہر برٹ اسپنسر کی کتاب چھپ گئی اور عنقریب شائع ہوگی، باقی زیر طبع ہیں۔

یوپی میں اپنے عزیز مولوی محمد سمیع صاحب کو جو جون پور میں محافظ دفتر تھے، لکھا ”انہوں نے انجمن کے ممبر اور مستقل خریدار بنائے، ۷ نومبر ۱۹۰۳ء کو حیدرآباد سے انہیں مطلع کیا، تو اعداد انجمن ترقی اردو میں اب اس قدر ترمیم ہوئی ہے کہ خریداران مستقل ارکان اعانت قرار دیے گئے، تم اپنے خریداروں کو بھی مطلع کر دو، انجمن کی تیار کردہ کتابیں زیر طبع ہیں۔“ (سمیع-۵۲)

جدید علوم کے ترجمہ میں اصطلاحات کی دقت تھی، اس کے لیے بالفعل یہ کیا گیا کہ اصطلاحات کو الگ چھپوا کر مترجمین کی خدمت میں بھیجا گیا، ۱۲ جنوری ۱۹۰۳ء کو مولوی ریاض حسن خاں خیال کو لکھتے ہیں ”کیمشری کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں، بلکہ صرف اصلی الفاظ چھپوا لیے گئے ہیں، کہ مترجمین کے پاس الگ الگ جلدیں بھیج دی جائیں۔“ (۴)

اسی ضمن میں شعرائے اردو کے تذکروں کی اشاعت کی تجویز بھی تھی، اپنے دوستوں میں سے نواب سید علی حسن خاں کو لکھا ”انجمن کی طرف سے میں مصحفی اور میر تقی وغیرہ کے مصنفہ تذکرۃ الشعرا چھپوانا چاہتا ہوں، کیا آپ کے کتب خانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہے۔“ (علی حسن خاں-۵) یہ تجویز مولوی عبدالحق صاحب کے زمانہ میں زیر عمل آئی۔

اسی سلسلہ میں مولانا نے ایک اور کام یہ کرانا چاہا کہ اس وقت تک اردو زبان میں کتابوں کا سرمایہ جتنا فراہم ہو چکا ہے، اس کی ایک مبسوط فہرست تیار کر لی جائے، اس کام کے لیے پروفیسر محمد سجاد مرزا یگ دہلوی کا انتخاب کیا جو اس زمانہ میں حیدرآباد ہی میں تھے، چنانچہ انہوں نے اس کام کو گوشروع کر دیا، مگر وہ ختم ۱۹۲۲ء میں ہوا اور ”الفہرست“ کے نام سے شائع ہوئی، پروفیسر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں، ۱۹۰۳ء میں جب انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو ایک تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست ان کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پایہ کی موجود ہیں، تاکہ آئندہ ان سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں اور اردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے۔

۱۔ اصل کتاب میں ۱۹۱۳ء غلط چھپ گیا ہے۔

مولانا شبلی صاحب مرحوم کے ایما سے راقم نے اس کام کو شروع کیا اور اسی سال اس کا ایک حصہ تیار بھی کر لیا تھا، جس کا ذکر مولانا ممدوح نے رپورٹ انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں کیا تھا، تھوڑے دن کے بعد مولوی شبلی صاحب حیدرآباد سے چلے گئے اور انجمن نے اس کام کی طرف توجہ نہ کی۔ انجمن کا کام شروع تو بڑے جوش و خروش سے کیا گیا، انتہا یہ ہے کہ دفتر میں کوئی دوسرا مددگار بھی نہ تھا، پھر بھی سارا کام مع خط و کتابت کے خود ہی انجام دیتے تھے، ۱۳ جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”میں اردو کے قصہ میں بہت عظیم الفرصت ہو گیا ہوں جو وقت بچتا ہے بالکل خط و کتابت میں صرف ہو جاتا ہے“ (حمید-۲۲) لیکن ایک ہی دو سال کے بعد ۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا پر دارالعلوم ندوہ کی خدمت کا قدیم ذوق اتنا غالب آ گیا کہ آخر انجمن کو دوسروں کے حوالہ کر کے خود ندوہ کے آستانہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

حیدرآباد سے استعفا | اوپر کے صفحوں میں یہ بیان آچکا ہے کہ وہ ندوہ کی مستقل خدمت کے لیے کس طرح تیار ہو رہے تھے اور اب دارالعلوم دیکھ کر اور طلبہ سے مل جل کر اپنے عزم کو عمل میں لانے کے لیے سعی کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ سابقہ منصب بحال ہو کر سررشتہ علوم و فنون کی نظامت سے استعفا منظور ہو جائے، چنانچہ ۱۹۰۴ء کے آخر یا ۱۹۰۵ء کے شروع ہی میں استعفا پیش کر دیا، مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی کو ۴ جنوری ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں ”عزیزی، خط پہنچا، میں نے چون کہ استعفا دے دیا اور مدارالمہام کے ہاں سے منظور بھی ہو گیا، صرف اعلیٰ حضرت کی منظوری باقی ہے، اس لیے جلد یہاں سے روانگی کا قصد ہے لیکن ابھی متعین نہیں کہ کہاں جاؤں گا، میری صحت کے لیے ضروری ہے کہ چار پانچ مہینہ تک صرف سیر و تفریح کروں، میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا میرا ساتھ رہتا تاکہ میں ادب اور فلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھا تا اور مضمون نگاری کی بھی تعلیم دیتا، دیکھیے خدا کب موقع لاتا ہے“۔ (ضیاء الحسن) شروع فروری ۱۹۰۵ء کو وہ حیدرآباد سے مستعفی ہو کر پہلے وطن چلے آئے، ۵ فروری ۱۹۰۵ء کو اعظم گڑھ سے مولوی سہج صاحب کو لکھا ”میں مستعفی ہو کر وطن آ گیا، اگرچہ مدارالمہام کو میرے قیام پر اصرار تھا لیکن میں نے ملازمت کے جوئے کو اتارنا ہی مناسب سمجھا“۔ (سہج-۵۳)

مولانا نے غلطی سے خط کے آخر میں تاریخ ۴ جنوری ۱۹۰۴ء لکھ دی ہے، سال کے شروع میں اکثر نادانستہ قلم سے پچھلا سال نکل جاتا ہے، یہی غلطی اس خط کے سنہ میں ہے، واقعات کا اتقنا یہی ہے کہ یہ جنوری ۱۹۰۵ء ہو۔

ملازمت سے علاحدگی کے بعد سو روپے ماہوار کا اگلا منصب بحال ہو گیا۔

بھوپال کی تحریک | مولانا کے استعفیٰ کی خبر جب بھوپال پہنچی تو ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے نواب محسن الملک کے ذریعہ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مولانا بھوپال آجائیں، نواب صاحب نے حسب ذیل خط مولانا کے نام لکھ کر بھیجا، مولانا ہر ہائینس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مولوی شبلی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں؟ اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے، فرمائیے کیا جواب دیا جائے۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے، اللہ وہ کب نکلے گا، آپ کے قبضہ میں ندوہ کے آنے سے حضراتِ علما کیا حال ہے، مددیں گے یا فریٹ ہو جائیں گے۔“ (مہدی)

لیکن مولانا اپنے عزم پر قائم رہے۔

طلبائے دارالعلوم کی خوشی | مولانا کی مستقل تشریف آوری اور قیام کی خبر جب دارالعلوم کے طلبہ کو ملی تو ان کو بے حد خوشی ہوئی اور اس خوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا گیا، طلبہ نے جلسے کیے، تقریریں کیں، نظمیں لکھی گئیں، خاک سارنے بھی طلبہ کی ایک انجمن میں اپنی خوشی و مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا جو زندگی میں فارسی کا پہلا کلام ہے اور آخری بھی، یہ طور یادگار ذیل میں اس کو جگہ دے کر اپنی کم سوادی کو سوائے عام کرنا چاہتا ہوں۔

شبلی نعمانی

بدہ ساقی مئے کو بقلند جلابِ ظلمانی
مئے کز جرعه اش رونق فرزاید لفظ و معنی را
میرس افسانہ داراؤ اسکندر کہ می بافند
خردم کردہ راہت اندریں را ہے کہ می پویم
فسوں سازی چشم زکسین دل رانمی بازد
ندارم گوش براین نغمہ سنجیبائے داؤدی
ندائے آن حدیث روح پرورد باد ہر جانے
خدیو کشور معنی کہ فرمائش برو دلہا
خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی
دہد تیغ زباں را جوہر تیغ صفا ہانی
میرس از دفتر پارین حکمت ہائے یونانی
فلاطونی دریں کشور بنا شد جز بہ نادانی
کہ مسحورم بہ سحر کلک و جادوے ستمدانی
کہ گوشم ہست بر آواز مرغ باغ یزدانی
کہ جان نودمد در مردہ دل چوں آب حیوانی
چہ دلہا؟ سکہ برجاں زد چہ برقاضی چہ بردانی

بہ بین اینجا کہ درویشے کند دفتر، سلطانی
 نمی دارد بدستش بیچ اسباب جہانبانی
 بساطش بوسہ گاہ و دانش آموزان یونانی
 حمیر کلبہ اش بہتر ز اورنگِ سلیمانی
 سطور صفحہ اش چون جعد بر رخسار نورانی
 مداوش از پے چشم ورق کحلِ صفا ہانی
 چنین گوہر نہ ز نہار آفریدست ابر نیسانی
 نمی ارزد بیک فرش ہمہ سامانِ سامانی
 ز بانگِ طبلِ صیّث پر فضائے کون امکانی
 ہویدا فکر حلِ معضلات از خطِ پیشانی
 بر آرد دستِ فکرش صدر ناسفت و نورانی
 پر از در معانی و پر از لعلِ بدخشانی
 عرق از در نظمش بر جبین ابر نیسانی
 کہ نشتر می خورد از ہمیش اقبالِ سلطانی
 ہوم شور سرسبزی و سبزہ را فراوانی
 بحکم تم باذن العلم آن تن را کہ شد فانی
 بماند زندہ جاوید این شہلی نعمانی
 ندا آمد مرا از پردہ ناموسِ ربانی

بیا سے قصہ خوان جاہِ افریدون و کنسر و
 نہ ایوانے نہ در بانے نہ دستیکے نہ اورنگے
 و ناقش سجدہ گاہ قصر و ایوان شہنشاہی
 کہن دستار او بالا تر از اگھیلِ سلطانی
 عصائے موسوی کلکش ید بیضاست قرطاش
 صریر خامہ اش نغمہ سرائے گلشنِ حکمت
 سخن گوید لیش یا گوہر شہواری بارد
 گراں تر چند اوراقش بود از گنجِ قارونی
 سان خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش
 دلش آرام گاہے، موج دریائے معانی را
 ضمیرش چون کند غواصی جیون مشکہا
 کفش باشد تہی از در ہم و دینار و داماش
 جفل از حسنِ نثرش لعجانِ جملہ گردوں
 دلش نتوان کشیدن منت اربابِ نعمت را
 بیانش ابر باران است می بخشد چومی بارو
 مسیحا دم باعجازِ قلم جانِ دگر بخشد
 بخوانم از خداوندے کہ نامش می و قیوم است
 نوشتم چون مدحِ حضرتہ الاستاذ دبر خواندم

دلیل فصلِ ممدوحت ز مدح تو ہویدا شد

بہ پیش مور سر نہی کہ ہنامِ سلیمانی

دارالعلوم کی معتمدی

۱۹۰۵ء - ۱۹۱۳ء

مولانا کا نام دارالعلوم کے معتمد کی حیثیت سے سب سے پہلی دفعہ ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۰۳ء کو بمقام شاہ جہاں پور مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری نے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا اور ارکان نے بالاتفاق منظور کیا اور طے ہوا کہ مولانا شبلی سے درخواست کی جائے کہ وہ لکھنؤ آ کر قیام کریں، مگر وہ ان دنوں نہ آسکے، تو ۱۷ شعبان ۱۳۲۱ھ کو منشی محمد اطہر علی صاحب کو دارالعلوم کا عارضی معتمد و نگران مقرر کیا گیا، اب جب مولانا تشریف لے آئے، تو ۱۵ صفر ۱۳۲۳ھ (اپریل ۱۹۰۵ء) کو باقاعدہ معتمد تعلیم منتخب ہوئے، یہ قانونی کارروائی تھی، ورنہ مولانا اس سے چند ماہ پہلے ۱۹۰۵ء کے شروع میں دارالعلوم میں تشریف لے آئے تھے اور گولہ گنج میں پرانے دارالعلوم کی اس عمارت میں جو اب جیسا کہ پہلے بتایا گیا ”خاتون منزل“ کے نام سے موسوم ہے، اس کی سب سے بالائی منزل پر جو صرف ایک کمرہ تھا اور جو پہلے طلبہ کا دارالمعلومات تھا، قیام فرمایا تھا۔

جدید نصاب کا اجرا | دارالعلوم کے قائم کرنے کا اصلی مقصد عربی طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح کرنا تھا، قدیم نصاب تعلیم میں جو خرابیاں تھیں، مولانا نے ان پر اللہ وہ میں بارہا مضامین لکھے اور ندوہ کی تقریروں میں ان کو برملا ظاہر کیا لیکن ان خرابیوں کو اختصار کے ساتھ انہوں نے روداد دارالعلوم بابت ۱۳۲۵ھ - ۱۹۰۷ء و ۱۳۲۶ھ - ۱۹۰۸ء، ۱۳۲۷ھ - ۱۹۰۹ء میں لکھ دیا ہے، مولانا کے خیال کے مطابق قدیم عربی نصاب میں حسب ذیل خرابیاں تھیں:

(۱) جو علوم مقصود اصلی ہیں، ان کی بہت کم کتابیں درس میں ہیں اور جو علوم بالواسطہ مقصود ہیں، ان میں کثرت سے کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مثلاً نحو و صرف کی، غرض علم ادب اور عربیت کی تکمیل ہے لیکن جس قدر وقت نحو و صرف پر صرف کیا جاتا ہے خود علم ادب پر نہیں کیا جاتا، اسی طرح اور فنون کا حال ہے۔

(۲) منطق و فلسفہ کی کتابیں اس کثرت سے درس میں ہیں کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ

ان تمام علوم کی مجموعی کتابیں بھی مل کر تعداد میں ان کے برابر نہیں ہو سکتیں۔

(۳) اکثر کتابیں اس قسم کی ہیں جن میں خلطِ محث ہے، مثلاً حمد اللہ، میرزا زہد، ملا حسن قاضی وغیرہ منطق کے فن میں ہیں لیکن اس میں فلسفہ کے مسائل نہایت کثرت سے بھر دیے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اصل فن سے محروم رہتا ہے، ان کتابوں کو پڑھ کر فلسفہ آجائے تو آجائے لیکن خالص منطق نہیں آسکتی۔

(۴) فن تفسیر اس قدر عظیم الشان اور مہتمم بالشان فن ہے لیکن اس کی صرف دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جلالین اور بیضاوی، جلالین کے اختصار کا یہ حال ہے کہ اس کے الفاظ کی تعداد قرآن مجید کے الفاظ کے برابر ہے اور بیضاوی کے ۳۰ پاروں میں سے صرف ڈھائی پارے درس میں ہیں۔

(۵) علم عقائد سب سے زیادہ مہتمم بالشان علم ہے لیکن اس میں صرف شرح عقائد نسفی پڑھائی جاتی ہے، جو بالکل معمولی درجہ کی کتاب ہے، شرح مواقف میں صرف امور عامہ کی بحث درس میں ہے، جس کو عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۶) اکثر کتابیں جو درس میں ہیں، ان میں مسائل کو اس طرح صاف اور متفق نہیں لکھا ہے کہ اصلی مسائل ذہن نشین ہو جائیں، رد و قدح، اعتراض و جواب، احتمالات اور تعلیلات سے مسائل کو مغلق اور پراگندہ کر دیا ہے، جس سے طالب علم گویا ایک جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

(۷) علوم جدید کی کوئی کتاب درس میں داخل نہیں۔

(۸) انگریزی زبان درس میں داخل نہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ندوہ نے ابتدا ہی سے اصلاحِ نصاب پر توجہ کی اور تمام علمائے ہندوستان سے مشورہ اور استصواب کیا گیا، چنانچہ ۲۱ مختلف نصاب پیش ہوئے جو چھاپ کر شائع کیے گئے لیکن یہ تمام نصاب باہم نہایت مختلف تھے، جب ۱۳۲۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۲ء میں بمقام امرتسر ایک جلسہ ہوا جس میں اکابر علماء شریک تھے، اس جلسہ میں چند اصولی مراتب طے ہوئے، پھر شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء بمقام مدراس ایک جلسہ ہوا، جس میں یہ طے ہوا کہ اصول طے شدہ کے موافق ملا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی، مولوی سید عبداللہ صاحب اور علامہ شبلی نعمانی باہم مل کر ایک نصاب بنائیں، چنانچہ وہ نصاب بنایا گیا، جس میں جز غالب مولانا کی ترمیمات کا تھا، اس نصاب میں حسب ذیل خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا تھا:

(۱) ادب اور فنِ بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، مختصر المعانی کے علاوہ دلائل الاعجاز، اعجازِ قرآن باقلانی اور نقد الشعر درس میں داخل کی گئی۔

(۲) تفسیر بیضاوی کے ۱۵ پارے درس میں داخل کیے گئے، مصر میں اس زمانہ میں نہایت مفید کتاب تالیف کی گئی تھی، جس کا نام الصراط المستقیم ہے، اس میں قرآن مجید کی صرف وہ آیتیں جمع کر کے ان کی مختصر تفسیر لکھی ہے جو فقہ، کلام اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، اس سے خاص قرآن مجید کی منصوص فقہ، کلام اور اخلاق کے مسائل معلوم ہو جاتے ہیں، یہ کتاب بھی درس میں داخل کی گئی۔

(۳) عقائد میں پہلے ابن رشد کی کشف الادلہ اور اقتصاد امام غزالی داخل کی گئی تھیں لیکن اب اس کے بجائے امام رازی کی معالم فی اصول الدین رکھی گئی۔

(۴) فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ، شرح حکمۃ العین اور شرح حکمۃ الاشراف داخل کی گئیں، اس خیر کتاب میں اشرافیوں کا فلسفہ ہے جس کے متعلق درس قدیم میں کوئی کتاب داخل نہ تھی۔

(۵) اسرار شریعت میں جتہ اللہ البالغ نصاب میں رکھی گئی۔

(۶) فلسفہ جدیدہ میں دروس الاولیۃ رکھی گئی، اس میں سائنس کے جدید مسائل ہیں اور

بیروت میں چھپی ہے۔

(۷) انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی۔

نصاب قدیم میں کسی تغیر اور اصلاح کا گوارا کرنا لوگوں کو اس قدر شاق تھا کہ گویہ نصاب ۱۹۰۴ء میں منظور ہو چکا تھا لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا تھا، مدرسین وہی قدیم کتابیں پڑھاتے تھے، یہاں تک کہ مولانا نے حیدرآباد سے آ کر ندوہ میں قیام کیا اور جبریہ حکم دیا، جب جا کر اس کی تعلیم جاری ہوئی، اس پر بھی بعض مدرسین خارج شدہ کتابیں پڑھایا کرتے تھے، جس کو بڑی سختی سے روکا گیا۔

تعلیم انگریزی | ایسے علما جو موجودہ زمانہ میں اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکیں، غیر ملکوں میں بلکہ خود اپنے ملک میں بھی اسلام کی تبلیغ کے فرض کو ادا کر سکیں، معتزین اسلام کے جوابات دے سکیں اور نئے تعلیم یافتوں کی تشفی کر سکیں، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ انگریزی زبان سے تھوڑی واقفیت رکھیں، اس خیال کی بنا پر مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی کے داخل کیے جانے پر بہت زور دیا، علما اس بدعت کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکتے تھے، انتہا یہ ہے کہ ندوہ کے ایک جلسہ انتظامیہ میں مولانا

نے جب یہ تحریک پیش کی تو مولانا شروانی جیسے روشن ضمیر و روشن خیال عالم نے خود مولانا شبلی کی بدنامی کے ذر سے اس بحث سے اعراض فرمایا، آج یہ باتیں عجیب معلوم ہوں گی، مگر ۱۸۹۹ء کا حال سنئے ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

”جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کی جائے، البتہ اس پر بحث نہیں ہو سکی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے، مولوی عبدالحی صاحب آپ کی اجازت کے طلب گار ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ آپ اجازت نہ دیں، (شروانی-۳) اس کے جواب میں مولانا شروانی نے شاید یہ لکھا کہ یہ واقعہ مجھے یاد نہیں آتا، اس پر ان کو لکھتے ہیں:

”بات تو کچھ نہیں لیکن مولوی عبدالحی صاحب کی بہانہ جوئی اور آپ کے خارق العادت بھولنے پر تعجب آتا ہے، یہ امر معمولی حیثیت سے نہیں بلکہ رد و کد کے ساتھ ظہور میں آیا تھا، جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی کے ساتھ کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا کہ میں ہوں اور میرا نام لکھا جائے، مولوی محمد یونس خان نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔

البتہ آپ کی خاطر سے میں نے پھر اس پر بحث نہیں کی، اب بحث طلب صرف یہ امر ہے کہ میں نے نائب ناظم سے کہا یا نہیں کہ میرے نام سے یہ تحریک لکھی جائے، اگر میں نے کہا تو انہوں نے لکھی یا نہیں؟ نہیں لکھی تو کیوں؟ اور لکھی تو اس کے درج کارروائی کرنے سے کیوں انکار ہے، صدر انجمن کو یہ حق البتہ ہے کہ کسی تحریک کو پیش کیے جانے سے روک دے، یہ حق نہیں کہ یہ بھی کارروائی میں درج نہ ہونے دے کہ فلاں شخص نے اس کو پیش کرنا چاہا تھا یا پیش کیا۔

جلسہ کے بعد میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کھرتے ہیں، آپ نے کہا تمہاری بدنامی کے ذر سے، باوجود ان تمام باتوں کے اگر آپ کو یہ تمام معرکہ بھول گیا تو نظیری کا یہ مصرع سمجھ میں آگیا

ع آگھ نسیاں آرد در خاصیت یا ذن است

مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و انوس ہے۔“ (شروانی-۲۲)

شوال ۱۳۱۸ھ-۱۹۰۰ء کے جلسہ انتظامیہ میں یہ تجویز دوبارہ پیش ہو کر منظور ہوئی، یہ تجویز اگرچہ بہت سے ارکان کی موجودگی میں منظور ہوئی تھی لیکن بعض معزز ارکان نے سخت مخالفت کی کہ اگر مدرسہ میں انگریزی پڑھائی گئی تو ہم اس مدرسہ کو توڑ دیں گے، بلکہ ایک صاحب نے جو نودہ پر ایک جائداد وقف کرنے والے تھے، اس کی وجہ سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، یہ رد و کد ۱۹۰۱ء تک جاری رہی، ۲۵ مئی ۱۹۰۱ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھتے ہیں ”ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے، بڑی مشکل سے مسلمانوں کے پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں، حالانکہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے، صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں۔“ (شروانی)

بہر حال مولانا اور دوسرے ارکان جو ایمان داری سے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، اپنے ارادے پر قائم رہے، آخر ربیع الاول ۱۳۱۹ھ-۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپیے ماہ وار پر ایک انگریزی کلاس مقرر ہو گیا اور کچھ طالب علموں نے اسے بی سی ڈی پڑھنی شروع کی، مگر یہ تعلیم دفع الوقتی سے زیادہ نہ تھی، سالہا سال کے بعد بھی کوئی پرائمر سے آگے نہیں بڑھا، ۱۹۰۵ء میں جب مولانا معتمد ہوئے تو ان کے اصرار سے صفر ۱۳۲۳ھ-۱۹۰۵ء کے ایک جلسہ میں ہر لڑکے کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور اس کی نگرانی کے لیے مولوی سید ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ مجلس دارالعلوم کے رکن منتخب ہوئے لیکن سرمایہ کی کمی کے سبب سے ماسٹروں کا بڑھانا ممکن نہ تھا، اس لیے تعلیم کا نقص جاری رہا، ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ۵۰۰ روپیہ ماہ وار کی امداد مدرسہ بنیادی تعلیم کے لیے منظور کی تو انگریزی اسٹاف ضرورت کے مطابق مقرر رہا اور انگریزی تعلیم باقاعدہ جاری ہوئی۔

انگریزی کی یہ تعلیم اتنی تھی کہ طالب علموں میں میٹرک تک کی لیاقت پیدا ہو جائے، اس کا یہ اثر ہوا کہ دارالعلوم کے کئی لڑکوں نے انگریزی پڑھ کر مفید علمی اور مذہبی خدمت انجام دی، مندرجہ کے اجلاس دہلی دارالدارالعلوم بابت ۱۳۲۵ھ و ۱۳۲۶ھ مرتبہ مولانا شبلی مرحوم، ص ۸۔ افسوس کہ سید صاحب موصوف نے ۱۹۳۲ء کی گرمیوں میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے دفعۃً انتقال کیا، وطن الہ آباد کا ایک قصبہ تھا، اقامت لکھنؤ میں تھی، کام باب وکیل تھے، ایک زمانہ تک مسلم لیگ کے سکرٹری رہے تھے، مرثیہ و مرثیہ، خاموش اور نیک طینت بزرگ تھے، لکھنؤ کے اکثر قومی کاموں میں شریک رہتے تھے، دارالعلوم اور مندرجہ کے رکن کی حیثیت سے وہ اخیر تک اس کی خدمت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

میں سید محمد اور عبدالمجید نامی دو طالب علموں نے جب ایک مذہبی موضوع پر انگریزی میں تقریریں کیں تو ایک عالم کی زبان سے انگریزی تقریریں کر لوگوں کو اچنبھا ہو گیا اور سر شیخ عبدالقادر نے جو جلسہ میں موجود تھے، ان کی تعریف کی، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مولوی ضیاء الحسن علوی کا لینا چاہیے، جنہوں نے یہاں سے نکل کر میٹرک کیا اور پھر علی گڑھ جا کر ایم اے کیا اور اسی کے بدولت ۱۹۱۶ء میں ہمارے صوبہ میں وہ عربی مدرسوں کے پہلے انسپکٹر مقرر ہوئے اور جنہوں نے عربی مدرسوں کی اصلاح و ترقی سے متعلق بہت سی اچھی خدمتیں انجام دیں، میری معمولی انگریزی تعلیم ندوہ ہی کی رہن منت ہے، اسی کا فیض ہے کہ میں ۱۹۱۰ء میں انگریزی اسکولوں کی ریڈروں سے صیفہ اغلاط تاریخی کی رپورٹ پیش کر سکا، ارض القرآن لکھ سکا اور یورپین مواد سے اپنی تصنیفات میں فائدہ اٹھا سکا، اور ۱۹۲۰ء میں یورپ میں جا کر کچھ کام کر سکا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے اسی کی بنا پر جدید فلسفہ کی متعدد کتابیں ترجمہ کیں اور عقل و نقل پر سورت کی ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس میں وہ رسالہ لکھ کر پیش کیا جو اہل عقل و نقل دونوں کے لیے یکساں مرکز توجہ ہے، پھر معجزات کے امکان اور وقوع پر وہ مبسوط رسالہ لکھا جو سیرۃ النبی ﷺ کے حصہ سوم کا ایک جز ہے اور یورپ کے مشہور فلسفیوں ہیوم اور برکلی کی تصنیفات کو اردو میں منتقل کیا اور دارالترجمہ حیدرآباد کے لیے جدید نفسیات و اخلاقیات کی ضخیم کتابیں اردو میں ترجمہ کیں اور جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ جدیدہ کے پروفیسر ہو سکے۔

مولوی زین العابدین ندوی نے اتنی ہی انگریزی پر یہ ہمت کی کہ وہ امریکہ تک پہنچے اور سات آٹھ برس وہاں رہ کر تبلیغ اسلام کا کام کیا، اور مولوی احمد اللہ صاحب ندوی نے اتنی ہی انگریزی کے سہارے ۱۹۲۰ء میں لندن تک گئے اور وہاں لوگوں کو اردو پڑھا کر چند ماہ گزارے۔

پروفیسر مظفر الدین ندوی نے یہاں سے نکل کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور اس وقت سے انگریزی میں علمی اور مذہبی مضامین لکھ رہے ہیں اور بعض تصنیفات انگریزی میں لکھ کر شائع کیں اور بیٹے کے فلسفہ پر ایک کتاب لکھی۔

مولوی حاجی معین الدین ندوی ہیں، جن کی انگریزی تعلیم اس مدرسہ سے آگے نہیں بڑھی، پھر بھی انہوں نے انگریزی میں اور ٹیلی لائبریری پٹنہ کی فہرست کی کئی جلدیں ترتیب دیں اور اب اسی لے آہ! کہ حاجی صاحب نے ۵ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق مئی ۱۹۴۱ء میں پٹنہ میں جہاں وہ مدرسہ شمس الہدیٰ میں صدر المدرسین تھے، وفات پائی۔

کام کو مولوی مسعود عالم ندوی کر رہے ہیں، جن کی انگریزی تعلیم مدرسہ سے نکلنے کے بعد میٹرک تک ہے، ندوہ کے اکثر عالم بقدر ضرورت انگریزی جاننے کی وجہ سے انگریزی اخبار، تار اور دوسرے معمولی کاروبار میں دوسروں کے محتاج نہیں رہتے۔

مولانا کا خیال تھا جس کو انہوں نے اپنی ۱۹۰۷ء و ۱۹۰۸ء و ۱۹۰۹ء کی رودادوں میں خود ظاہر کیا ہے، کہ ۸ برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خاص انگریزی تعلیم کے لیے انگریزی کا ایک درجہ تکمیل کھولا جائے، چنانچہ فرماتے ہیں ”اور جب وہ درجہ تکمیل میں دو برس تک اور صرف انگریزی پڑھیں گے تو زبان دانی میں قابل گریجویٹوں کی برابری کر سکیں گے اور اس وقت انگریزی میں تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں گے“، مگر یہ درجہ اب تک قائم نہ ہو سکا اور نہ یہ امید پوری ہوئی ورنہ اس سے اور بھی فوائد ہوتے۔ بہر حال مولانا کی جس تحریک کی اتنی پر زور مخالفت ہوئی وہ بھی بے اثر نہ رہی، آخر بڑے بڑے عربی مدرسوں کو اس کے آگے جھکنا پڑا اور دیکھا دیکھی ان کے مدرسوں اور طالب علموں کو مجبوراً اس زبان کی تحصیل کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور آج اس کی مثالیں اکثر عربی مدرسوں میں موجود ہیں اور یہ بدعت عام ہو چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن بزرگوں نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی، اس سے ان کا منشا محض کسی غیر اسلامی زبان کی تعلیم کا عدم جواز نہ تھا، بلکہ وہ ان اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان کے ساتھ ساتھ نادانستہ طور پر عربی کے طالب علموں میں سرایت کریں گے اور سچ یہ ہے کہ ان کا یہ خطرہ بے جا بھی نہ تھا اور جو لوگ علما کے لیے اس زمانہ میں اس کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے، ان کے سامنے وہ بیسیوں اسلامی مصلحتیں تھیں جو عربی خواں طلبہ کے انگریزی سیکھ لینے سے ان کو پوری ہوتی نظر آتی تھیں ان کا خیال تھا کہ:

زبان گر بہر حق جوئی چہ عبرانی چہ سریانی

مگر سوال یہی ہے کہ ”بہر حق“ ہو۔

ہندی اور سنسکرت کی تعلیم | مولانا نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں ۱۹۰۸ء میں ایک تیسرا کام یہ کیا کہ دارالعلوم میں ہندی اور سنسکرت کا ایک درجہ قائم کیا تاکہ ہمارے مدرسہ کے طلبہ ان زبانوں کو سیکھ کر آریوں کا مقابلہ کر سکیں، جن کا اس زمانہ میں بڑا زور تھا اور ہر جگہ وہ اسلام پر جاوے جا اعتراضات کرتے رہتے تھے، مولانا نے اس کے لیے پہلے اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کو لکھ کر چند وظیفوں کا

سامان کیا اور پھر ایک پنڈت کو نوکر رکھ کر چند طالب علموں کو ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دلائی اس درجہ میں محمد حسین ساکن اعظم گڑھ اور سید امداد حسین ہوشیار پوری دو طالب علم اچھے تیار ہو گئے تھے مگر مولانا کے بعد ہی یہ شعبہ ٹوٹ گیا اور اس سے کچھ کام نہیں لیا جا سکا، حالانکہ ہندوستان میں ہمارے علما اگر کچھ تبلیغی کام کرنا ہے تو اس تجویز کی تعمیل سے چارہ نہیں۔

نئی عربی | آج کل تمام اسلامی ملکوں میں جو عربی بولی جاتی ہے وہ ہماری قدیم عربی سے بالکل الگ ہے، اس کے علاوہ جو قدیم عربی زبان لکھی جاتی ہے، اس میں زمانہ کی ضرورت سے ہزاروں نئی چیزوں کے لیے نئے عربی الفاظ بن گئے ہیں، جن کے جانے بغیر کوئی شخص عربی اخبار، رسالے اور نئی عربی کتابیں نہیں سمجھ سکتا، مولانا جب مصر و شام کے سفر سے واپس آئے تو انہوں نے ان الفاظ کا ایک نہایت ہی مختصر فرہنگ لکھا جو ان کے سفر نامہ کے آخر میں لگا ہوا ہے، خاک سار کو چوں کہ بچپن سے ادب کا شوق تھا، اس لیے دارالعلوم میں اس زمانہ کے جو عربی اخبارات المودید اور اللواء وغیرہ آتے تھے، ان کو پڑھا اور ان کے معنی حل کیا کرتا تھا، اسی وجہ سے میں نے طالب علمی میں ایک بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کی، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں جب مولانا شاہ سلیمان صاحب دارالعلوم میں مقیم تھے، نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم دیکھنے کو آئے، میں نے ان کی شان میں ایک عربی قصیدہ پڑھا، جس کو سن کر انہوں نے فرمایا، میں دارالعلوم کی عربی دانی کا قائل اس وقت تک نہیں ہوں گا، جب تک یہ نہ جان لوں کہ یہاں کے طالب علم عربی اخبار سمجھ سکتے ہیں؟ چنانچہ المودید یا اللواء کا ایک پرچہ منگوا لیا گیا اور مجھ سے ایک مضمون کی طرف اشارہ کر کے پڑھنے کو کہا گیا، میں نے جب اس کو صحیح پڑھا کر اس کا صحیح مطالب بتا دیا، نواب صاحب بے انتہا خوش ہوئے اور اس کو دارالعلوم کا خاص امتیاز سمجھا۔

اس کام یابی نے مجھے جدید عربی کے سمجھنے اور اس کے مشکلات کے حل کرنے کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ کر دیا، پھر جب مولانا ۱۹۰۵ء میں ندوہ میں آکر مقیم ہوئے تو ان کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبار اور رسالے آیا کرتے تھے، جن کو میں بالالتزام پڑھتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ندوہ کی امداد منظور کی تو ایک جگہ اس

۱ تفصیل کے لیے دیکھو، مکاتیب سلیمان ۲۹ اور اندوہ ۱۹۰۸ء۔

میں جدید عربی کی تعلیم کے لیے بھی مقرر کی گئی اور اس کے لیے میرا انتخاب کیا، اس کے بعد انہوں نے اس کی تکمیل کے لیے مجھے مصر بھی بھیجنا چاہا، مگر اس زمانہ کے مصری سیاسیات کے سبب سے گورنمنٹ نے اجازت نہیں دی، بہر حال جدید عربی زبان کی ایک خاص کرسی؟ ہو جانے کے سبب سے دارالعلوم ہمارے ملک میں سب سے پہلی عربی درس گاہ تھی جس نے اس کو اپنی تعلیم میں ایک مناسب جگہ دی اور دارالعلوم کے طلبہ نے جدید عربی زبان کے بولنے اور سمجھنے میں پوری شہرت حاصل کی جو بھگت اللہ کہ آج تک قائم ہے۔

جدید عربی الفاظ و اصطلاحات کو عام کرنے کے لیے مولانا کی تجویز کے مطابق میں نے دروس اللادب کے نام سے دو ابتدائی عربی رسالے لکھے جو دارالعلوم اور بہت سے دوسرے مدرسوں میں بہت دنوں تک پڑھائے گئے اور اب بھی کہیں کہیں پڑھائے جاتے ہیں، پھر ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس دہلی میں یہ طے ہوا کہ جدید الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے اور یہ کام خاک سار کے سپرد کیا گیا جس کو میں نے دو برس میں پورا کر کے پھر ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری ایڈیٹر المنار تھے، پیش کیا اور لغات جدیدہ کے نام سے وہ چھپ کر شائع ہوئی اور جس نے عربی مدارس میں نئی عربی زبان کی دفتوں کے حل کرنے میں بڑی مدد دی۔

یہ سب مولانا کا فیض تھا۔

ہونہار طلبہ کی تربیت | مولانا نے دارالعلوم میں قدم رکھنے کے ساتھ چند ہونہار طالب علموں کو اپنے گرد جمع کر لیا، ان میں سب سے پہلا نام ہمارے مخلص دوست مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی کا کوروی (رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) کا ہے مولانا کے پاس مصر و شام کے عربی رسائل اور جدید تالیفات آتی رہتی تھیں وہ انہوں نے ہم لوگوں کے حوالہ کیا اور ان میں سے بعض مضامین کی تلخیص اور ترجمہ کی ہدایت کی، چنانچہ مولوی ضیاء الحسن کو مصر کا فلسفیانہ رسالہ ”المقتطف“ دیا جس میں سے انہوں نے عمر اور صحت کی تدابیر کے مضمون کا ترجمہ کیا، جو دسمبر ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں چھپا، مجھے جرجی زیدان کی کتاب ”اللغة العربية“ حوالہ کی اور اس کی تلخیص کی ہدایت فرمائی، جس کی تعمیل ہوئی، یہ مضمون جنوری ۱۹۰۵ء میں نکلا اور پسند خاطر ہوا۔

ہماری جماعت کے ایک اور رکن مولوی جو ادب علی خاں عالی تھے، ان کا مذاق طبع نہایت خوبصورت اور بیان تھا، اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہ چل سکے اور بعد کو ”خان عالی“ کے نام سے الناظر میں مضمون لکھتے رہے۔

۱۹۰۶ء میں اس جماعت میں ایک اور رکن کا اضافہ ہوا، یہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی تھے، جن کو تحریر و انشا کا فطری مذاق تھا، ان کے پہلے ہی مضمون تناخ کو مولانا نے بے حد پسند کیا اور پانچ روپے انعام دیا، اور اصلاح کے بغیر مختصر تمہید کے ساتھ مئی ۱۹۰۶ء کے ندوہ میں شائع کیا۔

تقریر کی مشق | علمی مضامین پر طلبہ کی تقریر کی مشق کی طرف بھی مولانا نے خاص طور سے توجہ کی اور اونچے درجہ کے اکثر مستعد طلبہ کو باری باری سے اپنے پاس بلواتے تھے، ان کے لیے ایک ہفتہ پہلے موضوع مقرر کر کے اس پر مطالعہ کے لیے کتابیں بتاتے تھے، طالب علم اس تیاری کے بعد مولانا کے کمرہ میں جا کر مقررہ موضوع پر تقریر کرتے تھے، مولانا موقع بہ موقع اس میں اصلاح دیتے تھے، طرز تقریر بتاتے تھے، طریقہ تعبیر سمجھاتے تھے اور مضمون کو عام فہم بنانے کی طرف خاص طور سے تاکید کرتے تھے، اس درس میں جن طلبہ نے خاص طور سے وقتاً فوقتاً حصہ لیا ان کے کچھ نام یاد آگئے ہیں۔

۱- مولوی عبدالباری بہاری مرحوم،

۲- مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم اے)

۳- سید سلیمان،

۴- مولوی مسعود علی صاحب ندوی،

۵- مولوی عبدالسلام صاحب ثانی (ایم اے، ایل ایل بی اعظم گڑھ)

۶- مولوی محمد حسن صاحب، اعظم گڑھ،

۷- مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب دیسوی بہاری،

۸- خواجہ عبدالواجد صاحب کان پوری (ایم اے)

ان میں سے مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے اپریل ۱۹۰۶ء میں بنارس کے جلسہ ندوہ

میں جب کامیاب تقریر کی ہے تو مولانا نے خوش ہو کر اپنی عبا ان کو اڑھادی تھی۔

لائق مدرسین کی فراہمی | اچھی تعلیم کے لیے اچھے مدرسین کا مہیا کرنا ضروری ہے، مولانا کے پیش نظر جس قسم کی تعلیم تھی، اس کے لیے معیار کے مطابق اساتذہ مشکل سے ہاتھ آسکتے تھے، تاہم انہوں نے کوشش جاری رکھی اور جہاں کہیں گئے، اپنے معیار کے مطابق اشخاص کو تلاش کرتے رہے، انگریزی کے لیے قاضی تلمذ حسین صاحب، ایم اے (گورکھپور) کو مقرر کیا، جو اب ساہا سال سے جامعہ عثمانیہ کے

دارالترجمہ میں کام کر رہے ہیں، مولانا حفیظ اللہ کے ڈھا کہ چلے جانے کے بعد فلسفہ اور عقلیات کے لیے مولانا شیرعلی صاحب کو لائے، جو مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رام پوری کے ارشد تلامذہ میں تھے، ان سے مولانا کی ملاقات بمبئی یا حیدرآباد میں ہوئی اور ایک ہی دو ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے، مولانا شیرعلی صاحب مدرسہ میں کئی سال رہے، علما میں ایسے فیاض، شریف اخلاق اور باوقار کم لوگ دیکھنے میں آئے، ان کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی، مولانا ہی کے زمانہ میں حیدرآباد چلے گئے جو ان کا وطن ہو چکا تھا، مولانا نے مجوزہ جامعہ علوم مشرقیہ حیدرآباد کن میں ان کی سفارش کی تھی، جامعہ کھلنے کے بعد وہ وہاں کے شعبہ دینیات کے صدر ہو گئے، ابھی چند سال ہوتے ہیں کہ انہوں نے وفات پائی، ان کے مدرسہ میں آنے پر مولانا نے شروانی صاحب کو جو خط لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں ”دارالعلوم اب جا کر رنگ پر آیا، بڑا رونا تعلیم کا تھا..... (مولانا شیرعلی صاحب) جن کو میں نے زبردستی حیدرآباد سے بلایا ہے، ایسے شخص ہیں کہ وہ ہی چار دن میں طلبہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سمجھے کہ تعلیم اور فن دانی اس کو کہتے ہیں۔“ (۷۷)

ان کے چلے جانے کے بعد ۱۹۱۱ء میں شمس العلماء مفتی عبداللہ صاحب ٹوکی کو جو اور ٹیل کالج لاہور سے پنشن پا کر علاحدہ ہو چکے تھے، مدرسہ میں لائے، مفتی صاحب مولانا کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس لیے ان کی ذہانت اور طباعی کے قائل تھے، مفتی صاحب کئی سال دارالعلوم میں مدرس اعلیٰ رہے، مولانا کی علاحدگی بلکہ وفات کے بعد وہ بھی علاحدہ ہو گئے۔

ادب کی تعلیم کے لیے ۱۹۰۸ء میں مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوئی کو دوبارہ دارالعلوم میں آنے کی زحمت دی، وہ تشریف بھی لائے، مگر اتفاق دیکھیے کہ وہ یہاں سے اپنا ضروری سامان لانے کے لیے غازی پور گئے، جہاں ان کا قیام تھا، وہیں بیمار پڑے اور وفات پا گئے، اس جگہ کے لیے اب مولانا کی نظر شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی پر پڑی جو مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے اور مدرسہ عالیہ رام پور میں عمر بھر رہے تھے، مگر ان دنوں نواب صاحب رام پور نے ان کو مدرسہ سے الگ کر دیا تھا، تو موقع پا کر مولانا ان کو دارالعلوم میں لے آئے، وہ معقولات اور ادبیات میں بڑے ماہر تھے اور حافظہ ایسا قوی پایا تھا کہ جو کچھ دیکھا یا پڑھا تھا، وہ نوک زبان تھا لیکن وہ مدرسہ میں بہت کم ٹھہرے، نواب صاحب کی ناخوشی دور ہو گئی تو وہ رام پور واپس چلے گئے۔

شیخ حسین صاحب عرب محدث یعنی جنوناب صدیق حسن خاں مرحوم کے اور اس عہد کے بہت سے علما کے شیخ الحدیث تھے، ان کے صاحب زادے شیخ محمد صاحب عرب ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے تھے، ان کو بھوپال سے بلوایا، وہ ایک زمانہ تک یہاں درس دیتے رہے، بعد کو بھوپال گئے اور وہیں وفات پائی۔

مولانا محمد شبلی صاحب جیراج پوری، مولانا حفیظ اللہ صاحب کے شاگرد تھے، اور چشمہ رحمت غازی پور میں پڑھاتے تھے، مولانا ایک دفعہ غازی پور گئے اور ان کو پڑھاتے دیکھا تو پسند فرمایا اور ان کو اپنے ساتھ دارالعلوم لے آئے اور یہاں فقہ کی تعلیم ان کے سپرد فرمائی، جس کو وہ اب تک پڑھا رہے ہیں اور اب تک مدرسہ ان سے فیض اٹھا رہا ہے۔

درجہ اعلیٰ اور درجہ تکمیل | مولانا کی تشریف آوری تک ندوہ میں چھ سال تک تعلیم پہنچ چکی تھی، یعنی تین سال ابتدائی کے اور تین سال متوسط کے، اب دو سال درجہ اعلیٰ کے کھلے، یعنی معمولی عربی تعلیم آٹھ سال میں پوری ہوگئی، ان آٹھ سالوں کی تعلیم کے بعد مولانا نے ارکان کی منظوری سے ۱۹۰۹ء میں تکمیل کا درجہ کھولا اور حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم میں مولانا کے زمانہ معتمدی کا یہ اہم کارنامہ ہے، اس درجہ سے مقصد یہ تھا کہ طلبہ کسی ایک فن کو لے کر دو برس تک خاص اس فن کی تعلیم حاصل کر سکیں اور اس میں کمال پیدا کریں، اس وقت تک تمام ہندوستان میں طریقہ تعلیم یہ ہے کہ ایک نصاب معین جس میں تمام علوم و فنون اوسط درجہ تک پڑھائے جاتے ہیں، سب پڑھتے ہیں اور مولوی کی سند حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے بعد کوئی شخص کسی ایک خاص فن کو لے کر اس کی تحصیل اس طرح نہیں کرتا کہ اس فن کا کامل بن جائے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک شخص بھی کسی ایک فن کا کامل نہیں پیدا ہوتا، اتفاق سے مدت کے درس و تدریس اور مہارت کے بعد کوئی شخص کسی فن میں ممتاز ہو جائے تو یہ ایک شاذ واقعہ ہے، اس بنا پر دارالعلوم ندوہ کی تجویز میں ابتدا ہی سے تکمیل کا درجہ رکھا گیا تھا لیکن آمدنی کی کمی سے اس کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔

جلسہ انتظامیہ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۹ء میں یہ طے پایا کہ سر دست علم کلام اور علم ادب کا درجہ تکمیل کھول دیا جائے اور ایک کمیٹی منتخب ہو جو اس درجہ کا نصاب تعلیم مقرر کرے، چنانچہ کمیٹی مذکور نے نصاب تجویز کر کے تمام ہندوستان کے علما کے پاس بھیجا، اکثر علما نے رائے بھیجیں، مجلس دارالعلوم منعقدہ ۳۰ جون ۱۹۰۹ء میں ان تمام آراء کے اشمال اور اقتباس سے حسب ذیل نصاب مقرر کیا گیا:

علم کلام

شرح مقاصد علامہ تفتازانی
تہافتہ امام غزالی و ابن رشد
کتاب الصفات امام تہجدی
برائے مطالعہ رسائل اربعہ امام غزالی برائے مطالعہ

علم کلام

بحث عصمت انبیاء از مثل و نخل علامہ ابن حزم، برائے مطالعہ کتب آریہ مثلاً ستیا رتھ پرکاش
تلخیص المقال و کشف الادلہ ابن رشد و اظہار الحق برائے مطالعہ
حدیقہ فکر یہ، برائے مطالعہ کتاب الروح ابن القیم برائے مطالعہ

علم ادب

دیوان امر القیس و نابغہ ذبیانی و علقمہ النخل موازنہ بی تمام و بستری
عروہ بن الورد فرزدق عقد الفرید ابن عبد ربہ، برائے مطالعہ
کتاب الصنائع ابن ابولہلال عسکری مشق نظم و نثر
اسرار البلاغہ عبد القاہر جرجانی

اس کے بعد دوسرے علوم کی تکمیل کے نصاب بھی مقرر کر کے شایع کیے گئے اور بعض بعض میں طلبہ داخل کیے گئے، تکمیل ادب میں خواجہ عبد الواحد صاحب کان پور، مفتی محمد یوسف صاحب بیتاوی مرحوم مدرس دارالعلوم، مولوی عبدالسلام صاحب (مصنف دارالمصنفین) مولوی قمر الدین صاحب مرحوم اعظم گڑھ، علم کلام میں مولوی شبلی صاحب اعظم گڑھ، حال صدر المدرسین مدرسۃ الاصلاح سرانے میر اور تفسیر میں مولوی سعود علی صاحب ندوی، حال مہتمم دارالمصنفین اعظم گڑھ داخل ہوئے۔

تکمیل ادب میں جو طلبہ داخل کیے گئے، ان کو عربی ادب کی نظم و نثر کے علاوہ عربی میں برجستہ تقریر و تحریر کی مشق بھی کرائی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ندوہ کے طلبہ نے عربی تعلیم کے اس بڑے نقص کو کہ عربی طالب العلم لکھ پڑھ نہیں سکتے اور نہ بول سکتے ہیں، دور کر دیا اور سارے ہندوستان میں بلکہ ممالک اسلامیہ میں بھی ان کی ادبیت و عربیت کا سکہ بیٹھ گیا جس کی بارہا شہادتیں مل چکی ہیں۔

علم کلام کا درجہ ۱۳۲۶ھ - ۱۹۰۸ء میں جب کھولا جانے لگا تو مولانا نے شوال ۱۳۲۶ھ مطابق نومبر ۱۹۰۸ء کے اندوہ میں اپنی تجویز کو ان الفاظ میں ظاہر کیا، دس برس کے بعد اب وقت آیا کہ

ندوہ کی تعلیم کا جو اصلی مقصد تھا یعنی خاص فنون میں کامل الفن اشخاص پیدا کرنا، اس کی طرف توجہ کی جائے، یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک عام نصابِ تعلیم جو دو سو برس ہوئے قائم کیا گیا، اس کے ساتھ یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ خاص خاص فن کے باخِ العلوم ہونے کا بھی نصاب بنایا جائے اور ان کی جداگانہ تعلیم دی جائے، جیسا کہ انگریزی میں ایم اے اور ایل ایل ڈی کی تعلیم ہے، حالاں کہ علوم کی ترقی کی اصلی تدبیر یہی ہے، اس بنا پر دارالعلوم ندوہ میں اس سال یہ شاخ کھول دی گئی اور ابتداً علمِ کلام سے کی گئی، کیوں کہ ہر حیثیت سے یہی علم آج سب سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے، علمِ کلام میں قدماء کی تمام کتابیں اور جدید تصنیفات اور فلسفہٴ حال کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے، البتہ یہ افسوس ہے کہ عربی زبان میں ابھی تک فلسفہٴ حال کی معمولی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں۔“

۱۹۱۲ء میں تفسیر کا درجہ تکمیل کھولا گیا، جس میں تفسیر ابن کثیر، بیضاوی، کشاف، کتاب النسخ والمسنوخ للنحاس، الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، اعجاز القرآن باقلانی، تفسیرات احمدیہ ملا جیون وغیرہ کتابیں داخل درس کی گئیں، اسی طرح فقہ و اصول فقہ کا ایک درجہ قائم ہوا، جس میں تحریر ابن ہمام، مسلم الثبوت، ملاحب اللہ، معانی الآثار امام طحاوی، بدلیۃ المجد قاضی ابن رشد وغیرہ کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔

ندوہ کے درجہ تکمیل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے ایسے بڑے بڑے مدارس میں جہاں سرمایہ ممکن ہے اس کی تقلید کی گئی اور اختصاصی کامل الفن علما کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور ان میں کتابیں بھی زیادہ وہی رکھی گئیں جو ندوہ میں رکھی گئی تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد دکن، جامعہ عباسیہ، بھاو پور، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے نام ہم کو یاد آگئے اور بھی بعض پرانے طرز کے عربی مدارس میں بھی یہ تجویز دوسری شکل میں پیش ہوتی رہتی ہے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں بھی اس تجویز پر عمل ہوا اور تفسیر کا درجہ اب کھولا گیا ہے، غرض من سن سنة حسنة کی بنا پر امت اسلامیہ اور علوم عربیہ کو اگر اس سے فائدہ پہنچے یا آئندہ پہنچیں تو امید ہے کہ مجوز اول بھی اس کے ثواب سے انشاء اللہ تعالیٰ بہرہ مند ہوگا۔

علوم جدیدہ کی تعلیم | دارالعلوم کی ایک اور بڑی غرض یہ تھی کہ قدیم منطق و فلسفہ کا بے کار حصہ نکال کر اس کی جگہ سائنس اور فلسفہ و ریاضیات کے لیے علوم داخل کیے جائیں، اس میں اصلی وقت یہ تھی کہ ہمارے قدیم علما ان علوم کو نہیں جانتے تھے اور نئے تعلیم یافتہ ان کو عربی یا اردو اصطلاحوں میں نہ سمجھا سکتے

تھے اور نہ پڑھا سکتے تھے، اس پر بھی جدید طبیعیات میں بیروت کی ایک عربی کتاب الدروس الاولیہ فی العلوم الطبیعیہ اور جدید ہیئت میں قسطنطنیہ کے چھپے ہوئے ہیئت جدیدہ کے ایک فارسی رسالہ کو نصاب میں داخل کیا اور کوشش کی کہ اس زمانہ میں جو ایک دو علما انگریزی پڑھے ہوئے ہیں، ان سے کام لیں، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب بی، اے کو بہ اصرار ان کی تعطیلوں میں بلوا کر ندوہ میں رکھا اور چند طلبہ کو ان سے الدروس الاولیہ کے کچھ اسباق پڑھوائے، مگر اس رواروی میں کتاب پوری نہ ہو سکی، پروفیسر مرزا ہادی صاحب رسوا، بی اے (پروفیسر عربی ریڈ کر سچین کالج لکھنؤ) سے (جو عربی میں عالم ہونے کے ساتھ جدید فلسفہ و ریاضیات میں بھی ماہر تھے اور بعد کو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں فلسفہ کے مترجم ہو گئے تھے) درخواست کی کہ وہ مدرسہ آ کر بعض طلبہ کو جدید ہیئت کا یہ رسالہ پڑھادیں، چنانچہ انہوں نے آ کر چند سبق پڑھائے، مگر یہ بھاڑے کا کام چند دنوں سے زیادہ چل نہ سکا۔

بہر حال اتنی ہی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ خاک سارا ۱۹۰۶ء کے جلسہ دستار بندی میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھ کر پیش کر سکا اور اندوہ میں تگوبین ارض اور مسلمان اور علم ہیئت پر چند نمبر لکھے اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی نے حواس خمسہ باطنی پر اندوہ میں ایک مضمون لکھا۔

۱۹۰۸ء میں جب مولانا حمید الدین صاحب مدرسۃ العلوم کراچی سے علی گڑھ کالج میں عربی لکچرر ہو کر آ گئے تو مولانا نے ندوہ کے جلسہ انتظامیہ میں یہ تجویز منظور کرائی کہ ایک طالب العلم کو ندوہ کے خرچ پر علی گڑھ کالج دروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ پڑھنے کے لیے بھیجا جائے، جہاں وہ آلات کا مشاہدہ بھی کر سکے گا، مولانا حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں ”مجلس انتظامیہ ندوہ نے بیروزو لیون پاس کیا کہ ایک طالب العلم کو وظیفہ دے کر مولوی حمید الدین کے پاس بھیجا جائے کہ وہ اس کو الدروس الاولیہ اور ہیئت جدیدہ پڑھائیں اور ممکن ہو تو وہاں آلات سے اس کو تجربہ بھی سکھلایا جائے، اس لیے ایک طالب العلم، تمہارے پاس بھیجا جائے گا، تم اس کی صورت قیام اور تعلیم و تجربہ سے مطلع کرو، اگر تم اپنے مکان میں جگہ دو تو وظیفہ اس میں محسوب کر سکتے ہو۔“ (حمید-۳۴)

اس تجویز پر عمل بھی ہوا مگر مولوی حمید الدین صاحب فوراً ہی علی گڑھ سے الہ آباد یونیورسٹی

میں چلے آئے، اس لیے تجویز کام یاب نہ ہو سکی۔

قرآن پاک کا درس | مولانا کی یہ کوشش ان کی متعدد تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ نصاب میں قرآن پاک اور علوم القرآن کو درس میں مستقل طور سے داخل کرنا چاہتے تھے، اسی لیے امام باقلانی کی اعجاز القرآن جب مصر سے چھپ کر آئی تو اس کو فوراً درس میں داخل کر دیا اور قرآن پاک کا درس بھی سبقاً سبقاً داخل نصاب کیا اور ۱۹۰۶ء میں قرآن پاک کے عالمانہ درس کے لیے خود وقت نکالا اور درس شروع کیا، اس میں مدرسہ کے اکثر طلبہ اور بعض مدرسین بھی شریک ہوتے تھے، اس میں ہر مسئلہ پر پوری پوری بحث ہوتی تھی، ۱۹ اپریل ۱۹۰۶ء میں مجھے بنارس سے لکھتے ہیں ”میں آ کر تفسیر کا مستقل درس دوں گا۔“ (سلیمان ۳) یہ اسی درکار کی طرف اشارہ ہے، چند ماہ کے بعد برسات میں حسب دستور مولانا جب بمبئی گئے تو یہ کام دارالعلوم کے مدرس اعلیٰ مولانا حفیظ اللہ صاحب کے سپرد کر گئے، استفسار کے جواب میں ۲ اگست ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہیں، قرآن کا درس ہو لیکن تحقیق کے ساتھ ہو، سرسری بے کار ہے، یہ سلسلہ اس طرح آگے نہ چل سکا، آخر اپنے بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب مصنف نظام القرآن کو لکھا کہ وہ اپنی تعطیل میں آ کر مدرسہ کے لڑکوں کو قرآن پڑھادیں، چنانچہ وہ دو سال تک اپنی تعطیل میں آ کر قرآن پاک کا درس دیتے رہے۔

رفیق مولوی ضیاء الحسن علوی اور مجھے خاص طور سے مولانا نے قرآن پاک کے اصول بلاغت پر اسباق بھی پڑھاتے رہے اور املا بھی کراتے رہے، مولوی ضیاء الحسن صاحب نے اس درس کے ان ہی معلومات کو ایک سلسلہ مضمون میں لکھا جو الہندوہ میں چھپا اور لوگوں نے اس کی تعریف کی اور دستار بندی کے جلسہ میں ۱۹۰۶ء میں انہوں نے قرآن پاک کی بلاغت پر بھرے جلسہ میں تقریر کی۔

بہر حال دارالعلوم کی خصوصیات میں یہ چیز اب تک باقی ہے اور قرآن پاک کا درس وہاں الحمد للہ کہ اب بھی جاری ہے اور اس کی تقلید بھی ہوتی جا رہی ہے۔

انقلابِ زمانہ | زمانہ کے اتنے پے در پے انقلابات کے بعد آخر ان علما کرام کو بھی جن کو شروع میں قدیم نصاب عربی کی اصلاح کی تجویزوں سے اختلاف تھا، مولانا کا ہم نوا ہونا پڑا، جمعیۃ العلما کے اجلاس لاہور منعقدہ ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷،

سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے باہمی مشورہ اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرانیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریاتِ عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو اور اس سلسلہ میں جمعیتِ علمائے ہند اربابِ علم سے رائے لے کر اپنی صوابدید کے مطابق حتی الوسع جلد کوئی موثر عملی اقدام کرے۔“

لیجیو وہی چیز جو کبھی مورد اعتراض تھی، اتنے دنوں میں جا کر مورد تحسین بنی، واللہ الحمد۔

ندوہ کا کتب خانہ | تعلیمی مرکزوں کے لیے کتب خانوں کے وجود سے چارہ نہیں، اس لیے دارالعلوم کے ساتھ ساتھ ایک کتب خانہ کا خیال بھی پہلے سے قائم تھا، اس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ ندوہ جب کانپور میں تھا، اسی وقت سے ایک زارالافتا کی شاخ بھی قائم تھی اور اس کے لیے فقہ کی کچھ کتابیں دفتر میں یک جا تھیں، اس کے بعد دارالعلوم کے قیام کے بعد ۱۳۱۶ھ-۱۸۹۹ء میں ندوہ کا سالانہ اجلاس جب شاہ جہاں پور میں ہوا تو وہاں کے ایک صاحبِ علم رئیس ڈپٹی مولوی عبدالرافع خان صاحب نے اپنا موردی کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تھیں، ندوہ کو عنایت فرمایا، اس کے بعد ۱۳۱۸ھ-۱۹۰۵ء میں ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں مولوی عبدالغنی وارثی بہاری (مددگار صدر محاسب سرکار نظام) نے اپنی کتابیں جو زیادہ تر تاریخ اور محاضرات پر مشتمل تھیں، ندوہ کے نذر کر دیں، اسی زمانہ میں کچھ اور صاحبوں نے اپنے اپنے بزرگوں کے علمی سرمایوں کو جو ان کے قابل نہیں رہے تھے یا وہ اب ان کے قابل نہیں رہے تھے، ندوہ کے حوالہ کر دیا۔

مولانا شبلی مرحوم کی آمد سے پہلے ندوہ کے کتب خانہ کا سرمایہ اسی قدر تھا، مولانا کو کتابوں سے جو شغف تھا وہ بیان کا محتاج نہیں وہ ۱۹۰۵ء میں جب ندوہ آ کر بیٹھے تو دوسرے صیغوں کے علاوہ اس صیغہ کی طرف بھی توجہ فرمائی، سب سے پہلے اپنے کتب خانہ کو جو اعظم گڑھ میں پڑا تھا اور جس کو کبھی تین ہزار روپیے میں بہ ضرورت علاحدہ کرنا چاہتے تھے، لکھنؤ میں منتقل کر لیا اور ۱۹۰۷ء میں اس کو ندوہ پر وقف کیا، اس کتب خانہ میں تاریخ و ادب کا بڑا سرمایہ تھا اور مصر و شام و قسطنطنیہ کے مطبوعات کے علاوہ یورپ کے بعض نادر مطبوعات بھی تھے۔

مولانا کی تحریک سے مولانا کے بعض دوستوں نے بھی توجہ فرمائی، جون ۱۹۰۷ء میں نواب سکندر نواز جنگ حافظ احمد رضا خاں صاحب سکندر منزل پٹنہ (سابق جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن) نے اپنی کتابیں نذر کیں، ان کتابوں کو پٹنہ سے لانے کا کام خاک سار کے سپرد ہوا، جس کو بہ خوشی انجام دیا، اسی سال شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر حیدرآباد دکن اور حکیم علی احمد صاحب نے اپنی کتابیں ندوہ کو دیں،

مارچ ۱۹۰۸ء میں پٹنہ سے آرنہیل مولوی شرف الدین صاحب حج ہائی کورٹ کلکتہ نے بھی اپنی کتابیں بھیجیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نواسہ سید مرتضیٰ صاحب نے اسی سال اپنے حصہ کی کتابیں ندوہ کے حوالہ کر دیں، نواب عماد جنگ بہادر (حیدرآباد) کا کتب خانہ جس میں مطبوعات یورپ کا اچھا ذخیرہ تھا، اسی زمانہ میں ندوہ میں آیا، ۱۹۱۰ء میں امیٹھی سے مولوی یوسف علی صاحب مرحوم کا کتب خانہ جس میں متعدد نایاب قلمی کتابیں تھیں، ندوہ میں شامل ہوا، (الندوہ جولائی ۱۹۱۰ء) اسی سال نواب علی حسن خاں صاحب خلف الصدق نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتابیں ندوہ کے نذر کیں، ان کی ہمیشہ مرحومہ صفیہ بیگم کے حصہ کی کتابیں اس سے دو ایک سال پہلے ندوہ کے کتب خانہ میں داخل ہو چکی تھیں، دلی سے نواب احمد سعید خاں بہادر خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر مرحوم کی کتابیں آئیں، یہ وہی کتب خانہ تھا جس کی مدد سے ایٹ نے تاریخ ہند لکھی تھی، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بگڑامی نے اپنا کتب خانہ جس میں انگریزی اور عربی کتابوں کا بڑا سرمایہ تھا مارچ ۱۹۱۱ء میں ندوہ کے حوالہ کیا، مولانا نے ان کو لانے کے لیے مجھے حیدرآباد بھیجا، یہ میرا حیدرآباد کا پہلا سفر اور نواب عماد الملک سے میری ملاقات کا پہلا ذریعہ تھا، میں ایک مہینہ کے قریب مولوی عبدالغنی صاحب وارثی (مددگار صدر محاسب سرکار عالی) کے یہاں مقیم رہا اور روزانہ نواب صاحب کے یہاں جا کر نواب صاحب کے ساتھ مل کر کتابیں الگ کر تا رہا، نواب صاحب مرحوم اپنے ہاتھ سے کتابیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کرتے جاتے تھے اور میں رکھتا جاتا تھا، اگر نواب صاحب مرحوم اپنی زندگی میں یہ نہ کر جاتے تو عجب نہیں کہ ان کے بعد ان کی کتابوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان کے بھائی مولوی سید علی صاحب بگڑامی کی کتابوں کا ہوا۔

عطیات کے علاوہ نئی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی شروع فرمایا، مختلف مدوں سے وہ کتب خانے کے لیے روپیہ الگ رکھتے تھے، جب کوئی نئی کتاب چھپتی اور اس کا نام مصری رسالوں اور فہرستوں میں پڑھتے تو مجھے ان کے منگوانے کی ہدایت فرماتے اور وہ منگوائی جاتی، اس طرح ۱۹۰۹ء تک کتب خانہ میں جو سرمایہ فراہم ہوا تھا، اس کی تعداد ۶۲۸۴ تھی اور ۱۹۱۳ء میں جب وہ ندوہ سے الگ ہوئے ہیں، یہ تعداد دونی ہو گئی تھی، یعنی ۱۱۲۱۵ اور اب یہ تعداد بگنی ہو گئی ہے۔

۱۔ مکتوبات بہ نام شروانی، ص ۴۳ ۲۔ مکتوبات ابوالکلام آزاد، ص ۲۶ ۳۔ مکتوبات سلیمان، ص ۲۶ رواد دارالعلوم مرتبہ مولانا شبلی بابت ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳

الندوہ

۱۹۰۲ء/۱۳۲۲ھ - ۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ

الندوہ کا ذکر اس سے پہلے آجانا چاہیے تھا، کیوں کہ اس کا آغاز ۱۹۰۲ء میں ہو چکا تھا لیکن چون کہ اس کی اشاعت سے ایک بڑی غرض طلبائے وار العلوم کی ذہنی ترتیب تھی، اس لیے اسی سلسلہ میں اس کا ذکر اس موقع پر کیا جاتا ہے۔

مولانا کو الندوہ یعنی ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک علمی رسالہ کی اشاعت کا خیال غالباً ۱۹۰۲ء میں آیا، اس قسم کے علمی رسالوں کا تجربہ ارکان میں مولانا سے زیادہ کسی اور کو نہ تھا لیکن جب ندوہ کی طرف سے یہ رسالہ نکالنا طے ہوا تو ارکان نے صرف مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو اس کا ایڈیٹر بنایا، مولانا کو ارکان کی اس فروگزاشت پر تعجب ہوا، ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء کو مولانا شروانی کو شکایت لکھی ”رسالہ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپ نے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت اور نام درمی مقصود ہوتی تو اس کے لیے علی گڑھ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پا جائے۔“ (شروانی - ۳۱) یہی شکایت ۶ دسمبر ۱۹۰۲ء کو ایک خط میں دوبارہ دہرائی گئی ہے۔ (شروانی - ۴۳)

مولانا شروانی اس کوشش میں تھے کہ اپنی ذمہ داری میں وہ مولانا شبلی کو بھی شریک کر لیں اور اس کے لیے وہ ارکان سے خط و کتابت کر رہے تھے، اس کی نسبت ۸ نومبر ۱۹۰۲ء کو مولانا شبلی نے انہیں لکھا ”رسالہ کے ایڈیٹروں میں مولوی محمد علی صاحب (ناظم) غالباً میرا نام پسند نہ کریں، پھر آپ ”مہمان ربا فضولی چکار“ کیوں کرتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ میں رسالہ کے لیے موجودہ حالت میں تیار بھی نہیں، ندوہ نے اپنی تجویزوں کے جو نمونے دکھائے یعنی دارالعلوم و دارالافتا وغیرہ وغیرہ کیا رسالہ بھی ایسے ہی نمونہ پر نکالنا مقصود ہے؟ مجھ کو تو ایسے ہی سامان نظر آتے ہیں، علما میں کون صاحب لکھنے کے قابل ہیں اور نہیں تو کیا ندوہ کا رسالہ بھی نیچریوں کی مدد سے نکلے گا؟ اور وحید الدینؒ و مولوی عبدالعلی و مرتضیٰ سے در یوزہ گری کیجیے گا، ایک آپ کیا کیا کریں گے؟“ (شروانی - ۴۵)

۱۔ حسب تصریح مولانا شروانی ۲۔ مولوی وحید الدین سلیم معارف علی گڑھ سے نکالتے تھے اور مولوی عبدالعلی صاحب اور مولوی مرتضیٰ صاحب جو اس زمانہ کے مولوی فاضل تھے، اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

اس کمی کو دوسرے ارکان نے بھی محسوس کیا، چنانچہ ۷/۱۲ شعبان ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) کے جلسہ انتظامیہ میں مولوی عبدالحی صاحب وکیل چندوسی کی تحریک اور شی محمد اطہر علی صاحب کی تائید سے مولانا الندوہ کے اڈیٹر قرار دیے گئے۔

۱۹۰۳ء کے آخر میں مولانا نے رسالہ کا ایک خاکہ (مسودہ) بنا کر دفتر میں لکھنؤ بھیجا مگر وہ یونہی پڑا رہا، شاہ جہاں پور میں ناظم صاحب کے پاس بھیجا نہیں گیا۔ ۳، ۴، ۵، ۶ جنوری ۱۹۰۴ء کو ندوہ کا اجلاس جب مدراس میں ہوا تو ناظم صاحب نے فرمایا کہ ”مجھے اس مسودہ کی خبر بھی نہیں ہوئی، آخر مدراس ہی میں ۱۵ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۰۴ء کے جلسہ انتظامیہ میں مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری کی تحریک اور مولانا شبلی کی تائید سے یہ طے ہوا کہ ایک مہینہ کے اندر رسالہ کی درخواست ناظم صاحب کی طرف سے گزر جائے اور رسالہ کی نگرانی و تصحیح وغیرہ دفتر کی نظامت سے کی جائے، اس پر بھی دو ہفتے گزر گئے تو ۲۲ جنوری ۱۹۰۴ء کو شروانی صاحب کو لکھا، میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا، وہ دفتر میں پڑا رہا، ناظم صاحب نے مدراس میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔“

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں ”ناظم حال رسالہ ندوہ کی درخواست دیتے ہوئے بہت بچکتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں، مشکل یہ ہے کہ ناظم کے سوا اور کوئی شخص درخواست نہیں دے سکتا، درنہ میں سو دفعہ درخواست دے چکتا۔“

بہر حال یہ مشکل یوں حل ہوئی کہ مدوگار ناظم مولانا سید عبدالحی صاحب نے اپنے نام سے

www.KitaboSunnat.com درخواست دی اور وہ منظور ہوئی۔

اس وقت ندوہ کا دفتر سخت انتشار کی حالت میں تھا، ندوہ کے قائم مقام ناظم مولانا مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہ جہاں پور تھے، اس لیے مولانا سید عبدالحی صاحب مدوگار ناظم، ندوہ کا آدھا دفتر لے کر شاہ جہاں پور چلے گئے تھے اور آدھا دفتر لکھنؤ میں تھا، بہر حال اسی انتشار کی حالت میں ۱۹۰۴ء کے اواخر میں ندوہ کی اشاعت کے سامان اس طرح مکمل ہوئے کہ مولانا سید عبدالحی صاحب مدوگار ناظم کے قیام شاہ جہاں پور کے سبب سے شاہ جہاں پور اس کا مقام اشاعت ہوا، رسالہ کے دواڈیٹر مقرر ہوئے، ایک مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جو علی گڑھ میں تھے اور دوسرے مولانا شبلی جن کا قیام ان

۱۔ مکاتیب اول، شروانی، ۳۵۔

دنوں حیدرآباد میں تھا، اس کی چھپائی کا انتظام آگرہ میں صوفی محمد علی خان کے مطبع مفید عام میں ہوا اور اس کا مقصد جیسا کہ اس کی لوح پر لکھا ہوا تھا ”علوم اسلامیہ کا احیاء تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ قرار پایا، ضخامت ۲ جز یعنی ۳۲ صفحے ٹھہری اور اس شان سے اگست ۱۹۰۳ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ میں اس کا پہلا نمبر منظر عام پر آیا۔

پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصابِ تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضمون شائع ہوئے جو زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم ہی کے قلم سے نکلے تھے، اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علما کی سطحِ جامد میں حرکت پیدا کی تھی، اب تک علما کے تحقیقاتی مسائل، منطق، عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے جن پر گو بہت لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا وہ ان ہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، منطق و فلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا، حاشیے لکھنا، تعلیقات لکھنا غیر مفید مناظرانہ رسائل تالیف کرنا یہ علما کے مشاغل تھے، حالانکہ زمانہ کا رُخ ادھر سے ادھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیے تھے، الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور ان کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں لیکن انہوں نے اس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے۔

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علما کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے اور جو اس کو پسند کرتے تھے، وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی اس کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

الندوہ کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علما اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بے حد پڑا اور نام نہیں لوں گا، مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درس گاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایہ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرہ میں نام وری حاصل کی اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا۔

خود دارالعلوم کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور کئی مستعد طالب علموں کی (جو اس وقت کے مشہور مفسرین ہیں) بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی اور اس طرح اہل علم بھری محفل میں ان کو زبان کشائی کی جرأت ہوئی، چند ہی نمبروں کے بعد اہل نظر کی نگاہیں، الندوہ کی اس افادہ حیثیت

پر پڑیں، الندوہ میں علم حدیث پر دارالعلوم کے ایک طالب العلم (سید سلیمان بہاری) کا جو مضمون چھپا تھا اس کو پڑھ کر مولانا حالی نے مولانا کو لکھا ”سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے، فبارک اللہ فیہا و فی طلبتہا و فی تعلیمہا مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بہ قدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی۔“

اس سلسلہ میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی ایم اے (انسپیکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) مولوی عبدالسلام صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین، مولوی خواجہ عبدالواحد صاحب ندوی ایم، اے کان پورا اور دوسرے طلبہ قابل ذکر ہیں، مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، مولوی عبدالرحمن بگرامی مرحوم، مولوی قمر الدین ندوی مرحوم وغیرہ بھی اس کے دوسرے دور کی یادگار ہیں۔

الندوہ میں وقتاً فوقتاً جو مضامین نکلے، ان میں سے قابل ذکر مضامین کی فہرست ۱۹۰۶ء میں خود مولانا نے ایک موقع پر دی ہے، جو یہ ہے، علوم القرآن، فلسفہ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا، علوم جدیدہ، ابن رشد، فن بلاغت، تذکرہ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، فن نحو کی مروجہ کتابیں، مسائل فقہیہ پر ضروریات زمانہ کا اثر، موبدان مجوس، ذواتون مصریہ، فارسی شاعری اور عربی شیرازی، مسلمانوں کی بے تعصبی، پردہ اور اسلام، ابن جوزی کی کتاب منقذ قلب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو، جمہورۃ البلاغہ، سوانح امام البخاری اور ان کی تصنیفات، المرأة المسلمہ پر ریویو۔

ان میں گیارہواں مضمون مولانا شروانی کا پندرہواں دراصل مولانا حمید الدین قرہاوی کا سولہواں، سید سلیمان بہاری کا اور سترہواں مولانا ابوالکلام کا ہے، باقی سب اپنے وجود میں مولانا کے قلم کے رہن منت ہیں۔

ان کے علاوہ جو مضامین نکلے ان میں اعجاز القرآن، مسئلہ ارتقا اور حکمائے اسلام عربی زبان کی خصوصیات، مسئلہ تاج، شیخ الاشراف سہروردی، مسلمانوں کا ذخیرہ علوم اور یورپ، جرجی زیدان کے تمدن اسلام پر ریویو، الاحساب فی الاسلام، اشتراکیت اور اسلام، قضا و قدر وغیرہ بیسیوں مضامین ہیں جو آج بھی ہماری زبان میں معلومات کا سرمایہ اور تحقیقات کا خزانہ ہیں۔

الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبد مینا پر شور ہے، ان میں سب سے پہلا نام، مولانا عبداللہ العمادی کا ہے جو جون پور کے ایک گاؤں کے رہنے والے اور ادب میں مولانا عبدالعلی آسی مدرسی لکھنؤی کے شاگرد ہیں اور اس زمانہ میں عربی رسالہ البیان لکھنؤ کے ایڈیٹر تھے، وہ فارسی و عربی ادبیات و تاریخ سے فطری مناسبت رکھتے تھے اور مولانا سے لکھنؤ میں اکثر ملتے رہتے تھے، مولانا نے جب ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ آکر قیام کیا اور الندوہ کا دفتر شاہ جہاں پور سے لکھنؤ آیا تو رسالہ مولوی عبدالعلی صاحب آسی مدرسی مرحوم کے مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں چھپنے لگا، جہاں سے البیان نکلتا تھا، جون ۱۹۰۵ء سے مولانا عمادی کو الندوہ کی ادارت سپرد ہوئی، اس سلسلہ میں ان کے مضامین اعجاز القرآن اور علم مناظرہ وغیرہ نکلے، موصوف یہاں سے نکل کر ”وکیل“ امرتسر ”زمین دار“ لاہور اور ”الہلال“ کلکتہ میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور اب وہ سالہا سال سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں عربی کے مترجم اور وہاں کے علمی حلقوں کے رکن رکین ہیں۔

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب ایڈیٹر ہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے ممبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا، مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانہ تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا، وہ ان کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے، یہیں انہوں نے مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے، جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو گھر کر الہلال میں نظر آیا۔

مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون مسلمانوں کا ذخیرہ علوم اور یورپ لکھا جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا، اس کے بعد ”المرآة المسلمة“ کے نام سے مصر کے قاسم امین بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے، یہی سلسلہ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا، اسی قسم کے ایک خط کے جواب

میں مولانا لکھتے ہیں ”آزاد کو تو آپ نے مخزن^۱ وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے، معلومات میں یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔“ (مہدی-۱۹)

الندوہ میں ان کے مضامین نے ان کے نام کو ہر طرف پھیلا دیا اور اخباروں اور رسالوں سے ان کی مانگ شروع ہو گئی، آخر کار وہ ۱۹۰۶ء میں ”وسیل“ امرتسر میں چلے گئے اور قریباً دو سال وہاں رہے ہوں گے، اسی اثنا میں ان کے بڑے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یمن صاحب آہ کا عراق میں جہاں وہ سیر و سیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے، انتقال ہوا اور اس کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا خیر الدین صاحب نے جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزار ہا مرید تھے، وفات پائی، رحلت کے وقت انہوں نے مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا، اب انہوں نے امرتسر چھوڑ کر پہلے بمبئی میں اور پھر کلکتہ میں قیام کیا اور ہدایت و ارشاد خلق میں مصروف ہوئے، آخر ۱۹۱۲ء میں انہوں نے ”الہلال“ نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمہری جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے۔

۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے، مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا نے الندوہ کا بلوچھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا، جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا، اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا (سیلمان-۲۲) اور جون و جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر ان کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالہ کر دیا گیا، اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا۔

اس کے بعد یہ عزت ہمارے دوست مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کو حاصل ہوئی، انہوں نے اپنا پہلا مضمون تناخ پر ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا، جس کو دیکھ کر مولانا بے حد خوش ہوئے اور اس کو الندوہ منگی ۱۹۰۶ء میں اپنی پسندیدگی کے اظہار کے ساتھ بہت شوق سے چھاپا اور یہ خوش خبری اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اپنے ایک خط میں مہدی افادی کو جو ادب اردو کے دلدادہ تھے، ان لفظوں میں پہنچائی ”ہمارے یہاں یعنی ندوہ میں عبدالسلام نہایت قابل لڑکا ہے جو غالباً خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔“ (مہدی-۲۷)

۱۔ رسالہ مخزن لاہور سے (سر) شیخ عبدالقادر ۱۹۰۷ء سے نکالتے تھے، مولانا ابوالکلام کے ابتدائی مضمون اسی میں نکلے تھے، خود میرے بھی ابتدائی مضمون اسی میں چھپے تھے۔

پھر ۱۳ دسمبر ۱۹۰۶ء کو انہیں لکھا ”عبدالسلام نہایت ہونہار ہے، وہ پورا مصنف ہو سکتا ہے اور ہوگا، انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے، ندوہ اس قسم کے جو اہر کا چمکانے والا ہے۔“ (مہدی-۲۹)

بالآخر زمانہ نے اس پیشین گوئی کو حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دیا۔

مولوی عبدالسلام صاحب نے اس اثنا میں شیخ الاشراف سہروردی اور امام مسلم وغیرہ پر مضامین لکھے اور آخر ۱۹۰۹ء میں جب وہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو الندوہ کی ادارت ان کے حوالہ کر دی گئی، جس کو انہوں نے مارچ ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک بہ خوبی انجام دیا، اس کے بعد یہ خدمت اگست ۱۹۱۱ء سے پھر تیسری دفعہ میرے سپرد ہوئی، جس کو میں نے مئی ۱۹۱۲ء تک پورا کیا اور اسی پر اس الندوہ کا خاتمہ ہوا جس کے اڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی تھے، ندوہ کے اختلافات نے اس کا خاتمہ کیا تھا، ندوہ کے دوسرے فریق نے یہ امانت دار العلوم ندوہ کے ایک مدرس مولانا عبدالکریم صاحب کے سپرد کی جو دارالعلوم کے چند مہتممی لڑکوں کی مدد سے اس کو چند مہینے چلاتے رہے، بعد ازیں مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی نے اس کی ادارت کا بوجھ اٹھایا اور آخر ۱۹۱۶ء میں وہ بہ ظاہر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا، مگر اب ۲۲ سال کے بعد میں نے بعض ندوی عزیزوں کو اس کی ادارت دے کر جنوری ۱۹۴۰ء سے دوبارہ نکالنے کا اہتمام کیا ہے، والامر بید اللہ تعالیٰ۔

الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کیے وہ حسب ذیل ہیں:

- ۱- اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا۔
- ۲- جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔
- ۳- علما کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔
- ۴- عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔
- ۵- اسلام اور تاریخ اسلام پر سے بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا۔
- ۶- قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی۔

مولوی عبدالعلیم صاحب شرر نے بھی اپنے مضمون میں الندوہ کی اہمیت ان لفظوں میں بیان کی ہے، مولانا کا اہم کام الندوہ تھا جس نے مسلمانوں کے لیے بہت سا محققانہ تاریخی سامان فراہم کر دیا اور اس کے سلسلے میں مولانا نے بڑے اہم مسائل میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔

بھوپال کی ماہانہ امداد | اب تک جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کی ان خدمات کا تذکرہ تھا جو انہوں نے دارالعلوم کی علمی و تعلیمی ترقیوں کے لیے کیں لیکن ابھی ان کی ان خدمتوں کا تذکرہ باقی ہے جو دارالعلوم کی مالی ترقی اور اس کی تعمیر کے سلسلہ میں انہوں نے فرمائیں، اب تک دارالعلوم کی مستقل آمدنی نہ تھی، سالانہ جلسوں اور سفر کے دوروں سے جو چندہ وصول ہوتا تھا وہ مدرسہ پر خرچ ہوتا تھا، ریاست حیدرآباد نے نواب وقار الامرا کے عہد وزارت میں نواب وقار نواز جنگ مولوی وحید الزماں خاں صاحب کی کوشش سے غالباً ۱۹۰۰ء میں پچاس روپیے ماہ وار دفتر ندوۃ العلماء کے لیے اور پچاس مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ کے لیے مقرر کیا تھا، جس کو انہوں نے بکمال ایثار ندوہ کو منتقل کر دیا تھا، یہ سو روپیے ماہ وار مجلس ندوۃ العلماء کے ماہانہ مصارف میں کام آتے تھے۔

البتہ ۱۹۰۲ء میں جب ندوہ کا اجلاس پہلی دفعہ امرتسر میں ہوا تو نواب محمد بھاول خان عباسی فرماں روائے بھوپال کے سع مبارک تک ندوہ کی آواز پہنچی اور انہوں نے اس کی امداد کی طرف توجہ فرمائی، پھر ۱۹۰۳ء میں تین سو سالانہ مدرسہ کے غریب طالب علموں کے وظیفہ کے لیے مقرر فرمائے، دارالعلوم کے لیے یہ پہلی مستقل امداد تھی۔

اوائل ۱۹۰۵ء میں جب مدرسہ کے انتظامات کی باگ مولانا نے اپنے ہاتھ میں لی تو ادھر بھی توجہ فرمائی اور یہ طے ہوا کہ مختلف مقامات میں دفن و روانہ کیے جائیں اور قوم کے رئیسوں کو ندوہ کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولوی غلام محمد صاحب شملوی کو بھوپال داحمد آباد کی طرف روانہ کیا گیا، بھوپال پہنچ کر ندوہ کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس کام کے لیے خود مولانا کو تکلیف دی جائے، چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں مولانا خود بھوپال تشریف لے گئے، سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرماں روائے بھوپال نے مولانا کو ملاقات کا موقع بخشا، مولانا اس ملاقات سے بے حد متاثر ہوئے اور یہ تاثرات ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو قلم بند کر کے الندوہ (اکتوبر ۱۹۰۵ء) میں چھپوائے، اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار عالیہ نے نومبر ۱۹۰۵ء میں مولانا کی موجودگی ہی میں پچاس روپیے ماہ وار کی امداد جاری فرمائی، مولانا نے تار کے ذریعہ سے جب یہ خبر دارالعلوم میں بھیجی تو ہر طرف عید کی سی خوشی چھا گئی۔

۱۔ مکاتیب سلیمان، ۵۱، ۲۔ روداد امرتسر ۱۹۰۲ء، ص ۱۴۵، ۳۔ روداد مدراس ۱۹۰۳ء، ص ۱۰۵۔

اجلاس بنارس ۱۹۰۶ء اور پہلی علمی نمائش | مولانا کی معتمدی سے پہلے ندوہ کے بڑے بڑے دس شاندار جلسے بڑے بڑے شہروں میں بلا انقطاع ہو چکے تھے، پچھلا دسواں جلسہ شروع جنوری ۱۹۰۴ء میں مدراس میں ہوا تھا، اس کے بعد باقی ۱۹۰۴ء اور پورا ۱۹۰۵ء جلسوں سے خالی گیا، مولانا دھوم دھام کے جلسوں کے قائل نہ تھے، بلکہ اس کے ذریعہ سے کچھ کام چاہتے تھے، سرکار عالیہ کی فیاضی سے جب امید کی پہلی شعاع نظر آچکی تو جلسہ سالانہ کی فکر ہوئی، اس کے لیے اضلاع مشرقی کے دو شہر گورکھپور اور بنارس نے پیش قدمی کی، مگر کام یابی بنارس کو ہوئی اور مارچ ۱۹۰۶ء میں بنارس میں ندوہ کے گیارہویں اجلاس کا اعلان ہوا، اس اجلاس میں دو باتیں خاص ذکر کے قابل ہیں، ایک علمی نمائش کا انتظام، جس میں شاہی فرامین، قطعات، نادر قلمی نسخے، تصاویر آلات ہیئت وغیرہ اسلامی علمی یادگاروں کی نمائش کی گئی تھی اور اس غرض سے دور دور سے قلمی کتابیں اور نادر یادگاریں منگوا کر فراہم کی گئی تھیں، دوسری چیز فارسی شاعری اور بعض دوسرے علوم عہد بہ عہد کے دواوین اور تصانیف اس طور سے ترتیب کے ساتھ رکھی گئی تھیں کہ بیک نظر اس فن کی ترقی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا، اس نمائش پر تبصرہ کے عنوان سے مولانا نے ایک نہایت عالمانہ اور محققانہ تقریر فرمائی جس میں ان یادگاروں کی اہمیت اور ان علوم کی تاریخی ترقی پر روشنی پڑتی تھی۔

علمی حیثیت سے یہ جلسہ بہت کام یاب ہوا، اس علمی نمائش کی روداد خود مولانا کے قلم سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس میں اس کی خصوصیات پوری تفصیل سے مذکور ہیں، اسی جلسہ میں مولانا نے پہلی دفعہ طلباء سے مجمع عام میں تقریریں کرائیں اور ان کو پیش کر کے آخر میں یہ شعر پڑھا:

لنخے برداز دل، گذر دہر کہ ز پشم من قاش فروش دلی صد پارہ خولشم

اس جلسہ میں خاک سار نے اور مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے تقریریں کیں، مولوی صاحب مرحوم کی تقریر سب کو بے انتہا پسند آئی، مولانا کا قاعدہ تھا کہ جلسوں میں لڑکوں کو پیش کر کے خود اٹھ جاتے تھے کہ لڑکے مرعوب نہ ہو، مولوی عبدالباری صاحب کی کام یاب تقریر کی خبر سنی تو خوشی میں خود آئے اور اپنی عبا ان کو پہنائی، افسوس کہ انہوں نے عین شباب میں انتقال کیا۔

بنارس میں ہنگامی قیام اور شعرا لہجہ | بنارس کے اجلاس اور علمی نمائش میں فارسی ادب کا پورا

۱۔ اس نمائش کی تفصیل کے لیے دیکھیے الندوہ مارچ، اپریل، مئی ۱۹۰۶ء ۲۔ مقالات شبلی جلد ہفتم۔

سٹ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتب خانہ سے منگوا لیا تھا، یہ ذوق اس وقت اس کا پتہ دے رہا تھا کہ وہ فارسی شاعری کی تاریخ یعنی شعر العجم کی تالیف میں مصروف ہیں، جلسہ کے ختم ہونے کے بعد انہوں نے ایک دو مہینہ بنارس ہی میں قیام کیا، شہر کے کنارہ پر ایک بنگلہ لے لیا تھا، اسی میں رہتے تھے، اور شعرائے عجم کی باتوں سے جی بہلاتے تھے، نمائش کی روداد بھی وہیں سے لکھ کر بھیجی اور اس کے متعلق ہدایات مجھے بنارس سے بھیجتے رہے جن کا ذکر مکتب میں میرے نام کے ابتدائی خطوط میں ہے، ۱۹۰۶ء اپریل ۱۹۰۶ء کو مجھے ارقام فرمایا۔

مجھ کو آنے میں ڈرا دیر ہوگی، اب انگریزی پر زیادہ توجہ کرو، میں آ کر تفسیر کا مستقل درس دوں گا۔“

(سلیمان-۳)

میں نے جلد واپسی کی تمنا ظاہر کی، تو ۲۸ اپریل ۱۹۰۶ء کو ارشاد ہوا ”بھائی اب مہینہ دو مہینہ تو ستانے دو، ابھی وہاں نہ بلاؤ، یہاں بھی میں سب سے الگ رہتا ہوں، ایک بنگلہ کرایہ پر لے لیا ہے، وہیں رہتا ہوں لیکن لوگوں کو پتہ نہیں دیتا کہ یہاں بھی رات دن کی بگ بگ نہ رہے“ (سلیمان-۷)

اسی زمانہ میں مجھے سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا لکھنے کی ہدایت فرمائی اور احادیث و مسانید کی طرف توجہ دلائی۔ (سلیمان-۷)

واپسی اور قرآن پاک کا درس | کچھ دنوں کے بعد واپس آ کر حسب وعدہ قرآن پاک کا درس شروع فرمایا، جس میں اول تمام طلبہ نے شرکت کی اور سب نے بہ قدر استعداد فیض پایا لیکن آخر میں صرف دو طالب علم رہ گئے، خاک سارا اور مولوی ضیاء الحسن صاحب، مولانا گرمی اور لوتو برداشت کر لیتے تھے، مگر برسات کا جس اور پسینہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے اس زمانہ میں بمبئی میں سمندر کی آب و ہوا ان کو پسند تھی، چنانچہ قرآن پاک کا درس مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اول دارالعلوم کے سپرد کر کے بمبئی کا سفر کیا۔

بمبئی اور دستہ گل کا پس منظر | میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا تھا اور یہی ”دستہ گل“ کی عطربیزی اور مشام پروری کا زمانہ تھا، دستہ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں ”نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ دنورا“ مولانا کو انیس برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد آیا تھا، ۱۱ ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی سے مہدی افادی مرحوم کو لکھتے ہیں ”۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا، یہاں کی دل چسپیاں غضب کی

محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کر سکتا، اپالو یہاں عجیب سیرگاہ ہے اور چوپائی اس کا جواب ہے، خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے، ”کنارا آب چوپائی و گلکش پالورا“ اس غزل کا ایک شعر ہے:

بہر سو از ہجوم دلبران شوخ بے پردا گزشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرورا
(مہدی-۲۶)

یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ مولانا حالی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا اور قیاس فرمایا کہ اس میں چشم ساقی کی مستی بھی آمیز ہے، خود شاعر نے بھی اپنے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع رکھا ہے:

اند کے نیز بکام دل خود میں باشم روزگارے چودم از دانش و عرفان زدہ ام
چند در پردہ تو ان کردن فاش بگوئے سنگ بر شیشہ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام
جامہ زہد چو بر قامت من راست بود شیشہ تقویٰ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
ان شدائے دوست کہ آراستے پیکر فن نقش زیبا صنمے بر ورق جان زدہ ام
آں شدے اے دوست کہ درندہ بہ بنی بازم کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام

وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس ”دشمن ایماں کی تلاش“ سمی میں کرتے

ہیں، حالاں کہ وہ علی گڑھ میں تھا، یعنی کہ وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے۔

یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں اور زبان و طرز ادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں، معاصر شعرا نے جوابی

غزلیں لکھیں جو خوش گمان تھے وہ ان کو تصوف کے رموز و اسرار سمجھ اور مولانا سے دست بیعت ہونے اور ان

کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں جو بدگمان تھے وہ اس وصف عنوانی کے افراد کی تلاش میں لگ گئے، حالاں کہ

واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ بلکہ صرف سمی کی خوش سوادی اور حسن منظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا

”خطوطِ شبلی“ کے اوراق میں یہ سامان نہیں، ان کی تاریخ دو برس کے بعد ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی ہے، غزل

کے منتخب اشعار ہم ذوق دوستوں اور عزیزوں کو لکھ کر بھیجے تھے، ۵ نومبر ۱۹۰۶ء مولانا شروانی کو یہ غزل بھیجی:

گرچہ من مرد ہوسنا کی درندی نیستم ایں چنینیں ہم گاہ گاہ ہم اتفاق افتادہ بود

۱۶ نومبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ سے سمی کی ایک غزل کے دو شعر لکھ کر بھیجے، دوسرا شعر ہے:

من ندائے بہت شوخے کہ بہ ہنگام وصال بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

مولانا اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے تو ایک خیالی بات لکھ دی، لکھنؤ کے ایک صاحب کے

سامنے اخیر کا شعر پڑھا تو کہنے لگے اس کالج کے پروفیسر یہیں مل سکتے ہیں (شروانی-۵۷) یہ میرے سامنے کی بات ہے لکھنؤ کے جن صاحب کا اشارہ اس میں ہے ان کا نام تو یاد نہیں رہا، اتنا یاد رہ گیا ہے کہ وہ ”زہر عشق“ کے مصنف مرزا شوق کے نواسے تھے۔

فروری ۱۹۰۸ء میں جب مدہوش اور دوش والی پہلی غزل کہی ہے:

ساقی مست چوسوئے من مدہوش آید ساغر از کف بنہد میکدہ بردوش آید
 این غزل اول فیض اثر بمبئی است باش تا بادہ این میکدہ در جوش آید
 باش تا شبلی آزاد بہ زیبا صنے از در صومعہ تا میکدہ ہم دوش آید

تو مولانا شروانی کی فرمائش سے ان کو بھیجی، آخر میں لکھا ”افسوس یہ ہے کہ ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں۔“ (شروانی-۶۹)

بمبئی میں ندوہ کی تحریک | بمبئی کے اس قیام کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ یہاں کے دولت مند سٹیٹوں کو ندوہ کی امداد کی طرف مائل کیا جائے، مگر وہاں بدعات کا جو زور تھا اور علمائے واعظین نے اس کی مٹی جس طرح خراب کی تھی اس سے ان کو ہمت نہیں پڑتی تھی، ۲۳/ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں ”بمبئی میں اس دفعہ صرف منصف پراکتفا کیا گیا، وہاں شدت سے یہ خیال پھیلا ہے کہ ندوہ کفر ہے۔“ (حمید-۳۶)

افسوس کہ یہ کفر اب تک نہیں ٹوٹا، مولانا نے جس منصف کی طرف اشارہ کیا وہ یہ تھا کہ انجمن اسلام ہال میں ندوہ کے اغراض و مقاصد پر ایک تقریر کی۔

بڑودہ کا سفر اور مضامین عالم گیر | بمبئی کے اس سفر میں ایک عظیم الشان کام کی بنیاد پڑی، محمد علی مرحوم (اڈیشہ کا مرید) جو مولانا کے علی گڑھ کے شاگرد بھی تھے، اس زمانہ میں بڑودہ میں نوکر تھے، ان کے اصرار پر وہ بڑودہ گئے اور ان ہی کے مکان پر قیام کیا، اسی زمانہ قیام میں انہوں نے مولانا سے یہ تحریک کی کہ وہ عالم گیر کے الزامات کی تحقیق و جواب میں مفصل مضمون لکھیں، مولانا نے اس کو منظور کیا، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر واپسی کے بعد ۵ دسمبر ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا اور اسی مہینہ کے اندوہ میں شائع ہوا، سوارس کے بعد ۶ نمبروں میں مارچ ۱۹۰۸ء میں یہ سلسلہ ختم ہوا اور نہایت مقبول ہوا، محمد علی مرحوم اس سلسلہ مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے، بلکہ جون ۱۹۰۸ء سے کام بھی شروع کر دینا چاہتے تھے (عبدالقادر-۳) | محترم محمد علی مرحوم نے یہ واقعہ خود مجھے لکھ کر بھیجا تھا، خطوط محمد علی شائع کردہ: مکتبہ جامعہ علیہ کے ص ۵۹ میں خط کا یہ مضمون ملے گا۔

مگر اپنے ضروری مشاغل کی وجہ سے اخیر تک نہ کر سکے، آخر یہ سعادت ہمارے دوست ڈاکٹر سید محمود کے حصہ میں آئی، جنہوں نے مولانا کی اجازت سے ۱۹۱۰ء میں لندن میں جب وہ ڈاکٹری کی ڈگری کے لیے کام کر رہے تھے، اس کا خلاصہ ترجمہ یا اقتباس شائع کیا۔ (ابوالکلام-۱۲)

اس سفر کی ایک بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ محمد علی مرحوم نے یہیں ان سے سیرت نبوی کی تالیف اور پروفیسر مارگولیتھ کے جواب لکھنے پر آمادہ کیا۔ (خطوط محمد علی، ص ۵۹)

ڈھا کہہ کا سفر | دسمبر کے آخر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھا کہہ میں تھا، مولانا بھی تشریف لے گئے، ۲۲ دسمبر کو مرزا شجاعت علی بیگ سفر ایران کی صدارت میں تاریخ اور اسلام پر لکچر دیا، مولانا جلد واپس آنا چاہتے تھے، مگر خواجہ سلیم اللہ صاحب نواب ڈھا کہہ نے روکا کہ ندوہ کے متعلق گفتگو کرنی ہے، چنانچہ جنوری ۱۹۰۷ء کی شروع تاریخوں میں احسن منزل میں جو نواب صاحب کی کونٹھی ہے، ایک جلسہ ترتیب پایا، جس میں مولانا نے اور جناب شاہ سلیمان صاحب نے ندوہ کے مقاصد پر تقریریں کیں، جناب نواب صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مارچ ۱۹۰۷ء میں خود لکھنؤ تشریف لائیں گے اور دارالعلوم کا ملاحظہ کریں گے، مگر افسوس کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوا۔

منظفر پور کا سفر | مظفر پور میں خان بہادر دیوان مولانا بخش مرحوم سی ایس آئی کا ایک پرانا خاندان ہے جس کا سلسلہ نسب حضرت امام محمد مقرب بہ تاج فقیہ (فاتح منیر صوبہ بہار) تک منتہی ہوتا ہے، دیوان مولانا بخش غدر کے گرد و پیش زمانہ میں کان پور میں سررشتہ دار تھے، شیخ تاج مولوی غلام امام شہید اور قاضی صاوق خاں اختر وغیرہ معاصر شعرا سے ان کا دوستانہ تھا، ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی۔

اس خاندان میں علم و دولت کی توأم صفتیں موجود ہیں، اس خاندان کے جانشین مولانا کے زمانہ میں مولوی اعجاز حسن خاں اور مولوی ریاض حسن خاں خیال تھے، اعجاز حسن خاں صاحب کا چار برس ہوئے کہ ۱۳۵ھ میں انتقال ہو گیا اور مولوی ریاض حسن خاں بحمد اللہ کہ اب تک ہمارے درمیان موجود ہیں، یہ دونوں صاحب مولانا کے خالص دوستوں میں تھے، ڈھا کہہ جاتے ہوئے دونوں صاحبوں کا اصرار تھا کہ مولانا مظفر پور تشریف لائیں، یہ وعدہ ڈھا کہہ سے واپسی میں پورا ہوا، اس سفر کا حال مولانا نے ندوہ میں خود اپنے قلم سے لکھا ہے ”مولوی ریاض حسن رئیس مظفر پور ہمارے قدیم مخلص عنایت فرما اور قومی ضرورتوں کے نبض شناس ہیں، جنوری ۱۹۰۷ء میں ڈھا کہہ سے واپس آتے ہوئے، ہم لے مکاتیب ریاض حسن، ۲۹، ندوہ فروری ۱۹۰۷ء، ۳ اس خاندان کے تفصیل حالات کے لیے دیکھیے معارف مئی ۱۹۳۱ء۔

کو مظفر پور ٹھہرنے کا موقع ملا، مسٹر محبوب حسن صاحب بیرسٹرا ایٹ لاء جو مولوی ریاض حسن صاحب کے چچا ہیں، ان کے دولت خانہ پر قیام ہوا، بیرسٹر صاحب باوجود تعلیم جدید اور سفر و ولایت کے عقائد مذہبی اور شعائر اسلام میں اس قدر سخت ہیں کہ ہم کو ان پر ملائے متعصب ہونے کا دھوکا ہوتا تھا، یہاں اور جن تعلیم یافتہ لوگوں سے ملاقات ہوئی، سب اسی رنگ میں نظر آئے، چوں کہ اس سفر میں مجھ کو ندوہ کی تقریب بھی پیش نظر تھی، اس لیے مولوی ریاض حسن صاحب اور ان کے بھائی اعجاز حسن صاحب نے جلسہ کا اہتمام کیا، کثرت سے لوگ شریک ہوئے، میں نے اسلام کی حقیقت اور اس کے ضمن میں ندوہ کی ضرورت پر ایک مفصل تقریر کی، تقریر کے بعد چندہ ہوا اور پانچ سو سے زیادہ نقد جمع ہو گیا، مسٹر محبوب حسن صاحب اور مولوی ریاض حسن صاحب نے سو سو کی رقمیں عنایت کیں، ایک وکیل نے کوئی تعین نہیں کی لیکن ان کی عام قدیمی عادت کی بنا پر لوگوں نے قیاس بلکہ یقین کیا کہ وہ بھی ایک معتد بہ رقم عنایت فرمائیں گے، چندہ کی پوری تفصیل علاحدہ شائع ہوگی، یہ تمام رقم سرمایہ محفوظ کی مد میں جمع ہوئی۔“

اس سفر سے واپسی کے بعد دارالعلوم کے جلسہ عطاءے سند کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

مارچ ۱۹۰۶ء جلسہ عطاءے سند | دارالعلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گزر چکے تھے، مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے، نہیں ہوا تھا، اسی غرض سے مارچ ۱۹۰۶ء مطابق محرم ۱۳۲۴ھ میں رفاہ عام کھنڈو کے وسیع ہال میں جلسہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا، جس کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری مرحوم نے کی جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی نہایت اچھی تعداد شریک تھی جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند منتہی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لیے تیاری کی ہدایت فرمائی، اس ضمن میں محبی مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم، اے) رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد نے قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر اور راقم نے علوم جدیدہ و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی، اسی تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشگاہ اور مرحوم نور محل ضلع جالندھر کے باشندہ تھے، ندوہ کے قدیم ہمدرد ارکان میں تھے۔ ۲ یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اس لیے بے اختیار نوک قلم پر آ گیا، اگر ناظرین کو اس سے خود ستانی کی بو آتی ہو تو چشم پوشی فرمائیں۔

سامعین کو آئینہ حیرت بنا دیا، عین راقم کی تقریر کے اثنا میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے، مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کر سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا، مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی، اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں، کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لیے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں، یہ اس پر تقریر کریں گے۔

چنانچہ موضوع کے تقریر کے لیے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا، جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسہ میں موجود تھے، انہوں نے موضوع یہ مقرر کیا کہ ”ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو؟“ میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کیے، ہر طرف سے احسنت و آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاذ مرحوم نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا، جو اس خاک سار کے واسطے ہمیشہ کے لیے طرہ افتخار بن گیا۔

مولانا نے خود اس واقعہ کی اطلاع اپنے دوست مولانا شروانی کو ان لفظوں میں دی ”آپ کے نہ آنے کا سخت صدمہ ہوا، آپ ارکان اصلی ندوہ ہیں، آپ کی عدم شرکت کا دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے اور لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں، بہر حال مقدر میں یہی تھا، اگرچہ شاہ سلیمان صاحب وغیرہ نہیں آئے، لیکن جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت اس پر عربی زبان میں لکچر دوں گا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ جو حیرت تھا اور آخر لوگوں نے نعرہ آفریں کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہوگئی۔“ (شروانی-۵۸)

یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لیے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے رواد جلسہ دستار بندی، ص ۱۹۰، ص ۵۶۔

اس جلسہ میں مولانا نے دارالعلوم کے مقاصد پر ایک مدلل تقریر فرمائی اور ساتھ ہی اپنے امرتسر والے فارسی قصیدہ مع ”مانہ آنیم کہ اورنگِ سلیمان داریم“ کو اس دردناک ترنم سے پڑھا کہ دل ہل گئے، اسی سماں میں مولانا نے لکھنؤ کے تعلیم یافتہ گروہ کی طرف خطاب کر کے ان کو ندوہ کی امداد پر آمادہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی ممتاز حسین صاحب، بیرسٹر مرحوم، مولوی نسیم صاحب ایڈوکیٹ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل وغیرہ نے ندوہ کی امداد کا وعدہ کیا اور یہ لوگ ندوہ کے ارکان میں داخل ہوئے، ان کی ذات سے ندوہ کو بہت فائدہ پہنچا، آخر الذکر دونوں صاحب آج تک ہمدرد ارکانِ انتظامیہ ہیں، سرگرم خدمت ہیں، مولانا شروانی کے نام اسی خط میں مولانا ان کو لکھتے ہیں ”مجمع نہایت کثرت سے ہوا اور بہت بڑی بات یہ ہوئی کہ بیرسٹر اور تمام ایجوکیٹڈ نے کہا کہ ہم لوگوں کو اب عملاً ندوہ میں شرکت کرنی چاہیے، لہذا آئندہ اتوار کو ایک خاص جلسہ رفاہ عام میں ہو جس میں ہم ایجوکیٹڈ لوگ اور ارباب ندوہ جمع ہوں اور مشورہ وغور کیا جائے کہ ندوہ کو کیوں کر ترقی دینی چاہیے اور کس طرح اس کو ہم لوگ اعلا درجہ تک پہنچائیں۔“

اسی جلسہ میں ایک رات کو مولانا نے ”اسلام اور بے تعصبی“ پر ایسی دلاویز تقریر فرمائی کہ درو دیوارِ رقص میں تھے، علمائے معاصرین بہت کم ایک دوسرے کو داد دیتے ہیں لیکن اس جلسہ کے بعد مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلا دارالعلوم جو خود ایک عالم جید ہیں، فرماتے تھے، اس تقریر کو سن کر جی چاہتا تھا کہ میں اپنا سر پھوڑ لوں کیوں کہ جو مولوی شبلی نے پڑھا وہی میں نے بھی پڑھا، پھر وہ کیوں ایسی تقریر کر سکتے ہیں اور میں نہیں کر سکتا۔“

پاؤں کا حادثہ

۱۷ مئی ۱۹۰۷ء

ان دنوں مختلف جلسوں کی شرکت اور آمد و رفت کی وجہ سے شعر العجم کی تصنیف میں بہت کچھ خلل آ گیا تھا، اس لیے مولانا نے چاہا کہ وطن (اعظم گڑھ) جا کر چند مہینے بہ اطمینان رہیں اور اس کی کو پورا کریں، چنانچہ اعظم گڑھ پہنچنے کے چند روز بعد ۲۹ مارچ ۱۹۰۷ء کو اپنے اس ارادہ کی اطلاع نواب علی حسن خاں کو دی (۵) اسی زمانہ میں اعظم گڑھ میں ایک اسلامی انجمن کا بھی جلسہ تھا اس میں بھی شرکت مقصود تھی، بہر حال مارچ کے آخر میں اعظم گڑھ آئے اور حسب معمول شبلی منزل میں قیام فرمایا۔ اس زمانہ میں شعر العجم جلد اول کے اوراق زیر تصنیف تھے، سترہ ۱۹۰۷ء کی صبح کو دس بجے وہ میز سے اٹھ کر ہال میں تشریف لے گئے جو ان دنوں زنان خانہ میں شامل تھا، یہاں تخت بچھے تھے، یہیں مولانا ایک پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گئے، اس بنگلہ میں باغ بھی تھا، جس میں لچیاں لگی تھیں، اور کوئے آ کر ان کو نقصان پہنچاتے تھے، مولانا کے اکلوتے صاحب زادہ حامد صاحب نے ان کے اڑانے کے لیے بندوق میں چھروں کے کارتوس بھر کر رکھے تھے اور اس کو ہال ہی میں چھوڑ گئے تھے، مولانا نے اس بندوق کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوئی، پاس ہی مقابل میں ان کی بہو یعنی حامد صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں، ان کو یہ کہہ کر دی کہ یہ عورتوں سے تو اٹھ بھی نہیں سکتی، اس دینے لینے میں ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر پڑ گیا اور بندوق سر ہو گئی، جس کا نشانہ مولانا کا پاؤں (قدم) تھا، گھر میں کہرام برپا ہو گیا لیکن مولانا کو کچھ احساس نہیں ہوا، اتنا معلوم ہوا کہ پاؤں میں جھٹکا لگا، وہ دوسروں سے پوچھتے تھے کیا ہوا، خیر ہے؟

اب حادثہ کی تفصیل خود مولانا کی زبان سے سنیے ع ”تصنیف رامصنف نیکو کند بیاں“
 حادثہ کی تفصیل مولانا کی زبان سے | ”ایک اتفاقی تقریب سے میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں آیا تھا اور ارادہ تھا کہ مہینے دو مہینے یہاں قیام کروں گا، شعر العجم کے اجزا زیر تحریر تھے اور شاہ نامہ پر یو یو کر رہا تھا، سترہویں مئی ۱۹۰۷ء قریب آدس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرے میں گیا، اندر تخت بچھے لے اسی حال میں اب دارالمصنفین کا کتب خانہ ہے۔“

ہوئے تھے، میں پاؤں لڑکا کر بیٹھ گیا، تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی، میں نے ہاتھ میں اٹھالی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دے دی، اتفاق سے گھوڑا گر گیا، بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی، بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا کارتوس میں اگرچہ چھرے تھے لیکن چوں کہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا اس لیے ٹخنہ کی ہڈی بالکل چور ہو گئی اور پاؤں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے، جس وقت ضرب لگی مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا، کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی اور اس وقت میں نے گھبرا کر کہا یہ کیا ہوا؟ آواز سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آگئے اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹائے بیٹھا تھا اور پاؤں جوتے میں تھے، ایک عزیز نے آکر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں نے جوتے میں سے نکال لیا، اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے میں بھنس کر رہ گئی، میں نے پاؤں اوپر اٹھا دیا اور نوکروں سے کہا کہ اس پر پانی ڈالو، پانی جب ڈالا جاتا تھا تو پاؤں میں سے بھک بھک دھواں نکلتا تھا، قریباً پانچ گھنٹہ تک میں پاؤں اٹھائے بیٹھا رہا، جب پنڈلیاں دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب نکیہ لا کر میرا پاؤں اس پر رکھ دو آدمی نے رو کر کہا کہ کیا چیز ہے جو رکھی جائے گی، مجھ کو اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ میری ایڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتدا میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی اور کچھ میں نے پاؤں کے متعلق حالات بیان کیے ہیں، وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں۔

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا، نوکر اور ماما وغیرہ تھیں، یہ لوگ سخت زار و قطار روتے تھے اور میں ان کو منع کرتا تھا، قریباً ایک گھنٹہ کے بعد فرزند عزیز محمد حامد آیا اور زخم کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا اور بہت بے قراری کے ساتھ گریہ و زاری کرنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری ہو گئی میں نے نوکروں سے کہا اس کے منہ پر پانی چھڑکوا اور حلق میں پانی پچکاؤ، اس سے اس کو ہوش آ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیز بھائی، جنید سول سرجن اور اسٹنٹ سول سرجن کو ساتھ لے کر آئے، بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جو رگیں کٹ گئیں تھیں ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا اور خود مجھ کو اور نہ نوکروں چاکروں میں سے کسی کو خیال آیا کہ اس پر پٹی کس کر باندھ دیں، جس سے خون رک جائے، بہر حال ڈاکٹر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رگوں کے منہ باندھ دیے، جس سے خون رک گیا، اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پاؤں جوڑنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالیے، ڈاکٹر نے کہا پاؤں کا نسنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں، غرض بے ہوشی کی دوا پلائی گئی اور عمل

جراحی شروع کیا گیا، چون کہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں، اس لیے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی اور ہرزہ گردی کی سزا دی گئی، عملِ جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا اور زخموں کے ٹانگے اور رگوں کی کھچاوت کی تکلیف محسوس ہوتی تھی، آج نواں دن ہے، ڈاکٹر ایک دن بیچ میں دے کر زخم کھولتا ہے، دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے، تکلیف میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے، سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی، بہت چلا پھرا دوڑا دھوپا، ملا جلا آخر کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہیے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بیٹھا دیا،

مع ”گرنتانی بہ ستم می رسد“

خدائے بے نیاز کا شکر گزار، احباب و اعزہ کا منت پذیر ہوں، بیچ گیا تو پھر کسی نہ کسی طرح دوستوں کو دیکھ لوں گا ورنہ انشاء اللہ تعالیٰ اب دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی، والسلام۔

دسویں دن ٹانگے کھولے گئے، ایک ٹانگے میں مواد آ گیا اس وجہ سے سوزش اور فنگ کی سخت تکلیف ہے، ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء تک یہ حالت ہے۔“

احباب اور معتقدین کا اضطراب | جس وقت یہ خبر ندوہ پہنچی ہے، طلبہ میں سراپیسنگی پھیل گئی، تار سے خیریت منگوائی، اخبارات کی مختصر اطلاع نے احباب اور معتقدین میں عجیب پریشانی پیدا کی، مخصوص احباب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مولانا سید عبداللہ صاحب، نواب سید علی حسن خان، مولوی ریاض حسن خان صاحب اور مولوی اعجاز حسن خان صاحب اور دوسرے احباب فوراً عیادت کو آئے، طلبہ میں سب سے پہلے خاک سارا اور ہم درس مولوی جو ادلی خان ۲۴ مئی کو اعظم گڑھ پہنچے، ہم دونوں دو روز یہاں ٹھہرے، یہیں بیٹھ کر خاک سار نے اخبارات کو حادثہ کی مفصل اطلاع بھیجی، دریافت حال کے لیے احباب اور معتقدین کے خطوط اور تار برابر آرہے تھے، ۲۵ مئی کو مولانا نے خاک سارا کو ہٹھا کر حادثہ کی پوری تفصیلات لکھوائیں، یعنی وہ بولتے جاتے تھے، اور خاک سارا لکھتا جاتا تھا اور یہی خط چھپوا کر دوستوں کی خدمت میں بھجوا دیا اور یہ وہی خط ہے جو ابھی اوپر نقل ہوا۔

گو اس خط میں حادثہ کی پوری تفصیل موجود ہے، مگر راقم نے مولانا کی زبان سے بعض ایسے

واقعے سے جو اس خط میں نہیں اور جن کو یہاں سے واپس جا کر الندوہ میں لکھا، وہ اس موقع پر اضافہ کے قابل ہے۔

مولانا اس دن شعر العجم میں فردوسی کے شاہنامہ پر تبصرہ لکھ رہے تھے اور اس کو اتفاق کہیے یا فال بد کہ اس تبصرہ کو اس شعر پر ختم کیا تھا:

برید و درید و شکست و بہ بست بلاں را سرد سینہ و پا و دست

اور اس کے بعد ہی زنان خانہ میں تشریف لے گئے اور یہ حادثہ پیش آیا، مولانا کو اس وقت پورا احساس نہیں تھا کہ کیا ہوا، جس وقت سول سرجن اور اسٹنٹ سول سرجن آئے ہیں تو مسکرا کر فرمایا کہ اگر پاؤں جڑ جائے تو خیر، ورنہ سر سے الگ کر دیا جائے۔

ڈاکٹر نے جب عمل جراحی کے لیے بے ہوشی کی دوا پلائی ہے تو اس وقت ایک نادر واقعہ پیش آیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممتاز دماغوں کی قوت اور حواس کی جمعیت بھی ممتاز ہوتی ہے، قاعدہ ہے کہ بے ہوشی کی دوا پلا کر مریض کو گھنٹے کو کہا جاتا ہے، عموماً لوگ پچاس سے ساٹھ تک گنتے ہوئے بے ہوش ہو جاتے ہیں، مگر مولانا نے اس ضعف اور ناقابل برداشت صدمہ پر بھی ستانوں تک گنا اور اس کے بعد بے ہوش ہوئے۔

ٹانکے دیتے وقت دونوں کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ اگر گرمی کی وجہ سے کچھ مادہ فاسد جمع ہو جائے گا تو اس راہ سے نکال دیا جائے گا، مگر الحمد للہ کہ زخم رو بصحت تھا اور مادہ فاسد نہیں جمع ہوا، صرف ان ہی دونوں کی جگہ میں کچھ مواد آ گیا تھا۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دو ہفتہ میں زخم خشک ہو جائے گا مگر افسوس کہ تیسرے ہفتہ تک زخم منہل نہیں ہوا، مواد آتا رہا اور زخم میں وروپک اور ٹیس ایسی تھی کہ جس سے رات بھر نیند نہیں آتی تھی اور بے چینی تھی، ۶ جون کو ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں، زخم کی حالت دس بارہ دن تک اچھی تھی لیکن بعد کو کوریم آنے لگی اور اب تک آتی ہے، اسٹنٹ سرجن روزانہ آتا ہے اور دن میں دو بار زخم دھویا جاتا ہے لیکن ابھی تک تکلیف میں کوئی کمی نہیں، تکلیف گو سخت ہے لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے جنہوں نے سر

۱۹۰۷ء (یہ نمبر تاخیر کے ساتھ شائع ہوا تھا، اسی لیے کسی کا واقعہ اپریل کے پرچہ میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ شعر العجم جلد اول ص ۱۶۷ میں زیر مثال صنایع و بدائع یہ شعر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس حادثہ کے وقت یہی صفحہ زیر قلم تھا، مولانا نے اس واقعہ کو شعر العجم جلد اول کے مقدمہ میں ص ۳ پر خود بھی ذکر فرمایا ہے۔ ۳۱ الندوہ اپریل ۱۹۰۷ء۔

کھوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا روؤں، فصیڈ جمیل“۔ (۶۲)

مولانا تین مہینے اپنے وطن میں بسترِ علالت پر پڑے رہے، اسی سبب سے مضمون عالم گیر کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ چند ماہ رکارہ لیکن شعر العجم کی تصنیف باوجود درد اور تکلیف کے تین چار ہفتوں کے بعد شروع ہو گئی۔

راقم نے جولائی میں لکھنؤ تشریف لانے کے خواہش کی تو ۲۲ جولائی کو اپنے قلم سے جواب لکھا کہ وہاں حسب دستور سابق کوٹھے پر میں رہوں تو پھر اترنا چڑھنا مشکل ہوگا۔ (سلیمان-۱۵)

ان ہی دنوں ۳۱ جولائی ۱۹۰۷ء کی اطلاع ہے کہ نواب محسن الملک نے علی گڑھ سے لکھا کہ وہ یہاں آجائیں، یہاں کے ڈاکٹر مفت علاج کریں گے، مگر وہ وہاں نہیں گئے اور بمبئی کا قصد کیا (سلیمان-۱۶) اس سخت تکلیف کی حالت میں بھی مولانا شروانی سے قلمی نسخوں پر دل چسپ خط و کتابت ہو رہی ہے۔ (شروانی-۶۳)

اگست کے شروع میں مولانا لکھنؤ آئے، ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب نے جو مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے داماد تھے اور لکھنؤ میں شاہی اسپتال میں ڈاکٹر تھے، ایک مرہم بنا کر دیا، مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، اسی زمانہ میں مولانا نے مولوی حمید الدین صاحب کو جس خط میں اپنے یہ حالات لکھے، اسی میں ان کو ندوہ آ کر طلبہ کو قرآن پاک کا درس اور سائنس میں دروس الاولیہ پڑھانے کی خواہش کی (حمید-۳۹) جس کو مولوی صاحب نے منظور کیا۔

مولانا نے اس کے بعد بمبئی کا سفر کیا اور وہاں لکڑی کا ایک مصنوعی پاؤں بنا کر استعمال کیا، یہ پاؤں اچھا نہیں بنا یعنی بھاری تھا، بمبئی سے حیدرآباد کی مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد گئے تو نواب افسر الملک بہادر نے جو ان دنوں سپہ سالار عساکر آصفی تھے، سرکاری کارخانہ سے اپنے زیر اہتمام ایک دوسرا پاؤں بنا کر پیش کیا جو زیادہ آرام دہ اور ہلکا تھا۔

حادثہ کی شاعرانہ تغلیل | حادثہ جو ہونا تھا ہو گیا، مگر یہ قول مولانا شروانی علمی آدمیوں کی ہر بات علمی ہوتی ہے، اس حادثہ نے علم ادب کا ایک نیا پہلو سامنے کر دیا، مولانا حالی مرحوم، نواب سید علی حسن خان مرحوم، خواجہ عزیز الدین مرحوم اور تلامذہ میں مولوی اقبال احمد صاحب سمیل، مولوی عبدالسلام صاحب اور خاک سار نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں اس واقعہ کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہات کی گئیں،

۱۔ مقدمہ شعر العجم، حصہ اول، ص ۳۔

مولانا نے یہ تمام رباعیاں راقم کو عنایت فرمائیں اور راقم نے مناسب سمجھا کہ دوسرے غم زدوں کو بھی حسن تعلیل کے اس تسلی نامہ میں شریک کرے، اس لیے ان کو ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۰ء کے الٹوہ میں شائع کر دیا گیا۔

(مولانا حالی)

شبلی کہ گزندِ پاش پر دل شکن است باختگیِ مجستگیِ مفترن است
چنداں کہ بکاہند فزاید اینجا ”کاراستن چمن ز پیراستن است“

(نواب سید علی حسن خاں مرحوم)

شبلی! ترے قوم پر بہت احساں ہیں باتیں تری درد قوم کی درماں ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر اس ایک قدم پہ لاکھ سر قرباں ہیں

(خواجہ عزیز الدین مرحوم)

اے پایہ تو بلند تر از افلاک پائیت چو بریدہ شد چہ ہستی غمناک
زیر قدمت بلندی و پستی ہست پائے بفلک داری و پائے بر خاک
مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے اس حادثہ پر متعدد رباعیاں لکھیں اور خوب خوب
توجیہیں کہیں:

اے ذاتِ تو در علم و عمل گمشدہ علم وائے مفتر از وجود پاکت عالم
یک پائے تو چوں شد بدم دستم داری دو جہاں سرور ما زیر قدم
اے آنکھ تو اہل قوم را طبائی حق داد ترا بہ ملک فن دارائی
چوں نیست کس ہم سر تو در پایہ پس پائے ترا ہی سر ز یکتائی
صد حیف ہوا شکستہ پائے شبلی اب سلسلہ سفر بھی مفقود ہوا
مشتاق زیارت جو ہو خود آئے یہاں رہبر جو تھا اب کعبہ مقصود ہوا
اللہ نے آپ کو جو ممتاز کیا ہر وصف میں بے نظیر و انباز کیا
باقی تھا فقط فخر شہادت ملنا اک پاؤں کا اس سے بھی سرفراز کیا

۱۔ مولانا حالی کا چوتھا مصرعِ عنصری کی رباعی کا ٹکڑا ہے، واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ سلطان محمود نے بدستی میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں، جب سلطان کو ہوش آیا تو اس کی خوب صورت زلفوں کے کٹ جانے سے نہایت غم گین ہوا، اس پر دربار کے شاعروں نے شاعرانہ حسن تعلیل سے سلطان کا دل بہلانا چاہا، اسی سلسلہ میں عنصری نے یہ رباعی کہی، کہتے ہیں کہ اس کے سنتے ہی سلطان خوش ہو گیا اور اس کے دل کا بوجھ ہٹا گیا۔

ان کی ایک رباعی الندوہ میں نہیں، خاک سار کے نام خط ۱۶ میں ہے، لکھتے ہیں، ایک صاحب کو خوب مضمون ہاتھ آیا، کہتے ہیں:

کیا اس سے بھی ہوگی کوئی ساعت منحوس
زخمی ہوا جبکہ پائے شبلی افسوس
ایک پاؤں عدم کو کیوں نہ جاتا اقبال
تھا اہل فنا کو اشتیاقِ پا بوس
خود مولانا نے بھی اس حادثہ پر کئی نظمیں کہیں:

بلنا بھی جگہ سے گر چہ اب ہے دشوار
اس پر بھی خدا کا شکر ہے احسان ہے
یعنی کہ پہنچ چکا ہوں جس منزل تک
یاں سے سفر عدم بس اب آسان ہے
ہر چند کہ زخمِ سخت جاں فرسا تھے
آثارِ ہلاک سر بسر پیدا تھے
ممنوں ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی
گو پاؤں کئے قدم بر جاتے
مقبول نہیں ہے بے نوائی میری
آلودہٴ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی
ناقص ہے ابھی بے سرو پائی میری
حالت از گردش ایام اگر گشت تبر
صبر فرما کہ ازیں نیز بتری بایست
شبلی نامہ سیہ را بجزائے عملش
پا پر بند و صدا خاکست کہ سری بایست
ملاوی اقبال احمد صاحب سہیل نے ان نظموں کے جواب میں عرض کیا:

کیجیے نہ غمِ شکستِ پا مولانا!
اس میں بھی تھی حکمتِ خدائے دانا
تھی اہل عدم کو آرزوئے پا بوس
اک پاؤں وہاں بھی چاہیے تھا جانا
اور مولانا کے پہلے قطعہ کے جواب میں یہ قطعہ کہہ کر پیش کیا:

شکستہ پائی تو تھی سر نوشت میں حضرت!
نہ ہاتھ آئے گا کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہے منزل نہ جا سکیں گے حضور
چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

ہمارے دوست مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے بھی جن کی سخنِ سنجی مسلم ہے، ایک رباعی

لکھ کر پیش کی تھی، جس کا اخیر مصرع یاد ہے

ع ”ہمت کا قدم زمیں میں اب گاڑ چکے“

خاک سار شاعر نہیں، اس پر بھی کچھ کہا تھا، جس کو ادباً یا مولانا کی تنقید کے ڈر سے پیش

نہیں کیا، اسی مہینہ میں موازینہ انیس و دہر شائع ہوئی تھی، اسی کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا:

تقید مراثی کے صلہ میں استاد دربارِ حسینؑ نے سعادت بخشی
 پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی
 اعظم گڑھ سے چلتے وقت معذرت کے چند عربی شعر کہہ کر چپکے سے مولانا کے سر ہانے رکھ کر
 لٹے پاؤں واپس پھرا، مولانا ہر چند پکارتے رہے، مگر میں شرم سے سامنے نہ جاسکا، اس نظم میں دیر سے
 پہنچنے پر عفو و تقصیر کی درخواست تھی، مطلع تھا:

دع و اغترف منك بحر الفضل والحكما واقتبس منك شمس العلم والعلماء

مجھے فضل و حکمت کے سمندر سے جذبہ بھر کے پانی پینے دے اور اے علم اور علموں کے آفتاب مجھے اپنے سے روشنی حاصل کرنے دے۔

دوسرا عربی قصیدہ صحت کی خوشی میں کہا، مگر اس کو بھی پیش نہیں کیا، بلکہ اس کے چند اشعار
 الذودہ (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے ایک مضمون میں جس کا عنوان ”علمائے سلف اور کتب بینی“ ہے، چھاپ
 دیے کہ وہ نظر اشرف سے گزر جائیں، ع ”گفتہ آید در حدیث دیگران“

عاد الربیع لروضی بعد ما ذہبا وعمر اللہ ربعی بعد ما خربا
 میرے جن میں بہار جا کر پھر آگئی اور خدانے میرے گھر کو دیرانی کے بعد پھر آباد کر دیا
 وازینت الارض خضراً بعد ما بیست والبرق عاد سناہ بعد ما احتجا
 زمین خشک ہو کر پھر سرسبز ہوگئی اور بجلی کی چمک چمپ کر پھر نکلی
 وفجر العلم عیناً بعد ما نصباً و اشرق الفضل شمساً بعد ما غربا
 اور علم کا چشمہ سوکھ کر پھر رواں ہوا اور علم و فضل کا آفتاب ڈوب کر پھر نکل آیا
 یا من سماحتہ عمت بصائرننا اعطیت ما فاق ابھی الدر والذہبا
 اے وہ جس کی بخشش ہماری بصیرتوں کو چھپائے ہے تو نے جو دیا وہ زر و جواہر سے بھی بڑھ کر ہے
 اذا مرضت فکل الناس قد مرضوا والعلم والفضل نالا مثلهم نصباً
 جب تو بیمار ہوا تو سب لوگ بیمار ہو گئے اور علم و فضل نے بھی ان ہی کی طرح تکلیف اٹھائی
 واذ برئت فکل الناس قد برثوا والعلم والفضل ماسا مثلهم طربا
 اور جب تو اچھا ہوا تو سب لوگ اچھے ہو گئے اور علم و فضل بھی خوشی سے جمونے لگے

ما رِجْلِكَ انْفَصَلَتْ اِلَا لِهَمَّتْهَا
تیرا پاؤں جدا نہیں ہوا، بلکہ اپنی ہمت کی بلندی سے منزلوں کو چھوٹا سمجھ کر ہماری زمین سے دور ہو گیا

رَجُلٌ بَهَا جُزْتُ كَمْ مِنْ سَبَسِيبٍ وَقَرَى
وہ پاؤں جس سے تو نے کتنے صحرا اور آبادیاں طے کیں

فِي الْفَضْلِ مَرْتَعِبًا لِلْعِلْمِ مَطْلَبًا
فضل کی خواہش اور علم کی تلاش میں

وَأَجْتَزَتْ مِصْرَ وَبَيْتَ الْقُدْسِ وَالْعَرَبَا
اور مصر و بیت المقدس اور عرب کو قطع کیا

أَذْكَبَهَا كَعْبَةً لِلْعِلْمِ لَا كَذِبًا
کیوں کہ اس کا کعب (ٹخنہ) بے شبہ علم کا کعب ہے

وَأَنْ هُمْ شَارِكُوكَ سَيْدِي لِقَبَا
اگرچہ وہ سب لقب شمس العلماء میں تیرے برابر ہیں

لَكِنَّمَا الشَّمْسُ فَاقَتْ هَذِهِ الشُّهُبَا
لیکن آفتاب ان تمام روشن اجرام میں سب سے بڑھ کر ہے

مَضَى وَأَنْتَ تَرَاعَى الصَّحْفَ وَالْكِتَابَا
مضی و انت تراعی الصحف والکتبا

جَبَّ تَجْهٍ بِرَ تَارِكٍ رَاتٍ دَرَا زَ بُونِے لَگتی ہے تو تو کتابوں اور صحیفوں کو دیکھتے ہوئے ان کو گزار دیتا ہے

بِهَ غَدَى دَرَّةٌ مَا كَانَ مِخْشَلِبَا
بہ غدی درہ ماکان مخشلبا

جس سے کوڑی بھی رتہ پا کر موتی بن گئے

اِذَا سَبَكَرَ عَلَيْكَ اللَّيْلُ حَالِكَا
جب تجھ پر تاریک رات دراز ہونے لگتی ہے تو تو کتابوں اور صحیفوں کو دیکھتے ہوئے ان کو گزار دیتا ہے

ان تمام نظموں میں سب سے زیادہ فخر کے قابل مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوئی کی فارسی مثنوی ہے، جس میں مولانا نے بڑے پیار اور محبت سے اپنے شاگرد کی بیمار پرسی کی ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ ۳۳ برس کے بعد ان کے خاص ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مثنوی بھی ان کے صاحب زادہ مولوی محمد مبین صاحب کیفی سے ہاتھ آئی اور اس وقت یہ تبرک دار المصتفین کے کتب خانہ میں ہے، مثنوی اسی زمانہ میں الندوہ میں بھی چھپ چکی ہے، فرماتے ہیں:

اے دل افروز شمعِ علم و بنر
نور چشمِ جہان و جانِ پدر

پدر انتسابِ علم و کمال
از نسب نامہائے عز و جلال

بر تو از آسمان گزند مباد
 چشم زخم زمانہ دراز تو
 من شنیدم کہ اندرین پرکار
 آفت ناگہاں رسید بہ پائے
 بہ خدائے کز دست صبر و بلا
 بودہ ام درتعب ز روزے چند
 کہ بہ من گفت رہ رو عاجل
 تیرے از چرخ خود پسند رسید
 این خبر چوں بگوش من بہ رسید
 آرخ آل پائے راہ پیائے
 ہم رو مصر و شام و روم برید
 دل بجوش آدم بہ نوحہ گری
 رہ نوردی برائے کسب و ہنر
 گرچہ پائے تو دید بیش گزند
 گرچہ شد خون از درواں بزمین
 گرچہ پایت زساق گشتہ جدا
 اے خدادند واہب اعمار
 جوہر دہر ستم پسند مباد
 بادہر بزم پر ز نور از تو
 کشتی از دست روزگار فگار
 پائے آل رہو جہاں پیائے
 کہ نیارم شنیدنش اصلا
 من در اینجا بہ حاجتے پابند
 کاے زاخباہر این و آل غافل
 شبلی ات را بہ پاگزند رسید
 تاب بشفتتیش زمن بہ رسید
 بسوے طیبہ گام فرمائے
 حیف از ساق خود جدا گردید
 یاد چوں آید از تو رہ سپری
 نہ بے ادخار بدرہ زر
 صبر تو نیز پایہ داشت بلند
 لیک چیت نکشتہ گرد جبین
 ایک صبرت چو کوہ پابر جا
 دانش بر رو سعادت دار

فکاہات و لطائف | اس حادثہ کے بعد مولانا اپنے مصنوعی پاؤں پر عجیب عجیب دل خوش کن فقرے کہہ کر دل بہلاتے تھے، مارچ ۱۹۰۸ء میں جب مشرقی یونیورسٹی کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد گئے تو نواب افرام الملک بہادر نے ان کے لیے لکڑی کا ہلکا سا جو پاؤں بنوایا تھا، کارخانہ سے اس کو لینے کے لیے مولانا اور نواب افرام الملک بہادر خود گئے، نواب صاحب پاؤں ہاتھ میں لیے ہوئے گاڑی پر سوار ہوئے تو مولانا نے برجستہ کہا:

”پابدست دگرے دست بدست دگرے“

حسن اتفاق سے اسی روز نواب صاحب کو ”سر“ کا خطاب ملا تھا، مولانا نے کہا کہ ”آپ نے

مجھ کو پاؤں دیا تو خدا نے آپ کو سردیا۔

۱۱ مارچ ۱۹۰۸ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو ایک خط میں اپنے پاؤں بننے کی خبر

دیتے ہیں تو لکھتے ہیں ’پاؤں بن گیا، آمد تو نہیں، آورد ہے، رفتہ رفتہ شاید ترقی ہو‘ (۱۵)

میرا کبر حسین صاحب (جج) سے ان کے تعلقات علی گڑھ کے ابتدائی زمانہ سے تھے، میر صاحب قافیوں کے استاد تھے، الہ آباد میں ایک دفعہ مولانا نے کہا کہ میر صاحب میں آپ کی تلاش قافیہ کا جب قائل ہوں جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں، میر صاحب نے ہنس کر فرمایا ’دیکھیے میں آپ کو بھی باندھتا ہوں‘ بات ہنسی میں ختم ہو گئی، ایک دوروز کے بعد میر صاحب نے ۲۳ نومبر ۱۹۰۷ء کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ ان کے پاس بھیجا جس میں لکھا تھا:

ہے بات یہ صاف بھائی شبلی

آتا نہیں مجھ کو قیلا قیلی

تجھو تم اسے پاؤ قلیا

مل جائے یہاں جو دال دلیا

مولانا نے اس کے جواب میں لکھا:

لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال

حلقہ درگوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

آپ کے لطف کرم کا مجھے انکار نہیں

اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا

جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی

ایک دن فرمایا کہ بھائی میں استدلالی (متکلم) تھا مولانا روم چھ سو برس پہلے کہہ گئے تھے کہ

میرا پاؤں کئے گا اور لکڑی کا پاؤں بنے گا:

پائے چوبیس سخت بے تمکلیں بود

پائے استدلالیاں چوبیس بود

ایک دفعہ وہ چل رہے تھے، میں ساتھ تھا، فرمانے لگے ’میاں! پہلے گفتار و کردار نقلی تھا، اب

رفقار بھی نقلی ہے۔‘

ایک دفعہ کا لطیفہ میں بھول نہیں سکتا، میں اور مولانا ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں تھے، مولانا مجھے ساتھ

لے کر کھانے کے ایک ریستوران میں گئے، کھانے کے اثنا میں خانساہاں سے فرمایا کہ ’پاؤں لاؤ‘ مجھے

تعب ہوا کہ پاؤں تو مولانا لگائے ہیں، یہ پھر پاؤں کیسا مانگتے ہیں، مڑ کر دیکھا تو خانساہاں پاؤ روٹی کے

نکڑے لا رہا ہے، اس دن مجھے معلوم ہوا کہ بمبئی میں اس کو پون کہتے ہیں (پاؤروٹی کی اصل یہی ہے، پون پر تگالی میں روٹی کو کہتے ہیں)

مولانا شرابی فرماتے ہیں ”ایک بار علی گڑھ کالج میں لکچر دینے وقت مقررہ کے بعد تشریف لائے تو عذرتاخیر بیان فرما کر کہا ”یہ عذر رنگ نہ خیال فرمایا جائے“۔
اس طرح اس حادثہ نے ادب میں خاصہ لطیف اضافہ کر دیا تھا۔

مسجد کان پور کے واقعہ کے سلسلہ میں مولانا نے ایک قطعہ میں اس کو میڈی کوئٹہ بیڈی بنا دیا ہے، مسلمان قیدیوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار
ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ
یعنی انفسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں
صحت کے بعد بمبئی و حیدرآباد کا سفر | اوپر یہ گزر چکا ہے کہ جولائی ۱۹۰۷ء کے آخر تک وہ اعظم گڑھ
رہے، اگست کے شروع میں وہ لکھنؤ آئے، ۸ دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمبئی گئے اور بمبئی سے حیدرآباد پہنچے،
جہاں مشرقی یونیورسٹی کی کمیٹی تھی، جس کی تفصیل آگے آئے گی، وہ ان سفروں میں ابھی اور رہتے مگر اس
وقت ندوہ سے سرکاری تعلقات کی بات چیت چھڑی ہوئی تھی، اس لیے وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔

ندوہ کے سرکاری تعلقات کا آغاز | ۱۹۰۸ء، ندوہ کی تاریخ اور مولانا کی معتمدی کے زمانہ کا نہایت
اہم سال ہے، اسی سال ندوۃ العلماء کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو سیاسی بدگمانیاں تھیں وہ دور ہوئیں،
اگرچہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب لکھنؤ، نواب محسن الملک بہادر اور جسٹس سید شرف الدین صاحب
پٹنہ وغیرہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کے لیے پوری کوشش کی، مگر اس میں کامیابی کا وقت مولانا شبلی
مرحوم کی معتمدی کے زمانہ میں آیا اور اس کی صورت بھی نئی پیدا ہوئی، ریاست پٹیالہ گو پنجاب میں ہے،
مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ریاست مذکور نے جو فوجی خدمتیں انجام دیں، ان کے صلہ میں ریاست
مذکور کو اودھ میں بھی ایک اچھا خاصہ علاقہ ملا ہے، اس زمانہ میں ریاست مذکور کے فارن منسٹر کرنل
عبدالجید خان ایک بااثر، بارسوخ اور حکومت انگریزی کے مستند وفادار تھے اور ریاست کے تعلقات کی
بنا پر حکام اودھ سے بھی کافی راہ ورسم رکھتے تھے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی کوششوں سے کرنل
صاحب موصوف کو ندوہ سے دل چسپی پیدا ہوئی اور مولانا سے ملاقات کا اتفاق ہوا، اس ملاقات نے
خلوص کا درجہ حاصل کیا، کرنل صاحب جب لکھنؤ آئے تو حکام سے مل کر ندوہ کے باب میں ان کے

خیالات کے پلٹنے میں کامیاب ہوئے۔ (مکاتیب شروانی - ۷۰)

سرکاری امداد | اسی اثنا میں منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹریٹ لا ریکس گدیہ (بارہ بنکی اودھ) جن کو ندوہ سے شروع ہی سے دل چسپی تھی، ۸ جنوری ۱۹۰۵ء کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف (لکھنؤ) میں حکومت کو دارالعلوم ندوہ کی امداد کی طرف توجہ دلائی، اس مضمون کے شایع ہونے کے بعد ۲۱ جنوری ۱۹۰۸ء کو ڈیپارٹمنٹ صاحب ڈائریکٹر کی طرف سے منشی صاحب موصوف کے پاس ایک مراسلہ آیا کہ کیا ندوہ باقاعدہ گورنمنٹ سے کسی قسم کی امداد کی درخواست بھیج سکتا ہے، اس وقت مولانا لکھنؤ میں نہ تھے، میں نے اس مراسلہ کی اطلاع دی، مجھے لکھا ”پروانشل آفس کے جواب میں ندوہ کی طرف سے یہ کیوں نہ لکھا جائے کہ ہم دونوں طرح کی مدد چاہتے ہیں، مالی بھی اور اعزازی بھی، خیر اس کے متعلق قدوائی صاحب کو لکھوں گا۔“ (سلیمان - ۱۷)

اس سلسلہ میں طرفین کی خط و کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو گورنمنٹ نے بلا شرط پانچ سو روپیے ماہ وار کی امداد منظور کرنے کی اطلاع دی، اور یہ وعدہ کیا کہ سرکاری محکمہ مدرسہ کے نصاب اور اصول میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور اس امداد کا روپیہ ادب عربی اور انگریزی و ریاضی وغیرہ مدرسہ کی غیر مذہبی تعلیم میں خرچ ہوگا۔

۱۔ منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹریٹ لا گدیہ ضلع بارہ بنکی اودھ کے مسلمان تعلقہ داروں میں تھے، ان کو ندوہ اور قومی کاموں سے شروع ہی سے دل چسپی تھی، وہ ۱۹۰۵ء کے قریب زمانہ میں تھوڑی سی انگریزی تعلیم کے بعد لندن چلے گئے تھے، اور وہاں بیرسٹری حاصل کی اور ساتھ ہی انگریزی تحریر و تصنیف کی مشق بہم پہنچائی اور اتحاد اسلام کی عالم گیر تحریک میں شامل ہو گئے، ۱۹۰۵ء کے قریب وہ انگلینڈ سے واپس آئے اور بدستور ندوہ اور دوسرے قومی کاموں میں دل چسپی لی، ۱۹۱۳ء کی جنگ عظیم کے دوران میں وہ لندن ہی میں تھے اور تقریباً ۱۹۲۰ء تک رہے، ۱۹۲۰ء کے شروع میں واپس آئے، ترکوں سے اور تحریک خلافت سے ان کو بے حد عقیدت تھی، وہ ایک طرف مولانا عبدالباری صاحب فرنگی مہلی مرحوم کے ذریعہ سے قوم کو اور دوسری طرف ہڑتائیں آغا خان کے ذریعہ گورنمنٹ کو مسلمانوں کے معاملات کو سدھارنے اور مختلف تحریکوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے تھے، ٹرکی اور یورپ کے بہت سے مشاہیر سے ان کے تعلقات تھے، وہ لنگ کی مسجد میں بھی اس زمانہ میں چند سال رہے تھے اور اسلام کے متعلق بہت سے مضامین اور کتابیں لکھیں، ان کی آخری کتاب ”اسلام اور بالشوازم“ ہے، وہ قلب کے مریض تھے، آخر اسی بیماری میں ۲۳ دسمبر ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ ۲۔ اس خط پر جو غالباً جنوری ۱۹۰۵ء کا ہے، مولانا کے قلم سے غلطی سے ۱۹۰۷ء نکل گیا ہے، ابتداء سنہ میں اکثر یہ غلطی ناہائستہ ہو جاتی ہے۔ ۳۔ مدرسہ کو یہ امداد ۱۹۲۰ء کے ترک موالات کے زمانہ تک ملتی رہی، ترک موالات کے زمانہ میں ندوہ نے اس رقم کو لینے سے انکار کر دیا، بعد کو راجہ کشن پال سنگھ ریکس کنگر نے اپنی وزارت تعلیم کے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی سفارش پر دوبارہ جاری کیا، جواب تک جاری ہے۔

غیر مذہبی علوم کے لیے اس نئی امداد حاصل ہونے پر انگریزی اور ریاضی کا اسٹاف بڑھایا گیا اور عربی علم ادب میں جدید عربی کی تعلیم کے لیے خاک سار جدید عربی کا معلم (ماڈرن عربک پروفیسر) مقرر کیا گیا اور بعض اضافے اور ترقیاں ہوئیں۔

قومی امدادیں | اب مدرسہ کے مذہبی علوم کی تعلیم کی ترقی و توسیع کے لیے مزید کوشش کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اس غرض سے مولانا نے پنجاب، صوبہ سرحد اور صوبہ بہار کے بعض شہروں کا دورہ کیا اور معتد بہ امدادیں حاصل کیں، صوبہ سرحد کے دورہ میں مولانا کے ساتھ جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواری بھی شریک تھے۔

وظائف | سنسکرت اور ہندی پڑھنے کے لیے جو طلبہ تیار ہوئے تھے ان کے لیے وظیفوں کا الگ انتظام کیا اور ہمیشہ اپنے دوستوں سے وظائف کی مد میں اعانت کی درخواست کرتے رہتے تھے۔

سرمایہ محفوظہ | ابھی تک ندوہ میں کوئی مستقل محفوظ سرمایہ نہ تھا، بلکہ یہ قاعدہ تھا کہ جو آتا تھا وہ خرچ کر دیا جاتا تھا، مولانا نے ۱۹۰۵ء-۱۳۲۳ھ میں یہ تحریک کی کہ بینک میں ریزرو فنڈ کے نام سے ندوہ کا الگ حساب کھولا جائے، پھر ۱۹۰۶ء میں بنارس کے جلسہ میں یہ تحریک پیش ہو کر منظور ہوئی اور اس کے لیے بارہ ہزار کے چندہ کا اعلان ہوا، مگر اس میں سے وصول کم ہوا، ۱۹۰۷ء کی روداد میں اس مد کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے، خیال آتا ہے کہ مولانا کے آخر زمانہ میں اس مد میں پندرہ ہزار کے قریب جمع ہو گیا تھا۔

تعمیر کی فکر | مدرسہ اب تک گول گنج کی ایک گلی میں ایک پرانے قسم کے مکان میں تھا، جو پہلے ایک ہندو رئیس کا تھا اور ندوہ نے نو ہزار روپیہ میں اس کو خریدا تھا، اسی میں ایک ہال ناصر الاسلام شیخ بہاء الدین صاحب وزیر جو ناگڈھ کی ایک ہزار روپیہ کی فیاضی سے بن گیا تھا، کچھ ادھر ادھر کمرے حسب ضرورت بنوائے گئے تھے، مولانا کی نظر میں قسطنطنیہ کے دارالعلوم اور علی گڑھ کا مدرسہ العلوم تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مذہبی درس گاہ ہماری دنیاوی درس گاہوں سے ظاہری حیثیت میں بھی کسی طرح کم نہ ہو، ۱۹۰۶ء میں مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں ”ندوہ کے مکان کی بد حیثیت اس کو ابھرنے نہیں دیتی، اس لیے ہر طرف سے ہٹ کر اب ادھر توجہ کرنی پڑی، اسی بنا پر کلکتہ کا سفر بھی ہے، ایک معقول شاہی عمارت بہت ارزاں لکھنؤ میں مل رہی ہے، خیال ہے کہ اسی کو لے لیا جائے۔“ (۸)

لیکن یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، اسی ضمن میں ۱۹۰۷ء میں ایک اپیل لکھوا کر چھپوائی جس میں

مدرسہ کی عمارت کا تخمینہ پچاس ہزار کیا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایسے پچاس بزرگ جو ایک ایک ہزار دے سکیں ہمت کریں، یہ اپیل مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم ریاست بھاولپور میں لے کر گئے تو حاتمہؑ دوران جدہ ماجدہ اعلا حضرت نواب صاحب بھاول پور نے فرمایا، پچاس شخصوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، یہ پوری رقم میرے منج کے خزانہ سے دے دی جائے۔

یہ خبر تار کے ذریعہ سے جب مولانا کو پہنچی ہے تو ان کی خوشی کا عجیب عالم تھا، اس دن تمام مدرسہ میں جلسہ و اساتذہ خوشی و مسرت سے بغل گیر ہو رہے تھے اور اسی خوشی میں انہوں نے یہ کیا کہ ۱۰ ارب بے دن کے کھانے کا جو دسترخوان، بچھا تھا وہ سارا کھانا فقرا کو تقسیم کر دیا، مولانا شردانی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ ”بیگم صاحبہ کی طرف سے مزید رقم کا وعدہ بھی تھا، مگر بعض معاصرین نے بیگم صاحبہ کو یہ خبر پہنچا کر پریشان کر دیا کہ ندوۃ العلماء کے دارالعلوم میں (نعوذ باللہ) الحاد لاندہ ہی کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں روپیہ دینا معصیت ہے“ اس خبر سے مضطرب ہو کر بیگم صاحب نے مولوی سرجم بخش صاحب مرحوم پریسڈینٹ کونسل ریاست (جن کی تحریک سے رقم بلا ملی تھی) کو بلا کر کہا ”سائیں سائیں جی روپیہ کس کو دلوں دیا“ ایک مولوی صاحب نے رفع الزام کی کوشش کی تاہم شوق امداد سرد ہو گیا، مزید رقم نہ مل سکی اور عمارت آج تک ناتمام ہے۔

مدرسہ کے لیے عطائے زمین ۱۹۰۸ء | سرمایہ کی طرف سے اطمینان ہوا تو زمین کی تلاش ہوئی، لکھنؤ میں سب سے بہتر اور سب سے موزوں تر وہ قطعہ آراضی ہے جو دریائے گوتسی کے پار آہنی پل کے دائیں جانب واقع ہے، زمین کا منظر یہ ہے کہ ایک طرف نہایت قریب دریا ہے، پشت اور پہلو میں اس وقت کیننگ کالج کا اور اب لکھنؤ یونیورسٹی کا بورڈنگ اور صنعتی اسکول کی پریشان عمارتیں ہیں، شمال کی طرف دور تک کھلا ہوا میدان ہے، یہ قطعہ پختہ ۳۴ بیگھ ہے، چنانچہ اس زمین کے لیے گورنمنٹ میں درخواست کی گئی، اگرچہ اس حلقہ کی زمین میونسپلٹی کے قاعدے کے رو سے ساٹھ روپیہ بیگھ سالانہ پر ملتی ہے اور اسی لیے زمین مطلوبہ کا لگان ڈھائی ہزار کے قریب ہوتا تھا، لیکن جناب مسٹر جاپانگ صاحب ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ کی اور کرنل عبدالجید خاں مرحوم وزیر پٹیالہ کی پرزور زبانی تحریک پر جناب کمشنر صاحب نے اس کے دیے جانے کی سفارش کی اور ہزار آرزو ہوٹ صاحب لفٹنٹ گورنر نے اس کو منظور کیا اور صرف دو سو سالانہ لگان مقرر کیا۔

۱۔ مولانا شردانی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ خود مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم نے ان سے بہ مقام بھاول پور بیان کیا تھا۔
۲۔ خاک سارے مارچ ۱۹۰۹ء میں بھاول پور ایک سلسلہ میں جا کر ارکان ریاست سے اس عمارت کی تکمیل کی تحریک کی، چنانچہ ہزار ہائوں نے چند ہزار کی رقم منظور فرمائی، مگر موجودہ جنگ کی وجہ سے یہ رقم اب تک نہ مل سکی۔

جلسہ سنگ بنیاد ۱۹۰۸ء | ان تیاریوں کے بعد نومبر ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم کے سنگ بنیاد اور ندوہ کے سالانہ اجلاس کی تاریخیں مقرر ہوئیں، ندوہ اودھ کے دارالسلطنت میں واقع ہے، اس کے چاروں طرف مسلمان رو سوار تعلقہ دار ہیں، جن کی معمولی نگاہِ التفات بھی ندوہ کو مالامال کر سکتی تھی، مگر ان لوگوں کو یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ ندوہ سے بدگمان ہے، اب جب کرنل عبدالحمید خاں مرحوم کی کوششوں سے ان بدگمانیوں کا پردہ چاک ہوا اور گورنمنٹ نے بیش از بیش نظر توجہ کی تو اس زمانہ کے حالات کے مطابق یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس مدرسہ کا ظاہری سنگ بنیاد یوپی کے گورنر سر جلال پرسکاٹ ہیوٹ رکھیں، تاکہ اودھ کے تعلقہ داروں کی بدگمانی دور ہو، مولانا مرحوم نے اس جلسہ کا حال خود اپنے قلم مسرت رقم سے لکھا ہے، اس لیے ہم اس کو یہاں ان ہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

بگذر ازیں حرف مکرر میرس خواب خوشی دیدم و دیگر میرس

تند سے بود خرابم ہنوز دیدہ من باز و بخوابم ہنوز

ہماری آنکھوں نے حیرت فرما تماشا گاہوں کی دل فریبیاں بار بار دکھی ہیں، جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظروں سے گزرا ہے، کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں، وعظ و پند کے پراثر جلسے بھی ہم کو متاثر کر چکے ہیں لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا، وہ ان سے بالاتر، ان سب سے عجیب تر، ان سب سے حیرانگیز تھا۔

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرماں روا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا، مسجد نبوی ﷺ کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا، غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کج کلاہ سب جمع تھے:

ع: آبا دایک گھر ہے جہان خراب میں

ہزار لفظ گورنر بہادر ممالک متحدہ نے منظور فرمایا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں گے، یہ تقریب ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو عمل میں آئی، چون کہ ندوہ کا سالانہ جلسہ بھی ان

ہی تاریخوں میں ہونے والا تھا اس لیے دو طرفہ کشمکش کی وجہ سے گویا تمام ہندوستان امنڈ آیا، انسوس یہ ہے کہ یہ کوئی تعطیل کا زمانہ نہ تھا ورنہ شاید منتظمین جلسہ انتظام مہمان داری میں ہمت ہار جاتے، معزز شرکائے جلسہ میں علما میں سے مولوی (مولانا) عبدالباری صاحب فرنگی بھٹی، مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری، مولانا ذاکر حسین صاحب، مولوی ابن حسن صاحب مجتہد العصر، مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواری، مولوی نظام الدین صاحب جھجری، مولوی مسیح الزماں خان صاحب استاد حضور نظام، (مولانا حبیب الرحمن خان شروانی) اور ارباب و جاہت میں سے جناب آرتھیل راجہ صاحب محمود آباد، جناب سر راجہ صاحب جہاں گیر آباد، نواب وقار الملک کرنل عبدالجید خاں فارن منسٹر پیالہ، صاحب زادہ آفتاب احمد خان، شیخ عبدالقادر بیرسٹر، حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس علی گڑھ، خان بہادر سید جعفر حسین صاحب، مولوی محمد حسین صاحب، مقبہ رئیس بمبئی، بابو نظام الدین رئیس امرتسر، حاجی شمس الدین صاحب سکریٹری حمایت اسلام لاہور، مرزا ظفر اللہ خاں صاحب سب جج جالندھر، شیخ سلطان احمد رئیس ہوشیار پور، خان بہادر شیخ غلام صادق صاحب، رئیس امرتسر، راجہ نوشاد علی خاں صاحب، صفی الدولہ نواب علی حسن خان لکھنؤ، حافظ نذرا الرحمن صاحب رئیس عظیم آباد جلسہ میں شریک تھے۔

تین بجے سے ذرا پہلے تمام لوگ بہ اسلوب بیٹھ گئے اور ارکان انتظامیہ ندوہ ہزار کے استقبال کے لیے لب فرش دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہوئے، کمشنر صاحب لکھنؤ نے سکریٹری دارالعلوم (شبلی نعمانی) کو لفٹ گورنر صاحب بہادر سے ملایا اور پھر سکریٹری موصوف نے تمام ارکان انتظامیہ کا ایک ایک کر کے لفٹ گورنر سے تعارف کرایا، اول دارالعلوم کے قاری نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں، پھر شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے ہزار سے ایڈریس پڑھنے کی اجازت طلب کی، مولوی مشیر حسن صاحب قدوائی نے ایڈریس پڑھا، ہزار نے نہایت خوش لہجگی اور صفائی سے ایڈریس کا جواب دیا، مولوی ظلیل الرحمن صاحب نے عربی ایڈریس جو سائن پر چھپا ہوا تھا، زیریں کار چوبی خریطہ میں رکھ کر پیش کیا، ہزار نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر ایڈریکٹنگ کے حوالہ کیا، پھر سنگ بنیاد نصب کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور مولوی شاہ ابوالخیر صاحب کرنل عبدالجید خاں صاحب، آرتھیل راجہ صاحب محمود آباد، نواب وقار الملک، حافظ عبدالعلیم صاحب رئیس کان پور، نواب علی حسن خان صاحب رئیس بھوپال، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، منشی اطہر علی صاحب بی، اے وکیل

لکھنؤ، حکیم عبدالعزیز صاحب، حکیم عبدالولی صاحب، مولوی محمد نسیم صاحب وکیل اور مولانا شروانی ان کے ساتھ گئے، سنگ بنیاد کے نصب کرنے کے وقت دوبارہ قاری صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت کی، واپسی کے وقت ارکانِ انتظامیہ نے موزن کار تک مشایعت کی اور یہ دلفریب تماشا ختم ہو گیا۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم لکھنؤ کا فرنگی محل تھا جو درسِ نظامیہ کا بانی ہے اور جس کے دامنِ فیض سے مولانا بحر العلوم، ملاحمد اللہ، ملاحسن وغیرہ تعلیم پا کر نکلے، یہ فرنگی محل اس لیے کہا جاتا تھا کہ ایک فرنگی کی کوٹھی تھی اور اس لیے محل اس کی طرف منسوب ہو گیا تھا، شاہ عالم گیر کی سند میں یہ نام درج ہے، اس جدید دارالعلوم کی بنیاد ہزار لفنٹ گورنر نے رکھی کہ وہ بھی اہل فرنگ ہیں، میر اکبر حسین صاحب نے اس موقع پر اس حسن اتفاق سے شاعرانہ کام لیا، لکھتے ہیں:

رکھی بنائے ندوہ ہزار نے آ کے خود سچ پوچھیے اگر تو فرنگی محل یہ ہے

لکھنؤ کی سرزمین میں مدرسہ کے نام سے یہ سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد پڑی تھی، اس واقعہ کو سامنے رکھ کر مولانا نے قرآن پاک کی ایک آیت سے جس میں خانہ کعبہ کو سب سے پہلا گھر فرمایا گیا ہے، یہ قطعاً تاریخِ موزوں فرمایا:

ملت این مدرسہ تازہ چو بنیاد نہاد کہ در و خلق زہر ناچیتے مجتمع است
قدسیاں از سرالہام بہ شبلی گفتند سال دتاریخ بناؤ اول بیت وضع است

۱۳۲۵ھ/۱۳۲۶ھ

سنگ بنیاد کی رسم بڑی شوکت و شان سے ادا ہوئی، تمام معزز رؤسا کا مصلح اور علماء و فضلاء شریک جلسہ تھے، اس موقع پر ارکانِ ندوہ کی طرف سے جناب ہزار کی خدمت میں جو سپاننامہ پیش کیا گیا، وہ گو پڑھا انگریزی زبان میں گیا، جس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شامل تھا، مگر اصل سپاس نامہ عربی زبان میں تھا۔ لطیفہ: ایک موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، لفنٹ گورنر کے انتظار میں ندوہ کے ارکانِ دور دوریہ کھڑے تھے، پروگرام یہ تھا کہ ڈپٹی کمشنر مولانا کا تعارف گورنر صاحب سے اور مولانا ارکان کا تعارف گورنر صاحب سے کریں گے، ابھی وہ نہیں آچکے تھے اور ارکان انتظار میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، مولانا شروانی نے مولانا سے فرمایا کہ جس ترتیب سے ہم لوگ کھڑے ہیں، اسی ترتیب سے ہمارے نام لکھ کر سامنے رکھ لیجیے، علی گڑھ میں ایک ایسا موقع آیا تو نواب وقار الملک نام بھول گئے، مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ

اب آپ لوگوں کے نام میں بھول جاؤں گا، اتفاق دیکھیے کہ جب گورنر آئے اور مولانا نے ایک ایک کے سامنے جا کر تعارف شروع کیا تو شاہ سلیمان صاحب کے پاس آکر ان کا نام بھول گئے، شاہ صاحب نے خود اپنا نام بتایا، اس پر بعد کو بڑی ہنسی ہوئی۔

ندوہ کا جلسہ سالانہ ۱۹۰۸ء | جلسہ سنگ بنیاد کے دوسرے دن ۲۹ و ۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ ہوا، پہلے جلسہ کے صدر جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری ہوئے، ان کی تقریر صدارت کے بعد مولانا نے اپنا وہ نو تصنیف فارسی قصیدہ جو اسی جلسہ کے لیے لکھا تھا، پڑھنا شروع کیا، اس کا مطلع ہے:

اے کہ نیرنگ ہر اپردہ عالم دیدی جاہ کینسرو و قمر حشم جم دیدی

قصیدہ کیا تھا تاثیر کا ایک امڈنٹا ہوا سیلاب تھا، جو دلوں کے ساحل سے جا کر ٹکراتا تھا، آہ و بکا اور شور و تحسین کے نعروں کے درمیان وہ ختم ہوا، اس کے بعد گورنر کے عطائے زمین اور ربیہ عالیہ بھاول پور کے شاہانہ عطیہ کے شکریہ کی تجویزیں منظور ہوئیں اور پہلا اجلاس ختم ہوا، ظہر کے بعد دوسرا اجلاس ہوا، جس میں حاضرین کے اصرار سے مولانا نے اپنا قصیدہ دوبارہ پڑھا، قصیدہ کی کاپیاں جو ندوہ کی طرف سے چھپوائی گئی تھیں، لوگوں نے ایک ایک روپیہ میں ہاتھوں ہاتھ لیں اور جناب نواب سید محمد علی حسن خاں بہادر نے تیس روپیہ میں ایک کاپی خرید فرمائی، اس کے بعد جناب سید محمد حسن مقبہ رئیس سہمی نے جو خود بھی عربی جانتے تھے، طلبہ کا امتحان لیا اور اردو کی ایک ایسی عبارت ترجمہ کے لیے دی جو جدید قانونی اور تمدنی الفاظ سے بھری ہوئی تھی، چار طالب علموں نے اسی وقت نہایت فصیح و بلیغ عربی میں ترجمہ کر دیا، اس کے بعد ایک طالب علم نے عربی میں نہایت شستہ رفتہ تقریر کی، جس پر تمام حاضرین نے تحسین و آفرین کی، مولانا نے وقت کی موزونیت کو سمجھ کر ادارہ علوم کی خصوصیات پر ایسی موثر تقریر فرمائی کہ لوگوں نے تعلیم اور تعمیر کے لیے چندے لکھوانے شروع کر دیے۔

اس جلسہ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ علی گڑھ پارٹی کے ارکان آفتاب احمد خان، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور کالج اور کانفرنس کے دوسرے ارکان جو ابھی تک ندوہ کے کسی جلسہ میں شریک نہیں ہوئے تھے، شریک اجلاس ہوئے، رات کو ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے بطیموسی اور فیثا غورثی نظام فلکی پر مبسوط لکچر دیا اور تمام علمی تجربات دکھائے اور اس کے بعد پروفیسر فیروز الدین مراد نے طبیعیات و

برقیات کے بعض مسائل پر میجک لینٹرن کے ذریعہ سے تقریر کی جس سے علما کو جدید سائنس کی بعض تحقیقات کا علم ہوا۔

دوسرے دن ندوہ کا تیسرا اجلاس ہوا، اس کے صدر شمس العلماء مولانا ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوری ہوئے، اس جلسہ میں سب سے پہلے مولوی عبدالودود صاحب ندوی نے جو انجمن تقویۃ الایمان ڈیک (راجپوتانہ) کی طرف سے آئے تھے، آریہ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی جو کوشش وہاں کر رہے تھے، اس کی تفصیلات بیان کیں، اس کے بعد مولانا نے دارالاقامہ کے لیے ہندوستان کے ہر شہر سے ایک ایک کمرہ بنانے کی تجویز پیش کی اور اس تجویز کو پیش کرتے وقت دین و دنیا کے تعلقات پر ایک جامع تقریر فرمائی، اصل تجویز کی تائید مولانا حبیب الرحمن خان شروانی اور مولوی غلام محمد صاحب شملوی نے کی اور اسی وقت چند کمروں کے لیے لوگوں نے چندے لکھوائے، اس کے بعد منتظمین کے شکر یہ پر جلسہ ختم ہوا اور لوگ یہ کہہ کر رخصت ہوئے:

”خواب خوشی دیدم و دیگر پرس“

وقف علی الاولاد کی کارروائی کا آغاز بھی ندوہ کے اسی اجلاس سے ہوا اور مولانا کی تحریک سے یہ طے ہوا کہ علما سے اس بارہ میں فتوے طلب کیے جائیں۔

دارالاقامہ کا خیال | دارالعلوم کی عمارت جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی تھی، مولانا اس کے لیے ایک دارالاقامہ کی تعمیر کی تحریک کو جس کی تجویز جلسہ میں منظور ہو چکی تھی، آگے بڑھا رہے تھے، ایک ایک کمرہ کا تخمینہ سات سات سو روپیہ قرار دے کر احباب سے اور دوسرے دردمندوں سے ایک ایک کمرہ کا چندہ وصول کرنا شروع کر دیا، دلی اور لکھنؤ کے اجلاسوں میں بہت سے اہل خیر نے ایک ایک کمرہ کی تعمیر کا وعدہ کیا اور بہت سے لوگوں نے اپنے وعدے پورے بھی کیے، ان میں پہلا نام تو خود مولانا کا ہے، دوسرا حکیم عبدالولی صاحب مرحوم جھوئی ٹولہ لکھنؤ کا ہے، ان کے علاوہ شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر اور نواب رستم علی خاں صاحب رئیس کرنال کے نام ہیں، نواب منزل اللہ خان نے لکھا کہ وہ مولانا کی تصنیفات کی یادگار میں ایک کمرہ بنوائیں گے لیکن مولانا نے ان کے اس چندہ کو دارالمصنفین کی تعمیر کے لیے مخصوص کرنے کی تجویز ان کے سامنے پیش کی۔

۱۔ منقول از روداد و از دہم، اجلاس دہلی، ۱۹۱۵ء، ص ۵۶، ۵۷۔ ۲۔ بہ جوالہ الندوہ۔

بیگم صلاحیہ ججیرہ (بھئی) نے جن کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانہ سے تھے، جولائی ۱۹۰۹ء میں ایک کمرہ کے لیے ایک ہزار روپیہ بھیجا، اس کے شکر یہ میں مولانا نے یہ قطعہ ان کو لکھ کر بھیجا:

مشغول کار مدرسہ بودم کہ ناگہاں	دیدم کہ نامہ باز پئے ہم رسیدہ است
زاں حملہ بست نامہ بے نقش و بے سواد	کز بارگاہ حضرت بیگم رسیدہ است
از جائے جستم و بگریتم بدست شوق	گویا کہ خستہ ایست بہ مرہم رسیدہ است
بر سر نہادم و بہ ادب بوسہ دادمش	مانند تھنہ کہ بہ زمزم رسیدہ است
مہر از سرش گرفتم و از جا در آدم	چوں دیدم این کہ کاغذ زہم رسیدہ است
نزم کہ این عطیہ فیض امیرہ است	کا آوازہ سخاش بہ عالم رسیدہ است

بھوپال کی امداد میں اضافہ ۱۹۰۹ء | سرکاری امداد سے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے موازنہ میں جو عدم توازن پیدا ہو گیا تھا، اس کے دور کرنے کے لیے مولانا پوری کوشش میں مصروف تھے، کبھی دورہ کرتے تھے، کبھی حیدرآباد کا خیال کرتے تھے۔ (سلیمان-۲۳)

منشی محمد امین صاحب بھوپال کو ۷ فروری ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں ”آپ کو معلوم ہے کہ ندوہ کی مستقل آمدنی ابھی تک صرف دو سو ہے گورنمنٹ نے پانچ سو روپیے دیے اس لیے اب خالص مذہبی علوم کا سینہ اس کے مقابلے میں بہت کم وقعت رہ جاتا ہے، ضرور ہے کہ خود ندوہ کی آمدنی میں اضافہ ہو، ریاست حیدرآباد سے پانچ سو کا وعدہ ہو چکا تھا لیکن اس حالت میں کہ ریاست پر کئی کروڑ کا بار پڑ گیا جو کئی سال تک قائم رہے گا، زبان نہیں کھل سکتی“ (۳) آخر کام یابی کی بجلی بھی اسی افق سے چمکی، جدھر سے امید کی پہلی شمع نظر آئی تھی، یہ وہی نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روئے بھوپال کا دست کرم تھا، سرکار عالیہ نے اس ضرورت کو سننے کے ساتھ اپنے پچاس روپیہ ماہوار کی امداد کو بیچ گونہ کر دیا، یعنی از خود دو سو روپیے ماہ وار کا اضافہ کر کے ڈھائی سو کر دیا، یہ وہ احسان عظیم تھا جس نے مولانا جیسے خود دار شاعر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی سپاس گزاری کو ایک قصیدہ کی صورت میں ظاہر فرمائیں، چنانچہ عمر میں پہلی دفعہ اپنی خوشی سے وہ مدیہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

انچ بادشت و چین ابر بہاراں کردہ است خسرو کشور بھوپال بما آں کردہ است

اس شعر میں نازی بیگم، عطیہ بیگم اور امیرہ بیگم کی طرف اشارہ ہے، جو اس خاندان کی محترم خواتین ہیں۔

ناشکر گزاری ہوگی اگر اس سلسلہ میں منشی محمد امین صاحب زبیری لٹریچر سکریٹری سرکار عالیہ و مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال کا نام نہ لیا جائے، جن کی سعی خیر سے یہ کام انجام پایا تھا، مولانا نے منشی صاحب کے ایک خط میں خود اس کا اقرار کیا ہے، لکھتے ہیں ”واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ اور ندوہ کو ریاست سے جو فوائد پہنچ رہے ہیں، اس کے سنگ بنیاد آپ ہیں۔“ (۱۱۱-۷)

ریاست رام پور کی امداد ۱۹۱۰ء | دوسرے سال ایک اور اسلامی ریاست نے امداد کا ہاتھ بڑھایا، ہزہائیس نواب حامد علی خان صاحب فرماں روا نے رام پور سے مولانا کے روابط بہت پرانے تھے، مگر ان کی تجدید غالباً جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے توسط سے اب ہوئی اور شاید ان ہی کی سفارش سے ۱۹۱۰ء میں نواب صاحب مدوح نے پانچ سو روپے سالانہ کی امداد منظور فرمائی، جو مولانا کی معتمدی تک برابر ملتی رہی۔

درس گاہ کی تعمیر کا کام | سنگ بنیاد کے بعد دارالعلوم کے مجوزہ عمارت کا نقشہ خان بہادر میر جعفر حسین صاحب انجینئر (لکھنؤ) نے جو علی گڑھ تحریک کے علم برداروں میں تھے نہایت محنت سے تیار کیا اور ۲۲ مئی ۱۹۰۹ء کو جلسہ انتظامیہ نے شکریہ کے ساتھ اس کو منظور کیا، یہ نقشہ اس قدر خوبصورت، موزوں اور جامع حیثیات تھا کہ سب نے بے ساختہ داد دی، بیچ کا کمرہ اتنا وسیع کہ ایک ہزار کرسیوں کی گنجائش ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ ۳۱ کمرے، ارکان کی طرف سے تعمیر کے لیے ایک سب کمیٹی بنادی گئی تھی، جس کے سکریٹری منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کا کوری مقرر ہوئے، منشی صاحب موصوف کی نگرانی میں سید ہادی صاحب اور سیر (لکھنؤ) نے اسی کے بعد عمارت بنوانی شروع کی اور ۱۹۱۳ء تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

تعمیر کے کمرہ کی بنیاد | مدرسہ کی زمین کا یہ منظر مولانا کی بہترین امیدوں کا گہوارہ تھا، وہ اس گہوارہ کو دیکھنے اکثر تشریف لے جاتے تھے، ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو مولوی ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں، ”دارالعلوم کی تعمیر شروع ہو گئی، عجب مست اور فرحت انگیز موقع ہے، روز دیکھنے کو جی چاہتا ہے، سینٹری کے لحاظ سے مدرسہ العلوم کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔“ (۳)

”۱۰ جنوری ۱۹۱۰ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں ”عمارت اب اس حالت تک پہنچ

گئی ہے کہ نہایت تفریح ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ وہیں رہا کیجیے، حالانکہ صرف کمر تک دیواریں آئی ہیں، تم دیکھ کر لطف اٹھاؤ گے۔“ (حمید-۳۷)

الندوہ، اپریل ۱۹۰۹ء۔

جب دیواریں تھوڑی تھوڑی اور بلند ہوئیں اور کمروں کے نشان ظاہر ہوئے تو فروری ۱۹۱۰ء میں فرط جوش میں ایک دن تمام طلبہ اور اساتذہ کو لے کر اس زمین پر گئے اور فرمایا مدرسہ کی ظاہری بنیاد تو ایک حاکم وقت نے رکھی، اب آؤ مدرسہ کی حقیقی بنیاد ہم رکھیں، اس پُراثر منظر کی تصویر خود مولانا کے قلم نے کھینچی ہے، مناسب ہوگا کہ وہ اس موقع پر آپ کی نظر سے بھی گزر جائے۔

”اربابِ دولت کو ندوۃ العلماء کی عظمت و شان کا تماشا اس وقت نظر آیا ہوگا جب خبر آنے دارالعلوم کا سنگ بنیاد نصب فرمایا تھا لیکن جو لوگ مذہبی خلوص کے دلدادہ ہیں، ان کے دل اس رسم کی ادائیگی کی خبر سن کر بل جائیں گے، جو اسلامی سال نو کے آغاز اور مقدس دن (جمعہ) کو ادا ہوئی، کیم محرم ۱۳۲۸ھ روز جمعہ کو تمام طلبائے دارالعلوم اس مقام پر جہاں دارالعلوم کی جدید عمارت تعمیر ہو رہی ہے، اس قدیم مذہبی خدمت کو انجام دینے کے لیے جمع ہوئے، جو ان کا آبائی شعار ہے، دارالعلوم کی تمام عمارت اگرچہ بہ جائے خود ایک غلطی اور مذہبی عمارت ہے لیکن اسلامی علوم میں علم تفسیر تمام علوم دینیہ کا سر تاج ہے، اس لیے جو کمرہ خاص فن تفسیر کے لیے تعمیر ہو رہا ہے، طلبائے دارالعلوم ندوہ نے اس کے پاس جا کر تمام مزدوروں کو بٹا دیا اور خود اپنے ہاتھ سے چونہ، گارا، ایشیں لاکر ڈھیر کرنی شروع کیں، معمار کام بناتے جاتے اور لڑکے ان کو مصالحو دیتے جاتے تھے، وہ حالت خاص اثر رکھتی تھی، جب مصالحو گھٹتا تھا اور کم حیثیت معمار معزز خاندانی لڑکوں کو تحکم کے لہجے میں ڈانٹتے تھے، کہ مصالحو پورا نہیں پہنچتا، جلد کام کرو، خاک سار چلی بھی اس رسم میں شریک تھا، اور اینٹ اٹھا اٹھا کر معماروں کو دیتا تھا، جب یہ رسم ادا ہو چکی تو میں نے دارالعلوم کے مقاصد و اغراض کے متعلق ایک تقریر کی جس کی ابتدا دعا سے ہوئی اور دعا پر ختم ہوئی، تقریر کا حاصل یہ تھا کہ اے خدا! یہ چند ناتواں کم حیثیت کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سخت سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لیے جاتا ہے، جس کے ساتھ ان کی مذہبی حالت مذہبی (علوم) مذہبی شعائر سب اسی طوفان کی زد میں ہے، اے خدا! تو ان چند ناتواں بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھال لیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے، جو کسی طرح ان کے چہرے پر نہیں کھلتا تو یہی ہے جو ان کی آبرورہ جائے۔

یہ ایک ایسی شان دار رسم تھی، یہ ایک ایسا موثر منظر تھا، جہاں دارالعلوم کے تمام مقاصد و اغراض محسوس صورت میں نظر آتے تھے، طلبہ کو نظر آتا تھا کہ ان کی زندگی کا آخری مقصد کیا ہے، وہ جس شاہ راہ پر جا رہے ہیں، اس کی انتہائی منزل کہاں ہے، ان کو معلوم ہوتا تھا کہ مذہب کا روحانی اثر کس قدر قوی ہے،

۱۔ اصل میں تاریخ ہے، مراد علوم، س۔

ان کو محسوس ہوتا تھا کہ کون سا پر زور ہاتھ ان کو ڈھکیل رہا ہے۔

دارالافتحیر کی یہ بنیاد تعمیر اور اس موقع پر ان کی یہ ولولہ انگیز تقریر ان کے اصلی جذبات کا پتہ دیتی ہے، کہ وہ کن امیدوں کے ساتھ ندوہ اور دارالعلوم کی خدمت میں لگے ہوئے تھے، اس عمارت کی ہر اینٹ ان کی امید و آرزو کی ایک اون تھی، اس خوش منظر قطعہ میں بھری ہوئی امیدوں کے ساتھ کبھی تنہا جاتے کبھی دوسروں کو لے جاتے۔“

اسی نامکمل عمارت میں ۱۹۱۰ء میں ہر ہائیٹس سر آغا خان کی آمد پر ایک نہایت شان دار جلسہ کیا اور ۱۹۱۳ء میں جب اس کا ہال پورا ہو چکا تھا، سید رشید رضا کی آمد پر ندوہ کا عظیم الشان سالانہ جلسہ پھر اسی میں منعقد کیا، تاکہ عام مسلمان امید کے اس نخلستان کو دیکھ لیں۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ سلسلہ تعمیر میں مولانا اور منشی صاحب میں ایک اختلاف پیدا ہوا، جو بڑھتا ہی گیا، مولانا یہ چاہتے تھے کہ جتنا سرمایہ ہمارے پاس ہے، اسی کی حیثیت سے تعمیر کو مکمل کر دیا جائے اور منشی صاحب موصوف جو بڑی مستعدی اور محنت سے عمارت کے بنوانے میں مصروف تھے، ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مدرسہ بنے تو نقشہ کے مطابق ہر حیثیت سے مکمل بنے، کام تین چار برس تک جاری رہا، بالآخر وہ پچاس ہزار ختم ہو گئے، مدرسہ کا پہلا مکان شاید نو دس ہزار میں بکا، وہ بھی خرچ ہوا، مستقل فنڈ بھی تمام ہو گیا، ندوہ کے قبضہ میں ایک آدھ کرایہ کا سکونتی مکان تھا، وہ بھی بک گیا، مگر تعمیر تکمیل کو نہیں پہنچی، ۲۷ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں، مکان بک گیا، اب بھی دیکھیے، عمارت پوری ہوتی ہے یا نہیں، نواب غلام احمدؒ مدراس سے آئے تھے، ان کو عمارت دکھائی، ان کے اندازہ تخمین سے باہر تھی، بہت خوش ہوئے۔“

افسوس کہ مولانا کی زندگی میں ان کے خواب تمنا کی تعبیر نہیں نکلی، آخر اسی نام تمام عمارت میں مولانا کی علاحدگی کے بعد اور وفات سے پہلے ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم اٹھ کر چلا آیا۔

مدرسہ میں سر آغا خان کی آمد اور ۵۰۰ سالانہ کی امداد ۱۹۱۰ء | اس زمانہ میں مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں کے سبب سے ہر ہائیٹس سر آغا خان ہندوستانی مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے، اخیر

۱۔ نواب غلام احمد خاں کلامی مدراس کے ایک پرانے قومی خادم ہیں، اب بوزھے ہو چکے ہیں، پھر بھی ریاست میسور کی اسمبلی میں غیر برہمنوں کے لیڈر ہیں، ندوہ کے قدیم ہی خواہ اور معین و مددگار ہیں۔

جنوری ۱۹۱۰ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں جس میں مولانا وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو پیش کرنے کی غرض سے گئے تھے، مولانا کی ملاقات سر آغا خاں سے ہوئی، موصوف نے ندوہ کے متعلق کچھ مشورے کیے، اس تقریب سے مولانا نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ندوہ کو دیکھتے جائیں، جس کو انہوں نے منظور کیا، چنانچہ ۳۱ جنوری ۱۹۱۰ء کو وہ لکھنؤ آئے اور ۳ فروری ۱۹۱۰ء دارالعلوم کی جدید عمارت کے زیر تعمیر ہال میں ایک نہایت شاندار جلسہ ہوا، ہال کو دارالعلوم کے ایک ممتاز طالب علم نے جن کے حسن اہتمام و انتظام کو اب ایک دنیا مانتی ہے، مگر اس وقت تک صرف مولانا ہی مانتے تھے، یعنی مولوی مسعود علی صاحب ندوی، نے نہایت خوبی سے سہایا تھا، تقریباً پانچ سو چیدہ اصحاب کا مجمع تھا، جن میں آرنہیل راجہ علی محمد خان تعلق دار محمود آباد، آرنہیل راجہ تصدق رسول خان تعلق دار جہاں گیر آباد، راجہ شعبان علی خان، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

ہزہ ہائینس ٹھیک ۱۲ رجب تشریف لائے، طلبہ نے جن کی دورو یہ قطاریں سڑک کے دونوں طرف کھڑی تھیں، اہلاً و سہلاً و مرحباً کا زور سے غلغلہ بلند کیا، ہزہ ہائینس ہال میں تشریف لا کر صدر میں بیٹھے، پہلے دارالعلوم کے ایک طالب علم نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں، پھر مولانا نے فارسی میں اڈریس پڑھا جو الندوہ میں اور مقالات شبلی کے سلسلہ میں چھپا ہوا ہے، چون کہ ہزہ ہائینس کا اصل مقصد طلبہ کے خیالات و معلومات کا اندازہ کرنا تھا، اس لیے جناب ممدوح نے طلبہ کو بلا کر ان کو تقریر کا موقع دیا اور بعض طلبہ کے لیے خود تقریر کا موضوع متعین کر دیا، طلبہ نے نہایت شستہ اور فصیح عربی میں تقریریں کیں، خاک سار کی تقریر کا موضوع تھا، ”علما کو جدید فلسفہ کا سیکھنا کیوں ضروری ہے؟“ یہ عربی تقریر لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں چھپی ہے، آخر میں ہزہ ہائینس نے کھڑے ہو کر نہایت فصیح فارسی میں برجستہ تقریر کی جس میں دارالعلوم کے مقاصد اور تعلیم کی تعریف کی اور فرمایا کہ ندوہ کی تعلیم کے سلسلے تمام ہندوستان میں پھیلنے چاہئیں، تاکہ مذہبی گروہ میں یہ روشن خیالی پیدا ہو جائے، یہ بھی فرمایا کہ طلبہ کو جدید تعلیم کی تکمیل کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا چاہیے اور جس طرح یہودی اور عیسائی پیشوایان مذہب علوم جدیدہ کو مذہب کی حمایت کے لیے سیکھتے ہیں، علمائے اسلام کو بھی اسی طرح سیکھنا چاہیے تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر اپنا مذہبی اثر ڈال سکیں اور ان کی رہبری کر سکیں، آخر میں فرمایا کہ میں ہمیشہ ندوہ کا معین و مؤند رہوں گا اور پانچ سو سالہ کی امداد منظور کی۔

آخر میں مولانا عبدالباقی صاحب مرحوم نے ہزہائینس کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا ہم کو ہزہائینس جیسے لوگ درکار ہیں جو مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا سکیں، اسی پر جلسہ کا خاتمہ ہوا۔

اجلاسِ دہلی ۱۹۱۰ء | ندوہ کے سالانہ اجلاس گو امرتسر سے لے کر کلکتہ اور مدراس تک بڑے بڑے شہروں میں ہو چکے تھے، مگر ہنوز ہندوستان کا پایہ تخت اس شرف سے محروم تھا، مولانا نے وقف علی اللہ کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں شرکت کے لیے جو سفر کیا، اسی سفر میں جنوری ۱۹۱۰ء میں دہلی میں جناب حکیم اجمل خاں صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہیں یہ طے پایا کہ ندوہ کا آئندہ سالانہ جلسہ دہلی میں ہو اور اس کے لیے ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء کی تاریخیں مقرر کی گئیں اور تیاریاں شروع ہوئیں۔

اس جلسہ میں مخالفین نے ایک ہنگامہ یہ برپا کیا کہ مولانا نے اس جلسہ کے سلسلہ میں ندوہ کے ایک شذرہ میں لکھ دیا تھا کہ ”اس جلسہ میں شاید مولانا حالی اور مولانا نذیر احمد صاحب بھی علما کے پہلو پہ پہلو شریک ہوں اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ جدید تعلیم کے امیر العسکر قدیم جماعت کے علما کی صف میں دوش بدوش نظر آئیں۔“ (اندوہ ص ۳ فروری ۱۹۱۰ء) ان دنوں مولوی نذیر احمد صاحب نے ”امہات الامہ“ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کی زبان نہایت سوجیا نہ تھی، جس کو پڑھ کر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوئی اور اس لیے ان کے خلاف دہلی میں خاصی شورش برپا تھی، ندوہ میں ان کی شرکت کی خبر نے خود ندوہ کے اجلاس کو مورد اعتراض بنا دیا، ارکان ندوہ نے بلکہ درحقیقت حکیم اجمل خان صاحب مرحوم نے مولوی نذیر احمد صاحب اور مخالفین کے درمیان اس بات پر مصالحت کرائی کہ کتاب کے نسخے ان لوگوں کو سپرد کر دیے جائیں اور آئندہ اس کی اشاعت بند کر دی جائے، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ نسخے فریق مخالف کے پاس بھیج دیے لیکن مولانا نذیر احمد صاحب نے خود اس بات پر اصرار کیا کہ یہ کتابیں فریق مخالف کے قبضہ میں بھی نہ رہیں، بلکہ جلا کر ناپید کر دی جائیں، شاید مولوی صاحب کو اس کا خطرہ ہو کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی کتاب سے کوئی دوسرا نفع اٹھالے، بہر حال ان کی اس پر اصرار خواہش کے مطابق کتاب کے موجودہ نسخوں کو ایک مجمع میں جس میں ندوہ کے ارکان بھی تھے، نذر آتش کروایا گیا، اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب سکر میٹری ترقی اردو نے اپنے مقدمہ حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف بواسطہ یا بلا واسطہ بے وجہ اور بلا تحقیق منسوب کر کے ایک تاریخی

۱۔ اندوہ مارچ ۱۹۱۰ء مطابق ربیع الاول ۱۳۲۸ھ۔

جرم کیا ہے، حالانکہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود نہ تھے، مولانا شروانی صاحب نے جو شریک جلسہ تھے، مقدمہ، مقدمات عبدالحق (ص ۸) میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھ دی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد واقعات کی نسبت میں کتنی بے احتیاطی برتتے ہیں۔ بہر حال یہ جلسہ جناب حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے زیر اثر اور ان ہی کی صدارت میں

بہت دھوم دھام سے عربک کالج کے میدان میں ہوا، دو دروڑ سے مہمان آئے تھے، حسب دستور طلبہ امتحان کے لیے پیش ہوئے، مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اور مولوی قمر الدین مرحوم سے حاضرین نے یہ خواہش کی کہ ”اربابِ دہلی نے ندوہ کا یہ اجلاس جس خوش اسلوبی اور فیاضی سے کیا ہے اس کا حال عربی میں لکھ کر پیش کریں، ان دونوں نے چند منٹ کے اندر بہترین فصیح عربی میں اس واقعہ کو قلم بند کر کے پیش کر دیا، اس کے بعد ندوہ کے درجہ تکمیل ادب کے طالب علم مولوی خواجہ عبدالواجد صاحب ندوی (جو بعد کو ”الہدلال“ کلکتہ میں شریک ادارت ہوئے اور اب ایم، اے ہو کر کانپور میں پروفیسر کالج ہیں) نے عربی میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک ایسی برجستہ تقریر کی کہ علما جو اس قسم کی تقریروں کے خاص مخاطب تھے، ان کی یہ حالت تھی کہ وجد میں آ کر جھومتے تھے اور ان کی زبان سے بے ساختہ تحسین آمیز کلمات بلند ہوتے تھے، شیخ عبدالحق صاحب حقی بغدادی اس سنٹ پر و فیصر عربی علی گڑھ کالج سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک اہل زبان اور معلم ادب ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے ظاہر فرمائیں، انہوں نے عربی کی ایک فصیح و بلیغ تقریر میں دارالعلوم کی تعلیم اور طلبہ کی ادبی قابلیت کی بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ طلبہ کی عربی تحریر و تقریر نے جاہلیت عرب کے سوتی عکاظ کا سماں پیدا کر دیا جس کو میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

مولانا نے اس زمانہ میں تبلیغ اور ردِ آریہ کے خیال سے ”بھاشا“ کی تعلیم کا ایک درجہ ندوہ میں کھولا تھا، سید امداد حسین صاحب ہوشیار پوری طالب علم ندوہ نے اعیان بھاولپور کی خواہش پر ہندی بھاشا میں ایسی عمدہ تقریر کی کہ لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ یہ کوئی نو مسلم ہندو ہے، لڑکا نہایت گورا چٹنا اور بلند قامت تھا، بدگمانی کرنے والوں نے سمجھا کہ یہ کوئی کشمیری برہمن ہے، چنانچہ اس خیال کے ازالہ کے لیے اسے قرآن پاک پڑھنے کی فرمائش کی گئی، اتفاق یہ کہ اس کی آواز بھی اچھی تھی، اس نے ایک خاص پر درد لہجہ میں سورہ رحمان کی تلاوت شروع کی تو سماں بندھ گیا اور اس پر انعامات کی بارش شروع ہو گئی۔

۱۔ رواد دہلی، ص ۱۳۹ ۲۔ ندوہ اپریل ۱۹۱۰ء مضمون نوشتہ مولانا ابوالکلام دہلوی۔

چند طالب علم انگریزی میں تقریر کرنے کے لیے بھی تیار تھے، مگر مولانا کو خیال ہوا کہ شاید عربی خواں طلبہ کی زبان سے لوگ انگریزی تقریر پسند نہیں کریں گے، اس لیے انہوں نے اس بارہ میں حاضرین کی رائے دریافت کی، لوگوں نے شوق کے ساتھ اجازت دی، اس پر سید محمد صاحب جو اب بی، اے ہو چکے ہیں اور عبدالجید نے جو دارالعلوم کے منتہی طالب علم تھے، محاسن اسلام پر انگریزی میں تقریریں کیں، ان تقریروں میں اگرچہ صحت مخارج اور انشا پر دازی کے لحاظ سے بہت کچھ خامیاں تھیں جن کو ریمارک کرتے وقت شیخ (سر) عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے ظاہر کر دیا، تاہم جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ صرف ایک سال کی باقاعدہ تعلیم کا نتیجہ ہے تو انہوں نے اس تعلیم کے مستقبل کی نسبت اپنا اطمینان ظاہر فرمایا۔ طلبہ کی ان تقریروں اور تحریروں کا یہ اثر ہوا کہ ہر طرف سے چندہ کی بارش ہونے لگی اور اس جلسہ نے متعلق یہ بہنا بالکل سچ ہے کہ یہاں جو کچھ کام یاہی ہوئی وہ تمام تر طلبہ کی لیاقت کا نتیجہ تھا، مولانا ابوالکلام نے بھی اس اجلاس میں بہت پرزور تقریر کی تھی جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک ہے۔ اس اجلاس کی سب سے اہم تجویز مجلس اشاعت اسلام کا قیام تھا اور جس کے لیے یہ زمانہ نہایت موزوں تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی، اسی اجلاس میں دوسرے دن میں نے ایک کتب خانہ اعظم کی تجویز پر تقریر کی، اور دارالمصنفین کا خاکہ پہلی دفعہ پیش کیا گیا، دوسری تجویز قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کے متعلق پیش ہو کر منظور ہوئی اور تیسری تجویز انگریزی کورس کی ان غلطیوں کی اصلاح کے متعلق منظور ہوئی، جن سے اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق بدگمانی پھیلتی ہے، اس صیغہ کا نام صیغہ تصحیح تاریخ اسلام رکھا گیا اور خاک ساراس کا سکریٹری منتخب کیا گیا، ایک اور تجویز جدید عربی کے لغت کی ترتیب کی منظور ہوئی اور یہ کام بھی خاک سار کے سپرد ہوا۔

حکیم صاحب مرحوم کی دل پذیر تقریر پر اس تاریخی اجلاس کا خاتمہ ہوا۔

ندوہ کا اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء سید رشید رضا مصری کی صدارت | ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں ندوہ کا وہ عظیم الشان اجلاس ہوا جس کو معنوی حیثیت سے ندوۃ العلماء کا سب سے کام یاب اجلاس کہا جاسکتا ہے، ان دنوں مولانا جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا جواب عربی میں لکھ رہے تھے اور اس کے کچھ اجزا سید رشید رضا ایڈیٹر المنار کے پاس مصر بھیجے، جس سے مابین خط و کتابت کی تازہ تقریب پیدا ہو گئی، سید موصوف اس زمانہ میں مصر میں ”دارالدعوة والارشاد“ کے نام سے جدید طرز کا

ایک مذہبی مدرسہ قائم کر رہے تھے، اس سلسلہ میں بھی دونوں میں خط و کتابت ہو رہی تھی، ادھر ندوہ کے مجوزہ اجلاس کی تیاری ہو رہی تھی، جس میں تبلیغ کے مسئلہ پر پوری بحث ہونے والی تھی، ان گونا گوں مناسبتوں سے مولانا نے سید موصوف سے تحریک کی کہ وہ ہندوستان آ کر ندوہ کے اس اجلاس کی صدارت کریں، موصوف نے اس کو قبول کیا، یہ دو اسلامی ملکوں کی مذہبی تعلیمی و تبلیغی کوششوں کا سب سے پہلا اتحاد تھا، جس کی خبر ہندوستان میں عام ہوئی تو مسلمانوں میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا، اس وقت لارڈ کرومر مصر میں برطانی سفیر تھے، سید موصوف نے ان سے خاص طور سے اجازت لے کر ہندوستان کا سفر کیا جس کے معنی یہ تھے کہ برٹش گورنمنٹ کو ان کی آمد پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

سید موصوف نے ۲۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا، بمبئی کے اکابر اور عرب تجار نے خیر مقدم کیا، بمبئی سے وہ دلی، دلی سے لاہور اور لاہور سے لکھنؤ آئے، مولوی عبدالحق صاحب حق بنادادی پروفیسر عربی علی گڑھ کالج سفر میں ان کے ہم رکاب تھے لکھنؤ کے اسٹیشن پر مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع جس میں علما، طلبہ اور رؤسا غرض ہر طبقہ کے اصحاب تھے، استقبال کے لیے کھڑا تھا، نوبے پنجاب میل نے اسٹیشن پر قدم رکھا تو اسٹیشن اہلاً و سہلاً و مدحبا کے نعروں سے گونج اٹھا، راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی گاڑی ان کی سواری کے لیے بھیجی تھی، اس پر بیٹھ کر وہ شہر روانہ ہوئے لیکن مسلمانوں کا جوش اتنا بڑھا ہوا تھا کہ آدھی دور کے بعد گھوڑے کھول دیے اور خود گاڑی کو اپنے ہاتھوں کھینچتے ہوئے سید ممتاز حسین صاحب بیرسٹر مرحوم کی کوٹھی پر لائے، جہاں سید صاحب موصوف کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

۶ اپریل ندوہ کے اجلاس کی تاریخ تھی، قرآن پاک کی تلاوت اور استقبال کے خطبہ صدارت کے بعد مولانا نے سید رشید رضا کی صدارت کی تحریک کی اور ان کی مذہبی و تعلیمی و تبلیغی کوششوں کو یہ تفصیل بیان کیا، سب نے یہ ایک آواز تائید کی، سید صاحب نے صدارت کی کرسی کو زینت بخشی اور عربی زبان میں ایک نہایت دل آویز و فصیح تقریر ارشاد فرمائی، جو اسلامی نقطہ نظر سے مسلمانوں کی تعلیمی و مذہبی ضرورتوں پر نہایت مدلل اور مؤثر تبصرہ تھا، سید صاحب کا انداز بیان ایسا دل چسپ اور مؤثر تھا کہ سنا بندھ گیا تھا، جو لوگ عربی نہیں بھی جانتے تھے، وہ بھی ان کی ڈھائی گھنٹہ کی عربی تقریر کو نہایت سکون سے سنتے رہے۔

اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے، وہ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بہ جائے خود اپنی سحر بیانی سے داؤں

میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔

تہنیت و تعزیت کی رسمی تجویزوں کے بعد مولانا نے یہ تجویز پیش کی کہ ”حکومت ہند سے درخواست کی جائے کہ جمعہ کے دن سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کو نماز جمعہ کے لیے دو گھنٹہ کی تعطیل دی جائے، جس کے نہ ہونے سے بہت سے مسلمان ایک بہت بڑے مذہبی فرض سے محروم رہ جاتے ہیں“ اس کی تائید مرزا سمیع اللہ بیگ وکیل لکھنؤ (حال نواب مرزا یار جنگ سابق وزیر عدالت حیدرآباد دکن) اور مرزا محمود صاحب قادیانی (موجودہ مرزا بشر الدین محمود امام قادیان) نے کی، اس کی منظوری کے بعد دلی کی تجویز کے مطابق قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کی کارروائی کی رپورٹ سنائی جس میں یہ مژدہ سنایا کہ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی جن سے زیادہ بڑا انگریزی کا کوئی مسلمان ادیب موجود نہیں، قرآن پاک کے ترجمہ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

تیسرے جلسہ میں خاک سار نے صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی کی رپورٹ سنائی اور انگریزی کورس کی ان غلطیوں کے اقتباسات پیش کیے جن میں اسلام پیغمبر اسلام علیہ السلام صحابہ کرام ﷺ قرآن پاک اور مسلمان بادشاہوں پر الزامات لگائے گئے تھے، مسلمان ان غلط بیانیوں کو سن کر تڑپ اٹھے، پھر یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں اور سرکاری محکمہ تعلیم سے اس باب میں جو مراسلتیں ہوئی تھیں، وہ پیش کیں اور آئندہ طریق کار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا۔

اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم دارالعلوم کی ضرورت پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور آغاز اس

شعر سے کیا:

ندامم این کہ سررشته از کجا بند است کہ آہ من بکشیدن نمی شود آخر

پھر فرمایا: حضرات! میں اس موضوع پر تقریر کرنے کے لیے صرف آج نہیں کھڑا ہوا ہوں، بلکہ کہنے کو کئی بار کہہ چکا ہوں لیکن یا تو لوگوں کے پہلو میں دل نہیں یا میری زبان میں اثر نہیں، اس لیے مجھے غالب کا شعر پڑھنا پڑتا ہے:

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مرئی بات دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

اس کے بعد موصوف نے وہ زہرہ گداز تقریر فرمائی جو اس طرز سے اس موضوع پر انہوں نے کبھی نہیں کی اور بتایا کہ مسلمان صرف مذہب ہے، اس لیے جو کچھ کرنا ہے اسی راستے سے کرنا ہے اور جو

آواز بھی ان کی اصلاح کے لیے اٹھائی جائے وہ اسی راستہ سے اٹھائی جائے، اسی سلسلہ میں انہوں نے فرمایا کہ مسلمانوں کو قوم کے نام سے اٹھانے کی کوشش تیس برس سے جاری ہے، مگر اس کی ناکامی ظاہر ہے، کیوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی امت قوم کے نام سے نہیں اسلام کے نام سے جاگتی ہے، اس نام سے اس کو پکارو، پھر دیکھو کہ اس کی بیداری کا کیا عالم ہوتا ہے، اسی تقریر کے دوران میں صیغۃُ التصحیحِ اغلاط کی مذکورہ بالا رپورٹ کی طرف اشارہ کر کے خاک سار کی حقیر ذات کی نسبت ایک ایسا فقرہ فرمایا جو اس کے لیے ہمیشہ سرمایہٴ سعادت رہے گا۔

اس تقریر کے بعد تعمیر کے چندہ کی تحریک ہوئی، مولانا نے خود اپنی طرف سے پانچ سو کا اور سید رشید رضا کی آمد کی مسرت میں سو روپیے کا اعلان کیا، ساتھ ہی جناب منشی محمد احتشام علی صاحب صفی الدولہ نواب علی حسن خاں صاحب رضی الدولہ نواب سید نور الحسن خاں صاحب، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور خان بہادر میر جعفر حسین صاحب وغیرہ نے پانچ پانچ سو کے وعدے کیے، خود صدر مجلس علامہ سید رشید رضا نے بھی سو روپیے پیش کیے۔

اس کارروائی کے بعد مولانا پھر کھڑے ہوئے اور وقف علی الاولاد کی جو کارروائی اب تک ہو چکی تھی، اس کی تفصیلی روداد پڑھ کر سنائی، جو تھے اجلاس میں خاک سار نے دلی کی تجویز کی تعمیل میں جدید عربی الفاظ کا ایک لغت پیش کیا، جلسہ نے میری اس محنت و کاوش کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب نے خطیبوں اور اماموں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت پر ایک مؤثر تقریر فرمائی، تاج پوشی کی خوشی میں ملک معظم نے ہندوستان کو تعلیم کے لیے جو پچاس لاکھ روپیے عنایت فرمائے تھے، پانچویں اجلاس میں مولانا شروانی نے تجویز پیش کی کہ اس رقم سے عربی مدارس کو بھی مناسب حصہ ملنا چاہیے، اس کے بعد مولانا شہلی مرحوم اشاعت و حفاظت اسلام کے موضوع پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور ایسی دل ہلا دینے والی تقریر کی کہ خود بھی رورہے تھے اور دوسروں کو بھی رُلا رہے تھے، تقریر آج بھی پڑھی جاسکتی ہے اور اس کی تاثیر کا امتحان کیا جاسکتا ہے، مولانا نے اس میں تفصیل سے آریوں کے حملوں، مسلمانوں کی غفلت اور خاندانی نومسلموں کے ارتداد کے واقعات کے ضمن میں سیرۃ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ واقعات بیان کیے جن سے ایمان تازہ ہوتا تھا۔

مولانا کی تقریریں ندوہ میں بارہا ہوئی تھیں، مگر ان تقریروں کا محل ورود ہمیشہ دماغ رہا، مگر

اس دفعہ موصوف نے ندوہ کے اجلاس میں تین دفعہ تقریریں کیں، تینوں دفعہ ہر تقریر دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی اور دل ہی کی گہرائیوں میں پیوست ہوئی جاتی تھی، اس انقلاب کارازان دنوں سیرۃ نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ اور انہماک تھا جس نے ایک ہی دو سال میں علی گڑھ کے مولوی شبلی کو ایک نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کر دیا تھا، جو ہمہ تن دل اور مجسم محبت بن گئے تھے، مولانا کی تقریر کے بعد خواجہ کمال الدین صاحب لاہور اور مولوی ابوالکمال عبدالودود صاحب بریلوی مرحوم نے تائیدی تقریریں کیں، اور رات کو ان ڈھائی سو مسلمانوں نے اپنے نام لکھوائے جو اسلام کی حفاظت و اشاعت کے لیے سربکف نکلیں گے۔

چھٹے اجلاس پر اس سالانہ جلسہ کا خاتمہ ہوا، اس آخری جلسہ میں حسب دستور ندوہ کے دو چھوٹے کسمن بچوں، عبدالرحمن نگرامی اور معین الدین (بارہ بکنی) نے اسلام کے فضائل و کمالات پر تقریریں کیں، جن کو سن کر لوگ دنگ رہ گئے، بعض طلبہ نے عربی میں تقریریں کیں، خیال تھا کہ اس دفعہ جب کہ صدر اجلاس ایک صاحب زبان ادیب اور قادر الکلام خطیب ہیں، طلبہ مرعوب ہو جائیں گے، مگر انہوں نے اس برجستگی اور بے خوفی سے تقریریں کیں کہ خود صاحب صدر نے ان کی عربیت کی داد دی، آخر میں مولانا شردانی نے منتظمین جلسہ کا اور ممتاز حسین بیرسٹر سکریٹری مجلس استقبالیہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، پھر سید رشید رضا صاحب صدر انجمن اجلاس، کھڑے ہوئے اور اس جوش کے ساتھ اپنی اختتامی تقریر کی کہ زبان کی نا آشنائی کے باوجود تمام جلسہ سرایا اثر تھا، آخر میں مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں صدر اجلاس کا شکریہ ادا کیا، جس کا عربی ترجمہ مولانا کے ارشاد کے مطابق خاک سار نے کر کے سنایا، جس وقت میری زبان نے ان کے شہداء سفر کا ذکر کیا اور تحیت کے آخری الفاظ ادا کیے وہ بے قابو ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، جوش غم نے ان کی آواز میں رقت پیدا کر دی تھی، اپنے شہداء سفر کے مقابلہ میں حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شہداء اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکالیف کا ذکر زبان پر لائے، اس اثر سے سارا جلسہ ماتم کدہ بن گیا تھا اور دیر تک وہ حالت رہی جس کے دیکھنے کے لیے لیل و نہار کی آنکھیں ترستی رہیں گی۔

اسی پر اس سال کے جلسہ کا خاتمہ ہوا اور مولانا شبلی کے زیر اہتمام ندوہ کے جلسوں کا بھی اسی جلسہ پر خاتمہ ہوا اور ندوہ کے متعلق یہ پیشین گوئی جو ۲۴ مارچ ۱۹۱۲ء کو انہوں نے کی تھی حرف بہ حرف پوری ہوئی، ”ندوہ کی بساط پر یہ آخری باری ہے جس پر اس کی موت و حیات کا مدار ہے۔“ (شردانی-۱۰۰)

بعض دوسرے تعلیمی خدمات

ریاست حیدرآباد کی تعلیمی خود مختاری ۱۹۰۸ء-۱۹۱۲ء | ریاست حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام نے ملک میں ایک مفید تعلیمی انقلاب کا جو دور پیدا کیا، اس کی تدریجی تاریخ نہایت دل چسپ ہے، یہاں مشرقی تعلیم کے لیے ایک دارالعلوم قائم تھا، جس کے تعلیم یافتہ بہت سے سرکاری عہدوں پر وقتاً فوقتاً فائز ہوتے رہے لیکن اس دارالعلوم کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی، بلکہ پنجاب یونیورسٹی نے مشرقی تعلیم کے امتحانات کا جو نصاب مقرر کیا تھا، اس دارالعلوم میں بھی اسی کی تقلید کی جاتی تھی اور اسی کے مطابق اس دارالعلوم کے طلبہ بھی وہاں مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے امتحانات دیتے تھے، غالباً ۱۹۰۶ء میں پنجاب یونیورسٹی نے یہ قاعدہ بنایا کہ وہ دوسرے ممالک کی درس گاہوں کے طلبہ کو اپنے امتحانات میں شرکت کی اجازت نہیں دے سکتی، اس وقت اس دارالعلوم میں سات سو طالب علم زیر تعلیم تھے، جن کے لیے مجبوراً ریاست کو ایک خاص نصاب تعلیم اور امتحانات کے لیے ایک نئے مستقل نظام کی ضرورت پیش آئی، اس وقت نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی وہاں تعلیمات کے ناظم یعنی ڈائریکٹر تھے، انہوں نے سرکار عالی میں یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے لیے ایک مناسب نصاب تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آئے، جس کے لیے مولانا شبلی اور بعض دیگر ماہرین کے خدمات حاصل کیے جائیں، سرکار کی منظوری کے بعد نواب صاحب موصوف نے مولانا کے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا جس کا خلاصہ یہ تھا، چون کہ دارالعلوم کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہو گیا ہے، اس کے عربی و فارسی نصاب تعلیم کے مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے ایک رکن آپ ہیں، نصاب تعلیم زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب کیا جائے، تاکہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پا کر امتحان میں کامیابی حاصل کریں، وہ سرکاری خدمات کے ادا کرنے کے قابل ہوں۔

ترمیم نصاب میں چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ضروریاتِ زمانہ اور حکومت کی خدمات کی ضروریات کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی

کے موجودہ نصاب میں اصلاح۔

(۲) تکمیلِ تحصیلِ علومِ مشرقیہ۔

مددوم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اور نیلِ تعلیم ناقص ہے، بہت سے علوم جن سے فضیلت کی تکمیل ہوتی ہے، اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مولوی فاضل سے بالاتر اول مرتبہ دو جماعتیں ہوں جن میں تحصیل کی تکمیل ہو سکے، اگرچہ سلسلہ نظامیہ کی پابندی ضروری نہیں، مگر تحصیل تکمیل کے لیے بہت کچھ اضافہ کتب درسیہ کی ضرورت ہے۔

یہ مراسلہ منگی یا جون ۱۹۰۸ء میں مولانا کی خدمت میں اس وقت پہنچا جب وہ پاؤں کے حادثہ کے سبب سے صاحبِ فرائض تھے، اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم ہوم سکریٹری حیدرآباد نے ۳۱ ماہِ الہی ۱۳۱۷ھ ف کونشان (۱۳۲۳ء) کے مراسلہ کے ذریعہ سے مولانا کو پھر حیدرآباد آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ جون ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد گئے اور وہاں چند روز قیام کر کے ایک نصاب تیار کیا اور اس کو ایک یادداشت کے ساتھ پیش کیا، جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ نصاب میں ترمیم و اصلاح کن اصولوں پر کی گئی ہے؟ اور ترمیم و اصلاح کے مہمات امور کیا ہیں؟

مولانا جس جامع الحیثیاتِ تعلیم گاہ کا خواب ہمیشہ سے دیکھا کرتے تھے اور جس کی تعبیر کے لیے ندوہ کی درود یوار سے نکلایا کرتے تھے، ان کے خیال میں اس کے لیے یہ بہترین موقع ہاتھ آیا، حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی، جس کا خزانہ معمور تھا اور جس کو تعلیم کے اس وسیع پروگرام کا بوجھ اٹھانے میں جو مولانا کے متخیلہ میں تھا، کسی قسم کا تاثر نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے انہوں نے جی کھول کر اپنے پورے حوصلہ کے مطابق اپنے تعلیمی پروگرام کو پھیلا کر ایک یادداشت تیار کی، اس یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ بقول مولانا صاحب ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھ کر نصاب میں ترمیم و اصلاح کی گئی:

(۱) دارالعلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا، اس کا مقصد صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں لیکن اب جب کہ دارالعلوم خود مختار اور آزاد ہو گیا ہے، اس کے مقاصد زیادہ وسیع ہو گئے ہیں، اس کی غرض اب ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں، بلکہ شرعی خدمات بھی انجام دے سکیں، علوم دینیہ، مثلاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں کمال رکھتے ہوں، ان کو ملک میں مذہبی عالم کی حیثیت حاصل ہو، وہ عوام میں عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا سکیں اور علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ سے بھی واقف

ہوں، تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر بھی ان کا اثر پڑ سکے۔

(۲) اس وقت جو جدید تعلیم ہندوستان میں جاری ہے، اس میں ہماری مذہبی ضروریات اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہیں، اس میں نہ مذہبی تعلیم ہے نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہو سکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق اور مسائل اخلاق کا علم ہو سکتا ہے، اس لیے بی، اے یا ایم، اے ہونے کے بعد بھی ان چیزوں کے متعلق ایک شخص کی حیثیت ایک عامی آدمی سے زیادہ نہیں ہو سکتی، باین ہمہ ہندوستان میں اس مشکل کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا، کیوں کہ یونیورسٹی کا موجودہ نصاب اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔

لیکن چون کہ ریاست حیدرآباد ایک وسیع ریاست ہے اور اس وقت تک اس نے سرکاری نوکریوں کے لیے یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے، اس لیے وہ موجودہ طریقہ تعلیم کے علاوہ ایک ایسا سلسلہ تعلیم بھی قائم کر سکتی ہے، جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو اور جس کے تعلیم یافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں۔

ان دونوں مقاصد کو پیش نظر رکھ کر مولانا نے ایک اصلاحی نصاب تعلیم تیار کیا جس کے اصول

یہ تھے:

(۱) تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقہ سے بیان کیے گئے ہوں، اس بنا پر وہ کتابیں جو معما و چیتاں کے طور پر نہایت مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں، نصاب درس سے خارج کر دی گئیں۔

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں تھیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیے گئے تھے اور اس خلط و محبت کی وجہ سے طالب العلم اصل فن کے مسائل سے دور پڑتا جاتا تھا، اس لیے یہ تمام کتابیں خارج کر دی گئیں اور اصلاحی نصاب میں اس قسم کی کتابیں رکھی گئیں جن میں اسی فن کے خالص مسائل بالاستیعاب مذکور ہوں۔

(۳) قدیم نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ بہت کم تھا، اس لیے اصلاحی نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا۔

(۴) قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصہ بہت کم تھا، اس لیے ادب کا حصہ بہت بڑھا

دیا گیا۔

(۵) اس نصاب میں انشا پر دازی کی مشق کے لیے خاص گھنٹے مقرر کیے گئے، کیوں کہ قدیم عربی خوانوں پر اعتراض تھا کہ وہ صحیح عربی کی چند سطریں بھی نہیں لکھ سکتے۔

(۶) قدیم نصاب میں عقائد و کلام کی صرف ایک معمولی درجہ کی کتاب داخل تھی، حالانکہ یہ نہایت اہم فن ہے، اس لیے اس نصاب میں اس فن کی متعدد بلند پایہ کتابیں داخل کی گئیں۔

(۷) قدیم نصاب میں تاریخ اسلام اور تاریخ عام کی ایک کتاب بھی داخل نہ تھی، اس کے موجودہ نصاب میں فن تاریخ کی کتابیں بھی داخل کی گئیں۔

(۸) علوم جدیدہ کی بعض کتابیں بھی جو عربی میں ترجمہ ہو گئی ہیں، نصاب میں شامل کی گئیں۔

(۹) انگریزی زبان بطور سکندنگلوتج کے لازمی قرار دی گئی۔

(۱۰) نصاب سابق میں ابتدا سے اخیر تک مدت تعلیم ۱۹ برس تھی، لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی، اس لیے گھٹا کر کل مدت ۱۴ برس قرار دی گئی۔

(۱۱) نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدا کی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ لڑکا ساتویں برس کے سن سے دارالعلوم کی ابتدائی جماعتوں میں لیا جائے گا اور اس مدت میں اردو ابتدائی فارسی، حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی۔

اس درجہ کے بعد نشی اور عالم کی دو الگ شاخیں شروع ہوں گی اور طالب العلم کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے جس شاخ کو چاہے، اختیار کرے، نشی کے تین سال اور نشی عالم کے دو سال اور نشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا، نشی فاضل تک طالب علم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کی سواد خوانی اور انگریزی بہ قدر عام ضرورت آجائے گی۔

عربی کے دو درجے قرار دیے گئے۔

عالم: اس کی مدت تعلیم آٹھ برس رکھی گئی، یہ درجہ بی، اے کے برابر ہے، اس میں تمام علوم متداولہ عربی بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زبان دانی، انٹرنس کے درجہ تک آجائے گی۔

فاضل: اس کی مدت تعلیم دو برس ہے اور یہ درجہ ایم، اے کے برابر ہے، اس میں کسی ایک

خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا اور اسی فن کے امتساب سے موسوم ہوگا، مثلاً مفکر، ادیب، فقیہ، وغیرہ، عالم یا فاضل کے درجے کے بعد ضرور ہے کہ چند طلبہ کو دو برس تک خالص انگریزی زبان سکھائی جائے، تاکہ انگریزی زبان میں تحریر اور تقریر کا ملکہ پیدا ہو اور ایسے علماء پیدا ہوں کہ یورپ کی علمی تحقیقات کا اسلامی علوم میں اضافہ کر سکیں اور انگریزی داں جماعت کے مجمع میں ان ہی کی زبان و خیالات میں اسلامی عقائد و مسائل پر تقریر کر سکیں۔

دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کی یہ اصلاح درحقیقت وہ پہلا قدم تھا جو جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے اٹھایا گیا اور مولانا کی یادداشت وہ پہلی اینٹ ہے جس سے بعد کو عظیم الشان جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا نے حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ حیدرآباد میں ایک آزاد اور مستقل یونیورسٹی کا تمہیدی خیال پیش کیا اور طعنہ دیا کہ جو لوگ غلام ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی بنانے کا خواب دیکھتے ہیں وہ اس آزاد حیدرآباد میں خود ایک آزاد یونیورسٹی کی بنیاد کیوں نہیں رکھتے، چنانچہ یادداشت مذکور کے شروع میں فرماتے ہیں:

”معلوم نہیں مسلمانوں میں کون ہی مبارک ساعت میں تقلید کی بنیاد پڑی تھی کہ زمانہ کے سیکڑوں ہزاروں انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشیں اب تک کم زور نہیں ہوئیں، تجب اور سخت تجب یہ ہے کہ جدید تعلیم یا فنی فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویٰ دار ہے اور درحقیقت جدید تعلیم کا بھی اثر ہونا چاہیے تھا وہ بھی اسی طرح بے سمجھے ہوئے جو ایک عام راستہ پر پڑ لیا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، جس تعلیم اور نتائج تعلیم کا اس قدر شور و نمل ہے وہ کیا ہے؟ کاجوں کی نوکریاں اور ڈگریاں و دیگر بیچ، شاید کہا جائے کہ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہیں اور اسی لیے تو ہم اپنی خاص یونیورسٹی چاہتے ہیں کہ اپنی ضرورتوں کے موافق اپنی تعلیم کا سامان ہم پہنچائیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر روپیہ ہم نہیں پہنچتا کہ یونیورسٹی بن سکے لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں یونیورسٹی بن سکتی ہے، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ حیدرآباد میں عنانِ تعلیم ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو ہندوستان میں یونیورسٹی بنانے کے محرک اور جان دادہ ہیں، یونیورسٹی کے لیے دس لاکھ روپیہ مانگا جا رہا ہے، حیدرآباد میں ایک منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد میں صرف ایک کالج پڑھ لاکھ لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے، حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہو سکتی کہ اگر وہ اپنی یونیورسٹی

۱۔ یہ یادداشت الہندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں اور مقالات شبلی حصہ دوم (تعلیمی) ص ۱۵۲ میں چھپی ہے۔

بنائے تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیوں کہ حیدرآباد خود ایسی وسیع ریاست ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہے کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لیے وہاں ایک دارالعلوم ہے، پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے ہیودہ نصاب کی آج تک تقلید کی گئی، پنجاب نے مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کیے ہیں وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک اسی کی محکومی کی گئی اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا، جب تک خود یونیورسٹی نے یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتے۔“

دوسہ بار باتو گفتیم کہ مرا بہ بیچ بستان نہ شد اتفاق شاید کہ بایں بہاگرام

مولانا کی اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کا اجلاس شعبان ۱۳۲۶ھ (ستمبر ۱۹۰۸ء) میں قرار پایا لیکن چونکہ عین اسی زمانہ میں ندوہ کی ایک خاص ضرورت سے مولانا کو لکھنؤ واپس آنا پڑا، اس لیے وہ اجلاس ملتوی ہو گیا، اس کے بعد مولانا ۲۳ جنوری ۱۹۰۹ء کو پھر حیدرآباد گئے اور ایک کمیٹی میں ان کا مرتبہ نصاب پیش کیا گیا، اس کمیٹی میں مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت و تعلیمات شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، مولانا انوار اللہ خاں صاحب استاد حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبداللطیف صاحب شرر، مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، اس اجلاس میں کچھ امور باقی رہ گئے تھے، اس لیے ۷ فروری ۱۹۰۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا، جس کے پریذیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت تھے اور جس میں نواب عماد الملک بہادر (سابق ناظم تعلیمات) اور ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات حال بھی شریک تھے اور غور و فکر کے بعد کسی قدر تغیر اور ترمیم کے ساتھ مرتبہ نصاب منظور کیا گیا۔

مولانا نے یہ پوری تفصیل حیدرآباد کی ”مشرقی یونیورسٹی“ کے عنوان سے الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں لکھی ہے، اس کے آخر میں فرماتے ہیں ”یہ ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔

در کفہ جام شریعت در کفہ سندان عشق ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باخضن

مولانا کا خیال تھا کہ ایک سال میں جدید نظام کے مطابق اس درس گاہ کا کام شروع ہو جائے گا، (سلیمان-۲۳) لیکن ایک سال کیا اس میں پانچ چھ سال لگ گئے، ۱۹۱۳ء میں جب مولانا دوبارہ نواب عماد الملک کی دعوت پر حیدرآباد گئے تو ابھی تک اس کے سوا اس کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی کہ سرکاری امتحانات کا انتظام ہو گیا تھا۔

بعض صاحب شروع سے یہ چاہتے تھے کہ مولانا حیدرآباد میں رہ کر اپنی اس اسکیم کو خود ہی چلائیں، مگر انہوں نے اس سے معذرت چاہی، ۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو مہدی صاحب کو لکھتے ہیں ”سرکار نظام علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے، اس کے نصاب وغیرہ کے لیے مجھے بلایا ہے، چند روز یہاں قیام رہے گا، یونیورسٹی کی نظامت مجھے دیتے ہیں، مشاہرہ بھی معقول ہے لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں۔“ (مہدی-۴۷)

۹ اگست ۱۹۰۸ء کو پھر لکھتے ہیں ”یہاں (حیدرآباد میں) مجھ کو بہت دیر ہوتی جاتی ہے اور میں گھبراتا جاتا ہوں، ایک دن کام یہاں مہینوں میں ہوتا ہے، یونیورسٹی کے لیے سب سامان مہیا ہیں، لیکن آدمی نہیں اور آدمی ہو تو سازشوں کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا، میں ملازمت تو کسی طرح نہ کروں گا، البتہ اگر سامان اچھے ہوئے تو برس دو برس رہ کر کام چلا دوں گا کہ آئندہ چلتا رہے۔“ (مہدی-۴۸)

۱۹۱۴ء میں جب کام کا آغاز ہو رہا تھا، مولانا کی جگہ پر نواب عماد الملک اور دوسرے قدر دانوں کے اصرار سے جون ۱۹۱۴ء میں (سلیمان) مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی، اے کا انتخاب اس دارالعلوم کی صدارت (پرنسپل) کے لیے عمل میں آیا، حالانکہ خود مولانا ان کی آزاد مذہبی اور علمی خدمت کے خواہاں تھے، مگر مجوزہ درس گاہ کی کامیابی کے خیال سے وہ نیم راضی سے ہو گئے، (حمید ۶۵، ۶۶، ۶۷) اس وقت ڈاکٹر المالطینی حیدرآباد میں تعلیمات کے ناظم تھے اور اکبر حیدری صاحب صیغہ مال کے اعلیٰ عہدہ دار۔

۱۔ حضرت الاستاذ نے اسی زمانہ میں اس کے جدید اسٹاف میں میرا نام بھی داخل کر دیا تھا، (سلیمان-۲۳) چنانچہ مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں المالطینی صاحب نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا، میں پونہ سے جا کر ان سے ملا، انہوں نے انٹرویو کے بعد میری تقرری کی ابتدائی کارروائی کے لیے کچھ کاغذات بھی میرے پاس بھیجے، مگر میں نے دارالمصنفین کے خیال سے اس کارروائی کو آگے نہیں بڑھایا۔

مولانا حمید الدین صاحب نے اس مجوزہ درس گاہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی یہ کہ دینیات اور ادبیات کے علاوہ اس درس گاہ میں سارے علوم اردو میں پڑھائے جائیں، یہ بالکل نیا خیال تھا، اس لیے انہوں نے بڑی ہی مشکل سے ارکانِ حکومت کو اس کے لیے راضی کیا، اب الما لطفی کی جگہ اس مسعود صاحب ناظم تعلیمات ہوئے، ان کے زمانہ میں زمانہ نے نئی کروٹ لی، یعنی ایک مشرقی یونیورسٹی کے بہ جائے اس نے اردو کی ایک ایسی مغربی یونیورسٹی کا جامہ پہن لیا جس میں دینیات کی حیثیت ثانوی ہوگئی اور علومِ مشرقیہ اس کا ایک صیغہ ہو کر رہ گئے، بعض وجوہ سے مولانا حمید الدین صاحب دل برداشتہ ہو کر ۱۹۱۶ء میں استعفادے کر چلے آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی موجودہ صورت میں بن کر نمودار ہوئی جو گو وہ نہیں بنی، جس کے بنانے کا خیال کیا گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے وجود میں آ کر ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کے دینیات اور علومِ مشرقیہ کا صیغہ اپنی تعلیم، طرزِ تعلیم، اساتذہ اور انگریزی و علومِ جدید کی آمیزش سے مولانا شبلی کے مرتبہ نقشہ کا اچھا خاصہ خاکہ ہے۔

مشرقی بنگال و آسام میں اصلاحِ مدارس کی تجویز ۱۹۱۰ء | ۱۹۱۰ء میں بنگال گورنمنٹ نے مشرقی بنگال اور آسام کے عربی مدرسوں کی اصلاح کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوئے تھے، اس کا پہلا جلسہ ۲۸ جنوری ۱۹۱۰ء کو اور دوسرا ۲۷ مارچ ۱۹۱۰ء کو ہونے والا تھا، مولانا کے کاغذوں میں اس کے متعلق سرکاری مراسلہ تو ملتا ہے لیکن اس کے لیے سفر اور اس میں مولانا کے کاموں کی نوعیت کا حال مجھے نہیں معلوم ہو سکا۔

مراسلہ مذکور ۲۳ فروری ۱۹۱۰ء کو ڈھا کہ سے بھیجا گیا ہے۔

مشرقی کمیٹی شملہ ۱۹۱۱ء | جولائی ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے علومِ مشرقیہ کی ترقی و اصلاح کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس کمیٹی کا اجلاس اسی مہینہ میں شملہ میں ہوا، ہندوستانی ممبروں کے علاوہ علی گڑھ کالج کے جرمن عالم ڈاکٹر یوسف ہارویز اور مسٹر برن چیف سکریٹری صوبہ متحدہ جو فارسی اور اردو کے عالم تھے اور بعض دوسرے انگریز ممبر بھی تھے جلسہ سے واپس آ کر مولانا نے اگست ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں ”ہوا کارخ دوسری طرف“ اور ”مشرقی کانفرنس“ کی دوہری سرخیوں کے نیچے اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد اور نائج کی تفصیل کی ہے، شروع میں سرسید اور ان کے دوستوں کو مشرقی تعلیم کی ترقی سے جن وجوہ سے اختلاف تھا، ان کا جواب دیا ہے، پھر لکھا ہے کہ اب ہوا کارخ

پلٹ رہا ہے، یعنی گورنمنٹ اب مشرقی تعلیم کی سرپرستی کے لیے آمادہ ہو رہی ہے، اس کے بعد اس کمیٹی کے حسب ذیل اغراض لکھے ہیں:

- (۱) مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا۔
 - (۲) علم الآثار (ارکیالوجی) کی تعلیم دینا اور جدید طریقہ تحقیقات آثار قدیمہ سے واقف کرنا۔
 - (۳) اعلیٰ طریق پر قدیم و قلمی کتب خانوں کی فہرست سازی (کٹیالوگ) کی تعلیم دینا۔
 - (۴) اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لیے پیش قرار وظائف مقرر کرنا۔
 - (۵) دیسی زبانوں کو ترقی دینا اور ان کے لیے امتحانات مقرر کرنا۔
 - (۶) علمی مشرقی تعلیم یافتوں کے لیے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقات آثار قدیمہ اور قدیم کتب خانوں میں ترتیب فہرست کے لیے عہدے قائم کرنا۔
 - (۷) کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق و متحد کرنا۔
 - (۸) انگریزی افسروں کی زبان دانی کا امتحان لینا۔
 - (۹) کلکتہ میں اغراض بالا کے لیے ایک عظیم الشان مشرقی درس گاہ قائم کرنا، کانفرنس نے جو کچھ طے کیا اس کے متعلق مولانا نے اپنے مضمون میں حسب ذیل نتائج کی توقع کی:
- ۱- گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معائنہ کر سکے گا، اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی پسند کریں گے۔
 - ۲- جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی، ان کو کچھ ماہ وار امداد دے گی۔
 - ۳- کلکتہ میں بہت بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مشرقی درس گاہ قائم ہوگی، مدارس عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کریں گے۔
 - ۴- اس درس گاہ کے تعلیم پانے والوں کو پیش قرار وظیفے دیے جائیں گے۔
 - (۵) اس درس گاہ سے سند لینے کے بعد ان کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی، جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی۔

یہ مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی اور جن کے تعلیم یافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے، ان کالجوں اور اسکولوں کی پروفیسری اور مدرسوں مل سکے گی۔

مولانا نے اس کمیٹی کی سفارشوں سے جن نتائج کی توقع دلائی تھی وہ سب کی سب تو پوری نہیں ہوئیں، مگر ان سے حسب ذیل نتیجے ضرور برآمد ہوئے:

۱- سرکاری خرچ پر مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی اور انگریزی پڑھے ہوئے طلبہ کا بھیجا جانا، اگرچہ اس کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۹۰۸ء میں اعلان بھی کر دیا تھا اور بیش قرار وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا اور اس کے مطابق سب سے پہلے بہار سے ڈاکٹر عظیم الدین ۱۹۰۹ء میں یورپ بھیجے گئے اور ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر منصور علی گڑھ سے گئے اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ۱۹۱۲ء میں بھیجے گئے اور پنجاب سے مولوی محمد شفیع صاحب (موجودہ پرنسپل اور ٹیچر کالج لاہور) گئے اور اب بھی طلبہ جا رہے ہیں۔

۲- ان لوگوں کو ان کی کامیاب واپسی پر کالجوں میں مشرقی علوم کی پروفیسری پیش قرار تنخواہوں پر دی گئی اور اب تک دی جا رہی ہے۔

۳- یوپی بہار اور بنگال میں ایک ایک عربی داں گریجویٹ کو مدارس عربیہ کی انسپکٹری کا یا علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کی سپرنٹنڈنٹ کی عہدہ دیا گیا اور عربی مدرسوں کی نگرانی کا کام ان کے سپرد ہوا، چنانچہ یوپی میں ۱۹۱۶ء میں مولانا کے شاگرد خاص مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو ندوہ کے فاضل اور علی گڑھ کے ایم، اے تھے، انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔

۴- بعض بعض صوبوں میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کی طرح سرکاری امداد سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہوا، جیسے بہار میں مدرسہ شمس الہدی، پٹنہ۔

۱- انسوس ہے کہ ڈاکٹر منصور نے ۲۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو انتقال کیا، شاہ جہاں پور وطن، اور ۱۸۸۵ء سال ولادت ہے، علی گڑھ کالج میں ڈاکٹر باروین کے خاص شاگرد تھے، ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کے وظیفہ سے یورپ گئے اور برلن میں ڈاکٹر سخاؤ کی نگرانی میں عربی جغرافیہ نویسوں پر اپنا مقالہ تیار کیا، اور ۱۹۱۵ء میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، اسی اثنا میں یورپ کی بڑی جنگ شروع ہوگئی اور چار سال تک ممالک یورپ اور ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے رہے، ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء تک وہ زیادہ تر برلن میں رہے، اسی زمانہ میں حدیث کی فہرست بنانے کا جو کام وہاں ہو رہا تھا، مستشرق وینسک کے ساتھ مل کر اس کو انجام دیا، ۱۹۳۰ء میں وہ ہندوستان واپس آئے، قرآن پاک کا وہ جرمن ترجمہ جو مولوی صدر الدین صاحب احمدی کے نام سے چھپا ہے، ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ان ہی کا کیا ہوا ہے، ۱۹۳۵ء میں وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر ہوئے اور یہیں وفات پائی۔

۵- مختلف عربی مدرسوں کے لیے حسب مرتبہ یا حسب ضرورت ماہانہ اندادیں، ایڈ کے طور پر منظور ہوئیں۔

۶- کلکتہ امپیریل لائبریری میں فن کتب خانہ کی تعلیم کے لیے ایک درجہ کھولا گیا۔

۷- کلکتہ کے بے جائے ڈھا کہ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کی ایک بڑی درس گاہ کھولی گئی۔

۸- آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے لیے بعض ماہرین علوم مشرقیہ کا تقرر ہوا، جن میں سے

ہمارے صوبہ میں پہلا نام ظفر حسن صاحب کا ہے جو علی گڑھ کے ایم، اے اور ہارویز صاحب کی نگرانی میں آثار کے پڑھنے کی تعلیم پائے ہوئے تھے۔

مولانا نے اس کمپنی میں ندوہ کو بھی روشناس کیا اور اس کے بعض مقاصد کی تشریح کی، شروانی

صاحب کو ۲۷ جولائی ۱۹۱۱ء کو لکھتے ہیں، مشرقی کانفرنس سے اچھے نتائج کی امیدیں ہیں، میں نے ندوہ

کو وہاں زیادہ روشناس کیا اور بعض کارروائیوں میں وہ شامل کر لیا گیا۔ (شروانی-۹۴)

مولانا زبانی فرماتے تھے کہ انہوں نے اس میں شمس العلماء کے خطاب کی بے قدری کا حال

بھی بیان کیا اور اس کا سبب یہ بتایا کہ اس کے عطا کرنے میں استحقاق اور قابلیت پر نہیں بلکہ سرکاری سفارشوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

مولانا کے اس سفرِ شملہ کے بعض ادبی پہلو بھی ہیں، اثنائے قیام میں شملہ کے علم دوست

وادب نواز دوستوں نے اپنے حلقہ میں لیا، جن میں سے انگریز مراد آبادی اور مولوی محمد عمر صاحب نعمانی

کے نام معلوم ہیں، مولوی صاحب نے بھی الندوہ (سلسلہ جدید) کے دوسرے پرچہ مورخہ فروری

۱۹۲۰ء میں اس ملاقات کے بعض ادبی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اس سفر میں کرنل

عبدالحمید خان پٹیلہ کے مہمان تھے اور اس کوٹھی میں فروکش ہوئے تھے جو اب شیخ ریاض الدین صاحب

خلف شیخ شہاب الدین مرحوم کی ملکیت ہے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی وجہ سے شملہ ندوہ سے

ہمیشہ سے روشناس تھا، مگر مولانا کے اس سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کو وہاں مزید مقبولیت حاصل ہوئی۔

ڈھا کہ یونیورسٹی جولائی ۱۹۱۲ء | لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال کی تقسیم نے جس طرح ہندو

بنگالیوں میں گورنمنٹ کی طرف سے غم و غصہ کا طوفان برپا کر دیا تھا، اسی طرح ۱۹۱۰ء میں تاج پوشی کے

موقع پر اس کی تسبیح نے مسلمانوں میں ہجمن برپا کر دیا، یہاں تک کہ نواب وقار الملک جیسے ٹھنڈی

طبیعت کے آدمی نے ایک سخت مضمون لکھ کر گورنمنٹ کے اس نفل کو ناقابت اندیشی بٹھرایا، گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس زخم پر رکھنے کے لیے جو مرہم تجویز کیا اس کا نام ڈھا کہ یونیورسٹی ہے، اس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے، چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علما میں سے مولانا شبلی کے نام اس سب کمیٹی میں داخل ہوئے، جو اسلامک اسٹڈیز کے لیے بنی تھی۔

ڈھا کہ یونیورسٹی حقیقت میں اس خواب کی تعبیر ہے جو شملہ مشرقی کانفرنس میں دیکھا یا دکھایا گیا تھا، چون کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مدرسہ عالیہ کے اصول پر سرکاری عربی مدرسوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم ہے، اس لیے ڈھا کہ یونیورسٹی کا ایک ایسا نظام قرار دیا جانا تجویز ہوا، جس میں عربی علوم اور اسلامی دینیات کے ساتھ جدید علوم اور اعلیٰ انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے۔

۵ اگست ۱۹۱۲ء کو اس کی کمیٹی کی تاریخ تھی اور اسی زمانہ میں بنگلور میں مدراس کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا اور دونوں جگہوں سے طلبی تھی، مولانا اسی زمانہ میں بمبئی میں تھے، راقم بھی ہر کاب تھا، تو بنگلور کانفرنس کی شرکت کے لیے ۲۵ جولائی ۱۹۱۲ء کو مجھے روانہ فرمایا اور خود دوسرے دن ۲۶ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ کی راہ سے ڈھا کہ تشریف لے گئے۔ (عبدالقادر-۲۵)

ڈھا کہ کی ترجیح کی دو وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ مولانا کو ایشیا ٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں سیرت کے لیے بعض کتابیں دیکھنی تھیں اور دوسری یہ کہ بنگال کے احباب نے ان کو لکھا کہ اگر وہ آجائیں تو مدرسہ عالیہ وغیرہ کی اصلاح کا کام بھی انجام پا جائے، ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء کو وہ شروانی صاحب کو خود لکھتے ہیں ”مدراس میں خود جاتا لیکن عین اسی زمانہ میں ڈھا کہ یونیورسٹی کی سب کمیٹی میں گورنمنٹ بنگال نے مجھ کو مدعو کیا ہے اور وہاں کے لوگوں نے مجھے لکھا ہے کہ اگر تم آ جاؤ تو مدرسہ عالیہ وغیرہ کی ابتری کی اصلاح کی بہت کچھ امید ہو سکتی ہے، اس لیے بایں شکستہ پائی و پیری وہاں جا رہا ہوں، سیرت کے لیے ایشیا ٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں۔“ (شروانی-۱۰۲)

۱ مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے ۱۹۰۲ء میں بھی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں سر جان ولنٹن گورنر وقت نے بھی مولانا سے خواہش کی تھی کہ مدرسہ عالیہ کی اصلاح میں مدد دیں، اس اجلاس میں میں بھی موجود تھا۔

ورنیکولرا اسکیم، الہ آباد ۱۹۱۲ء اردو کو ناگری ہونے سے بچانا | ۱۹۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ”ورنیکولرا اسکیم کمیٹی“ قائم کی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو ہندی دو زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جاسکے، نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے، پنڈت سندر لال وغیرہ اس کمیٹی کے ممبر تھے، مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ نے اس کے متعلق ایک اسکیم مرتب کی تھی جس کے دفعہ ۳۰۳ میں اس تجویز کی تائید میں حسب ذیل دلیل قائم کی تھی ”اردو زبان اور ہندی زبان دراصل ایک ہی زبانیں ہیں کیوں کہ ان کی گرامر متحد ہے اور جن زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں، اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اردو اور ہندی دونوں بن جائے۔“

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ ”اس کی نظم و سثر کی گرامر مختلف ہے، اس لیے ہندی نظم کی گرامر کی مہارت اور واقفیت کے لیے رامائن، تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہیے، ہندوؤں کے لیے وہ لازمی کر دی جائے اور مسلمانوں کے لیے بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا۔“

مولانا نے مرحوم بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے اور اس موقع پر اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے انہوں نے ایک مدلل یادداشت مرتب کی تھی جو معارف اکتوبر ۱۹۱۵ء میں چھپ چکی ہے اور مقالات شبلی کے سلسلہ میں بھی شامل ہے، اس یادداشت کے اخیر میں مولانا نے یہ رائے دی تھی ”اخیر میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ نہایت ابتدائی درجوں تک ایک سادہ زبان جو عربی اور سنسکرت دونوں سے قریباً آزاد ہو، اختیار کی جاسکتی ہے لیکن ہائر (اوپر) کلاسوں کے لیے اردو اور ہندی کو بالکل الگ الگ قائم کرنا چاہیے اور اسی صورت میں دونوں اعلا درجہ تک ترقی کر سکتی ہیں۔“

۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا نے مجھے مطلع کیا کہ یہ یادداشت اس قدر مؤثر اور کامیاب رہی کہ

”خود انگریز اور ہندو ممبروں نے اس سے حرف بہ حرف اتفاق کیا۔“ (سلیمان-۳۸)

اور ۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو شردانی صاحب کو لکھا کہ تیسرے جلسہ میں مجھ کو کمال فتح نصیب ہوئی،

اور مسٹر برن نے جو تجویزیں پیش کی تھیں، سب کی سب اڑ گئیں۔ (شردانی-۹۷)

۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو کمیٹی کا پھر جلسہ ہوا اور مولانا کی رائے کے مطابق وہی طے ہوا جس کا

خلاصہ اور پلکھا جا چکا۔

مذہبی تعلیم کی کمیٹی میں شرکت | اسی سال یو پی گورنمنٹ نے سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے اجرائی ایک کمیٹی مقرر کی، اس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، ۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو اس کے اجلاس کی تاریخ تھی، (شروانی-۹۷) مولانا کے خطوط میں پھر اس کمیٹی کا کچھ حال نہیں ملتا اور زبانی بھی مجھے یاد نہیں کہ کیا پیش آیا۔

صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی ۱۹۱۰ء-۱۹۱۲ء | اس زمانہ میں تاریخ صرف کسی قوم کے گزشتہ واقعات کا

مجموعہ نہیں رہی ہے، بلکہ اس کے احاطہ میں دین و مذہب اخلاق و عادات، معاشرت و تمدن، اسلاف کرام اور پوری ملت کی ہزار سالہ عملی زندگی کی مکمل تصویر آ جاتی ہے، اس لیے اس کی اہمیت گزشتہ زمانہ سے آج بہت زیادہ ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں آ کر اس سے ایک اور کام لیا، یعنی یہ کہ چوں کہ انہوں نے ہندوستان کا تخت مسلمانوں سے چھینا تھا، اس لیے انہوں نے زیر درس اسلامی تاریخ کو ایسے رنگ میں لکھ کر پیش کیا کہ اس سے دو نتیجے نکلیں، ایک یہ کہ مسلمان طلبہ ان کے بیانات کو سچ سمجھ کر اپنے اسلاف اور بزرگوں کے کارناموں سے خود شرمانے لگیں اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور مختلف قوموں کے طالب علموں میں تعصب اور بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہو جائیں، چنانچہ ان کو یہ دونوں نتیجے حاصل ہوئے اور وہ سب کے سامنے ہیں، اگرچہ بعض یونیورسٹیوں کے کورس کی نسبت کبھی کبھی کانفرنس اور اخبارات یہ شکایت کیا کرتے تھے لیکن اب تک اس کام کے لیے کوئی باقاعدہ صیغہ قائم نہیں ہوا تھا، دہلی کے اسی جلسہ میں جو مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوا، مولانا نے اس صیغہ کے قائم کرنے کے لیے ایک رزلوشن پیش کیا، جو منظور کیا گیا اور خاک سار کو اس صیغہ کا سکریٹری مقرر کیا، خاک سار نے اس کام کو شروع کیا، مختلف یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں سے خط و کتابت کی اور ان سے اس بارہ میں مشورہ پوچھا اور ۲۵ مئی ۱۹۱۰ء کو عام اطلاع کے لیے اخباروں میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں واقف کار لوگوں سے اس قسم کی قابل اعتراض کتابوں کے نام دریافت کیے گئے تھے، اس کے جواب میں متعدد لوگوں نے مختلف کتابوں کے نام لکھ کر بھیجے، سب سے زیادہ قابل اعتراض کتاب سابق ڈائرکٹر تعلیم مارٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان تھی جو نہ صرف الہ آباد بلکہ کلکتہ وغیرہ دوسری یونیورسٹیوں کے بھی جو نیر کلاسوں میں پڑھائی جاتی تھی۔

دوسری کتاب ڈیلانوس صاحب کی تاریخ ہند تھی، ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر ان کی قابل

اعتراض عبارتوں کو نقل کر کے جولائی ۱۹۱۰ء میں اسلامی اخبارات سے خواہش کی گئی کہ وہ ان کتابوں کے نکالنے کی تحریک کی پوری تائید کریں، چنانچہ نہ صرف اردو بلکہ بعض انگریزی اخباروں نے بھی اس طرف توجہ کی، ساتھ ہی ۳ جولائی ۱۹۱۰ء کو مولانا کی طرف سے رجسٹرار صاحب یونیورسٹی الہ آباد کی خدمت میں ایک یادداشت بھیجی گئی جس میں یہ درخواست کی گئی کہ مارسٹن صاحب کی اس کتاب کو نڈل کے کورس سے خارج کر کے اس کے بہ جائے موجودہ ڈائریکٹر تعلیم ڈیلا فوس صاحب کی تاریخ ہندوستان چند ترمیمات کے بعد داخل کی جائے، رجسٹرار صاحب نے ۲۸ اگست ۱۹۱۰ء کو سنڈیکیٹ کمیٹی کے حسب ہدایت اس تحریک کو ڈائریکٹر صاحب سررہنہ تعلیم کے نام بھیج دیا اور اس کی نقل مولانا کے پاس بھیجی۔

یونیورسٹی نے اس یادداشت کی اطلاع مارسٹن صاحب کو جو اتفاق سے اس وقت ہندوستان ہی میں تھے، بھیج دی، اس کو پڑھ کر مارسٹن صاحب نے مولانا سے خط و کتابت شروع کی اور خود لکھنؤ آ کر مولانا کے مکان پر ملاقات کی، ساتھ ہی فقہ کی ایک بڑی قلمی کتاب ہدیہ پیش کی جو اب ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، اس ملاقات میں مارسٹن صاحب نے یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اشاعت میں ان غلطیوں کی اصلاح کر دیں گے، اس کے بعد یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے انہوں نے یہ خط لکھا کہ میں اب اپنی اس کتاب کے طبع ثانی کا انتظام کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ کی حسب ذیل عنایتوں کا خواست گار ہوں:

۱- ایک یہ کہ ڈیلا فوس صاحب کو آپ یہ خط لکھ دیں کہ چون کہ مارسٹن صاحب نے اپنی کتاب کی طبع ثانی میں قابل اعتراض سطور کو نکال دینا منظور کر لیا ہے، اس لیے اب اس کتاب پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اور اب میں اپنی تحریک کو واپس لیتا ہوں۔

۲- آپ میری کتاب کے انگریزی اور اردو نسخوں کے حاشیوں پر ان اصلاحات کو لکھ دیں، جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے جواب میں شعبہ نے ۱۳ اپریل ۱۹۱۱ء کو حسب ذیل خط لکھ کر ڈائریکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا، جس میں ظاہر کیا کہ مارسٹن صاحب کی پوری کتاب جس لب و لہجہ میں لکھی گئی ہے اس کے لحاظ سے وہ صرف چند عبارتوں کے بدل جانے سے پاک و صاف نہیں ہو سکتی ہے، بلکہ پوری کتاب کا ڈھانچہ بدلنے کے لائق ہے، ڈائریکٹر صاحب نے ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو اس کا جواب دیا۔

شعبہ نے اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کی تاریخ اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں کی تصحیح کی طرف

توجہ کی اور ان کے قابل اعتراض مقامات کی نشان دہی کی اور بعض دوسرے صوبوں کی تاریخی کتابوں کا بھی جائزہ لیا اور ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں اس شعبہ کی پوری رپورٹ پیش کی، اس رپورٹ میں قابل اعتراض عبارتوں کے جو اقتباسات پیش کیے گئے تھے ان کو سن کر پورے جلسہ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، اس لیے جب مولانا کھڑے ہوئے تو حاضرین سے پوچھا ”حضرات! کیا آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ آپ کے ہزاروں لاکھوں بچے ان الفاظ کو مدرسوں میں پڑھتے ہیں جن کو آج آپ نے سنا اور جن کے سننے سے آپ کے دل لرز گئے ہیں اور جس پر آپ نے نفرت کے نعرے بلند کیے ہیں (کبھی اس سے پہلے آپ نے نعرے بلند کیے تھے، سوال یہ ہے کہ جب آپ کا لڑکا پڑھ کر گھر میں آتا تھا تو کیا کبھی اس نے شکایت کی کہ آیا ایسے ناگوار اور لغو الفاظ ہم کو اسکول میں پڑھائے جاتے ہیں، آپ کا احساس مذہبی زائل ہو رہا ہے، آپ کو اس پر رونا چاہیے کہ آپ کی فیلنگ آپ کے احساسِ مذہبی بالکل فنا ہوتے جاتے ہیں۔) (ردود لکھنؤ ص ۱۱۵، ۱۹۱۲ء)

اس صیغہ تاریخ کی، تاریخ نہیں آ کر ختم ہو جاتی ہے، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہماری ان تحریروں اور تحریکوں سے چونکہ کر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام نہ وہیں ہوا نہ یہیں ہوا، میں نے صیغہ کے سکریٹری کی حیثیت سے دو سال پہلے ہی ۱۵ اگست ۱۹۱۰ء کو یہ خط لکھا تھا ”جناب مکرم دام لطفکم السلام علیکم، ندوۃ العلماء کے اعلانِ شعبہ تصحیح کے بعد ”البشیر“ میں یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ پڑھی کہ جناب نے بھی اس امر کی طرف توجہ فرمائی ہے، دوسری بار بعض اغلاط تاریخی کی اشاعت کے بعد پھر ”البشیر“ میں پڑھا کہ جناب نے معلمین و افاضل مدرسہ العلوم کی ایک کمیٹی بغرض تصحیح اغلاط مرتب فرمائی ہے، چوں کہ ایک قومی کام دو منتشر مقاموں میں انجام پانا خلافِ مصلحت ہے، اس لیے چند امور عرض ہیں، (۱) اس کام کو متحد قوت سے کیوں کر عمل میں لایا جائے؟ (۲) آپ نے اس کام کو عملی صورت میں لانے کی کیا تدابیر اختیار کی ہیں؟ (۳) انگریزی کورس کی جو تاریخ از سر تا پای لغو ہوا اس کو خارج از کورس کرنے کی کیا تدبیر ہے؟

امید ہے کہ قومی کاموں میں یکجہتی کو پیش نظر رکھ کر جواب سے مستفیض فرمائیں گے۔“

مگر جواب حسبِ مراد نہیں آیا۔

عربی مدارس کی تنظیم کی تحریک ۱۹۱۲ء | ۱۹۱۲ء میں دہلی کے اجلاسِ ندوہ کے زمانہ میں مولانا کو

یہ خیال ہوا کہ موجودہ عربی مدرسوں کا انتشار ان کو کسی ایک سلسلہ میں منسلک ہونے سے مانع ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں جو طوائف الملوکی ہے وہ جس طرح اس کے ہر شعبہ حیات کو محیط ہے، عربی مدرسے بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں اور اس کے سبب سے عربی مدرسوں کی بہت سی خرابیاں اور بد انتظامیاں دور نہیں ہو سکتیں، اس خیال کا آنا تھا کہ مولانا نے سب سے پہلے حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس اول دارالعلوم دیوبند کو اس بارہ میں خط لکھا موصوف نے اس کا جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے:

”مکرم والادور جنت زید فصلکم..... تسلیم مع التکریم،

”بوجہ تشریف آوری حجاج بندہ کو دہلی، میرٹھ، سہارن پور جانا ہوا، اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی، آپ نے جو خیال لائق مدرس کی نسبت ظاہر فرمایا نہایت ضروری اور قابل اہتمام ہے، اس کا بندوبست ہونا چاہیے۔

جیسا آپ نے تصاویر کا انسداد فرمایا، اسی طرح دیگر جزئیات کی طرف وقتاً فوقتاً آپ کی توجہ نہایت مفید اور موثر ہوگی۔

ایک مختصر مجمع میں جس میں چند حضرات بیرونی بھی شریک تھے، حالات موجودہ پر کچھ بحث ہوئی دو باتیں قابل اہتمام سمجھی گئیں، اول یہ کہ مرکز بنایا جائے، یا نہیں اور بنایا جائے تو کس کو؟ دوسری یہ کہ اس کی صورت کیا ہو، امر اول کو موجودین نے منظور کیا اور بالاتفاق مسئلہ مرکز کو مستحسن کہا، تعین مرکزی نسبت جو رائے ہوئی تو بعد گفتگو یہی قرار پایا کہ مدارس اسلامیہ بہ جز دیوبند اور کسی کی ماتحتی نہیں پسند کر سکتے ہیں اور نہ یہ امر مناسب ہے۔

بقیہ حضرات سے استفسار کے بعد جو امر طے ہوگا، اطلاع دوں گا، امر دوم یعنی اس سلسلہ کی صورت اور شرائط و قیود کیا ہوں گی، یہ لمبی بحث ہے، جو جملہ اراکین وغیرہ کے بدون اس کا تصفیہ قابل اعتبار ناممکن ہے، بعد مشاورت اگر کوئی امر قابل عمل درآمد لے ہوگی تو جناب کو اطلاع دی جائے گی، آپ کسی تجویز مفید سے اطلاع فرمائیں تو غالباً اس وقت میں مفید ہوگی۔

مجھ کو یہ بھی خیال ہے کہ آپ کو اور ہم کو یونیورسٹی سے کیا تعلق رکھنا مناسب ہے، غالباً آپ

نے کوئی امر ضرور مقرر فرمایا ہوگا۔ والسلام بندہ محمود حسن، دیوبند ۱۸ ربیع الاول ۱۲۹ھ

اس جواب کی بنا پر مدرسوں کی تنظیم کے خیال کو چھوڑ کر صرف مذہبی ضروریات کے لیے ندوۃ العلماء کی مرکزیت کی تجویز پیش ہو کر منظور ہوئی۔

مدینہ یونیورسٹی کی تجویز ۱۹۱۳ء | ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں طرابلس الغرب پر اٹلی کے حملہ اور بلقان میں بلقانی ریاستوں کی بغادت نے دنیائے اسلام میں جو ہلچل پیدا کر دی تھی اس کی تاریخ اس زمانہ کے اخبارات کے صفحات میں ہے، اس وقت دولت عثمانیہ کی امداد و تحفظ کے لیے ساری دنیا کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم مولوی ظفر علی خاں اور بہت سے ہندوستانی اہل فکر مسلمانوں نے ترکی کا سفر کیا اور وہاں کے اہل الرائے اکابر سے ملاقاتیں کیں، اسی سلسلہ میں یہ قرار پایا کہ مدینہ پاک میں ایک مدینہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جائے جس میں سارے اسلامی ملکوں کے طالب علم یک جا ہوں اور اسلامی دنیا کے بڑے بڑے ماہرین علوم اس میں درس و تدریس کے لیے اپنے اوقات عزیز کو وقف کریں، ہندوستان کی طرف سے اس میں مولانا شبلی اور ان کے عزیز و شاگرد مولانا حمید الدین صاحب کے نام لیے گئے، اس سلسلہ میں اس زمانہ کے ”زمین دار“ اور ”الہلال“ میں بہت سی تجویزیں زیر بحث آئی تھیں، مکاتیب شبلی میں بھی ۲۹ مئی ۱۹۱۳ء کے خط میں اس کا ذکر آ گیا ہے، (ابوالکمال عبدالحکیم - ۲) ۱۰ جون ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں ”مدینہ یونیورسٹی کی تجویز میں قسطنطنیہ کو لکھنؤ سے تو ارد ہوا، خیر لیکن بہت ضروری چیز ہے، افسوس ہے کہ اب ہمت نہیں کہ اس کے متعلق کچھ کر سکو، پہلی سی بات ہوتی تو مدینہ جانا کیا مشکل تھا۔“ (۵)

لیکن افسوس ہے کہ بلقان کے معرکہ میں ترکی کی ناکامی سے ان تجویزوں پر اوس سی پڑ گئی۔

مسلم یونیورسٹی ۱۹۱۱ء - ۱۹۱۳ء | علی گڑھ تحریک میں مسلم یونیورسٹی کا تخیل تمام تر سید محمود مرحوم کا ساختہ و پرداختہ ہے سب سے پہلے ان ہی نے ۱۸۷۳ء میں ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کا نصب العین پیش کیا، جو کیمبرج و آکسفورڈ کی طرح حکومت وقت کے اختیارات سے آزاد ہو، اس کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے سرسید کی وفات کے بعد اس خیال کو آگے بڑھایا اور اس کو سرسید کی یادگار ٹھہرا کر ایجوکیشنل کانفرنس کے مقصد میں اس کو داخل کر دیا، اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک جب کہ مسلم یونیورسٹی نے خواب کے بجائے تعبیر کی صورت اختیار کی، کانفرنس کے ہر اجلاس کے صدر نے اس خوش آئند خواب کو دہرانا اپنے خطبہ کا ضروری حصہ قرار دے لیا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم کالج کے تعلق سے اس تحریک کی اندرونی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خواب کبھی ممنونِ تعبیر نہ ہوگا، چنانچہ مئی ۱۹۰۱ء میں مولانا شروائی کو لکھتے ہیں کہ ”ندوہ میں چند لڑکوں کو انگریزی پڑھنے کی اجازت دینا اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر نواب محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی“ (۲۶)

لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دس بارہ برس کے بعد یہ فرضی یونیورسٹی جن لوگوں کے ہاتھوں واقعی بن جائے گی، ان میں خود مولانا کا ہاتھ بھی شامل ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بے حد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی اور ان کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑھ ہوتی تھی، حکام کے سامنے ان ناخوش گوار حالات کا تدارک از بس ضروری تھا، اس کے لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالم گیر اسلامی تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو ادھر سے ادھر پھیر دے، یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیل تھا جس کو لے کر ہنر ہائینس سر آغا خاں جو اس وقت کے مسلم قومی رہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے، علی گڑھ پارٹی کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی رہنمائی کی باگ نکل رہی تھی، اس کو دوبارہ ہاتھ میں لینے کے لیے بھی یہ تدبیر کارگر ہو سکتی تھی، بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا، خود ہنر ہائینس سر آغا خاں نے صوبوں کا دورہ کیا اور بڑے بڑے امرا کے دروازوں پر جا جا کر دستک دی اور چندہ کی بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں اور یوں بھی عام طور سے ملک کے مختلف حصوں میں چندوں کی وصولی کی کارروائی شروع ہو گئی اور تھوڑے دنوں کے بعد اکتیس لاکھ کی مطلوبہ رقم پوری ہو گئی، مولانا نے اس کی تاکید میں جنوری ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں حسب ذیل نوٹ لکھا ”حکومت انگریزی کی ابتدائی تاریخ سے آج تک مسلمانوں نے کبھی ایسی بلند ہمتی کا اظہار نہیں کیا جو آج ایک یگانہ قوم ہنر ہائینس سر آغا خاں کی ذات سے وجود میں آئی، مجھن یونیورسٹی ایک خواب تھا جو گو نہایت خوشگوار و شیریں تھا لیکن پھر بھی خواب تھا، ہنر ہائینس موصوف نے اس کی تعبیر بتائی اور بتائی نہیں بلکہ کر کے دکھا دیا، چہ کرو مسلمان اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے، جو ایک ذاتِ واحد نے انجام دیا، خدا کرے وہ دن آئے کہ علی گڑھ میں مسلمان فیو لنظر آئیں، مسلمان تعلیمی اسکیم بنائیں، مسلمان نصابِ تعلیم تجویز کریں، فیوشپ کی امیدواریاں ہوں، مسابقت ہو، ووٹوں کی کشمکش ہو اور فریق اور نچ دونوں ہمیں ہوں۔“

ازمن بہ من سلام و ہم ازمن بہ من پیام رنجِ دلے مباد سلام و پیام ما
 اس کے بعد ہی لکھنؤ میں اس کا وفد آیا تو بڑی خوشی سے اس کی کوششوں میں شریک ہوئے اور
 سب سے دل چسپ بات یہ ہوئی کہ ایک فیاض مسلمان نے ندوہ کی طرف سے دس ہزار روپیے اس فنڈ
 میں داخل کیے، اس پر خوش ہو کر فروری ۱۹۱۱ء کے الودہ میں دوسرا نوٹ لکھا ”ہز ہائٹس سر آغا خاں بہادر
 کی سرپرستی میں محض یونیورسٹی کا جو وفد لکھنؤ میں آیا، اس کا جس جوش، جس شان، جس خلوص کے ساتھ
 استقبال کیا گیا، وہ مدت تک اہل لکھنؤ کو یاد رہے گا، امیر و غریب و کلا، تاجر، پیر ستر، عام، خاص، غرض ہر
 قسم کے لوگ اسٹیشن پر ہز ہائٹس موصوف کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے، یونیورسٹی کے لیے چندہ کی جو
 فہرست کھولی گئی اس میں بھی ہر قسم کے لوگوں نے اپنے نام لکھوائے، ندوۃ العلماء اپنے مقاصد کی تکمیل
 کے لیے اگرچہ ابھی تک خود قومی فیاضوں کا محتاج ہے لیکن محض یونیورسٹی کی تکمیل میں اس نے بھی
 نمایاں حصہ لیا اور اپنی طرف سے دس ہزار کی رقم پیش کی، ممکن ہے لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ندوہ کو جب خود اپنی
 تکمیل بلکہ اپنی بقا کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے تو وہ دوسروں کی طرف کیوں کر متوجہ ہو سکتا ہے، ممکن ہے
 کسی کو یہ بھی خیال ہو کہ ندوہ کو یہ کیا حق ہے کہ وہ ندوہ کے سرمایہ کو دوسرے کام میں لگائے لیکن واقعہ یہ ہے
 کہ یہ رقم ندوہ کے سرمایہ سے نہیں دی گئی بلکہ ندوہ کے ایک ہی خواہ نے اپنے پاس سے دی، باقی یہ کہ ندوہ
 خود محتاج ہے، تو اسلام میں اس ایثار نفس کی مثالیں موجود ہیں کہ محتاجوں نے محتاجوں کی شرکت کی ہے۔
 لاہور میں ہز ہائٹس سر آغا خاں کی سرکردگی میں جو وفد گیا اس کے ایک ممبر خود مولانا بھی تھے،
 چنانچہ وہیں اپنی یہ مشہور نظم پڑھی:

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد	کہ ایں سررشدہ تعلیم ماور دست ما باشد
علوم تازہ را با شرع و حکمت با ہم آمیزیم	الہی با ریاضی و طبعی آشنا باشد
بساطے تازہ چمنیم و طرے نو در اندازیم	کہ در بزم نوے پیشیاں رانیز جا باشد
کنوں دہ سال شد کین خواب نوشیں در نظر واریم	کہ خوابے ایں چنیں خود جاں نواز و جانفز باشد
ولے پیدانہ شد ایں خواب را چون صبح تعبیرے	گماں بردیم کیں اندیشہ از روئے خطا باشد
گبے با خویش می گفتیم کاساں گرد ایں مشکل	ولے بانستہ صد محنت و رنج و عنا باشد
بود آساں کہ چون طفلان دوسہ نقشی کشف وانگہ	گبونی کیں در دہام است و ایں قصر دسر باشد

و لے آساں نہ باشد در سگاہے را بنا کردن
 کہ خود ہر گونہ گوں رنجوری مارا شفا باشد
 درین بودیم ماکز پرده گاہ غیب سر برزد
 ہمایوں طلعتے کیں عقدہ رامشکل کشا باشد
 سر آغا خاں کہ خود خواب است این تعبیر نوشیں را
 چہ خوش باشد کہ خواب از ماو تعبیر از خدا باشد
 بکیش شیعہ و سنی سر آغا خاں خدا نبود
 ولیکن کشتی اسلامیاں را نا خدا باشد

کنوں بنی کہ زود آن گلشن رنگین پاگرد
 کہ شبلی ہم درد یک بلبل رنگیں نوا باشد

مجلس تاسیس جامعہ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی) کے نام سے یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط بنانے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی، مولانا اس کے بھی ممبر تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ یونیورسٹی کیا ہوگی، ۲۵ مارچ ۱۹۱۱ء کو مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں ”یونیورسٹی کا چارٹر تو ضرور مل جائے گا یہ قطعی ہے، باقی یہ کہ وہ کیا ہوگی، اس کو وہ لوگ خود جانتے ہیں لیکن بہر حال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔“ (۲۷) اسی لیے وہ یونیورسٹی کمیٹی کے سارے کاموں میں شریک رہے، وزیر تعلیم سے گفتگو کرنے کے لیے جو وفد شملہ گیا تھا وہ اس کے بھی ممبر تھے، راجہ صاحب محمود آباد کی سرپرستی میں لکھنؤ میں یونیورسٹی کے اجلاس بار بار ہوتے تھے، ۱۸ اگست ۱۹۱۱ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں ”یونیورسٹی کے اجلاس یہاں ہو رہے ہیں، بڑے بڑے معزز لوگوں کا مجمع ہے، میں بھی ممبر ہوں، اس لیے شریک ہوتا ہوں، اس کے بعد شملہ ڈیپوٹیشن میں جانا ہے۔“ (۳۱)

یونیورسٹی کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان بعض شرائط کے تصفیہ کا تھا، ان میں تین باتیں سخت تنازعہ فیہ تھی۔

(۱) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی ہو، اور گورنمنٹ علی گڑھ یونیورسٹی

کہتی تھی۔

(۲) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے جس قدر کالج اور

اسکول ہیں ان کے الحاق کا اختیار ہو، گورنمنٹ اس کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور اب تک تسلیم نہیں کیا۔

(۳) گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے متعلقہ امور کے آخری فیصلہ کا اختیار (ویٹو) اپنے حکام

اعلا کو دینے پر مہر تھی اور ہے، مسلمان اس کے ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

اربابِ علی گڑھ متردد تھے کہ اہم مسائل میں عام مسلمانوں کو دخل اندازی کی حاجت ہے یا نہیں، بہر حال اس بحث کو طے کرنے کے لیے لکھنؤ کے قیصر باغ میں یونیورسٹی کا اساسی جلسہ فوٹوٹیشن کمیٹی ۲۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہوا جس میں ملک کے تمام اکابر اور رہنمایان ملت شریک تھے، جس میں مولانا بھی تھے، اربابِ علی گڑھ راجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک طرف تھے اور احرار کی جماعت مسٹر محمد علی (اب مولانا) ابوالکلام کی سیادت میں دوسری طرف تھی، پہلے روز کے اجلاس میں محمد علی صاحب نے جلسہ میں نہایت جوش پیدا کیا اور احرار کی سربراہی کی لیکن دوسرے دن دفعۃً معاملہ بدل گیا، واقعات شہینہ کیا تھے، کم لوگوں کو معلوم ہیں، بہر حال جلسہ میں یہ نظر آیا کہ محمد علی صاحب اربابِ علی گڑھ کی حمایت میں ہیں اور تنہا مولانا ابوالکلام ادھر ہیں، کہتے ہیں کہ جب جا کالج کے طلبہ جن کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا، وہ نہایت اہتمام سے جلسہ کے اطراف میں باقاعدہ بٹھائے گئے اور انہوں نے اس قدر جلسہ پر استیلا حاصل کر لیا کہ موافقین کا چیر سے دل بڑھایا اور مخالفین کو ”شی شی“ کی آواز سے مبہوت کرویا، مخالفین نے ہر چند بولنے کی کوشش کی، ناکامی ہوئی، یہ واقعات اس زمانہ میں نہایت اہم تھے۔

اسی جلسہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اس میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ معاملات کے تصفیہ کے لیے واسرائے کی خدمت میں ارکان کا ایک وفد بھیجا جائے تو خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے اس کی سخت مخالفت کی، مگر جب ان کا نام بھی داخل وفد کر لیا گیا تو وہ چپ ہو گئے۔

ان میں سے ہر واقعہ پر مولانا کی متعدد نظمیں ہیں، جو ان کے اردو کلیات میں جمع کر دی گئی ہیں، جن صاحبوں کو شوق ہو وہ ان نظموں کو واقعات سے ملا کر دیکھ لیں، ان نظموں نے عام لوگوں میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات سے نہایت گہری دل چسپی پیدا کر دی تھی۔

لطیفہ: مولانا کے فارسی قطعہ کے دوسرے مصرع ع کہ ”ایں سررشتہ تعلیم مادر دست ماباشد“ کے جواب میں خوب فرمایا تھا ع ”بشرط آنکہ ایں دست شاد دست شتاباشد“

ناگ پور یونیورسٹی میں مشورہ ۱۹۱۴ء | ناگ پور یونیورسٹی یعنی صوبہ متوسط و برار کی یونیورسٹی جس کا صدر مقام ناگ پور ہے، اس وقت تجویز و خیال کی منزل میں تھی، مسٹر جنس اس زمانہ میں وہاں کے ڈائریکٹر اور اس تجویزی کمیٹی کے سکریٹری تھے، موصوف نے مولانا کو ۲۵ اگست ۱۹۱۴ء کو حسب ذیل سرکاری چھٹی لکھی:

۱۔ خاک سار مؤلف اس جلسہ میں خود شریک تھا۔

”آپ شاید واقف ہوں گے کہ صوبہ متوسط اور برار کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کی گئی ہے اور اس کی اسکیم مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، مقامی حکومت کی طرف سے اس امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم سے دل چسپی رکھنے والے اصحاب اس کمیٹی کی امداد کریں گے۔“

مجھ کو آپ تک یہ اطلاع پہنچانے کی ہدایت دی گئی ہے کہ عربی اور فارسی کی تجاویز کے لیے ایک سب کمیٹی کی تشکیل ہوئی ہے اور غالباً اس کام کی تکمیل کے لیے آپ کی امداد اور مشورے کی ضرورت ہو، آپ سے امداد اس سے زیادہ نہیں لی جائے گی، کہ آپ بعض مسائل سے متعلق خطوط کا جواب دیں، ان مسائل کے متعلق آپ کی معلومات اور تجربے قیمتی ہوں گے، اس لیے میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ اس قسم کی ضرورت پیش آئی تو کیا آپ خطوط پا کر جواب دینے پر رضامند ہوں گے۔

امید ہے کہ اس کا جواب ۵ دسمبر تک مرحمت فرمائیں گے۔“

مولانا نے اس کا جواب ۳۱ اگست ۱۹۱۴ء کو دیا، مگر یہ وقت مولانا کے لیے بڑی مصیبت کا تھا اور چند ہی مہینوں کے بعد وفات پائی، اس لیے مجھے امید نہیں کہ انہوں نے اس یونیورسٹی کے مشرقی صیغہ کی تشکیل میں کچھ زیادہ مشورے دیے ہوں گے، یونیورسٹی کا یہ خاکہ چھ برس میں تکمیل کو پہنچا اور ۱۹۲۰ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، نیز اس کا مشرقی صیغہ جو عربی و فارسی وارد پر مشتمل ہے، خاصہ ہے، اور اس کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ علامہ شہلیؒ کی تجاویز کا بھی کسی حد تک ممنون ہے۔

مذہبی اور قومی کام

وقف علی الاولاد ۱۹۰۸ء-۱۹۱۲ء | اسلام میں اپنی اولاد اور عزیزوں پر بلکہ خود اپنے آپ پر وقف کرنا بھی جائز ہے، ہندوستان پر جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو چون کہ یہ مسئلہ ان کے قانون کے مطابق نہ تھا، اس لیے انگریزی عدالتوں نے اس قسم کے مقدمات میں اپنے فیصلوں میں اس اسلامی قانون کو رد کر دیا، حالان کہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر نہ صرف مسلمانوں کی جائداد کا تحفظ و بقا موقوف تھا، بلکہ اس کے ذریعہ سے ان نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح بھی ہو سکتی تھی، جو اپنے آبا و اجداد کی جائداد کو نہایت بے دردی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ اپنی ہوائے نفسانی پر قربان کر رہے تھے۔

سر سید نے اسی خیال سے اپنی لیکچر سلیڈ کونسل کی ممبری کے زمانہ میں ”وقف خاندانی“ کے نام سے ایک مسودہ قانون کے پیش کرنے کی تیاری کی تھی، جس میں گورنمنٹ سے یہ چاہا تھا کہ ایسی وقف جائداد کی تولیت کا مسئلہ ہمیشہ حکام کی مرضی سے طے ہو اور نیز یہ جائداد کسی سرکاری مطالبہ، مال گزاری میں ضبط نہ ہو، مگر ایک طرف بعض علمائے اس سے اختلاف کیا اور دوسری طرف سر سید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے، ان کو بتایا کہ گورنمنٹ اس قانون کو اس لیے منظور نہیں کر سکتی کہ ولایت کے مقننوں کی یہ قطعی رائے قرار پا چکی ہے کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لیے ناقابل انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔^۱

جسٹس مولوی سید امیر علی صاحب جس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے، وقف کے ایک مقدمہ میں (میر محمد اسماعیل بدنام شی چرن گھوش) اس مسئلہ کے جواز کے تمام دلائل لکھے لیکن حکام پر یوی کونسل نے ۱۸۹۳ء میں (یہ مقدمہ ابوالفتح بدنام راس مایا دھر چودھری مندرجہ جلد ۲۲، ترجمہ انڈین لار پورٹ مطبوعہ جولائی ۱۸۹۵ء) ان دلائل کو ناکافی خیال کیا، اور ”وقف علی الاولاد“ کو ناجائز قرار دیا، اس وقت سے مسلمانوں کو برابر یہ خیال رہا کہ اس غلط فیصلہ کی تصحیح کی جائے، چنانچہ خود مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں انگریزی کے مشہور رسالہ ”نائین ٹینتھ سنچری“ میں اس مسئلہ پر ایک نہایت مدلل مضمون لکھا، لیکن وہ بھی بے اثر رہا، بعد ازاں کلکتہ کے ممتاز وکیل مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے ایک نہایت

مدلل و مفصل رسالہ لکھ کر بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک عرض داشت کے ساتھ بھیجا، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بنگرامی نے جب وہ انڈیا کونسل کے ممبر تھے، اس وقت کے وزیر ہند سے کہہ کر اس غلطی کی اصلاح کی کوشش کی لیکن یہ تمام پر زور کوششیں اور یہ با اثر شخصیتیں اس لیے ناکام یا برباد رہیں کہ اس منزل کے طے کرنے کا جو راستہ تھا، سب اس سے الگ جاتے تھے۔

سب سے مقدم بات یہ تھی کہ گورنمنٹ کے کانوں تک جو صدا پہنچانی تھی وہ عام صدا ہونی چاہیے تھی لیکن اب تک جو کچھ کہا گیا تھا وہ انفرادی حیثیت سے کیا گیا تھا، مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم کے مضمون کی خوبی میں کیا کلام ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی وہ ایک شخص خاص کا خیال تھا، مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے بے شبہ اس کے آگے ایک قدم بڑھایا تھا اور بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے درخواست بھیجی تھی لیکن یہ ایسوسی ایشن کل ہندوستان کیا، کل بنگال کی زبان بھی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ ملک کو اس درخواست کی خبر بھی نہیں ہوئی اور گورنمنٹ نے مارچ ۱۹۰۸ء میں صاف جواب دے دیا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ میں کوئی مداخلت نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ کہا یہ جاتا تھا کہ یہ مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے پریوی کونسل کا فیصلہ جو اس کے خلاف ہے، منسوخ ہونا چاہیے لیکن جو لوگ یہ صدا بلند کرتے تھے، وہ مسلمانوں کے مذہبی لیڈر یا پیشوا نہ تھے، اس لیے ان کی آواز مذہبی آواز نہیں ہو سکتی تھی لیکن مولانا نے منزل مقصود تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا اس میں اس قسم کے نشیب و فراز نہ تھے۔

مولانا کا خیال اس مسئلہ کی طرف ۱۹۰۸ء کے شروع میں رجوع ہوا، اس وقت ان کے سامنے

چند امور قابل غور تھے۔

۱- آیا یہ مسئلہ حقیقت میں مسلمانوں کا مسلمہ مذہبی مسئلہ ہے یا نہیں؟

۲- اگر ہے تو گورنمنٹ کو کیوں کر اس کا یقین دلایا جاسکتا ہے۔

۳- گورنمنٹ پریوی کونسل کے فیصلہ میں مداخلت کر سکتی ہے یا نہیں؟

چوں کہ دفعہ اول میں ان کو کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے دفعہ دوم اور سوم کے متعلق انہوں نے تو م

کے اکثر نام ور قانون دان اور سربراہ آوردہ اصحاب مثلاً سید علی امام بیرسٹر پنڈہ پریسیڈنٹ، مسلم لیگ، مولوی مظہر الحق بیرسٹر پنڈہ، مسٹر شفیع بیرسٹر لاہور، نواب سید امیر حسن خاں کلکتہ، مولوی حامد علی خاں بیرسٹریٹ لاکھنؤ، نواب وقار الملک بہادر علی گڑھ، سید ظہور احمد صاحب بیرسٹر لندن، مولوی محمد شریف

آزیری سکریری وقف کمیٹی لندن، مولوی محمد یوسف صاحب وکیل ہائی کورٹ کلکتہ مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی میر سٹریٹ لاکھنؤ نواب نصیر حسین خاں خیال کلکتہ، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بگرامی وغیرہ سے خط و کتابت کی، فروری اور مارچ ۱۹۰۸ء میں ان میں سے اکثر اصحاب نے خطوط کے جواب دیے، جن کا خلاصہ انجمن وقف اولاد کی کارروائی میں درج ہے، سب نے متفقاً کام یابی کی امید ظاہر کی اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا اور خواہش کی کہ صحیح طریقہ سے اس تحریک کو جاری کیا جائے۔

ان تمام بزرگوں کے نزدیک سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ اس سلسلہ کے متعلق گورنمنٹ کو یقین دلایا جائے کہ یہ مسلمانوں کا مسلمہ مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے یہ مناسب خیال کیا گیا کہ پہلے اس کو علما کے سامنے پیش کیا جائے، ندوۃ العلماء کا جلسہ عام دارالعلوم کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں نومبر ۱۹۰۸ء میں لاکھنؤ میں ہو رہا تھا، چنانچہ اسی زمانہ میں انہوں نے اس مسئلہ کو ایک تجویز کی صورت میں پہلے ندوہ کے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا، مولوی ظیل الرحمن صاحب کے سوا باقی سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ تمام ہندوستان کے علما سے پہلے فتوے حاصل کیے جائیں، اس کے بعد آگے کارروائی کی جائے، یہی تجویز ندوہ کے اس کھلے اجلاس عام میں پیش ہو کر منظور ہوئی، اس منظوری کے بعد کام شروع کر دیا، عام اعلان کے لیے ۲۳ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اندوہ میں ایک کھلا خط شائع کیا جس میں کام کے حسب ذیل مراتب مقرر فرمائے:

- ۱- ایک رسالہ اردو زبان میں نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ فقہ کی مستند کتابوں سے تیار کیا جائے، جس میں ثابت کیا جائے کہ وقف اولاد فقہ اسلامی کا ایک مسلم اور قطعی مسئلہ ہے۔
- ۲- اس رسالہ پر تمام علمائے ہندوستان سے دستخط کرائے جائیں۔
- ۳- اس رسالہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا جائے۔
- ۴- ہندوستان کے ہائی کورٹوں اور پریوی کونسل نے جس بنا پر وقف اولاد کو ناجائز قرار دیا ہے، ان دلائل سے تعرض کیا جائے اور ان کی غلطی دکھائی جائے۔
- ۵- ایک محضر اس مضمون کا تیار کیا جائے، کہ چونکہ وقف اولاد کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لیے پریوی کونسل نے اس کے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی ہے، اس کی اصلاح قانون کے ذریعہ سے کر دی جائے۔

۶- اس محضر پر تمام اسلامی انجمنوں اور عام مسلمانوں کے دستخط کرا کے گورنمنٹ کے پاس بھیجا جائے، ان تمام امور کے انجام دینے کے لیے ایک رقم کی ضرورت ہے، جس کی تعداد تخمیناً دو تین ہزار ہوگی، جس سے رسالہ کی تیاری، انگریزی ترجمہ اور خط و کتابت کے مصارف ادا ہو سکیں، اس بنا پر ہم تمام مسلمانان ہندوستان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں تو خاک سار کو مطلع فرمائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ وہ جو مفصلہ ذیل میں کس قسم کی شرکت کر سکتے ہیں۔

۱- مشورہ اور رائے میں شرکت۔

۲- چندہ میں شرکت۔

۳- رسالہ کی ترتیب اور تیاری میں قانونی مشورہ اور انگریزی ترجمہ کرنے میں شرکت۔

لوگوں نے بڑی خوشی سے ان تینوں کاموں میں شرکت کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد ندوۃ العلماء کی تجویز کے مطابق مولانا نے تمام علما سے استفتاء کیا، سب سے پہلا فتویٰ مولانا فضل حق صاحب رام پوری مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رام پور نے لکھا اور اس کے بعد عام طور سے علما نے اس پر دستخط مثبت فرمائے، بعضوں نے کچھ اور عباراتیں اور حوالے بھی بڑھائے، عموماً دونوں مذہب (شیعہ و سنی) کے علمائے نے محققاً فتوے لکھا کہ یہ مسئلہ شریعت اسلام کا مسلم مسئلہ ہے اور پشاور سے بنگال تک کے علمائے اس فتویٰ پر دستخط کیے اور جب اکثر جگہ سے فتاویٰ آگئے تو مولانا نے خود اس مسئلہ پر نہایت مدلل رسالہ لکھا، جس میں پر یوی کونسل کے تمام دلائل کے جواب دیے اور مسئلہ کی شرعی مصلحتیں ظاہر فرمائیں اور ندوۃ العلماء کے جلسہ انتظامیہ مورخہ ۲ مئی ۱۹۰۹ء میں اس کو پیش کیا، جلسہ نے اس کے متعلق حسب ذیل رزلوشن منظور کیے۔

۱- رسالہ وقف علی الاولاد جو اس مسئلہ پر لکھا گیا ہے اس کا انگریزی ترجمہ کرایا جائے، مع ان فتوؤں کے جو علمائے لکھے ہیں نیز علمائے حرمین سے بھی فتوے حاصل کیے جائیں اور مصر میں اس کے متعلق جو فیصلے عدالتوں میں ہو چکے ہیں، وہ ہم پہنچائے جائیں۔

۲- ایک مجلس وقف زیر حمایت ندوہ قائم کی جائے اور ہندوستان کے تمام مقتدر مجالس سے

اس میں مدد لی جائے۔

۱۔ شاگرد رشید مولانا محمد لطف اللہ صاحب و مولانا عبدالحق خیر آبادی رکن ندوۃ العلماء، افسوس کہ مولانا نے ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں تقریباً سی برس کی عمر میں وفات پائی، بڑے پایہ کے مدرس تھے، اخیر عمر تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔

۳- ایک عرض داشت اس کے متعلق تیار ہو جس میں گورنمنٹ سے خواہش کی جائے کہ وہ شریعت اسلام کے موافق قانون تیار کر دے۔

۴- اس عرض داشت پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے دستخط کرائے جائیں اور دستخط کے بعد وہ ایک معزز اور مقتدر ڈیپوٹیشن کے ذریعہ سے وائسرائے کی خدمت میں پیش کی جائے۔ ان ضروری مراتب کے طے ہو جانے پر مئی ۱۹۰۹ء سے مولانا نے عملی کارروائیاں شروع کیں بزرگان قوم سے مجلس وقف کی ممبری قبول فرمانے کی درخواست کی، عرض داشت پر دستخط کرانے کے لیے فارم تیار کر کے نہایت کثرت سے شائع کیے اور متعدد آدمیوں کو مقرر کیا، جنہوں نے دورہ کر کے ہر طبقہ کے لوگوں سے اس پر دستخط کرائے، ان دستخطوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو گئی۔

تمام کارروائیوں کے لیے ایک معتد بہ رقم کی ضرورت تھی اس لیے چندے کی تحریک کی، اہل خیر نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس تحریک کا خیر مقدم کیا، چنانچہ لاہور، بہار، مدراس، سورت اور بعض دوسرے شہروں میں اس کی اعانت و ہمدردی کے لیے نہایت شاندار جلسے ہوئے اور لوگوں نے بخوشی چندے دیے۔

۱۹۱۰ء میں شیعہ کانفرنس نے بھی اس کی تائید کی، ایک خاص رزلویشن پاس کیا، اسی سال جنوری میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں بھی ایک خاص رزلویشن منظور ہوا، جس کی تحریک مولوی عزیز مرزا مرحوم نے کی جو اس وقت لیگ کے سکریٹری تھے، مولانا نے بھی صدر انجمن مسلم لیگ کے ایما سے اس مسئلہ پر تقریر کی اور یہ طے ہوا کہ ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے الگ میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں جائیں اور حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن بھیجنا قرار پائے تو ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کے ممبر بہ تعداد مساوی شریک ہوں اور مشترکہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے، کیوں کہ یہ مسئلہ پولیٹیکل اور مذہبی دونوں حیثیتیں رکھتا ہے، اس لیے دونوں حیثیتوں سے گورنمنٹ کی خدمت میں سفارت جانی چاہیے۔

مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کا جو جلسہ دہلی میں ہوا، اس میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا اور مولانا نے اس کی اصلیت اور صورت شرعی پر نہایت مفصل تقریر کی اور اس وقت تک اس کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو چکی تھی اس کو پیش کیا، مولانا کے بعد شیخ عبدالقادر بیرٹریٹ لا، چودھری سلطان محمد خاں بیرٹریٹ لا، مولانا سید عبداللہ صاحب، خان بہادر خواجہ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر، اور چند دیگر اشخاص نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی اور آخر میں شیخ عبدالرحیم صاحب تاجر چرم کی طرف سے

وقف علی الاولاد وتمد کے لیے پانچ سو روپیے کے چندے کا اعلان ہوا۔

اسی سال میسوریل کا مسودہ جس کو مئی ۱۹۱۰ء میں غالباً سر تیج بہادر سپرو (الہ آباد) نے تیار کیا تھا (شروانی-۸۱) شایع ہوا اور ملک کے متفنن اور اہل الرائے کی خدمت میں ترمیم و اصلاح کے لیے روانہ کیا گیا، انگریزی اور اردو اخبارات میں بھی اس کی ایک ایک کاپی بھیجی گئی لیکن غالباً یہ میسوریل قابل اعتماد ثابت نہیں ہوا، اس لیے مولانا نے اس کے لکھوانے کے لیے قابل ترین اشخاص کی جستجو کی، اکتوبر ۱۹۱۰ء میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اس کے لکھنے پر آمادگی ظاہر کی، مگر یہ شرط کی کہ مولانا خود حیدرآباد آئیں، مگر ندوہ کی ضرورتوں کی وجہ سے وہ نہ جاسکے، (شروانی-۸۸) جب ہندوستان میں کوئی شخص اس قابل نہ ملا تو جنوری ۱۹۱۱ء میں تمام کاغذات لندن میں ایک ایسے بزرگ (غالباً مولوی امیر علی) کے پاس روانہ کیے، جن سے بڑھ کر کسی کو اس مسئلہ پر لکھنے کا حق حاصل نہ تھا۔

اسی زمانہ میں کونسل کی اصلاح و ترقی (ریفارم) کی وہ اسکیم ہندوستان میں جاری ہوگئی، جس کو ”منٹو مارلے ریفارم“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس اسکیم کے نفاذ نے ”وقف علی الاولاد“ کی کوششوں کا راستہ آسان کر دیا، یعنی اب کونسل کو وضع قوانین کا تھوڑا بہت اختیار حاصل ہوا، اس لیے مولانا نے اس تجویز کو داسرائے کی کونسل کے مسلمان ممبروں کے اندر ہر ممکن طریقہ سے کام یاب بنانا شروع کر دیا، اس کے لیے بار بار کلکتہ جا کر مسلمان ممبروں سے گفتگو کی اور انہوں نے اس کی تائید پر پوری آمادگی ظاہر کی، ان میں سب سے پیش پیش مولوی مظہر الحق مرحوم بیرسٹر پٹنہ تھے، انہوں نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنے اثر سے ہندو ممبروں کو بھی اس کی تائید کے لیے آمادہ کیا۔

ان مختلف کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ سارے ملک میں اس مسئلہ کے متعلق ایسی پر زور آواز پیدا ہوئی کہ گورنمنٹ بھی اس کے سننے سے انکار نہ کر سکی، چنانچہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس میں جب مسٹر محمد علی جناح نے کونسل میں سوال کیا کہ گورنمنٹ اس تحریک سے جو اس مسئلہ کے متعلق مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے، واقف ہے یا نہیں؟ اور اس کے لیے وہ کیا کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ نے صاف اعتراف کیا کہ یہ صدائیں اس کے کانوں میں آچکی ہیں لیکن وہ خود قانون بنانا نہیں چاہتی بلکہ جو صورت اس کے متعلق مسلمان پیش کریں گے، اس پر غور کرنے کے لیے وہ آمادہ ہے، اس جواب سے لوگوں کو ہمت بندھی اور آخر مولوی مظہر الحق مسٹر جناح اور دوسرے قانون داں ممبروں کے مشورے سے یہ طے ہوا کہ آئندہ اس مسئلہ کو ایک

۱۔ شذرات الندوہ ۱۹۱۰ء، ص ۵ ۲۔ شذرات تمبر ۱۹۱۱ء۔

بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا جائے، چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو مسٹر جناح نے اس مسئلہ کو وقف بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا اور اس پر ایک مفصل تقریر کی، جس میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک، ندوۃ العلماء کی تجویز اور مسلمانوں کے احتجاجی جلسوں اور تجویزوں کا ذکر کیا اور مولانا موصوف نے جو رسالہ پریوی کونسل کے دلائل کے جواب اور مسئلہ کی فقہی حیثیت کی تشریح میں لکھا تھا اس کا خلاصہ پڑھ کر سنایا اور بتایا کہ مسلمانوں میں مولانا کا علمی پایہ کتنا اونچا اور مسلمانوں میں ان کی وقعت کس درجہ ہے اور اس بنا پر ان کی رائے کا وزن کتنا ہو سکتا ہے اور یہ کہہ کر اس کے اقتباسات جگہ جگہ سے پڑھ کر سنائے اور بتایا کہ مولانا کی زیر نگرانی علمائے ہند کی مشہور مجلس ندوۃ العلماء کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا جا رہا ہے جو یا تو گورنمنٹ میں پہنچ چکا ہو گا یا پہنچ رہا ہو گا اور جس پر ہزاروں مسلمانوں کے دستخط ثبت ہیں۔

آخر میں انہوں نے وقف اولاد کا بل پیش کیا اور اس کے دفعات کی تشریح کی۔

اس کے بعد سب سے پہلے مہاراجہ بردوان نے مختصر آؤر آئرہیل مسٹر سچد انند سنہا (بیرسٹر پٹنہ) نے پوری تفصیل سے اس کی تائید کی، ان کے بعد نواب عبدالجید صاحب بیرسٹر الہ آباد نے مولانا شبلی مرحوم اور ندوۃ العلماء کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا اور رسالہ مذکور کے بعض دوسرے ضروری اقتباسات کا اضافہ کیا بعد ازیں راجہ دیگھا پتیا، مولوی شمس الہدیٰ صاحب وکیل کلکتہ، نواب سید محمد بہادر مدراس مسٹر سوبہ راؤ، بابو بھوپندر ناتھ باسو مسٹر گوکھلے اور سب سے آخر میں مولوی مظہر الحق مرحوم نے تقریر کی اور ہندو میمورل کی اس پر جوش تائید کا شکریہ ادا کیا، آخر میں مسٹر جناح نے اس بل کو بزبان انگریزی گورنمنٹ گزٹ میں اور صوبہ کی حکومتوں میں مختلف زبانوں میں شائع کرنے کی تجویز پیش کی۔ گورنمنٹ ممبر نے جواب میں کہا کہ گورنمنٹ مسودہ کو عام طور پر شائع کر کے مسلمانوں کی عام رائے کا انتظار کرے گی، چنانچہ گورنمنٹ نے ملک کے تمام حصوں سے رائیں طلب کیں اور ہر جگہ سے متفقہ رائیں آئیں۔

مسٹر جناح نے جو بل پیش کیا تھا اس کے بعض دفعات سے مولانا کو اختلاف تھا، اس لیے ہمیں جا کر وہ مسٹر جناح سے ملے اور ان کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کیا، انہوں نے اس کے مطابق اپنے بل میں اصلاح منظور کر لی، بہر حال جولائی ۱۹۱۱ء تک یہ کام باقی رہ گیا کہ میموریل بل کے قانونی و شرعی اصلاحات

۱۔ مکاتیب بہ نام عبدالباری۔

کے ساتھ چھپوا کر اور اعیان و اکابر سے دستخط کرا کر وائسرائے کی خدمت میں بھیج دیا جائے، اس غرض سے مولانا نے ہوم ممبر سے جن سے تمام قوانین کا تعلق تھا، خط و کتابت کی اور لکھا کہ وہ ایک ڈیپوٹیشن کی پذیرائی قبول کریں جو ان کو تمام کاغذات سمجھائے، چنانچہ انہوں نے نہایت خوشی سے اس کو منظور کیا اور ڈیپوٹیشن کے لیے ایک تاریخ مقرر کی لیکن یہ تاریخ قطعی و یقینی نہ تھی، اس لیے ٹل گئی، ۱۹۱۲ء کے اوائل میں مولانا خود کلکتہ تشریف لے گئے اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کر کے تمام مراتب طے کیے اور یہ توقع قائم ہو گئی کہ اسی مہینہ میں بل حسب مراد پاس ہو جائے گا اور سب کمیٹی بیٹھ جائے گی، چنانچہ یہ توقع پوری ہوئی اور گورنمنٹ نے اصولاً وقف علی الاولاد کو تسلیم کر لیا اور اس کے جزئیات ایک سب کمیٹی کی نگرانی میں طے ہو گئی اور مولانا کی چار سال کی جدو جہد تک و دو اور سعی و محنت کا نتیجہ حسب مراد نکل آیا اور مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی جس سے ہزاروں گھرانے تباہی سے بچ گئے۔

تعمیل جمعہ ۱۹۱۲ء | سرکاری دفاتر اور انگریزی مدارس کے اوقات چوں کہ عموماً ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک رکھے گئے ہیں، اس لیے مسلمان عہدہ داروں اور مسلمان ٹیچروں اور طالب علموں کو جمعہ پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، اگرچہ یہ فسوس ناک بات ہے کہ جدید تعلیم کے اثر سے خود مسلمانوں میں فرائض مذہبی کی پابندی کا بہت کم احساس باقی رہ گیا ہے، تاہم بہر حال یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے اور کوئی مسلمان اپنے اس حق سے دست بردار ہونا نہیں پسند کرے گا، مولانا کو وقف علی الاولاد کے معاملہ میں جو کام یابی حاصل ہوئی، اس نے ان کے حوصلہ کو بہت کچھ بڑھا دیا اور انہوں نے اسی سلسلہ میں تعویل جمعہ کی طرف بھی توجہ کی اور اس کو گورنمنٹ کی خدمت میں اسی طرح پیش کرنا چاہا جس طرح وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو پیش کیا تھا، چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اپریل ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں جو لکھنؤ میں ہوا تھا، اس مسئلہ کے متعلق ایک رزلوشن پیش کیا جو منظور کیا گیا، اس کے بعد انہوں نے اس کے متعلق ایک یادداشت مرتب کی، جس میں بہ ترتیب حسب ذیل متعدد دلیلوں کی بنا پر مسلمانوں کے اس مطالبہ کو حق و بجانب قرار دیا۔

۱- انگلش گورنمنٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رعایا کے تمام مختلف مذاہب کو یہ آزادی دیتی ہے کہ وہ ہر اطمینان تمام اپنے اپنے فرائض مذہبی کو بجالائیں۔

۲- جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جو معذور و مجبور نہ ہو، فرض قطعی ہے۔

۳- چنانچہ جمعہ کی فرضیت کا حکم قرآن پاک میں مذکور ہے۔

۴- اس نماز کی اہمیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اسلامی سلطنتوں اور ریاستوں میں اس دن تعطیل

ہوتی ہے۔

۵- یہاں تک کہ ہندوستان کی اکثر ہندو ریاستوں میں بھی باوجودیکہ وہاں مسلمان

ملازموں کی تعداد نسبتاً کم ہے، اس دن تعطیل ہوتی ہے۔

۶- انگریزی عملداری کے شروع میں چون کہ مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت

ایک غیر حکومت ہے، وہ ہماری مذہبی فرائض کا لحاظ کیوں کرنے لگی، اس لیے انہوں نے اس درخواست

کی ہمت نہیں کی لیکن بعد کو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی انصاف پسندی کا جیسے جیسے تجربہ ہوتا جاتا

ہے، ان کی یہ خواہش بڑھتی جاتی ہے کہ وہ اس ضروری فرض کے ترک کی طرف گورنمنٹ کو متوجہ کریں۔

۷- آئندہ جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جائے گی، مسلمان سرکاری ملازموں کی تعداد بھی بڑھتی

جائے گی اور اسی مناسبت سے نماز جمعہ کی تعطیل کا مسئلہ بھی روز بروز اہم ہوتا جائے گا۔

مولانا کے اسی مضمون کو پیش نظر رکھ کر انگریزی میموریل تیار ہوا اور تمام مسلمانوں سے اس پر

دستخط کرانا چاہا، چنانچہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں

”و تعطیل جمعہ کی نسبت جاہ جاکچھ کارروائیاں ہو رہی ہیں، آپ اخباروں میں پڑھتے ہوں گے لیکن

جب تک وقف اولاد کی طرح متحدہ، پُر زور اور وسیع طریقہ سے باضابطہ کارروائی نہ کی جائے گی کام یابی

نہ ہوگی، میں نے انگریزی میں میموریل لکھوایا ہے اور اس کو چھپوا کر دستخطوں کے بہم پہنچانے کی

کارروائی شروع کرنی چاہتا ہوں لیکن اس معاملہ کے آخر تک پہنچانے کے لیے کم از کم چار پانچ سو

روئے کی رقم درکار ہوگی، آپ اس سرمایہ میں جو کچھ عنایت فرما سکیں، مطلع فرمائیں۔“ (۱۰۵)

ان اغراض کے لیے مولانا نے جس رقم کی درخواست کی تھی وہ نہایت آسانی سے جمع ہوئی،

اب اس کام میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، کام شروع تھا، کہ مارچ ۱۹۱۳ء میں مسٹر غزنوی (بنگال کے

ممبر) نے بنگال کونسل میں اس کے متعلق گورنمنٹ سے سوال کیا، سرکاری ممبر نے اس کا جواب تشفی بخش

دیا اور گورنمنٹ بنگال نے نماز جمعہ کے لیے دو گھنٹہ کی چھٹی منظور کر لی، اس پر مسٹر شیخ بیرسٹر لاہور نے مولانا

۱۔ مولانا کا یہ پورا مضمون مقالات شہلی حصہ ہفتم صفحہ ۲۹ میں ہے۔ ۲۔ مکاتیب شہلی حصہ دوم، سلیمان۔ ۴۰۔

کو لکھا کہ اب اس تحریک کو آگے چلانے کی ضرورت نہیں (ریاض حسن ۳۱ و شروانی ۱۰۷) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا خیال تھا کہ کام یابی ناممکن ہے (شروانی - ۱۰۷) لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات نے اس سے موافقت نہیں کی، چنانچہ مولانا نے ایک اور میموریل تیار کر لیا جس میں بنگال گورنمنٹ کے فیاضانہ حکم کا حوالہ دے کر گورنمنٹ سے خواہش کی کہ جمعہ کو دو گھنٹوں کی تعطیل کے بجائے ایک بجے سے آدھے دن کی عام تعطیل دی جائے، اس مطالبہ کا حق بجانب ہونا حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا ”گورنمنٹ بنگال تمام مسلمانوں کے شکر یہی کی مستحق ہے کہ اس نے نہایت فراخ دلی سے مسلمانوں کی اپیل نہایت توجہ سے سنی اور مسلمان سرکاری ملازموں کو جمعہ کے دن دو گھنٹہ کی رخصت عطا کی، اس میں شبہ نہیں کہ یہ رعایت ادائے مذہبی، مذہبی فرائض کو دیکھتے ہوئے کافی ہے لیکن اس طرفدارانہ انتظام میں ایک خطرہ ہے جو تمام اہل اسلام کے خوف کا موجب ہو سکتا ہے، خاص کر اس خطرہ کا اثر سب آرڈینٹ سروں (تحت اسامیاں) پر پڑتا ہے، خطرہ یہ ہے کہ بہت سے افسر ایسے بھی ہوں گے، جو ایسے مسلمانوں کو اپنی ماتحتی میں لینا ناپسند کریں گے، جو ہر جمعہ کو دو گھنٹہ کے لیے کام چھوڑ کر چلے جایا کریں گے اور چوں کہ ایسی اسامیاں جیسے تجویز نویس، محرر، نقل نویس، وغیرہ وغیرہ، ایسے ہی افسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، اس لیے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ ایسی اسامیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں جو دو گھنٹہ کے لیے چلے جایا کریں گے، غیر مسلمان ملازموں کو ترجیح دی جائے گی، جو ہر روز اور ہر وقت ان کے ساتھ کام کیا کریں گے، اگر اس خطرہ کی کوئی اصلیت ہو سکتی ہے تو ایسے طرفدارانہ انتظام سے مسلمان سرکاری ملازموں کی آئندہ امیدوں اور ترقیوں پر سخت اثر پڑے گا۔

لہذا حضور والا کے ملتزمین یہ تجویز کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن نصف دن کی تعطیل ایک بجے سے اس ضرورت کے لیے کافی ہوگی، بلاشبہ اس رعایت سے ایک حد تک کام پر اثر پڑے گا لیکن حضور والا کے خدام بصد ادب ملتحق ہیں کہ اس نقصان کی تلافی بھی آسانی سے کی جاسکتی ہے، بہت سی عدالتوں اور دفاتروں میں سینچر کے روز نصف دن کی تعطیل بالکل فضول ہوتی ہے، بجائے سینچر کے جمعہ کے دن آسانی کے ساتھ ایسی تعطیل کی جاسکتی ہے۔“

یہ کارروائی ابھی جاری تھی کہ مولانا نے انتقال فرمایا، اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صوبوں میں ملازمین کو نماز جمعہ میں جانے کی اجازت مل گئی، یعنی اگر وہ چاہیں تو آدھ گھنٹہ کی چھٹی لے کر جاسکتے ہیں اور اسکولوں میں یہ سفارش کی گئی کہ یا تو اسکول صبح سے ۱۲ بجے تک ختم کر دیا جائے یا ایک بجے جو لڑکے اور مدرس نماز کو جانا چاہیں، ان کو آدھ گھنٹہ کی چھٹی دے دی جائے۔

افسوسناک لطیفہ | جن دنوں مولانا نماز جمعہ کی تعطیل کی کوشش کر رہے تھے، اکثر فرماتے تھے کہ تعطیل کی کوشش تو ہو رہی ہے، مگر ڈر یہ لگتا ہے کہ کہیں تعطیل ہو جائے اور مسلمان نماز پڑھنے نہ جائیں تو ان کی کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔

اوقافِ اسلامی ۱۹۱۴ء | ہندوستان میں اسلامی اوقاف کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے، اس سے کون واقف نہیں، مولانا کا دل بھی اسلامی اوقاف کی تباہی و بربادی سے کڑھ رہا تھا، خصوصیت کے ساتھ وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں ان کو اسلامی اوقاف کی جو کیفیت معلوم ہوتی رہی اس سے ان کے دل کا زخم اور بڑھتا رہا اور خصوصیت کے ساتھ اس لیے کہ اوقاف کی کثیر رقم بیکار پڑی رہنے کے باوجود قومی اور مذہبی ضرورتوں کے واسطے جس مشکل سے ایک ایک جیب سے ایک ایک دانہ جمع کر کے انبار لگانا پڑتا ہے، اس سے خوب واقف تھے، غرض ان مختلف اسباب سے مولانا نے وقف علی الاولاد کی کامیابی کے بعد عام اسلامی اوقاف کے حسن انتظام و اہتمام کی طرف توجہ فرمائی۔

مولانا سے پہلے بھی قوم کے کارکن اور ذی احساس افراد نے ادھر توجہ کی تھی اور ان کے مدخل و مصارف کا باقاعدہ انتظام کرنا چاہا تھا، چنانچہ مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بارہا یہ رزلوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی کی طرف متوجہ ہو لیکن گورنمنٹ نے یہ جواب دیا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں، ایک تو یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے، دوسرے یہ کہ ان اوقاف کی آمدنی صحیح مصرف میں نہیں صرف کی جاتی، اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی اور ایسا ضروری معاملہ جوں کا توں رہ گیا۔

مولانا نے وقفِ اولاد کے بعد اس مسئلہ کی طرف توجہ کی اور جنوری ۱۹۱۴ء میں ایک عام خط شایع کیا، جس میں حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:

- ۱- ایک مختصر کمیٹی قائم ہو جو اس کی تدبیروں پر غور کرے اور کوئی صحیح اور متعین اور قابل عمل طریقہ تجویز کر کے ایک اسکیم بنائے جو قوم کے سامنے پیش کی جائے اور فیصلہ کے بعد اس پر عمل کیا جائے۔
- ۲- ایک میموریل تیار کیا جائے، جس میں انتظام اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے اور اس میموریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ میموریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے۔

۱۔ یہ خط مقالاتِ شبلی جلد ہفتم، ص ۲۶ میں موجود ہے۔

۳- گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے اس طریقہ کی ہو کہ مذہبی دست اندازی کا کسی طرح احتمال پیدا نہ ہونے پائے، مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے، جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتاً طریقہ پر انتخاب کیے جائیں اور انتخاب کی تمام تر کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے، پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کر لے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے لیے دیے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شائع کی جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۴- تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کے لیے ایک خاص عہدہ دار مقرر تھا، جس کو صدر الصدور کہتے تھے، کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے لیکن صدر الصدور کا تقرر اسی نیابتاً اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہوتا کہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہو سکے۔

مولانا نے جنوری ۱۹۱۲ء میں یہ تحریک کی تھی اور فروری ۱۹۱۲ء ہی میں گورنمنٹ نے اوقاف کے متعلق ایک یادداشت شائع کی اور اسی مہینہ میں اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے ایک کانفرنس بٹھانا چاہا (سلیمان-۶۶) خوشی میں مولانا شروانی صاحب کو ۱۶ فروری ۱۹۱۲ء کو ان لفظوں میں اس کی خبر دی :

ع ”انچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم“

آپ نے دیکھا، ادھر اوقاف اسلامی کی تحریک شروع ہوئی، ادھر گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی اور ایک کانفرنس اسی مہینہ میں بٹھانے والی ہے، خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے۔

ع آگے نصیب ہے جسے پروردگار دے

لیکن افسوس کہ اسی سال مولانا کا انتقال ہو گیا، تاہم اوقاف کی نگرانی اور انتظام کے متعلق جو تحریک چل چکی تھی وہ مردہ نہیں ہوئی، خود گورنمنٹ نے اور صوبہ کی اسمبلیوں اور کونسلوں نے اس کو جاری رکھا اور بالآخر مختلف صوبوں میں اس کے لیے پہلے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہوئیں اور ان کی سفارش سے نگرانی اور حسابات کی پڑتال کی ایک صورت قائم ہو گئی، گو مولانا کی خواہش اور مسلمانوں کے مطالبہ سے وہ بہت کم ہے، اسی طرح ہندوستان میں صدر الصدوری یا شیخ الاسلامی یا امارت شرعیہ کی جو تحریکیں بعد کو اٹھیں وہ بھی اسی تجویز کی صدائے بازگشت ہے۔

اشاعت اسلام ۱۹۰۸ء-۱۹۱۳ء | ہندوستان میں ۱۹۰۸ء کا زمانہ اسلام کے لیے عجیب کشمکش کا زمانہ تھا، ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں سیکڑوں ہزاروں راجپوت، جاٹ، میواتی اور دوسرے ہندو خاندان مسلمان ہو گئے تھے، ان میواتی کی تعداد بہت کافی ہے، یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے اور کس نے ان کو مسلمان کیا کہ اس وقت سے لے کر آج تک نہ پورے مسلمان ہوئے، نہ ہندو ہی رہے، وہ اپنے کو نام کا مسلمان تو ضرور کہتے تھے، مگر ان میں بہت سے رسوم ہندوؤں کے بھی جاری تھے، بلکہ بعض کے تو نام تک ہندو نہ تھے، ان کی تعداد لاکھوں کے قریب ہے اور حدود راجپوتانہ سے لے کر دہلی و آگرہ تک پھیلے ہیں، آریہ مبلغ معلوم نہیں کب سے اس شکار کی تاک میں تھے اور ان کو دوبارہ ہندو بنانے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، ۱۹۰۸ء میں ایک بیک یہ راز طشت از بام ہوا تو تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف اس کی مدافعت اور بچاؤ کی کوششیں شروع ہو گئیں، مولانا بھی ضعف اور بیماری کے باوجود اس فتنہ کے انسداد کے لیے فوراً کمر بستہ ہو گئے، مارچ ۱۹۰۸ء میں کرنل عبدالجید خاں وزیر خارجہ ریاست پٹیالہ نے جو خود مسلمان راجپوت تھے، پٹیالہ میں ایک مسلمان راجپوت کانفرنس قائم کی اور شاید اس لیے کہ مولانا بھی راجپوت نسل سے تھے، ان کو اس جلسہ میں آنے کی دعوت دی، چنانچہ سخت مصروفیتوں کے باوجود وہ جا کر اس میں شریک ہوئے۔

۱۳ اپریل ۱۹۰۸ء کو نو مسلم راجپوت اور حفاظت اسلام کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ ان نو مسلموں کے ارتداد کا اصلی سبب مذہبی جہالت ہے، اس سلسلہ میں ایک عجیب حقیقت کا اظہار فرمایا جو آج آنکھوں کے سامنے ہے، فرمایا ”ان نو مسلموں کی مذہبی جہالت تو سب کو معلوم ہے، لیکن جس جدید تعلیم کے پھیلائے پر اتنا وقت اور سرمایہ صرف کیا جا رہا ہے، اس کے مذہبی تعلیم سے سراسر خالی ہے، کی بنا پر اس سے بھی اسی قسم کے نتیجہ کا ڈر ہے“ ان کے الفاظ یہ ہیں ”سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ ان نو مسلموں کے مرتد ہو جانے کا سبب کیا ہوا، اس کا جواب صرف ایک ہے، وہ یہ کہ لوگ اسلامی عقائد، اسلامی احکام اور اسلامی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے، ان کا اسلام صرف نام کو اسلام تھا، اس لیے ذرا سی فریب کاری اور دھوکہ سے یہ عارضی رنگ اڑ گیا، یہ جواب بلاشبہ صحیح اور سر تاپا صحیح ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیوی تعلیم سے کیا اس پیشین گوئی کی مخفی آواز نہیں آرہی ہے؟

کیا ہماری دنیوی تعلیم (انگریزی تعلیم) میں عقائد اسلام کے استحفاظ کا کوئی بندوبست ہے؟
کیا اس میں تاریخ اسلام کا کوئی معتد بہ حصہ شامل ہے؟ کیا وہ مذہبی زندگی کی ذمہ دار ہے؟
بے شبہ ابھی تک موجودہ نسلوں میں اسلام کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن یہ کچھلی اور موجودہ
سوسائٹی کی بقیہ یادگاریں ہیں۔

کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ اخباروں میں یہ مضامین مسلمان لیڈروں کی طرف سے شائع
ہوتے تھے کہ اسلام کا قانون وراثت بدلنے کے قابل ہے، ایک مسلمان صاحب نے علانیہ لکھا تھا کہ
قرآن کی وہ سورتیں جو مدینہ میں اتریں بادشاہانہ حیثیت رکھتی ہیں، ان کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں۔
بے شبہ ابھی اس قسم کی مثالیں کم ہیں لیکن ابھی دنیوی تعلیم کو پھلتے ہوئے کے دن ہوئے
ہیں؟ نو مسلم راجپوت دوسو برس کے بعد اس حالت کو پہنچے ہیں، جدید تعلیم کی جو رفتار ہے، دوسو برس کے
بعد اس سے کس قسم کے نتیجے کی امید کی جاسکتی ہے؟

اس تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی تعلیم کو روکا جائے، ہمارے نزدیک دنیوی تعلیم کو
اس قدر پھیلانا چاہیے کہ بچہ بچہ تعلیم یافتہ ہو جائے لیکن ساتھ ہی ہم کو ”مذہب“ کی حفاظت پر بھی اپنی تمام
قوت صرف کر دینی چاہیے، اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی تعلیم کی ایک وسیع الشان
درس گاہ موجود ہو، جس میں تمام مذہبی علوم نہایت مکمل اور اہتمام کے ساتھ پڑھائے جائیں، طلبہ کو عمدہ
ترتیب دی جائے، وہ دروہ زگری کے طریقہ سے پچائے جائیں، ان کو ایثار نفس اور سچی قناعت و خود
داری کی تعلیم دلائی جائے۔

اس کے بعد انہوں نے مذہبی تعلیم کی ایک جامع حیثیات درس گاہ کی ضرورت پر زور دیا اور
مسلمانوں کو متحد ہو کر کسی ایک تبلیغی مرکز کی کوشش پر آمادہ فرمایا۔

ندوة العلماء نے اگرچہ ابتدائی سے اشاعت اسلام کو اپنے مقاصد میں داخل کیا تھا اور ارکان
میں سے پہلے مولوی خلیل الرحمن صاحب اور پھر مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری اس کے معتمد قرار
پائے تھے، تاہم اب تک اس نے عملی طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی لیکن اب وہ حالت
یہ مضامین سرسبز شاہ دین لاہور کے نام سے نکلے تھے، دیکھیے الندوہ شوال ۱۳۳۲ھ (جنوری ۱۹۰۵ء) جلد ۱، نمبر ۶، وڈی
تقدہ ۱۳۳۲ھ (فروری ۱۹۰۵ء) جلد ۱، نمبر ۷، فروری ۱۹۰۵ء (شذرات)۔

پیش آگئی کہ خاموش رہنا مشکل تھا، مولانا نے ہندوستان کے افق پر نظر ڈالی تو ان کو نظر آیا کہ مسلمانوں میں مذہبی جوش کا طوفان تو ضرور برپا ہو گیا ہے لیکن اس کی موہیں بے راہ روی اختیار کر رہی ہیں، اس مذہبی بے چینی اور جوش کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ تمام انجمنیں اپنے اپنے سفیر اور اپنے اپنے داعظ مقرر کر کے مختلف مقامات میں بھیج رہی ہیں لیکن ان انجمنوں میں باہم کسی قسم کا ربط و اتحاد نہیں ہے، اس بنا پر ان کی رائے یہ قرار پائی کی الگ الگ کام کرنے کے بہ جائے ”انجمن ہدایت الاسلام“ دہلی کو جسے مولانا عبدالحق صاحب تھانی مرحوم نے قائم کیا تھا، وسعت دے کر اشاعت اسلام کی ایک مجلس عمومی بنا دی جائے اور تمام متفرق و پراگندہ قوتیں جو علاحدہ علاحدہ کام کر رہی ہیں اسی میں مدغم ہو جائیں اور ندوہ بھی اپنی بساط کے مطابق اس کی پوری مدد کرے۔

شروع میں مولانا کا اصلی خیال یہی تھا اور انہوں نے اس خیال کو اس مضمون میں جس کو ۱۳ اپریل ۱۹۰۸ء میں لکھا تھا نہایت بلند آہنگی کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا تھا لیکن مسلمانوں میں یہ اتفاق عام پیدا نہ ہو سکا، مجبوراً انہوں نے پہلے ندوہ کے اندر رہ کر اشاعت و حفاظت اسلام کے مختلف کام کیے، لیکن اس میں بھی ایک دقت حائل تھی، ندوہ کی مجلس اشاعت اسلام کے معتمد جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری تھے اور مولانا کے خیال میں وہ کام نہیں کر رہے تھے، اس لیے مولانا دو برس تک عجیب شش و پنج میں رہے، کبھی خود کام کرنے لگتے اور کبھی شاہ صاحب کا خیال کر کے چپ ہو جاتے، اسی حال میں دو برس گزر گئے، اس زمانہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے دل کو ٹھیس لگی اور وہ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس آگ میں کود پڑے، انہیں اطلاع ملی کہ شاہ جہاں پور کے قریب ایک مسلمان زمین دار راجپوت مرتد ہوا چاہتا ہے، یہ سننا تھا کہ بے قرار ہو گئے، پہلے سیدھے دارالعلوم میں تشریف لائے اور طلبہ کے مجمع میں تقریر شروع کی، تقریر کے شروع میں سورہ نعرہ کو تعوذ اور بسم اللہ کے بغیر یوں پڑھا، اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَخْرُجُونَ“ مِنْ دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا، پھر فرمایا، عزیزو! تم نے خیال کیا ہوگا کہ میں نے آیت غلط پڑھی، ایک دن تھا کہ جب لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہوتے تھے لیکن آج وہ دن ہے کہ لوگ جوق جوق اسلام سے نکلے جاتے ہیں، پھر مسلمانوں کی بے پروائی سے اس فتنہ کے جو نتائج نکلیں گے، ان کا ہولناک منظر کھینچا اور طلبہ کو تبلیغ کے سپاہی بننے کی ترغیب دی۔

۱۔ یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہشتم، ص ۳ پر چھپا ہے۔

مولانا نے اس واقعہ کا ذکر ۱۹۱۲ء کے اجلاسِ لکھنؤ میں خود کیا ہے، فرماتے ہیں ”حضرات! میرے اوپر ابتدا اس اثر کی یوں ہے کہ دو سال ہوئے کہ شاہ جہاں پور سے ایک خط میرے پاس سفید خاں سوداگر کا آیا کہ شاہ جہاں پور سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں ہے، جمال پور، وہاں کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں، آری وہاں پہنچ گئے ہیں، ان کو ہندو کرنا چاہتے ہیں، آپ جلد آئیے اور مدد کیجیے، انہوں نے اس کے ساتھ ہی دہلی کی انجمن ہدایت الاسلام کے مولانا عبدالحق تھانی کو لکھا تھا، وہ وہاں سے تشریف لائے تھے اور میں ندوہ سے گیا، جس وقت میں یہاں سے چلا ہوں، میری جو حالت تھی، یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے، کہ میں نے اس وقت کوئی گالی نہیں اٹھا رکھی تھی جو میں نے ان ندوہ والوں کو نہ سنائی ہوگی کہ اے بے حیاؤ اور اے کم بہتو! ڈوب مرو، یہ واقعات پیش آئیں ہیں، ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڑھ کو بھی پھونک دو، یہی الفاظ میں نے اس وقت کہے تھے اور آج بھی کہتا ہوں، اس وقت نہایت افسوس میں یہاں سے گیا تھا، وہاں جا کر میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے، لوگوں نے یہ بیان کیا کہ آریہ اس گاؤں میں آئے ہوئے ہیں اور وہ گاؤں کے نو مسلم راج پوتوں کو ہندو بنانا چاہتے ہیں، مسلمان علما کو بلوایا ہے، جمال پور سے ایک کوس پر خیمہ کھڑا کیا گیا ہے، تین سو روپے کھانے میں صرف ہوئے ہیں، چندہ وغیرہ کیا گیا ہے، وہ نو مسلم بے چارے یہ کہتے تھے کہ مناظرہ ہم جانتے نہیں، پڑھے لکھے نہیں، آپ ہمارے اس گاؤں میں آئیے اور یہاں آ کر ہم کو سمجھائیے، جو باتیں ہمارے دل میں ہوں گی، ہم آپ سے کہیں گے، آپ ان کا جواب دیجئے، پھر جو کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے اس میں ذرا بھی غلط نہیں کہتا ہوں، اس کے شاہد سید وزیر حسن صاحب وکیل شاہ جہاں پور ہیں وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں“ اس پر ایک شخص بھی راضی نہ ہوا کہ گاؤں میں جائیے، اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ لوگ خدا نخواستہ فوج داری کریں گے، یا ماریں گے، کیوں کہ پولیس اور تحصیلدار وہاں موجود تھے کہ امن وامان قائم رہے۔

میں نے بالآخر یہ کہا کہ بھائیو! مجھے تو پاکلی میں ڈال کر وہاں لے چلو، میں چتا ہوں لیکن کوئی شخص نہیں لے گیا، غرض تین دن تک میں وہاں پڑا رہا، بالآخر ان لوگوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں۔

”کیا یہ واقعات آپ کے کانوں میں پڑتے ہیں، اگر نہیں پڑتے تو آپ کی بے خبری کی داد دینی چاہیے اور اگر پڑتے ہیں تو آپ کا دل جل نہیں جاتا؟ پھٹک نہیں جاتا؟ کڑھ نہیں جاتا، اس سے زیادہ کیا بے حیستی ہوگی؟ کیا یہ باتیں ایسی ہیں کہ جن سے چشم پوشی کی جائے؟“

مولانا بنگامی دورہ، مناظرہ اور تقریر وغیرہ کی ان عارضی تدبیروں کو جو اس وقت کی اسلامی انجمنیں اختیار کر رہی تھیں، حفاظت اسلام کی مستقل تدبیر نہیں خیال فرماتے تھے، ان کے نزدیک صحیح صورت یہ تھی کہ ان آریوں کے مقابلہ کے لیے ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علما کا گروہ پیدا کیا جائے جو بھاشا میں بات کر سکے اور سنسکرت کی تھوڑی واقفیت رکھے، یہ لوگ دیہاتوں میں جا کر پھیل جائیں اور ان اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی مرکز قائم کر لیں، آریوں کے گروکل کے مقابلہ کے لیے اپنے یہاں بھی اسی قسم کی ایک تربیت گاہ کو وہ ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی کی تقریر میں انہوں نے اپنے اس خیال کی تفصیل کی ہے، ندوہ کا ایک دوسرا فرض اشاعت اسلام ہے، یہ مقصد اگرچہ مدت سے ندوہ کے مقاصد میں شامل کیا گیا تھا اور اس کا ابتدائی دستور العمل مرتب ہو گیا تھا لیکن ندوہ نے قصداً اس کام کو نہیں شروع کیا اور مجھ کو تفصیل سے بتانا چاہیے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟

اشاعت اسلام کی ضرورت آج کل درحقیقت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ آریوں نے تمام ملک

میں اپنے سفیر اور واعظ پھیلا دیے ہیں اور انہوں نے جاہل اور نو مسلم مسلمانوں پر مختلف تدبیروں سے اپنا اثر پھیلاتا شروع کر دیا ہے، یہ حالت نہایت اندیشناک ہے اور خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو ہر جگہ اس خطرہ کا احساس ہو گیا ہے اور جاہل اس کی مدافعت کے لیے انجمنیں اور مجلسیں قائم ہو گئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، لیکن ہم کو نہایت غور و فکر سے دیکھنا چاہیے کہ جو کوششیں کی جا رہی ہیں، یہ کافی ہیں یا نہیں، آریوں نے جن اسباب سے اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کی ہے اور کرتے جاتے ہیں وہ وہ چیزیں ہیں۔

۱- ایثار نفس، یعنی ان کے داعظ نہایت ایثار نفسی، نہایت جاہل شاری، نہایت جفاکشی کے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں، ان کا داعظ جو اچھے سے اچھا تعلیم یافتہ ہوتا ہے، نہایت فقیرانہ زندگی کے ساتھ ایک ایک گاؤں میں پھرتا ہے، چنے چبا کر بسر کر لیتا ہے، راتوں کو درخت کے نیچے سو رہتا ہے، ابوؤں کی لپٹ میں سفر کرتا ہے۔

۲- دیہات اور قصبات میں پیہم اور لگاتار کوشش جاری رکھنا۔

اس کے مقابلہ میں ہمارے علماء صرف شہروں پر اکتفا کرتے ہیں اور دیہات میں جاتے بھی ہیں تو ایک آدھ دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتے، اس لیے وہ کوئی پائیدار اثر قائم نہیں کر سکتے۔

۳- آریہ داعظ اکثر انگریزی تعلیم یافتہ اور جدید علوم و فنون سے واقف ہوتے ہیں اور

ہمارے واعظ اکثر ان علوم سے واقف نہیں ہوتے۔

۴- آریوں نے اپنے مذہب کا مدار صرف وید پر رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ وید کے معنی جو عام پنڈت بیان کرتے ہیں، وہ صحیح نہیں، بلکہ وہ صحیح ہیں جو سوامی دیانند نے بیان کیے ہیں اور چون کہ مسلمان (ایک آدھ کے سوا) سنسکرت سے واقف نہیں، اس لیے وید کی صحت و غلطی کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

اسباب مذکورہ بالا کے لحاظ سے آریوں کے مقابلہ کے لیے اسباب ذیل کی ضرورت ہے:

۱- ایسے لوگ پیدا کیے جائیں جن میں ایثار نفسی، سادگی، جفاکشی اور جاں نثاری کے اوصاف ہوں۔
۲- اشاعت اسلام کا مستقل صیغہ قائم کیا جائے، تاکہ اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں، مستقل واعظ مقرر کیے جائیں جو نو مسلم دیہات میں جا کر ایک ایک دو دو مہینے رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں۔

۳- عربی خوانوں کے سنسکرت اور انگریزی کی اعلا درجہ تک تعلیم دی جائے۔

۴- اسی بنا پر ندوہ نے دارالعلوم میں انگریزی اور سنسکرت کی شاخیں کھولیں اور اشاعت اسلام کے مستقل صیغہ کے قائم کرنے کا انتظام کیا، جس کی عملی صورت چند دنوں کے بعد نمایاں ہوگی۔

ندوہ کا کام یہ ہے کہ دارالعلوم میں خاص مذہبی خدمات انجام دینے والوں کی ایک جماعت موسوم کرے، ان کو مذہبی وظائف دے، ان کو وقتاً فوقتاً ان اوصاف کے پیدا کرنے کی ترغیب دلائے، تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد ان کو ان کاموں میں لگائے، یہ تدبیریں ندوہ نے پیش نظر رکھ لی ہیں اور ان کو عمل میں لانا شروع کر دیا ہے، خدا اس کی کوششوں میں کامیابی دے۔

مولانا نے اپنے اسی خیال کے مطابق دارالعلوم میں بھاشا کی تعلیم کا ایک درجہ کھولا اور خدام الدین کے نام سے دارالعلوم کے طلبہ کا ایک گروہ الگ کیا، ۲۷ مارچ ۱۹۱۰ء میں دلی کے اجلاس میں جب ندوہ ہی کو مرکزی مذہبی مجلس بنانے کی تجویز اور اشاعت اسلام کی تحریک منظور ہوگئی تو پھر پوری طاقت سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، ملک کے اکابر کو اشاعت و حفاظت اسلام کی تدابیر کی طرف مائل کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، نو مسلموں کے حالات کی تفتیش و تحقیق کے لیے ایک انسپکٹور متعین کیا، وقف اولاد کے کام کرنے والے سفیروں کو حکم دیا کہ وہ اشاعت و حفاظت کے کام کو بھی اپنی نظر میں رکھیں، عام مجلس اشاعت اسلام کے قیام کی تجویز پیش کی اور ضروری مقامات پر خود اپنے دورہ کا ایک پروگرام بنایا، یہ زمانہ کسی جون کی سخت گرمیوں کا تھا

اور مولانا ایک مہینہ سے پیش میں مبتلا تھے، اس کے باوجود شاہ جہاں پور اور رائے بریلی وغیرہ مقامات پر گئے، ۱۵ مئی ۱۹۱۰ء کو شروانی صاحب کے نام لکھتے ہیں ”اشاعت اسلام کے لیے مجھ کو ایک بار دورہ کرنا ہے، میں ایک مہینہ سے پیش میں مبتلا ہوں..... اسی حالت میں رائے بریلی گیا اور وہاں جلسہ کر کے اس کی بنیاد ڈالی، چھیننا پڑنے پر عام دورہ شروع ہو جائے گا بڑی دقت یہ ہے کہ دیہات میں جا کر تلقین اسلام کرنے والے واعظ نہیں ملتے، اس کا کیا علاج ہوگا؟ اشاعت اسلام کی کارروائی تمام تر اس پر موقوف ہے۔ (شروانی-۸۱) ۱۲ جون ۱۹۱۰ء کو پھر انہیں لکھا ”اشاعت اسلام کی بنیاد دو کاموں پر ہے، تقرر و اعطاء، آمدنی مشاہرہ و اعطاء، واعظ حسب خواہش و ضرورت نہیں ملتے اور لیس تو کئی سو ماہوار کی آمدنی چاہیے، انہی دونوں باتوں کے متعلق میں نے یادداشت کے لیے لکھا تھا اس پر مکرر غور فرمائیے اور اپنی رائے قلمبند کر کے دیجیے کہ ”کیوں کر“ اور کس طریقہ سے یہ دونوں باتیں حاصل ہوں گی۔“ (شروانی-۸۲)

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا شروانی صاحب نے اس کا جواب کیا دیا، مگر مولانا نے اس تجویز کا جو حل سوچا وہ یہ تھا کہ ائمہ اور مؤذنین کی تعلیم کے لیے اردو کا برس دو برس کا کوئی کورس بنایا جائے اور اردو خواں جوانوں کو قرآن پاک کے ساتھ اردو میں مسائل و عقائد کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں میں مسجدوں میں پھیلا دیا جائے کہ یہ مسجدوں میں بچوں کی تعلیم کے لیے اپنے مکتب کھول لیں اور لوگوں کو اسلام کی تلقین کریں، مگر سرمایہ کے نہ ہونے سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔

حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے جاتے تھے، ۲۷ فروری ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی کو لکھا ”نومسلموں کے متعلق نہایت کثرت سے خطوط آئے کہ اکثر جگہ مسجدوں کو گو بر سے لپیٹتے ہیں، نماز کا ذکر نہیں، میں نے انسپکٹر روانہ کر دیا ہے“ (۹۷) اور ادھر مولانا نے مختلف کام شروع کر دیے تھے، وقف اولاد کی تحریک پورے شباب پر تھی، اس کے کام کا سارا بوجھ اکیلے مولانا کے کندھوں پر تھا، تصحیح اغلاط کے کام کی نگرانی سیرت نبوی ﷺ کی تصنیف کا خیال جس کو خود اشاعت اسلام نے پیدا کیا تھا، خدام الدین کی تربیت، اشاعت اسلام کے لیے دورے، جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کی تردید، اردو ورینکلر اسکیم کی مخالفت سید رضا مصری کی آمد کی تیاری اور لکھنؤ میں ندوہ کے آئینہ جلسہ کی تدبیر لیکن اس زمانہ میں ان سب میں اشاعت اسلام ہی کا خیال تھا، جو ہر طرح سے ان پر چھایا ہوا تھا اور اسی کے لیے یہ سب کچھ تھا، ندوہ کے اجلاس دہلی نے ندوہ میں اشاعت و حفاظت کا کام تو منظور کر دیا، مگر یہ طے نہ کیا

کہ کام کون کرے، ندوہ کی مجلس اشاعت کے سکریٹری مولانا شاہ سلیمان صاحب تھے، مولانا ان کے اختیارات میں دخل دینا نہیں چاہتے تھے اور دخل دیے بغیر کام نہیں چلتا تھا، یہ ادھیڑ بن الگ تھا، ۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو اپنے محرم اسرار مولانا شروانی کو لکھتے ہیں ”سیرۃ نبوی ﷺ کا کام واقعی بڑے پھیلاؤ کا ہے، ادھر اشاعت اسلام کی یہ حالت ہے کہ بیسیوں خطوط اور رپورٹیں آرہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں نو مسلم ارتداد کے خطرہ میں ہیں، آریوں کی مقامی کمیٹیاں جا بجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، کہاں کہاں واعظ مقرر کیے جائیں، کہاں کہاں کتب قائم ہوں، یہ تو سلطنت کا کام ہے۔“ آج ایک اپیل بھیجتا ہوں، کاغذات جلسہ (مجوزہ اجلاس لکھنؤ) میں پیش کروں گا، کلکتہ میں ایک انجمن سے کام لیا اور نواب ڈھا کہ کو راضی کیا کہ وہ انجمن اشاعت اسلام کے پریسیڈنٹ ہوں، لطف یہ ہے کہ ادھر شاہ سلیمان صاحب نہ کچھ کرتے ہیں نہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں کہ ”میں باقاعدہ کام کروں، مجبور ہو کر ندوہ کے دائرہ سے نکل کر کام کرنا پڑے گا۔“ (شروانی-۹۷)

مولانا نے اس تجویز پر ۱۹۱۲ء کے آغاز سال ہی میں عمل شروع کر دیا تھا، یعنی ندوہ کے دائرہ سے الگ ہو کر ایک عام مجلس اشاعت و حفاظت کی بنیاد ڈالی اور خاک سار کو اس مجلس کا شریک ناظم بنا کر ہر قسم کی دفتری کارروائیوں کی ذمہ داری عنایت فرمائی، سفر و حضر دونوں میں برابر کام کے متعلق ہدایات کرتے رہتے، جنوری ۱۹۱۲ء میں نو مسلموں کی مردم شماری اور ان کی موجودہ کیفیت کی ایک رپورٹ تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس بنا پر نو مسلموں کی مردم شماری یعنی ان کی کہاں کہاں آبادیاں ہیں اور جہاں ان کی آبادی ہے، اس کی تعداد کیا ہے؟ اور ان کی موجودہ حالت کیا ہے؟ ان تمام معلومات کو حاصل کرنے کے لیے اخبارات میں ایک اطلاع بھیجی گئی، ۲۸ جنوری ۱۹۱۲ء کو مجھے لکھتے ہیں ”نوٹس مردم شماری نو مسلمان ”زمین دار“ میں ضرور بھیجنا اور اخباروں میں تو میں نے دیکھا۔“ (سلیمان-۳۵)

۱۳ فروری ۱۹۱۲ء کو ایک رجسٹر پر اپنے ہاتھ سے حسب ذیل نقشہ بنایا جس کی خانہ پری

مطلوب تھی۔

نمبر شمار	نام، مقام، معد پرگنہ و تحصیل و ضلع	نام قوم و مردم شماری و پیشہ	وضع و لباس و رسم	کس بنا پر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں؟	کوئی مسجد یا مدرسہ ہے؟	کیا گوشت کھاتے ہیں؟ ذبح کیا مسجد یا مدرسہ کی تعمیر پر راغب ہو سکتے ہیں؟	قرآن شریف وہاں موجود ہیں یا نہیں؟ قرآن کے ساتھ ان کی تعظیم و تکریم کیسی ہے؟	کون سی بات اسلام کی ان میں پائی جاتی ہے؟ اور ان کو کیوں کر اسلام کے احکام کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے؟

اس نقشہ کو لے کر سفرانے بدایوں، بیاور، اجیر، بے پور، جودھ پور، کشن گڑھ، الور، باندی کوئی اور ریواڑی وغیرہ کے قصابات اور دیہات میں دورہ کیا اور مطلوبہ مواد فراہم کیا، جو اس وقت تک دارالمصنفین میں موجود ہے، حسن شاہ صاحب جو ایک سادہ مزاج متدین اور متقی بزرگ تھے وہ مقرر کیے گئے کہ دیہاتوں میں جا کر نو مسلمان میں احکام اسلام کی تلقین کریں، ان کو ایک رجسٹر بنا کر دیا، جس میں اپنے قلم سے حسب ذیل مدیں لکھیں:

تاریخ و وقت روانگی	مدت سفر	جائے قیام	مقام تحقیقات	تعداد مردم شماری	مختصر تحقیقات
ذریعہ سفر				دو تیس دپیشہ	و کیفیت

ایک علاحدہ اشتہار اور خطوط کے مسودے لکھے اور مجھے حکم دیا کہ ان کو چھپوا کر ملک کے اہل الرائے کی خدمت میں بھیجوں اور ان سے اعانت اور ہمدردی کی خواہش کروں، چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور اعلانات و اشتہارات اور خطوط روانہ کیے گئے، یکم مارچ ۱۹۱۲ء کو وہ آباد ہو کر وقف اولاد کے سلسلہ میں کلکتہ جا رہے تھے، اس لیے میرے لیے حسب ذیل ہدایات لکھیں ”میں نے نو مسلمانوں کی ایک مسل بنوائی ہے، کاتب سے لے کر ان لوگوں کے نام اور ایڈریس لکھ لو، جن لوگوں نے نو مسلمانوں کے متعلق خطوط بھیجے ہیں، نو مسلمانوں کے متعلق ایک اپیل جلی خط میں عبدالوہاب صاحب کے یہاں چھپوایا ہے لیکن ابھی ان ہی کے یہاں ہے، وہ منگوا کر ان اشخاص کے نام ایک ایک دو دو پرچے بھیج دو، ایک خط کا مسودہ کاتب کو دے آیا ہوں، ہر اپیل کے ساتھ وہ خط بھی بھیج دو۔“

(۲) اپیل مذکورہ بالا کی سوکاپیاں میرے پاس اس پتہ سے بھیج دو، شبلی مگلاؤڈ اسٹریٹ نمبر

۱۳ کلکتہ۔“ (سلیمان-۳۷)

اوپر کی سطروں میں جس اپیل کا ذکر ہے اس کا عنوان ہے، ”نو مسلمانوں کو دوبارہ ہندو ہوجانے سے بچانے کے لیے تمام برادران اسلام کی خدمت میں فریاد“ یہ اپیل اخبارات میں چھپا (اور اب سلسلہ مقالات جلد ششم میں شامل ہے) اس میں مولانا نے حسب ذیل تدابیر کا ذکر کیا تھا:

(۱) اس قسم کے واعظ مقرر کیے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔

۱۔ مالک اصح المطالع محمود دگر، کھنؤ۔

(۲) دودو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کیے جائیں، جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے۔

(۳) صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں، جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے۔

(۴) مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں، اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوئے ہیں اور اس لیے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں ہو سکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور و فکر اور جدوجہد سے حل کرنا چاہیے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پروا نہیں کرتے تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہیے۔“

حفاظت و اشاعت اسلام کے عنوان سے ایک مجلس کی بنیاد کی تجویز پیش کی اور اس کا ایک مختصر خاکہ تیار کیا جو مقالات میں شامل ہے۔

۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ پہنچ کر لکھا کہ ”یہاں دو تین روزہ کراشاعت کا کام شروع کر دیتا ہوں“ (سلمان-۳۸) یہاں ایک انجمن کو یہ کام سپرد کیا اور جناب نواب خواجہ سلیم اللہ صاحب نواب ڈھا کہہ کر جوان دنوں بنگال کے مسلم لیڈر تھے، اس بات پر راضی کیا کہ وہ مجوزہ مجلس اشاعت اسلام کی صدارت قبول کریں، (شروانی-۹۷) اجلاس لکھنؤ کے بعد جو شروع اپریل میں ہو رہا تھا، وہ ملک میں دورہ پر آمادہ ہو رہے تھے، ۱۸ مارچ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا ”ہاں! کام بہت ہیں لیکن میں اشاعت کے کام کو سب پر مقدم رکھوں گا، قطعی طور سے معلوم ہوا کہ راج پوت خاندان مرتد ہوتے جاتے ہیں، آریوں کی مقامی انجمنیں چپکے چپکے کام کر رہی ہیں، ذرا دقت یہ ہے کہ جلسہ کے بعد ہی میرا دورہ شروع ہونا چاہیے، لیکن موسم ناقابل برداشت شروع ہو جائے گا، اس لیے دو مہینوں کا وقفہ ہو جائے گا، جو مضر ہوگا۔ (شروانی-۹۹)

جو خطوط اور اپیل لوگوں کو بھیجے گئے تھے، ان کے حوصلہ افزا جوابات آئے، ۲۴ مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھا ”جلسہ انشاء اللہ نہ صرف بارونق بلکہ مہمات امور کے اجرا کا پیش خیمہ ہوگا، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ تین روز پہلے آجائیں، اشاعت اسلام کا بہت اچھا اثر ملک میں پھیل رہا ہے، لوگ خط و کتابت کر رہے ہیں، صرف اتنی بات ہے کہ شاہ صاحب وغیرہ اس کام کو کرنے دیں، یہ اس وقت ہوگا کہ آپ آجائیں، آپ کا توسط سب مشکلات کو حل کر دے گا۔“

چنانچہ مولانا شروانی تشریف لائے اور مولانا کی دعوت پر بہت سے اہل الرائے حضرات

مکاتب قائم کیے جائیں، پانچ چھ، سات گاؤں کا ایک حلقہ قرار دے کر ایک صدر مقام جہاں سے آدھ آدھ کوس کے فاصلہ پر دیہات ہوں وہاں ایک بڑا کتب ہو جس میں نہ آپ کا یہ فلسفہ یونانی ہو اور نہ انگریزی کا ایک لفظ ہو، بلکہ صرف قرآن شریف کا متن اور اردو اتنی کہ جس سے بعض مسائل عبادت نماز روزہ اور وہ بھی نہایت آسان آسان ان کو پڑھائے جائیں اور زور دے کر فرمایا کہ اردو میں نہیں بلکہ یہ رسائل ناگری ہی میں چھپوائے جائیں، تاکہ آسانی سے وہ اس کو سیکھ کر پڑھ سکیں۔

دوسری تدبیر یہ بیان کی کہ ایسے معمولی خواندہ مسلمانوں کو جو اردو پڑھ لیتے ہوں، ان کے لیے ایک ٹریننگ کلاس ندوہ یا الہیات کان پور میں کھول دیا جائے اور ان کو وظیفہ دے کر ایک سال وہاں پڑھایا جائے، اس کے بعد ان کو ان دیہاتوں میں تعلیم و تلقین کے لیے بھیجا دیا جائے کہ دو دو تین تین مہینے ایک گاؤں میں رہ کر مسلمانوں کو مسلمان بنائیں، آخر میں فرمایا ”میں فوری جوش کا قائل نہیں، آپ گھروں پر جا کر غور کریں اور سوچیں اور اس کے بعد اپنے دل میں اشرپائیں تو اسلام کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں۔“

مولانا کی یہ تقریر بڑی پر اثر تھی، ندوہ کی روداد کے یہ الفاظ ہیں:

مولانا ممدوح کی یہ تقریر جس کا لفظ لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا، حاضرین کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اور ان کی اندرونی تاثیر کو امداد کی صورت میں ظاہر کر رہی تھی۔

دن کو یہ تقریر ہوئی اور ساتھ خواجہ کمال الدین صاحب لاہوری اور مولوی ابوالکمال عبدالودود صاحب بریلوی کی تائیدی تقریریں بھی ہوئیں، اس کے بعد رات کے جلسہ میں جب ان تقریروں کی تاثیر کی جستجو کی گئی تو ڈیڑھ سو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اپنے نام لکھائے، جو اس کام میں ہر طرح کی امداد کے لیے آمادہ تھے۔

مولانا یہ چاہتے تھے کہ اشاعت کے کام تمام فرقے مل کر کریں، اسی لیے مرزا بشیر الدین محمود جو اب خلیفہ قادیان ہیں اور خواجہ کمال الدین صاحب تک کی شرکت سے انکار نہیں کیا گیا، اس پر اسی جلسہ کے دوران میں مولانا پر یہ الزام رکھا گیا کہ انہوں نے قادیانیوں کو جلسہ میں کیوں شریک کیا اور ان کو تقریر کی اجازت کیوں دی، مگر مولانا شروانی کی ثالثی سے یہ بلا ٹلی، جلسہ کے بعد ہی اضلاع کے دورہ کا خیال تھا، اس کا آغاز کان پور سے کیا، ۱۷ اپریل ۱۹۱۲ء کو وہ کان پور روانہ ہوئے، منشی محمد امین کو لکھتے ہیں، میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں، نو مسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں، وہ سخت خطرناک درجہ

تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی اجتماعیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے، چونکہ گرمی خفت ہو رہی ہے، اس لیے یہ دورہ مختصر ہوگا۔ (۱۷-۷)

مئی ۱۹۱۲ء میں گرمیوں کے ڈر اور سیرت کے خیال سے یکسوئی اور تنہائی کی تلاش میں بمبئی روانہ ہو گئے اور مجھے سیرت کے کام کے سلسلہ میں رفاقت کا شرف بخشا۔ (۱۷-۹-۱۰) تین چار مہینے وہاں رہے اور سیرت کی پہلی جلد تعمیر کعبہ تک ختم کی، مجھے یہ ہدایت ہوئی کہ ابن اسحاق، ابن سعد اور طبری کے رجال چھانٹ کر الگ کروں، چونکہ عام طور سے ان کے رجال نہیں ملتے اس لیے بڑی دقت سے میں نے رجال ابن اسحاق، رجال ابن سعد اور رجال طبری پر الگ الگ رسالے پیش کیے۔ (شروانی-۲۰)

برسات کے بعد بمبئی سے واپسی ہوئی، مجھے ارشاد ہوا کہ میں بمبئی سے بی بی سی آئی ریوے سے گجرات اور بڑودہ وغیرہ کا دورہ کر کے مسلمانوں کی عام ذہنی کیفیت کا اندازہ کروں، چنانچہ اس پر وگرام کے مطابق گجرات، بڑودہ اور اجیر تک کا سفر کیا اور وہاں کے اکابر سے مل کر اشاعت و حفاظت اسلام کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا اور آخر آگرہ ہو کر لکھنؤ پہنچا، واپسی کے بعد مولانا نے یہ طے کیا کہ وہ اشاعت کا کام ندوہ سے بالکل الگ ہو کر کریں، مجھ سے فرمایا کہ جن لوگوں نے جلسہ سالانہ میں امداد کا وعدہ کیا تھا اور دوسرے ہمدرد حضرات کے نام ایک مطبوعہ خط بھیجوں اور ان سے مجلس اشاعت و حفاظت اسلام کی رکنیت کی خواہش کروں اور ہر رکن سے دو روپیے سال کے چندہ کا وعدہ لوں، اس تجویز کے مطابق میں نے پانچ سو اصحاب کے نام یہ خطوط بھیجے اور ان کے جوابات آئے۔

۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء کو مجھے الہ آباد سے لکھتے ہیں ”اشاعت کے جوابات آرہے ہیں، میری دانست میں خط ملفوف اور اس کے ساتھ مطبوعہ کاغذات کے پمفلٹ بھیجیو، چند لوگوں نے استحسان اور ممبری قبول کی ہے۔“ بہار دیا و رقم ممبری“

لکھنؤ کے پچھلے اجلاس میں اردو خواں معلموں کی جو تجویز پیش کی تھی، اس سلسلہ میں فرمایا ”دس روپیے ماہ وار پر مسلم گزٹ میں ایسے ابتدائی معلموں کے لیے اشتہار دے دو جو دیہات میں جا کر اردو کی ابتدائی کتابیں اور قرآن مجید پڑھا سکیں۔“

میں نے چاہا کہ صیغہ اشاعت اسلام الگ قائم کر کے اس کی طرف سے اعلان ہو، مولانا نے اس کو ابھی پسند نہیں کیا، فرمایا ”صیغہ اشاعت اسلام کے نام کی ابھی ضرورت نہیں، آریہ بھڑکیس گے،

صرف میرا نام لکھ دو۔“ (سلیمان-۳۹)

میں نے پھر اپنے خیالات لکھ بیچھے اور عرض کی کہ اشاعت و حفاظت کے کام کو بڑے پیمانہ پر شروع کرنا چاہیے اور اسی کے مطابق ایک یادداشت لکھ کر الہ آباد بھیجی، ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو جواب آیا، خط پہنچا، آپ کے پروگرام کے ابتدائی حصہ سے میں سردست متفق نہیں، اسی لیے پہلے پروگرام کو آپ کی رایوں کے انضمام کے ساتھ بھیجتا ہوں، بڑے بڑے امرا ابھی شریک نہیں ہوں گے، بلکہ ایسے بڑے پروگرام سے بھڑکیں گے، ان سے استفسار کرنا اور نام کام یاب ہونا دل شکستہ کر دے گا، اس لیے ابھی بہت اونچا نہ دیکھیے، اگر مارچ میں اس کا کہیں اجلاس ہوتا تو رستہ نکلتا، غلام حسین عارف کو خاص طرح پر لکھنا چاہیے، شاید کلکتہ میں انتظام ہو سکے۔“

میں نے عرض کیا تھا کہ اشاعت و حفاظت کا کام اگر آپ کے بہ جائے اور ممبروں کے نام سے چلایا جائے تو شاید دوسرے ارکان کے رشک و حسد کی آگ نہ بھڑکے اور کام چل نکلے، اس پر اسی خط میں لکھا، ”لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام کی تکرار سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس کے چھپے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرائض آنکھ سے دیکھتا ہوں اور زبان سے ہر وقت ہائے ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق ”الہلال“ میں خط تک چھپو دیا، جب کوئی نہ کرے تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور افسری کا شوق نہیں، کوئی کرے، اس کے ساتھ ہوں اور بیرو بن سکتا ہوں۔“ (سلیمان-۴۰)

اشاعت فنڈ میں روپیہ نہ تھا، اس لیے اجازت دی کہ جمعہ فنڈ سے قرض لے کر کام شروع کروں، پھر لکھا، ”کلکتہ، پٹنہ، رام پور، میں اشاعت کے کاغذات کیا کم گئے؟ پرنس ارکاٹ کو انگریزی خط لکھوا کر اس کے ساتھ کاغذات بھیجو، غلام احمد خاں کو خاص طور پر لکھو، خود اپنے دستخط سے بھیجو اور جوائنٹ سکریٹری اشاعت اپنا نام لکھو..... اشاعت اسلام کو تھک و اصلاح کے بعد بھیجتا ہوں، دو ہزار یا زیادہ چھپوا لو اور بڑا خط بھی۔“

پانچ سو کے انداز میں یہ کاغذات ملک کے اکابر کے نام بھیجے گئے، مگر ۶ فروری ۱۹۱۳ء تک صرف بیس پیچس اصحاب کے جواب آئے، یہ صورت دیکھ کر مولانا نے مجھے لکھا ”برادر م! دیکھا پانچ سو اشتہارات اور کل پیچس جواب، ان ہی باتوں کو میں دیکھ رہا تھا، خیر اب تو پیچھے ہٹنا نہیں ہے، زنبہار اس رسید ہی سے کام نہ لو (ندوہ کی پرانی چھپی ہوئی رسیدوں سے) ورنہ شاہ سلیمان اور مولوی خلیل الرحمن

صاحب فوراً آکر ہاتھ پکڑیں گے اور کچھ کرنے نہ دیں گے، ندوہ سے بالکل آزرہر ہنا چاہیے، ایک موتمر دینی عمومی کا مسودہ لکھ کر چھپنے کو دے دیا جائے، وہ اصل اسکیم ہے، جس پر چلنا چاہیے، آجائے تو بھیج دوں، آج جن لوگوں کے جواب قبول مہبری کے آئے ہیں، حسب ذیل ہیں:

اس تجویز پر عمل کا وقت آیا ہی تھا کہ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا قضیہ نامرضیہ پیش آیا، خاک سار دل برداشتہ ہو کر وطن چلا آیا اور وہاں سے ”الہلال“ کلکتہ کے اسٹاف میں شامل ہو گیا اور مولانا بیمار اور پرانگندہ خاطر ہو کر مولوی عبدالسلام صاحب اور سیرت کو لے کر بمبئی روانہ ہو گئے اور دو چار ماہ کے غور و فکر کے بعد جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے مستعفی ہو کر سبک دوش ہو گئے اور کام کی ساری تجویزیں درہم ہو کر رہ گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خدا م الدین ۱۹۱۲ء | مولانا نے اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تو ان کو نظر آیا کہ جب تک مبلغین اسلام کی ایک ایسی جماعت نہ تیار کی جائے جو مذہبی تعلیم کے ساتھ سادہ مذہبی زندگی بسر کرے، اس میں ایثار، قناعت اور جفا کشی کا مادہ ہو، اس وقت آریوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، اس وقت آریہ مبلغوں کا سب سے بڑا مرکز گروکل تھا، گروکل کے حالات اخباروں میں پڑھ کر اور جانے والوں سے زبانی سن کر وہ بہت بے تاب تھے کہ اس کے مقابلہ کے لیے ایک جماعت مسلمانوں میں بھی ہو۔

اعظم گڑھ کے ضلع میں ایک قصبہ سرائے میر ہے، مولانا کی برادری کے لوگوں نے عربی کا ایک مدرسہ بنایا قائم کیا تھا جس میں زیادہ تر اسی ضلع کے دیہاتی لڑکے عربی تعلیم حاصل کر رہے تھے، چون کہ یہ مدرسہ بالکل مولانا کے زیر اثر تھا اور ان دیہاتی بچوں میں نہایت آسانی کے ساتھ یہ تمام اوصاف پیدا کیے جاسکتے تھے، یعنی یہ کہ وہ سادہ زندگی بسر کریں اور مسلمانوں کے دیہاتوں میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ سفر کریں اور تبلیغ کا کام انجام دیں، اس لیے مولانا نے اس مقصد کے لیے اس مدرسہ کو خاص طور پر پیش نظر رکھا، چنانچہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۰ء کو مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے۔“ اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔ (حمید-۵)

مدرسہ سرائے میر کی نسبت تو ابھی خیال ہی تھا کہ مولانا نے خود دارالعلوم میں ایک جماعت

کی بنیاد ڈال دی اور اس کا نام خدام الدین رکھا جو طلبہ اس کام کے لیے تیار ہوئے تھے، ان کے والدین کو لکھ کر ان کی رضامندی منگوائی، پھر طلبہ کو اس میں داخل کیا، ان کے لیے سادہ کھانا، سادہ پہننا، سادہ رہنا، زمین پر سونا، احکام اسلام کی پوری پابندی اور تقویٰ اور قناعت ان کی زندگی کا اصول بنایا گیا، اس زمانہ میں خود مولانا پر بھی یہی اثر تھا اور یہ اخیر زندگی تک رہا۔

مولوی حمید الدین صاحب کو ۸ فروری ۱۹۱۲ء کو یہ خوشخبری سناتے ہیں، انہیں نے خدا کا نام لے کر خدام الدین کی جماعت قائم کر دی، الگ مکان لے دیا ہے اور الگ تربیت ہے، قریباً ایک ماہ ہوا اب تک امید افزا آثار ہیں، احکام اسلام کی پابندی میں شغف اور مستعدی پائی جاتی ہے، ابھی تک سات لڑکے عہد و پیمان کے ساتھ خود اپنی مرضی سے داخل ہوئے ہیں، یہ دیہات وغیرہ میں اشاعت اسلام کے کام بھی آئیں گے اور جو کام ان کو بتایا جائے گا۔“ (حمید-۵۵)

ان سات طالب علموں میں سے ایک طالب علم مولوی عبدالرحمن نگرامی مرحوم تھے، انہوں واقعہ یہ ہے کہ بچپن میں مولانا کے ہاتھ پر جو عہد کیا تھا اس کو اخیر تک نباہا، افسوس ہے کہ جوانی ہی میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، اگر وہ زندہ ہوتے تو مولانا کے حسن انتخاب کا زندہ پیکر ہوتے۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے الگ ہونے کے بعد جب مولانا نے اعظم گڑھ کو اپنا دائرہ عمل قرار دیا اور نیشنل اسکول اور مدرسہ سرائے میر میں سے پہلے کو تمام قوم کی دینی اور دوسرے کو دینی تعلیم کا مرکز بنانا اور اسی میں اس خدام دین کی جماعت کا انتظام کرنا چاہا، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھا ”مدرسہ اپنی آمدنی سے چل رہا ہے، بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڑھ پر، دونوں کے برداشت کے قابل قوم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہیے اور ان کا باہمی تعلق۔“

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گر و گل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں بوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرہ عمل بنانا چاہیے، ہم سب کو وہیں بود و باش رکھنی چاہیے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہیے، اگر تم بہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں۔“ (حمید-۶۷)

بہر حال ابھی یہ تجویز خواب و خیال میں تھی کہ مولانا نے اس کے ایک سال کے بعد آنکھیں

بندر کر لیں، مولانا کی یہ تجویز حقیقت میں بڑی اہمیت کی چیز تھی اور ان کی نکتہ رس نظر بہت دور پہنچی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی حقیقی کامیابی کے لیے خود بانی کی زندگی اور نقطہ نظر میں جو اصلی تبدیلی چاہیے تھی وہ ہنوز پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی، اس کے لیے وقت درکار تھا، اس کے لیے گروکل پر جذبہ رشک سے ہٹ کر خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے بزرگان دین اور ائمہ ہدئی کی نظیریں سامنے ڈنٹی چاہیے تھیں، مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کاموں میں جتنی کوششیں بھی فرمائیں، ان کی تہ میں یہ کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی، اگر مولانا کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو ان کے دل میں اخیر میں جو تخم پیدا ہو چکا تھا، وہ یقیناً ایک دن بار آور ہوتا۔

جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کا رد، اگست و ستمبر ۱۹۱۱ء | مصر میں شام کا ایک عیسائی مؤرخ

دادیب جرجی زیدان نام تھا جس کا رسالہ الہلال ان دنوں بہت مشہور تھا، یہ عربوں کے علوم و فنون اور اسلامی تاریخ پر مضامین اور کتابیں لکھا کرتا تھا، اس کے کئی تاریخی ناول ہیں جن میں کسی نہ کسی اسلامی عہد کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے، اس کی سب سے مشہور کتاب تمدن اسلامی کی تاریخ ہے جو اس نے عربی میں پانچ جلدوں میں لکھی ہے، یہ تاریخ تمدن اسلامی مستشرقوں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ پروفیسر مارگولیتھ (آکسفورڈ یونیورسٹی) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا (اور بعض صاحبوں نے اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا ہے۔)

مصنف چون کہ عیسائی تھا، اس لیے اس نے اپنے قلم سے اس میں اسلامی تمدن کی صورت بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر ایسے اسلوب سے اس کو دکھایا ہے کہ بہ ظاہر وہ حسن نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت اس میں کوئی نہ کوئی عیب چینی ہوتی ہے۔

جرجی زیدان سے مولانا کے پرانے تعلقات تھے، خط و کتابت تھی، الہلال میں ان کے مضمون نکلتے تھے، مگر اس کے باوجود مولانا اس کی اس کتاب کی حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کے لیے وقت کے منتظر تھے، اس اثنا میں برلن سے ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمود لیب کا خط ۱۹۰۸ء میں مولانا کے نام آیا جس میں مولانا سے اسلامی آلات پر ایک رسالہ کی نسبت سوال تھا، مولانا نے بہت دن ہوئے وہ رسالہ اڈیٹر الہلال کے پاس مصر بھیج دیا تھا، مولانا نے ان کو جرجی زیدان کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیج دیا، جس میں لکھا تھا کہ اس رسالہ کو وہ ڈاکٹر صاحب کے حوالہ کر دیں، اسی تقریب سے

مولانا نے اس خط میں جرجی زیدان کی اہلہ فریبیوں اور دسیسہ کاریوں پر بھی کچھ سطریں لکھی تھیں، ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں برلن سے ۱۱ اگست ۱۹۰۸ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں مولانا کی تائید کی تھی اور اس کی تصنیفات کا راز فاش کیا تھا، یہ خط مزید تحریک کا باعث ہوا لیکن اس وقت مولانا کو فرصت نہ تھی، اس لیے مجھے اشارہ ہوا اور میں نے ایک مختصر مضمون جرجی زیدان کی تصنیفات کی غرض و غایت اور قدر و قیمت پر لکھا، جو اکتوبر ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں شائع ہوا، پھر اگست ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں اس کی تمدن اسلامی کے اس باب کا جو کتب خانہ اسکندریہ پر ہے اور جس میں اس نے مولانا کے کتب خانہ اسکندریہ کے دلائل کار دیکھا ہے، جواب لکھا لیکن ۱۹۱۱ء میں چند واقعے ایسے پیش آئے کہ مولانا کو باوجود قلت فرصت اس کی کتاب پر مستقل طور سے ایک نہایت سخت اور مبسوط تنقید بلکہ تردید لکھنی پڑی۔

پہلا واقعہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر یوسف ہارویز کی تجویز سے اس عربی کتاب کا کچھ حصہ ہمارے صوبہ کے مولوی فاضل کے امتحان میں رکھا جانے لگا، دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ مارگولیس نے اس کتاب کا جب انگریزی میں ترجمہ کیا تو اسی زمانہ میں ٹائٹس نے ایک مضمون لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا کتب خانہ اسکندریہ کو جلانا ثابت ہے، جیسا کہ جرجی زیدان نے اس کو تمدن اسلام میں جدید دلائل سے ثابت کر دیا ہے، اس پر طرہ یہ ہوا کہ مصر کی یونیورسٹی کو جس کا نام جامعہ مصریہ تھا، اسلامی تاریخ پر لکچر دینے کے لیے ایک پروفیسر کی ضرورت ہوئی تو بعض آزاد خیالوں نے جرجی زیدان کا نام پیش کیا، یہ نام منظور ہونا ہی چاہتا تھا کہ مصر میں اس تقرر کے خلاف ایک شورش سی برپا ہوگئی، آخر اس کے بہ جائے شیخ محمد خضری مقرر ہوئے، جن کے تاریخی لکچر چھپ چکے ہیں اور اردو میں تاریخ الامت کے نام سے روشناس ہیں۔

۱۔ ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں: ”تمدن اسلام کا ضرر بہت متعدد ہوا، یہاں تک کہ ڈاکٹر ہارویز پروفیسر علی گڑھ نے اپنی تحریری رائے یونیورسٹی میں بھیجی کہ امتحانات فاضل و عالم میں وہ داخل درس کی جائے، مجھ پر اس کا سخت اثر ہوا اور میں نے سب کام چھوڑ کر اس کی دروغ بافیوں پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا، اس وقت تک میں صفحے ہو چکے ہیں، عربی میں لکھوں گا اور عربی اخبارات میں طبع کراؤں گا۔“ (ابوالکلام-۳۲) ۲۔ مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں: ”جرجی زیدان کے صرف ایک حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے، مارگولیس نے کیا ہے جو اسلام کا سخت دشمن ہے اور درحقیقت اسی انگریزی ترجمہ نے مجھ کو رد لکھنے پر آمادہ کیا۔“ (ریاض-۱۸) اس مضمون کی تمہید الندوہ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں پڑھی، جس میں اس واقعہ کا حوالہ ہے۔ ۳۔ الندوہ جنوری ۱۹۱۱ء۔

ان واقعات نے مولانا کو مجبور کیا کہ ۱۹۱۱ء کے آخر میں اس کتاب پر ایک سخت تنقید لکھیں، جس سے اس کی بے اعتباری نمایاں ہو جائے، غالباً اگست ۱۹۱۱ء سے مولانا پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہوئے، جو کئی مہینے تک جاری رہا، بیسیوں تصنیفات کے ہزار ہا صفحات جن کے حوالے اصل کتاب میں تھے، ان کو ملا کر دیکھنا اور مختلف اڈیشنوں کو تلاش کرنا اور ان میں مصنف کے دیے ہوئے حوالوں کو ڈھونڈنا آسان کام نہ تھا، یہ رمضان کا مہینہ اور برسات (ستمبر) کی اس اور جس، مولانا روزہ رکھ کر اسی طرح کتابیں دیکھنے پڑھنے اور لکھنے کی محنت اٹھاتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور اس کی بینائی گویا جاتی رہی، اس پر بھی کام جاری رہا اور اس کو تمام کر کے چھوڑا۔

۶ نومبر ۱۹۱۱ء کو مولانا اس واقعہ کو کس حسرت سے مولوی ابوالکلام کو لکھتے ہیں ”تمدن کے رد میں ابتداء ایک ہفتہ میں اس قدر انہماک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اترنا محسوس ہوا اور اب اس سے حرف نظر نہیں آتے، ایک آنکھ صحت مند ہے اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے، اب لکھنا پڑھنا بالکل کم ہو گیا ہے، اس لیے ساٹھ صفحے ہو کر رہ گئے اور اسی پر کتاب ختم کر دی، طبیعت بہت افسردہ رہتی ہے، سپاہی کا ہتھیار چھین جائے تو پھر وہ کس کام کا ہے۔“ (ابوالکلام-۳۴)

اسی تنقید و تردید کا اردو خلاصہ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں چھپا اور اصل عربی مضمون کو جو عربی ادب کا نمونہ ہے، الا انتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے پہلے خود مولانا نے جنوری ۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں لکھنؤ کے ایک مطبع میں چھپوایا اور ساتھ ہی اس کے اجزا مصر میں فروری ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا اڈیٹر المنار کے پاس بھیجے سید موصوف نے بڑی تعریف کی اور اس اہم کام کے انجام پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور لکھا کہ وہ مصر کے کئی علما کو ادھر متوجہ کر چکے تھے، مگر کسی نے ہمت نہیں کی، بھگد اللہ کہ یہ فرض کفایہ ہندوستان کے ایک عالم سے ادا ہو سکا، (ریاض حسن ۱۸-جمید ۵۵) مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ سید رشید رضانا نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں خود بھی تردید کرنی چاہتا تھا مگر جرجی زیدان کے مکائد اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو سمیٹ کر یک جا کرنا اور ان کی تردید کرنا قابو میں نہ آتا تھا، آپ نے اس پر قابو پالیا اور تردید کر دی۔ سید موصوف اس کے بعد مولانا کی خواہش پر ۱۹۱۲ء کے شروع میں ہندوستان آنے اور یہاں سے واپس جا کر اس کو المنار میں اور بعد کو ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا۔

اس رسالہ کی عربی تحریر بڑی انشا پر دازانہ ہے، مولانا عربی تحریر میں جاہظ کے طرز کے پیرو تھے، جس زمانہ میں وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے، جاہظ کی بیان و تمیز اور کتاب الحیوان اکثر مطالعہ میں رہتی، راقم کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس کتاب میں نبو امیہ کی علمی سرپرستی کا باب جو طبع ہند کے صفحہ ۴۷ سے صفحہ ۵۳ تک ہے حضرت الاستاذ کے اشارہ سے اس شکستہ رقم کے قلم سے نکلا ہے، واللہ الحمد۔

اس کتاب کے چھپوانے کا مرحلہ درپیش تھا کہ حکیم نور الدین صاحب نے قادیان سے اس کے لیے پچاس روپے بھیج دیے، باقی کے لیے انہوں نے اپنے دوستوں میں سے مولانا شروانی، نواب مزمل اللہ خان اور عزیزوں میں سے مولانا حمید الدین کو لکھا اور خود مولانا نے بھی اپنا حصہ دیا اور کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔ (شروانی - ۹۵)

اس کتاب کی اشاعت نے ہندوستان اور مصر اور دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں جہاں تک تمدن اسلامی کا زہر پھیلا تھا، تریاق کا کام دیا اور ایک بڑے فتنے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔
والحمد لله على ذلك۔

قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ۱۹۱۰ء | اس وقت تک قرآن پاک کے جتنے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہوئے تھے، وہ کل عیسائیوں کے قلم سے نکلے تھے، انگریزی میں سب سے پہلا اور مشہور ترجمہ سیل کا تھا اور اس کے بعد پامر کا اور ۱۹۰۹ء میں راڈویل کا ترجمہ شائع ہوا لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے نزدیک کسی استناد کے لائق نہیں ہو سکتے تھے، ہندوستان میں انگریزی زبان کی اشاعت کے سبب سے جن نو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآن کے سمجھنے کی طرف توجہ ہوئی، وہ ان ہی ترجموں کی طرف توجہ کرتے تھے، غیر مسلم لوگ بھی جب اسلام کی دعوت کا صحیح مطلب سمجھنا چاہتے تھے تو انہی ترجموں میں سے کسی ایک کو پڑھتے تھے۔

اس زمانہ میں آریوں کے سبب سے جب مولانا کو تبلیغ و حفاظت اسلام کی طرف توجہ ہوئی تو قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کی ضرورت بھی معلوم ہوئی، چنانچہ مارچ ۱۹۱۰ء میں جب دلی میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ہوا تو مولانا نے اس جلسہ میں یہ تجویز پیش کی اور تمام لوگوں نے اس کی تائید میں صدائیں بلند کیں، مصارف کا مرحلہ اسی جلسہ میں نہایت آسانی کے ساتھ طے ہو گیا، یعنی سردار اسماعیل خاں سفیر افغانستان نے اعلان کیا کہ وہ سردست اس مقصد کے لیے پانچ ہزار روپیہ دیتے ہیں اور اس کے علاوہ جو مصارف پڑیں گے وہ ان کو بھی برداشت کریں گے، اب جو کچھ وقت تھی وہ صرف یہ تھی کہ

کون شخص اس کام کو انجام دے، مولانا کے نزدیک اس کے لیے ایک ایسا جامع الحسبیتین شخص درکار تھا جو عربی اور انگریزی دونوں کا ماہر ہو اور اس کے ساتھ قرآن مجید پر کافی غور کر چکا ہو، اس لحاظ سے ان کی نگاہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اور نواب عماد الملک مرحوم پر پڑی، اسی زمانہ میں مولانا نے مولوی محمد صالح صاحب پروفیسر بھاولپور کالج کی بھی تعریف سنی اور ان سب سے خط و کتابت کی لیکن نواب عماد الملک جو انگریزی کے ایک اعلیٰ ادیب تھے اور عربی زبان سے بھی واقف تھے، اس کام کے لیے سب سے زیادہ مستعد نظر آئے، حالانکہ ان کی عمر ستر سے زیادہ ہو چکی تھی، اس پر بھی مستعدی ظاہر کی اور ۲۲ گھنٹہ روزانہ کام کرنا شروع کیا، چنانچہ انہوں نے مولانا کو لکھا کہ وہ مسودہ مولانا کے پاس بھیج دیں گے، جو چھپوا کر مولانا حمید الدین اور مولوی محمد صالح اور دوسرے قابل حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے گا، پھر جو رائیں ان کی نسبت موصول ہوں گی وہ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی جائیں گی اور متفقہ رائے سے فیصلہ ہوگا۔

اس کے ساتھ مولانا نے یہ رائے بھی قائم کی کہ انگریزی کا اردو ترجمہ علماء کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہوگا تاکہ وہ اس کی صحت و غلطی کا فیصلہ کر سکیں۔

نواب صاحب کا یہ ترجمہ پندرہ پاروں تک مکمل ہو چکا تھا، ۱۹۱۲ء میں جب مولانا کی کوششوں اور نواب عماد الملک کے اصرار سے مولوی حمید الدین صاحب دارالعلوم حیدرآباد کے صدر (پرنسپل) مقرر ہو کر حیدرآباد پہنچے تو نواب صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور روزانہ مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر اپنے انگریزی ترجمہ پر نظر ثانی شروع کی، یہ کام تمام بھی نہیں ہوا تھا کہ خود مولانا کی عمر تمام ہو گئی، مولوی حمید الدین صاحب اور نواب صاحب کا کام اس پر بھی جاری رہا اور اس متفقہ کوشش سے جو اصلاح ہوئی تھی، وہ غالباً چار پاروں تک پہنچی تھی، اسی اثنا میں ۱۹۱۷ء میں مولوی حمید الدین صاحب حیدرآباد سے چلے آئے اور نواب صاحب ضعف بصارت اور علالت کے سبب سے تنہا کام کرنے سے معذور ہو گئے اور ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور کام سولہ پاروں سے آگے نہ بڑھ سکا، نواب صاحب نے جن ۱۶ پاروں کا ترجمہ کیا تھا اس کا چھپا ہوا مسودہ تو موجود ہے، مگر افسوس ہے کہ چار پاروں کے اصلاح شدہ مسودہ کا تلاش کے باوجود پتہ نہیں چلا۔

مولانا کی یہ تجویز گوان کی وفات سے نا تمام رہی، مگر بھگتدے کا نام نہیں رہی، یعنی گوان کے ہاتھوں سے یہ انجام نہ پاسکی، مگر اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی اسی تحریک کا فیض تھا کہ اس کے بعد قادیانیوں نے مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے مسٹر محمد پکھتال (حیدرآباد) نے اور بعض

دوسرے مخلص مسلمانوں نے اس کام کو انجام تک پہنچایا، اس لیے الدال علی الخیر کفاعلہ کے اصول پر انشاء اللہ تعالیٰ مولا ناکو بھی اس ثواب سے حصہ ملے گا۔

مجلس علم کلام کی تجویز ۱۹۱۲ء | اسلام کی مستقل حفاظت و اشاعت کی غرض سے جو تجویزیں اس زمانہ میں مولانا کے ذہن میں آ رہی تھیں، ان میں سے ایک مجلس علم کلام کی تجویز تھی، جس کے ذریعہ سے یورپ کے فاسد خیالات و اعتراضات کا استیصال مقصود تھا، ان کے خیال میں اس مشکل کا اصل حل قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج تھا، جس کے لیے وہ ہر طرف کوشش کر رہے تھے لیکن جب تک اس امتزاج کا سامان نہ ہو اور اس کا نتیجہ پیدا نہ ہو، ان مشکلات سے اعراض نہیں برتا جاسکتا جو جدید تعلیم کے بدولت مسلمانوں کو پیش آ رہی تھیں، اس بنا پر ان کو یہ خیال ہوا کہ ملک میں اس وقت نئے تعلیم یافتوں میں سے ایسے لوگوں کو جو فلسفہ کا ذوق اور اسلام کا درد رکھتے ہوں، ایک طرف سے لیا جائے اور دوسری طرف سے ایسے علما کو لیا جائے جو قدیم فلسفہ کے ماہر، جدید تعلیم سے مانوس اور فلسفہ جدیدہ کے نئے اعتراضات کی تردید و تنقید کی قوت رکھتے ہوں اور ان دونوں کو ملا کر ایک مجلس علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے، جس میں یہ نور کیا جائے کہ فلسفہ جدیدہ کے کون کون سے مسائل مذہب کے مخالف ہیں اور یہ مسائل کہاں تک یقینی ہیں اور ان کی بنا پر مذہب پر جو اعتراضات پڑ سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے؟ اس مجلس کے لیے علما میں سے انہوں نے مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹوکی، مولانا شیر علی صاحب حیدر آباد، سید رشید رضا مصری کو لیا اور نئے تعلیم یافتوں میں سے ڈاکٹر محمد اقبال لاہور، مولوی حمید الدین صاحب پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد اور مولوی عبدالقادر صاحب بی، اے بھاگل پوری کو لیا اور ۱۴ مارچ ۱۹۱۲ء کے مسلم گزٹ میں ایک مضمون کی صورت میں اس تجویز کو شائع کیا اور دلی کے اجلاس ندوہ میں اس پر غور و فکر کی دعوت دی، اس مضمون میں مولانا نے پہلے عباسیوں کے زمانہ میں علم کلام کی بنیاد پڑنے کی کیفیت لکھی ہے اور اسی پر داز پر موجودہ زمانہ میں کام کرنے کا خیال ظاہر کیا۔

اس تجویز پر عمل کا آغاز اس سے کیا کہ ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہ کو اس تجویز کے مطابق خطوط لکھے اور ان کے جوابات بھی آئے، مگر مجلس کا کام شروع نہ ہو سکا، گویا تجویز تجویز کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔

کلکتہ کا سفر ۱۹۱۲ء | کلکتہ اس زمانہ میں حکومت کا پایہ تخت تھا، وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں کونسل کے اکثر مسلمان ممبروں سے ملنے کے لیے مولانا کو کئی دفعہ کلکتہ کا سفر کرنا پڑا، وہاں کبھی جنس شرف الدین

۱۔ یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہفتم، ص ۵۳ میں ہے۔

کے ہاں ٹھہرے اور کبھی مولانا ابوالکلام صاحب کے پاس، ۱۹۱۲ء کے شروع میں انہوں نے پھر کلکتہ کا سفر کیا اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کر کے تمام مراتب طے کیے اور واپسی میں پٹنہ میں قیام کیا۔

پٹنہ کا سفر ۱۹۱۲ء | مولانا نے پٹنہ کا متعدد بار سفر کیا، شروع میں ۱۸۹۶ء میں ندوہ کے لیے گئے اور غالباً مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم وکیل کے دولت کدہ پر قیام فرمایا، پھر خدا بخش خاں کے کتب خانہ کے سیر کو کئی دفعہ گئے، ۱۹۰۶ء میں بھی گئے تھے اور مولوی شرف الدین صاحب بیرسٹر کے یہاں ٹھہرے تھے، ڈھا کہ سے واپسی میں بھی پٹنہ میں ٹھہرے اور خدا بخش خاں کے یہاں اترے، ایک دفعہ شمس العلماء مولوی حافظ محبت الحق صاحب (مصنف دعوت الحق) کے یہاں مہمان ہوئے تھے۔

اس دفعہ ۴ فروری ۱۹۱۲ء کی صبح کو وہ پٹنہ پہنچے تو اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے معتقدین کا نہایت کثرت سے مجمع تھا، شہر کے عمائد اور کالج کے تمام طلبہ موجود تھے، آدھی راہ کے بعد طلبہ کے اصرار سے گاڑی کے گھوڑے کھول دیے گئے اور خود طلبہ ذوق و شوق کے عالم میں اس گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر فروگاہ تک لائے، مولانا اس واقعہ کو لکھ کر فرماتے ہیں ”یہ تو نہیں کہتا کہ رعونت پرست نفس کو پھریری نہیں ہوئی ہوگی لیکن واقعاً ہنسی آتی تھی کہ عجیب خوش اعتقاد بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں۔“ (ابوالکلام-۳۵)

مولانا کا ایسا سمجھنا ان کے حسن تواضع کی دلیل ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان کے کاموں نے ان کو لوگوں میں اور خصوصاً نوجوانوں میں اتنا ہی ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔

یہاں ایک جلسہ ہوا جس میں لوگ کثرت سے شریک ہوئے اور مولانا نے اس میں وقف

اولاد اور اس کے سلسلہ میں ندوہ کا مناسب ذکر کیا۔ (ابوالکلام-۳۵)

اسی سال اکتوبر کے آخر میں انہوں نے پٹنہ کا ایک اور سفر کیا اور غالباً اس سفر کی غرض تعطیل جمعہ کے میموریل کی تیاری کے سلسلہ میں تھا اور غالباً کتب خانہ میں قیام فرمایا، ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ڈاکٹر محمود کو جواب پٹنہ میں بیرسٹری کر رہے تھے، حسب ذیل خط لکھا ”باکئی پور پٹنہ میں تو غالباً کتب خانہ ہی میں ٹھہروں، مدت سے وہاں آمد و رفت ہے اور وہیں ٹھہرتا ہوں۔“

۱۔ مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم ایک لائق خاندان کے لائق فرد تھے، پٹنہ کا مشہور مردم خیز گاؤں صاحب پوران کا وطن تھا، علم دوست اور علما کے قدر شناس تھے، پٹنہ کے مشہور وکلاء میں تھے۔ ۲۔ اس خط کا کس ندیم گیا، اگست ۱۹۳۰ء میں چھپا ہے۔

سیاسیات

مولانا کی سیاست و واقعات کا جو سلسلہ چلا آتا ہے، اس سے ہمارے ناظرین پر یہ بات بے پردہ ہو چکی ہوگی کہ گو سیاسیات کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا، تاہم وہ سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے لیکن ان کے سیاسیات کا یہ رقبہ بھی حقیقت میں ان کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جز تھا، یعنی ان کو اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون سے جو شیفتگی تھی، اس کا فطری افضائیہ ہونا چاہیے کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ہو اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے ہیں، اس کو وہ مجسم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوج ڈالا، ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ہو، یہی ان کی سیاست تھی، ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لیے سراپا سپاس تھے، دوسری طرف یورپ کی دست برد سے ہمہ تن فریاد اسی جذبہ نے ہندوستانی سیاست کی ایک دوسری شکل ان کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ یہ ملک ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہے، لیکن اسلامی سیاسیات میں وہ پورے چین اسلامی تھے۔

ما بین الاسلامی سیاست اور ترکوں سے محبت | اس وقت ساری دنیا میں صرف ترکی ہی کی وہ سلطنت تھی جس کے پیکر میں ان کو اسلام کے شان و شکوہ کا جلوہ نظر آتا تھا، اس لیے ان کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، ان کی جوانی تھی کہ ۱۷۶۱ء میں روس و روم کی جنگ نمودار ہوئی، اس لڑائی میں سارا ہندوستان بلکہ ساری اسلامی دنیا ترکوں کے ساتھ تھی، ہندوستان بھر میں مسلمانوں نے ترکوں کی اعانت کے لیے چندے جمع کیے، بلکہ حضرات علما نے بھی اس میں پوری طرح حصہ لیا اور چندے جمع کر کے ترکی بھیجے، مولانا نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس سلسلہ میں کام کیا اور اپنے شہر کی طرف سے کئی ہزار روپے سفیر ترکی، مقیم بمبئی کی معرفت قطن ظنیہ بھیجے، یہی وہ راستہ ہے جس سے ترکوں کی محبت نے ان کے دل میں گھر کیا اور اسی محبت میں ترکی کا سفر کیا اور وہ عشق جواب تک صرف گفتار کے ذریعہ تھا، دیدار سے وہ اور وہ چند بڑھ گیا، ان کو ترکوں کے کوکہ جلال میں بدر و حنین کے جلوے نظر آتے تھے:

تازگی بدر و حنین از تو ہست زیب و طراز حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہِ انجم سپاہ آنکہ بود شرعِ بنی را پناہ

فرہ دین نبوی از تو ہست بازوے اسلام قوی از تو ہست

اس زمانہ میں ترکوں کا نام لینا برٹش گورنمنٹ کی سیاست کی نگاہ میں بڑا جرم تھا، مولانا نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور ہر چند کہ ٹرکی کے سفر نامہ کی ترتیب میں صرف اس کا علمی و تعلیمی ہی پہلو پیش نظر رہا، سیاست کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا، مگر یہ خفیف جرم بھی عفو و درگزر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا، ان کو سلطانی ایٹلی ہونے کا ملزم ٹھہرایا گیا اور ان کے پیچھے خفیف پولیس لگائی گئی، انتہا یہ ہے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب کان پوری، مصنف البرامکہ نے اس سفر نامہ پر ریویو لکھا تو کان پور کے کلکٹر نے ان کو بلوا کر ڈانٹا کہ تم برطانی رعایا ہو کر سلطانِ روم کی تعریف کرتے ہو اور مولوی صاحب کو معذرت کرنی پڑی۔

۱۸۹۵-۹۶ء میں جب آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بانی کر کے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا اور ہندوستان کے اخباروں میں اس کی نقلیں چھپ رہی تھیں تو مولانا سے ضبط نہ ہو سکا، انہوں نے ۲۱ فروری ۱۸۹۶ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا، یہ وہ وقت تھا جب وہ علی گڑھ کا لُج کی ملازمت میں تھے۔

۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ جب پیش آئی تو وہ علی گڑھ میں تھے اور سرسید کا نقطہ نگاہ سب کو معلوم ہے، گو مولانا نے اس موقع پر اپنے کو قابو میں رکھا لیکن ان کو علی گڑھ کی فضا میں اندر سے گھٹن ہونے لگی اور نتیجہ اس قسم کی سیاسی کشمکش کا علاحدگی تھا۔

ان کی بہت کم مجلس ترکوں کے فضائل و مناقب اور دل چسپ قصوں کے بیان سے خالی ہوتی تھی اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تھے، بلبل ہزار داستان بن جاتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں جب انور بے وغیرہ کے زیر علم ٹرکی نے دستوریت کا اعلان کیا تو وہ خوشی میں آپے سے باہر تھے، ایک ایک نام و درو جوان ترک اور انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ایک جاں باز رکن کی تعریفیں کرتے تھے سلطان عبدالحمید خان کی اس معاملہ فہمی کی مدح کرتے تھے کہ محمد علی شاہ کج کلاہ ایران کی طرح اپنے ملک کو خانہ جنگی میں نہیں برباد کر دیا بلکہ خون کا ایک ایک قطرہ بہائے بغیر ملک میں اتنا بڑا انقلاب ہونے دیا، انہوں نے اس انقلاب سے بڑی بڑی امیدیں قائم کر رکھی تھیں، اس زمانہ میں شیخ عبدالعزیز

۱۔ یہ دونوں واقعے مولوی عبدالرزاق صاحب نے جو مولانا کے اسی زمانہ کے ملنے والے اور دوست ہیں، اپنے مضمون یا دایام میں لکھے ہیں۔

شاد لیش ٹرکی سے ”العرب“ نام ایک عربی اخبار نکالتے تھے، وہ ان کے پاس آتا تھا، اس کو بڑی دل چسپی سے پڑھتے تھے اور جو پڑھے تھے اپنی مجلس میں اس کو دوسرے ہفتے تک بیان کرتے رہتے تھے۔

۲۸ اگست ۱۹۰۸ء کو ایک خط میں مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں ”ٹرکی کی جدید زندگی نے اس کے

ہوا خواہوں کو محمور کر دیا ہے، کیا بتاؤں عربی اخبارات میں آج کل کیا نشہ ہوتا ہے، سو سو دفعہ پڑھتا ہوں اور سیر نہیں ہوتا، آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے، ان میں بیس ہزار کی جمعیت کا ایک کمانڈر ایک جنس لطیف تھی..... ایران اور ٹرکی کی پارلیمنٹ یورپ کا اثر نہیں، گو تو ارد ہے اَمُوهُم شُورَى کا سبق مسلمانوں کو یاد آیا اور چوں کہ گھر کی چیز تھی، کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی، خدا کی قسم یہ جوش، یہ صداقت، یہ مسرت، یہ اعتدال دنیا کی تاریخ دکھائے گی، تو اسلام ہی کے آئینہ میں دکھائے گی، خیال فرمائیے، آٹھ لاکھ آدمیوں کا دربار قسطنطنیہ میں کوہ شکن موجیں لے رہا تھا اور ایک منگے کا بال بیکانہ ہوا، معاویہؓ کی غلطی کا کفارہ عبد الحمید نے ادا کیا۔“ (مہدی-۳۹)

یہ خط اپنے لکھنے والے کے وفور جوش کا مرقع ہے، بار بار پڑھیے محسوس ہوگا کہ مسرت اور خوشی کا ایک امنڈتا ہوا سمندر ہے، جو موجیں لے رہا ہے اور یہ راز بھی یہیں سے کھلے گا کہ ان کی سیاست کا سرچشمہ اسلام کی تعلیم ہے، یورپ کی آزادی نہیں۔

اسی زمانہ میں عطیہ بیگم (بہمنی) ٹرکی کے سفر سے واپس آئی تھیں، ان سے حالات سنے اور جب انہوں نے یہ کہا کہ ”ٹرکی ایک یورپین طاقت کا باز پچہ ہے اور یہ پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں، جدید قرض نے اپنا جان ستانی کا کام انجام دیا ہے اور دیتا جاتا ہے“ تو انہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا (مہدی-۵۳) ان ہی کو سلطان عبد الحمید خان کی نسبت کس قدر بلیغ فقرہ لکھ کر بھیجا ہے، ”عبد الحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کی پالیٹکس کے اوراق کا تاش کھیلا ہے۔“ (۵۶) ۲۲ نومبر ۱۹۱۰ء کو پھر انہیں لکھتے ہیں، ترکوں نے دکھا دیا:

نالوں سے عنندیب کو میں نے دبایا بھاری ہوں لاغری میں بھی تہا ہزار پر

(ہزار بلبل کو بھی کہتے ہیں) عربی اخبارات آج کل پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔“ (۶۳)

۱۔ یہ حضرت امیر معاویہؓ کی اس خط کی طرف اشارہ ہے جو ان سے اسلام کے نظام شوری کے توڑنے اور بیٹے کی ولی عہدی کے متعلق ہوئی۔ ”س۔“

پھر دفعۃً جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا تو ان کے دل میں ٹھیس سی لگی، اس زمانہ میں ان کا رہ کر اضطراب اور باتوں باتوں میں شعلہ نفسی، مجھ کو اچھی طرح یاد ہے، ہر ہفتہ جب مصر کے عربی اخبارات آتے تھے تو ماسوا سے بے خبر ہو جاتے تھے اور ترک بہادروں کی جاں بازی اور شجاعت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے، انور بے، عزیز بے مصری اور دوسرے نوجوانوں ترک افسر جو اٹلی کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چھپ چھپ کر طرابلس پہنچ رہے تھے، ان کی اس جواں مردی کے قصوں کے دہرانے میں اس بڑھاپے میں بھی ان میں جوانی کی الٹ پیدا ہو جاتی تھی۔

طرابلس کی اس لڑائی کے زمانہ میں ساری دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، ہندوستان کا براعظم اس زمانہ میں اسلامی جوش و خروش کا طوفان خیز سمندر بن گیا تھا، یاد ہوگا کہ ٹرکی نے اٹلی سے اس بات پر صلح کر لی تھی کہ ترک طرابلس کو خود مختار بنا دیں گے اور وہ جس طرح چاہے اٹلی سے نیٹ لے، چنانچہ باب عالی نے اس کے مطابق طرابلس کو خود مختاری بخش دی اور شیخ سنوسی وغیرہ نے اس کی آزادی کا بیڑا اٹھایا، مجھے اسی زمانہ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ یاد ہے، رات کو تفریباً آٹھ نو بجے بے وقت مولانا کا رقعہ آیا، جس میں مجھے اور اونچے درجہ کے دو تین طالب علموں کو یاد فرمایا تھا، ہم سمجھے کوئی ضروری بات پیش آئی ہوگی جو اس وقت طلب فرمایا ہے، ہم لوگ تمام عجلت پہنچے تو دیکھا کہ خود چٹائی پر لیٹے ہیں، سامنے لیپ ہے اور چاروں طرف عربی اخبار پھیلے ہیں، ارشاد ہوا ”بھائی سنا؟ بڑا مزہا ہوا، عربی اخبار آئے ہیں ان میں انور بے وغیرہ کا اعلان ہے کہ وہ ٹرکی کی خدمت سے استعفا دے کر طرابلس میں اپنی نئی حکومت بنائیں گے اور اخیر وقت تک اٹلی کا مقابلہ کریں گے، اس خبر سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا تھا، مگر اکیلے ہنسنے نہیں بناتا تھا، اس لیے تم لوگوں کو بلوایا ہے“ یہ کہہ کر صندوقچہ سے روپیے نکالے اور آدمی بھیج کر بازار سے مٹھائی میٹھا کی، خوشی و مسرت کا یہ جلسہ دیر تک قائم رہا، حالانکہ مولانا عموماً نوبے سوجانے کے ہمیشہ سے عادی تھے۔

ابھی طرابلس الغرب کی یہ مصیبت ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ سلطنتوں کی شہ پاکر بلقان کی ریاستوں نے ٹرکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا، اسلامی جذبات کا وہ لہر دنیا کے انقلاب کا حیرت انگیز منظر ہے، اس وقت ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو اٹلی کی یہ سلطنت طرابلس ختم ہو گئی اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور اسی کے ساتھ اٹلی کی افریقہ کی شہنشاہی کی زمین کا ایک ایک چپہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور انگریزوں کے زیرِ علم آ گیا، تلك الایام نداولہا بین الناس۔

سمندر جو ابھی ٹھہرنے بھی نہیں پایا تھا، پھر جوش میں آیا اور مسلمانوں کے دلوں میں علانیہ آزادی اور حریت کی تحریک لہریں لینے لگی، اس زمانہ میں اس تحریک کی رہنمائی جن لوگوں نے کی ان میں ایک نام ہمارے ہیرو کا بھی ہے ”شہر آشوب اسلام“ کے نام سے غم و حسرت سے بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثہ پر مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا اور آج بھی جو کوئی اس کو سنے گا، اس کی آنکھوں سے اشک غم کے چند قطرے بے اختیار نکل آئیں گے:

چراغِ کشتہٴ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
فضائے آسمانی میں اڑیں گے دھجیاں کب تک
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سیران کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ لطف انگریزی بیگمہ آہ و نفاں کب تک
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خونچکاں کب تک
دکھائیں ہم تمہیں بیگمہ آہ و نفاں کب تک
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
ہم اپنے خون سے سنبھیں تمہاری کھیتاں کب تک
ہمارے زہ ہائے خاک ہوں گے زرافشاں کب تک
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
مناؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ جیتاں کب تک
تو پھر یہ احترامِ حیدہ گاہِ قدسیاں کب تک
تو پھر یہ نغمہٴ توحید و گلہانگ اذماں کب تک

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
قبائے سلطنت کے گرنے پر زے
مراکش جا چکا فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
یہ سب ہیں رقصِ بے ل کا تماشا دیکھنے والے
یہ وہ ہیں نالہٴ مظلوم کی لئے جن کو بھاتی ہے
کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ جوشِ انگیزی طوفانِ بیداد و بلاتا کے
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
نگارستانِ خوں کی سیرِ گرم نے نہیں دیکھی
یہ مانا گرمیِ محفل کے سماں چاہیں تم کو
یہ مانا قصہٴ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشاںِ رفتگاں ہم ہیں
زوالِ دولتِ عثمانِ زوالِ شرع و ملت ہے
خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیاں ہیں؟
پرستارانِ خاکِ کعبہ دینا سے اگر اٹھے
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے

بکھرتے جاتے ہیں شیرازہ اور اراقِ اسلامی چلیں گی تند، بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صیدالکُنوں کی جب نگاہیں ہیں تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیان کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

یہ نظم (شاعرانہ معنوں) میں سراسر الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کی متعدد پیشین گوئیاں حرف
حرف پوری ہوئی ہیں۔

یہ نظم مولانا نے لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں جوڑکی کی فراہمی چندہ کے لیے ہوا تھا، پڑھی تھی، خود
بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلا یا، معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے، خواجہ کمال الدین
صاحب (لاہور) اس زمانہ میں اشاعتِ اسلام کی غرض سے لندن (بشپ گیت نمبر ۲۶) میں مقیم تھے،
اس نظم نے ہزاروں میل دور سے ان کے دل پر جو اثر کیا، اس کا ذکر ان کے اس خط میں ہے، جو انہوں
نے لندن سے مولانا کے نام لکھا تھا:

”مکرمی مولانا! السلام علیکم

اگرچہ ہزار کوس دور بیٹھے ہوئے کسی بات نے مجھے بچوں کی طرح زلایا تو آپ کے طبع زاو جدید
کے اس مصرع نے ع ”چراغِ کشفہ محفل سے اٹھے گا ہواں کب تک“ کیا حقیقت اور صداقت ہے اور
کیا یاس افزا منظر سامنے آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم کرے.....“

مسلمانوں نے بار بار حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے احساس کا لحاظ کرے
اور بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رہے، مگر اس کا جواب ہمیشہ یاس انگیز ملا، اس پر شاعر نے
جل کر یہ کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے توڑے:

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساسِ مسلم کا مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالم گیری ملت
منافق ہے جو کہتا ہے کہ میں ترکی سے یکسو ہوں ہمارا جوشِ اسلامی انہیں باور نہیں آتا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے وہ ہندوستان تک ہے عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہاں گیری زباں تک ہے یہ اندازِ تغافل جلوہ گاہِ امتحاں تک ہے
کہ جس کا بندہ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے کہ اب مسلم کی ہستی تیری لطف نہاں تک ہے

۱۔ مکاتیب جلد دوم۔ نام مولوی ظفر علی خاں۔

اسی زمانہ میں جب تمام ہندوستان میں وزرائے برطانیہ کے اس طرز سیاست کے خلاف جوش و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی، بسببی میں ایک گننام وفادار اسلامی انجمن بسببی کے نام سے اخبارات میں مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت میں اس کی تجویزیں شائع ہوئی تھیں، مولانا نے اس نظم میں اس کی پردہ داری کی:

ایک دن تھا کہ وفاداری مسلم کی متاع
ہر جگہ عام تھی اور نرخ میں ارزانی بھی
دفعۂ ہوگئی ہنگامۂ بلقان میں گم
قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی بھی
ہاتھ آنے کا تو کیا ذکر، پتہ تک بھی نہ تھا
ڈھونڈھنے والوں نے گوناگ بہت چھانی بھی
ہو مبارک تجھے اے بسببی اے ناز دکن!
کہ ترے تاج میں ہے طرہ سلطانی بھی
تیرے بازار میں وہ یوسف گم گشتہ ملا
جس کا مشتاق تھا خود یوسف کنعانی بھی
یہ الگ بات ہے اندھوں کو وہ آئے نہ نظر
گو اسی زمرہ میں ہے ”یوسف ثوبانی“ بھی

اس زمانہ میں ہزہائینس سرآغاخان نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ ان کے لیے، بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمین یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تاکہ وہ دول یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں، اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غم و غصہ پیدا ہوا، کیوں کہ اس سے ان کے عالم گیر سیاسی وقار کو بہت صدمہ پہنچا تھا، مولانا نے آغاخان کو اپنی دو نظموں میں طنزیہ جواب دیا جو کلیات میں موجود ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی کوشش سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں اس لڑائی میں ایک طبی وفد نومبر ۱۹۱۲ء میں ترکی کے محاذ جنگ پر بھیجا گیا تھا، اس کے ممبر شعیب قریشی (موجودہ وزیر حضور ی بھوپال) چودھری خلیق الزماں وکیل لکھنؤ، عبدالرحمن صاحب صدیقی (موجودہ ممبر اسمبلی بنگال) عبدالعزیز انصاری وغیرہ تھے، یہ سب اس زمانہ میں علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے، مگر جوش کا یہ عالم تھا کہ تعلیم چھوڑ کر زخمی مسلمانوں کی مرہم پٹی کے لیے چل کھڑے ہوئے، ڈاکٹر سید عبدالرحمن صاحب (موجودہ میڈیکل آفیسر بھوپال) جو اس وقت انگلینڈ میں اپنی طبی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، وہیں سے سیدھے چل کر قسطنطنیہ پہنچے، ڈاکٹر نعیم انصاری بھی وفد کے ہم راہ تھے اور وہ بھی انگلینڈ ہی سے آکر ملے تھے، اس وفد کے تمام اخراجات ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے چندوں سے پورے کیے اور تاریخ میں یہ ترک بھائیوں

۱۔ سیٹھ یوسف ثوبانی مرحوم، عمر ثوبانی کے والد بسببی کے ممتاز تاجر تھے اور تعلیم کے مسئلہ سے دل چسپی رکھتے تھے، وہی اس جماعت کے سرگروہ تھے۔

کی خدمت کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کا اپنی قسم کا پہلا کارنامہ تھا، ڈاکٹر انصاری مرحوم جو برسوں لندن کے شفا خانوں میں کام کر چکے تھے، اس وقت ہندوستان میں موجود تھے، موصوف کا وطن غازی پور میں یوسف پور کا قصبہ ہے، جو اعظم گڑھ سے جو مولانا کا وطن تھا، نسبتاً قریب ہے، اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے بڑے بھائی حکیم عبدالوہاب مشہور حکیم نابینا صاحب مولانا کے ہم درس تھے، انہوں نے بھی اعظم گڑھ میں مولانا فاروق صاحب سے پڑھا تھا، مولانا اور ڈاکٹر صاحب کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا، ڈاکٹر صاحب اس وقت بالکل جوان تھے اور مولانا بوڑھے اس پر بھی یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہو کر روانگی کے لیے دلی جا رہے ہیں، لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں، گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں، ڈاکٹر صاحب ڈبے کے دروازے پر کھڑے وداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعۃً اس ہمدن جوشِ علامہ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، دفعۃً ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا، آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لیے اور گاڑی اسلامی غیرت و حمیت کے ان گہرے گراں مایہ کو لے کر آگے بڑھی۔

چند مہینوں کے بعد جنگ کے اختتام پر جب ڈاکٹر انصاری اپنا یہ طبی وفد لے کر ہندوستان واپس آئے ہیں تو مولانا اتفاق سے بمبئی میں تھے، جب وہ جہاز سے اترے تو مولانا نے ان کے پاؤں دوبارہ چومنے چاہے، ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی تو فرمایا کہ ”یہ تمہارے پاؤں نہیں، اسلام کے جسمہٴ غربت کے پاؤں ہیں“ ان کے یہی جذبات موزوں نالہ کی صورت بن کر بمبئی کے اس جلسہ میں ظاہر ہوئے جو اس وفدِ طبی کے استقبال و خیر مقدم کے لیے بمبئی میں ہوا تھا، بڑی پردردِ لطم ہے:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری	کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفد انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی	یہی تھا دردِ اسلامی یہی تھی رسمِ غم خواری
فراقِ ملک و ترکِ خانماں و دوریِ منزل	خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری
تمہارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے	صدائے نالہ ہائے درد و جوشِ گریہ و زاری
نگاہِ حسرت آلود عزیزاں کی سناں باری	فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی شرر باری
مگر اک جذبہٴ اسلام نے سب کو شکستیں دیں	کہ سب کو چھوڑ کر پیچھے وہاں بایں گراں باری

۱۔ اس قسم کے واقعہ کو غلبہٴ حال پر محمول سمجھنا چاہیے۔ ”س“۔

کہ سب اہل وطن کو چھوڑ کر پنچے پنے یاری
مریضوں کے لیے وہ آپ کی شب ہائے بیداری
کہ تم نے کی ہے ترکمان مجاہد کی پرستاری
کہ تم نے غازیان دین کی کی ہے ناز برداری
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی تیشیوں کی گہر باری
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرائیوں کا طرز خوں خواری
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی
سنے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
زبان بے نوا کے چہرہ محزون بھی دیکھے ہیں
بلا مغربی کے یہ نئے قانون بھی دیکھے ہیں
نتائج ہائے امید گلید سنوں بھی دیکھے ہیں
شہیدان وطن کے جامہ پر خوں بھی دیکھے ہیں
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گونا گوں بھی دیکھے ہیں
زمین پر پار ہائے سینہ پر خوں بھی دیکھے ہیں
شہیدان وفا کے عارض گلگون بھی دیکھے ہیں
کہ تم نے شاہد اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
تو تم نے وہ رموز توت کنوں بھی دیکھے ہیں
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کسی کو خواب میں یہ سعادت مل نہیں سکتی
جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعویٰ آقا کی
تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
نہیں ہے سوز اسلامی کا گونا نام و نشاں باقی
مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں کو بھی دیکھے ہیں
تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستان والے
قیاموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزتم نے
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
مسلمانوں کا قتل عام اور ترکوں کی بربادی
تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ناکے لگائے ہیں
تمہاری چشم عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
لبو کی چادریں دیکھی ہیں رخسار شہیداں پر
نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے، شہدایان ملت کا
جنون جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
عجب کیا ہے یہ بیزار غرق ہو کر پھر اچھل آئے

دعاے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی

تو اب دست دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

ایک فتویٰ لڑائی کے زمانہ میں بقرعید کا زمانہ آگیا تھا، مولانا کو خیال ہوا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اس سال قربانی کے روپیے ٹرکی کے فنڈ میں داخل کر دیں تو اچھا ہے کہ قربانی کا روپیہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا جو اس وقت اپنی حقیقی قربانی کر رہے ہیں، فقہ کی رو سے انہوں نے اس پر غور کیا تو ان کو کوئی مانع

نظر نہیں آیا، مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونگی بھی یہیں تھے، ان سے رجوع کیا، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی مٹھی کو لکھا اور اس باب میں جو فتویٰ مرتب کیا تھا وہ دکھایا تو سب نے تائید کی ادھر سے تسلی ہو گئی تو اس تحریک کو اخباروں میں پیش کیا اور وہ چل پڑی، اس طرح ہزاروں روپیے اس فنڈ میں جمع ہو گئے، بعض علمائے ان کے اس فتویٰ سے اختلاف بھی کیا، چنانچہ مولوی ظفر علی خاں نے مولانا کو اپنا شبہ لکھ بھیجا جو ۱۶ نومبر ۱۹۱۲ء کو اس کے جواب میں لکھا ”عزیزی مولوی ظفر علی خاں صاحب دام قدرۃ السلام علیکم میں نے جو فتویٰ لکھا اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شایع ہو چکا ہے، ہدایہ میں اس کا جزئیہ موجود ہے، البتہ ہدایہ میں صرف جواز ہے اور میں نے افضلیت کا فتویٰ دیا ہے، اس قدر میرا اجتہاد ہے۔

بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے، فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل علیہ السلام پر مقصود تھی، کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے؟ پھر ۱۷ نومبر ۱۹۱۲ء کو عام اخباروں میں اپنا ہی خط چھپوایا:

جناب من! بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بہ جائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں، شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے، غزوہ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اس لیے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے؟

قربانی شعار اسلام ہے، مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں۔

۱۔ مولانا نے اپنی تائید میں ہدایہ کی یہ عبارت پیش کی تھی، والتضحیۃ فیہا افضل من التصدق بثمان الاضحیۃ یعنی عید اضحیٰ کی قربانی کے دنوں میں قربانی کی قیمت کے صدقہ کرنے سے قربانی کرنا بہتر ہے۔ (ہدایہ کتاب الاضحیۃ) اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ اگر قربانی کے جانور کی قیمت نقد خیرات کر دی جائے تو گو اس صدقہ کا بھی ثواب ہوگا، مگر قربانی کی سنت کے ثواب سے محرومی رہے گی، جیسا کہ اس کے آگے کی عبارت میں تفصیل ہے۔ ”لانہا تسقیم واجبة اوسنة والتصلق تطوع محض فتنفضل علیہ“ ”س“۔

اسیذکہ میرا خط اور صاحبانِ اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کر دیں۔“

ترک اس جنگ میں اڈریانوئل (ادرنہ) تک پیچھے ہٹ آئے تھے اور اڈریانوئل بھی ہاتھ سے جا چکا تھا، مگر آخر آخراہی صورت ہوئی کہ انہوں نے اس شہر کو جو یورپ میں ان کا پہلا پایہ تخت تھا، دوبارہ لے لیا، مسلمانوں کو اس فتح سے بڑی خوشی ہوئی، شاعر نے ۸ دسمبر ۱۹۱۲ء اس پر مبارکباد کے یہ چند شعر گائے:

اے ترک! اے مجسمہ کبریائے حق اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہ ملت ختم الامم ہے تو تو آج زور بازوئے شاہ حجاز ہے
رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحہ وجود مغرب ترا ہی عرصہ گہ ترک تاز ہے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں ستاں اب بھی فنائے ہستی دشمن کا راز ہے
رنگیں جو ہے مرقع عالم کا ہر ورق شمشیر تیری خانمہ رنگیں طراز ہے

طرابلس اور بلقان کے ساتھ ساتھ سیاسیات اسلامی کا تیسرا اہم حادثہ خود ہندوستان میں مسجد کان پور کی صورت میں پیش آیا۔

مسجد کان پور کا ہنگامہ اگست ۱۹۱۳ء رمضان ۱۳۳۱ھ | بلقان کا شور محشر بھی برپا ہی تھا کہ مسجد کان پور کا ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا، یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی و قومی جوش و خروش کے طوفان کا سب سے بڑا خونیں منظر ہے، یہ عین اس وقت رونما ہوا جب جنگ بلقان کی آگ ایک طرف ہندوستان سے ہزاروں میل دور بھڑک رہی تھی اور مسلمانوں کے دل برطانی وزارت خارجہ کی سیاسی روش سے سخت مشتعل تھے، دلوں کا یہ بخار نکلنے نہیں پایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمس مسٹن اور ان کے ماتحت حکام کان پور کی غلط کاریوں نے خود ہندوستان میں اس کا ایک موقع بہم پہنچا دیا، کان پور کے محلہ چھلی بازار میں ایک مسجد برسر راہ تھی، وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک نئی سڑک نکالی جس میں مسجد کا ایک حصہ جو وضو خانہ تھا، بیچ میں آ گیا اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کر دیا گیا، حالانکہ اسی کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا جس کو بچا کر یہ سڑک نکالی گئی، اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں ایک آگ سی لگادی، ۳۱ اگست ۱۹۱۳ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی، مسلمانانِ کان پور نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ لے ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو ترکوں نے اڈریانوئل لے لیا تھا، اس کے بعد گولڑائی ختم ہو چکی تھی، مگر صلح ابھی تک نہیں ہوئی تھی، صلح کی کانفرنس ستمبر ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی۔ ”س“۔

مدرسۃ الہیات کان پور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، جلسہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہوا، جلسہ کے بعد پر جوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی تھے، مسجد کا رخ کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چن چن کر رکھنے لگے، مسٹر بلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے یہ دیکھ کر مسجد پر متعین سکھ فوج کو ان نیتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا، فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے ان پر نہایت بے رحمی سے دور سے گولیاں برسائیں اور قریب سے بڑھے مارے، شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے ننھے بچے بھی شامل تھے، شہدائے کثیر تعداد کا صحیح اندازہ معلوم نہ ہوا، سرکاری اندازہ بیس تیس آدمیوں کا تھا، اس خونخیزی نے تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا، آتش، بیاں مقرر، شعلہ افشاں محروں اور شعلہ نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگادی، یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزادی پرستی کے سلسلہ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے، مولانا مرحوم پر اس واقعہ نے بے حد اثر کیا اور یہ اثرات ناہائے موزوں بن کر ان کی زبان و قلم سے ادا ہوئے اور ان کی ان نظموں نے، حقیقت یہ ہے کہ ملک کے سیاسی انقلاب میں مسلم طور سے بہت بڑا حصہ لیا، اس واقعہ کے کئی برس کے بعد تک یہ نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں اور اب بھی ہیں۔

اس واقعہ کے وقت مولانا بمبئی میں تھے اور راقم الحروف کلکتہ میں الہلال کے ادارہ میں شامل تھا، اس واقعہ کو واقعہ بنانے، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمانانِ کان پور کی پر جوش حمایت میں کھڑا کر دینے اور مقتول شہیدوں کے عزیزوں کی دل دہی و دست گیری، زخمیوں کی غم خواری و تیمارداری اور قیدیوں کی قانونی چارہ جوئی کا غیر محدود جذبہ جس کی زبان و قلم کا سب سے زیادہ مرہون ہے، وہ مولانا ابوالکلام کی ذات ہے، اس زمانہ کے مشہور بیرونی مسٹر مظہر الحق پٹنہ کو کان پور بھیجنا اور ان کے ساتھ

۱۔ شیوخ فاروقی میں تھے، پچھراہ (بہار) کا ایک گاؤں فرید پور نامی ان کا وطن تھا، انٹرنس کے بعد انگلستان گئے اور بیرونی ہوئے، یہ اور گانگھی جی ایک ساتھ ایک جہاز میں بیرونی ہو کر ہندوستان واپس آئے تھے، پٹنہ میں بیرونی کرتے تھے، کانگریس کے حامی تھے اور مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھے، نہایت پر جوش اور بے باک لیڈر تھے، کنسل اور اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے، وقف اولاد کے کاموں میں مولانا کو زیادہ مشورہ ان ہی سے ملتا تھا، کانگریس اور لیگ کے ملائے میں ان کا بھی حصہ تھا، ۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک میں شامل تھے اور ترک موالات کے سلسلہ میں پریکٹس چھوڑ دی تھی، پٹنہ میں صداقت آشرم کے نام سے ایک سیاسی خانقاہ بنا کر اس میں گوشہ نشین فقیر بن کر بیٹھ گئے، یا تو زندگی سراسر انگریزی تھی اور یا بدلتی تو ایسی بدلتی کہ گلاس میں پانی تک نہ پیتے تھے کہ یہ انگریزی چیز ہے، مس کے کٹورے میں پانی پیتے تھے، تہ بند باندھتے تھے اور انگریز کھانپتے تھے، سپید داڑھی سینے تک لمبی ہو گئی تھی، زمین پر بیٹھتے تھے اور اسی پر سوتے تھے اور اسی سلسلہ میں روحانیت یعنی اسپرینچوایلیزم کا شوق پیدا ہو گیا تھا، لمبا قد، گورا رنگ، بلند آواز، اسی فقیری اور گوشہ گیری کی حالت میں جنوری ۱۹۳۰ء میں وفات پائی، ستر برس کے قریب عمر ہوئی ہوگی۔

ہر صوبہ کے ممتاز و کیلوں اور بیرسٹروں کا کان پور جانا، ان ہی کی تحریک کا فیض تھا، مقامی حیثیت سے سید فضل الرحمن صاحب مرحوم و کیل کان پور کی محنتیں بھی بھولنے کے قابل نہیں، اسی واقعہ نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی کو سب سے پہلے ملک میں روشناس کیا، ملک کے سارے طول و عرض میں ان مظلوموں کی حمایت کے لیے مسلمانوں نے بے خطر جلسے کیے، آتشیں تقریریں کیں، آزادی کا پیام سنایا اور مظلوموں کی امداد اور مقدمہ کے مصارف کے لیے تھوڑی سی کوشش میں انہوں نے ایک لاکھ کی رقم ایسی حالت میں جمع کر دی، جب کہ ابھی مسلم یونیورسٹی کے لیے تیس لاکھ اور بائقان و طرابلس میں ٹرکی کی امداد کے لیے ہزاروں روپیے وہ دے چکے تھے اور دے رہے تھے۔

غرض ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ میں یہ واقعہ متعدد حیثیتوں سے ذکر کے قابل ہے، مولانا نے اس واقعہ پر جو پر جوش نظمیں لکھیں وہ اس قدر پر اثر تھیں کہ جس ہفتہ وہ الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمین دار لاہور چھپتیں، ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک اسلامی جوش و خروش کے رجز کا کام دیتی تھیں، اس سلسلہ میں جو سب سے پہلی نظم لکھی، اس میں اب بھی جوش و خروش کا وہی طوفان ہے۔

کل مجھ کو چند لاشے بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خور دسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیز آگئی ہے، منتظر نفعِ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نضہ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دروغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنے سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکہ کان پور ہیں
انہیں اس کا غم تھا کہ وہ اس وقت بمبئی میں کیوں تھے؟

مساجد کی حفاظت کے لیے پولیس کی حاجت ہے خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے

”مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانہ کی ضرورت ہے“
یہ زیور سید سجادِ عالی کی وراثت ہے
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
یہ بچے ہیں سویرے ان کو سوجانے کی عادت ہے
کہ شبلیؒ بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہراہ سے یہ صدا آئے
پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
شہیدانِ وفا کے قطرہٴ خون کام آئیں گے
عجب کیا ہے جو نو خیزوں نے سب سے پہلے جائیں دیں
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہے آوازیں

ان کے دلی تاثر کا اندازہ ان دو قطعوں سے کیجیے:

اگر چہ صدمہٴ بلقان سے جگر شق ہے
کہ کان پور کے بھی زمینوں کا کچھ حق ہے
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
کچھ بیلقان کہ خاک میں کچھ کان پور میں

اگر چہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
پجار کھے ہیں مگر میں نے چند قطرہٴ خون
کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم
سن لو وہ گنج ہائے گراں مایہٴ ذن ہیں

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مسٹر بلٹرزڈ پٹی کمشنر کان پور کو مزاد دی جائے، مسجد اپنی جگہ پر پھر بنوادی
جائے، قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے اور متوتلوں کا خون بہا ادا کیا جائے، سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر یوپی
اڑے تھے کہ مسٹر بلٹرز جو فیصلہ کر چکے اس میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔

ابھی دو برس پہلے دہلی کی تاج پوشی کے موقع پر تقسیمِ بنگالہ کی تینخ کا تماشا ہو چکا تھا کہ لارڈ
کرزن کی تقدیر مہرم کو شہنشاہِ برطانیہ نے آکر بدل دیا تھا، جس کے متعلق وائسرائے اور وزرائے
برطانیہ بار بار کہہ چکے تھے کہ یہ طے شدہ اور ناقابلِ تغیر مسئلہ ہے، مولانا نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ
کر کے تعریض و تلخج کے رنگ میں یہ دو فارسی قطعے ارشاد فرمائے:

نیست ممکن کہ دگر بگذرد از گفتمہ خود

حضرت لاٹ بفرمود کہ فرما فرمائے

جیمس مسٹن وائسرائے

نگبے گرد و بفرمود کہ ”من کردم و شد“

صدر اعظم بہ سوئے قسمت بنگالہ شرق

وزیر اعظم

مولانا نے فرمایا کہ اس اصول کی استواری کا حال تقسیمِ بنگالہ کے مسئلہ میں معلوم ہو چکا، اب

جب وہ بنگالیوں کے انجیکیشن سے بدل چکا تو اب مسلمان بھی اس فیصلہ کو بدلوائے بغیر دم نہیں لیں گے،
 ”گر بہ کشتن روز اول باید“

جناب لاٹ از فرمودہ خود برنی گردد کہ تمکین حکومت ریاست بیشتر باید
 دلے در قسمت بنگالہ این اندیشہ می بایست کہ گر بہ کشتن اول روزی باید اگر باید

سر سید علی امام مرحوم اس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل میں ممبر تھے، انہوں نے مولانا محمد علی
 مرحوم کو اور ان کے ذریعہ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کو مصالحت کا پیام دیا اور صلح کی گفت و
 شنید کا آغاز ہوا اور بات یوں شروع ہوئی کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، ملزموں سے مقدمہ اٹھالیا
 جائے گا اور مظلوموں کو مالی امداد دی جائے گی لیکن مسجد کا جو حصہ توڑ دیا گیا ہے وہ اب اسی طرح چھوڑ دیا
 جائے اور مسلمان اس کو دوبارہ بنوانے پر اصرار نہ کریں، یہ سن کر مولانا نے یہ قطعہ لکھ کر چھپوایا:

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادہ صلح
 لیکن انعام گرانقدر و وظائف کی طبع
 مایہ بحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے
 داد خواہ حق مسجد ہیں اسیران جفا
 ہم سے خود ذوق اسیری نے یہ کانوں میں کہا
 جز مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر
 آپ کہتے ہیں وضو خانہ تھا، مسجد تو نہ تھی
 آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ
 بند کرتے ہیں جو یہ آپ جرائد کی زبان
 اور بھی برہمی طبع کا سماں ہے یہ
 فتح اس طرح کیا کرتے ہیں اقلیم قلوب
 اور ہی کچھ ہے گرفتاری دل کی تدبیر
 جبر سے برہمی عام کا رکنا ہے محال
 داد خواہوں سے ہزار نے جو ارشاد کیا
 یہ اگر سچ ہے تو جز خوبی تقدیر نہیں
 یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
 دیت قتل شہیدان جواں میر نہیں
 ورنہ ان کی گلہ سختی تقدیر نہیں
 کہ خم طرہ محبوب ہے زنجیر نہیں
 آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
 یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں
 حامل فقہ نہیں، واقف تفسیر نہیں
 یہ بھی کچھ مانع آزادی تحریر نہیں
 فتنہ عام کے دہنے کی یہ تدبیر نہیں
 تیر ترکش میں نہیں، ہاتھ میں شمشیر نہیں
 سختی طوق و گراں باری، زنجیر نہیں
 یعنی اس خواب پریشاں کی یہ تعبیر نہیں
 کہ ”یہ حکم ازلی قابل تغیر نہیں“

حسن ظن کے جو گرفتار تھے وہ بول اٹھے اس مرقع میں بھی اسلام کی تصویر نہیں
ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک پھر نہ کہیے گا کہ فتراک میں نچیر نہیں

بالآخر مصالحت کی تدبیر کامیاب ہوئی، لارڈ ہارڈنگ وائسرائے خود کان پور آئے اور سر علی امام نے صومت کی طرف سے اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی مٹھی نے مسلمانوں کی نیابت فرما کر معاملہ کو اس طرح طے فرمایا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے، مقدمے واپس لے لیے جائیں اور مسجد جو بلندی پر تھی اس کے ٹوٹے ہوئے حصہ کو اس طرح بنایا جائے کہ اوپر چھت دے کر وضو خانہ پھر قائم کر دیا جائے اور چھت کے نیچے سے سڑک کی آمدورفت کا راستہ رہے، اس فیصلہ کو سب نے منظور کیا اور وائسرائے نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان پر مسلمانوں کے احرار اور وفادار دونوں طبقوں نے شکرگزاری کا اظہار کیا، مولانا نے وائسرائے کو خطاب کر کے حسب ذیل قطعہ میں اپنی شکرگزاری کا فرض ادا کیا:

اے ہمایوں گہر و افسر اور نگِ شبلی وہ کیا تو نے جو آئین جہاں بانی ہے
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست یہ حقیقت میں ظفرِ مندیِ سلطانی ہے
تو نے سمجھا کہ رعایا کا وہ انبوہ وہ جوش گرچہ زائد نہ سہی فطرتِ انسانی ہے
تیرے لطف و کرم نام نے دے دی یہ ندا کوئی مجرم ہے نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے
تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا بازوں میں یہ تیرے زور جہاں بانی ہے
بات رکھ لی تری تقریر نے حکام کی بھی گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی
تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراقِ سپاس ان میں یہ پیش کشِ شبلی نعمانی ہے

اور مولانا ابوالکلام کو جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے سب سے مقبول رہنما اور اس تحریک کے جان تھے، لکھا ”برادرم! کان پور کا معاملہ جس طرح ہوا، فیصلہ ہو گیا، اب سردست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔“ (ابوالکلام-۳۸)

چنانچہ اسی پر اس کا خاتمہ ہو گیا، مظہر الحق صاحب کے پاس جو ہزاروں روپے جمع ہو گئے تھے، اس سے برسوں تک کان پور کے مظلوموں اور بیواؤں کی امدادیں ہوتی رہیں، پھر وہ سلسلہ بند ہو گیا۔
سیاسیات ہند | ملکی معاملات میں وہ ہمیشہ سے آزاد تھے اور آزاد رہے، حالانکہ وہ ایک ایسے

گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جس نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حکومتِ وقت سے وفاداری اور حکامِ شہر سے تابع داری میں نیک نامی حاصل کی تھی، ان کے والد ماجد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے اپنی ساری عمر حکامِ ضلع کی خوشنودی کی دولت جمع کرنے میں صرف کی تھی، وہ گھر سے نکل کر علی گڑھ گئے تو وہاں کی فضا بھی یہی تھی، وہاں کے آنے جانے والے بھی وہی تھے، بلکہ اس موضوع نے وہاں قومی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس سے انکارِ ارتداد سے کم نہ تھا، اس لیے ان موانع کے ساتھ مولانا کی سیاسی آزادی ان کی فطری صلاحیت کے سوا کسی اور سبب کی ممنون نہیں ہو سکتی۔

مولانا اپنے ایک خط میں جو معارف میں چھپ چکا ہے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

”رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ ان سے

مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں“ (معارف نومبر ۱۹۲۳ء ص ۳۹۴)

خواجہ غلامِ انتقلین مرحوم جو سرسید اور مولانا شبلی کے زمانہ کے علی گڑھ کالج میں پڑھے ہوئے تھے اور دونوں سے اچھی طرح واقف تھے، مولانا کے سانحہ وفات پر اپنے ”عصر جدید“ (مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء) میں لکھتے ہیں ”سرسید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوئے تھے، اس لیے کالج کی پروفیسری کے زمانہ ہی سے مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔“

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل رادی ہیں کہ سرسید نے لکھنؤ میں کانگریس کے حالات جو مشہور تقریر کی تھی مولانا نے اپنا نام چھپا کر علی گڑھ گزرتے میں اس کا جواب لکھا تھا۔

۱۸۹۲ء میں یونین کے ایک جلسہ میں شخص اور جمہوری حکومت پر جو مباحثہ ہوا تھا اور مولانا نے جمہوریت کی تائید پر جو تقریر کی تھی اور سرسید نے اس کے جواب میں اپنے گزرتے میں جو مضمون لکھا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

بایں ہمہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی بحث سے آگے نہیں بڑھی تھی، وہ اپنی مجلس میں بیٹھ کر کانگریس کے مطالبوں پر رجز خوانی اور مسلمانوں کی سیاسی گمراہی کا ماتم کیا کرتے تھے اور بس اردو اخباروں میں ”ہندوستانی“ لکھنؤ کو جسے لکھنؤ کے کانگریسی لیڈر گنگا پرشاد درمانکا لیتے تھے، بہت شوق سے پڑھتے تھے اور اس سے اثر لیتے تھے لیکن دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیمِ بنگال کی تیئج نے دفعہ لبوں کی مہر کو

توڑ دیا، نواب وقار الملک کے مضمون کے بعد جو دوسرا بہادرانہ مضمون اس انقلاب کی بشارت لے کر نکلا وہ مولانا شبلی ہی کا تھا، جس کی سرخی ”مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ“ ہے، مسلمانوں میں مستقل سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے آزاد اخبارات کا وجود بہت ضروری تھا، اس وقت لاہور سے زمین داروں سے ہمدرد اور کلکتہ سے الہلال جیسے اخبارات نکل رہے تھے اور یوپی جو اصل میں مسلمانوں کا تمدنی و سیاسی مرکز تھا، اس قسم کے اخباروں کے وجود سے خالی تھا، مولانا نے اس کمی کو پورا کرنا چاہا۔

مسلم گزٹ ۱۹۱۲ء | اس زمانہ میں لکھنؤ میں ایک عالی ہمت نوجوان سید میر جان صاحب تھے، انہوں نے ان دنوں لکھنؤ کی گرسریوں میں بہت اچھا خاصا حصہ لیا تھا، ایک ریڈنگ روم قائم کیا تھا، مولانا نے ان دنوں امین آباد پارک کی شمالی قطار میں ایک بلاخانہ کرایہ پر لیا تھا، اس میں رہتے تھے، اسی کے پاس یہ ریڈنگ روم تھا، سید میر جان صاحب اکثر مولانا کی خدمت میں آیا جابا کرتے تھے، مولانا نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایک آزاد مسلمان اخبار جاری کریں، جس کے تبادلہ میں اخبارات آئیں گے بھی اور صحیح خیالات کی ترویج بھی ہوگی، انہوں نے اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے مضامین کی نگرانی مولانا اپنے ذمہ لیں، انہوں نے اس کو قبول کیا اور اسی طرح مسلم گزٹ کے نام سے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے اخبار نکلا۔

اخبار کی ایڈیٹری کے لیے مولانا نے مولوی وحید الدین صاحب سلیم کو پسند کیا، جو اس سے پہلے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ اور معارف (علی گڑھ) کے ایڈیٹر تھے، ان کا کمال یہ تھا کہ وہ پورا اخبار تیار کر لیتے تھے، بڑے لکھنے والے تھے اور جو لکھتے تھے وہ ٹھوس لکھتے تھے، اس میں نری لفاظی اور بھرتی نہیں ہوتی تھی لیکن دقت یہ تھی کہ علی گڑھ کے زمانہ میں ان کے والد اور مولانا کے درمیان میں بعض معاملات میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس کی بنا پر مولوی وحید الدین صاحب سلیم کا دل مولانا کی طرف سے صاف نہ تھا، الفاروق نکلی تو مئی ۱۸۹۹ء میں مولانا شروانی نے اس پر یو یو لکھا اور اس کو مولوی وحید الدین صاحب کے رسالہ معارف علی گڑھ میں چھپوانا چاہا، تو مولانا نے شروانی صاحب کو لکھا ”بہتر ہے معارف میں بھیج دیجیے، مگر پہلے ان سے پوچھ لیجیے کہ چھاپیں گے یا نہیں؟“ ایڈیٹر صاحب مجھ سے خفا ہیں“ (شروانی ۵) مگر بہر حال وہ ریویو اس میں چھپا، اس کے دو ہی برس کے بعد ۱۹۰۱ء میں جب حیات جاوید نکلی تو اس اختلاف کی بنا پر جو مولانا کو مر سید کے بعد خیالات یا کچھلی کارروائیوں سے تھا اور جن کا ذکر حیات جاوید میں نہیں یا بہت ہلکا ہے، مولانا نے اس کتاب کو مدلل مداحی یا کتاب المناقب کہا، جس سے مولانا حالی کی تنقیص

مقصود نہ تھی، بلکہ یہ مقصود تھا کہ اس کتاب میں صاحب سوانح کی زندگی کے دونوں رُح نہیں، مولانا حالی کو اس کمی کا احساس خود بھی تھا، چنانچہ انہوں نے دیباچہ میں خود اپنے اس احساس کی تشریح اور اپنے طرز عمل کی توجیہ کی ہے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ ”میں نے جو ریو یو حیات جاوید پر لکھا تھا، اس میں یہ پہلو بسط سے دکھایا تھا، مولانا نے اس کو پڑھ کر لکھا کہ اگر اور ریو یو بھی ایسے لکھے جائیں تو کتاب کا زہر بہت کچھ کم ہو سکتا ہے۔

بہر حال مولانا کی اس تنقید سے مولانا حالی کے بعض خاص عقیدت مندوں کو بڑی تکلیف پہنچی اور اس وقت سے ان صاحبوں کے قلم سے جب کوئی ایسا مضمون نکلا جس میں مولانا شبلی کا ذکر کسی طرح آسکتا ہو تو اس کو قصداً لایا گیا اور ان پر چند ناملائم حرف کہنا صداقت کا منشا سمجھا گیا، حالانکہ خود ان دونوں بزرگوں کے دل باہم صاف تھے اور دونوں ایک دوسرے کے پورے جوہر شناس تھے۔

غرض یہ کہ اس اختلاف کے باوجود مولانا نے ان کو اڈیٹری کے لیے منتخب کیا اور وہ خود کسی تقریب سے علی گڑھ گئے تو مولوی وحید الدین صاحب سلیم سے اور ان سے مولانا حمید الدین صاحب کے قیام گاہ پر ملاقات ہوئی اور طرفین کے گلہ و شکایت کے بعد جس میں سرسید کی لائف لکھنے کے پرانے واقعہ سے حیات جاوید تک کے معاملات پر گفتگو ہوئی اور آخر کار پرانی شکایتوں کی بساط لپیٹی گئی اور باہم لطف و محبت کا نیا عہد نامہ مرتب ہوا اور مولوی صاحب مسلم گزٹ کی اڈیٹری کے لیے لکھنؤ تشریف لے آئے اور مولانا کے قریب ہی ایک دوسرے بالاخانہ میں قیام کیا اور مسلم گزٹ ایک آزاد اخبار کی حیثیت سے بہت کام یابی سے نکلا اور دو سال تک نکلتا رہا اور مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء تک اس کے اڈیٹر رہے۔

شروع شروع میں مولوی صاحب اور مولانا میں بڑا اتحاد رہا، اکثر ساتھ نشستیں رہتیں، صحبتیں چھنتیں اور معاملات پر گفتگو اور اخبار کی سیاست کی تجویزوں پر بحثیں ہوتی، مولانا اس اخبار میں کبھی اپنے نام سے اور کبھی بے نام کے مضامین اور نوٹ لکھتے تھے، اس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ خاص مولانا کا اخبار ہے، اس لیے اس اخبار کی پسندیدگی کا سارا کریڈٹ مولانا کے حصہ میں آتا رہا، مولانا کا خیال تھا کہ مولوی وحید الدین صاحب کو یہ امر ناگوار ہوا اور وہ اس کی فکر میں رہے کہ کوئی ایسا موقع آئے جس میں

۱۔ بروایت مولوی اقبال احمد صاحب سہیل جو اس وقت وہیں موجود تھے۔

خود مولانا کے مقابلہ میں وہ اپنی آزادی کا ثبوت دیں، چنانچہ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کے سلسلہ میں ان کو یہ موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے نہایت ناموزوں طریقہ سے مولانا کے خلاف سخت و درشت مضمون لکھنے اور چھاپنے شروع کیے، پھر ۱۹۱۳ء میں طلبائے ندوہ کی اسٹرائیک کی تقریب سے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا تا کہ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ اخبار سارا مولانا کا ساختہ و پرداختہ ہے، دور ہو جائے، اسی درمیان میں مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء میں پولیٹیکل وجوہ سے گورنمنٹ کے حکم سے لکھنؤ سے باہر کر دیے گئے اور یہ سلسلہ ختم ہوا۔

مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ | بہر حال مسلم گزٹ جس سیاسی مقصد کو لے کر پیدا ہوا اور چلا اور بڑھا، وہ تمام تر مولانا کی تجویز و ہدایت کے مطابق تھا، اس وقت تقسیم بنگال کی تیغ، بلقان کی جنگ، مسلم یونیورسٹی کے مطالبات، کان پور کی مسجد اور مسلم لیگ کی اصلاح اور مسلمانوں میں صحیح پولیٹیکس کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش وغیرہ مسائل خاص اہمیت رکھتے تھے اور ان ہی مسئلوں پر مولانا کے مضامین اور نظمیوں نکل رہی تھیں، مسلم گزٹ میں ان کے جو سیاسی مضمون نکلے ان میں سب سے اہم سلسلہ مضمون وہ ہے جو مسلمانوں کے پولیٹیکل کروٹ کے عنوان سے چار نمبروں میں شائع ہوا، حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون اس قدر مدلل اور پر جوش تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا۔

مضمون کا پہلا نمبر جو ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء کو نکلا، اس کا آغاز یہ ہے ”اگر یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگال کے طمانچے سے مسلمانوں کی پالیٹیکس کا منہ پھر گیا تو ہم رضامند ہیں کہ اس تقریب مسرت میں بنگال کے سوا کچھ اور بھی نثار کر دیا جائے لیکن مرکز پالیٹیکس اور اس کے حوالے سے جو صدائیں آتی ہیں، زرد فنا ہونے کے ساتھ خود ان کا لہجہ بھی غلط ہے۔“

پانچواں مسلمان نامہ نگار لکھتا ہے کہ ”چوں کہ اب نظر آتا ہے کہ ٹرکی اور ایران کے کم زور ہونے کی وجہ سے ہمارا فارن رتبہ قائم نہیں رہے گا، اس لیے ہم کو ہندوؤں سے مل جانا چاہیے“ ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے لیکن یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی اور ہمیشہ اچھی بات رہے گی لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے، وہ اسلام کا تنگ ہے، کیا ہم کو ہمسایوں کے دامن میں اسی لیے پناہ لینا چاہیے کہ اب ہمارا کوئی سہارا نہیں رہا، کیا اگر ٹرکی اور ایران پر زور ہوتے تو ہمارے ہم سایہ کے مقابلے میں مدد کر سکتے؟ کیا شملہ ڈیپوٹیشن کی اس فحاری پراگریزوں کو یقین آگیا تھا کہ ہمارا پولیٹیکل وزن اپنے ہم سایوں سے زیادہ ہے؟

۱ مکاتیب سلیمان - ۵۳ نیز دیکھیے عبدالباری - ۵۔

اس کے بعد نواب وقار الملک بہادر کے اس بہادرانہ مضمون کا ذکر ہے جو تیشخ بنگال کے بعد ان کے قلم سے نکلا لیکن ان کی اس رائے سے کہ ”مسلمان کانگریس میں شرکت کریں گے تو ان کی ہستی فنا ہو جائے گی“ اتفاق نہیں کیا، لکھا ”نواب وقار الملک کا سنجیدہ لیکن بہادرانہ مضمون ایک سچے دلیر مسلمان کی آواز ہو سکتا تھا، اگر اس میں یہ غلط منطق شامل نہ ہو جاتی کہ ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائے گی، جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں، اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کروڑ اور مسلمانوں کے پانچ کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے اگر داد بھائی نوروز جی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا ہے، اگر گوکھلے تو ہمارا ینارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۵ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔“

غرض دلائل اگرچہ غلط ہیں لیکن بات بالکل صحیح ہے کہ پولیٹیکل خواب سے بیدار ہونے کا وقت آ گیا ہے، اس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی غفلت پر ماتم کیا ہے، ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے، وہ پالیٹکس کی تحقیق تھی، ہماری پالیٹکس کا کعبہ دراصل بت کہہ تھا، ہماری پالیٹکس جس کی آواز کلمہ شہادت کی طرح ولادت کے دن سے ہماری کانوں میں پڑی، صرف یہ تھی، ابھی وقت نہیں آیا ہے، ابھی ہم کو پالیٹکس کے قابل بننا چاہیے، ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے، ہماری تعداد کم ہے، اس لیے نیابتی اصول سلطنت ہمارے موافق نہیں۔“

یہ الفاظ اس قدر دہرائے گئے کہ قوم کی رنگ و پے میں سرایت کر گئے، ہر مسلمان بچہ ان خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رکھتا ہے، مسلمانوں کی عام جماعت میں جب پالیٹکس کا نام آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نوجوان تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دہراتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدوجہد، سعی و کوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھا گیا، ہم سنتے ہیں کہ گروکل میں تین سو وہ بچے تعلیم پارہے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کر دی ہے اور جو باوجود دولت مندی کے زمین پر سوتے اور کل اوڑھتے ہیں، ہم کو معلوم ہے کہ پونا میں سروٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے، جہاں اس وقت ۲۹- بی، بی، اے

پالیٹکس کی تعلیم پارہے ہیں جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے اور ان کی کل زندگی کی قیمت صرف ۳۰ روپیہ ماہوار ہوگی، ہم واقف ہیں کہ فرگوسن کالج میں ۱۹ پروفیسروں نے جن میں سے کوئی بی اے سے کم تعلیم یافتہ نہیں، صرف ۷۵ روپیہ ماہوار پر اپنی تمام عمر فروخت کر دی ہے، ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آریہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد ہندو پروفیسر ہیں، جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں، لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں، یہ تمام پر جوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات ہمارے دلوں میں ایک ذرہ جنم نہیں پیدا کر سکتے، ہماری قومی درس گاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی، ہمارا قومی تربیت یافتہ گریجویٹ قومی کام میں نریخ بازار سے ایک حسب اپنی قیمت نہیں کم کرتا، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہمارا پولیٹیکل احساس بالکل مر گیا ہے۔

دنیا میں صرف آئیڈیل (مطح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات و احساسات کو برا بھونکتا کر سکتی ہے، ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تار کا ہے؟ ہمارا کیا منجھائے خیال ہے؟ بی، اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پر زور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لیے زہتیں برداشت کی جاسکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا اولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟ کیا اس ذوق میں فرش خاک پھولوں کی بیج بن سکتا ہے؟

اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جنم اور بزدلی چھا گئی، ہمارے پولیٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے، ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظام حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے اور پھر پارلیمنٹ اور وائسرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں اور سرسید سے فتویٰ پوچھتے ہیں، یہاں تک کہ مرحوم کو علی گڑھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑتا ہے کہ ”تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں“ ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لیے یہ شرط پیش کی کہ صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے۔

جب ہم اس اختلاف حالت کا سبب پوچھتے ہیں تو ہمارے لیڈر یہ نازک فرق ہم کو سمجھاتے ہیں کہ ”ہندو مچھر ہیں“ اس لیے گورنمنٹ کو ان کی بھن بھناہٹ کی پروا نہیں لیکن مسلمان شیر نیتاں ہیں، ان کے ہمہد سے جنگل دہل جاتا ہے، خیر! یہ فریب کاری ختم ہو چکی، غفلت کا دور گزر چکا، قوم میں

ایک احساس پیدا ہو چلا ہے اور صرف یہ متعین کرنا رہ گیا ہے کہ نئی زندگی کا طریق عمل کیا ہوگا؟
مضمون کے دوسرے نمبر میں حسب ذیل امور پر بحث کی ہے:

(۱) پالیٹکس کی صحیح اسکیم۔

(۲) ہمارے موجودہ طریقہ کی غلطیاں۔

(۳) ہندو مسلمانوں کا اتحاد۔

پھر لکھا ہے کہ مسلمان دو حیثیتیں رکھتے ہیں، ایک یہ کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا ہیں، (موجودہ زمانہ میں اس کو یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہندوستانی ہیں) اور دوسری یہ کہ وہ مسلمان ہیں، اب مسلمانوں کی پالیٹکس کا ہیوٹی ان ہی دو جزؤں سے بن کر تیار ہوگا، اس سلسلہ میں مولانا نے پہلے شخصی حکومت کے بہ جائے جمہوری حکومت کی تائید کر کے اس غلطی کو دور کیا ہے کہ سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی، وہ ان کی ذاتی رائے تھی، بلکہ ان کے پس پشت کوئی اور قوت تھی جو کالج کے فائدے دکھا کر اور مسلمانوں کی تعلیمی کم زوری سے ڈرا کر گویا زبردستی ان کے منہ سے یہ کہلواری تھی، چنانچہ سرسید کی سیاسی آزادی کے چند واقعات نہایت بلیغ انداز میں گنوا کر فرماتے ہیں ”ایسے بہادر کو حالات اور گرد و پیش کے واقعات نے اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا آج جواب دینا غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔“

اس کے بعد سرسید کی لکھنؤ والی تقریر کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر واقعات سے اس کا مدلل اور مسکت جواب دیا ہے، آخر میں کہتے ہیں ”بہر حال سرسید نے اگر نیشنل کانگریس سے روکا تو اچھا کیا، کانگریس میں شریک ہونا پھر بھی تقلید تھی، جو ہمارا عار ہے، ہم کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے، ہم کو اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیے، ہماری ضروریات ہندوؤں کے ساتھ مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی، اس لیے ہم کو ایک جداگانہ پولیٹیکل اسٹیج کی ضرورت ہے، اس موقع پر پہنچ کر دفعۃً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے، مسلم لیگ یہ عجیب الخلقیت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدا نخواستہ نہیں، اینٹی کانگریس ہے؟ نہیں، کیا ہاؤس آف لارڈس ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے۔“

مضمون کے ان دو نمبروں کا شائع ہونا تھا کہ سارے ملک میں کھلبلی مچ گئی، فیض آباد اور

راولپنڈی میں ان کے خلاف تحریک کھڑی کی گئی اور ساتھ ہی اسی جرم میں نواب وقار الملک کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی، اس پر مولانا نے اپنے مضمون کا تیسرا نمبر لکھا، جس کا آغاز ان فقروں سے ہے ”ہمارے پچھلے دو آرٹیکلوں نے ہمارے دوستوں کو سخت برہم کر دیا ہے، ہمارا جرم مفرد جرم نہیں، بلکہ سینکڑوں جرائم کا مجموعہ ہے، ہم نے مسلمانوں کی سی سالہ پالیٹکس کی بے احترامی کی، ہم نے مسلمانوں کی پولیٹیکل پالیسی سے بغاوت کی، ہم نے ”اتفاقِ عام“ کے شیرازہ کو درہم برہم کرنا چاہا، ہماری گستاخیوں سے ڈرے کہ لیڈروں کی عظمت و شان میں فرق آجائے، ہمارا لہجہ سخت ہے، ہم لیگ جیسے پرزور انسٹیٹیوشن کی عظمت کے منکر ہیں، ہم مصنف کے درجہ پر قانع نہ ہو کر پولیٹیکل لیڈر بننا چاہتے ہیں، ہم کونسل کی ممبری کے امیدوار ہیں۔“

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ کی غلط پالیسی پر پورا تبصرہ کر کے صحیح پالیٹکس کا ایک نظام پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں یہ فقرہ کتنا بلیغ اور معنی خیز ہے ”اگرچہ ہم آگے چل کر صحیح پالیٹکس بتائیں گے لیکن سچ یہ ہے کہ صرف یہ سمجھ لینا کہ موجودہ پالیٹکس غلط ہے، یہی صحیح پالیٹکس ہے۔“

پھر مسلم لیگ کی کیا حقیقت ہے اور وہ کیوں کر عالم وجود میں آئی، اس پر چند فقرے ہیں:

”اس بنا پر پالیٹکس کی بحث میں سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی، مسلم لیگ کیوں قائم ہوئی؟ کب قائم ہوئی؟ کس نے قائم کی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ وحی (بہ قول سر سید مرحوم) خود دل سے اٹھی تھی یا کوئی فرشتہ اوپر سے لایا تھا؟

یہ سوالات اگرچہ اصل مسئلہ پر کسی قدر اثر رکھتے ہیں اور اگرچہ ان کے جواب دینے کا حق ہم کو اسی قدر حاصل ہے جس قدر خود بانی اول کو (کیوں کہ جب یہ تماشا ہو رہا تھا تو مجھ کو پردہ کی طرف جھانکنے کی اجازت تھی) تاہم اس سے ضروری تر باتیں درپیش ہیں اور ہم کو پہلے ان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

امور تنقیح طلب حسب ذیل ہیں:

- ۱- کیا لیگ کا کانسٹیٹیوشن پالیٹکس سے مطابقت رکھتا ہے؟
- ۲- کیا اس میں پالیٹکس کی علامات پائی جاتی ہیں؟
- ۳- کیا مسلم لیگ، مسلم لیگ رہ کر کسی کام کے قابل ہو سکتی ہے؟

لیگ کا سنگ اولین شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا اور اب یا آئندہ جو کچھ اس کا ترکیبی نظام قرار پائے، ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی، ڈیپوٹیشن کا مقصد سراسر ایسا تھا اور یہی ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے (اپنی ہی سالہ جدوجہد سے) حاصل کیے ہیں اس میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے۔

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ اور کانگریس کی رودادوں سے ان دونوں کے مطالبات کی قدر و قیمت کا موازنہ کیا ہے اور دونوں کے تخیل اور طریق عمل کے فرق کو دکھایا ہے، پھر آخر میں مسلم لیگ کے نظامِ ترکیبی پر بحث کی ہے اور پوچھا ہے ”سب سے آخری بحث یہ ہے کہ مسلم لیگ کا نظام ترکیبی کیا ہے؟ اور کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہے اور اس کو اپنے صدر انجمن کے لیے نیابت صدر کے لیے، سکرٹری شپ کے لیے، ارکان کے لیے، اضلاع کے عہدہ داروں کے لیے، وہ مہرے مطلوب ہیں، جن پر طوائف رنگ ہو لیکن پلٹھکل بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے، کیا ایک معزز رئیس ایک بڑا زمین دار، ایک حکام رس دولت مند، اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے، ہندوؤں کے پاس زمین داری، دولت اور خطاب کی کمی نہیں لیکن کیا انہوں نے تیس برس کی وسیع مدت میں کسی بڑے زمین دار یا تعلقہ دار کو پریسیڈنٹی کا کرسی نشین کیا؟ کیا اس کے پریسیڈنٹوں میں کسی کا سر خطاب کے تاج سے آراستہ ہے۔“

مولانا نے اس کے بعد اضلاع میں مسلم لیگ کی شاخوں کی ضرورت پر اس لیے بحث کی ہے کہ سارے اضلاع میں چون کہ ایسے مسلمان نہیں مل سکتے جو بہادری سے صحیح پالیٹکس پر چل سکیں، اس لیے حالت یہ ہوئی ہے کہ جاہ پسند دولت مندوں کی تلاش ہوتی ہے اور چار و ناچار ان کے سر پر یہ تاج رکھ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد صحیح پالیٹکس کا نظام پیش کیا ہے اور اس کی پہلی دفعہ یہ لکھی ہے:

۱- سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے دائرہ کو وسعت دے، چھوٹی چھوٹی باتیں جو کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے علاوہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے، جن پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، مثلاً ایک بندوبست کا مسئلہ ہے جس کو لیگ نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا، یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ہندوستان کی سرسبزی کا مدار ہے، ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کاشت کار روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں، ہر بندوبست مال گذاری کی

مقدار میں اس قدر اضافہ کر دیتا ہے کہ جو زمینیں موسیٰ کا حق تھیں ان کو اپنے کام میں لانا پڑتا ہے، چارہ نایاب ہوتا جاتا ہے، چراگا ہیں، مزرعہ بنتی جاتی ہیں، ایک فصل بھی اگر کمی کر جائے تو فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی ہے، ہزاروں کاشت کار گھر چھوڑ کر نئی آبادیوں میں بھاگتے جاتے ہیں، مالگڈاری کے وقت ہزاروں لاکھوں کے زیورات رہن ہو کر بے درد مہاجنوں کے گھر پہنچ جاتے ہیں، بائیس ہمہ ہر تیسویں سال نیا بندوبست ہوتا ہے اور زمین دار نئے بندوبست کے نام سے دہل جاتا ہے۔

فرض کرو کہ اگر بنگال کی طرح ہمارے ملک میں بھی استمراری بندوبست ہو جائے تو یہ ہندوستان کے حق میں رحمت ہو گا یا یہ کہ چند مسلمانوں کو موجودہ تعداد سے زیادہ نوکریاں مل جائیں؟

۲- سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام انتظامی کاموں میں یہ خواہش کی جائے کہ ہندوستانیوں کی شرکت ہو، گو کھلے نے یہ بل پیش کیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک کونسل چھ آدمیوں کی قائم ہو اور کلکٹر ضلع ان کے مشورہ سے انتظامی امور عمل میں لائے، کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اپنا حال ہم دوسروں سے زیادہ جان سکتے ہیں، کس کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ اپنی تکلیف کا جس قدر احساس ہم کو ہو سکتا ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ سب سے عمدہ تدبیر تھی جو ملک کی بہبودی کے لیے پیش کی جاسکتی تھی لیکن یہ بل نامنظور کر دیا گیا، مختصر یہ کہ بہ جز کسی خاص رزولوشن کے باقی تمام ان تجاویز کو جو کانگریس میں پیش کی جاتی ہیں، مسلم لیگ کو اپنے پروگرام میں داخل کرنا چاہیے، جس طرح ہندوؤں کا ماڈریٹ فرقہ کرتا ہے۔

۳- مولوی امیر علی صاحب نے حال میں جو صورت تجویز کی ہے، یعنی یہ کہ مشترکہ مسائل میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ اسٹیج قائم ہو اور جب حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن جائے تو دونوں گروہ کے ممبر برابر کے شریک ہوں، یہ نہایت صحیح تجویز ہے اور اس کو فوراً اختیار کرنا چاہیے۔

۴- مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی بڑے بڑے زمین داروں اور علاقہ داروں سے بالکل خالی کر لی جائے، صرف وہ لوگ شریک کیے جائیں جو آزادی اور حق گوئی کے ساتھ اظہار رائے کر سکیں۔

۵- سب سے بڑی اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ قومی پارلیمنٹس کا ذوق پیدا ہو جائے، پارلیمنٹس ایک وسیع علم ہے، اس کے مسائل اور معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ ہے، ان کو بقدر ضرورت اپنی زبان میں لایا جائے، مہمات مسائل پر رسالے اور پمفلٹ شائع کیے جائیں، کچھ لوگ مقرر کیے جائیں جو ملک میں دورہ کریں اور پولیٹیکل مسائل پر عالمانہ لکچر دیں، جو دلائل معلومات اور اعداد پر مبنی ہو۔

۶- چند لوگ آزریری یا تنخواہ دار مقرر کیے جائیں، جو کسی کسی خاص مسئلہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، مثلاً کسی ایک ضلع کے صدر مقام میں قیام کر کے ان امور کی تحقیقات کریں کہ تیس برس پہلے ضلع کی کیا حالت تھی؟ کتنے بڑے بڑے زمین دار تھے، کن لوگوں کے پاس زمین داریاں تھیں، اب کیا حالت ہے، کتنی زمین داریاں نیلام ہو گئیں، کس قسم کے قرضوں میں نیلام ہوئیں، بندوبست کا کیا اثر پڑا، کاشت کاروں کی کیا حالت ہے، کتنے آدمی دوسرے ممالک میں چلے گئے، اس قسم کے اعداد اور واقعات سے پرنسٹنچ یا دداشتیں تیار ہو سکیں گی اور گورنمنٹ ان سے فائدہ اٹھا سکے گی۔

آپ نے دیکھا کہ صحیح پالیسی کے متعلق ان کا نظریہ کیا تھا، مضمون کے آخر میں انہوں نے ہندو مسلمانوں کے مصالحنہ اتحاد کے مسئلہ پر بحث کی تھی اور بتایا تھا کہ مغلوں کی حکومت کے دور میں یہ مصالحنہ اتحاد باہمی محبت اور رواداری کیوں کر پیدا ہوئی اور اب بھی وہ ممکن ہے۔

مسلم لیگ کی اصلاح | ان مضامین نے مسلمانوں کے خیالات میں عجیب انقلاب برپا کیا، یہاں تک کہ مسلم لیگ کے ارباب بست و کشاد نے بھی اپنے اندر ترقی اور اصلاح کی ضرورت محسوس کی اور قوم کے بعض ممتاز لیڈروں نے مولانا کو یقین دلایا کہ اب کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۲ء میں لیگ کا نظام بدل جائے گا، مولانا اپنے مضمون کے چوتھے نمبر کے شروع میں لکھتے ہیں، ”پچھلے آرٹیکل میں ہم نے مسلم لیگ کی موجودہ حالت اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق بحث کی تھی، ہم کو مسرت ہے کہ مضمون کے پہلے حصہ سے اکثر بزرگوں کو اتفاق ہے اور قوم کے بعض نہایت ممتاز لیڈروں نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ اب کے سالانہ اجلاس میں لیگ کا نظام قریباً بدل دیا جائے گا اور جو تجویزیں ہم نے لیگ کی اصلاح کی پیش کی ہیں، قریب لیگ اسی قالب میں ڈھل جائے گی، اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہم کو لیگ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوگی اور ہم سب سے پہلے اس کے آگے گردن جھکا دیں گے۔“

لیکن ہندو مسلمانوں کے مصالحنہ اتحاد کے مسئلہ میں مولانا نے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا، اس میں ترازو کے دونوں پلڑے برابر نہیں رہے تھے، یعنی ہندوؤں کی رواداری کو اتنا سہا تھا کہ دوسری طرف مسلمان مجرم نظر آتے تھے، اس لیے اخیر نمبر میں یہ دکھایا کہ ہندوؤں میں یہ رواداری مسلمانوں کی بے تعصبی کے جواب میں تھی اور تاریخی واقعات سے اس پر استدلال کیا، مگر افسوس کہ یہ نمبر ان کی زندگی کے بعد شائع ہوا۔

۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، نظام بدلا، نصب العین کسی قدر اونچا کیا گیا، سلف گورنمنٹ کو لیگ کا مقصد قرار دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ایک ذمہ تعین لفظ بڑھا کر سرکار اور احرار دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی، یعنی ”سوٹ اہل سلف گورنمنٹ“۔

مولانا مرحوم نے لیگ کی اس بوالعجبی پر خوب خوب طنزیہ نظمیں لکھیں اور جو کچھ لکھیں وہ ایسی صحیح نکلیں کہ آج تک ان کی صحت میں فرق نہیں آیا، بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لیگ میں اس وقت جو کچھ انقلاب پیدا ہوا، اس میں دوسرے اسباب کے ساتھ مولانا کے نشتر ریز قلم کا بھی کچھ کم حصہ نہیں، مولوی نظام الدین صاحب بدایونی (اڈیٹرز و القارئین بدایوں) نے کوفہ الشمسین کے نام سے ۱۹۱۵ء میں مولانا شبلی اور مولانا حالی کی وفات پر ایک رسالہ مع مرثیوں کے چھاپا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں ”اس کے علاوہ سلف گورنمنٹ کے ریز ویولوشن کے بانیوں میں بھی مولانا کا نام ایک ذمہ جگہ رکھا ہے، گزشتہ چند سال سے وہ تمام قومی اور سیاسی معاملات کے متعلق اپنی رائے بلند پایہ نظموں کی شکل میں اخبارات میں شائع کراتے رہے۔“ (صفحہ ۲۷)

مولوی سید طفیل احمد صاحب اپنی کتاب ”مسلمانوں کا روشن مستقبل“ میں لکھتے ہیں ”یاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں اب تک زیادہ تر نام جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے آئے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے، قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا، بلکہ انہوں نے ہی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کی دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا، جن میں سب سے اول مولانا شبلی نعمانی تھے..... انہیں موقع ملا کہ وہ اپنا زور قلم مسلم لیگ کا نقطہ نظر بدلنے میں صرف کریں..... مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی کے شریک کاررہے۔“ (طبع دوم از صفحہ ۳۷ تا ۳۹ صفحہ ۳۷)

مسلم لیگ اور کانگریس کا اتحاد | بہر حال مولانا کی یہ کوششیں ضائع نہیں ہوئیں اور ان ہی کے بقول خود زمانہ کے طمانچوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا، ان میں روز بروز احرار کی تعداد بڑھنے لگی، ابوالکلام، محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خان، حسرت موہانی، ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر انصاری اور بہت سے نوجوان احرار آگے بڑھے اور بوڑھوں کو بھی اپنے ساتھ لگائے، حکیم اجمل خان، نواب اسحاق خان، میجر سید حسن بلگرامی، راجہ محمد علی محمد خان والی محمود آباد، وغیرہ بہت سے کہن سال رہنما بھی جوانوں کے قدم بہ قدم چلنے لے دیکھے کلیاتِ شبلی اردو۔

پر آمادہ ہوئے، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر (پٹنہ) اور مسٹر محمد علی جناح (بمبئی) نے احرار لیگ کے اس مشترکہ اقدام کی رہبری کی، یہ دیکھ کر مولانا نے فرمایا:

لاٹھ آزادی اذکار کو روکا لیکن
غیر کجخت تو گستاخ تھے مدت سے مگر
کام یابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے
اب بھی آجاتی ہے کالج سے خوشامد کی صدا
یہ وہ افسوس ہے کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے
اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے
لیگ سے سلسلہ کا نگر لیس باقی ہے
جا چکا قافلہ اب بانگ جرس باقی ہے

مولانا کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی، لیگ اور کانگریس کے تعلقات آپس میں بڑھتے گئے، یہاں تک کہ مولانا کی وفات کے ایک سال بعد اخیر دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس کے صدر مسٹر مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ اور صدر استقبالیہ مسٹر محمد علی جناح تھے، اسی زمانہ میں وہیں کانگریس کا اجلاس بھی تھا، دونوں کے رہنما آپس میں ملے اور خیالات میں اتحاد کی شکل پیدا ہوئی اور لیگ اور کانگریس میں اشتراک عمل نمایاں ہوا، لیگ کے رہنماؤں نے کانگریس میں اور کانگریس کے لیڈروں میں جن میں گاندھی جی، پنڈت مالوی جی، مسز سر جینی نائیڈو، سر ایس پی سنہا صدر کانگریس، مسز اینی بسنت اور مسٹر ہارنی من اڈیٹر بمبئی کرانیکل وغیرہ شامل تھے، لیگ کے اجلاس میں شرکت کی اور حاضرین نے پرتپاک چیزز سے ان کا خیر مقدم کیا، دوسرے سال دسمبر ۱۹۱۶ء میں دونوں

۱۔ اس اجلاس میں راقم شریک تھا، اس وقت مولانا مرحوم کے رنگ میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، اس موقع پر یہ نظم قلم نے دکھی:

حق و باطل مدتوں تک معرکہ آرا رہا
پر شب تاریک اب تاریک پہلی سی نہیں
وہ زمانہ جا چکا جب بت پرستی عام تھی
جب متاع رہنمائی تھی سزاوار خرید
جب کہ تھی آزادگان عشق کی ہم میں کمی
پھر بھی تمیز حق و باطل کا وہ جوہر نہ تھا
رزم گاہ نور و ظلمت بمبئی مدت سے ہے
ابر خورشید حقیقت پر بہت چھایا رہا
ملک میں جھپٹے دنوں کچھ کچھ اجالا سا رہا
جب خدا کا حکم ہر عیار کا ایما رہا
جب کہ ہر قاروں پہ ہم کو خضر کا دھوکا رہا
جب کہ ہر فرعون ہم میں قوم کا موسیٰ رہا
جو ہمیشہ قوم میں شمع رہ صحرا رہا
گر ہمیں انوار حق چمکے تو کیا بے جا رہا

آیت قرآن کہ جاء الحق مصدق ہوگی

مجلس آئین ہماری ”مظہر حق“ ہوگی

یہ اشارہ مسٹر مظہر الحق کی طرف تھا۔

سیاسی مجلسوں کے اجلاس لکھنؤ میں ہوئے، مسلم لیگ کی صدارت کا فرض محمد علی جناح نے انجام دیا۔ یہیں دونوں قوموں کے درمیان ”لکھنؤ پیکٹ“ طے ہوا اور اب یہ اتحاد سال بہ سال اتنا آگے بڑھا کہ کئی سال تک متواتر دونوں مجلسوں کے اجلاس ایک شہر میں ایک ساتھ ہونے لگے اور ایک دوسرے کے اکابر، دوسرے کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے اور ایک ہی قسم کے ریزولوشن دونوں جگہ منظور ہونے لگے، مسٹر محمد علی جناح نے لکھنؤ کے اس جلسہ کے صدارتی خطبہ میں ایک جگہ فرمایا، تجدید ملی کا سب سے زیادہ پر امید پہلو یہ ہے کہ ہندو مسلمان مشترکہ مقصد کے لیے متحد ہو رہے ہیں، بمبئی کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ گزشتہ دسمبر میں پہلی بار لیگ و کانگریس کے اجلاس اسی شہر میں ہوئے، بڑی کٹھن منازل طے کرنے کے بعد اس اتحاد کا مظاہرہ نظر آیا..... آج پھر لکھنؤ کا تاریخی شہر جو اسلامی ادب و تہذیب کا گہوارہ ہے اور جہاں سے چند برس ہوئے لیگ کی بنیاد پڑی تھی، کانگریس اور لیگ کے متحدہ اجلاس کا منظر پیش کر رہا ہے۔

یہ وہ خوش آئند منظر تھا کہ جس کو اگر مولانا مرحوم دیکھتے تو اپنی تحریک کی کامیابی پر بے انتہا خوش ہوتے۔

احرار کو تنبیہ | اس موقع پر ایک اور بات بھی یاد دلانی ہے، احرار کے نام سے جو گروہ بن رہا تھا جیسا کہ قاعدہ ہے، قدیم سیاسی حد بندیوں کے ٹوٹنے سے وہ اعتدال سے آگے قدم رکھ رہا تھا، مولانا نے اس کو بھی ٹوکا اور اپنی متعدد نظموں میں اس کی بے اعتدالی، لہجہ کی سختی اور طرز کلام کی ناہمواری پر گرفت کی، پہلے تو قدیم ہزرگوں کی خدمت میں معذرت کے طور پر فرمایا:

۱۔ راقم اس دوسرے اجلاس میں بھی شریک تھا اور یہ نظم موزوں ہوئی:

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے	کوہ شملہ جن دنوں ہم پایہ سینا رہا
جب کہ داروے وفا ہر درد کا درماں رہی	جب کہ ہر تاراں عطائی بوعلی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرماز ہر کہتے تھے اسے	جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادہ حب وطن کچھ کیف پیدا کر سکے	دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و سینا رہا
علت دیریں سے گواہی تو ہی ہے کار ہیں	گوش سنوا ہے نہ ہم میں دیدہ بینا رہا

پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ امید

ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جناح رہا

۲۔ مسلم لیگ کی تاریخ، مولفہ سید اختر حسین، ص ۱۳۷۔

اعتدال آنے نہ پایا ہے نہ آئے گا کبھی یہ تو ہوتا ہے کہ اچھلے گی اسی زور سے آپ آشنائی میں تو اک عمر بسر کی میں نے مدتوں آپ نے عاقل تو مجھے دیکھا ہے ایک اور نظم میں احرار کی سیاست کی ابھی نوعمر بتا کر ان کی سیاسی خطاؤں سے درگزر کرنے کی درخواست کی:

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ زود اعتقادات ہیں تلؤن ہے، وہم ہے دل میں نہ عزم ہے نہ ارادوں میں ہے ثبات بے اعتدالیاں ہیں ادائے کلام میں ہر دم ہیں گو مسائل ملکی زبان پر یہ سب بجا درست مگر سچ جو پوچھیے یہ ہے اسی سیاست پارینہ کا اثر موزوں نہیں ہے جنبش اعضا تو کیا عجب چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں بیکار کر دیے تھے جو خود بازوئے عمل آئے کہاں سے قوت رفتار پاؤں میں غوں غاں ہے کچھ مباحث ملکی نہیں ہیں یہ اس کے بعد احرار کو خطاب کر کے ان کو بھی مناسب سرزنش فرمائی:

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا لوگ اب حلقہ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر ہاں مگر ایک گزارش بھی ہے یہ قابل غور قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد ٹوٹ جائے گا طلسم اثر استبداد یہ تو فرمائیے، اس باب میں کیا ہے ارشاد؟

شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھیے بنیاد دیکھیے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد خیر جو کچھ تھا، مگر جمع تو تھے کچھ آزاد نہ کوئی جادہ مقصد ہے نہ کچھ توشہ زاد خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد یونہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیش نہاد کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہوگا فساد بعض پر جوش احرام کا قلم خاص طور سے تیر و نشتر تھا، اس کی طرف رخ کر کے یہ نظم ارشاد کی:

سوچتا ہوں کہ یہ آئین خرد ہے کہ نہیں؟
اس میں کچھ شائبہ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟
اس میں کچھ قابل تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟
بزم تہذیب میں مستوجب رد ہے کہ نہیں؟
کوئی اس جادہ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟
اس میں ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں؟
اس دوراے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں؟
”بزر“ جیسا تھا، اسی زور کا ”مد“ ہے کہ نہیں؟

بلکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن آبلہ قابل نشتر تھا یہ مانا لیکن آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا اب کوئی مرکز قومی ہے نہ توحید خیال خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازہ قوم ذرے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اڑاڑ کے فنا نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا بھاپ پر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی ہو تو بعض پر جوش احرام کا قلم خاص طور سے تیر و نشتر تھا، اس کی طرف رخ کر کے یہ نظم ارشاد کی:

دیکھ کر حریت فکر کا یہ دور جدید رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ انداز کلام اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئین سخن جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ شاطروں نے جوئی آج بچھائی ہے بساط پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ لوں

حریت خیال کے مسافرنے یہاں تک منزل طے کی تھی کہ بہت سے کہنے سال وفاداران قوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے نوجوانوں کی خیرہ سری ہمارے ازلی آقاؤں کو ہم سے سرگراں نہ کر دے اور طرابلس، بلقان، کان پورا اور یونیورسٹی کے معاملات میں ہماری آزادہ گوئی اور مسلم لیگ کے انقلاب، مسلم لیگ و کانگریس کے اتحاد اور لکھنؤ پیکٹ وغیرہ میں ہماری سیاسی آزادہ روی سے حکومت وقت کے دل میں ہماری طرف سے غلط فہمی نہ ہو، اس لیے بہ ظاہر صلح کان پور کے شکر یہ میں اور درحقیقت مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلانے کی خاطر مہاراجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک ڈیپوٹیشن ترتیب دیا گیا، جس

میں حزب الاحرار کے بھی بعض نام ورافراد نے انیسویں ہے کہ شرکت کی اور گویا انہوں نے اس طرح اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کیا، اس وفد نے پندرہ اپریل ۱۹۱۴ء کو وائسرائے سے ملاقات کی اور ایک ایڈریس پیش کیا لیکن مولانا ابوالکلام اور بعض دوسرے احرار نے اس وفد سے قطعاً احتراز کیا اور اس کے خلاف سخت مضامین لکھے، مولانا نے اس عجیب و غریب وفد کے متعلق تین قطعے ارشاد فرمائے:

سچ تو یہ ہے کہ وفا کیش ازل ہیں ہم لوگ
ہم نے یہ لکھ کے جو دیں آپ کو تحریر وفا
مشق ہے جاہد طاعت پہ ہمیں چلنے کی
ہم نے تحریر وفا پڑھ کے سنائی ان کو
احرار اور مدعیان وفا ہیں اور
دونوں کا منتہائے نظر ہے جو مختلف
اس پر بھی صاف صاف نہ تھا امتیاز حق
دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا
اب صاف ہو گیا حق و باطل میں امتیاز
اب آفتاب صدق گہن سے نکل گیا
وہ اختلاط و رد مئے صاف اب نہیں
جو لوگ ہیں متراع خوشامد کے مایہ دار
یہ مختصر فسانہ بزم شینہ ہے

مولانا کی سیاسی کلام کا یہ آخری بند ہے اور اسی کے چند مہینوں کے بعد انہوں نے وفات پائی۔

سیاست میں بھی اعتماد تھا | تاہم اس زمانہ میں آزاد سے آزاد آدمی کا حکومت وقت سے مطالبہ صرف اصلاحات کا تھا، مولانا کی سیاست بھی اس سے آگے نہ تھی اور نہ اس کے آگے کوئی راستہ کسی کو معلوم ہوتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس سیاسی حریت طلبی کے باوجود وہ حکومت وقت سے انحراف کا کوئی خیال بھی اپنے دل میں نہیں رکھتے تھے اور ذرا سے دباؤ سے وہ اپنی مسلم وفاداری کا اقرار کرنے لگتے تھے۔

یاد رہے کہ ترکی کے سفر سے واپسی کے بعد سے ان پر ترکی خلیفہ کے ”خفیہ سفیر“ ہونے کا الزام تھا، سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں یونان و روم کی جنگ کے موقع پر جب مسلمانوں میں بڑا جوش تھا،

انہوں نے علی گڑھ کالج میگزین میں ”خلافت“ پر تین چار صفحات کا ایک مضمون لکھ کر یہ بتانا چاہا کہ تاریخ اسلام میں اب تک کسی غیر قریشی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا ہے، اس لیے ترکوں کا دعوائے خلافت بھی تسلیم کے قابل نہیں لیکن چونکہ یہ مضمون ”آورد“ تھا، آمد نہ تھا، اس لیے ایک نمبر کے بعد اس کے دوسرے نمبر کا چھپنا بلکہ شاید سپرد قلم ہونا بھی نصیب نہیں ہوا اور اسی طرح نا تمام رہا، ۱۹۲۰ء میں جب راقم وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے لندن میں تھا اور وہاں کے وزرا اور ارباب سیاست سے ترکی خلافت کی نسبت بحث و گفتگو جاری تھی تو پروفیسر آرنلڈ جوائن ڈون انڈیا آفس سے متعلق تھے، اکثر کرم فرما کر میرے پاس تشریف لاتے اور مولانا کے اس مضمون کا حوالہ دے کر ترکوں کے دعوائے خلافت کو بے بنیاد ثابت کرنا چاہتے تھے، میں کہتا کہ یہ مضمون مولانا نے لکھا نہیں، ان سے لکھوایا گیا ہے اور اس کی نامتائی خود اس کی دلیل ہے۔

۱۹۰۸ء میں جب کرنل عبدالجید خاں وزیر خارجہ ریاست پٹیالہ جو انگریزوں کے بڑے دوست تھے اور ان دنوں گورنمنٹ اور ندوۃ العلماء کے درمیان صلح و صفائی کی پیماہری کر رہے تھے، مولانا نے الندوہ رجب ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں ایک مضمون لکھا کہ مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے؟ اور اس میں یہ ثابت کیا کہ ”مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ قومی شعائر رہا ہے کہ وہ جس قوم کی حکومت میں رہیں اس کے وفادار ہو کر رہیں“، یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ کو اس کے اس چھ ہزار سالانہ امداد کی قیمت ادا کی جو اس نے دارالعلوم کو دینا منظور کی تھی۔

۱۔ یہ دونوں مضمون مقالات شبلی جلد اول میں چھپ گئے ہیں، انہوں نے اس مولانا نے اس دوسرے مضمون ”مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر رہنا چاہیے“ میں رد مختار کے جس فقرہ پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی ہے اس کے صحیح پڑھنے میں ان سے سہوا ہے، وہ مفترض علینا اتباعہم میں انہوں نے اتباع (پیچھا کرنا) کو اتباع (پیچھے ہونا یا تابع ہونا) پڑھا ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے کہ ”اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر قبضہ کر لیں اور اس کو اپنے گھر میں جمع کریں تو وہ اس کے مالک ہوں گے اور ہم پر ان کی اطاعت فرض ہے“، لیکن یہ تمام تر غلط ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ”اگر غیر مسلم حملہ کر کے مسلمانوں کے مال و دولت پر قبضہ کر لیں اور اس کو اپنے ملک یعنی دارالحرب میں لے کر چلے جائیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے اور وہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں باقی نہیں رہے گا لیکن جب کفار دارالحرب سے آکر دارالاسلام میں حملہ کر کے مسلمانوں کے مال و دولت پر اس طرح قبضہ کر لیں تو مسلمانوں پر حملہ آوروں کا پیچھا کرنا اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ دارالاسلام کے حدود میں ہوں، البتہ جب وہ دارالاسلام کی حدود سے نکل جائیں اور مال لے کر دارالحرب میں داخل ہو جائیں تو پھر ان کا پیچھا کرنا مسلمانوں پر فرض نہ رہے گا۔“ (دیکھئے شامی حاشیہ رد مختار علی الدر المختار، ج ۳، ص ۷۷، ص ۳، مصر)۔

اس کے بعد طرابلس، بلقان اور کان پور کے ہنگاموں میں مولانا نے جو تیز و تند نظمیں لکھیں، جنہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا، صوبہ متحدہ کی حکومت اس واقعہ سے بے خبر نہ تھی، اس زمانہ میں مسٹر برن نامی ایک لائق اور علم دوست انگریز حکومت یوپی کے چیف سکریٹری تھے، وہ اردو بہت اچھی بولتے تھے اور فارسی خوب سمجھتے تھے اور اسی لیے ان سے اور مولانا سے مراسم تھے، لوگوں نے یہ نظمیں ان تک پہنچائیں، اسی زمانہ میں بنگال کی حکومت نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں ایک اردو مجموعہ اشعار کو ضبط کیا، جس میں مولانا کی نظم بھی تھی، اخبارات میں مولانا کی شہرت کی وجہ سے یا لوگوں میں تحریک پیدا کرنے کے لیے اس کو یہ کہہ کر شائع کیا گیا کہ بنگال گورنمنٹ نے مولانا کی نظمیں خلاف قانون قرار دیں اور ضبط کر لیں۔

جنوری ۱۹۱۴ء میں کوئی سرکاری پارٹی تھی، جس میں مولانا بھی شریک تھے، اس میں لفٹنٹ گورنر صاحب سے جب سامنا ہوا تو انہوں نے شکایت آمیز بلکہ کچھ طعن آمیز فقرے کہے، چیف سکریٹری صاحب بھی کچھ سرگراں رہے اور دوستانہ شکایت کی، مولانا نے کہا کہ یہ اتفاقی حالات ہیں، ورنہ میں نے تو ہمیشہ قوموں میں بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے، مولانا نے یہ پورا واقعہ ۵ فروری ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھ کر مجھ کو بھیجا ”میری نظموں کی ضبطی کا یہاں بہت برا اثر ہوا، لفٹنٹ گورنر صاحب سے ایک پارٹی میں سامنا ہو گیا، پہلے تو کہا ”مزارع مقدس“ پھر شکایت آمیز بلکہ طعن آمیز فقرے کہے، ابھی تک میں ان سے مل نہ سکا، جا سوسوں نے ان کو سب نظمیں پہنچائیں اور معنی سمجھائے، چیف سکریٹری صاحب بھی مجھ سے شاک تھے، میں نے کہا یہ اتفاقہ خلاف معمول بات ہوئی، ورنہ میں نے تو ہمیشہ بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔“

اس واقعہ کی مزید تفصیل مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کے ایک بیان سے معلوم ہوتی ہے، جو انہوں نے مکتب شبلی میں مولانا کے ایک رقعہ کی تشریح میں حاشیہ کے طور پر لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ (حافظ الملک) حکیم اجمل خاں مرحوم جو ان دنوں نہایت حکام رس تھے اور ریاست رام پور سے تعلقات کی بنا پر مسٹر برن سے ان کے خاص مراسم تھے، لکھنؤ آئے تو یکم فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا کو ساتھ لے کر مسٹر برن سے ملنے گئے، مگر مولانا کی طرف سے ان کی پیشانی پر بل بدستور رہے، وہاں سے واپس آ کر رات ہی کو مولانا نے ایک رقعہ لکھ کر (عبدالماجد-۱۱) مولوی عبدالماجد صاحب کو بلوایا جو ان سے اس زمانہ میں میں ملکتہ میں موجود تھا، تاہم اس کا حوالہ مکتب میں بھی ہے۔ (دیکھیے عبدالکلیم-۴، سلیمان-۶۶)۔

دنوں سیرت کے انگریزی تراجم کے سلسلہ میں مولانا کے انگریزی کاروبار کو انجام دیا کرتے تھے، مولوی صاحب فرماتے ہیں ”تحریر بالاشب کوہلی، میں اسی وقت گیا، مولانا بہت دیر تک تخیلہ میں گفتگو کرتے رہے، ماہِ حاصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آج کل مجھ سے بدظن ہے، خصوصاً حاملہ کان پور کے متعلق میری نظموں سے حاذاق الملک حکیم اجمل خاں مجھے آج مسٹر برن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے تھے، وہ بہت کبیدہ تھے، حالاں کہ اس سے پیش تر نہایت اخلاق و تپاک سے ملتے تھے، تم ان کے نام ایک مفصل چھٹی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدۃ العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں، میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں، چنانچہ اس پر میری تصانیف شاہد ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں میں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک رزلوشن بھی پاس کرایا، پھر معاملہ عبدالکریم میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں، رہا واقعہ کان پور کے متعلق نظمیں تو وہ ایک ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں جس میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔

خط کے اسی سلسلہ میں مولوی صاحب کو یہ دوسرا فقرہ لکھا، جو مکاتیب میں شامل ہے ”جس خط کے لیے میں نے شب کو کہا ہے، وہ آدمی کے ہاتھ نہ بھیجے گا، یہ بھی مناسب موقع پر بڑھادیجے گا، کہ میں نے اپنے کانشنس کے مطابق معاملہ میں پانچ ارکان کو ساتھ لے کر جو کیا، باوجود اس کے کہ بعد کو پبلک کے شور و غل کی وجہ سے سب نے اخبارات کے ذریعہ سے اپنی برأت ظاہر کی اور یہ لکھا کہ ہم نے فلاں شخص کی وجہ سے مجبور ہو کر ایسا کیا لیکن صرف میں اپنی رائے پر اپنے فرض کے مطابق قائم رہا۔“ (عبدالماجد-۱۲)

آخری واقعات | ہم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ خط بھیجا گیا یا نہیں اور اگر بھیجا گیا تو اس کا کیا اثر ہوا لیکن یہ معلوم ہے کہ مولانا کی اس ساری مدافعت کوشش کی غرض یہ تھی کہ ندوہ سے گورنمنٹ کے تعلقات جو اس کدو کاوش اور جدوجہد کے بعد درست ہوئے تھے، وہ ان کی بدولت پھر بگڑ نہ جائیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ مولانا کی ”سیاسی خوئے بد“ میں بہ قول سعدی اب بھی کوئی تغیر نہیں ہوا، چنانچہ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۱۴ء میں جب بڑی لڑائی چھڑی گو وہ اس وقت اپنے بھائی کی ناگہانی وفات کے سبب سے نہایت نڈھال تھے،

تاہم اس ناتوانی میں بھی ان کی کمان سے یہ تیر نکل ہی گیا جس میں انہوں نے غالب کے اس شعر کی:
 اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
 تضمین کی تھی:

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رو غرور
 برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
 اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
 آئیں شناسِ شیوہ پیکار بھی نہیں
 دیوانہ تو نہیں ہے تو ہتھیار بھی نہیں
 تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
 سننا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
 اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یہ تیر پورے نشانہ پر بیٹھا، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کی روایت ہے کہ اس نظم پر حکومت نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن مولانا خود مرض الموت میں گرفتار تھے، اتفاق سے ایک نیک دل مسلمان پولیس آفیسر اس زمانہ میں یہاں متعین تھے، جو مولانا کے پورے قدر شناس تھے، وہ ان کی اس بیماری کے عذر پر اس کو ٹالنے رہے، یہاں تک کہ شاعر چند روز کے بعد خود قیدِ عنصری سے آزاد ہو گیا۔

اخیر زندگی کا ایک اور واقعہ بھی سننے کے قابل ہے:

نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکوں نے بھی لڑائی میں جرمنوں کے ساتھ ہو کر انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر شہر کے پرانے وفادار مسلمانوں کی طرح اعظم گڑھ کے چند وفاداروں نے بھی ترکوں سے برأت کا اعلان مناسب سمجھا اور اس کے لیے قیامت یہ کی کہ خود شبلی منزل کو جلسہ کا مقام بنایا، جس کی مولانا کو کوئی خبر نہ تھی، میں وقت پر جب وہ دوسرے کمرہ میں موت کے بستر پر پڑے تھے ان کے بچپن کے ایک بے تکلف دوست ان کے پاس گئے کہ ”آپ رضا مندی دیں تو جلسہ آپ کی صدارت میں ہو“ مولانا یہ سن کر بے چین ہو گئے، ان کی طرف منہ کر کے فرمایا بھائی صاحب! میں نے تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ترک اپنی جوتیوں میں میری کھال کا تسمہ بھی لگائیں“ یہ اس پر جوش عالم کی بین الاقوامی سیاست کا اخیر فقرہ تھا۔

ندوة العلماء میں مولانا کی مخالفت اور معمدی سے استعفا

۱۹۰۵ء میں جب مدرسہ کا انتظام مولانا کے ہاتھ میں دیا گیا تو کسی لائق ناظم کی عدم موجودگی کے باعث یایوں کہیں کہ کسی ایک واحد ذات پر پورا اعتماد نہ ہونے کے سبب سے ندوہ کے کاموں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر ایک کے لیے ایک ایک معمدی قائم کر دی گئی تھی۔

۱- دارالعلوم اور اس کے تعلیمی انتظامات: معمّد مولانا شبلی نعمانی

۲- دفتر مراسلات: معمّد مولانا حکیم سید عبداللّٰہی صاحب

۳- صیغہ مال: معمّد منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کا کوری

یہ ایک ایسا انتظام تھا جس میں وحدت کا سررشتہ گم تھا، یہ تینوں نہریں الگ الگ بہتی تھیں، یعنی یہ تینوں مل کر پھر کہیں ایک نہیں ہوتی تھیں اور کسی ایک شخص کے ہاتھ میں طاقت آ کر سارے کاموں میں اشتراک اور اتحاد نہیں پیدا ہوتا تھا، اس اتحاد اور اشتراک کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ ان کارکنوں کا اخلاص اور باہمی اعتماد تھا، جب تک ان کارکنوں میں یہ روح موجود رہی، کام کی رفتار آگے بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا کہ اعتماد کی جگہ بدگمانی نے لے لی، اب اتحاد کا وہ روحانی سررشتہ بکھر گیا اور ایک دوسرے کے ہر کام پر بدگمانی کی نگاہیں پڑنے لگیں۔

پھر اس تقسیم عمل سے ندوہ کے دفتری کام کا تو انتظام ہو گیا، مگر ندوہ کے اصل مقاصد کی تکمیل اور اس کے ذریعہ سے اہم اصلاحات اور قومی و مذہبی مطالب کے لیے سعی و کوشش کا کام ان میں سے کسی فہرست میں بھی داخل نہیں ہوا دوسرے اصحاب اپنی اپنی ذاتی مصروفیتیں بھی رکھتے تھے اور مولانا کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہر ذاتی کاروبار سے بے پروا ہو کر ندوہ کے آستانہ پر آ بیٹھے تھے اور ندوہ ہی کے کام کو اپنی زندگی کا کام بنا لیا تھا، اس لیے وہ ان کاموں کو بھی کر دینا چاہتے تھے لیکن دوسرے لوگ اس کو اپنے حدود و فرائض سے تجاوز اور دوسرے کے کاموں میں مداخلت سے تعبیر کرتے تھے۔

اب تک جو واقعات آپ کی نگاہ کے سامنے سے گزر رہے ہیں، ان سے یہ اچھی طرح معلوم

ہو چکا ہوگا کہ جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی تھی اور اس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا، اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بناتا جاتا تھا، یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی، یہ گو واقعہ تھا، مگر اس واقعہ کو واقعہ سمجھ کر برداشت کر لے جانا ہر انسان کا کام نہیں، اس لیے رشک و حسد نے بے اعتمادی اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا۔

لیکن یہ کہنا کہ مولانا کے سوا ان کے تمام دوسرے مخالف رفقا اخلاص اور حسن نیت سے خالی تھے، ایک بڑی جرأت ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سولہ برس علی گڑھ میں بسر ہوا تھا اور علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی شہرت عام رکھتی تھی لیکن یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کو اس وابستگی کے باوجود اس تحریک کے بعض حصوں سے سراسر اختلاف تھا اور اسی بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہوئے تھے، مگر عام علما اور ان کے معتقد ارکان یہی سمجھتے تھے کہ یہ علی گڑھ تحریک کے آدمی ہیں اور علی گڑھ چھوڑ کر ندوہ میں اسی لیے شریک ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو بر باد کریں۔

پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی توڑ و تقذس جو علمائے دین کا خاصہ ہی نہیں تھا اور اس لیے ان علما کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے، مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا اور اسی بنا پر وہ طلبہ کے لیے ان کی تعلیم و صحبت کو سخت مضر سمجھتے تھے۔

مولانا کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام ایسی دو کتابیں تھیں جو مصنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود علما کے نزدیک اعتراض کے قابل تھیں، ان کے بعض مباحث ٹھیٹھ مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے، اس لیے علما کی ایک جماعت جو متکلمین کی آراء و تحقیقات سے بے خبر تھی، ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لیے ان کو موزوں نہیں سمجھتی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ مولانا دارالعلوم کی تعلیم میں جس قسم کی اصلاح اور ترقی چاہتے تھے، علما کا بڑا حصہ اس سے نفور تھا، وہ قدیم معقولات کی ان کتابوں کو جن سے علما کو صدیوں کا قلبی انس تھا، یکسر الگ کر رہے تھے اور ان کی جگہ نئے علوم لانا چاہتے تھے جس کو وہ اپنے خیال میں کفر و زندقہ جانتے تھے، مولانا انگریزی کی ضرورت پر زور دیتے تھے اور ان کو اس ضرورت سے شدید انکار تھا۔

غرض ارکان میں مختلف مذاق کے افراد تھے لیکن دوسرے قومی کارکنوں کی طرح مولانا نے کبھی

۱۔ مضمون بروقات مولانا شہلی نوشتہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔

اس کی نہ تدبیر کی اور نہ پروا کی کہ ارکان میں ان کے خیال اور مذاق کے لوگوں کی اکثریت ہو حالانکہ مخالف پارٹی نے اس کا پورا ہندو بست کیا اور ایک ہی جلسہ میں زبردستی ممبروں کی تعداد ۳۵ سے ۵۱ کر لی اور خلاف قاعدہ اپنے ۱۵ آدمی دفعۃً بڑھا لیے (مکاتیب نواب علی حسن خاں صاحب ۱۳) نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے ہمدردوں اور معاونوں کی جماعت اقلیت میں آگئی اور جلسہ انتظامیہ کی کارروائیوں پر فریق ثانی کا پورا قبضہ ہو گیا۔

مولانا خلیل الرحمن صاحب کا اختلاف | جب مولانا نے ندوۃ العلماء میں قیام کا ارادہ کیا تھا، اس وقت نواب محسن الملک نے کہا تھا کہ ”ندوہ کی اس کس مہر سی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا، لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعۃً تمام مولوی آپ پر نوٹ پڑیں گے اور آمادہ مخالفت ہوں گے“ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور جلسہ سنگ بنیاد ہی میں اس کی بنیاد پڑ گئی، مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری مرحوم جو پہلے رسماً نائب ناظم تھے اور اب کسی ناظم کی عدم موجودگی میں اپنے کو قائم مقام ناظم سمجھتے تھے، بطور حریف کے مولانا کے مقابل کھڑے ہوئے اور اس کی ابتدا ایک خط سے ہوئی، جس میں مولانا نے ان کو یہ لکھا تھا کہ اس وقت ندوہ کا کوئی ناظم نہیں (حالانکہ مولانا خلیل الرحمن صاحب مرحوم اپنے آپ کو ندوہ کا قائم مقام ناظم سمجھتے تھے) بہر حال اس کے بعد مولوی خلیل الرحمن صاحب نے اپنی مخالفت کا اظہار (جس کو کون کہہ سکتا ہے کہ نیک نیتی پر مبنی نہ ہوگا) مختلف پردوں میں کیا، سب سے پہلے جلسہ سنگ بنیاد کے موقع پر ۱۹۰۸ء میں مولانا نے جلسہ انتظامیہ میں مسئلہ وقف علی الاولاد کو بغرض منظوری پیش کیا تو مولانا خلیل الرحمن صاحب مرحوم نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد جب ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ ایڈ کی تقسیم اور جدید مدرسین کے تقرر کے لیے جلسہ انتظامیہ ہوا، تو مولانا خلیل الرحمن صاحب مرحوم نے ایک یادداشت کے ذریعہ سے تمام ممبروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کی معتدی یعنی مولانا کا عہدہ توڑ دیا جائے (مہدی-۵۶) جون ۱۹۱۰ء میں مولانا نے مولانا شروانی صاحب کو جو اپنی فطری متانت و سنجیدگی اور صلح کل طبیعت کی بنا پر طرفین کے معتمد علیہ تھے لکھا ”اگر آپ کو ندوہ کا درہ ہے تو آٹھ سات دن کے لیے آئیے، مولوی خلیل الرحمن صاحب کو بلائیے، پہلے آپس میں صلح اور نیک نیتی کے ساتھ تمام مراتب طے ہو جائیں اور ضرور ہو سکتے ہیں، پھر تمام امور کو باقاعدہ جلسہ میں طے کر لیجیے، جب ہم لوگ متفق ہوں گے تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا ورنہ حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب انجمن حمایت الاسلام کی طرح ندوہ کی مالی کارروائیاں بھی اخبارات کے منظر پر نظر آئیں گی، چار برس ہوئے کوئی حساب کتاب

نہ مرتب ہوا، نہ شائع ہوا، لوگ چاہتے ہیں کہ ماہِ بمانہ الندوہ میں جمع خرچ چھپے، یہاں کسی کو خبر بھی نہیں، مد تقیر کی ایک مجلس ہے اس کا ایک اجلاس ابتدائی کے سوا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہوا، سب جمع خرچ محض ذاتی رائے سے ہو رہا ہے۔“ (۸۳) مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

کمیشن کا معاملہ | ۱۹۱۰ء کے جلسہ انتظامیہ میں مولوی خلیل الرحمن صاحب کی تجویز بلا جب ارکان نے منظور نہیں کی تو انہوں نے بلا اطلاع یعنی قاعدہ کے خلاف ایجنڈے میں درج ہوئے بغیر بروقت یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے طلبہ کی مذہبی حالت کی تحقیق و تفتیش کے لیے ایک کمیشن بٹھایا جائے، مولانا اس تجویز پر خاموش رہے اور جلسہ انتظامیہ نے منظور کر لیا، اس کے بعد مخالفوں نے اس کے طریق کار میں یہ وسعت پیدا کی کہ خود معتمد دارالعلوم کی بھی شہادت ہو یعنی گویا مجرم کی حیثیت سے اس کو بھی سامنے لایا جائے۔

مولانا پر اس تجویز کا اس قدر برا اثر پڑا کہ وہ ندوۃ العلماء سے الگ ہونے کے لیے تیار ہو گئے، چنانچہ ۳۱ اگست ۱۹۱۰ء کو اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب کو ایک مفصل خط لکھا پھر ۲۹ ستمبر ۱۹۱۰ء کو دوبارہ دوسرا اور زیادہ مفصل خط لکھا یہ دونوں خط (۸۶، ۸۵) مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، مولانا شروانی نے اس کے جواب میں غالباً کچھ تسلی آمیز باتیں لکھیں، اسی پر ان کو فوراً ہی ۳۰ ستمبر ۱۹۱۰ء کو لکھا ”ندوہ کے مواد فاسد کی ہر دفعہ اوپر سے لپ لپ پوت کر دی جاتی ہے اور اندر اندر مواد پکتا رہتا ہے، اس لیے ہمیشہ خلبان رہتا ہے، اگر واقعی ندوہ کا درد ہے (اور ضرور ہے) تو ایک ہفتہ کے لیے آئیے، اصل یہ ہے کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمن صاحب بلکہ مولوی عبداللہ صاحب کو کسی قدر یقین ہے کہ میں ان لوگوں کے اختیارات میں دست اندازی کرتا ہوں اور ان کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں اور اس طرح وہ نمایاں نہیں ہوتے، اس لیے آ کر میری اور ان کی سینے اور دیکھیے کہ کیا واقعہ ہے، مجھ کو آپ کی رائے پر پورا بھروسہ ہے، اگر آپ کے نزدیک میں نے ایک ذرہ بھی اپنے حدود سے تجاوز کیا ہوگا تو معترف ہو کر معافی مانگوں گا، ورنہ جب تک ان لوگوں کا یقین زائل نہ ہوگا کوئی کمیشن اور اصلاح سود مند نہ ہوگی، یہ تو سب اسی رنجش کے بخارات ہیں، باقی مفصل خط پہلے لکھ چکا ہوں۔“ (۸۷)

ارکان کی یہ باہمی کشاکش ختم نہیں ہوئی اور فیصلہ کے لیے جلسہ انتظامیہ کی ایک تاریخ مقرر ہوئی، مخالف ارکان نے اس تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے تمام شہر میں گشت کیا اور بہت سے معززین کو دارالعلوم کے ہال میں جو گولہ گنج میں واقع تھا، اس لیے جمع کیا کہ وہ مولانا شبلی کی برطرفی کا تماشا دیکھیں،

مگر اس اجتماع کا عجیب مستحکم خیز انجام ہوا جو لطیفہ سے کم نہیں، ارکان اور شہر کے معززین کا اجتماع جب دارالعلوم کے ایک ہال میں جمع تھا، مولانا ندوہ کے دستور العمل کا ایک نسخہ ہاتھ میں لیے ہوئے ہال میں داخل ہوئے اور جب جلسہ کی کارروائی شروع ہونے لگی تو سب سے پہلے اٹھ کر یہ دریافت فرمایا کہ ندوہ کے جلسوں کی تین قسمیں ہیں، جلسہ عام، جلسہ خاص، جو کسی امر کے طے کرنے کے لیے ارکان اور دوسرے اہل الرائے حضرات کی شرکت سے ہوتا ہے، تیسرا جلسہ انتظامیہ جس میں صرف ارکان شریک ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ کون سا جلسہ ہے، اس پر شاہ سلیمان صاحب نے یا کسی اور نے فرمایا کہ یہ جلسہ خاص ہے، مولانا نے فرمایا دستور العمل میں جلسہ خاص کی تعریف یہ کی گئی ہے ”جلسہ خاص وہ جلسہ ہے جس کو جلسہ انتظامیہ کسی خاص مقصد سے کسی معین تاریخ میں طلب کرے اور ملک کے سربرآوردہ اہل الرائے حضرات کی خدمت میں شرکت کی دعوت بھیجے“ اب اس اجتماع کی کیفیت پر غور کیجیے کہ نہ تو اس اجتماع کو جلسہ انتظامیہ نے بلایا ہے نہ اس کی تاریخ متعین کی ہے اور نہ ملک کے تمام اہل الرائے حضرات کو دعوت دی گئی ہے، اس قانونی اعتراض پر سب دم بخود رہ گئے، اس پر بعض مخالف ارکان نے کہا کہ بہتر ہے۔

ہم ابھی دوسرے کمرہ میں بیٹھ کر جلسہ انتظامیہ کیے لیتے ہیں اور اس کو جلسہ خاص بنا ڈالتے ہیں، اس تجویز کے مطابق سب ارکان اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلے گئے اور جلسہ انتظامیہ کی کارروائی شروع ہوئی، مولانا نے پھر فرمایا یہ جلسہ گو ارکان کا ہے، مگر یہ جلسہ انتظامیہ نہیں ہے، کیوں کہ جلسہ انتظامیہ کے لیے ضروری ہے کہ انعقاد سے پندرہ روز پہلے اس کی تحریری یادداشت تمام ارکان کے پاس بھیج دی جائے، اس اعتراض پر ایک سادہ دل مولوی صاحب (مولانا احمد علی صاحب محدث میرٹھی) نے کیا خوب فرمایا ”یہ قاعدہ تو ہم ہی ارکان نے مل کر بنایا ہے، اب ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ قاعدہ غلط ہے“ اس پر بہت سے لوگوں کو ہنسی آگئی اور یہ سارا اجتماع بے نیل مرام منتشر ہو گیا۔

مولانا نے قانون کی جو تعلیم حاصل کی تھی، شاید تمام عمر میں اس موقع سے زیادہ اس نے کبھی ان کو فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا۔

بالآخر اس باہمی کشاکش کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ کرل عبدالجید خان بہادر فارن منسٹر ریاست پٹیالہ نے جو اس وقت ندوہ کے مرہبی خاص اور ندوہ کے بڑے محسن تھے، اس طرف خاص طور پر توجہ کی اور ان کے سامنے ایک انتظامی جلسہ میں تمام لوگوں نے اپنی اپنی شکایتیں بیان کر کے مصالحت کی اور

باہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔

مولوی عبدالکریم صاحب کی معظلی کا معاملہ | اس مصالحت کے بعد کچھ عرصہ تک ندوۃ العلماء میں ہر قسم کا سکون رہا لیکن شروع ۱۹۱۳ء میں ایک دوسرا ہنگامہ برپا ہوا، مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم نامی ایک بزرگ تھے، جو سرحد کے رہنے والے تھے، پہلے حیدرآباد میں مدرس تھے، پھر مولانا مسیح الزماں خان صاحب کے تعلق سے شاہ جہاں پور کے مدرسہ عین العلوم میں مدرس ہوئے اور وہاں سے مولانا کے اخیر زمانہ میں فقیہ اول کے عہدہ پر دارالعلوم میں رکھے گئے، موصوف اچھے خاصے طباع اور ذہین تھے، مگر افسوس ہے کہ اس ذہانت کا رخ دوسری طرف تھا، وہ بہت جلد دوسروں کے حلقہ اثر میں آگئے، جنہوں نے ان کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا مقابل بنا کر کھڑا کیا، مولانا نے ندوہ کی ایڈیٹری سے جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ مطابق مئی ۱۹۱۲ء کے پرچہ کے بعد جب استعفا دے دیا تو نائب ناظم صاحب نے جلسہ انتظامیہ کی منظوری کی امید پر ان ہی مولوی عبدالکریم صاحب کو اس ندوہ کا ڈیڑھ مقرر کر دیا، جس کی منظوری چند ماہ بعد ۲۶ ستمبر ۱۹۱۲ء کے جلسہ انتظامیہ میں ہوئی، اس وقت جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال تھا، مولوی عبدالکریم صاحب نے اس موقع کی مناسبت سے اپنے پہلے ہی مرتبہ پرچہ میں جو ۱۹۱۲ء کے آخر میں جون ۱۹۱۲ء کے مہینہ کا چھپا، جہاد کے فضائل و مناقب پر ایک طویل مضمون لکھ کر شایع کیا، اس زمانہ میں لفظ جہاد کے نام کی جو ہیبت انگریزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اس کا تصور بھی آج مشکل ہے اور ندوہ ابھی ابھی ان سیاسی الزاموں سے حکومت کی نگاہ میں بری ثابت ہوا تھا، اس مضمون کی اشاعت نے ندوہ کے کارکنوں کو گھبرا دیا، مولانا نے ۲۰ جنوری ۱۹۱۲ء کو معتدین اور مقامی ارکان کو بلا کر صورت حال پیش کی، سب کی متفقہ رائے سے وہ چند روز کے لیے معطل کر دیے گئے اور اس کارروائی کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دی گئی، یہ کارروائی اگرچہ تمام معتدین اور مقامی ارکان کے اتفاق رائے سے کی گئی تھی لیکن مخالفین نے اخبارات میں جب شور و غل کیا تو ان میں سے متعدد ارکان نے اپنی برأت ظاہر کی اور آخر چند دیگر ارکان نے جن میں مقامی وکلا تھے، ۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو ایک جلسہ انتظامیہ کر کے اس قانونی نقص کی بنا پر اس کو منسوخ کرایا کہ اس معظلی کا قانونی

۱۔ مولوی عبدالکریم صاحب نے افسوس ہے کہ دارالعلوم کی مدرسہ ہی کے زمانہ میں اپریل ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں لوگ جانے سے وفات پائی۔

اختیار نہ معتمدین کو تھا اور نہ صرف مقامی ارکان کو لیکن اس کے بعد جب منشی احتشام علی صاحب وغیرہ کشنر سے ملے تو اس کی خواہش یہ معلوم ہوئی کہ اڈیٹر کو کچھ نہ کچھ تنبیہ ضروری ہے، اس لیے انہوں نے ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو ارکان کے نام خطوط جاری کیے اور چھ مہینے کے لیے مولوی عبدالکریم صاحب کو باقاعدہ معطل کرایا لیکن اس پوری کارروائی کو بھی بعض لوگوں نے مولانا ہی کی طرف منسوب کر کے ان کو بدنام کرنا چاہا اور خصوصیت کے ساتھ مسلم گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر مولوی وحید الدین صاحب سلیم نے ایک خاص غرض سے اس فنڈ کے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا، حالانکہ مولانا کو اس دوسری کارروائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مولانا ایک خط میں جو ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں ”لکھنؤ میں میرے مخالف پہلے سے تھے، انہوں نے موقع پا کر اس قصہ کو طول دیا اور ایک جھٹھا بنا لیا ہے جو مختلف اخباروں میں مضامین لکھتا ہے، یہ ایک باقاعدہ اور مسلسل کوشش ہے جو..... وغیرہ کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ میں نے اس معاملہ کو گورنمنٹ تک پہنچانے میں مطلق حصہ نہیں لیا، البتہ جب سب نے کہا تو میں نے بھی اتفاق کیا، اس پر یہ حال ہے کہ آپ الگ ہیں، نفاق کا یہ حال ہے کہ پبلک میں اپنی علاحدگی دکھاتے ہیں اور گورنمنٹ آفسر سے مل کر تمام کام انجام دیے، مجھ کو خبر تک نہیں ہونے پائی، حکام سے ملنا اور خط و کتابت کرنا، چھ مہینے کی معطلی کا ممبروں سے منظور کرانا، مجھ کو ذرہ بھر اس سے تعلق نہیں۔“ (عبدالکیم-۲)

ایک اور خط میں ۱۴ جون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں ”میرے خلاف چند خود غرضوں نے ندوہ کے معاملہ میں جو طوفان مچایا، آپ نے سنا ہی ہوگا، لطف یہ کہ شرکت سب نے کی اور اب سب الگ ہیں اور لطف یہ کہ گورنمنٹ افسروں سے گورنمنٹ ہی کا پہلو ظاہر کرتے ہیں اور سرخرو بنتے ہیں، مولوی عبدالکریم کی چند روزہ معطلی جو میں نے کی اس کو نرنہ کر کے منسوخ کرایا، پھر..... وغیرہ چپکے خود کشنر کے پاس گئے اور ان کی مرضی لے کر مخفی خطوط ارکان کے نام جاری کیے اور چھ مہینے کے لیے مولوی صاحب کو معطل کرایا اور پبلک کو اب تک دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم کو ان کی معطلی سے واسطہ نہیں، شبلی نے کیا، جو کچھ کیا، میرے پاس تمام اصلی اور مطبوعہ کاغذات ہیں، موقع ہوا تو دکھا دوں گا، ہزار نرنہ جو خط بھیجا اس میں لکھا ہے کہ وہ ندوہ کے مضمون کو سخت شرارت انگیز خیال کرتے ہیں، مجھ کو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ گورنمنٹ ایسا خیال کرے گی، اگر ندوہ کی طرف سے خبر نہ لی جاتی تو گورنمنٹ خود مقدمہ قائم کرتی اور نواب

وقار الملک کی طرح اہم لوگوں کو عدالت میں جا کر گواہی دینی پڑتی۔“ (امین-۱۵)

مولانا کے ان بیانات کی تصدیق کے لیے حاشیہ پر ندوہ کے ایک غیر مطبوعہ دفتری خط کی نقل درج کی جاتی ہے جو ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا اور دیگر ارکان کے نام لکھا گیا تھا اور جس کا دفتری نشان ۲۸۱۳/۳۳۵ ہے اور جس پر مولانا سید عبدالحی صاحب اور مولانا خلیل الرحمن صاحب کے دستخط ہیں، اس خط سے واقعہ کی پوری کیفیت معلوم ہو سکتی ہے۔

۱۔ غالباً ۱۹۰۵ء میں مولوی سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے اردو مصلیٰ میں جس کو وہ علی ٹرڈ سے نکالتے تھے، ہمسرے متعلق ایک پر جوش مضمون شائع کیا تھا، جس کو گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا، وہ گرفتار کر کے عدالت میں حاضر کیے گئے، اور نواب وقار الملک شہادت میں پیش کیے گئے، سید حسرت موہانی صاحب اسی مقدمہ میں پہلی دفعہ قید ہوئے تھے۔ ۲۔ یہ خط حسب ذیل ہے:

از دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء، ۲۸۱۳/۳۳۵

مخدومی و کمری جناب شمس العلماء مولانا شاہی صاحب نعمانی دام لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، جلسہ انتظامی ۹ مارچ ۱۹۱۳ء نے یہ طے کیا کہ اس جلسہ کی رائے میں کل کارروائی جلسہ غیر معمولی ۲۸ جنوری ۱۹۱۳ء و کارروائی معتد صاحب دارالعلوم بہ نسبت معظلی مولوی عبدالکریم صاحب خلاف دستور العمل ندوۃ العلماء بغیر کسی اختیار کے عمل میں لائی گئی ہے، لہذا اکالعدم سمجھی جائے۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہادرنکو نے قبل جلسہ کے ششی احتشام علی صاحب کو بلا کر اپنی خواہش ظاہر کی تھی کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو بے موقع اشاعت مسئلہ جہاد کی وجہ سے چھ مہینے کے لیے معطل کیا جائے، چنانچہ اس کا اظہار ششی صاحب نے جلسہ میں کیا اور لکھا بھی گیا، مگر جلسہ نے اس کی اشاعت کو بہ خیال ناگواری حکام منع کیا اور بہ طور خود تجویز کر کے یہ چاہا کہ اراکین سے مولوی صاحب کی بابت رائے طلب کریں کہ اس اشاعت کی بابت مولوی عبدالکریم صاحب سے کچھ تدارک کیا جائے یا نہیں اور کیا جائے تو کیا؟

جلسہ کے بعد احتیاطاً میں اور ششی محمد احتشام علی صاحب ۱۵ مارچ ۱۹۱۳ء کو ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر سے طے اور اس بارے میں گفتگو کی، تو صاحب نے فرمایا کہ ضرور ہمارا یہ منشا اور خواہش ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو صرف چھ مہینے کے لیے معطل کیا جائے اور پھر وہ بدستور اپنا کام کریں، اور ہماری اس خواہش کا اعلان کر سکتے ہو، اور مولوی عبدالکریم صاحب کی سچائی کی ہم نے جبراً از سر سفارش کی ہے اور مقدمہ جوان کے اوپر یہ وجہ نہ لکھنے کے نام مشتبہ کنندہ پر چہرے چل سکتا تھا، نہیں چلایا مگر اس قدر معظلی کا اس اشاعت کی بابت ضرور خیال ہے، اس کے بعد ہم کو ان سے اور ندوہ سے کچھ شکایت نہیں، وہ اپنا کام کریں۔

چوں کہ جلسہ انتظامی ۹ مارچ کو ہو چکا ہے، فوراً دوسرا جلسہ طلب نہیں ہو سکتا اور اس کا اتنا اجلہ عانی تک باعث بذلفی حکام ہوگا اور احتمال نقصان کا ہے، اس لیے بموجب دفعہ ۲۵ دستور العمل دوبارہ معظلی مولوی عبدالکریم صاحب تحریری رائے کا خواست گار ہوں کہ اندر ایک ہفتہ کے اپنی رائے سے مطلع فرمائیے، تاکہ کثرت تحریر رائے عمل کر سکوں اور صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کو ان کی خواہش کے نتیجے کی اطلاع دے سکوں، والسلام، خلیل الرحمن، نائب ناظم ندوۃ العلماء، نقلم عبدالحی۔

ندوہ کے اس دفتری مراسلہ سے ثابت ہوگا کہ کن لوگوں نے اس کو حکومت تک پہنچایا اور کس طرح ان کی شش ماہہ معطلی عمل میں آئی، ان کی چند روزہ معطلی کے پہلے جلسہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی بحیثیت رکن انتظامی شریک تھے، مگر بعض مقامی اخباروں کے شور و غل کے بعد انہوں نے ایک اخبار میں اپنی شہادت شائع کرائی اور اپنی برأت ظاہر کی، اس کا جواب مولانا نے ۲۴ مئی ۱۹۱۳ء کے وکیل امرتسر میں چھپوادی، یہ تحریر اور دوسری تحریر جو مولانا سید عبداللہ صاحب کے جواب میں ہے، مقالات شبلی جلد سوم صفحہ ۱۱۹ اور صفحہ ۱۳۱ پر چھپی ہوئی ہے۔

دارالعلوم کی معتمدی سے استعفا | بہر حال مولانا ان ہنگاموں سے ایسے بددل ہوئے کہ انہوں نے دارالعلوم کی معتمدی سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ جولائی ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے اپنا استعفا دفتر میں بھیج دیا، ان کے ساتھ دارالعلوم معتمدین یعنی مولوی سید عبداللہ صاحب مرحوم اور منشی احتشام علی صاحب بھی اپنی اپنی معتمدیوں سے مستعفی ہو گئے، بعض اور دوسرے ارکان نے بھی رکنیت سے استعفا دیا، اس کے بعد ۱۸/۱۹/۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا خلیل الرحمن صاحب مرحوم مستقل ناظم بنائے گئے اور ندوہ کی عنان حکومت ان کے ہاتھ میں دے دی گئی، (شروانی - ۱۰۹) اور مولوی سید عبداللہ صاحب اور منشی احتشام علی صاحب عہدوں کے لحاظ سے نائب ناظم مقرر کیے گئے۔

نظامت کے عہدے کے لیے مولانا خلیل الرحمن صاحب مرحوم کا انتخاب اگرچہ دستور العمل کے قواعد اور مولانا کی مصلحت بینی کے بالکل خلاف تھا، کیوں کہ وہ مولانا کے نزدیک دارالعلوم کے اصلی نصب العین اور مقصد سے متفق نہ تھے اور وہ اس کو پرانی قسم کی ایک عربی درس گاہ بنا دینا چاہتے تھے، تاہم چون کہ مولانا صرف ندوۃ العلماء کی اصلاح اور بہبودی کے خواستگار تھے، اس لیے اس یکسوئی میں ان کو ندوۃ العلماء کے فوائد نظر آئے اور وہ اس پر خوش ہوئے، چنانچہ ۱۹ اگست ۱۹۱۳ء کو مجھے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں ”باوجود مخرب بات کے چند باتیں خود بخود مفید بھی نکل آئیں، ہیڈ ماسٹر نے دوسری جگہ تعلق کر لیا اور سردست چھ مہینے کی رخصت لی، پھر غالباً مستعفی ہو جائے گا، اس سے انگریزی کا جو سخت نقصان تھا، رفع ہو جائے گا، مولوی عبداللہ صاحب ٹوکنی کے اختیارات وسیع ہوئے اور..... کے استعفا سے ہر ہر کام میں رکاوٹ جاتی رہی..... معتمدیوں کے ٹوٹ جانے سے اتنا فائدہ ہوا کہ بہر حال قوت ایک جگہ ہو گئی، یہ دوسری بحث ہے کہ اس وقت انجن خراب ہے لیکن کوئی کام کا آدمی منتخب ہوگا، تو کام

میں رکاوٹ نہ ہوگی، ورنہ معتمدین کا ہٹانا بہت مشکل تھا۔“ (سلیمان-۵۱)

مولانا کے استغنے کا اثر | مولانا کے استغنے کی خبر جب طلبہ کو معلوم ہوئی تو ان کو سخت افسوس ہوا، پہلے سب نے ایک جلسہ کر کے مولانا کو ہمیں پے درپے کئی تاریخیں بھیجی، جن میں ان سے استغنے کی واپسی کی پرزور خواہش کی تھی اور فردا فردا دوسرے طالب علموں نے بھی اسی قسم کے خطوط لکھے اور التجا میں کہیں کہہ اپنے استغنے کو واپس لے کر ان کو مرہون منت فرمائیں، لیکن مولانا نے عہدہ کی ذمہ داری لینے سے بدستور انکار کیا، لیکن اس انکار کے باوجود یہ اقرار کیا کہ معمولی رکن کی حیثیت سے اب بھی ان کی زندگی کا مقصد ندوہ ہی کی خدمت ہے، چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو طلبائے ندوہ کے نام حسب ذیل خط لکھا ”عزیزان من! السلام علیکم! آپ لوگوں کے پراثر خطوط اور تار پے درپے آئے ہیں، ایسا سنگ دل نہ تھا کہ ان سے متاثر نہ ہوتا لیکن موجودہ حالت میں کام کرنا ناممکن تھا اور میں دارالعلوم کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا، مجھ کو اپنی تمام کوششوں اور جاں فشانیوں کی (اگر میں نے یہ فرض کچھ کی ہیں) داد مل گئی اور یہ میرا پورا اصلہ ہے کہ جن کی خدمت کی گئی وہ اس کی قدر کرتے ہیں، آپ لوگ مایوس ہیں لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں، عام اسلامی جماعت بیدار ہو گئی ہے، وہ اپنے ہر قسم کے فوائد کو سمجھے گی اور اس کی نگہداشت کرے گی ممکن ہے کہ کچھ دیر ہو لیکن جو ختم زمین پر پڑ چکا ہے وہ انشاء اللہ برباد نہ جائے گا۔

ندوہ کیا چیز ہے؟ موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں مذہب کی حمایت، یہ احساس عام ہو چلا ہے، معارف قرآنیہ دہلی اسی رفتار کا ایک قدیم ہے، ندوہ بھی اپنے اولیت کے نتائج حاصل کرے گا، ولو بعد برہۃ باوجود استغنا میری زندگی کا مقصد ندوہ ہی رہے گا اور آپ لوگوں کی خدمت نہ صرف دل

بلکہ ہاتھ سے بھی کرسکوں گا علی اللہ التکلان۔“ (مکاتیب اول)

پھر مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹوکی مدرس اعلیٰ دارالعلوم اور حضرات مدرسین کے جواب میں یہ خط لکھا ”آپ صاحبوں کی ہمدردی اور قدردانی شکر یہ ادا کرتا ہوں لیکن فرمائیے چارہ کیا ہے؟ پورے چار برس گزرے۔ بجز اس کے کہ ہر کام میں میری مخالفت کی گئی اور کیا ہوا، اس بنا پر میں ندوہ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں، دو ایک برس بھی آزادی سے کوشش کر سکتا تو ندوہ کو کچھ ترقی دے سکتا۔

۱۔ مکاتیب ابوالکمال، عبدالکحیم ۲۔ شاید ۱۹۱۲ء میں مولانا عبداللہ صاحب سندھی نے اس نام سے ایک قرآنی درس گاہ کی بنیاد مسجد فتح پوری میں ڈالی تھی، جس کا مقصد سندیا فتنہ عربی طلبہ اور مسلمان گریجویٹوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا تھا۔ ۱۹۱۳ء کی بڑی لڑائی میں مولانا عبداللہ صاحب وغیرہ نے جب ہندوستان کو چھوڑا تو یہ ادارہ بند ہو گیا۔

اس لیے یہی بہتر ہے کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں، ممکن ہے کہ وہ مجھ سے اچھا کر سکیں، بہر حال میں مدرسہ کا اور طلبہ کا ویسا ہی خدمت گزار ہوں گا، اب محبت اور ہمدردی کا تعلق بالکل بے لاگ ہوگا، یعنی انفری کی ظاہری بے گانگی بھی نہ رہے گی اور بچے دیکھیں گے کہ میں کیوں کر ان کا برابر کا بھائی بن کر کام کرتا ہوں۔“

۱۹ جولائی ۱۹۱۳ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا ”ندوہ سے تعلق منقطع ہونا تو محال ہے لیکن یہ وہیں آکر فیصلہ ہو سکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو۔“ (مسعود علی - ۲)

ملک کے مختلف گوشوں سے بھی استغنے کی واپسی کے لیے تحریکیں انھیں مگر مولانا اپنی رائے پر پختہ رہے۔

حیدرآباد کا سفر اور ماہانہ میں اضافہ | مولانا بہمنی سے نواب عماد الملک کی طلبی پر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے دوسرے ہفتہ میں (۱۱ین اور ۱۰واں کلام - ۲۷) حیدرآباد روانہ ہو گئے، نواب صاحب اس وقت مولانا کی تحریک سے قرآن پاک کا جو انگریزی ترجمہ کر رہے تھے، اس میں مولانا سے مشورے درکار تھے، یاد ہوگا کہ سرکار آصفیہ سے مولانا کو ۱۰۰ روپیہ ماہ وار جب ۱۸۹۶ء میں مقرر ہوئے تھے تو اس فرمان میں آئندہ کے اضافہ کا اشارہ بھی تھا، مگر اب تک نہ مولانا نے خواہش کی اور نہ سرکار آصفیہ نے توجہ فرمائی، اس سفر میں نواب صاحب نے اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان بہادر کی سرکار میں اضافہ کی تحریک کی تو اعلیٰ حضرت نے مسرت ظاہر فرمائی (عبدالماجد - ۱۷) اور دو سو ماہ وار کا اضافہ منظور فرمایا، اس اضافہ سے مولانا کو اپنے بہت سے پیش نظر علمی و قومی کاموں میں سہولت حاصل ہو گئی۔

حیدرآباد میں اس دفعہ ان کو مکان بہت دل خواہ اور تفریح بخش مل گیا تھا، اس لیے وہ دو تین مہینے حیدرآباد میں ٹھہر گئے اور سیرت کی پہلی جلد کی تکمیل میں ہمت تن مصروف ہو گئے۔

لکھنؤ کو واپسی | آخر ہم سب لوگوں کے بڑے تقاضے سے ۸ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ کا قصد کیا۔ (سلیمان - ۶۳) اس اثنا میں میں الہلال کلکتہ سے الگ ہو کر پٹنہ میں ٹھہرا ہوا تھا، مولانا کے لکھنؤ کی آمد کی خبر سن کر میں بھی حاضر خدمت ہوا اور چند ہی روز کے بعد مجھے دکن کالج پونہ کی ایک خدمت پر روانہ کیا، اور خود لکھنؤ میں قیام فرمایا۔

طلبائے دارالعلوم سے بدستور تعلق | طلبہ نے ان کے آنے پر ایک جلسہ کیا، جلسہ میں انہوں

نے اپنی تقریر سے پہلے طالب علموں سے مخاطب ہو کر بڑی حسرت سے اپنا یہ قطعہ پڑھا جس کو دو اعیہ کہنا چاہیے:

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
 اور اب تو جی یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا
 درس بخاری کو روکنا | دسمبر ۱۹۱۳ء کے آخر میں آخری سال کے لڑکوں نے مولانا سے خواہش ظاہر کی
 کہ وہ انہیں بخاری شریف کا درس دیں، مولانا نے اس کو قبول کیا اور ہر روز مغرب کے بعد درس شروع
 ہو گیا اور بہت سے لڑکوں نے اس میں شرکت کی لیکن ناظم صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا، انہوں نے
 جناب مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی سے جو مہتمم و مدرس اعلیٰ تھے، خواہش کی کہ وہ طلبہ کو اس سے روکیں،
 مفتی صاحب نے اس میں تامل کیا اور اس کا تذکرہ مولانا سے کیا، انہوں نے فرمایا کہ وہ آپ کو تحریری
 حکم بھیج دیں، تو آپ اس پر عمل کیجیے لیکن جناب ناظم صاحب نے اس ناگوار فرض کی انجام دہی سے
 پہلو تہی کی اور مفتی صاحب کو مجبور کیا کہ وہی اپنے قلم سے حکم لکھیں، انہوں نے یہ کیا کہ یہ تخصیص بخاری
 کے درس کے روکنے کے بجائے طلبہ کو خارج اوقات میں کسی سے درس لینے کی ممانعت کر دی، اس کا اثر
 طلبہ پر بہت برا پڑا، بہت سے طلبا خارج اوقات میں دوسروں سے اپنے سابق کی کمی کو پورا کرتے تھے،
 وہ سب بند ہو گئے۔

میلا د میں مولانا کی تقریر کو روکنا | دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ دارالعلوم کے طلبہ ہر سال کسی نہ کسی
 تاریخ میں دھوم دھام سے بیان سیرت کی مجلس کرتے تھے، جس میں تمام اہل شہر مدعو ہوتے تھے اور مولانا
 عموماً سیرت نبوی ﷺ پر کوئی مفید و موثر تقریر فرماتے تھے، اس سال بھی اس مجلس کا اہتمام شروع ہوا اور
 خیال تھا کہ طلبہ مولانا سے تقریر کی درخواست کریں گے، اس لیے پہلے اس مجلس ہی کو روکنے کی کوشش کی گئی
 لیکن پھر بعد کو عام بدنامی کے ڈر سے مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ اس کی منظوری دے دی گئی۔
 اسٹریک | اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جو طلبہ میں ہيجان کا باعث بنتے گئے، جن میں سے
 ایک طلبہ کو سیاسی جلسوں میں شرکت سے حکماً باز رکھنا بھی تھا، آخر ۷ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا کی ہر قسم کی
 فہمائش کے باوجود طلبہ نے اسٹریک کا عام اعلان کر دیا اور چون کہ طرابلس و بلقان کی لڑائیوں اور کان پور
 ل ابوالکمال عبدالکحیم - ۵، حمید - ۷۔

کے بچکاموں اور مسلم یونیورسٹی کے پرجوش مطالبوں کے باعث طبائع میں عام طور سے بے چینی تھی، اس لیے اسٹرائیک کے ساتھ ملک کی ہمدردی ایک ملکی مسئلہ کی طرح پھیل گئی، زمین دار لاہور، ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ اس زمانہ کے مشہور اور آزاد اخبار تھے، جو طلبہ کی حمایت میں پرزور مضامین لکھ رہے تھے، وقت کی سیاسی بے چینی نے قوم کے افراد کو دو حصوں میں صاف صاف منقسم کر دیا تھا، ایک آزاد جن کا نام آہستہ آہستہ احرار پڑ رہا تھا، جس کے سربراہ مولانا ابوالکلام، محمد علی مرحوم، سید حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں اور ان کے شیخ طریقت مولانا شبلی تھے، دوسرا حصہ قدامت پسندوں کا تھا جن میں اس وقت صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے، احرار کا طبقہ ہر طرح طلبہ کی ہمدردی و حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور دوسرا طبقہ ندوہ کے موجودہ کارکنوں کی حمایت میں تھا، مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنان مدارس کی ہمدردی کے نام سے علی گڑھ کالج کے ارباب اقتدار اور مدرسہ دیوبند کے علماء بھی ندوہ کے مدعیوں کے ساتھ تھے اور یہ تصادم ملک کے طول و عرض میں پورے ڈھائی مہینے قائم رہا۔

مولوی مسعود علی ندوی اور طلبائے قدیم | اسٹرائیک کے اعلان کے ساتھ بعض ان قدیم طلبہ نے جو لکھنؤ میں رہتے تھے، مناسب سمجھا کہ طلبائے قدیم کی ایک مجلس کی بنیاد ڈال کر اس اسٹرائیک کی رہنمائی کریں، اس مجلس کے پہلے ناظم مولوی مسعود علی صاحب ندوی منتخب ہوئے، مولوی صاحب مدوح کی عملی قابلیت کا غیر معمولی اظہار اسی اسٹرائیک کی رہنمائی کے دوران میں ہوا، انہوں نے بڑی قوت اور قابلیت سے طلبہ کی اسٹرائیک کو پورے زور شور سے اس خوبی سے جاری رکھا کہ تمام ملک دنگ رہ گیا، ایک طرف ۱۰۰ سے زائد طلبہ کے کھانے پینے رہنے سہنے کا انتظام، ان کو قابو میں رکھنا، ان میں بددلی نہ پیدا ہونے دینا اور ساتھ ہی ان کے پڑھنے کے لیے مدرسین کا فراہم کرنا اور دوسری طرف تمام ملک میں اخبارات رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعہ سے رائے عامہ کو ابھارتے رہنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

اصلاح ندوہ کی کوشش | مولانا نے استعفا دینے کے ساتھ اپنے ہمدرد و احباب اور شاگردوں کو ندوہ کے علاج سے مایوس ہونے کے بجائے اصلاح ندوہ کی تجویزوں کی طرف متوجہ کیا تھا، دوستوں میں سے خصوصیت کے ساتھ نواب سید حسن خاں، مولانا ابوالکلام اور شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی اور خاک سار کو متعدد خطوط لکھے اور ان کو ندوہ کی اصلاح کے لیے آمادہ کیا، ان ہی میں سے بعض نے یہ خطوط ابھی نواب صاحب، مولوی ابوالکلام صاحب، مولوی مسعود علی صاحب اور میرے نام کے مکاتیبِ شبلی میں چھپے ہوئے موجود ہیں۔

خطوط کو ڈاک سے اڑا کر دفتر نظامت نے ۲۶، ۲۷، ۲۸، مارچ ۱۹۱۳ء کے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا اور اخباروں میں شائع کرایا اور ثابت کرنا چاہا کہ مدرسہ میں یہ اسٹرائیک ان کی سازش سے ہوئی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا لیکن جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے مولانا نے علی الاعلان اعتراف کیا کہ بے شبہ یہ میری تحریک ہے اور لوگوں سے میری یہ استدعا ہے کہ وہ ندوہ کی اصلاح کے لیے فوراً کھڑے ہو جائیں۔

مجلس اصلاح ندوہ کا قیام | ملک میں یہ ہنگامہ برپا تھا اور مختلف شہروں میں ندوہ کے کارکن اصحاب کے خلاف احتجاجی جلسے ہو رہے تھے، آخر ندوہ کے ارکان میں سے ان لوگوں نے جو اصلاح کے حامی تھے اور جن کی تعداد دو تہائی کے قریب تھی، متفق ہو کر اپریل ۱۹۱۳ء کی ابتدائی تاریخوں میں لکھنؤ میں مجلس اصلاح ندوہ کی بنیاد ڈالی، نواب سید علی حسن خاں مرحوم اس مجلس کے ناظم اور مولوی نظام الدین حسن صاحب (سابق منصب دار بھوپال و حیدرآباد) صدر قرار پائے اور بہت سے حضرات نے اس کی ممبری قبول کی اور تمام ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں بلکہ قصابات و دیہات میں تقریباً پچاس ۵۰ جلسے مطالبہ اصلاح کی تائید میں مسلسل منعقد ہوئے۔

الہلال اور مولانا ابوالکلام | اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کا تصور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا، انہوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور شور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے یہ تمام واقعات مولانا کے اس مضمون میں مذکور ہیں، جو "اسٹرائیک کا سبب کون تھا؟" کے عنوان سے ہمدرد دہلی مورخہ ۶ مارچ ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا، اور اب مقالات شبلی جلد ہشتم کے ص ۱۲۸ پر چھپا ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی عبد السلام صاحب ندوی کے ایک خط نے بڑا ہنگامہ برپا کر دیا، انہوں نے ۲۵ جولائی ۱۹۱۳ء کو بمبئی سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ، "اب خاموشی کا وقت نہیں، مختلف مقاموں میں جہاں جہاں آپ کا اثر ہو، اظہارِ افسوس اور ندوہ کے موجودہ نظام سے بے اطمینانی کے جلسے کرائیے، سرکشی اور اسٹرائیک کا وقت اب آیا ہے،" اس کے آخر میں لکھا تھا کہ، "اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو، یہ مولانا کا حکم ہے،" یہ خط بھی دفتر نظامت نے ڈاک سے اڑایا اور بعد کو اسٹرائیک کے بعد اس کو پبلک میں شائع کیا، مولانا نے اس خط کے متعلق بے حلف اپنے مضمون میں لکھا کہ، "نہ یہ میری ایما سے لکھا گیا ہے، نہ میں نے اس کو دیکھا ہے اور نہ میں اس کو اب بھی جائز سمجھتا ہوں،" مولوی عبد السلام صاحب نے اس خط کو اپنا قبول کیا، مگر یہ لکھا کہ، "میں نے مولانا کے اتنے ہی منظوری کی خبر سے مضطرب ہو کر لکھا اور مولانا کی طرف اس لیے نسبت کی کہ طلبہ میں اس تحریک کی اہمیت بڑھ جائے،" مگر یہ خط نہ مکتوب الیہ کو ملا اور نہ طلبہ تک پہنچا اور نہ وہ اسٹرائیک کا سبب بنا، یہ اسٹرائیک اس خط کی تاریخ کے سات مہینوں کے بعد ہوئی۔

سے اس سرے تک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف ندوہ ندوہ کا شور برپا ہو گیا۔
 حکیم اجمل خاں مرحوم | یہ حالت تھی جب حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنی مسیحا نفسی کا ثبوت دیا
 انہوں نے پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کی اہمیت کو سمجھ کر تمام ملک کے اہل الرائے حضرات
 کو دہلی میں ایک مشورہ کی مجلس میں شرکت کی دعوت دی، جو ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کو وہاں ہونی قرار پائی۔

مجلس اصلاح ندوہ کا اجلاس عام دہلی میں | مولانا کا قیام دہلی میں حکیم صاحب ہی کے مکان
 پر تھا، ہر روز اصلاح حال کے جلسے اور مشورے ہوتے رہتے تھے مختلف ہمدرد اصحاب آتے اور معاملہ کی
 یکسوئی کی راہیں پیش کرتے تھے، ۲۹ اپریل ۱۹۱۴ء کو مولانا دلی سے نواب علی حسن صاحب کو
 لکھتے ہیں ”مقامی کمیٹی جلسہ کے انتظام میں مصروف ہے، باہر سے بہت سے لوگ آتے نظر آتے ہیں،
 خطوط آرہے ہیں، مولوی خلیل الرحمن صاحب، منشی سخاوت علی، نواب وقار الملک، مولوی حبیب الرحمن
 خاں شروانی کے مواجہہ میں مختلف جلسے معاملات کے طے ہونے کے ہوئے، گو میں شریک نہ تھا، اب
 تک جو امور طے ہوئے، بہ ظاہر قابل اطمینان ہیں، دیکھیے اگر اخیر تک قائم رہ جائیں، ایک خاص امر
 میں زیادہ بحث ہے اور وہ ۱۰ مارچ کے جلسہ کا انعقاد ہے، بہر حال دو ایک دن میں آخری نتائج معلوم
 ہو جائیں گے اور مطلع کروں گا، کوئی امر بغیر آپ کی اصلاحی کمیٹی کی منظوری کے طے نہ کیا جائے گا، ابھی
 تک مسودہ ہے۔ (نواب علی حسن خاں - ۹)

محمد علی مرحوم ابھی تک پوری مستعدی سے اصلاحی کمیٹی میں شرکت نہیں کر رہے تھے، ان کا
 خیال تھا کہ جب تک اصلاح کی تمام دوسری صورتیں ناکام نہ ہو جائیں، ۱۰ مئی کی کانفرنس کو ملتوی
 کر دینا چاہیے، ۲۴ اپریل کے ہمدرد میں انہوں نے اپنے اس خیال کو پھیلا کر لکھا، مولانا نے یکم مئی
 ۱۹۱۴ء کے ہمدرد میں ان کو جواب دیا، جس میں پہلے ان کی مخلصانہ کوشش کا اعتراف کیا، پھر لکھا کہ اب
 تک میں نے اور میرے ہمدرد ارکان نے مصالحتانہ اصلاح کی کیا کوششیں کیں اور وہ ناکام رہیں اور
 اب یہ جز مسلمانوں کی ایک عام کانفرنس کے کوئی دوسرا اعلان باقی نہیں رہا۔

غرض ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کی اصلاحی کانفرنس کی تاریخ قائم رہی۔
 مولانا کی تکفیر | مخالفین نے اس اصلاحی تحریک کو ناکام کرنے کے لیے جو آخری ہتھیار اٹھایا وہ

۱۔ اب یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہفتم میں ملے گا - ۱۲۔

مولانا کی تکفیر کا فتویٰ تھا، دلی میں مخالف ارکان و علما کا مرکز مولانا عبدالحق صاحب حقانی کا مکان تھا، کہتے ہیں کہ ان ہی کے مشورہ سے بعض علما نے الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر تکفیر کا یہ فتویٰ مرتب کیا، جس میں ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ قدم مادہ کے قائل ہیں اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں، یہ فتویٰ ملک میں شایع ہوا اور اشتہار کے طور پر مختلف شہروں کی دیواروں پر چسپاں کیا گیا، اس موقع پر سید عبدالسلام صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی نے مولانا کی خدمت میں ایک استفسار پیش کیا، جس میں یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ مادہ عالم کو قدیم اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں؟ مولانا نے اس کے جواب میں پہلے ایک مفصل بیان لکھا کہ میں مادہ عالم کو قدیم نہیں مانتا، البتہ تمام صفاتِ الہی کے قدم کا قائل ہوں اور اسی طرح نبوت کو اکتسابی بھی نہیں جانتا بلکہ اس کو عطیہ الہی مانتا ہوں، سید عبدالسلام صاحب نے کہا کہ یہ تحریر ذرا لمبی ہے اور عوام اس کو سمجھ نہیں سکتے، مولانا نے اسی مطلب کی ایک دوسری مختصر تحریر لکھ دی، میں اس وقت پاس بیٹھا تھا، میں نے مولانا کے ہاتھ کی وہ دونوں تحریریں اپنے پاس رکھ لیں (جو انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر پیش ہوں گی) اور دوسری تحریر کی نقل سید صاحب کے حوالہ کی، جو عام طور سے شایع کی گئی، جس سے اس فتنہ کا سارا تار و پود بکھر گیا۔

دلی کی اصلاحی کانفرنس، محمد علی مرحوم اور اسٹراٹیک کا خاتمہ | بہر حال ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء کو دلی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اس کا ایسا معقول انتظام کیا تھا کہ ایسا ہنگامہ خیز اجلاس پوری دل جمعی کے ساتھ بیٹھا اور اس نے اپنا کام کیا، اس کانفرنس میں تمام ہندوستان سے لوگ آئے تھے اور ہر طرف سے موافق و مخالف سمٹ کر اس میں جمع ہوئے تھے، دونوں طرف کے ممبروں نے تقریریں کیں، اپنی اپنی رودادیں سنائیں اور تجویزیں پیش کیں، اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ محمد علی مرحوم جو حزب احرار کے دوسرے دست و بازو تھے، وہ ابھی تک گوگلو میں تھے اور پوری مستعدی کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ تھے، میں اور مولوی مسعود علی صاحب ان سے کئی دفعہ ملے اور ان کو طلبہ کے مطالبات کی حمایت کے لیے آمادہ کیا، انہوں نے کہا جب تک طلبہ اسٹراٹیک نہ ختم کر دیں، میں ان کی حمایت نہیں کر سکتا، ہم دونوں نے کہا اگر آپ ان کے مطالبات کی ذمہ داری قبول کر لیں تو امید ہے کہ وہ ابھی اسٹراٹیک ختم کر دیں گے، یہ سن کر وہ

۱۔ مکاتیب شروانی - ۱۱۶۔

خوش ہوئے، کیوں کہ اس سے پہلے بہت سے اکابر اس کے لیے کوشش کر کے ناکام ہو چکے تھے، غرض اسی وقت ہم نے اور انہوں نے مل کر طلبہ کو لکھنؤ تار دیا، وہاں سے محمد علی مرحوم کے نام جواب آیا کہ ہم بخوشی اپنی قسمت کی باگ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دیتے ہیں اور آپ کے حسب مشورہ اسٹراٹیک کو ختم کرتے ہیں، یہ ایسی خوش خبری تھی کہ محمد علی مرحوم اپنی اس کام یا بی بی پراچھل پڑے اور فوراً تار لیے ہوئے جلسہ میں آئے اور ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ اس تار کو پڑھ کر طلبہ کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

دوسرا واقعہ جس نے محمد علی مرحوم کو طلبہ کی حمایت میں اور زیادہ سرگرم بنا دیا، وہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تقریر تھی، وہ محمد علی مرحوم کی جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور منتظمین کی حمایت میں ایک مبسوط تقریر کی، میں پاس بیٹھا تھا، محمد علی مرحوم کا یہ حال تھا کہ صاحب زادہ صاحب مرحوم کے ہر ہر فقرہ پر وہ اور زیادہ مشتعل ہوتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ صاحب زادہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہہ اٹھے کہ ”اگر استبدادِ مجسم دیکھنا ہو تو ادھر دیکھو“ آخر صاحب زادہ صاحب کی تقریر کے بعد وہ پھر کھڑے ہوئے اور ایسی گرم اور پر زور تقریر کی کہ استبدادی منتظمانہ اصول کی جڑیں بل گئیں، اس سلسلہ میں خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری نے تائیدی تقریریں فرمائیں۔

اصلاحی سب کمیٹی | بہر حال ان گرما گرم تقریروں کے بعد حاضرین کی کثرت رائے سے چند تجویزیں منظور ہوئیں اور ایک سب کمیٹی بنی، جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوہ کے لیے ایک ایسا نیا دستور العمل بنائے جس میں کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے، اس دستور العمل کے بنانے کا کام حکیم صاحب مرحوم کے حسب منشا، پیر زادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا اور حکیم صاحب مولانا ابوالکلام صاحب، محمد علی مرحوم، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، نواب علی حسن خان مرحوم، حکیم عبدالولی صاحب مرحوم (جھوئی ٹولہ لکھنؤ) وغیرہ ممبر منتخب ہوئے۔

اصلاحی سب کمیٹی نے اپنا کام فوراً ہی شروع کر دیا، پہلی کمیٹی میں محمد علی مرحوم نے اس بات پر زور دیا کہ یہ کمیٹی پچھلے واقعات کی تنقید سے تعلق نہ رکھے، بلکہ یہ پیش نظر رکھے کہ اب ایسے قاعدے بنائے جائیں اور جمہور کی قوت کو اتنا بڑھایا جائے کہ آئندہ کسی کو خود مختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے،

۱۔ رداد جلسہ عام، انجمن اصلاح منعقدہ دہلی، بتاریخ ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء۔

غرض یہ قرار پایا کہ ۲۴ مئی کو ایک جلسہ بلایا جائے، جس میں تمام ارکان جمع ہوں اور پورا خاکہ اس طرح مرتب کر لیا جائے کہ بار بار اجتماع کی ضرورت پیش نہ آئے، ہر طرف کے توسط کے لحاظ سے دہلی کو پھر مقام جلسہ تجویز کیا گیا اور مجلس اصلاح ندوہ لکھنؤ کو اس کی اطلاع دی گئی، اس تجویز کے مطابق ۲۴ مئی کو ایک جلسہ ہوا اور آئندہ کارروائی کی راہیں متعین کی گئی اور پیرزادہ محمد حسین صاحب نے ایک نیا دستور العمل بنایا جس کو مجلس اصلاح نے چھاپ کر شایع کیا۔

مولانا بمبئی میں | مولانا نے اس اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں پورا اپریل و مئی اور جون کا ایک حصہ دہلی میں بسر کیا، اصلاحی سب کمیٹی کے کاموں سے فرصت کر کے وہ وسط جون میں بمبئی روانہ ہو گئے اور سیرۃ النبی ﷺ جلد اول کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور ساتھ ہی دارالہستیفین کے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگے اور احباب و تلامذہ کو خطوط بھیجتے رہے کہ ندوہ کے پرانے دستور العمل کے نقائص اور پیرزادہ محمد حسین صاحب کے مجوزہ دستور العمل پر ناقدانہ مضامین لکھے جائیں۔

علی گڑھ کانفرنس کا کمیشن | چونکہ اس شورش کے زمانہ میں حیدرآباد کے سوادوسری ریاستوں نے دارالعلوم کی ماہانہ و سالانہ امدادیں روک دی تھیں اور گورنمنٹ کے حکمہ تعلیم نے بھی سخت اعتراضات کیے تھے، اس لیے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے معاملات کی تحقیقات کے بہانہ سے ایک کمیشن بھیجے کی تجویز پیش کی، جو موجودہ منتظمین کے موافق ایسا معائنہ لکھے جس کو وہ سرکار بھوپال اور گورنمنٹ میں پیش کر کے مسدود امدادوں کو دوبارہ جاری کرا سکیں، چنانچہ اس تجویز کے مطابق کانفرنس کے کچھ اہل کار دارالعلوم کے معائنہ کے لیے تشریف لائے اور منتظمین نے اس جنگ کو گوارا کر لیا، مولانا گوالگ ہو چکے تھے، مگر ان کی خود در طبیعت کو ندوہ کی اس ہستی سے نہیں لگی اور آنسو کے چند قطرے شعروں کی صورت میں نکل گئے، اس سلسلہ کی پہلی نظم یہ ہے، جس میں ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء کے اجلاس دہلی میں علی گڑھ پارٹی کے طرز عمل کی تشریح ہے:

کیا لطف ہے کہ حامی ندوہ ہیں اب وہ لوگ	جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوہ غریب	اک بیہودہ خیال تھا یا آنکہ خواب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں تعلیم کا یہ طرز	اعلانِ جنگ سید عالی جناب تھا

۱۔ مکاتیبِ شبلی بہتہ منو اب علی حسن خاں۔

تعلیم مغربی کے لیے سد باب تھا سر تا قدم فریب دہ شیخ و شاب تھا جن کے لیے وہ موجب رنج و عذاب تھا ندوہ کے حل و عقد کا نائب مناب تھا وہ اس گروہ پاک کا وقف عتاب تھا ان کی طرف سے ایک کا سوسو جواب تھا جن میں کوئی قمر تھا کوئی آفتاب تھا یعنی یہ کیا طلسم تھا؟ کیا انقلاب تھا اس بزم قدس میں یہ کہاں باریاب تھا یوں کب وہ موردِ کرم بے حساب تھا جو مدقوں سے موردِ خشم و عتاب تھا جس کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا اک ایک کی زبان پہ یہ یہ فصل الخطاب تھا جو کچھ بیاں ہوا ہے یہ آغاز باب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوہ حقیر وہ لوگ جن کی رائے میں ندوہ کا یہ طلسم ندوہ کا نام سن کے جو کھاتے تھے بیچ و تاب حیرت یہ ہے کہ مجمعِ دہلی میں یہ گروہ ندوہ پہ حرفِ گیر جو ہوتا تھا کوئی شخص ندوہ میں کوئی نقص بتاتا اگر کوئی سیارگانِ چرخِ علی گڑھ تھے پیش پیش حیرت میں تھے تمام تماشاویانِ بزم ندوہ کہاں، کہاں وہ علی گڑھ کی انجمن؟ کس دن کی دوستی ہے یہ کب کا ہے ارتباط شایانِ آفریں ہے وہی ندوہِ غریب سرشار ہے حمایتِ ندوہ میں وہ گروہ بغضِ معاویہ ہے، یہ حبِ علی نہیں یہ قصہ لطیف ابھی ناتمام ہے

خاص اس کمیشن کے سلسلہ میں دوسری نظم ارشاد فرمائی:

جو اختراعِ مجمعِ حکمتِ شعار ہے کچھ ابتدا سے بانی آغاز کار ہے مضمونِ آفتاب کا مضمونِ نگار ہے جو صلح ہے وہی روش کارزار ہے جو مدعی رہبری روزگار ہے جو کاروانِ رفتہ کی اک یادگار ہے جس کا کہ مصر و شام میں اب تک وقار ہے جس کا مرقعِ ادبی المنار ہے

آتا ہے اب معائنہ ندوہ کا مشن جن میں سے کچھ شریکِ نزاعِ قدیم ہیں جن میں سے کوئی محکمہ راز کا شریک خود کوزہ گر ہے، خود گل کوزہ بھی ہے وہی کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوہِ علوم جو مایہ امید ہے نسلِ جدید کا جس پر یہ حسنِ ظن ہے کہ ہے مجمعِ کرام آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضلِ عرب

۱۔ سید رشید رضا، اڈیٹر المنار، مصر۔

چلتے ہیں جس کے نقش قدم پر حریف بھی
جس نے خطابتِ عربی کو دیا رواج
جس نے بدل دیا روش و شیوہ قدیم
آتے ہیں اس کی جانچ کونا آشنائے فن
تعلیمِ مشرقی سے نہیں جن کو کچھ غرض
اربابِ ریش و جبہٴ اقدس کا وہ گروہ
یہ داستانِ درد، یہ افسانہ الم
گوا اعترافِ حق سے ابھی ان کو عار ہے
جو فنِ جرح و نقد کا آموز گار ہے
یہ انقلابِ گردشِ لیل و نہار ہے
جو رہبرِ طریقہٴ اصلاحِ کار ہے
ندوہ اب ان کا نازکش اقتدار ہے
اب چند منشیوں کا اطاعت گزار ہے
ندوہ کا نوحہٴ نفسِ احتضار ہے
بہر حال یہ کمیشن آیا اور اس نے دارالعلوم کا معائنہ کیا اور رپورٹ تیار کی، جو گورنمنٹ کے

محکمہٴ تعلیم اور ریاستوں میں بھیجی گئی۔

مصالحت کے لیے مولانا کی آخری کوشش | ۱۳ جون ۱۹۱۲ء کو ندوہ کا جلسہ انتظامیہ ہونا طے
ہوا اور اس کا ایجنڈا رکن کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا گیا، اس میں غالباً دہلی کی اصلاحی
کانفرنس کی مخالفت کی طرف بھی کوئی اشارہ تھا، اس پر مولانا نے ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو اس کے جواب میں
بہمنی سے ایک مفصل تحریر لکھ کر بھیجی اور مصالحت کی تجویز پیش کی، خوش قسمتی سے اتفاقاً مجھے یہ تحریر دفتر
ندوہ کے پرانے کاغذات میں اس وقت مل گئی، گو نیچے سے اس کی ایک دو سطریں پھٹ کر الگ ہو گئی
ہیں، تاہم مطلب کی بات اس میں سب کچھ موجود ہے۔

”جناب من! السلام علیکم، جلسہ انتظامیہ مورخہ ۱۳ جون ۱۹۱۲ء کا ایجنڈا پہنچا، اس زمانہ میں غالباً

میں ان اطراف میں نہ رہوں گا، میری صحت اب اس کی مقتضی نہیں کہ میں سیرت نبوی کے سوا زیادہ تر اور
کسی طرف متوجہ ہو سکوں، بعض ضروری امور گزارش ہیں:

۱۔ جلسہ دہلی کے متعلق میری رائے ہے کہ اس کا منشا رکانِ ندوہ کی توہین یا شکست نہ تھی، بلکہ صرف

یہ تھی کہ چون کہ تین چار دفعہ خود ندوہ کے مختلف اور متعدد رکان کی طرف سے اصلاح کی کوشش ہو چکی، مولوی

عبدالباری^۱ صاحب اور میرزا ظفر اللہ^۲ خاں صاحب کے خطوط مطبوعہ اور یادداشت مطبوعہ سب کے پیش نظر

ہیں، باوجود اس کے کوئی توجہ اس لیے بعض لوگوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سامنے لایا

۱۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم ۲۔ میرزا ظفر اللہ خاں صاحب، ڈسٹرکٹ جج سیال کوٹ، پنجاب۔

جائے لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ (اس کا مقصد) کسی شخص کو معتمد یا ناظم بنانا ہے، یا موجودہ کارکن صاحب کو برطرف کرانا ہے، اس لیے نہایت فریق ہندانہ جوش پیدا ہوا، لیکن جلسہ میں ایک حرف ان امور کے متعلق نہیں کہا گیا، صرف چند اصحاب منتخب ہوئے کہ دستور العمل کے اصلی نفاذ اور اس کی عدم پابندی کے متعلق اصلاحی اسکیم مرتب کریں، یہ اسکیم غالباً خود ارکانِ ندوہ کے سامنے پیش ہوگی، اس بنا پر جلسہ دہلی کی کارروائی کے ساتھ مخالفت کی بہ ظاہر وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

سچ تو یہ ہے کہ ندوہ اب بالکل نئے سرے سے باقاعدہ ہونے کا محتاج ہے۔

۲- مولوی عبداللہ صاحب کی رپورٹ متعلق اسٹراٹیک دیکھ کر سخت حیرت ہوئی اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی شہادت صرف خدائے عالم الغیب پر محمول ہے، مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبق روکنے پر اپنی مجبوری بیان کی اور کہا کہ میں کیا کروں؟ ناظم صاحب سے متعدد دفعہ نماز کے اوقات میں مسجد میں ملاقات ہوتی ہے اور وہ ہر دفعہ مجھ سے کہتے ہیں کہ بخاری پڑھنے والے لڑکوں کو خارج کر دیا یا نہیں لیکن اب تک میں نے نہیں خارج کیا“ میں نے کہا کہ آپ ان سے حکم لکھوا لیجیے، اس پر فرمایا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں، آئیں گے تو میں لکھواؤں گا“ پھر یہ بھی کہا کہ ان کے واپس آنے تک لڑکے اگر بخاری پڑھیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔

اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہوں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس

کا فیصلہ کرنے والا ہے؟

باقی قانونی حیثیت سے تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ندوہ جب سے قائم ہے، لڑکے باہر اساتذہ وغیر اساتذہ سے پڑھتے تھے، خود اس زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا، بہت سے لڑکے اور اسباق..... مثلاً ظلیل صاحب (شیخ محمد عرب صاحب کے فرزند) سے..... کہیں، بخاری شریف کے سبق کے متعلق چوں کہ مولانا نے براہِ راست مجھ کو مخاطب کیا ہے، اس لیے یہ چند سطریں لکھنی پڑیں۔

۳- اسی رپورٹ میں میرے دارالاقامہ کے تعلق کا بھی ذکر ہے، اس کے متعلق کوئی شکایت

ہے، تو میں اس کا ذمہ دار ہوں لیکن دارالاقامہ میری نگرانی میں کبھی براہِ راست نہیں رہا جو ہتہم ہوتا تھا،

۱۔ مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹوکنی، مدرس اعلا دارالعلوم نے اسٹراٹیک کے متعلق ایک یادداشت لکھ کر موجودہ ناظم صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی، جس کو انہوں نے چھاپ کر تمام ارکان کے پاس بھیجا تھا، اس میں انہوں نے اسٹراٹیک کے ان اسباب کی تردید کی تھی جو عام طور سے طلبہ نے اپنی شہادت میں بتائے تھے۔

اسی سے اس کا تعلق رہتا تھا۔

یہ امور ضابطہ کی حیثیت سے لکھے گئے:

خاص طور پر میری یہ گزارش ہے کہ بہ جائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دو قوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، اسلامی (مصالح) کا یہ اقتضا ہے کہ دو تین شخصوں کو حکم مان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دے دیجیے جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کر لیں، پھر وہ جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ منظور ہو جائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تضحیک ہو چکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے کہ جھگڑا کہاں سے شروع ہوا، کیوں کہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسرِ ناحق ہے، ایسے اشخاص خود ندوہ میں موجود ہیں، جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔“

ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لیے اشخاص ذیل موزوں ہیں:

ڈاکٹر ناظر الدین حسن (پیرسٹر)

مسٹر ممتاز حسین (پیرسٹر)

مولوی آزاد صاحب سجانی کان پور

مولوی سید سلیمان پوند، دکن (شبلی ۲۵ مئی ۱۹۱۴ء)

آخری مصالحت مئی ۱۹۱۵ء | مولانا نے مصالحت کی جو تجویز اس وقت پیش کی تھی وہ بدستور ناقابل قبول ٹھہری لیکن کیا عجیب بات ہے کہ اس کے چھ مہینے کے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مولانا نے وفات پائی تو ناممکن، ممکن اور ناقابل قبول قابل قبول ہو گیا، حادثہ وفات کے چار مہینے بعد ندوہ کے ارکان نے لکھنؤ میں اس کے سالانہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی، اس موقع پر ۱۸ مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کی رائے سے نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم نے دفتر نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی، مصالحت کا مبارک وقت آپہنچا تھا، اس لیے ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا اور مولانا ابوالکلام اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور ارکان ندوہ نے متعدد صحبتوں میں بیٹھ کر معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور یہ طے کیا کہ دس آدمیوں کی ایک مشترک مجلس ۳۱ مارچ کی شام کو منعقد ہو اس میں پانچ ندوہ کے موجودہ ارکان اور پانچ مجلس اصلاح ندوہ کے ارکان شریک ہو کر کثرت رائے سے تمامی اختلافی معاملات کا تصفیہ کر دیں، چنانچہ انجمن اصلاح کی جانب سے حازق الملک حکیم اجمل خاں مرحوم،

مولانا ابوالکلام صاحب، بابونظام الدین صاحب رئیس امرتسر، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ (حال نواب ناظر یار جنگ جج ہائی کورٹ حیدرآباد) اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور موجودہ ارکان ندوہ کی طرف سے مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب، منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کا کوری، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ اور مولوی اعجاز علی صاحب رئیس کا کوری منتخب ہوئے، یہ اصحاب ۳۱ مارچ کی رات کو بعد مغرب دارالعلوم کی عمارت میں جمع ہوئے اور تمام امور پر نہایت ہمدردی سے غور و فکر کیا اور حسب ذیل امور اتفاق کامل سے منظور کیے:

(۱) ندوۃ العلماء کے دستور العمل میں مناسب اصلاح و ترمیم۔

(۲) مسئلہ نظامت کا تفسیہ مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری نے استعفا دیا اور ان کی جگہ مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا، جس کو مولانا نے اصرار کے بعد قبول فرمایا۔

(۳) معتمد صاحب مال نے اپنے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط کو منظور کیا۔

(۴) دارالعلوم کے طلبائے قدیم میں سے پانچ اشخاص کو ندوہ کا ممبر بنانا قبول کیا گیا۔

اس تفسیہ کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب ”مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن“ کے ضروری اجلاس میں شرکت کے لیے پہلی اپریل کو علی گڑھ چلے گئے، جہاں سے وہ ۵ اپریل کو واپس آ کر ندوہ کے آخری سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے اور مجلس اصلاح کی طرف سے کھلے جلسہ میں تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا اور دونوں فریق نے اتحاد و اتفاق کے اس پر مسرت منظر پر خوشی ظاہر کی لیکن اس خوشی و شادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی، وہ یہ تھی کہ انیسویں اس منظر کو دیکھنے کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا، جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح امید ہے کہ شاد ہوئی ہوگی۔

بھائی کی وفات

وطن کی طرف بازگشت اور مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا عزم

مولوی اسحاق صاحب مرحوم مولانا کے بعد اس وقت سب بھائیوں میں بڑے تھے، الہ آباد ہائی کورٹ کے اولو العزم کام یاب وکیل تھے، نہایت سنجیدہ، متین، کم سخن، بلند ہمت، مستقل مزاج اور بہت صاحب رائے اور باتدبیر تھے، مولانا کو شیخ صاحب مرحوم یعنی اپنے والد کے قرضہ کے ادا ہوجانے کے بعد سے گھر کے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا، گھر کی زمین داری، تحصیل و وصول، مقدمات، مال گزاری اور دوسرے خانگی کاروبار کی دیکھ بھال یہی سنبھلے بھائی مولوی اسحاق صاحب مرحوم کیا کرتے تھے، ادھر جب سے مسلمانوں میں پالیٹکس کا انقلاب پیدا ہوا تھا، وہ پالیٹکس میں بھی دل چسپی لینے لگے تھے ”منٹو مارلے اسکیم“ کے زمانہ میں وہ یوپی کے ان بڑھتے ہوئے تعلیم یافتہ لوگوں میں تھے، جو الہ آباد میں رائے عامہ کی نمائندگی کر رہے تھے، سرعلی امام جو اس سال (۱۹۰۸ء) کی مسلم لیگ امرتسر کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے مسلمانوں کے مسلم لیڈر ہو رہے تھے، اسی اسکیم کے زمانہ میں انہوں نے جب اپنی رائے مخلوط انتخاب کی ایک خاص شکل کی حمایت میں ظاہر کی تو یوپی میں ان کے خلاف جو تحریک اٹھی، اس کے رہبروں میں مولوی اسحاق صاحب مرحوم سب سے آگے تھے، یہاں تک کہ سرعلی امام پر ملامت کا ووٹ تک الہ آباد میں پاس کرایا گیا۔

مولانا نے اپنی برادری اور ضلع میں جو تعلیمی کام چھیڑ رکھے تھے، ان دنوں ان کی نگرانی بھی مولوی اسحاق صاحب ہی کرتے تھے، ایک تعلیمی کمیٹی بھی ضلع میں قائم کی تھی اور اب اسی کے ماتحت نیشنل ہائی اسکول جو اتنے دنوں کی غفلت میں جارج ٹڈل اسکول بن چکا تھا، اس کو چھوڑ کر شہلی اسکول کا نام دے کر اس کی اصلاح و ترقی کی تجویز بھی ان کے زیر غور تھی اور عنقریب اس کام کے لیے وہ اعظم گڑھ میں آکر ضلع کا دورہ کرنے والے تھے، ساتھ ہی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر بھی پیش نظر تھا۔

جولائی ۱۹۱۴ء کا اخیر تھا، مولانا بمبئی میں تھے، ۶ جولائی ۱۹۱۴ء کو قرآن پاک کا ایک نہایت قیمتی نسخہ ڈھائی سو میں بمبئی میں خریدا تھا، اس کی خوشی میں تھے (شردانی - ۱۱۷) اور ہمہ تن سیرت نبوی ﷺ کی لے عام مسلمان جداگانہ انتخاب پر مصر تھے، سرعلی امام نے یہ پیش کیا کہ کچھ مسلمان ممبر جداگانہ انتخاب سے اور کچھ مخلوط انتخاب سے منتخب ہوں۔

جلد اول کی تکمیل میں مصروف تھے، چنانچہ ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء کو اپنی مصروفیت کا حال ان لفظوں میں لکھتے ہیں ”سیرت کے اتمام کے لیے یہیں کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لیے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اولیٰ ہمدہ جہت تمام کر کے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔“ (شروانی-۱۱۸)

ان کا خیال تھا کہ وہ رمضان بھر وہیں رہیں گے اور تکمیل کے طلبہ کو وہیں بلوائیں گے، (عبدالعظیم ۷ مورخہ ۱۹ جولائی ۱۹۱۳ء) وہ ان ہی منصوبوں میں تھے کہ دفعۃً الہ آباد سے بھائی کی سخت علالت کی اطلاع آئی، یہ خبر سنتے ہی فوراً الہ آباد روانہ ہو گئے، علالت ایسی سخت اور پیچیدہ تھی کہ خود ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی، شاید چودہ پندرہ روز کی مختصر علالت کے بعد انہوں نے ۵ اگست ۱۹۱۳ء کو الہ آباد میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا کے لیے یہ حادثہ بڑا روح فرسا ہوا، ان کے سکون و اطمینان کی دنیا ہی الٹ گئی، اب ہر طرف سے منہ موڑ کر انہوں نے اس دیرانہ کو آباد کرنے کا عزم کیا، جس کو عمر بھر آبادی کے قابل نہیں سمجھا، یعنی اعظم گڑھ کو مراجعت فرمائی اور شبلی منزل میں بیٹھ کر بقیہ عمر اپنے مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل میں صرف کرنے کا عزم کر لیا، یہیں بیٹھ کر ان کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر روئے، یعنی ایسا پر درد مرثیہ لکھا جس کا لفظ لفظ ان کے خون شدہ دل کی ایک ایک بوند ہے:

وہ برادر کہ مرا یوسف کتھانی تھا وہ کہ مجموعہ ہر خوبی انسانی تھا

وہ کہ گھر بھر کے لیے رحمت یزدانی تھا قوت دست دل شبلی نعمانی تھا

جوش اسی کا تھا جو میرے سر پر شور میں تھا

بل اسی کا یہ مرے خامہ پر زور میں تھا

ہم سے ناکاروں میں ایک قوت عامل تھا وہی مایہ عزت اجداد کا حال تھا وہی

مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی

اب وہ مجموعہ اخلاق کہاں سے لاؤں

بائے افسوس! میں اسحاق کہاں سے لاؤں

۱۔ یہ مرثیہ ستمبر ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ میں بیٹھ کر لکھا ہے، (مسعود-۲۳)۔

جب کیا والد مرحوم نے دنیا سے سفر گھر کا گھر تھا ہدف ناوک صد گونہ خطر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر تیر جو آئے، گیا آپ وہ ان کی زد پر

خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں

اس نے غم اس لیے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج و الم
امن و راحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم میں تھا اور مشغلہ نامہ و قرطاس و قلم

اس کے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی

اس کا ممنون تھا مرا گوشہ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ مرے مہدی مرحوم کا داغ کہ مرا قوت بازو تھا، مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا کج فراغ میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تروتازہ ہے یہ باغ

یعنی وہ آئینہ خوبی اخلاق تو ہے

اٹھ گیا مہدی مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازہ اوراقی پریشان بھی گیا عتبہ والد مرحوم کا درباں بھی گیا

گلہ خوبی تقدیر رہا جاتا ہے

نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو اے خاکِ لحد آج اجل نے سوچی وہ امانت جو مرے والد مرحوم کی تھی
بسکہ فطرت میں ودیعت تھی نفاستِ طلبی ناز پروردہ، نعمت تھا بایں سادہ و شی

دیکھنا اڑ کے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں

گرد پڑ جائے نہ اس عارضِ روشن پہ کہیں

اس کے اخلاق کھٹک جاتے ہیں دل میں ہر بار وہ شکر ریز تبسم وہ متانت وہ وقار
وہ وفا کیشی احباب وہ مردانہ شعاع وہ دل آویزی خو وہ نگہ الفت یار

صحت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی

اس کے ابرو پہ شکن آ کے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم و لطف سے اس کی تعمیر
خوبی خلق و تواضع میں نہ تھا اس کا نظیر
بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر
اس کی اک ذات تھی مجموعہ اوصاف کثیر

بس کہ خوش طبع تھا وہ صاحب تدبیر بھی تھا

سچ تو یہ ہے کہ وہ نونیز بھی تھا پیر بھی تھا

اس کو شہرتِ طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا
وہ گرفتارِ کمند ہوس خام نہ تھا
اس کی ہر بات میں اک لطف تھا ابرام نہ تھا
وہ کبھی مدعی رہبری عام نہ تھا
اس کو مطلوب کبھی گرمی بازار نہ تھی
اس کی جو بات تھی کردار تھی، گفتار نہ تھی

اس کو معلوم جو تھا وسعتِ تعلیم کا راز
اس نے دیکھے تھے جو منزل کے نشیب اور فراز
اس نے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز
مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخسار تک و تاز
کوششوں کے جو نتیجے تھے اسے مل نہ سکے

ہائے وہ پھول کہ پھولے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ! بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن
وہ ترا اورجِ شباب اور وہ بچے کسن
مسندِ حلقہٴ احباب ہے سونی تجھ بن
تو ہی تھا اب خلفِ صدرِ نشینانِ مُسن

دن جب آئے کہ تجھے رہبرِ جمہور کہوں

چرخِ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور
اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر، نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اورج کا دور
کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکون جاتا ہے

کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ! اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز
تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں

اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا! شبلیؒ دلِ خستہ بایں موئے سفید لے کے آیا ہے ترے درِ گہ عالی میں امید
 مرنے والوں کو نجاتِ ابدی کی ہونوید خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید
 کیا لکھوں قصہٴ غمِ تابِ رقم بھی تو نہیں
 اب مرے خامہٴ پر زور میں دم بھی تو نہیں

ان کے اس دردِ غم کا اندازہ ان کے ان خطوط سے بھی کیجیے جو اس زمانہ میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھے، کتنے مختصر، مگر کتنے بلیغ اور ساتھ ہی کس قدر اثر میں ڈوبے ہوئے، ۱۰ اگست ۱۹۱۴ء کو الہ آباد سے راقم کو ان لفظوں میں حادثہ کی اطلاع دیتے ہیں؛ ”میرا سب کچھ جاتا رہا“ اننا للہ (سلیمان-۷۹) دو لفظوں کے اس کوزہ میں غم و الم کا ایک سمندر بند ہے، ۲۹ اگست کو مولوی مسعود علی صاحب کو لکھتے ہیں؛ ”آخر ساری دنیا لٹا کے گھر آیا۔“ (۱۹)

ان لفظوں میں غم و ماتم کی ایک دنیا آباد ہے، ۵ ستمبر کو پھر مجھے لکھتے ہیں ”واقعہٴ حال نے میرے جو اس کھو دیے۔“ (۸۰)

۱۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں ”میں واقعہٴ حال سے اس قدر افسردہ ہو گیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعتِ شگفتہ نہیں ہوتی۔“ (۸)

بہر حال اس شدتِ غم نے گوان کی طبیعت کو اس قدر ملول اور افسردہ بنا دیا تھا کہ وہ خود مرنے کو تیار بیٹھے تھے، تاہم دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس عالم میں بھی دین و ملت اور علم کی خدمت کے دلولہ میں کمی نہیں آئی، مدرسۃ الاصلاح سرانے میر کی فکر، شبلی اسکول کی دھن، دارالمصنفین کے قیام اور سیرت نبوی کی تکمیل کا کام، اسی طرح ان کے دل سے لگا ہے، اس بارہ میں ان کا ایک مکتوب جو ۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا تھا پڑھنے کے قابل ہے، یہ مکتوب خدا جانے کس طرح مکاتیبِ شبلی میں درج ہونے سے رہ گیا ہے، مولانا شروانی نے مولانا کی وفات پر جو مضمون علی گڑھ گزٹ میں لکھا تھا، اس میں اس کو پورا نقل کر دیا ہے۔

”عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا، حالانکہ مہدی مرحوم کا واقعہ اسی درجہ کا گذر چکا تھا، بہر حال میں اعظم گڑھ چلا آیا، محمدان شبلی اسکول جو ۳۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا، بانی اسکول سے ڈل اسکول تک آگیا، عزیز مرحوم اس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے نسبتاً میں اسکول اور کاتب قائم کرنا چاہتے تھے، دو مہینے کا دورہ رکھا تھا اور پانچ سو روپیے مصارفِ دورہ کے لیے الگ کر دیے تھے، اشتہارات اور رسید یہاں سب چھپ گئی تھیں۔“

مجھ کو اس کام کے علاوہ دارالمصنفین اور دارالتعمیل کی فکر ہے ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا، ۶ برس تک کشاکش میں گزرے، جو ہو گیا وہ توجب انگیز ہے، بہر حال صورت موجود یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے، جس کا کل رقبہ گیارہ ہیکٹہ بنتے ہے، اس کو وقف کر رہا ہوں، اور شرکاء بھی راضی ہو گئے ہیں، مسودہ لکھا جا چکا، رجسٹری کرانا ہے، دو ہنگلے پہلے سے موجود ہیں، کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے، دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا، بلکہ صرف کتب خانہ کے لیے کافی ہوگا اور دارالمصنفین کی عمارت کے لیے کچھ اضافہ ہوگا، چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے چار عنصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قوم کے نام کندہ ہوں چندہ مشروطہ نہیں، ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا، اس کے ساتھ دارالتعمیل کھول رہا ہوں، یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبہ کو تیار کروں، دو مددگار ہوں گے، انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا، سر دست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرہ معلومات اور کتابیں ان کو دی جائیں گی، جو کچھ لکھیں گے، اس کا عیب و منہر بتایا جائے گا، پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصانیف کرائی جائیں گی، وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے، جو کم از کم ۲۰، ۲۵ روپے ماہوار ہوں گے، دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کانٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے، ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے، یہ آخر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ: ع ”چوں ہنر ہائے دگر موجب حرمان نہ شو“

نواب عماد الملک نے دارالمصنفین کی صدر انجمنی قبول کر لی ہے، تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے، و التسلیم۔“

مولانا شروانی اس مضمون میں فرماتے ہیں ”اسی تحریر (مذکورہ بالا خط) میں دو امر خاص قابل لحاظ ہیں، ایک پاک اور کارآمد منصوبے، دوسرے یہ کہ شدت غم میں بھی دماغ علم کی غنوار سی میں مصروف تھا۔ بعد وفات علامہ مرحوم معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روئے وصیت وقف کر دیا ہے اور بلند حوصلہ اعزہ تعمیل وصیت پر آمادہ ہیں، قبر اسی باغ میں بنی ہے اور وہیں تکمیل سیرت کے سامان ہو رہے ہیں:

شدیم خاک و لیکن زبوںے تربت ما تو اس شناخت کزیں خاک مردے خیزد“

اس خط سے قیاس ہوگا کہ اس کرب و بیتابی کے عالم میں بھی وہ اپنے اصلی کاموں کو نہیں بھولے تھے، مولوی حمید الدین صاحب مولوی مسعود علی صاحب اور راقم کے نام کے خطوط سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت ان کے پیش نظر ندوہ کی اصلاح، سرانے میر کا انتظام، نیشنل اسکول کی تعمیر، دارالمصنفین اور دارالتعمیل کے قیام اور سیرت کی تکمیل کی تجویزیں تھیں۔

شبلی اسکول

۱۹۱۳ء-۱۹۱۴ء

پچھلے صفحوں میں مولانا کے ابتدائی تعلیمی کارناموں میں نیشنل اسکول کا نام بار بار آیا ہے، مولانا جب سے حیدرآباد گئے اور وہاں سے واپسی پر ندوہ کے کاموں میں اتنے منہمک رہے کہ وہ اپنے اس اسکول کو جس سے انہیں بڑی محبت تھی، بھول سے گئے، اتنے عرصہ میں اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ ہائی اسکول سے منزل کر کے ڈل اسکول ہو گیا، اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کا کام تھا، انہوں نے شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر اسکول کا نام جارج اسکول بنا کر لفظی تغیر سے اس کی معنوی ترقی کا خیال باندھا، جو تمام تر بے سود تھا، اسکول اپنی موجودہ حالت سے ذرا آگے نہ بڑھ سکا، آخر جب مولانا ندوہ کے ہنگاموں سے الگ ہوئے تو پھر اگلی محبت یاد آئی، ۷ نومبر ۱۹۱۳ء کو مولوی اسحاق مرحوم کو لکھا ”وہاں (اعظم گڑھ) رہ کر اسکول کا بھی تفریحی مشغلہ ہے۔“ (اسحاق-۲۴)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کو اس کے لیے آمادہ کیا اور لکھا کہ ”اعظم گڑھ میں پہلے ایک پرزور تعلیمی کانفرنس ہو“ مولوی اسحاق مرحوم نے کچھ اختلاف کیا تو انہیں لکھا ”شور و غل فی نفسہ بہودہ چیز ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ کوئی کام دنیا میں بغیر اس کے نہیں چلتا، انبیا اور ریفارمرز دونوں کی نظیریں دیکھ لو، علی گڑھ کالج صرف شور و غل سے قائم ہوا اور اب تک اسی پر قائم ہے۔“

تم نے کانفرنس تسلیم تو کر لی لیکن اس کے لیے ایک عمدہ پراسپیکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور رؤسائے دیہات کے پاس بھیجنا ضرور ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلا منصف عہدہ دار جو اچھی حالت رکھتے ہیں وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پروا ہے، نیشنل اسکول یا سرائے میر کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں، تم پرائیویٹ خطوط لکھ کر بہ اصرار و تقاضا ان لوگوں کو جمع کرو، مثلاً مولوی عبدالحمید صبر حدی، مولوی عبدالحمید منصف، میاں جنید وغیرہ وغیرہ پر تمہارا ہی اثر پڑ سکتا ہے، میرا کہنا تو ان لوگوں کے لیے بھی ایک معمولی عام صدا ہوگی۔

کانفرنس کا مقام اعظم گڑھ ہوگا، نیشنل اسکول یا بنگلہ میں اور اگر سرائے میر ہو تو عامی مذاق غالب رہے گا، میرے لیے یہ مشکل ہے کہ علی گڑھ والوں کا سخت تقاضا ہے، وعدہ بھی کر چکا ہوں، تاہم

زیادہ بلکہ قطعی یہی ارادہ ہے کہ اعظم گڑھ ہی آؤں۔

اعظم گڑھ کانفرنس میں حکام کو بھی مدعو کیا جاسکتا ہے، بورڈنگ کو اگر وسعت دی جائے تو گورکھپور اور جون پور تک کے لڑکے آسکتے ہیں، غرض ایک نہایت وسیع پیمانہ خیال میں ہے۔

افسوس ہے، قبل از وقت معذور سا ہو گیا ہوں، ۲۲ گھنٹہ میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹہ کام کر سکتا ہوں، یہ غنیمت وقت صرف میرت پر صرف کرتا ہوں، ع ”عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت“
”میاں حمید کو بھی یہ خط دکھاؤ اور کانفرنس کا اعلان و پروگرام دونوں صاحب مل کر اور چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے ساتھ بھجوا اور تقسیم کرو۔“

پھر دوبارہ ۸ دسمبر ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا ”قابل غور یہ مسئلہ ہے کہ نیشنل اسکول کو ہائی اسکول بنانا چاہیے، ایک بورڈنگ قائم کرنا چاہیے، اسکول ہر شہر میں سرکاری یا مشن موجود ہوتے ہیں اور ان کے برابر اسٹاف کا اسکول بنانا آسان نہیں اور بہت قوت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے، اب تجربہ کار لوگ اس کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ اسلامی بورڈنگ بنانا نہایت مفید ہے، جس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو، باقی تعلیم تو کسی اسکول میں حاصل کریں گے، اگر یہ رائے صحیح ہو تو نیشنل کی عمارت کے قریب بورڈنگ کی بنیاد ڈالنا چاہیے، جس کو رفتہ رفتہ بہت ترقی دی جاسکتی ہے، بورڈنگ کی وجہ سے بہت زیادہ بچے تعلیم حاصل کر سکیں گے اور کفایت شعاری کے ساتھ۔

مولوی محمد عمر صاحب اور سبھی سال بھر میں پیشن لے لیں گے، یہ لوگ بورڈنگ یا مدرسہ کے قیام و ترقی کے متعلق اپنا کافی وقت دے سکیں گے اور ان پر برادری کا اعتماد بھی ہے۔“

بہر حال مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے ۱۹۱۳ء میں ضلع اعظم گڑھ میں ایک ایجوکیشن سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور اسکول کو اس کی نگرانی میں دے دیا اور یہ عزم تھا کہ اس سال الہ آباد ہائی کورٹ کی بڑی تعطیل میں جو تین مہینہ کی ہوتی ہے، پورے ضلع کا دورہ کریں گے اور نئے سرے سے اسکول کو اٹھائیں گے، لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس تعطیل کے آنے سے پہلے ہی انہوں نے ۵ اگست ۱۹۱۳ء کو انتقال کیا، ان کی وفات کے بعد جب مولانا نے اعظم گڑھ کا قیام اختیار کیا تو اسکول کی طرف توجہ فرمائی، مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی

یادگار میں اسکول میں چند کمروں کی تعمیر کی تجویز منظور کی اور متعدد عزیزوں سے چندے لے کر ان کی تعمیر کا کام شروع کر دیا، ابھی یہ معاملہ یہیں تک پہنچا تھا کہ نومبر ۱۹۱۳ء میں خود مولانا نے وفات پائی، مگر بھگتدہ کا کام جاری رہا، بلکہ کام کرنے والوں میں اب ایک کے بجائے دو بزرگوں کی آرزوؤں کی تکمیل کا جذبہ پیدا ہوا، مولوی سمیع صاحب کے بڑے بھانجے مرزا مصطفیٰ بیگ مرحوم اس وقت ایل ایل بی ہو کر اعظم گڑھ آئے اور اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پوری محنت و تندہی سے کام کر رہے تھے کہ دو تین سال کے بعد بتلائے وق ہو کر وفات پائی، اس کے بعد شہر کے ایک ممتاز وکیل مولوی ولی جان صاحب بی اے ایل ایل بی نے اس کی خدمت کا جائزہ لیا مگر وہ اپنے پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے کچھ زیادہ نہ کر سکے، آخر مولانا کے ایک ماموں زاد بھائی شیخ محمد صاحب (زمین دار پھر ہا) نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی محنت اور کوشش نے اسکول کو دوبارہ زندہ کر دیا اور اس کو پھر ہائی اسکول تک پہنچایا اور تعمیرات میں بھی اضافہ کیا، مولانا کے صاحب زادہ حامد صاحب نعمانی نے بھی اس کی تعمیر کی تکمیل کی پوری کوشش فرمائی، اس کے دوسرے انتخاب میں مولوی سمیع صاحب مرحوم کے چھوٹے بھانجے اور مرزا مصطفیٰ بیگ مرحوم کے چھوٹے بھائی مرزا مرتضیٰ بیگ صاحب بی اے، ایل ایل بی سکریٹری ہوئے، ان کے دور میں جواب تک جاری ہے، اسکول نے شاندار کامیابی حاصل کی اور اب اس سال ۱۹۳۵ء میں اس کے موجودہ ہیڈ ماسٹر مولوی بشیر احمد صاحب صدیقی کی کوشش اور حسن تدبیر سے اس اسکول نے ترقی کر کے شبلی کالج کا رتبہ حاصل کر لیا، کالج کی عمارت الگ بن گئی، جس کی تعمیر میں مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے جن کو شروع سے اپنے استاد کے اس ابتدائی تعلیمی کارنامہ سے دلچسپی رہی، ان تھک محنت کی اور کالج کی پوری عمارت ان ہی کی کوشش اور اہتمام سے بن کر تیار ہوئی۔

کالج کے کارکنوں نے مناسب سمجھا کہ اس کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد اس شخص کے ہاتھ سے رکھوایا جائے جو اس اسکول کے بانی کا حبیب صمیم تھا، یعنی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، چنانچہ موصوف سے عرض کیا گیا اور وہ زحمت سفر برداشت کر کے اعظم گڑھ آئے اور ۳۱ مارچ ۱۹۳۵ء کی شام کو ایک بہت بڑے جلسہ میں اس کے افتتاح کا اعلان کر کے بہت سے معززین کی معیت میں اپنے ہاتھ سے شبلی کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

کالج بچہ اللہ اسی سال جولائی سے کھل گیا اور اس میں اس وقت ایف اے تک کی تعلیم ہو رہی ہے۔

مدرستہ الاصلاح سرائے میر

۱۹۰۸ء-۱۹۱۲ء

سرائے میر اعظم گڑھ اور شاہ گنج کے بیچ میں ایک مشہور پرانا قصبہ ہے، حضرت میر علی عاشقان رحمۃ اللہ علیہ شیر شاہ اور ہمایوں کے عہد میں ایک صاحب دل گزرے ہیں، ان ہی کی نسبت سے یہ مشہور ہے، ان کا مقبرہ اور ان کی خانقاہ کی عمارتیں اب بھی گری پڑی قصبہ کے وسط میں موجود ہیں، اس کے آس پاس بعض دولت مند شیعہ زمین دار بھی آباد ہیں، مگر کثرت ان لوگوں کی ہے جو مولانا مرحوم کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، یہ لوگ زیادہ تر دیہاتوں میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اکثر نہایت محنت سے معمولی زمین داری اور کاشتکاری پر گزار کرتے ہیں اور بعض لوگ اور ملکوں اور جزیوں میں جا کر تجارت کرتے ہیں، یہ سب نیک اور دین دار لوگ ہیں، مولوی حمید الدین صاحب کا وطن پھر ہا بھی اسی کے قریب ہے۔

مولوی شفیع صاحب نام ایک بزرگ نے جو نہایت نیک اور مقدس اور ان ہی اطراف کے رہنے والے ہیں اور دوسرے مقامی علما اور علم دوست اور دیندار مسلمان زمین داروں نے (جن میں مولوی حمید الدین صاحب کے خاندان کے بزرگ جو مولانا کے بھی ناہمالی بزرگ تھے) مل کر شاید ۱۹۰۶ء میں ایک انجمن ”اصلاح المسلمین“ قائم کی، جس کا عام جلسہ ہر مہینہ کسی نہ کسی آس پاس کے قصبہ میں ہوتا تھا اور اصلاح و ترک بدعات کے مواعظ اس میں بیان کیے جاتے تھے، اس کے سالانہ جلسے بھی بڑے پیمانے پر ہوتے تھے، ان میں وقتاً فوقتاً مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری جیسے مشاہیر علما آتے اور لوگوں کو مستفید کرتے رہے، اسی سلسلہ میں ایک اسلامی مدرسہ کی بنا کا خیال پیدا ہوا، اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں ان ہی اطراف کے ایک مدرس مولوی عبدالاحد صاحب (جو منجیر پٹی نام ایک گاؤں کے باشندہ تھے، جو سرائے میر سے ایک میل پر واقع ہے) جون پور کے کسی مدرسہ میں مدرس تھے، وہ کسی سبب سے مدرسہ چھوڑ کر اپنے گاؤں میں آ گئے، ان کے ساتھ کچھ طلبہ بھی آئے، جن کو وہ اپنے گاؤں میں بیٹھ کر پڑھانے لگے، مدرسہ کی تحریک کرنے والوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مدرسہ کے لیے سرائے میر میں اسٹیشن کے پاس ۲۴ بیگھ کی ایک زمین پسند کی، یہ زمین چند سنی اور شیعہ زمین داروں کی

ملکیت تھی، سب نے بخوشی اپنے اپنے حصہ کو اس نیک کام کے لیے وقف کیا، اسی زمانہ میں ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں ایک چہترہ بنا کر چھپر ڈال دیا گیا اور وہ مدرسہ ہو گیا، اس زمانہ میں مولانا سید اصغر حسین صاحب جو اب دیوبند کے مدرسہ میں ہیں اور نہایت مقدس بزرگ ہیں، اٹالہ کی جامع مسجد جون پور میں پچیس برس سے مدرس تھے، وہ تشریف لائے اور ان کے ہاتھوں سے مدرسہ کا افتتاح ہوا، مولوی عبدالاحد صاحب یہیں آ کر پڑھانے لگے، مولوی فیض الحسن صاحب میرٹھی نامی ایک خوش بیان واعظ، اتفاق سے انجمن کے ایک سالانہ جلسہ میں آئے تو لوگوں نے ان کو اور انہوں نے اس مقام کو غنیمت سمجھا، چنانچہ انہوں نے چند سال یہاں رہ کر مدرسہ کے لیے چندوں سے سرمایہ جمع کیا اور ایک بنگلہ اور کچھ کچے کمرے بنوائے۔ مدرسہ کی تحریک اور بنیاد تک میں مولانا کا ہاتھ نہ تھا لیکن جوں ہی اس نے برگ و بار پیدا کیا، برادری کی ایک نیک تحریک کے خیال سے مولانا نے اس کی سرپرستی قبول کر لی، ۱۹۱۰ء میں اس کا بڑا جلسہ ہوا، اطراف کے سارے مسلمان جمع ہوئے، دیوبند سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اور ندوۃ العلماء سے مولانا مرحوم دارالعلوم کے دو چھوٹے طالب علموں، عبدالرحمن گرامی اور معین الدین کو لے کر جو باد جو کسنی کے بہت اچھی تقریر کرتے تھے، جلسہ میں شریک ہوئے، یہیں مولانا مرحوم اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی میں پہلی ملاقات ہوئی اور تجلیہ میں گفتگوئیں ہوئیں اور ایک نے دوسرے کو پہچانا، اس تعارف میں شاید اس واقعہ کو بھی دخل ہو کہ مولانا حمید الدین صاحب مدت تک کراچی میں رہے تھے اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے اور ان سے وہاں ملاقاتیں رہتی تھیں، دونوں میں قرآن پاک کے درس اور غور و فکر کا ذوق مشترک تھا۔

اس زمانہ میں مولانا پیر آریوں کے حملوں کی وجہ سے اشاعت و حفاظت اسلام کی تحریک بالکل چھائی ہوئی تھی اور آریوں کے گروکل کی سادگی اور مذہبی خدمات کے لیے ان کی تیاری کے قصوں سے بہت متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں بھی کوئی جماعت یا درس گاہ اسی اصول پر قائم کی جائے، یہ مدرسہ جو بالکل دیہات میں قائم تھا، اس کام کے لیے ان کو بہت موزوں نظر آیا، ۲۹ اپریل ۱۹۱۰ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا ”کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمتِ مطہرہ کی زندگی ہو۔“ (حمید-۵)

۱۹۱۲ء میں مولانا نے اس کے انتظامی جلسوں میں شرکت فرمائی اور مولوی فیض الحسن کو جن پر لوگوں کو بہت سے اعتراضات تھے، خوش اسلوبی سے الگ کیا گیا۔

۱۹۱۳ء میں جب مولانا نے دارالعلوم کی معتمدی سے سبک دوشی حاصل کی تو مدرسہ سرائے میر کی طرف مزید توجہ فرمائی، اس وقت وہ حیدرآباد میں تھے اور دارالعلوم حیدرآباد دکن میں مولانا حمید الدین صاحب کی تقرری کا مسئلہ گراں قدر مشاہرہ پر طے پارہا تھا، تاہم انہوں نے مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا، بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڑھ پر دونوں کے برداشت کے قابل قوم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہیے اور ان کا باہمی تعلق۔

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرہ عمل بنانا چاہیے، ہم سب کو وہیں بود و باش کرنی چاہیے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہیے، اگر تم بہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں۔

آج ڈاکٹر تعلیمات سے تمہارے متعلق فیصلہ کرانا ہے، صرف یہی ایک زینہ رہ گیا ہے، لیکن یہ فیصلہ موافق بھی ہو جائے تب بھی میں اس کو قومی خدمت پر ترجیح نہیں دیتا، البتہ کچھ معاش کا سہارا ہونا چاہیے، وہ بقدر کفاف کسی نہ کسی طرح ہوتا رہے گا، آخر تمہارا بھی خود خیال تھا، پرنسپل اور بیش قرار تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔‘ (حمید-۶۷)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جب مولانا اعظم گڑھ آئے اور یہاں کے منتشر اداروں کو باہم ملا کر ایک منظم شکل دینی چاہی تو اس کی ایک کڑی مدرسہ سرائے میر بھی قرار دی، مولوی حمید الدین صاحب نے ان کو لکھا کہ ”آپ اس مدرسہ کی نظامت قبول فرما کر اسی کو اپنی کوششوں کا محور قرار دے لیں“ اس کے جواب میں ۲۱ ستمبر ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا ”بھائی! باایں ضعف و دل شکستگی مدرسہ سرائے میر کی نظامت کیوں کر کر سکتا ہوں، کوئی دوسرا شخص سوچو، امکانی مدد کرتا رہوں گا۔“ (حمید-۷۵)

بالآخر مولانا نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو جن کے حسن انتظام کا ان کو تجربہ ہو چکا تھا، اعظم گڑھ بلا لیں اور دارالمصنفین کے ساتھ مدرسہ سرائے میر کی نگرانی بھی ان کے سپرد کریں، اکتوبر ۱۹۱۳ء کے شروع میں مولوی مسعود علی صاحب اعظم گڑھ آئے

اور انہوں نے مجوزہ دارالمصنفین کے مکان اور مدرسہ سرائے میر کو جا کر دیکھا، ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا نے مجھے لکھا "تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنفین و تکمیل وغیرہ) کی جولان گاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں۔" (سلیمان-۸۱)

مولوی صہ حب نے واپس جا کر مولانا کو لکھا کہ "مدرسہ میں جو مدرس اول ہیں وہ اس جگہ کے لیے موزوں نہیں، مولانا نے جواب دیا، سرائے میر کے منتظم دلیر نہیں ہیں، مدرس حال گوان کے نزدیک ناقابل ہیں لیکن ان کو فوراً موقوف نہ کریں گے اور شاید اس میں کچھ دیر لگے، درجہ تکمیل والوں کے ساتھ شبلی یہاں چلے آئیں، جب تک کوئی انتظام نہ ہو وہ تکمیل میں رہیں۔" (مسعود-۲۱)

یہاں شبلی سے مقصود مولوی شبلی صاحب ندوی متعلم ہیں، جو عظیم گڑھ ہی کے رہنے والے اور دارالعلوم سے فارغ ہو کر دو برس سے دارالعلوم کے درجہ تکمیل میں علم کلام اور معقولات کی تکمیل میں مصروف تھے، مولانا ان کو سرائے میر کے لیے تجویز فرما رہے تھے، مگر چونکہ وہاں کے انتظام میں کچھ تاخیر تھی، اس لیے سردست ان کو عظیم گڑھ آنے کی ہدایت فرمائی، مولانا کے ذہن میں اس وقت دارالمصنفین درجہ تکمیل اور سرائے میر کو ملا کر ایک اچھے خاصے جامعہ اسلامیہ کا تصور قائم ہو گیا تھا، مولوی مسعود علی صاحب کو اپنی ایسی غم انگیز حالت میں بھی کس خوشی سے اپنے اس خوش آئند خواب کی اطلاع دیتے ہیں، "دارالمصنفین درجہ تکمیل، سرائے میر ابتدائی پورا جامعہ اسلامیہ کا مصالطہ ہے، کام کرنے کی ضرورت ہے، سرائے میر والے چند بار آئے، وہ تمہارے بہت آرزو مند ہیں، وہاں کے موجودہ عملی ناظم اور بانی مدرسہ

اللطیفہ:- دارالعلوم میں بیک دفعہ تین شبلی جمع تھے، مولانا شبلی صاحب معتد دارالعلوم، مولانا شبلی صاحب مدرس اور یہ مولوی شبلی متعلم، ان بے چارے کے نام کے ساتھ اسی فرق کے لیے متعلم کا لفظ لگایا گیا، وہ احباب کی زبان پر ان کے نام کا ایسا لازمی جز بن گیا کہ اس کے ملائے بغیر ان کی شخصیت کا تصور نہیں آتا تھا، مگر جب انہوں نے علم کلام کی تکمیل کر لی تو اسی وزن پر تکلم کا لفظ ان کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا، جواب تک قائم ہے، یہ ہماری جماعت میں کلام و معقولات میں نہایت لائق و فاضل اور ساتھ ہی نہایت متواضع، خاک سارا دربار پر بند ہیں، مولانا ان سے محبت رکھتے تھے۔ آل جامعہ کا لفظ جامعہ ملیہ دہلی کے بعد سے تو عام ہے مگر یہ لفظ ہماری زبان میں اس معنی میں پہلے مولانا ہی کے قلم سے نکلا اور بعد کو اشاعت پذیر ہوا، جامعہ ملیہ کے نام کی تاریخ بھی ایک اتفاقی واقعہ ہے، مسلم یونیورسٹی سے ٹوٹ کر اس کے بالمقابل جوئی قومی مسلم یونیورسٹی قائم کی گئی، اس کا لیٹر پیپر یعنی خط کا کاغذ مولانا ابوالکلام نے چھپوایا تھا، ان ہی نے نیشنل مسلم یونیورسٹی کے انگریزی لفظوں کے ساتھ اس کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی کر دیا، پھر بعد کو یہ لفظ چل گیا، جامعہ مصر کی نئی عربی زبان میں یونیورسٹی کو کہتے ہیں، جو یونیورسٹی کا گولفظی ترجمہ ہے، لیکن چونکہ جامع عربی میں مسجد اعظم کو کہتے ہیں اور شروع میں مسجدیں ہی درس گاہیں تھیں، اس لیے جامع کے ساتھ جامعہ کا لفظ خاص مناسبت رکھتا ہے۔

مولوی محمد شفیع صاحب کی خواہش ہے کہ تم ناظم یا نائب ناظم بن جاؤ اور وہ واعظ بن کر قصبات کا دورہ کرتے رہیں کہ مالی حالت کی طرف سے اطمینان ہو جائے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو نظم و نسق نہیں آتا، یہ بھی خیال تھا کہ انسپکٹر مدارس سے مل کر اس کی سرکاری امداد کا کوئی انتظام ہو، اسی خط میں لکھتے ہیں:

”انسپکٹر مدارس آئے تھے، وہ سرائے میر کو دو مہینہ کے بعد دیکھیں گے اور امداد کی پوری توقع

ہے۔“ (مسعود-۲۵)

پہلی نومبر کو پھر مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا ”میں ایک مفصل اسکیم لکھ چکا ہوں، اب جو آنے والے ہوں فوراً آ جائیں، تاکہ ایک صحیح اسکیم قائم ہو جائے، شبلی متعلم بھی اور اور لوگ بھی تم اپنی نسبت فیصلہ کر لو کہ کہاں رہنا بہتر ہے، لکھنؤ سے بالکل قطع تعلق مناسب معلوم نہیں ہوتا، ورنہ ایک عمدہ اسکیم یہ تھی کہ سرائے میر کا نظام تمہارے ہاتھ میں ہوتا، اگر اس کا کچھ تذراک یعنی تلافی ہو سکے تو سرائے میر کے ارادہ سے آ جاؤ، میرا دورہ بھی اکثر رہے گا۔“ (مسعود-۳۲)

مولوی مسعود علی صاحب نے لکھا کہ ”وہ بالفعل چھ مہینے کے لیے سرائے میر کے مدرسہ کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیں گے“، مولانا نے ۵ نومبر ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا ”تمہاری نسبت یقیناً سرائے میر میں رہنا بہتر ہے اور چھ مہینے کی رائے ٹھیک ہے، تم کو ہر بات کا تجربہ ہو جائے گا، اختیارات جس قدر چاہو گے مل جائیں گے۔“ (مسعود-۳۳)

مولوی مسعود علی صاحب جب آئے تو بلانے والا مرض الموت کے بستر پر تھا۔

مولوی شبلی صاحب متکلم مولانا کی وفات سے تین روز پہلے پہنچ گئے تھے، ان کو پاس بلا کر فرمایا کہ میری زندگی کے حاصل تم لوگ ہو، جہاں رہو میری طرز تعلیم کو پھیلاتے رہو۔

مولانا مرحوم کی وفات کے تیسرے روز گویا ماتم سے فارغ ہو کر مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا کے ان چند شاگردوں کو لے کر جو اس وقت جمع تھے، ایک مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مولانا مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی جائے، اس مجلس میں اس وقت مولانا حمید الدین صاحب کے علاوہ حسب ذیل اشخاص شریک تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی اور خاک سار، اس مقصد کی بنا پر ہم لوگوں نے مولوی شبلی صاحب متکلم کو مدرسہ سرائے میر کی صدر مدرس اور مولوی مسعود علی صاحب کو اس کی نگرانی کی خدمت سپرد کی جس کو ان

دونوں صاحبوں نے قبول کیا، مولوی مسعود علی صاحب کو تو سال دو سال کے بعد دارالمصنفین کے کاموں کے پھیلاؤ کے سبب سے اس کی نگرانی کی خدمت سے الگ ہو گئے اور خود مولوی حمید الدین صاحب نے اس بوجھ کو اپنے سر اٹھالیا لیکن مولوی شبلی صاحب اس وقت سے لے کر اس وقت تک پوری جانفشانی، محنت اور ایثار کے ساتھ ہر قسم کی مصیبتوں کو مردانہ وار جھیل کر اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں اور محمد نذیر کدوان کے اور ان کے ساتھیوں کی محنت اور ایثار کی بدولت مدرسہ آج ایک ممتاز علمی حیثیت رکھتا ہے، آخر عمر میں گویا مولانا کی آرزو کے مطابق جس کا پچھلے خط میں ذکر ہے، مولانا حمید الدین صاحب نے حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور قرآن پاک کی تعلیم و تدریس اس کا خاص مقصد قرار دے کر اس کا خاص نصاب بنایا، جس پر وہ آج تک گامزن ہے اور اچھے نتائج پیش کر رہا ہے۔

دارالمصنفین

۱۹۱۰ء - ۱۹۱۴ء

ابتدائی خیال | مولانا مرحوم کے ذہن میں دارالمصنفین کی تجویز کتب خانہ ندوۃ العلماء کی عمارت کے سلسلہ میں سب سے پہلی بار آئی، مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاسِ دہلی میں دارالعلوم کی جو سہ سالہ رپورٹ انہوں نے لکھ کر پیش کی تھی، اس میں یہ بھی لکھا تھا ”قومی اور مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانہ اعظم گڑھ کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ضروری ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہوتا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔“

یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرہ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہو، جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے، جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دیا جائے۔“

مولانا نے اسی جلسہ میں پڑھنے کے لیے ”ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت“ کا عنوان میرے حوالہ فرمایا تھا اور ارشاد ہوا تھا کہ اسی سلسلہ میں ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرو، میری یہ تقریر ندوہ کے اجلاسِ دہلی کی رپورٹ اور الندوہ میں چھپ چکی ہے، اس کے آخر میں صیغہ تصنیف و تالیف کے عنوان کے نیچے ہے، ندوہ جس قسم کے علما اپنے مدرسہ میں تیار کرانا چاہتا ہے، وہ اس اسٹیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجہ عالیت یا درجہ تکمیل کے بعد تالیف و تصنیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغہ تالیف و تصنیف قائم کیا جائے، جس سے علوم و تاریخ اسلام کا احیا ہو،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو، جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں اردو زبان کی بہترین مذہبی لائف الفاروق ہے لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ یہ پانچ سو صفحات کی کتاب ہندوستان، مصر قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں کو سنگھال کر لکھی گئی ہے، یہ امر بدیہی ہے کہ ہر مصنف کو یہ فرصت و وسعت نہیں مل سکتی کہ وہ ایک ایک تصنیف کی خاطر تمام روئے زمین کا سفر کرے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذ و نادر شایع ہوتی ہیں، اگر قوم ندوۃ العلماء کے اقتدار میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کر دے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو محیط ہو تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ اردو زبان میں نہایت آسانی سے جمع ہو جائے اور خصوصاً اس اسکیم کی قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہوگی کہ ممتاز طلبائے دارالعلوم کا ایک حصہ صیغہ تالیف و تصنیف کے لیے وقف کیا جائے، جس کی قوم کو اس وقت نہایت ضرورت ہے۔

دارالعلوم کی جدید عمارت میں اس کتب خانہ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تیار کی جائے، جس میں کتب خانہ کے سوا ایک وسیع کمرہ ارباب قلم و مصنفین کے لیے بنایا جائے، جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف و تصنیف میں مشغول ہو، مادری زبان کو جس کا گہوارہ طفولیت یہی دہلی ہے، ان تصنیفات کے ذریعہ سے ترقی دی جائے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ارباب قلم و مصنفین جن کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے، اس کے مصارف بطور یادگار اپنی جیب سے پورے کریں اور اس عمارت کا نام دارالمصنفین ہو، بظاہر یہ تجویزیں خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کی امداد سے آج جہاں بہت سے مشکل اور بظاہر محال کام انجام پارہے ہیں، اس کتب خانہ اعظم کا قائم ہو جانا بھی بعید نہیں، جس کے لیے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایہ کافی ہوگا۔“

اگست ۱۹۱۰ء میں نواب منزل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا کو لکھا کہ وہ ان کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوائیں گے تو مولانا نے الندوہ (اگست ۱۹۱۰ء) میں یہ نوٹ لکھا، جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دارالعلوم کے بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں، ہماری تصنیفات کی تو خیر کیا وقعت ہے لیکن نواب صاحب موصوف چون کہ علم دوست ہیں، اس لیے انہوں نے علم پروری کا یہ بھی ایک بہانہ پیدا کر لیا ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف

وتصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شایع ہوں، باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آکر رہیں، ان کے لیے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم و فنون کی کتابیں مہیا رہیں، چوں کہ ندوہ کا کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طلبہ میں تصنیف و تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس لیے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح موزوں ہے، نواب منزل اللہ خاں صاحب سے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں، اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لیے دس ہزار روپے درکار ہوں گے۔

اس کے بعد ندوہ میں اختلافات کا دور پیدا ہو گیا اور یہ خیال ان کے دماغ میں پونہ پیچیدہ رہا۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہوئے تو ادھر سے یکسو ہو کر ان کے ذہن میں ایک تصنیفی ادارہ کا خیال زور پکڑنے لگا، چنانچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو نئی محمد امین صاحب زبیری کو (جو اس وقت ہز ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کے لٹریٹری سکریٹری تھے) ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں ”ہاں یہ دونوں (سلیمان، عبدالسلام) اچھے بن گئے، کجنت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی، بہر حال یہ طے ہو لے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں، انشاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے، ہندوستان میں اور ہر کام کے لیے انجنینس ہیں لیکن تصنیفی انجنین کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لایق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔“ (۱۸)

سیرت اکاڈمی | ایک خیال یہ بھی تھا کہ مخصوص طور پر سیرت کی ایک اکاڈمی بنائی جائے اور اس کے ذریعہ سے اس فن کے ماہر تیار کیے جائیں، چنانچہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”آپ نے یہ نہ لکھا کہ کون سا کام لے کر بیٹھوں، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن ابھی مختلف مقاصد میں سے کسی ایک کا قطعی انتخاب نہیں ہوتا، چاہوں تو خود سیرت کو ایک مقصد مستقل قرار دوں۔ یعنی ایک اکاڈمی قائم ہو، سیرت کے متعلق تمام نادر تصانیف جمع کی جائیں، لوگوں کو وظائف بطور فیلوشپ کے دیے جائیں کہ سیرت کی اسٹڈی کریں اور خاص اس فن میں ماہر بنیں اور سیرت پر تقریر و تحریر کریں، وغیرہ وغیرہ، اس میں بقدر ضرورت مالی اعانت بھی مل سکتی ہے۔“ (۳۹)

دارالمصنفین کی تجویز کی اشاعت | بہر حال دارالمصنفین کا خیال اس قدر پختہ ہو گیا کہ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں الہدال کلکتہ کے ذریعہ سے اس تجویز کو عام طور پر ملک کے سامنے پیش کیا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا اور مخصوص احباب کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس رسول پور ضلع مظفر پور، بہار ۲۶ فروری ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھا کہ ”ہاں دارالمصنفین کی تجویز الہدال میں کیا نظر سے نہیں گزری، ضرور دیکھیے، آپ اس کے خاص مخاطب ہیں، اس کے لیے خود وہاں تک آؤں گا، یہ میرا اخیر کام ہے، اور زمرہ مصنفین کی دائمی خدمت ہے۔“ (۲۳)

ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ چند طلبہ خود مولانا کے ساتھ رہیں اور ان کو خاص خاص فنون میں تیار کرایا جائے، چنانچہ وہ مجھی کو جون ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”آزاد سے مشورہ ہوا، رائے یہ پھیری کہ اصل غرض قابل اشخاص کو تیار کرنا ہے، اس لیے میں خود دو چار طلبہ اپنے ساتھ رکھوں اور ان کو کسی فن میں تیار کروں اور صحیح مذاق ان میں پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف پر تنگ بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہوگا، اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو، نیز ایک وظیفہ فنڈ قائم ہونا چاہیے، اس میں کچھ ماہوار تم بھی دو۔“ (سلیمان-۶۸)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد اس زیر تجویز ادارہ کے اہتمام و انصرام کا کام مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو جن کی انتظامی قابلیت اور حسن تدبیر کے مولانا معترف تھے اور جو اب ندوہ کے اصلاحی کاموں سے فارغ ہو چکے تھے اور کسی عملی مشغلہ کی تلاش میں تھے، سپرد کرنا چاہا، اسی بنا پر دارالمصنفین کے آئندہ قیام اور نظام کے مشورے اس زمانہ میں ان سے ہوتے رہے، جن کے اذکار ان کے خطوط میں بکثرت ہیں۔

دارالمصنفین کا مرکز | سب سے اہم سوال یہ تھا کہ دارالمصنفین کو کہاں قائم کیا جائے؟ مولانا نے اس کے متعلق سب سے پہلے ارکان ندوہ سے اتمام حجت کرنا چاہا، ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی سے پوچھا، ہاں دارالمصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہے، میں اس عمارت کو انشاء اللہ پورا کر کے رہوں گا اور وہی شاید میرا مدفن بھی ہو۔“ (۱۱۳)

پھر چند روز کے بعد ۲۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو انہیں دوبارہ لکھا ”دارالمصنفین کی تجویز میں قطعاً طے کر چکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہو تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے، میں خود اپنے

پاس سے ادا کر دوں گا، چھوٹے چھوٹے بنگلے اور احباب سے بنوائوں گا، بہر حال اس وقت ضرورت آپ سے یہ مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے، اگر علی گڑھ یا کہیں اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ خاں کا مقلد کہیں گے، اس لیے میں اتمامِ حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر مجھ پر اعتراض نہ ہوگا، پر لطف تجویزیں دارالمصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں۔“ (۱۱۴)

لیکن مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے غالباً اس کے لیے خود اپنے وطن حبیب گنج کا انتخاب کیا، جس کو مولانا نے منظور نہیں کیا، لکھا: ”آپ دارالمصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں، تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں۔“ (۱۱۵)

لیکن مولانا کی اصلی خواہش یہ تھی کہ دارالمصنفین ندوہ ہی میں قائم ہو، چنانچہ مولوی مسعود علی صاحب نے جب ان کو یہ لکھا کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں اور ندوہ ہی کے احاطہ میں قائم ہو، تو اس کے جواب میں ۲۷ جولائی ۱۹۱۴ء کو انہیں لکھا ”بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصلی خواہش یہی ہے لیکن کیا کیا جائے، حالاں کہ اس میں انہی کا فائدہ ہے۔“ (۱۱۶)

ندوہ سے الگ بھی وہ دارالمصنفین کا مرکز لکھنؤ ہی کو بنانا چاہتے تھے، چنانچہ ۱۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو انہی کو لکھا: ”ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا ہندوستان کرو، راجہ صاحب محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے، چاہو تو وہیں تم کو بھی دلا دوں، کہو تو میں ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے تو ایک پھوس کا مختصر بنگلہ اور چند اور چھپر کرے بنوائے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا، غالباً وہاں میری صحت بھی درست رہے۔“ (۱۱۷)

بالآخر دارالمصنفین کے مرکز کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کر دیا، یعنی اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم کی موت نے ان کو اعظم گڑھ آنے پر مجبور کیا، یہاں سکون و اطمینان نظر آیا تو اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا: ”میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔“

میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیم کے کام

۱۔ سابق مہاراجہ محمود آباد، محمد علی محمد خاں۔

شروع ہو گئے ہیں، کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے، اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کیے، باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں سرگان بازاری کے ساتھ عموماً میں بتلا ہونا، دارالمصنفین بھی شروع ہو جائے گا۔“ (۲۷)

اب اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالنی چاہی تو سب سے پہلے مولانا نے اس کے لیے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو وقف کرنا چاہا لیکن چون کہ خاندان کے اور لوگ بھی اس میں شریک تھے، اس لیے ان کی رضامندی بھی حاصل کرنا چاہی، یہ لوگ راضی ہو گئے تو وقف نامہ لکھوانا شروع کیا، چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مجھے لکھتے ہیں: ”تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنفین و تکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتا میں بقدر ضرورت مہیا ہوگی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامہ باغ زیر تحریر ہے، بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا ہے۔“ (۸۱)

وظائف کا انتظام | چون کہ اب تک دارالمصنفین کے لیے کسی قسم کی آمدنی نہ تھی اس لیے درجہ تکمیل کے وظائف کے لیے مولانا حمید الدین صاحب نے ۳۰ روپیہ ماہوار مقرر کیے، اسی قدر مولانا نے اپنی طرف سے منظور کیا، کتب خانہ باغ اور بنگلہ کی وسعت و ترمیم میں جو مصارف کثیر پڑنے والے تھے، ان کا بار بھی مولانا نے خود اپنے سر لیا، دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے طلبہ کے قیام کے لیے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ کے قریب اور دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا کرایہ پر لیا، باغ کے پہلو میں سڑک پر جو سرکاری مکان تھا، اس کے خریدنے کا بھی سامان کرنا چاہا۔ (مسعود-۲۲)

دارالمصنفین کا تعلیمی خاکہ | ان تمام مراتب کے طے ہو جانے کے بعد طلبائے دارالمصنفین کے لیے حسب ذیل قواعد داخلہ بنائے:

- ۱- مدت تعلیم دو سال۔
 - ۲- اس کی دو شاخیں ہوں گی، تکمیل و تصنیف۔
 - ۳- ہر طالب العلم جو صرف و نحو کافی جانتا ہو، اس درجہ میں داخل ہو سکے گا۔
 - ۴- اس درجہ میں داخل ہونے کے لیے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا۔
- درجہ تکمیل، اس درجہ میں دو مضمون لازمی ہوں گے، ادب اور علوم ثلاثہ میں سے کوئی ایک

دونوں عالمانہ ہو، علما کا ہمیشہ قاضی ابو یوسف کے زمانہ سے ایک خاص لباس رہا ہے، طلبہ بھی اسی کے قریب قریب استعمال کرتے تھے۔“ (مسعود-۲۱)

طلبہ کا انتخاب | ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد طلبہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، ندوہ کے فارغ التحصیل یا قریب فارغ التحصیل طلبہ میں سے جن سے وہ خود واقف تھے، چند طلبہ کا انتخاب کیا، اس کے بعد متعدد طلبائے ندوہ نے داخلہ کے لیے بہ شوق خطوط لکھے تو یہ قرار پایا کہ تمام طلبہ بقرعید کے بعد آجائیں (مسعود-۲۳) مولوی ابوالحسنات عبدالشکور ندوی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین کا انتخاب خود مولانا ہی نے فرمایا تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ”عبدالشکور کا ایک قصیدہ ملا، تمہارے پتے سے جواب مانگا ہے، جواب کیا حاجت ہے، بقرعید کے بعد آ جانا چاہیے۔“

قصیدہ میں کچھ غلطیاں اور کم زوریاں ہیں لیکن طبیعت میں قابلیت ہے، اس لیے بہت جلد یہ خامیاں نکل جائیں گی۔“ (مسعود-۲۵)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد ندوہ کے جن طلبہ کو قابل تربیت سمجھتے تھے، ان پر خود بخود ان کی نگاہ پڑی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں، عبدالرحمن نگر لکھی بھی قابل تربیت ہے“ (سلیمان-۶۹) ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ”سید سلیمان نے محسنؒ کی تعریف لکھی ہے کہ وہ میرے پاس رہنے کے قابل ہیں، انشا پر دازی کا بھی مادہ ہے، ظلیل صاحب اگر آئیں تو بلا لوں، ان کے لیے تو وظیفہ میں خود اپنے ہاں سے دوں گا۔“

۱۔ عین شباب میں وفات ہوئی، یہ بہار کے ایک قصبہ کے تھے، ان کے حالات کے لیے دیکھیے معارف نومبر ۱۹۲۳ء
۲۔ عین جوانی میں انہوں نے بھی وفات پائی، یہ نگرام ضلع لکھنؤ کے باشندہ تھے، اور ایک علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، تفصیل کے لیے دیکھیے معارف مارچ ۱۹۲۶ء
۳۔ یہ بہار کے کانڈی محلہ کے باشندہ اور ندوہ کے فارغ التحصیل تھے، کچھ دنوں ندوہ کے کتب خانہ میں کام کرتے رہے، پھر وطن چلے گئے اور وہاں کے ایک مقامی اسکول میں ہیڈ مولوی ہو گئے اور چند سال کے بعد مرضِ وق میں مبتلا ہو کر وفات پائی، ان کو عربی ادب سے کافی ذوق تھا، رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یہ مشہور محدث یعنی شیخ حسین صاحب عرب کے جو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی قدر دانی سے بھوپال میں رہ گئے تھے اور ہزاروں علما اور محدثین کے استاد تھے، پوتے تھے، ان کے والد شیخ محمد صاحب عرب ندوہ میں مدرس ادب تھے، اسی سلسلہ میں شیخ محمد ظلیل صاحب نے ندوہ میں تعلیم پائی، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے، پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، چند سال کے بعد مزاج کی ناسازی کے سبب سے مستعفی ہو کر بھوپال چلے گئے اور اس وقت ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء مجلسِ علمائے بھوپال کے رکن ہیں جو ریاست بھوپال کا ایک معزز سرکاری منصب ہے۔

بہر حال کام جس سرگرمی سے ہو رہا تھا، اس کے لحاظ سے ۲ نومبر ۱۹۱۴ء تک مولانا اس قابل ہو گئے تھے کہ دو تین مہینہ کے بعد اپنے احباب خاص کو دارالمصنفین کے دیکھنے کے لیے مدعو کر سکیں، چنانچہ نواب علی حسن خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”میرا تو یہ حال ہے کہ میں نے اچھا وسیع قطعہ دارالمصنفین اور دارالنگمیل کے لیے لے لیا ہے اور جو قوت اور افادہ وہاں بیکار جا رہا تھا اس کو موزوں اور مناسب موقع پر صرف کروں گا۔“

دو تین مہینہ کے بعد آپ کو تکلیف دوں گا کہ آپ خود بھی دیکھ لیں۔“ (علی حسن خاں-۱۵)

لیکن اس کے سولہ ہی دن کے بعد مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دل کی حسرت دل میں رہ گئی، تاہم مولانا نے دارالمصنفین کے متعلق جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ”شاید وہی میرا مدفن بھی ہو“ (شروانی-۱۱۳) وہ پوری ہوئی، ان کی نیک نیتی سے ان کے بعد ہی دارالمصنفین قائم ہوا اور اب تک جس طرح چل رہا ہے اس کو ہر شخص بطور خود دیکھ سکتا ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ

ذات نبوی ﷺ سے عقیدت | استاذ مرحوم کو حضور انور ﷺ کی ذات مبارک سے بڑی شیفنگی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ اس نام نامی کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد و پایاں نہ تھی، یہاں تک کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں بے ظاہر اس حد سے بھی تجاوز کرتے ہیں، کہتے ہیں:

شیفنگ گانیم و پیہر پرست
سجدہ اگر نیست زمین بوس ہست

بدء الاسلام | انہوں نے علی گڑھ آ کر نئی طرز پر جب تصنیفات کا آغاز کیا تو یہ آغاز بھی ذات مبارک کے ذکر خیر ہی سے فرمایا اور بدء الاسلام کے نام سے عربی میں سیرۃ نبوی ﷺ پر ایک مختصر رسالہ لکھا جو علی گڑھ کالج کے نصاب میں داخل تھا۔

سیرت کا ابتدائی خیال | اردو میں جب ناموران اسلام کا سلسلہ چھیڑا تو بار بار ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ ان نام و دروں سے پہلے سب سے اول اس نام و در کا نام آنا چاہیے، جس کی نام وری نے ان سب کو نام و در بنایا ہے، اس لیے الفاروق والغزالی کے بعد ۲۸ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۵ جون ۱۹۰۳ء کو انہوں نے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں اس کام کا آغاز کیا اور ۳ھ تک کے واقعات قلمبند کیے (یہ مسودہ اب تک دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے، وہ خود ان کو پسند نہیں آ رہا تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اس کو راز رکھا اور سارے مکتوبات میں کہیں ایک حرف بھی اس کے متعلق انہوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی سے نہیں کہا، صرف ایک خط میں اس کا تذکرہ اس بنا پر آ گیا ہے کہ حیدرآباد میں مولوی حسین عطاء اللہ صاحب کے پاس بہت اچھا کتب خانہ تھا، اس کتاب کے لیے ان کو بعض کتابوں کی ضرورت پیش آئی تو ۲۷ مئی ۱۹۰۳ء کو ان کو لکھا: ”میں نے جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنی شروع کی ہے، جو سعادت دارین کا ذریعہ ہے، اس کے لیے اس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے، میرا کتب خانہ تمام وطن میں ہے۔“ (مکتیب اول طبع دوم ص ۳۳۶) لیکن اس پر بھی وہ غزوہ خندق سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

۱۔ پرستیدن کے دو معنی ہیں، پوجنا اور خدمت کرنا، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، یعنی ہم خادم رسول ہیں مگر شاعرانہ ابہام، دوسرے غیر مقصود معنی کی طرف لے جا کر لطف پیدا کرتا ہے۔ ۱۳

اصل یہ ہے کہ ان کے ذہن میں اس زیر تجویز کتاب کا معیار بہت بلند تھا، اس سے کم کوئی چیز ان کے دل کو نہیں بھاتی تھی، فرماتے تھے کہ ”سوانح عمری ایسی لکھنی چاہیے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچی نظر آئے لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرور کائنات ﷺ کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب (اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لیے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے“ غالباً ان کے اسی خیال کا عکس ان کے اس قطعہ میں ہے، جس کو غالباً ۱۹۱۴ء میں نظم فرمایا تھا:

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالم
دیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامین لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی
کہ ”ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے“
فرماتے ہیں تھے کہ نعت کے متعلق عربی نے بالکل صحیح کہا ہے:

عربی مشابہ ایس رہ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را
بشار کہ نتواں بیک آہنگ سرودان
نعمتِ شہ کونین و مدح کے و جم را
تالیف سیرت کا عزم | اس مشکل کے باوجود سیرت کی ضرورت کے لیے مسلمانوں کی طرف سے بار بار رہ رہ کر آوازیں بلند ہوتی تھیں اور وہ ان کو سن کر چپ رہ جاتے تھے لیکن جدید تعلیم جس تیزی کے ساتھ پھیلتی جاتی تھی، مذہبی بے خبری بھی اسی قدر بڑھتی چلی جاتی تھی اور یہ صورت حال ایسی تھی جس کی روک تھام کی بڑی ضرورت تھی، اس ضرورت کے احساس کا آغاز ان کو سب سے پہلی دفعہ ۱۹۰۶ء میں ہوا، یہ وہ زمانہ ہے جب اس سے ایک سال پہلے ۱۹۰۵ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ نے محمد ﷺ کے نام سے سیرت میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی اور بڑی محنت سے لکھی اور اس خصوصیت کے ساتھ لکھی کہ اس میں اکثر حوالے احادیث کی کتابوں کے تھے، یہ کتاب بڑی زہرناک تھی اور انگریزی تعلیم یافتہ اس کی تحقیق و تلاش کے نتیجوں سے نہایت متاثر ہو رہے تھے اور اس تاثر کا اظہار سب سے پہلے مولانا کے سامنے اسی نے کیا جو اس عہد میں جدید تعلیم کا سب سے مایہ ناز فرزند گزرا ہے، یعنی محمد علی مرحوم نے، مرحوم اس زمانہ میں بڑودہ کی ریاست میں ایک عہدہ پر ممتاز تھے، گو وہ نئی تعلیم کے سب سے بہترین پیداوار تھے، تاہم ان کا دل ہمیشہ سے مسلمان تھا، ۱۰ اگست ۱۹۱۸ء کو چھنڈ واڑہ (سی پی) سے جہاں وہ نظر بند تھے، مجھے ایک خط میں لکھا جو ان کے مجموعہ خطوط میں چھپ گیا ہے اور جو حسب ذیل ہے:

”۱۹۰۶ء میں مولانا و استاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے ہی پاس مقیم تھے، اس زمانہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمائیے کہ سیرۃ نبوی ﷺ کا کیوں انتظام نہیں فرماتے، ہندوستان میں کون ہے جو کفار کے پے در پے مگر بیجا سے بیجا تر حملوں کا جواب دے گا، خصوصاً اپنے اوکسفورڈ کے..... استاد مارگولیوٹھ کی طرف اشارہ تھا..... نہ معلوم اس سے قبل مولانا مرحوم کو کتنی بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا، مگر طرز گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر نے اثر کیا اور آخری فیصلہ کم سے کم بڑودہ ہی میں رہ کر کیا گیا۔“ (خطوط محمد علی مکتبہ جامعہ ص ۵۹)

بہر حال جدید تعلیم کی اس ضرورت کے ساتھ اس کے بعد ہی ارداد و غیرہ کے جوہنگا سے شروع ہوئے اور اشاعت و حفاظت اسلام کی جو تدبیریں ان کے سامنے آتی رہیں، ان سب نے مل کر سیرت نبوی کی تالیف کے ارادہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا، چنانچہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان کے ارادہ نے عزم کی صورت اختیار کر لی، چنانچہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا، اسی اعلان میں جو اسی ماہ و سال کے اندوہ میں چھپا ہے، اس کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ان کو اس ضرورت کا احساس کیوں ہوا، فرماتے ہیں ”سیرۃ نبوی ﷺ کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم و وسعت سے پھیلتی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا، یہ گروہ آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں سکتی، اس لیے اس کو چار و نار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں، یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں..... میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رہا تھا لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے ذرا اتر جائے، تو سخت جرم ہے..... قوم کی طرف سے ایک مدت تقاضا ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبوی ﷺ کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں، خود میں بھی اپنی پہلی رائے سے رجوع کر چکا ہوں اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں۔“ (مقالات شبلی جلد ۸ ص ۳۲)

اب مصنف نے احادیث و سیر کا مطالعہ شروع کیا اور جیسے جیسے یہ مطالعہ بڑھتا گیا، نظر میں وسعت، دل میں تڑپ اور روح میں بالیدگی بڑھتی گئی، سیرت کے جو اوراق انہوں نے ۱۹۰۳ء میں لکھے تھے، ان کو ۱۹۱۳ء والے اوراق سے ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب صرف دماغ سے

اور دوسری دل سے لکھی گئی ہے، نقش اول میں مورخ کے قلم کی گلکاری ہے اور نقش ثانی میں جو سراپا کھینچا گیا ہے، اس میں مورخ کے ساتھ محدث کی قلم کاری بھی شامل ہے، ہمارے دوست اور رفیق درس اور مولانا کے عزیز شاگرد مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی (ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) نے اندوہ کے سلسلہ جدید میں ”یادایام“ کے نام سے جو مسلسل مضمون لکھا ہے، اسی میں اس موقع پر لکھتے ہیں: ”علی گڑھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ ندوہ میں اسٹراٹیک ہو چکی ہے، مولویوں نے قبضہ کر لیا ہے، ایک آنکھ میں نزول ماہ شروع ہو گیا ہے، اسٹراٹیک کا قضیہ سنتا ہوں، قلق ہوتا ہے، ان کی معذوری پیش نظر ہو جاتی ہے، اب وقت اس قسم کے ہیجان برداشت کرنے کا نہیں ہے، عقیدت مند شاگرد مشورہ یکسوئی کا دیتا ہے اور یہ عرض کرتا ہے کہ اس وقت تک آپ نے جو کچھ کیا اگرچہ وہ دینی خدمت ایک حد تک تھی، مگر اب مخلصین لہ الدین کا وقت ہے، الامر بالخوانم، استاذ علامہ بے چین ہو جاتے ہیں، استاذ شاگرد آبدیدہ ہو جاتے ہیں، استاذ فرط محبت سے شاگرد کو لپٹا لیتا ہے اور پھر دو باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں، علوم القرآن اور سیرۃ نبوی ﷺ شاگرد عرض کرتا ہے کہ پہلے میں اشکال زیادہ ہے، یہ کام ساری عمر کا ہونا چاہیے تھا، پھر ہندوستان میں اس کا مخاطب کون ہے، اردو میں اس کو دلچسپ بنانا ایک اور محنت چاہتا ہے، جو آپ کے سن و سال و قویٰ کے مناسب حال نہیں، آخر میں سیرۃ ہی پر رائے مختلف ہو جاتی ہے، دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو مسودہ اعلان یا اپیل تیار تھا، مجھے دکھایا، پھر طباعت کو بھیج دیا، کچھ خدمت مواد کے متعلق سپرد ہو جاتی ہے، جس کی تعمیل بمشورہ ڈاکٹر ہارویز کر کے بھیج دی گئی، مگر یہ عرض کیا کہ کتاب ہر قسم کے مباحثوں سے الگ، محض صحیح واقعات اور عمدہ ترتیب پر مبنی ہونی چاہیے، مولوی کچھ سمجھیں، انما الاعمال بالنیات یہ میرا ایمان ہے کہ خلوص کی کمی نہ تھی علم و فہم میں کیا کسر تھی، قبولیت کیوں حاصل نہ ہوتی، عشق رسول کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔“

مجلس تالیف سیرت | بہر حال جیسا کہ ابھی گذرا، ۱۹۱۲ء کی شروع تاریخیں تھیں کہ ان کے ارادہ نے عزم کی صورت اختیار کر لی، ۲ جنوری ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی کو لکھا ”سیرۃ نبوی ﷺ کا شروع سال سے عزم ہے لیکن پچاس ہزار سرمایہ کی ضرورت ہے، کیا قوم سے یہ امید ہو سکتی ہے۔“ (شروانی-۹۶) مگر اس عزم ۱۔ مضمون نگار کو واقعہ صحیح تاریخ میں کچھ تشاہد ہو گیا ہے، ندوہ کی اسٹرائٹک کا واقعہ اس کے دو سال بعد مارچ ۱۹۱۳ء میں پیش آیا، اور سیرۃ کی تالیف کا اعلان جنوری ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے، بہر حال اختلافات شروع ہو چکے تھے، اور مولانا بدل ہو رہے تھے، جس کا آخر نتیجہ اسٹرائٹک تھا۔ ”س“

نے چند ہی روز میں یہ شدت اختیار کی کہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں سیرۃ نبوی ﷺ کی تالیف کا برملا اعلان کر دیا اور قوم سے اس کے ماہانہ مصارف کے لیے ڈھائی سو ماہوار اور خرید کتب کے لیے کچھ اور نقد روپیے کی درخواست کی اور تجویز پیش کی مجلس تالیف سیرۃ نبوی ﷺ کے نام سے ایک مجلس قائم کی جائے جس میں وہ ارکان شامل ہوں جو مر بی بن کر کم از کم ایک ہزار یکمشت یا دس روپیے ماہوار دیں یا جو عام ارکان میں داخل ہو کر ایک روپیہ ماہوار عنایت کریں، یا معین بنیں اور نایاب و قلمی کتابیں بہم پہنچائیں یا اور کسی مفید طریقہ سے مدد دیں تاکہ مصنفین یورپ نے جو کتابیں سیرت میں لکھی ہیں، ان کو ایک جا کیا جاسکے اور کچھ مترجم ہوں جو ان کو پڑھ کر ان کے اعتراضات کا خلاصہ کر سکیں اور کچھ علما ہوں جو روایات کی تلاش و تنقید اور چھان بین کا کام کریں، کچھ مسودہ نویس ہوں جو مسودوں کو صاف کریں۔

سرکار عالیہ بھوپال کی امداد | اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو بلیک کہا اور فال نیک یہ کہ سب سے پہلے ایک مسلمان خاتون بنت نصیر الدین حیدر تیموریہ (حیدرآباد دکن) کا خط اشاعت کے قابل ٹھہرا، جس کو مولانا نے اپریل ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں شائع کیا، یہ قدرت الہی کی طرف سے اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کام کے لیے دانہ دانہ چننے اور کوڑی کوڑی بیٹورنے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ کوئی مخدومہ جہان خود آگے بڑھ کر روپیوں کی تھیلی سامنے رکھ دے گی، چنانچہ یہی ہوا، منشی محمد امین صاحب زبیری نے جو ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم فرما زوئے بھوپال کے لٹریٹری سکریٹری تھے، سرکار سے عرض کیا کہ ”حضور! آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے، آپ اس کو بڑھ کر کیوں اٹھا نہیں لیتیں، یعنی ایک عاشق رسول مصنف گلے میں جھولی ڈال کر سیرۃ نبوی ﷺ کی تصنیف کے لیے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہے، یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں اور اس فقیر کی جھولی میں ڈھائی سو ماہوار ڈال دیتیں کہ وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائے، یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اتر گئی، انہوں نے اس حصول سعادت کی رضامندی ظاہر کی، منشی صاحب نے مولانا کو مطلع کیا اور اپریل ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان سے باقاعدہ درخواست منگوائی گئی، جو ۱۴ اپریل ۱۹۱۲ء کو دو برس کے لیے دوسو ماہوار کے حساب سے منظور ہوئی، مولانا نے مئی ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں بڑی مسرت سے اس کا اظہار کیا، مجلس تالیف سیرت نبوی ﷺ کے لیے چندوں کے وصول کرنے کی جن مختلف تدابیر کا اعلان کیا گیا تھا، ایک زبیدۃ وقت کی فیاضی نے ان سب کو منسوخ کر دیا، عام مسلمانوں کو سیرت نبوی ﷺ کے ساتھ جس شدت سے شغف

اور اعتقاد ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اعلان کے بعد مجالس قومی نے جدید تعلیم کے افراد عالیہ نے، قدیم تعلیم یافتہ اشخاص نے، رؤسائے ملک نے، عام مسلمانوں نے اور نہ صرف جنس رجال نے بلکہ جنس اناث نے بھی نہایت جوش کے ساتھ مالی، علمی اور عام امداد کے لیے آمادگی ظاہر کی، بعض لوگوں نے بلا طلب چندے بھی بھیجا شروع کر دیے لیکن عدم ضرورت کی بنا پر واپس کیے گئے، بعضوں نے اصراراً بھیجے، لیکن پھر واپس کیے گئے، یہ دلائل ہیں ذات رسالت مآب ﷺ کے ساتھ اس غیر فانی عقیدت مندی کے جس کو مسلمانوں کے سینوں سے نہ تعلیم جدید محو کر سکتی ہے اور نہ مغربی بے اعتنائی کے قومی اثرات اس کو مٹا سکتے ہیں۔“

کتابوں کی خریداری کے لیے دو ہزار روپیے نواب زادہ حمید اللہ خاں موجودہ اعلیٰ حضرت فرماں روئے بھوپال کی طرف سے منظور ہوئے۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہو کر مولانا نے سیرۃ نبوی ﷺ کا دفتر قائم کیا، ایک عربی کا مددگار دو انگریزی کے مترجم رکھے، عربی کے مددگار کے عہدہ پر انہوں نے اپنی شفقت سے خاک سار کو منتخب فرمایا اور صیغہ تعلیم سے ہٹا کر سیرت کے اسٹاف میں لے لیا اور یہ خدمت سپرد ہوئی کہ صحیح بخاری سے سیرۃ کے واقعات کو یک جا کروں اور انگریزی مترجموں میں سے ایک کو پروفیسر مار گولیوس کی کتاب محمد اور دوسرے کو سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد ترجمہ کے لیے دی گئی لیکن خود مولانا اشاعت اسلام وغیرہ کی مشغولیتوں کی وجہ سے کام جلد شروع نہ کر سکے، ۱۷ اپریل ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں: ”ریاست کے عطیہ کی درخواست تو کی لیکن اب قبول کرنے میں ایک بڑا بار محسوس کرتا ہوں۔“

میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں، نو مسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں، وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکتب قائم کرنا مقصود ہے لیکن چون کہ گرمی سخت ہو رہی ہے، اس لیے یہ دورہ مختصر ہوگا، اسی طرف سے بھوپال آؤں گا، پھر بنگلور یا بمبئی جاؤں گا، کتابیں ساتھ نہیں جاسکتیں، نہ اسٹاف ساتھ جاسکتا ہے، اس لیے سیرۃ نبوی ﷺ کا کام باضابطہ بارش سے شروع ہوگا، یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی طرح دو برس میں انجام نہیں پاسکتا، اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے، اس لیے جلدی بھی کرتا ہوں کہ کچھ کر لوں ورنہ جس قدر میں کر سکتا ہوں اتنا کرنے والا بھی نظر نہیں آتا، کتابوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے، بہت سی کتابیں تو خود مندوہ میں موجود ہیں، زائد جو مطلوب ہیں، ان کو منگوانا ہے، اشاعت کی فکر نہ کیجیے، میں خود کر سکتا ہوں۔“ (۷)

لکھنؤ میں رہ کر ان کو سکون نہیں ملتا تھا، اس لیے سیرۃ کی تالیف کی خاطر بمبئی کے کسی ایک گوشہ میں بیٹھ کر عزت گزیں ہونا چاہا، منشی صاحب کو ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء کو لکھا ”میرا ارادہ ہے کہ مستقل بمبئی میں قیام کر کے سیرت کو ختم کر دوں، یہاں روز ایک قصہ رہتا ہے، اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسٹاف ساتھ لے جاؤں گا، سید سلیمان ساتھ رہیں گے، خوشنویس اور انگریزی مترجم وغیرہ بھی۔“ (۹)

منی کے آخر میں بمبئی جاتے ہوئے مولانا بھوپال اترے اور حضور عالیہ نے شرف ملاقات بخشا، مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البراکہ کا جوان دنوں بھوپال میں تھے، بیان ہے کہ مولانا نے اسی موقع پر اپنا یہ قطعہ پڑھ کر سنایا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت بیغیر خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بانئیر ہونا تھا

سرکار عالیہ اس کو سن کر بے حد متاثر ہوئیں اور مصنف کی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی، سرکار بھوپال سے سیرت کی امداد کا اجرا صرف دو برس کے لیے ہوا تھا، یہ زمانہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی اہم کتاب کے لیے بہت ہی کم تھا، چنانچہ ۲ نومبر ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھا ”میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کر دیں لیکن اب روپیے کا نہیں میری جان کا معاملہ ہے، ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مرنہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔“ (۱۲)

دو برس تمام ہوتے ہوتے سرکار عالیہ نے ۲۳ دسمبر ۱۹۱۳ء کو اپنی امداد کی مدت تکمیل بڑھا دی، اس سے خوش ہو کر مولانا نے قطعہ کہا، جس کو ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کو منشی محمد امین صاحب کے خط میں لکھ کر بھوپال بھیجا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت کہ ابراہیم فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی تو اس کے واسطے حاضر مرادل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے

مولانا کا خیال تھا کہ سرکار عالیہ کی یہ امداد اس سلسلہ کی دوسری تالیفات کے لیے ہمیشہ جاری رہے تو بڑے کام نکلیں، چنانچہ ۳۰ جنوری ۱۹۱۴ء کو منشی صاحب موصوف کو لکھا: ”سیرت کی رقم بھی مستقل

ہو جاتی تو بہت اچھا تھا، اس مدکی تصنیف کا مستقل سلسلہ قائم رہتا، کانوں میں بھنک تو ڈال دیجئے، یہ وسیع سلسلہ ہے، مثلاً سیرۃ صحابہ، سیرۃ ازواجِ پیغمبر علیہ السلام وغیرہ وغیرہ۔“

عجیب بات ہے کہ مولانا اور سرکار عالیہ کی وفات کے بعد اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں کے عہد میں مولانا کی یہ آرزو تکمیل کو پہنچی، سرکاری امداد مستقل ہو گئی اور سیر الصحابہ وغیرہ بھی دس بارہ جلدوں میں لکھ کر پوری کر دی گئی۔

تالیف سیرۃ کا آغاز | سیرۃ کی تالیف کا آغاز بابِ کعبہ یعنی بسبئی میں بیٹھ کر کیا گیا، یعنی وہیں قلم نے سیرۃ کی پہلی سطریں لکھیں، آغاز کا زمانہ بھی معلوم ہے، ۱۶ جون ۱۹۱۲ء کو لکھتے ہیں: ”ابھی تک میں نے لائف کا کچھ کام نہیں کیا، طبیعت مطمئن نہیں، بل اب کام شروع کروں گا۔۔۔۔۔“

اگر وہاں کتب خانہ میں تفسیر فتح البیان مع تفسیر ابن کثیر موجود ہو تو ضرور لیتے آئیے گا، یہاں نہیں ہے اور میں ساتھ نہیں لایا، سید سلیمان آگئے۔“ (ابن ۱۰۰)

مولانا نے مجھے اس لیے بلایا کہ میں انہیں روایات کی تلاش اور رواۃ کے ناموں کی تحقیق میں مدد دوں، یہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ بسبئی میں سیرت کے آغاز کا مقدس کام کس مکان میں ہوا، کھڑا پارسی کے پاس ”پالمن جی“ ہوٹل نامی ایک مکان تھا، اس کے اوپر کے ایک کمرہ میں مولانا مقیم تھے اور خاک سار بھی اسی عمارت کے دوسرے گوشہ کے ایک دوسرے بالائی کمرہ میں ٹھہرایا گیا تھا، اس سڑک کی خصوصیت یہ تھی کہ ادھر سے ٹریم نہیں گزرتی تھی اور مکان بھی سڑک سے فاصلہ پر تھا، اس لیے بسبئی کے عام شور و غل سے یہ محفوظ تھا اور یہی اس کے انتخاب کی وجہ ترجیح تھی۔

مولانا نے بڑے روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ کتاب کا آغاز کیا، ابھی چند ہی صفحے لکھنے پائے تھے کہ سفر ڈھا کہ کی ضرورت پیش آ گئی، سفر کا باعث ڈھا کہ یونیورسٹی کے جلسہ میں شرکت تھی، مگر اس کا قانونی مقصود کلکتہ میں ایشیا ٹیک سوسائٹی کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا تھا، ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: ”سیرت کے لیے ایشیا ٹیک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں، انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں، ان سے کذب و افتراء کا عجیب منظر سامنے آ جاتا ہے، مرگولوس پروفیسر آسٹریا سے بڑا عربی عالم ہے، اس کی لائف آف محمد دیکھنے کے قابل ہے، لکھتا ہے کہ عبدالمطلب، مطلب کے غلام تھے، کعبہ آنحضرت ﷺ سے صرف ۱۰۰ برس پہلے کی عمارت

تھی، وغیرہ وغیرہ کام ہو رہا ہے، سیرت کی ماخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ان کے تمام رواۃ کا استقصا کر کے ان کے اسماء الرجال، تہذیب وغیرہ سے مرتب کر رہا ہوں کہ روایتوں کے انتقاد میں آسانی ہو، سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں اور وہ یہیں ہیں، خود الگ سیرت میں مشغول ہوں، انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔‘ (شروانی-۱۰۲)

وہ اگست کے شروع ہفتہ میں کلکتہ ہو کر ڈھا کہ گئے (عبدالقادر-۲۵) اور پھر اسی طرف سے کلکتہ میں کتابیں دیکھ کر بمبئی واپس آ گئے، اس وقت تک انگریزی میں سیرت کی بہت سی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، اگرچہ لائق گریجویٹ ان میں سے بعض اہم کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے، پھر بھی ان ساری کتابوں کے ترجمہ کے لیے بڑی محنت اور بڑا سرمایہ درکار تھا، اس لیے یہ تجویز کیا کہ اپنے دوستوں میں سے ان اصحاب کو جو انگریزی جانتے ہیں، ایک ایک دو دو کتابیں بانٹ دیں اور ان سے خواہش کریں کہ وہ ان کو پڑھ کر قابل اعتراض مقامات پر نشان لگا دیں، چنانچہ اسی تجویز کے مطابق ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو ان اصحاب کے نام خطوط جاری کیے، جن میں سے مولانا شروانی اور شیخ عبدالقادر صاحب کے نام خطوط مکاتیب میں درج ہیں (شروانی-۱۰۲، عبدالقادر-۱۸) جن صاحبوں نے اس خدمت کو قبول کیا، ان کے پاس کتابیں بھیج دیں اور انہوں نے ان کو دیکھ کر واپس کیا۔

ستمبر ۱۹۱۲ء تک مولانا بمبئی میں رہے، اس اثنا میں ولادت باسعادت سے لے کر خانہ کعبہ کی تعمیر کے باب تک لکھا جا چکا تھا کہ جواز سفر نے ہندوستان کا رخ کیا، یعنی مولانا وقف وغیرہ کے کاموں کے سبب سے لکھنؤ واپس چلے آئے، تاہم اس وقت تک کتاب کے ۱۰۰ صفحے ہو چکے تھے، ۲ نومبر ۱۹۱۲ء تک ان پر نظر ثانی ہوئی اور مضامین میں حذف و اضافہ ہوا، اسی تاریخ میں لکھتے ہیں ”سیرۃ کے سو ۱۰۰ صفحے ہو چکے تھے، لیکن نظر ثانی میں پھر کچھ کچھ ہو گیا، یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، ان کے ایک ایک حرف کے لیے سیکڑوں اوراق الٹنے پڑتے ہیں، یہ کمجنت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے، یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں۔“ (۱۱-۱۲)

فروری ۱۹۱۳ء میں وہ بدر تک پہنچے تھے (عبدالہاری-۲۱) لیکن اپنی ناسازی طبع کے سبب سے ان کے دل میں یہ خیال کاٹنا سہاٹھکتا تھا کہ وہ اس کی تکمیل اس حالت میں کر سکیں گے یا نہیں، یکم مارچ ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں: ”سیرۃ چل رہی ہے، اب نظر آتا ہے کہ واقعی ایک ایسی تصنیف کی

سخت ضرورت تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میں پورا کر سکوں گا یا نہیں۔ (عبدالباری-۳)

بایں ہمد ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء کو سیرۃ کا سادہ مسودہ فتح مکہ و حنین تک پہنچ چکا تھا۔ (عبدالباری-۴)

پہلا حصہ | اس زمانہ میں ندوہ کے کاموں میں بہت سے الجھاوے پڑ گئے، جن میں سب سے اہم

مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا مسئلہ تھا، جس پر اخباروں میں بڑی بحثیں رہیں، اس لیے جون

۱۹۱۳ء میں وہ تہائی اور داغی سکون کی خاطر پھر بمبئی چلے گئے، اس سفر میں میرے بہ جانے مددگار عربی

کی حیثیت سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی ان کے ساتھ تھے، اس دفعہ وہ نیونانگپاڑہ روڈ بانی کلا

اکبر بلڈنگ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہے، اور سیرت جلد اول کی تالیف میں ہمد تن مصروف

ہو گئے، بلکہ دارالعلوم کی معتمدی سے بھی استعفا دے دیا تاکہ دربار رسول ﷺ کے لیے دماغ کو پوری

یکسوئی حاصل ہو، ۹ جولائی ۱۹۱۳ء کو شروانی صاحب کو لکھا ”پہلی جلد کا نصف حصہ گویا تیار ہے، ہر ہفتہ

میں طبیعت دو تین روز ناساز ہو جاتی ہے، اس لیے ناغہ سے ہرج ہو جاتا ہے، بڑے بڑے محرکے طے

ہوئے، اس فن کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی، مجھ کو خود خیال نہ تھا کہ ایسی کام یابی ہوگی،

لیکن قدر کو ن کرے گا، کوئی شخص پہلے طبری واہن اشیر کو چھان چکا ہو تب اندازہ کر سکتا ہے۔ (شروانی-۱۰۸)

اس پر بھی کام اس محنت سے کیا کہ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو اندازہ تھا کہ دو تین مہینہ میں سیرت کا

پہلا حصہ تمام ہو کر مطبع چلا جائے گا (شروانی-۱۱۰) اسی لیے وہ بمبئی سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، اسی زمانہ میں

مولانا ابوالکلام نے ان سے گلگت آنے کی فرمائش کی تو ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا: ”گلگت آنے کو سوسو بار جی

چاہتا ہے، لیکن کیا کروں، سیرت کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں کہاں

لیے پھروں، یہاں سوڑتی سے استعارۃً بھی کتابیں مل جاتی ہیں، اس پر بھی بہت سی خریدنی پڑیں، ایک

کافی ذخیرہ ساتھ آیا تھا، پھر بھی ہر قدم پر ضرورت پیش آتی ہے، چون کہ بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے، اس

لیے اب ہر منٹ گراں معلوم ہوتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد پریس میں جا سکے۔“ (ابوالکلام-۳۶)

اس بنا پر اس دفعہ بمبئی میں چار پانچ مہینے جم کر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے شروع میں جس طرح بنا

سیرت کے پہلے حصہ کا مسودہ قریب قریب پورا کر لیا اور ادھر سے یک گونہ اطمینان پا کر نواب عماد الملک

۱۔ ۲۱ جولائی ۱۹۱۳ء کو سید عبدالکحیم صاحب دسنوی کو لکھتے ہیں ”بہر حال اب تو ایک دو برس..... نجات رہے گی،

اور دربار رسالت کا آستانہ ہوگا۔ (۳)۔ ۲۔ ابنائے غلام رسول سورتی، تاجرین کتب بمبئی۔

کی خواہش حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو نوشی محمد امین صاحب کو لکھا: ”کتاب کا پہلا حصہ جس میں سادہ حالات زندگی ہیں، قریباً تیار ہو گیا ہے، اگرچہ اس میں بھی نہایت کدو کاوش اور تمام کتب حدیث و رجال کی چھان بین کرنی پڑی، تاہم اصلی مرحلے آگئے ہیں، کتاب پانچ جلدوں میں ہوگی، جو حصہ گویا تیار ہے وہ قریباً پانچ سو صفحوں میں ہے، پوری کتاب کو اس کا چوگنا کر لیجئے۔ (امین-۱۷)

حیدرآباد میں ان کو ایک نہایت پر فضا مکان مل گیا، اس لیے وہاں کئی مہینے رہے۔ (ابوالکلام-۳۹) یہاں طبیعت بھی فی الجملہ صحیح رہی اور ارادہ فرمایا کہ جلد اول تمام کر کے یہاں سے اٹھیں، وہاں کا کتب خانہ بھی ان کے اس قیام میں متعین رہا۔ (امین) تاہم نومبر ۱۹۱۳ء تک سیرت کا پہلا دیباچہ سپرد قلم نہیں فرمایا، ہنوز اس کا خاکہ ان کے ذہن ہی میں تھا۔ (امین-۸) ۱۷ نومبر ۱۹۱۳ء تک ان کی یہ خواہش تھی کہ وہیں چار پانچ مہینے رہ کر پہلی جلد تمام کر کے اٹھیں، (عبدالماجد-۴) اسی لیے مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی سے خواہش کی کہ وہ چند روز کے لیے سیرت کے انگریزی دفتر کی نگرانی قبول کریں تو پہلی جلد نکل جائے، کیوں کہ معلوم نہیں کہ یورپ کے بے شمار ذخیرہ میں کیا کیا چیزیں لینے کے قابل ہیں اور عام مترجم یہ نہیں بتا سکتے (عبدالماجد-۴) مولوی صاحب نے اس عہدہ کو قبول فرمایا اور کئی مہینے تک لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ کام انجام دیتے رہے۔

دسمبر کے شروع میں ہم لوگوں کے اصرار سے مولانا حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور چاہا کہ یہاں بھی سکون نصیب ہو کہ کم از کم پہلی جلد تمام کو پہنچے (۱۳ جنوری ۱۹۱۴ء بہ نام شروانی صاحب-۱۱۱) لیکن ان کے استعفیٰ کی وجہ سے طلبہ اور مدرسین میں ایک ہرجان برپا تھا، جس کا نتیجہ طلبہ کی اسٹریک میں جا کر نکلا، اور کئی مہینے اس کے اوجھڑ بن میں گزر گئے، آخر مئی ۱۹۱۴ء میں اصلاح ندوہ کا جلسہ واپسی میں ہوا اور اصلاح ندوہ کی بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں اور جون ۱۹۱۴ء کے شروع تک وہ واپسی میں مصروف کار رہے، مگر ان جھمیلوں میں بھی جن میں ہر روز ان کی تشویش خاطر کی ایک نئی صورت پیش آتی رہتی تھی، وہ سیرت سے غافل نہ رہے، جیوں ہی ذرا ان کو چھٹی ملی، وہ جون کے وسط میں بمبئی روانہ ہو گئے، بھائی کلمہ اکبر بلڈنگ میں قیام ہوا اور سکون کے ساتھ پہلی جلد کو ہر جہت سے مکمل کرنے لگے اور اب کتاب کی پہلی جلد اس حیثیت کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی چھپائی کے مشورے بھی ہونے لگے، اسی درمیان میں سیرت کا وہ مقدمہ جو فن مغازی و سیر کی تاریخ اور اسلامی فن روایت کے اصول پر ہے، مرتب فرمایا۔

ایک فنڈ | مولانا ابوالکلام کی تحریک تھی کہ سیرت خوش نمائاں میں چھپے، مولانا نے نمونہ کے طور پر چھاپنے کے لیے اس مقدمہ کو ان کے پاس الہلال پریس کلکتہ میں بھیج دیا، مولانا ابوالکلام نے اس مقدمہ کو الہلال میں بھی چھاپ دیا تاکہ اہل نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے لیکن بعض مخالفین جن کو دل سے یہ بات پسند نہ تھی کہ سرکار عالیہ کی سرپرستی میں جو سیرۃ نبوی ﷺ لکھی جائے، وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، اس کے منتظر تھے، کہ سیرۃ کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھاڑ کریں، یہ مقدمہ نکلا تو مولوی عبدالشکور صاحب اڈیٹر ”انجم“ نے اپنے نقطہ نظر سے اس مقدمہ پر نہایت سخت تنقید لکھی، مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی تھے، اس تنقید کو دستاویز بنا لیا، اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا اور بعض ذرائع سے وہ سرکار عالیہ تک پہنچائی گئی، انہوں نے مولانا سے حقیقت جان دریافت فرمائی اور اس کے جواب لکھنے کی فرمائش کی، بلکہ خود مولانا کو بھوپال آنے کا اشارہ فرمایا، مولانا نے منشی محمد امین صاحب کو لکھا کہ ”نہایت مہمل اور معاندانہ اعتراضات ہیں“ جو اب کے متعلق لکھا کہ وہ لکھ دیا جائے گا لیکن میرے نام سے نہیں چھپے گا، غرض اظہار حقیقت ہے، نہ اظہار نام، وہ یا تو رسالہ کی صورت میں چھپے یا الہلال میں بھیج دیا جائے“ آخر میں لکھا ”میں بارش کے قبل نہیں آسکتا، بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لیے آ جاؤں لیکن اگر اسی درجہ کے لوگوں کے لکھنے پر میری دارو گیر ہوتی رہے گی تو میں سمجھتا ہوں کہ اعانت سے مستعفی ہو جاؤں۔“ (امین-۲۶)

سرکاری مراسلہ کے جواب میں لکھا کہ: ”سرکار عالیہ کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں تاکہ مسودہ اس کے پاس بھیج دیا جائے“ اور اپنی طرف سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کا نام اس کام کے لیے تجویز فرمایا، چنانچہ مولانا نے مولانا محمود الحسن صاحب کی خدمت میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے ذریعہ سے اپنی خواہش پیش کی اور ساتھ ہی اپنا مسودہ بھی مولانا سندھی کے پاس بھیج دیا کہ وہ ان کو لے کر مولانا محمود حسن صاحب کی خدمت میں جائیں لیکن اس تجویز کا جو حشر ہوا، وہ ان ہی کی زبان سے سنئے، آج ان کا (مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کا) خط آیا کہ وہ گئے لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی، ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحب کو باز رکھا کہ وہ مسودہ کا سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں، دیوبند کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہ الگ ہیں، چنانچہ

۱۔ سیرۃ النبی ﷺ جلد اول کے صفحہ ۵ پر جو یہ احاشیہ ہے وہ اسی جواب کا ایک حصہ ہے۔

مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کو ان لوگوں نے کافر بنا دیا لیکن مولوی محمود حسن صاحب کے تعلقات اب تک ان سے وہی ہیں، بہر حال اب غور کرنا چاہیے کہ کیا کیا جائے، چونکہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے، اس لیے سردست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے گا، ورنہ سمجھے گا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا۔

اب اگر معاملہ اس پر موقوف ہے تو مجھ کو وظیفہ بھوپال سے خود دست بردار ہو جانا چاہیے، اخبارات میں تو یہ پہلے ہی شائع ہو چکا ہے کوئی نئی بات نہیں، میں بھی کشمکش سے نجات پا جاؤں گا اور کتاب کو مطبع میں بھیج دوں گا۔

میں جانتا ہوں کہ سرکار کو بھی مولویوں کے بدنام کرنے کا لحاظ ہوگا، اور ہونا چاہیے، اب اگر سرکار چاہیں تو یا تو سرے سے اس رقم کو بند کر دیں یا وار لمصنفین کی طرف منتقل کر دیں، یا جوان کی مرضی ہو، مجھ کو ہر حال میں ان کی رضا مندی منظور ہے، یہ معلوم ہے کہ میرا کام ٹک نہیں سکتا، میں خود مصارف کا متکفل ہو سکتا ہوں، اس کے علاوہ جس ریاست سے خواہش کروں اعانت کے لیے تیار ہوگی، جواب جلد عنایت ہو، ورنہ اسٹاف کا خرچ ابھی سے کم کر دینا ہوگا۔“ (امین-۲۹)

فتنہ کی ناکامی | چنانچہ اس کارروائی سے جو بالکل صاحب تھی، سرکار عالیہ نے سمجھ لیا کہ یہ چند مولویوں کی محض معاندانہ باتیں ہیں، منشی محمد امین صاحب نے اس کی اطلاع مولانا کو دی، مولانا نے اس کے جواب میں ۲۹ جولائی ۱۹۱۲ء کو لکھا: ”آپ کا خط پہنچا، اطمینان ہوا، میں جس تحقیق و تدقیق سے سیرت لکھ رہا ہوں، ناممکن تھا کہ مولوی محمود حسن صاحب اس کو دیکھتے اور تحسین نہ کرتے لیکن مخالفوں نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرے سے دیکھنے ہی سے انکار کر دیں، البتہ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی مسودہ دیکھ رہے ہیں، ان کی رائے آجائے گی تو بھیج دوں گا، مولوی عبد اللہ صاحب ٹوٹی پراگر اطمینان ہو، تو ان کے پاس بھیج دوں یا جو مصلحت ہو، یا یہ صورت ہے کہ سردست اس قصہ ہی کو خاموش چھوڑ دیا جائے۔“ (۳۰)

اس پریشان خاطری کے باوجود سیرت کا کام بدستور جاری تھا، ۲۶ جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا شہدائی کو لکھتے ہیں: ”تسلیم! سیرت کے اتمام کے لیے یہیں (بہمنی) کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لیے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اول بہمہ جہت تمام کر کے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں..... خوشنویس (کاپی نویس) کو

یہیں بلوایا ہے، ایک خاص دراندازی کی وجہ سے دیر ہوگئی، ورنہ مسودہ مطبع میں جاچکا ہوتا، ریاست پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ سیرت چھپنے نہ پائے۔“ (شروانی-۱۱۸)

منشی محمد امین کو یہ بھی لکھا کہ اس دفعہ بمبئی میں پورے سال بھر قیام کا ارادہ ہے، بمبئی میں سارا دن کام کے لیے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکنا نہیں، اس لیے برس دن یہاں سے ٹلنے کا ارادہ نہیں۔ (امین-۱۸)

سیرۃ کی ناتمامی کا داغ | لیکن آہ! سع مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال، اس عزم پر ایک ہفتہ بھی گزر نہ نہیں پایا تھا کہ جو لائی کے تیسرے عشرہ میں ان کو الہ آباد میں اپنے بھائی کی شدید علالت کی اطلاع ملی اور فوراً ہی الہ آباد روانہ ہو گئے، بھائی نے ۱۵ اگست ۱۹۱۳ء کو وفات پائی اور وہ دل شکستگی کے ساتھ گھر (اعظم گڑھ) واپس آئے، ۲۹ اگست ۱۹۱۳ء کو مولوی مسعود علی صاحب کو اپنے وطن واپس آنے کی خبر ان لفظوں میں دیتے ہیں: ”آخر ساری دنیا لانا کے گھر میں آیا“ (۱۹) لیکن اس عالم میں بھی سیرت کا خیال دل میں بسا تھا، ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں: ”میں اب بالکل دل شکستہ ہو گیا ہوں، برادر مر اسحاق کی موت نے دل بٹھا دیا..... سیرت کا کام جاری ہے، گویا تاخیر طبع سے طبیعت اچھی طرح آگے نہیں بڑھتی۔“ (امین-۳)

سیرت کے ان مباحث میں جن کا تعلق صحف بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے، وہ اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب سے جنہوں نے اس قسم کے مسائل پر بہ تحقیق غور کیا تھا، اکثر مشورے کرتے رہتے تھے، جن کا حوالہ مکاتیب شبلی میں جا بجا ہے، اسی سلسلہ میں ان کو ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کس حسرت سے لکھتے ہیں: ”افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے۔“

۱۔ بھوپال میں معاندین کی کارروائیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ۲۔ یہاں دارالمصنفین کا ذکر ہے۔

وفات

۱۳۳۳ھ-۱۹۱۴ء

خرابیِ صحت | مولانا اگر چہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں بڑے قوی و توانا تھے لیکن علی گڑھ کے زمانہ قیام میں یہاں کی آب و ہوا کا اثر ان کی صحت و توانائی پر نہایت مضر پڑا اور معدہ کی مختلف شکایتیں مثلاً قبض، تخییر وغیرہ پیدا ہو گئیں، جو اخیر عمر تک قائم رہیں، سفرِ کشمیر کے بعد علالتِ صحت کا سلسلہ جو برسوں قائم رہا، اس نے ان کو اور بھی ضعیف و ناتواں کر دیا، چلنے پھرنے سے معدہ کو جو فائدہ پہنچتا تھا، واقعہً شکستِ پاکہ کے بعد اس سے بھی محروم ہو گئے، اس لیے معدہ کی شکایتوں میں اور بھی اضافہ ہوا، لکھنؤ کی آب و ہوا نے ان شکایتوں کو اور بھی المضاعف کر دیا، اور پچیس اور اسہال کے دورے پڑنے لگے اور حکیم عبدالولی صاحب لکھنؤی اور حاذق الملک حکیم اجمل خاں دہلوی کے علاج و تدبیر سے افاقہ ہوتا رہا، ان ہی شکایتوں کی بنا پر اخیر عمر میں تبدیلِ آب و ہوا کے لیے بمبئی کو پسند کیا تھا، وہاں ہر سال موسمِ گرما میں جا کر چند مہینے قیام کرتے تھے اور وہاں کی آب و ہوا کا اثر ان کی صحت پر نہایت عمدہ پڑتا تھا، چنانچہ ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”یہاں (بمبئی میں) بلا مبالغہ وہاں (لکھنؤ) کی بہ نسبت دوئی غذا ہے، دھوتوں میں ثقیل غذائیں کھا لینا ہوں کہ لکھنؤ میں وہ مہینوں کی بیماری کے لیے کافی ہیں، یہاں صرف ایک آدھ وقت کا غرہ کر دینا کافی ہو جاتا ہے۔“ (حمید-۶۲)

لیکن بایں ہمہ وہاں کی آب و ہوا کا اثر بھی ان کی صحت میں کوئی ایسا نمایاں تغیر نہیں پیدا کر سکتا تھا کہ ان کو صحیح و تندرست کہا جاسکتا، اسی مہینہ اس سے ایک ہفتہ پہلے یکم ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود بمبئی سے ایک خط میں لکھتے ہیں: ”ہاں نسبتاً بہت اچھا ہوں، دو گنی بلکہ چو گنی ترقی ہوئی ہے، تاہم صرف ایک وقت کی گزارہ گئی ہے اور وہ بھی دو توں۔“ (سج-۵۶)

غرض پچیس اور اسہال کے جو دورے اکثر پڑا کرتے تھے، انہوں نے مولانا کی زندگی سے بہت کچھ مایوس کر دیا تھا، چنانچہ ۱۹۱۳ء ہی میں جب لکھنؤ میں اسہال کا دورہ پڑا اور اس سے صحت یاب ہو کر بمبئی تشریف لے گئے تو مولوی عبدالسلام صاحب ندوی ساتھ تھے، چون کہ ضعف سے خود خطوط کا

جواب نہیں لکھ سکتے تھے، اس لیے وہ اس فرض کو انجام دیتے تھے، اسی حالت مایوسی میں ایک دوست کو خط میں لکھوایا کہ: ”اب اسہال کے دورے جلد جلد پڑنے لگے، اس لیے سال دو سال سے زیادہ جینے کی توقع نہیں“ بہر حال وفات سے چند سال پیش تر صرف ایک حباب تھے، جو ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ سکتا تھا، چنانچہ ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب کو ۱۰ جون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں: ”اب بمبئی کے قابل بھی نہیں رہا، یعنی دن بھر دروازے بند رکھتا ہوں، ہوا ذرا خشک ہوگئی ہے تو اس کی برداشت نہیں ہو سکتی، ایک مرتبہ صرف اسی بے احتیاطی سے بخار آچکا، بھائی تیل تمام ہو چکا، بخدا اب مجھ میں کچھ نہیں رہا، غذا ۲۴ گھنٹوں میں سب ملا کر پاؤ بھر، بات کرنا گراں ہوتا ہے، حالانکہ بخار وغیرہ کی کچھ شکایت نہیں۔“ (عبدالباری-۵)

لیکن یابیں ہمہ ضعف و علالت دل و دماغ صحیح تھے، اس لیے دل میں طرح طرح کے علمی مذاق، قومی اور مذہبی دلولے پیدا ہوتے تھے اور جن کاموں کی تکمیل کا ارادہ کر چکے تھے، اس سے کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے لیکن مولوی اسحاق مرحوم کی وفات نے دل و دماغ کو بھی ماؤف کر دیا، اگرچہ اس حالت میں بھی ان کا دماغ عملی تخیلات سے خالی نہ تھا، تاہم اب وہ اپنی زندگی سے کلیئہ مایوس ہو چکے تھے، اور ہر کام کے لیے اپنا جانشین ڈھونڈتے تھے، چنانچہ مرض الموت سے تقریباً ایک مہینہ پہلے مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کے نام ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو جو خط لکھا ہے اس سے اس مایوسی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے: ”دو دن اچھا رہا تو چار دن بیمار رہتا ہوں لیکن بات چیت کرتا رہتا ہوں، لوگ جانتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظام جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سخت سردی لگی، حالانکہ دو پہر کا وقت ہے۔“

”افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے اور اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا، آج سید سلیمان آئیں گے اور کل پرسوں چند طلبہ تکمیل لیکن بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے۔“

اسی زمانہ میں عیداضحیٰ کی تقریب سے ۱۰/۱۰/۱۰ الحجبہ کو اپنے وطن بندول تشریف لے گئے، وہاں سے دوسرے دن پلٹ کر آئے تو اپنے قدیم مرض اسہال و پچیش میں مبتلا ہوئے۔

یہ نومبر کی ۱۷ تاریخ تھی، تین دن تک پچیش اور بوا سیر کا دورہ رہا، ضلع کے اسٹنٹ سرجن کا علاج رہا لیکن کوئی افاتہ نہ ہوا، چوتھے دن لوگوں نے طبی علاج شروع کیا، شہر کے طبیب نے پچیش کا معمولی نسخہ استعمال کرایا، نسخہ کے استعمال سے اس دن ۵۰، ۶۰، دست آگئے اور ایک بار اس قدر خون آیا کہ طشت کا تین

ثلث حصہ خون سے بھر گیا، یہ جسم کی قوت کی پہلی شکست تھی، اس کے بعد ضعف برابر ترقی کرنے لگا۔ جب حالت نازک ہو گئی تو حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی اور حکیم عبدالولی صاحب مرحوم کو لکھنؤ تیار دیا گیا، حکیم اجمل خاں مرحوم نہیں آسکے، اتفاق یہ کہ حکیم عبدالولی صاحب مرحوم خود بیمار تھے اور اسی بیماری میں انہوں نے وفات پائی، وہ لکھنؤ میں مولانا کے پرانے معالج تھے، انہوں نے نسخہ اور تجویز بنا کر اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبدالقوی صاحب کو بھیجا، مگر انہوں نے اس وقت پہنچے جب بیمار ”افاقۃ الموت“ پا چکا تھا۔ مولانا کو اپنی صحت سے پہلے ہی یاس ہو چکی تھی، جب تھوڑی طاقت تھی، اسی وقت سیرۃ نبوی ﷺ کے تمام مسودے اور مینیضے کیڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کر دیے اور عزیزوں کو جو بیمار داری میں تھے، یہ وصیت فرمائی کہ ”یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کیے جائیں، ان دو کے سو کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں“ اس پر بھی سیرت کی نامتھی کا داغ ان کے دل کو رہ کر بے چین کر رہا تھا، آخر وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو حیدرآباد، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور مجھے پونہ، کلکتہ اور دہلی کے پتے سے تار دیے، مولانا ابوالکلام کو جو تار دیا اس کا مضمون یہ تھا، اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی ﷺ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بیکار ہو جائے گی، سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔“ (ابوالکلام-۴۰)

مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا، معلوم نہیں ان کو یہ تار ملا یا نہیں، میں اس وقت بانکی پور میں تھا، مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سر بانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا، پھر زبان سے دوبارہ فرمایا ”اب کیا! اب کیا!“ لوگوں نے پانی میں جو ہر مہرہ گھول کر ایک چھچھو بلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا ”سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو“ میں نے پونہ اس لیے کرنا تھا ان دنوں کن کالج پونہ میں عربی و فارسی کا لکچر تھا، اور کلکتہ کا تار الہلال کے تعلق سے اور دہلی بہار کا ایک گاؤں جو خاک سار کا وطن ہے۔

ثلث حصہ خون سے بھر گیا، یہ جسم کی قوت کی پہلی شکست تھی، اس کے بعد ضعف برابر ترقی کرنے لگا۔ جب حالت نازک ہو گئی تو حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی اور حکیم عبدالولی صاحب مرحوم کو لکھنؤ تار دیا گیا، حکیم اجمل خاں مرحوم نہیں آسکے، اتفاق یہ کہ حکیم عبدالولی صاحب مرحوم خود بیمار تھے اور اسی بیماری میں انہوں نے وفات پائی، وہ لکھنؤ میں مولانا کے پرانے معالج تھے، انہوں نے نسخہ اور تجویز بنا کر اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبدالقوی صاحب کو بھیجا، مگر افسوس وہ اس وقت پہنچے جب بیمار ”افاقۃ الموت“ پا چکا تھا۔ مولانا کو اپنی صحت سے پہلے ہی یاس ہو چکی تھی، جب تھوڑی طاقت تھی، اسی وقت سیرۃ نبوی ﷺ کے تمام مسودے اور مٹیے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کر دیے اور عزیزوں کو جو تیمارداری میں تھے، یہ وصیت فرمائی کہ ”یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کیے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں“ اس پر بھی سیرت کی نامتو کا داغ ان کے دل کو رہ کر بے چین کر رہا تھا، آخر وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو حیدرآباد، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور مجھے پونہ، کلکتہ اور دہلی کے پتے سے تار دیے، مولانا ابوالکلام کو جو تار دیا اس کا مضمون یہ تھا، اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی ﷺ کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بیکار ہو جائے گی، سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔“ (ابوالکلام-۴۰)

مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا، معلوم نہیں ان کو یہ تار ملا یا نہیں، میں اس وقت بائیک پور میں تھا، مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی سے کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سر ہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا، پھر زبان سے دوبارہ فرمایا ”اب کیا! اب کیا!“ لوگوں نے پانی میں جو اہمہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا ”سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو“ میں نے پونہ اس لیے کرنا تھا ان دنوں دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کا لکچر تھا، اور کلکتہ کا تار الہلال کے تعلق سے اور دہلی بہار کا ایک گاؤں جو خاک سار کا وطن ہے۔

نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”ضرور، ضرور!!“

اس کے بعد ان کی حالت روز بروز بلکہ ساعت بہ ساعت نازک تر ہوتی گئی، اسہال خونی اور آخر میں صرف اسہال برابر جاری رہا، آنتوں میں خراش سے زخم ہو گیا تھا، غذا تمام ایامِ عدالت میں متوقف رہی، لاغری و نحافت کا یہ حال ہو گیا کہ پیٹ اور پیٹھ کے جرم میں شاید دو تین انگل کا حجاب ہو، طبی علاج و اہتمام جاری تھا لیکن مولانا نے دوا کے استعمال سے قطعاً انکار کر دیا تھا اور پھر تین روز تک قطعاً دوا نہیں پی، ۱۶ کی شام کو مولانا حمید الدین صاحب بھی تشریف لائے، جن کے لیے مولانا ابتدا سے منتظر تھے، ۷ کی صبح کو مجھے اور انہیں یاد فرمایا، زبان مبارک سے تین مرتبہ ”سیرت! سیرت! سیرت!“ کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا ”سب کام چھوڑ کے۔“

ڈاکٹر محمد نعیم صاحب انصاری جو انصاری طبی وفد ترکی کے ایک ممبر رہ چکے تھے اور ان دنوں جون پور میں مطب کرتے تھے، مولانا کی رحلت سے ۱۲ گھنٹہ پیش تر پہنچ گئے، انہوں نے نہایت توجہ کے ساتھ مریض کا ایک ایک عضو دیکھا اور بہ حالت یاس کہا کہ دماغ کے سوا اور تمام اعضا معطل ہو چکے ہیں اور اب تدبیر بے سود ہے، آخر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ رزی الحجہ ۱۳۳۲ھ کی صبح کو ساڑھے پانچ بجے بروز چہار شنبہ روح نے آخری سانس لی، عزیزوں اور شاگردوں میں جو پاس کھڑے تھے، کہرام برپا ہو گیا، تجھیروں و تکلیفوں کی فکر ہوئی، مقامِ دفن میں لوگوں کا اختلاف تھا، آخر ان کا مسکن ہی جیسی ان کی پیشین گوئی تھی، مدفن بنا، عصر کے وقت لاش ”شبلی منزل“ کے ایک گوشہ میں جہاں آج سے آٹھ برس پہلے ان کے شکستہ پاؤں کے ریزے دفن کیے گئے تھے، سپرد خاک کی گئی، تمام شہر اور اطراف کے مسلمان نماز میں شریک تھے، سرکاری عدالتیں اور شہر کے مشن اور مسلم اسکول بند کیے گئے۔

استاذ بزرگ وار! جا جا اور سایہ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈے گی، لیکن نہ پائے گی لیکن تیرے علمی فیوض و برکات کا منظر ہمیشہ نظر آتا رہے گا:

بعد از وفات تربت مادر زمیں مجو در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما
تمام ملک میں ان کی وفات کی خبر سے شورِ قیامت برپا ہو گیا، ہر طرف سے تعزیتی خطوط اور
تار آنے لگے، اخبارات میں مہینوں ان کا ماتم ہوتا رہا، مضمون نگاروں اور اخباروں کے اڈیٹروں نے ان
کے کارناموں پر بے شمار مضامین اور شعرانے ان کے مرثیے اور تاریخی قطعے لکھے، جو زمانہ تک اخباروں میں

چھپتے رہے۔

مولوی ضیاء الحسن صاحب ندوی یا وایلم کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ وہ اس وقت علی گڑھ میں تھے اور اس وقت تک مولانا کی خبر وفات علی گڑھ نہیں پہنچی تھی، اسی رات کو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ عید گاہ میں ایک بہت بڑی محفل سیرت منعقد ہے اور مولانا وہاں کھڑے ہوئے بیان فرما رہے ہیں، دوسرے روز خبر وفات ملی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

(شبلی)

آل و اولاد

مولانا کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی شادی خود مولانا کے خاندان ہی میں اور گاؤں ہی میں ہوئی تھی، یعنی بندول میں اور اس محل سے متعدد اولاد ہوئی، جن میں بعض نے بچپن ہی میں انتقال کیا اور دو صاحب زادوں نے صاحب اولاد ہو کر مولانا کی زندگی ہی میں وفات پائی، ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا نام رابعہ تھا، دونوں نے اچھی تعلیم پائی تھی، رابعہ بی بی نے ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا، فاطمہ بی بی کے نام مکتیب میں کئی خط ہیں، مولانا ان کو بہت چاہتے تھے، انہوں نے بھی مرضِ دق میں مبتلا ہو کر ۱۹۰۹ء میں وفات پائی، اس وقت مولانا کی اولادِ زرینہ میں صرف حامد نعمانی موجود ہیں، ۱۸۸۰ء ان کی پیدائش کی تاریخ ہے، علی گڑھ میں ایف، اے تک تعلیم پائی، گورنمنٹ میں تحصیلدار (سب ڈپٹی کلکٹر) ہو کر اب پنشن یاب ہو چکے ہیں۔

اس محل نے ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا، ان کے انتقال کے بعد مولانا نے عدم تامل کا ارادہ کر لیا تھا اور پانچ سال تک غیر متاہل زندگی بسر بھی کی، لیکن ۱۹۰۱ء میں جب ایک جگہ جمعیتِ خاطر سے بیٹھنا چاہا تو پاؤں میں ایک زنجیر ڈالنی چاہی، اس لیے دوسری شادی بھی کی، چنانچہ ۱۷ جون ۱۹۰۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ پانچ برس کے تعطل کے بعد میں نے جو تعلق اختیار کیا وہ صرف اس لیے تھا کہ ایک زنجیر پاؤں میں پڑ جائے تاکہ مارا مارا نہ پھردوں۔“ (سج-۳۸)

مولانا کے اس محل سے بھی دو لڑکیاں اور ۱۹۰۴ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن تینوں نے بچپن ہی میں انتقال کیا، اس محل سے جو لڑکا پیدا ہوا تھا، اس سے مولانا کو خاص دل بستگی تھی، چنانچہ ۲ مئی ۱۹۰۴ء کو حیدرآباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں: ”اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو باپ بنایا، کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔“ (مہدی-۱۲)

۱۔ افسوس کہ ان کی یہ جسمانی یادگار بھی جو مدت سے مرضِ قلب میں مبتلا تھی، ۲۰ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو مٹ گئی، جون پور میں جہاں یہ ضرورت ۱۶ مارچ کو گئے تھے، وہیں رات کو یعنی ۱۹ مارچ کا دن گزار کر ۲۰ مئی شب کو وفاتِ انتقال کیا اور لاشِ اعظم گڑھ آ کر شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں دفن ہوئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

لیکن یہ کھلونا بھی ۱۹۰۵ء میں جب مولانا حیدرآباد چھوڑ کر لکھنؤ آ کر رہے تھے، جاتا رہا، لکھنؤ کے محلہ لوالہ گنج میں منشی احتشام علی صاحب کا ایک بڑا محل سرائے تھا، اسی کو کراہیہ پر لے کر مع اہل و عیال رہتے تھے، وہیں یہ حادثہ پیش آیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد اسی سال یہ بیوی بھی مرضِ دق میں مبتلا ہو گئیں، جب حالت بہت غیر ہو گئی تو ان کو اعظم گڑھ لے کر آئے، یہاں پہنچ کر انہوں نے بھی جدائی کا داغ دیا، جس سے مولانا بہت متاثر ہوئے، اس سفر میں مولانا کے ساتھ مولانا ابوالکلام بھی لکھنؤ سے اعظم گڑھ آئے تھے، وہ کہتے تھے کہ بیوی کی وفات پر مولانا بہت بے چین ہوئے اور چیخ چیخ کر روئے۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی شادی نہیں کی اور یہ دس برس تہجد میں بسر کیے۔

اخلاق و عادات

انسان کے جسم کو دیکھا جائے تو وہ دراصل خاک کا ایک تودہ ہے، اس کی اصلی زندگی اس کے اچھے اخلاق اور عادات ہی سے ہے، مولانا کی پیدائش ایک آسودہ خاندان میں اور ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جس میں ان کے پھسلنے اور بہکنے کے کئی مواقع تھے، مگر انہوں نے تعلیم و تربیت کی اس دشواری کو بخیر و خوبی طے کیا اور فرماتے تھے کہ یہ برکت ان کو اپنی والدہ ماجدہ کے بدولت حاصل ہوئی، وہ بہت نیک، عبادت گزار، سحر خیز اور وقت کی پابند تھیں، مولانا نے یہ سبق ان سے بہت کچھ سیکھا۔

مولانا کا شب و روز کا پروگرام | مولانا صبح سویرے ۴ بجے کے قریب اٹھ بیٹھتے تھے، پہلے تو یوں ہی بستر پر پڑے پڑے قرآن پاک کی کچھ آیتیں جو ان کو یاد آجاتیں، جن کے ساتھ زور زور سے پڑھتے تھے، پھر حماسہ کے دو چار عربی اشعار ادھر ادھر سے گاتے تھے، ذرا مطلع صاف ہوا تو پاس ہی چائے کا چاہا جو مٹی کے تیل سے جلتا تھا، رکھار ہتا تھا، خود اٹھ کر اس کو روشن کرتے اور چائے کا پانی اس پر رکھ دیتے تھے، ساتھ لوٹے میں پانی اور طشت رکھار ہتا تھا، اس سے وضو کر کے نماز سے فرصت کر لیتے تھے، اسی وقت چائے بھی پی لیتے تھے، ان کو قبض کی شکایت ہمیشہ رہتی تھی، اس لیے بیت الخلاء میں جا کر دیر تک بیٹھتے تھے، اسی لیے وہ بیت الخلاء ہمیشہ غیر مشترک چاہتے تھے اور رکھتے تھے اور وہ بھی نہایت صاف ایسا صاف کہ وہاں اخبارات ساتھ لے جاتے تھے اور وہیں پڑھتے تھے کہ یہ وقت بھی ضائع نہ ہو، حاجت ضروری سے فارغ ہو کر لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے تھے، آٹھ نو بجے تک اس سے فارغ ہو جاتے تھے، ضروری خطوں کا جواب بھی وہ اسی وقت لکھ لیتے تھے، یہ وقت ان کی پوری تنہائی کا ہوتا۔

اس کے بعد وہ کتب بینی میں مصروف ہو جاتے تھے، کوئی باہر سے یا اور کوئی ممتاز آدمی آگیا تو مل بھی لیے، مگر وہ اس وقت خوش دلی سے نہیں ملتے تھے، لکھنؤ میں جب تھے تو پچھانک پر ایک نوٹس لگا رکھا تھا کہ کوئی صاحب ۱۰ بجے سے پہلے ملنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔

اسی وقت نو دس ۱۰ بجے کے قریب وہ کھانا بھی کھا لیتے تھے، اب ۴ بجے شام تک وہ الٹ پلٹ کر کتابیں دیکھا کرتے جو آئینہ لکھنا ہوتا، اس کا مواد تلاش کرتے، ضروری مقامات پر نشانات لگا دیتے، ۴ بجے کے بعد سے احباب، طلبہ اور ملنے والوں کی آمد ہوتی، نشست بالکل سادہ تھی، ایک دو

کریاں، باقی دس بارہ موڈھے، ایک کھڑی چارپائی جس پر وہ خود بیٹھتے تھے، لوگ ادھر ادھر بیٹھ جاتے تھے، بڑی شگفتہ اور با معنی مجلس ہوتی تھی، اس وقت وہ بلبل ہزارداستان بن جاتے تھے، عموماً مغرب تک یہ مجلس قائم رہتی تھی اور کبھی مغرب کے بعد تک بھی، رات کا کھانا عام طور سے مغرب کے آگے پیچھے وہ کھا لیتے تھے اور رات کو نوبے وہ سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے، سونے کے لیے یہ اہتمام تھا کہ اپنے پاس اتنی دور تک کہ سونے والے کے خرائے کی آواز سنائی دے، کسی کو سونے نہیں دیتے تھے، باہر والوں کی نقل و حرکت ناگوار ہوتی، وہ گھڑی ٹائمیں پس رکھتے تھے، اس کی ٹک ٹک کی آواز بھی ان کی نیند میں خلل انداز ہوتی تھی، اس لیے یا تو اس کو بھی دور رکھواتے تھے، یا بند کر دیتے تھے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک موقع پر میران کا شب کو ایک کمرے میں سونا ہوا تو فرمایا: ”آج عمر میں یہ پہلا اتفاق ہے، بالآخر دوسرا کمرہ تجوڑ ہوا۔“

شکل و شمائل | قد بلند و بالا تھا، پیشانی چوڑی، آنکھیں بڑی، ناک لمبی کھڑی، دہانہ بڑا، چہرہ لمبا، رنگ گندمی، ہاتھوں کی انگلیاں لمبی، بھویر گھنی اور لمبی، گردن اونچی، سر کے بال چھوٹے رکھتے تھے، مونچھیں چھوٹی، لبوں تک، داڑھی، نہ لمبی نہ چھوٹی، درمیانی، بال قبل از وقت پک گئے تھے، اور ستاون برس کی عمر میں وہ بالکل سن سپید ہو گئے تھے۔

وہ اپنی جوانی میں بہت توانا و تومند تھے، کہتے تھے کہ گھونے سے وہ اینٹ توڑ ڈالتے تھے، کرسی کو ایک پایہ پکڑ کر اٹھا لیتے تھے، پنجے بڑے مضبوط تھے، پنجہ کشی کی مشق کبھی نہیں کی تھی، اس پر یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پنجہ کش ان کا پنجہ نہیں پھیر سکتے تھے، شجاعت اور پہلوانی کے قصوں اور کارناموں سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اس لیے وہ مغل بادشاہوں کے بڑے دلدادہ تھے اور ان کی شجاعت اور بہادری کے قصے بڑے جوش و خروش سے بیان کیا کرتے تھے، گو وہ خود کشتی کبھی نہیں کھیلتے تھے لیکن وہ پہلوانوں کی کشتی اور دنگل دیکھنے کے شائق تھے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی فرماتے تھے کہ میں نے ان کو سب سے پہلے علی گڑھ کی نمائش میں دنگل میں دیکھا، نواب منزل اللہ خاں مرحوم نے جو ساتھ تھے، بتایا کہ: ”یہی مولوی شبلیؒ ہیں“ تو وہ فرماتے تھے کہ ”مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مولوی اور دنگل“ الہ آباد کی ۱۹۱۲ء والی بڑی نمائش میں رستم ہند غلام پہلوان اور دوسرے پہلوانوں کی جو مشہور کشتی ہوئی تھی، اس میں وہ شریک تھے اور وہ بھی ان لوگوں میں تھے، جنہوں نے غلام کو تمنے پہنائے تھے۔

ان کی پیشانی کی رگ اور پٹھے جلد جلد حرکت کرتے رہتے تھے، ہم نے یہ بڑھاپے میں دیکھا، مولوی حمید الدین صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب مولانا کا شباب تھا تو پورے سر کی رگوں اور پٹھوں میں اتنی تیزی سے حرکت ہوتی رہتی تھی کہ لکھنؤ کے کام کی دو پلٹری ٹوپی جو وہ اس زمانہ میں پہنتے تھے، وہ تھوڑی دیر میں سر سے جھک جاتی تھی اور کبھی نیچے گر پڑتی تھی۔

لباس | ان کا لباس جب سے میں نے دیکھا یہ تھا، مونے لملل کا کرتا، جس سے بدن نمایاں نہ ہو، کسی قدر چوڑی مہری کا سپید چھالٹی کا پاجامہ، ڈھیلی شروانی جس کو وہ باہر نکلنے میں پہنتے تھے، پاؤں میں دلی کا معمولی کام کا سرخ سلیم شاہی جوتہ، پاؤں کے حادثہ کے بعد ایک مصنوعی پاؤں لگانے کے سبب سے جب پاؤں لگاتے تھے تو بوٹ پہن لیتے تھے، سر پر اوئی یا سادہ کپڑے کی سیاہ ایرانی ٹوپی، بڑکی کے سفر پر بھی جب نکلے تھے تو وہ اسی قسم کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور اسی لیے عربوں نے انہیں شیعہ سمجھا۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ: ”میں نے جس زمانہ میں سب سے اول دنگل میں ان کو دیکھا تو سر پر سیاہ نخل کی گول ٹوپی تھی، اس کی باڑھ سادہ اونچی تھی، اوپر کا حصہ گول چین دار تھا، عرصہ تک یہ ٹوپی استعمال فرماتے رہے، شروانی زیب تن تھی۔“

جاڑوں میں وہ روئی دار بٹنی اور روئی دار ڈگلا پہنتے اور کندھوں پر کشمیر کا شالی رومال رکھتے تھے، جس کو گلے سے لپیٹ لیتے تھے، جاڑوں میں نکلنے تو سرج کا پاجامہ پہنتے، عجیب بات ہے کہ گرمیوں میں بھی وہ تو شک بچھاتے تھے اور رضائی پانتانے رکھی رہتی تھی۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں: ”سردی میں کوئی رزائی گرم نہ تھی، حبیب گنج کے قیام میں پہلی شب کو سہاری رزائیاں اوڑھائی گئیں، سردی کی شکایت رہی، دوسرے دن خاص طور پر ڈھائی سیر روئی کا لحاف تیار کیا گیا، جب چین آیا، حبیب گنج سے بھیکم پور نواب منزل اللہ خان مرحوم کے یہاں گئے تو شب کو وہی لحاف طلب ہوا، اسی کے ساتھ کوئی پانی ان کے واسطے ٹھنڈا تھا، صراحی کا باسی پانی بھی پاس نہ ہوا، برف دیہات میں موسم سرما میں تھی نہیں، فرماتے تھے میرا داغ گرم ہے، جسم سرد ہے، یہ میرے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ یہ اجتماع ضدین کیا ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔“

وہ عام طور سے سر پر عمامہ نہیں باندھتے تھے، مگر قومی جلسوں اور تقریبوں میں وہ زرد ریشمی کام کا عزیز اللہی عمامہ اور عمدہ مدنی عبا زیب تن کرتے تھے اور اسی لیے ان کے پاس کئی کئی عبائیں اور

عمامے رہتے تھے، مگر ان سے قرینہ سے عمامہ بندھتا نہ تھا، ان کے استاد مولانا فاروق صاحب کا بھی یہی حال تھا، وہ عمامہ کیا بندھتے تھے، سر پر اٹنے سیدھے اس کو پلیٹ لیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم ان سے تو اچھا بندھتے تھے، مگر ٹچ ٹھیک نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ ندوہ میں کوئی تقریب تھی، مولانا قیمتی ریشمی کام کا عمامہ بندھ کر آئے تھے، اتفاق سے راقم بھی سوتی ململ کا صافہ بندھ کر حاضر ہوا، فرمانے لگے ’’دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے، مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہے اور تمہارا چھپکے کا صافہ ہے، مگر اس قرینے سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے۔‘‘

طعام : کھانے کے شائق تھے لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ امرا کی طرح متنوع اور متعدد لذیذ کھانوں کے دلدادہ تھے، فرماتے تھے کہ ’’کھانے کی عمدگی کے یہ معنی ہیں کہ عمدہ پکا ہوا ہو، میں عمدہ پکی ہوئی دال کھا سکتا ہوں اور برابریکا ہوا گوشت نہیں کھا سکتا۔‘‘

کھانے میں نمک تیز پسند تھا، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے تھے اور کھانے میں ڈالتے جاتے تھے، شیرینی بہت مرغوب تھی اور اس کے لیے کسی قسم خاص کی ضرورت نہ تھی جو بھی ہو اور جیسی بھی ہو، فرماتے تھے کہ ’’شیرینی کے لیے صرف بیٹھا ہونا کافی ہے‘‘ ایک دفعہ نواب علی حسن خاں صاحب کے عزیز خواجہ رشید الدین صاحب عرف ایٹھے صاحب نے مولانا کے لیے چوگئے شکر کے بیٹھے چاول پکوائے، کھاتے وقت مولانا سے پوچھا کہ ’’مولانا بیٹھا تو ٹھیک ہے؟ چوگئی شکر چھوڑی ہے‘‘ مسکرا کر فرمایا یہ کون کہتا ہے کہ شکر میں بیٹھا اس ہوتی ہے۔‘‘

مولانا شردانی فرماتے ہیں ’’ایک بار ندوہ کے اجلاس سے واپسی میں بریلی سے علی گڑھ مولانا کی ہمراہی ہوئی، میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر بیٹھائی خریدی، چکھی، خواہ اچھی تھی یا ناقص، میں نے استعجاب ظاہر کیا تو فرمایا مٹھائی ہے، شیرینی کے متعلق لطیفے خوب خوب یاد تھے، ایک موقع پر فرمایا کہ ایک دوست نے دوسرے شیرینی پرست دوست کو مدعو کیا تو انہوں نے کہا یا رکھ لیا کھلاؤ گے، کہا بہت اعلیٰ بیٹھے چاول، گھر آ کر باورچی طلب ہوا، باصرار شیرینی کی مقدار بڑھائی گئی، چوگنا بیٹھا پڑا، فخر سے کھلایا، تم طعام پر داد چاہی تو جواب ملا، جتنے چاول تھے، اسی قدر پھیکا س تھا۔‘‘

بنارس کے قیام میں ایک روز دو پہر کو سخت لو کے وقت ملاجی میرے رفیق اور اپنے ندیم سے فرمائش کی کہ گئے کی گنڈیریاں بازار سے لاؤ، انہوں نے کہا کہ ایسی دھوپ میں فرمایا، بڑا لطف رہے گا،

ملا جی گئے، گنڈیریاں لائے، دونوں نے مل کر کھائیں، لطف کی باتیں ہوئیں“ ع خنبائے شیریں بہ از قند بست“

رساؤل بہت شوق سے کھاتے تھے اور اس اہتمام سے پکواتے تھے کہ مصنوعی طریقوں سے اس کو صاف کروانا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ اس سے اس کی طبعی میٹھاس کم ہو جاتی ہے، اسی لیے رساؤل میں بالائی یا دودھ نہیں ملاتے تھے، ایک دفعہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے ان کے پاس رساؤل بھیجی اور اودھ کے مذاق کے مطابق اس میں بالائی ملا دی ملاقات ہوئی تو فرمایا تم نے تو رساؤل کو غارت کر دیا، بالائی سے تو پھیکھی ہو جاتی ہے۔

مصری کے ڈلے چبایا کرتے تھے، بیٹھے بیٹھے انگریزی شکر کے ایک ایک دانے منہ میں ڈالا کرتے تھے اور بیکاری کے اوقات میں یہ ان کا لذیذ ترین مشغلہ تھا، پیشاب میں شکر آتی تھی، طیب، ڈاکٹر اور احباب اس طرح شکر کھانے سے روکتے تھے، مگر وہ نہیں مانتے تھے، ایک دفعہ نواب سید علی حسن خاں صاحب اور اچھے صاحب فرماتے تھے کہ مولانا بیمار تھے تو ہم لوگ دیکھنے کے لیے گئے، سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے تھے، منہ بھی بند تھا، مگر کچھ دانوں کے چلنے کی آواز آتی تھی، پوچھا آپ کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا ”کچھ نہیں لحاف الٹا تو دیکھا کہ سینہ پر شکر کی ایک ٹشتری رکھی ہے اور وہ ذرا ذرا اس کو کھا رہے ہیں، ہم نے عرض کی، اس حالت میں شکر سے پرہیز فرمائیے، فرمایا ”تو پھر جی کر کیا کروں گا۔“

چائے وہ دن رات میں کئی دفعہ پیتے تھے لیکن صبح کو جب سویرے اٹھتے تھے تو اس وقت ملازم کو تکلیف نہیں دیتے تھے، بلکہ خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا لیتے تھے، چائے کی پیالیاں چھوٹی ہوتی تھیں، عموماً سادی چائے پیتے تھے، فرماتے تھے ”چائے میں دودھ کی آمیزش انگریزوں کی بدعت ہے۔“

کھانے میں عمدہ پکا ہوا صرف ایک قسم کا سالن ہوتا تھا اور اس کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے، وہی ضرور ڈلواتے تھے، باورچی کے ہاتھ کا سالن پسند نہیں آتا تھا تو اپنے سامنے منگوا کر اپنے ہاتھ سے گوشت بھونتے تھے، سامنے لوہے کا چولہا یا آتش دان رکھ لیتے اور اس پر دیکھی رکھ کر گوشت بھونتے تھے، کھانے میں سادہ پیاز شوق سے کھاتے تھے، مرچوں سے گھبراتے تھے، فرماتے تھے ہر مزہ میں شدت مرغوب، مگر مرچ، باقی دال اور روٹی جو ندوہ کے باورچی خانہ میں عموماً پکا کرتی تھی، وہی مولانا کے دسترخوان پر بھی نظر آتی تھی، بمبئی میں ضعف معدہ کی وجہ سے چوکر کی پاورٹی منگوا کر تے تھے اور

اخیر میں تو صرف تو س ہی کھایا کرتے تھے، کبھی کبھی بیٹھے چاول بھی پکواتے تھے، پڈنگ بھی نہایت پسند تھی اور بمبئی میں اکثر کھاتے تھے، فصل میں آم بہ شوق کھاتے تھے، برف کی قلفیاں بھی کھاتے تھے لیکن اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے، ایک بار برف کی قلفیاں بکنے کو آئیں تو خریدنا چاہی، کسی نے کہا اچھی نہیں ہیں، فرمایا ”منہ تو بہر حال ٹھنڈا ہو جائے گا“ پانی ہمیشہ ٹھنڈا پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ جاڑوں میں بھی برف استعمال کرتے تھے، نازہ اچھے گھی کے بہت شائق تھے، وطن آتے تھے تو اس کی فرمائش کرتے تھے، لکھنؤ میں لکھنؤ کے آس پاس کے رہنے والے شاگردوں سے ان کے گاؤں سے فرمائش کر کے گھی منگواتے تھے، مولوی مسعود علی صاحب گھی اور رسا دل کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، بمبئی میں گھی اچھا نہیں ملتا تو باہر سے ڈاک سے اچھا گھی دوستوں اور عزیزوں سے فرمائش کرتے تھے، یہ شوقِ اخیرِ اخیر تک قائم رہا، بمبئی سے ۱۸ مئی ۱۹۱۳ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو مظفر پور لکھتے ہیں ”اگر آپ صرف سیر بھرتازہ اور عمدہ گھی بھیجیں تو میں ممنون ہوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ اگر سیر بھر سے ایک ماشہ بھی زیادہ ہو تو گستاخی معاف ہو، مگر واپس کر دوں گا اور تازگی کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کو بنے ہوئے دو تین روز سے زیادہ عرصہ نہ گزر راہو، یہاں گھی کے سوا ہر چیز ہلتی ہے، میں نے وطن کی مختلف قراہتوں میں بھی فرمائش بھیج دی ہے، مگر مقدار وہی مقرر کی ہے جو آپ سے کی ہے۔“ (ریاض-۲۲)

بمبئی میں اچھا گھی نہیں رہتا تھا تو تازہ کھن لے کر اس کا گھی بنا لیتے تھے۔

دولت کی بے قدری | مولانا نے جس ماحول میں زندگی بسر کی اس کا قدرتی نتیجہ تو یہ تھا کہ وہ دولت، عزت، شہرت، حکومت اور شان و شوکت وغیرہ کے اسی قدر دلدادہ ہوتے، جتنا ایک دنیا دار آدمی ہو سکتا تھا، غور کرو، ایک ایسا شخص جس نے ایک آسودہ خاندان میں پرورش پائی ہو جو ایک صاحب اقتدار زمین دار ہو، جس کے باپ، جس کے بھائی اور جس کے عزیز و اقارب و وکیل، بیرسٹر اور اعلیٰ سرکاری عہدہ دار ہوں اور انگریزی طریق پر بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہوں، جس نے علی گڑھ میں سولہ برس تک قیام کیا ہو اور اس کی نگاہ سے دنیاوی جاہ و جلال کے تمام مناظر گزر چکے ہوں، جو مدتوں حیدرآباد کے امرا کی سوسائٹیوں میں زندگی بسر کر چکا ہو، اس کے دل میں دنیوی جاہ و جلال، دنیوی نام و نمود اور دنیوی عیش و عشرت کے علاوہ اور کون سا خیال پیدا ہو سکتا تھا۔

لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی دنیاوی آرائش و آسائش کی طرف ان کو متوجہ نہ کر سکی، انہوں

نے عام طور پر اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے چند دنوں نقل نویسی اور امانت کا کام کیا، جس کی تنخواہ نہایت کم تھی، امانت کی ملازمت میں دیانت کی بدولت جو مصیبتیں اٹھائیں ان کو لطف سے بیان فرماتے تھے، چند روز وکالت کی اور آمدنی کے لحاظ سے ان کا وہی حال رہا جو ایک نئے وکیل کا ہو سکتا ہے، علی گڑھ میں ملازمت کی تو ابتدائی تنخواہ چالیس روپے ماہوار قرار پائی اور ۱۶ برس کی مدت میں بتدریج سو روپیہ تک پہنچی، اسی تنخواہ میں ایک بچہ ایک بھائی ایک معلم دونوں کو اور خود مولانا کے مصارف شامل تھے اور ایک بنگلہ میں رہتے تھے، تعجب ہوتا ہے کہ اس قلیل رقم میں وہ اتنی صاف ستھری زندگی کیوں کر بسر کرتے تھے، علی گڑھ سے قطع تعلق کیا تو حیدرآباد سے جو وظیفہ مقرر ہوا، اس کی مقدار بھی اس سے زیادہ نہ تھی، بعد کو وہ اگرچہ حیدرآباد میں چند سال کے لیے بمشاہرہ پانچ سو ماہوار ملازم ہو گئے تھے لیکن اس میں بھی وہ ایک معقول رقم والد کے قرضہ میں نکل جاتی تھی اور بقیہ وہاں کی کثیر المصارف زندگی کی نذر ہوتی تھی، حیدرآباد سے مستعفی ہوئے تو پھر وہی سو روپیہ کا وظیفہ جاری ہو گیا، اخیر میں اگرچہ اس میں دو سو کا اور اضافہ ہو گیا تھا لیکن موت نے ان کو اس سے ایک سال سے زیادہ متمتع ہونے کا موقع نہیں دیا اور وہ بھی زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوا۔

ان کے خاندان اور سسرال کی دو تین ہزار کی جائیداد بھی تھی، مگر کبھی انہوں نے اس سے اپنا حصہ لینا پسند نہیں کیا اور ہمیشہ اپنی ہی کمائی کی روٹی پر قناعت کی، اسی طرح اپنی کتابوں کی آمدنی سے بھی انہوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، جب تک علی گڑھ میں رہے، ان کی تالیفات کا لُج کی نذر ہوتی رہیں، یعنی اسی نے ان کو چھپوایا اور اسی نے منافع حاصل کیا، حیدرآباد گئے تو ان کی کتابیں سررشتہ علوم و فنون کی ملکیت رہیں، ان کی ذہانت کو ان سے کوئی تعلق نہیں رہا، جب ۱۹۰۵ء میں ندوہ آئے اور سوانح مولانا نے روم، موازنہ اور شعر العجم چھپیں تو ان کے زمانہ میں شاید ان کی لاگت نکل آئی ہو تو نکل آئی ہو، اس زمانہ میں اگر ان کو فائدہ ہوا تو یہ ہوا کہ ایک کتاب کی فروخت سے جو کچھ ہاتھ آتا وہ دوسری کتاب کی چھپائی میں خرچ ہو جاتا۔

امتحانات کے پرچوں سے بھی ان کو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، مگر وہ ضروریات ہی میں صرف ہو جاتی۔

حیدرآباد کے بعد بے سہارے ندوہ آکر بیٹھ جانا ایسا واقعہ تھا کہ ”علی گڑھ پارٹی“ کے لوگ اس کو خود کشی کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اس وقت مولانا کے لیے حصولِ معاش کے میسوں دروازے

کھلے ہوئے تھے، بالخصوص علی گڑھ کالج تو ان کے لیے بالکل چشمِ براہ تھا اور نواب محسن الملک مولانا کوہر قسم کی ترغیبات دے کر کالج میں بلانا چاہتے تھے، چنانچہ جب مولانا نے حیدرآباد سے الگ ہو کر ندوہ میں آنا چاہا تو نواب صاحب نے لکھا کہ فوراً کالج میں چلے آئیے، حیدرآباد کا سابق وظیفہ بھی جاری ہو جائے گا اور ۱۰۰ روپیہ کالج سے بھی ملیں گے لیکن مولانا نے اس کو نا منظور کیا، اس کے بعد ہزہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کی طرف سے ان کو بھوپال جانے کی ترغیب دی لیکن یہ افسوس بھی کارگر نہ ہو سکا، ندوہ میں آنے کے بعد انہوں نے مولانا کا پیچھا نہیں چھوڑا، چنانچہ جب کالج میں عربی کی ایک اعلیٰ کلاس کھولی گئی اور اس کے لیے ایک مشہور جرمن مستشرق یوسف ہارویز بلائے گئے تو نواب محسن الملک نے مولانا کو دو سو روپیہ ماہوار پران کی اسسٹنٹی کے لیے بلایا لیکن مولانا نے صاف لکھ دیا کہ

ع ”شاخ بریدہ را نظر سے بر بہار نیست“

حیدرآباد میں علومِ مشرقیہ کی یونیورسٹی قائم ہوئی تو نظامت کے لیے بمشاہرہ معقول مولانا کا نام پیش ہوا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور ایک خط میں لکھا ”یونیورسٹی کی نظامت مجھ کو دیتے ہیں، مشاہرہ بھی معقول ہے لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں۔“ (مہدی-۴۷)

بہر حال اگر مولانا کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو سو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ ایک ایسی رقم ہے جو مولانا کے کمالات کے سامنے بالکل پیچ ہے، سادہ زندگی کی وجہ سے اگر چہ ان کے ذاتی مصارف کچھ زیادہ نہ تھے تاہم انہوں نے کبھی بدچشتی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی، ایک دو ملازم ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے تھے، کپڑے متوسط درجے کے پہنتے تھے، کھانے کے شوقین تھے، یعنی بد مزہ کھانا وہ کبھی نہیں کھا سکتے تھے، قلمی کتابوں کا شوق الگ تھا، ایک ایک کتاب کے سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیے وہ دے ڈالتے تھے، بڑے بڑے چندے بھی دیتے تھے، قومی اور علمی کاموں کے لیے اکثر اپنے کرایہ سے سکند کلاس میں سفر کرتے تھے، بلادِ اسلامیہ کے سفر کے کل مصارف خود برداشت کیے اور کسی سے اس میں ایک چہ کی مدد قبول نہیں کی، اخیر میں تبدیل آب و ہوا اور ترقیِ صحت کے لیے ہر سال بمبئی چار پانچ مہینہ قیام کرتے تھے اور اس حالت میں ان کے مصارف بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے، ان اسباب سے ان کی مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہتی تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار حیدرآباد سے وظیفہ آیا اور انہوں نے اسی وقت اس کو ضروری مصارف میں خرچ کرنا شروع کیا، اخیر میں صرف چند روپیہ رہ گئے

تو دبی زبان سے فرمایا کہ ”یہ رقم کافی نہیں ہوتی“ اگر اتفاق سے کبھی روپیے زیادہ بچ جاتے تو ان کو یوں ہی بے گنے ایک چھوٹے سے آفس بکس میں ڈال دیتے اور اس میں سے نکالتے رہتے اور جب کچھ نہ رہتا تو سمجھ لیتے کہ سب خرچ ہو گیا اور وہ اس باب میں ایسے سادہ تھے کہ ان روپیوں میں سے کوئی دوسرا نکال لیتا تو ان کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی، ایک دفعہ مولانا کے ایک عزیز طالب علم جو ان کے پاس ندوہ کے قیام کے زمانہ میں آتے جاتے رہتے تھے، کئی مہینہ تک اس میں سے نکالتے رہے اور مولانا کو کچھ پتہ نہ چلا، آخر میں اس میں سے ایک گنی نکال لی جو اس میں رکھی ہوئی تھی تو احساس ہوا، روپیے، پیسے، نوٹ یوں ہی بے قدری سے فرش پر ڈال دیتے تھے، کتابوں میں رکھ دیتے تھے، وہ گم بھی ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ مولانا پٹنہ گئے، اتفاق سے میں بھی وہیں تھا، ملنے گیا تو فرمایا ”رات چھروں نے بہت دق کیا، کسی پتلے کپڑے کی ایک چادر سلوادو“ یہ کہہ کر روپیہ دیا، میں شام کو کپڑا خرید کر اور چادر سلوا کر لایا تو وہ موجود نہ تھے، میں نے ان کے بستر کے سر ہانے چادر رکھی اور ایک کاغذ پر اس کا حساب لکھ کر رکھ دیا اور باقی پیسے بھی وہیں رکھ دیے، دوسرے دن ملنے گیا تو مال کا اظہار کیا کہ تم کو ایک روپیہ کے حساب لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

شروع شروع میں جب وہ ندوہ آئے ہیں تو مدرسہ گولہ گنج کے ایک مکان میں تھا، اس کی سب سے بالائی چھت پر ایک کمرہ تھا، جس کی لمبائی چوڑائی ۱۰×۳۰ فٹ ہوگی، مولانا کا پورا اثاثہ یہیں تھا، یہی خواب گاہ، یہی ملاقات کا کمرہ، یہی دارالاطالعہ، یہی کھانے کا کمرہ اور یہی مہمان خانہ، سب تھا، ایک طرف پٹنگ پر بستر تھا، باقی درمی تھی، جس پر وہ خود اور آنے جانے والے بیٹھتے تھے، مجھے بار بار حیرت ہوتی کہ وہ ہستی جس کے آوازہ سے سارا ہندوستان معمور ہے، وہ کیوں کر ایک چھوٹے سے کمرہ میں زندگی گزار رہا ہے اور اس خوبی سے کہ خود باغ و بہار، جو پاس بیٹھے وہ بھی شگفتہ ہو کر جائے۔

اور ان کا اثاثہ کیا تھا، بستر اور کپڑوں کا ایک بکس، چائے کا مختصر سامان، لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور دو کرسیاں، باہر کچھ موندھے اور بس، غرض ان کی زندگی گویا حدیث نبوی ﷺ

کن فی الدنيا كانك غريب او كعابر دنیا میں ایسے رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ سے

گزر رہے ہو۔

سبیل (ترندی)

کے مطابق تھی۔

استغنا اور بے نیازی | قدیم علما کی ایک بڑی خصوصیت بے نیازی تھی اور مولانا میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر پائی جاتی تھی، آپ پیچھے بڑھ آئے ہیں، کالج سے علاحدہ ہونے کے چند روز بعد امیر عبدالرحمن خاں والی کا بل کہ جب ترجمہ ابن خلدون کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اس کے لیے ایک معقول رقم یعنی دس ہزار روپیہ صرف کرنا چاہا اور اپنے سفیر ہندوستان کو اس کی اطلاع دی اور سفیر موصوف نے اس کے لیے مولانا سے خط و کتابت کی تو مولانا نے صاف انکار کیا، امیر صاحب نے نہایت وسیع پیمانہ پر کلکتہ میں ایک دارالترجمہ قائم کرنا اور مولانا کو اس کا سرکیریٹری مقرر کرنا چاہا تو مولانا نے اس عہدے کو بھی قبول نہیں کیا۔ حیدرآباد میں چند سال کی ملازمت بھی جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، مجبوراً اختیار کی تھی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ”گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا ورنہ میں اپنے گوشہ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔“ (مکاتیب سبج-۴۷)

یہی وجہ ہے کہ جب حیدرآباد میں سیاسی تغیر ہوا تو بہ جائے اس کے کہ وہ اپنے لیے کسی قسم کا جوڑ توڑ کرتے، نہایت خوشی کے ساتھ اس تعلق کو چھوڑ کر غربانہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس کی نسبت خود لکھتے ہیں ”میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر و نردنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپیے ہیں، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا اس سے غربانہ زندگی خاصی طرح بسر ہو سکتی ہے۔“ (مکاتیب اسحاق-۱۹)

مولانا جس طرح مال و دولت سے بے نیاز تھے، اسی طرح جاہ و شہرت کی بھی ان کو ہوس نہ تھی، جاہ و عزت کا سب سے بڑا مرکز علی گڑھ تھا لیکن انہوں نے علی گڑھ کالج پر غریب ندوہ کی خدمت کو ترجیح دی، خود ندوہ میں سب سے بڑی چیز نظامت تھی، جس کے لیے اور بھی بہت سے مدعیان توکل و قناعت مدتوں امیدوار رہے لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مولانا نے کبھی نظامت کی خواہش نہیں کی اور ہمیشہ وزیر بن کر کام کرنا چاہا، یہ سچ ہے کہ ندوہ میں وہ تمام کام اپنے نام سے کرتے تھے، جس سے بعض لوگوں کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ نام و نمود کے لیے کر رہے ہیں لیکن درحقیقت اس کے دو سبب تھے، ایک تو یہ کہ ان کاموں کی طرف ان ہی کو توجہ پہلے ہوتی تھی، وہی ضرورت محسوس کرتے تھے، پھر دوسروں کو متوجہ کرتے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ان کی حیثیت اصل محرک کی اور دوسروں کی مویڈ کی ہوتی تھی۔

دوسری بات یہ تھی کہ دنیا اس قدر ظاہر پرست واقع ہوئی ہے کہ جب تک کوئی تحریک کسی ممتاز

آدمی کی طرف سے نہیں اٹھتی، اس کی طرف توجہ نہیں کرتی، مولانا بار بار تجربہ کر کے اس کو دیکھ چکے تھے، اس لیے مجبور اپنے کو آگے رکھتے تھے۔

ندہ کی مخالفتوں کے زمانہ میں اشاعت اسلام کے سلسلہ میں ایک دفعہ میں نے جرأت کر کے مولانا کو لکھا کہ ان خطوں میں ان کے بہ جائے کسی دوسرے رکن انتظامی کا نام لکھ دیا جائے تو اچھا ہے تاکہ مخالفتوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ ہر کام میں اپنے ہی کو آگے رکھتے ہیں، اس پر جواب آیا، لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس سے چھپے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرمائش آنکھ سے دیکھتا ہوں اور زبان سے ہر وقت ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق الہلال میں خط تک چھپوایا، جب کوئی نہ کرے تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور افسری کا شوق نہیں، کوئی کرے اس کے ساتھ ہوں، اور پیرو بن سکتا ہوں۔“

اسی خط میں لکھتے ہیں ”تم کہتے ہو کہ بہ جائے اپنے مشیر حسین یا نواب علی حسن خاں کا نام لکھوں، وقف اولاد کے متعلق ابتدا میں نے خود اشتہار دیا تھا کہ جو چندہ بھیجا جائے نشی احتشام علی کے پاس بھیجا جائے، صرف آٹھ روپیے ان کے پاس آئے، پھر اچھے صاحب کے نام سے انگریزی کاغذات بھیجے، ایک شخص نے الٹ کر جواب نہیں دیا، مشیر حسین وغیرہ کا نام لکھ کر دیکھ لو، ایک درجن آدمی بھی جواب نہ دیں گے، تجربہ کرو تو معلوم ہو جائے گا، تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے نام کے لیے ہر کام میں اپنا نام رکھتا ہوں، لیکن تجربہ کر کے ایسا کرنا پڑتا ہے۔“ (۴۰)

اخیر زندگی میں جس کے چند ہی روز کے بعد انہوں نے وفات پائی، اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا کہ ضرورت اس کی تھی کہ دارالمصطفین کے لیے چند لوگ یک جا ہو جاتے لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق گزرتی ہے:

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع بس بادشاہی کنم در گدائی“

کتنے مؤثر فقرے ہیں۔

خودداری | مولانا اگر چہ مغرور نہ تھے، تاہم وہ فطرۃً سخت خوددار تھے اور جب ان کو کوئی کام خودداری کے خلاف کرنا پڑتا تھا تو ان کو سخت صدمہ ہوتا تھا، ابتدائی زمانہ میں ان کو امانت و نقل نویسی کے کام سے خلاف مذاق ہونے کے علاوہ اس بنا پر بھی عار و شرم محسوس ہوتی تھی کہ وہ اس کو اپنی خودداری اور عزت

۱ ترک خدمت و نوکری۔ ”س“

نفس کے خلاف سمجھتے تھے، نقل نویسی کی تنخواہ ان کو ۱۰ روپیہ ماہوار ملتی تھی، جس کی نسبت فرماتے تھے کہ جب اس کا تصور کرتا تھا تو مجھے رونا آتا تھا، کچھریوں کے معمولی ملازم عموماً پیدل جایا کرتے تھے لیکن مولانا نے اس حالت میں بھی اپنی خودداری کو قائم رکھا تھا اور فرماتے تھے کہ باوجود یکہ میری تنخواہ دس روپیہ ماہوار تھی، تاہم میں کچھری ہمیشہ یکہ سے جاتا تھا اور تنخواہ کے نو روپے صرف یکہ کے کرایہ میں صرف ہو جاتے تھے، علی گڑھ میں گئے تو اگرچہ ابتداً اسکول کی مدرسے قبول کر لی تاہم وہ اس کو اپنے لیے موجب ذلت سمجھتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں، ابجا کہ آرمیدہ ام وایں مذمت برخولیش پسندیدہ نہ دانم ناچرخ رادریں پردہ چہ نیرنگہیاست (مکاتیب-۲)

اس زمانہ میں صرف چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، تاہم انہوں نے کبھی ذلت کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا، ابتدا میں وہ شہر میں رہتے تھے، جو کالج سے دور تھا، اس لیے کالج میں پیدل نہیں آسکتے تھے لیکن فرماتے تھے کہ باوجود قلت تنخواہ میں نے کبھی یکہ پر آنا جانا پسند نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ گاڑی پر آیا جایا کرتا تھا۔

کالج میں اگرچہ ان کے تعلقات تمام لوگوں کے ساتھ دوستانہ اور مساویانہ تھے اور سرسید نواب محسن الملک اور مولوی سبیح اللہ خاں وغیرہ ان کی نہایت عزت اور قدر کرتے تھے، تاہم جب کبھی اصول و قواعد کی رو سے ان کو اپنی حیثیت اور لوگوں سے کم نظر آتی تھی تو ان کو اس کا سخت صدمہ ہوتا تھا، فرماتے تھے کہ ایک بار اسٹریٹنگی ہال میں جلسہ ہوا اور لوگ تنخواہ کے لحاظ سے درجہ بدرجہ آگے پیچھے بٹھائے گئے اور اس وقت میری کرسی بہت پیچھے رہی تو میں نے یہ منظر دیکھ کر گردن جھکالی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔“

ملازمت سے نفرت اور آزاد و وظیفہ کی خواہش اگرچہ ان کو زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ وہ ملازمت کی پابندی کے ساتھ خالص علمی اور قومی زندگی نہیں بسر کر سکتے تھے، تاہم اس میں خودداری کا مخفی جذبہ بھی موجود تھا، کیوں کہ ملازمت کی وجہ سے بعض اوقات ایسی باتیں پیش آ جاتی تھیں جن کو وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن باوجود اس خواہش کے انہوں نے وظیفہ کے لیے کبھی اپنی خودداری کو صدمہ نہیں پہنچایا، وہ جس زمانہ میں علی گڑھ میں تھے، اس وقت نواب علی حسن خاں بہادر بھوپال میں تھے، اور ریاست بلکہ خود

نواب شاہ جہاں بیگم پران کا بہت بڑا اثر تھا، وہ مولانا کے بہت بڑے دوست اور نہ صرف دوست بلکہ سخت معتقد تھے اور اپنے جاہ و اقتدار سے مولانا کو ہر قسم کے امکانی فوائد پہنچانا چاہتے تھے اور اس کے لیے مولانا کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مولانا کی طرف سے کسی خواہش کا اظہار ہو، لیکن ایک مدت تک تو مولانا کی خودداری نے اس کا موقع ہی نہیں دیا اور ان کے بار بار کے اصرار سے ایک بار وظیفہ کے لیے لکھا بھی تو شرم و غیرت نے آب آب کر دیا، فرماتے تھے کہ عرفی نے ایک موقع پر کہا تھا:

ردودمان اصیلم ہمیں گواہم بس کہ شرم اس ختم خوے ز چہرہ پیروں داد

میں نے بھی جب نواب صاحب کو یہ خط لکھا تو مجھے پسینہ آ گیا۔“

انہوں نے حیدرآباد میں بعض مجبوریوں سے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، گوملازمت اختیار کر لی تھی لیکن وہ اس کو دل سے پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ”بے شہہ اگر میں ملازمت کر سکتا اور کسی قدر دنیا داری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے، لیکن میاں سبج، عمر کا بہت بڑا حصہ صرف ہو چکا، چند برسوں کے لیے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی بلند رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا، ورنہ میں اپنے گوشہ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔“ (مکاتیب سبج - ۴۷)

حیدرآباد کی ملازمت سے چند ہی سال کے بعد ان کو الگ ہونا پڑا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی خودداری چھوڑ کر امر کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ نہ ہوئے، چنانچہ ایک خط میں نواب محسن الملک بہادر کو تحریر فرماتے ہیں ”مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں، میں کچھ براہیم ادہم اور بازند نہیں ہوں، میرا زواں زواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہے لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دربارداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے کام یابی معلوم، اس لیے میں نے گوشہ عافیت پسند کیا۔“

ایشیائی سلطنتوں میں مدح گستری اور تصیدہ گوئی کام یابی کا ایک بڑا ذریعہ خیال کی جاتی ہے، اور دیسی ریاستوں میں اب بھی ایشیا کی یہ قدیم شان قائم ہے، مولانا فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے، اس لیے اگر انہوں نے ایشیائی شعرا کی اس معتدل روش کو اختیار کیا ہوتا اور امر کی تصیدہ خوانی کر سکتے تو ان کو اپنی کام یابی کا نہایت آسان ذریعہ ہاتھ آ جاتا لیکن انہوں نے ہمیشہ امر و اسلاطین کی مداحی کو اپنے

لیے تنگ و عار سمجھا، ۱۹۰۱ء میں موجود حضور نظام حیدرآباد اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں بندوق کے صدمے سے بال بال بچ گئے، تو مولانا نے اس مسرت میں بے شبہ ایک قصیدہ لکھا لیکن یہ اعیان حیدرآباد کی فرمائش بلکہ اصرار کا نتیجہ تھا، صلہ و کام یابی کی خواہش کو اس میں دخل نہ تھا اور وہ بھی تمام تر تہنیت اور دعائے سلامتی پر مشتمل رہا۔

بیگم صاحبہ بھوپال نے جب ۱۹۰۸ء میں ندوۃ العلماء کے لیے دو سو روپیہ ماہوار مقرر فرمائے تو اس کے شکریہ کے لیے جو جلسہ کیا گیا، اس میں بھی مولانا نے ایک قصیدہ پڑھا تھا، یہ قصیدہ اگرچہ ایک قومی حیثیت رکھتا تھا، تاہم مولانا اپنی خودداری کو ذرہ برابر نہیں لگانا پسند نہیں کرتے تھے، آخر اخیر کے شعر میں اپنی خوددارانہ شان کا اظہار کر ہی دیا:

شبلی غمزدہ را مدحِ شہاں شیوہ نہ بود لیک لطفت ہمدرا بندہ احساں کردہ است

۱۹۰۲ء میں جب مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر ہوئے تو بحیثیت ملازم سرکار وہ بھی ان کو نذر دینے گئے، تو ان کے ایڈیٹنگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا، تو انہوں نے ذرا تکیے ہو کر کہا ”یہ اوروں کا پیشہ ہے، میں یہ کام نہیں کرتا“ اس پر رد و بدل ہوئی اور انہوں نے ناگواری کے ساتھ کہا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔

اسی طرح ۱۹۰۹ء میں بیگم صاحبہ ججیرہ نے ندوہ کی تعمیر میں ایک رقم بھیجی تو اس کے جواب میں ان کو شکریہ کا ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، مگر ان میں سے کسی میں بھی شاعرانہ خوشامد و نذلت کی خوروا نہیں رکھی۔

نذرو نیاز کے طریقہ کو بھی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے اور اس پر کتنے ہی خوش نما پردہ ڈالا جائے لیکن اس سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے، نواب علی حسن خاں بہادر نے ان کے ساتھ ایک بار اس قسم کا سلوک کرنا چاہا اور ریل پر چلتے وقت ایک معقول رقم نذر کرنی چاہی، لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، ایک دفعہ مولانا شروانی فرماتے تھے، بہت ابتدائی زمانہ تعلق و ملاقات میں جب مولانا کو میں نے پہچانا تھا، ایک کتاب مطبوعہ میرے یہاں سے طلب فرمائی جو میرے یہاں نہ تھی، میں نے سادہ لوحی سے لکھ دیا کہ کتاب دوکان سے طلب کر لیجیے، رقم میں ادا کر دوں گا، اس پر اس گرمی سے ڈانٹا کہ آج تک یاد ہے، میری معذرت ساختہ یہ تھی کہ مقصد یہ تھا کہ کتاب آجائے گی تو میرے یہاں رہے گی، ہر بائینس بیگم صاحبہ مرحوم بھوپال نے اپنی ایک تصنیف کی اصلاح کے معاوضہ میں دو سو روپیے

نذر کیے، لیکن مولانا نے ان کو خود لینا پسند نہیں فرمایا، سرکاری اہل دفتر کو ہدایت فرمائی کہ وہ ان کو نودہ کے حساب میں منتقل کر دیں۔

ایک بار ٹرکی کے سفر میں اس قسم کا نہایت بد نما منظر سامنے آیا، مولانا ذکی پاشا سے ملنے گئے، تو عربی وضع میں تھے، پاشا موصوف کو اس وقت نہایت جلدی تھی، سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں (ٹرکی سکہ) نکالیں، پہلے تو مولانا کو سخت تعجب ہوا، پھر خیال آیا کہ انہوں نے ان کو گداگر سمجھا، اس خیال سے مولانا کو سخت رنج ہوا اور رنج کے ساتھ غصہ آیا اور چلا کر کہا:

شو هذا ما جئنا لهذا لسنا من الفقراء یعنی یہ کیا ہے؟ ہم اس لیے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں

ہیں۔

شیخ علی ظہیان بھی مولانا کے ساتھ تھے، پاشائے موصوف نے ان سے مولانا کے غصہ کی وجہ پوچھی، انہوں نے مولانا کے آنے کی غرض و غایت بیان کی تو پاشائے موصوف کو سخت ندامت ہوئی اور معذرت کے ساتھ کہا کہ آپ بالا خانہ پر چلے میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، مولانا اس واقعہ کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں ”مجھ کو اس بات کے معلوم ہونے سے کہ یہاں علما اور متصوفین جب کسی امیر یا عہدہ دار سے ملتے ہیں تو اسی غرض سے ملتے ہیں کہ انہیں نورانی ہاتھ آئے، ذکی پاشا کی بدگمانی کا رنج تو جاتا رہا، لیکن اس فرقہ کے حال پر بہت افسوس ہوا، نذر و نیاز کے طریقہ کو میں ہندوستان کے ساتھ مخصوص سمجھتا تھا لیکن افسوس یہاں بھی اس سے نجات نہیں پائی۔“ (سفر نامہ ص-۶۷)

نہ صرف نذر و نیاز بلکہ عموماً کسی قسم کی مالی اعانت قبول کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، ایک بار وہ بیمار تھے، ان کے بھائی مولوی اسحاق مرحوم نے بغرض علاج ان کے پاس دوسروپے بھیجے لیکن انہوں نے واپس کر دیے۔

اٹلی سے ان کے نام اور ٹھیل کانفرنس کی شرکت کا دعوت نامہ آیا تو نواب علی حسن خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس علمی سفر کے مصارف قومی چندے سے ادا کیے جائیں لیکن مولانا نے ان کو لکھا کہ ”میزی مالی اعانت کی ضرورت نہیں اور اگر کسی قدر ہے تو اس کو ہمیت نفس نے رفع کر دیا ہے، اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو تو یہ پہلو پیش نظر ہے کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ شہلی در یوزہ گری کر کے یورپ گیا۔“ (مکاتیب دوم)

ندوہ کی کامیابی کے لیے اگرچہ وہ ہر قسم کی کوششیں کرتے تھے، تاہم اس کے لیے بھی ان کا لب سوال بہ مشکل کھلتا تھا، شملہ ڈیپوٹیشن میں گئے، تو اپنے لکچر میں نہایت دبی زبان سے چندہ کی تحریک کی تو یہ شعر پڑھا:

عاشق تازہ ہوں اور وصل کی اول شب ہے شرم سے کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا مطلب ہے
ایک بار لکھنؤ میں جان محمد مالک ہوٹل کی نسبت مشہور ہوا کہ وہ ایک معقول رقم کسی قومی کام میں دینا چاہتے ہیں، بعض احباب کے اصرار سے مولانا بھی ان سے ملنے گئے اور اسی قسم کی قومی باتیں ہوئیں، مولانا فرماتے تھے ”مجھے تعجب تھا کہ میں اس قدر ذلیل ہو گیا کہ روپیہ کے لیے دولت مندوں کے گوشہ چشم کا منتظر بنتا ہوں، میری یہ حالت تھی کہ علی گڑھ کے ایک رئیس نے مجھ سے ملنا چاہا اور اس غرض سے اپنی گاڑی بھیج دی لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر ان کو ملاقات کا شوق ہے تو خود آئیں، میں نہیں جا سکتا۔“

ایک بار حافظ عبدالحلیم صاحب رئیس و تاجر کان پور نے ندوہ میں پانچ سو روپے دیے، مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اس وقت الندوہ کے سب ایڈیٹر تھے، انہوں نے اپنے شذرات میں اس کا ذکر منت پذیر کی کے ساتھ کیا اور اخیر میں لکھا کہ ”ان کی فیاضی ندوہ کو گل بداماں کر سکتی ہے“ چون کہ شذرات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا، مولانا کی طرف منسوب ہوتا تھا، اس لیے مولانا نے اس کو دیکھا تو سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں اس قسم کی خوشامد اندہ الفاظ کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کر سکتا۔

ایک بار کسی جشن کے موقع پر ندوہ کی طرف سے نواب صاحب بھادپور کی خدمت میں دعا نامہ بھیجنے کی تحریک ہوئی اور مولانا سے دعا نامہ لکھنے کی خواہش کی گئی، تو انہوں نے اس کو سخت ناپسند کیا اور لکھا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ نہایت دناست کی بات ہے کہ موقع جشن پر اور منگتوں کی طرح ندوہ کا وفد بھی اپنا بھجن گائے، علما کی شرکت اسی قسم کے خیالات پیدا کرتی ہے، کیا علی گڑھ کالج بھی ایسی بدہمتی کر سکتا ہے۔“ (عبدالرحمن - ۱)

عدم قبول احسان | خود داری اور بے نیازی نے مولانا کو ہمیشہ لوگوں کے احسانات سے سبک دوش رکھا، عربی کی طالب علمی کے زمانہ میں تو یہ گناہ عموماً معاف ہوتا ہے، مگر وہ اس گناہ کے کبھی مرتکب نہیں ہوئے اور ہمیشہ اپنے کھانے پینے کا سامان خود کیا، ان کے والد جو کچھ ماہوار بھجتے تھے، انہیں اپنے ہاتھوں سے لکھنا پڑتا تھا۔

بن پڑتا تھا، بسر کرتے تھے، طالب علمی کے بعد جب خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق ہوئے تو والد ماجد کو بھی زحمت دینے سے احتراز کیا، حیدرآباد کے وظیفہ کے لیے تو بے شبہ انہوں نے بعض احباب کا احسان اٹھایا لیکن اس کے علاوہ انہوں نے کسی سے معمولی سے معمولی احسان کا اٹھانا بھی گوارا نہیں کیا، ممالک اسلامیہ کے سفر کو روانہ ہونے لگے تو اپنے والد سے بھی مالی امداد قبول نہیں کی اور نہیں چاہا کہ ان کی وجہ سے کوئی دوسرا زیر بار ہو، بعض بزرگوں نے اس پر بھی ان کے قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد ان کے پاس روپیے بھیجے تو واپس کر دیے، واپسی کے بعد ریاست رام پور نے سفر کے کل مصارف ادا کرنے کا ہے تو اس سے بھی انکار کیا۔

لکھنؤ میں نواب سید علی حسن خاں مولانا کے بہت بڑے دوست بلکہ بہت بڑے معتقد تھے، وہ بہت چاہتے تھے کہ مولانا سال میں چند مہینے ان کی کوٹھی میں قیام کریں لیکن مولانا نے اس کو کبھی پسند نہیں کیا، بمبئی میں اگرچہ مکانات بہت گراں ہیں اور بعض حالات میں بہ مشکل ملتے ہیں لیکن مولانا نے وہاں بھی کسی دوست یا کسی تاجر کے یہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا، ایک دفعہ بمبئی میں ایک رئیس نے ان کو اپنے یہاں ٹھہرانا چاہا لیکن انہوں نے اس کو منظور نہیں کیا، بمبئی سے چار مہینہ کے لیے حیدرآباد گئے تو وہاں بھی کرایہ کا مکان لیا۔

اگر کسی موقع پر ان کے ساتھ کوئی سلوک کرتا تو جہاں تک ہوتا وہ اس کا معاوضہ ادا کرتے اور اس کے احسان کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے، سفر قسطنطنیہ میں حسین آفندی جو پہلے سفیر بمبئی رہ چکے تھے، مولانا کے ساتھ نہایت حسن اخلاق سے پیش آتے تھے، مولانا نے وہیں ان کے احسانات کی گراں باری کو محسوس کیا اور ان سے سبکدوش ہونے کے لیے اپنے والد کو لکھا "ان کے اخلاق نے مجھ کو نہایت گراں بار کر دیا ہے اور میں کسی قدر سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، اس لیے عرض ہے کہ نہایت اہتمام، نہایت تلاش اور جدوجہد کے ساتھ نظام آباد کے برتن ارسال فرمائیے، کسی ہوشیار شخص کو نظام آباد بھیجئے جو وہاں کے کسی رئیس کی معرفت فرمائیے، ہوا کر لائے، یہاں ہندوستان کے ظروف گلی گلی آتے ہیں، مگر اچھے نہیں آتے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان، مگر نہایت عمدہ فروی بوتیاں ہوں، نہایت باریک اور نازک کام ہو اور تیس روپیہ سے کم قیمت کا نہ ہو، خواجہ عزیز الدین صاحب کی معرفت اگر خریداجانے تو غالباً اچھا ہوگا، میں آخر اگست تک رہوں گا، اس وقت تک آجائے، یہ بھی نہ ہو تو مراد آباد کا کوئی برتن، مگر نہایت عمدہ، غرض

کوئی نادر چیز ضرور بھیجئے۔“ (مکاتیب-۱)

راست بازی | بیان واقعہ میں راست گوئی اور راست بازی ان کی عادت تھی، وہ کسی کی غیبت و حکایت و شکایت نہیں کرتے تھے اور یہ طریقہ ان کو سخت ناپسند تھا، وہ جس زمانہ میں تعلیم سے فارغ ہوئے علما کے لیے اس وقت سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ کامیاب ذریعہ معاش جو تھا، وہ وکالت کا پیشہ تھا، مولانا نے بھی اگر چہ اعزہ و احباب بالخصوص والد کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن ان کی فطری راست بازی نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ اس پیشہ کے لیے ناموزوں ہیں اور ایک موقع پر جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، خود ان کے والد کو یہ کہنا پڑا کہ بس آپ وکیل بن چکے۔“

اسی وکالت کے زمانہ میں پیشہ وکالت کے متعلق جس کو انہوں نے مجبوراً اختیار کیا، لکھتے ہیں ”مگر چہ کنیم کہ والد قبلہ راجز وکالت روئے ودا ہے نیست، و بہ این آزادہ دلی اگر بہ وکالت ناساختہ باشم در نظر انصاف مرادیں میا نہ گنا ہے، نخواہد بود، آہ ازاں ہنگام کہ دولت روئے گرداند و کار بدست من افتد، دوران آشوب دل بر جانہ دارم و خواست و ناخواست روئے بہ وکالت آرم و خویش را اندازہ نہ نہم و مردمان را بہرزہ و لاف فریب و ہم وایں خواری بہ خویش در پذیریم۔ (مکاتیب)

وکالت کے پیشہ پر ان کی یہ تنقید ان کی فطری راست پسندی کی غماز ہے، بالآخر وکالت چھوڑ کر علی گڑھ گئے، وہاں جھڈن کالج میں مدرسہ قبول کر لی، جس کی تنخواہ ۴۰ روپے ماہوار تھی، اگرچہ مولانا کی خودداری اس کو بھی پسند نہیں کرتی تھی، تاہم انہوں نے دروغ بانی پر اس کو ترجیح دی۔

سفارشوں میں جھوٹ بولنا یا مبالغہ کرنا عموماً برائیاں سمجھا جاتا، مگر وہ اس باب میں بھی بہت محتاط تھے اور وہیں تک کہتے یا لکھتے تھے، جو ان کے نزدیک صحیح ہوتا، ان سے جب کوئی شخص کوئی خلاف قیاس بات روایت کرتا تھا تو وہ محدثانہ اصول سے اس سے مواخذہ کرتے تھے اور اس کا سلسلہ روایت دریافت کرتے تھے اور اس پر تنقید کرتے تھے اور یہ واقعہ ہر دوسرے تیسرے دن ضرور ہی پیش آیا کرتا تھا۔

سفارشوں میں احتیاط | سفارش نیکی کا کام ہے، مگر درحقیقت یہ ایک قسم کی شہادت بھی ہے، اس لیے اس میں احتیاط کی سخت ضرورت ہے، عام لوگ اس کی نیکی ہی کے پہلو کو دیکھتے ہیں، دوسرے سے چشم پوشی کرتے ہیں، مولانا کا عمل اس کے برخلاف تھا، اس میں ایک تو ان کی خودداری کو دخل تھا کہ وہ اس کو بھی امر کے سامنے اظہار حاجت ہی سمجھتے تھے، جس سے ان کو ہمیشہ اجتناب رہا، وہ جس قدر

صاحب اثر تھے اور جس قسم کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان کے ذریعہ سے اگر وہ لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے تو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے لیکن جس طرح انہوں نے اپنے لیے کسی کے سامنے زبان سوال نہیں کھولی، اسی طرح اپنے اعزہ و احباب کے لیے بھی کسی سے سفارش کرنا پسند نہیں کیا، حامد ان اکلوتے بیٹے تھے اور مدتوں نائب تحصیل داری تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن مولانا نے ان کو اس میں کسی قسم کی مدد نہیں دی، چنانچہ مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی کو جنہوں نے ان سے سفارش کی خواہش کی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں ”بات یہ ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کے لیے بھی کبھی سفارش نہیں کی، لیکن موقع آجائے تو ہر طرح کی تائید کر سکتا ہوں۔“

مولانا کے والد لوگوں پر اس قسم کے احسانات بہت کیا کرتے تھے لیکن مولانا فرماتے تھے کہ مجھے تعجب آتا ہے کہ وہ حکام سے اس طرح لوگوں کی سفارشیں کیا کرتے تھے کہ گویا معمولی بات چیت کر رہے ہیں، ایک خط میں نواب محسن الملک کو جو اپنے کالج کے طالب علموں کے لیے ہر قسم کی سفارشوں کے لیے تیار رہتے تھے، یہ لکھا ”رہا تو م کی خدمت تو اس کی یہ تدبیر نہیں کہ جھوٹی سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلا دیجائے، ان کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں، (مکاتیب اول محسن الملک) فرمایا کرتے تھے کہ جھوٹی سفارش کر کے ایک کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے، اور سیکڑوں کو نقصان۔“

اس سے یہ معلوم ہوا کہ خود داری کے علاوہ لوگوں کی سفارش نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جب تک ان کو کسی شخص کی اہلیت و قابلیت پر کافی اطمینان نہیں ہوتا تھا وہ اس کے لیے سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور سفارش نامہ میں صرف اس قدر لکھتے تھے، جتنا ان کو صحیح طور پر معلوم ہوتا تھا، محض سنی سنائی باتوں کی بنا پر ایشیائی حسن ظن و حسن اخلاق کی بنا پر وہ کسی کی سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے، مولوی منصور احمد صاحب ایم اے علی گڑھ سے تحصیل عربی کے لیے یورپ جا رہے تھے اور سرکاری وظیفہ کے لیے سند چاہتے تھے، اگرچہ ان کو خود ڈاکٹر ہارویز سرٹیفکیٹ دینے والے تھے لیکن انہوں نے مولانا سے بھی سند لینا چاہی اور چونکہ وہ مولانا کے مذاق طبیعت سے واقف تھے، نمونہ کے طور پر عربی عبارت بھی لکھ کر بھیجی، اس کے متعلق مولانا مولوی ضیاء الحسن ندوی کو جو اس وقت کالج میں تھے، لکھتے ہیں ”عربی عبارت تو معمولی ہے، اس سے گئی گزری اور کیا ہوتی، سرٹیفکیٹ لکھوں گا تو یہ لکھوں گا کہ عربی عبارت معمولی لکھ سکتے ہیں۔“ (مکاتیب دوم ضیاء الحسن)

البتہ جو لوگ علمی مذاق رکھتے تھے، یا علمی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، وہ اس سے مستثنیٰ تھے اور یہ مولانا کی علم پروری کی سب سے بڑی دلیل ہے، انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے کبھی سفارش نہیں کی، لیکن اپنے فرزند ان روحانی کی سفارش میں کبھی دریغ نہیں کی، بلکہ ہمیشہ ان کے لیے عمدہ مواقع کی تلاش میں رہے، ۱۹۰۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ایک مدرس کی جگہ خالی تھی، راقم نے آزیں ہیل مولوی سید شرف الدین صاحب نج ہائی کورٹ کلکتہ کی وساطت سے درخواست دی اور کلکتہ جانے لگا، مولانا نے سنا تو پاس بلوایا اور از خود مولوی سید شرف الدین صاحب کے نام ایک تعارفی خط لکھ کر دیا، جس میں راقم کا ذکر اچھے لفظوں میں فرمایا تھا، جامعہ عثمانیہ میں بھی میرے لیے سفارش فرمائی تھی۔ (سلیمان -۲۳) لیکن جب اس کا موقع آیا اور ناظم تعلیمات سرکار نظام (المالطینی صاحب) نے مجھے بلانا چاہا تو مولانا کا انتقال ہو چکا تھا اور میرے سر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی تھی، اس لیے انکار کرنا پڑا، دکن کالج پونہ کی اسٹنٹ پروفیسری پر راقم کا تقرر مولانا ہی کی سفارش بلکہ کوشش سے ہوا، مولوی عبدالسلام صاحب کے لیے بھی مولانا نے بھوپال وغیرہ میں سفارشیں کیں، مولوی عبدالباری صاحب ندوی علی گڑھ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، مولانا نے ان کے لیے بھی سفارش کی اور وہ وہاں سے چلے گئے، تب بھی وہ وعدہ کیا کہ آئندہ مراحل کے لیے بھی مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے، میں ہمیشہ موجود ہوں۔ اسی طرح جن لوگوں کی لیاقت و قابلیت پر ان کو اعتبار تھا، ان کی سفارش پوری قوت سے کرتے تھے۔

مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو علی گڑھ کالج کی اسٹنٹ پروفیسری مولانا ہی کی سفارش سے ملی، دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپل پران کا تقرر مولانا ہی کی کوشش سے ہوا۔ مولوی عبدالعلیم صاحب شرر حیدرآباد سے علاحدہ کیے گئے تو بھوپال میں ان کے لیے پرزور سفارش کی۔

کالج میں نائب ناظم دینیات کی تجویز ہوئی اور اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی خدمت میں حافظ محمد اسلم صاحب جیران پوری کے لیے سفارش چاہی گئی تو مولانا نے ان کو لکھا، مولوی محمد اسلم جیران پوری کی مجھ سے سفارش چاہی گئی ہے، میں صرف ان کی نیک بختی کا حال جانتا ہوں، باقی معلومات مذہبی اور پابندی فرائض کو آپ خود تحقیق کریں، مجھ کو علم نہیں، (مکاتیب اول شروانی)

رد و کد سے احتراز | مولانا کے متعلق اخبارات میں رطب و یابس بہت کچھ لکھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات پر بعض لوگ مخالفانہ ریویو بھی لکھا کرتے تھے، ان کی متعدد کتابوں کا رد بھی لکھا گیا لیکن وہ کسی کا جواب نہیں دیتے تھے، ایک بار مولانا نے مسئلہ ارتقا پر ایک فلسفیانہ مضمون لکھا، اس پر بعض مذہبی حلقوں میں شورش پیدا ہوئی اور بعض اشخاص نے سخت لہجے میں اس پر اعتراضات کیے، مولانا حسب عادت خاموش رہے لیکن راقم نے ”قرآن مجید اور مسئلہ ارتقا“ کی سرخی سے ایک مضمون لکھا، جس میں ثابت کیا کہ یہ مسئلہ مجید کے مخالف نہیں، اگرچہ یہ مضمون مولانا کے قلم سے نہیں نکلا تھا تاہم ان کو ناگوار ہوا اور مجھے لکھا ”ارتقا پر جو مضمون تم نے لکھا گو میں نے نہیں دیکھا اور ممکن ہے کہ اچھا ہو لیکن میری ناراضی کی وجہ یہ ہے کہ اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی اتنے ہیں کہ لوگ ہمارا جواب لکھیں، یہ یقین کرے گا کہ تم نے لکھا ہے، سب میری طرف منسوب کریں گے۔“ (مکاتیب سلیمان-۱۷)

علم الکلام اور الکلام پر ایک طالب علم فلسفی نے رسالہ الناظر لکھنؤ میں زیادہ سخت تنقید لکھی، جس کو پڑھ کر میں بے چین ہو گیا اور اسی علم میں مولانا کے پاس پہنچا، میں اپنی نادانی سے یہ سمجھے تھا کہ جب مجھے اتنا غصہ ہے تو خدا جانے مولانا کا کیا حال ہوگا، وہاں پہنچا تو دیکھا دریا پوری طرح ساکن ہے، مگر پھر بھی یہ عرض کیا کہ اس کا جواب لکھا جائے، ارشاد ہوا، جو وقت اس کے جواب میں صرف کیا جائے، اسی میں کوئی دوسرا نیا کام کیوں نہ کر لیا جائے۔“

دکن ریویو میں جب وہ حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا، مولانا کے بعض شاگرد جن کو ان سے کدسی ہوئی تھی، ان کے مضامین اور تصنیفات پر نہایت بدناما تنقیدیں لکھتے رہے، مگر انہوں نے کبھی الٹ کر نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اردو) نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کر لیا تھا کہ جاو بے جا ان پر اعتراض کریں، مگر کبھی انہوں نے اس کے سوا کہ ”یہ ازم صحیح نہیں“ ان سے کچھ اور نہیں کہا، (چند ہم عصر، مؤلف مولوی عبدالحق صاحب سوانح مولوی سید علی بگرامی)

سیرت نبوی ﷺ کے دیباچہ پر جب لکھنؤ کے ایک مولوی صاحب نے اعتراضات کیے، اگرچہ بعض مصالِح کی بنا پر مولانا نے اس کا جواب لکھا لیکن اپنے نام سے چھپوانا پسند نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ ”.....گو میں مخاطب نہیں کر سکتا، اس لیے کسی اور کے نام سے وہ چھپ سکتا ہے، میں اپنے نام سے نہیں چھپوا سکتا، غرض اظہار حقیقت ہے نہ اظہار نام۔“

ابتدائے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے المامون پر جو اعتراضات کیے تھے، مولانا نے صرف اس کا جواب لکھا، اس کے علاوہ انہوں نے کسی ریویو کا جواب لکھنا پسند نہیں کیا اور یہ نتیجہ تھا جیسا کہ خود مولانا شروانی فرماتے ہیں ”ایڈیٹر اخبار آزاد لکھنؤ کے اصرار کا‘ مولانا شروانی کا بیان ہے، ”عاباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا:

رسی آنگہ بدر و ما کہ چوما خامہ گیری و حرف بگاری

ندوہ کے مخالفتوں کے زمانہ میں جب بعض ارکان ندوہ کے غلط الزامات سے ان کو قلب حقیقت کا خوف ہوا تو بے شبہ اخبارات میں ایک دو صاحبوں کی تحریروں کا جواب دیا جو مقالات میں شامل ہے۔

صفائی پسندی | مولانا باوجود سادگی کے نہایت صفائی پسند تھے، کپڑے ہمیشہ صاف پہنتے تھے اور ہفتہ میں کئی بار بدلتے تھے، بعض لوگ جو نمائش صفائی پسند ہوتے ہیں، یہ کرتے ہیں کہ اوپر سے صاف کپڑے پہن لیتے ہیں اور نیچے میلی بنیائیں یا میلا کمر بند رہنے دیتے ہیں، ایک دفعہ ایک ملازم نے یہ حرکت کی تو سخت برہم ہوئے، فرماتے تھے کہ ”رات دن ایک ہی کپڑا پہننے سے جلد میلا ہو جاتا ہے، اس لیے ایک بار میں نے خیال کیا کہ رات کو کوئی دوسرا کپڑا پہن کر سویا کروں، لیکن پھر خیال ہوا کہ آخر وہ بھی تو میلا ہی ہوگا اور گواس پر دوسروں کی نگاہ نہ پڑے لیکن خود میری طبیعت اس کو گوارا نہیں کرتی“، جس کمرے میں رہتے تھے وہ باوجود سادگی کے نہایت صاف و شفاف رہتا تھا، اس میں روزانہ جھاڑو دلاتے تھے، وہ ہر چیز کو صاف کر داتے تھے، ندوہ کے کسی جلسہ میں گئے تو ایک حجرہ ٹھہرنے کے لیے ملا، چونکہ کوئی ملازم ساتھ نہ تھا، اس لیے خود ہی جھاڑو دے لیا کرتے تھے۔

لونا ملازم سے روزانہ منجواتے تھے، خود پان نہیں کھاتے تھے اور پان کھانے والوں سے سخت نالاں رہتے تھے، اگر کوئی شخص پان کھا کر ان کے مکان میں تھوک دیتا تھا تو سخت منغص ہوتے تھے اور اس کو چھلوا ڈالتے تھے۔

گنا یا آم کھاتے تو ملازم سامنے ایک طشت رکھ دیتا، اسی میں چھلکا اور گھٹلی رکھتے جاتے، زمین پر نہ پھینکتے، ایک بار دارالعلوم میں ایک بڑے مدرس کے سامنے زمین پر آم کے چھلکے دیکھے تو

فرمایا ”آپ پھلے کسی برتن میں کیوں نہیں رکھتے، انہوں نے کہا، بھنگی آئے گا تو اٹھالے جائے گا، بولے کہ ”مولوی پہلے لکھتے ہیں، پھر مٹاتے ہیں۔“

کھانے میں ہاتھ بہت کم آلودہ کرتے، ان کے دسترخوان پر چچہ بلکہ کبھی کبھی چھری کا نسا بھی ہوتا اور اسی سے بوٹیاں اور ترکاریاں وغیرہ کھاتے، بدبو سے سخت نفرت تھی، اور اسی لیے حقہ پینے والوں کے پاس بیٹھنے سے سخت بیزار ہوتے تھے، پان کثرت سے چہانایا تمباکو ڈال کر کھانا سخت ناپسند تھا۔

نفاست پسندی | مولانا اپنی سادگی کے باوجود بہت نفاست پسند تھے اور اس کا اثر ان کی ایک ایک چیز سے نمایاں ہوتا تھا، مسودات ہمیشہ سفید اور فلسکیپ کاغذ پر لکھتے تھے، میز پر قلم و دوات نب وغیرہ ہمیشہ عمدہ قسم کی رکھتے تھے، مسودات نہایت خوش خط کاغذ سے صاف کرواتے تھے، فرماتے تھے کہ جتنا زیادہ صاف اور خوشخط ہو، اسی قدر اس کے بنانے میں جی لگتا ہے، کتاب ہمیشہ بہتر سے بہتر چھپواتے تھے، یورپ اور بیروت کی عمدہ چھپی ہوئی کتابوں کو گراں قیمت پر خریدتے تھے اور ان کی نہایت خوشنما جلد بندھواتے تھے، مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار بمبئی میں میرے سامنے آغانی خریدی اور جلد بندھنے کے لیے دے دی، جلد ساز جلد بھدی باندھ کر لایا تو سخت برہم ہوئے۔

مولانا میز پر لکھنے کے عادی تھے، میز پر باناں جڑا رہتا تھا، ایک دفعہ یہ باناں ملیا ہو گیا تھا یا کوئی داغ پڑ گیا تھا تو طبیعت میں وہ انشراح نہیں رہا، جو ایک مصنف کے لیے درکار ہے، بڑھی نہ ملا، اتفاق سے ایک طالب علم (مولوی سید محمد صاحب ندوی رائے بریلوی اور اب ایم اے) اس وقت موجود تھے، ان کو اس قسم کے کاموں کا ذوق تھا، بازار سے کپڑا آیا اور اسی وقت انہوں نے بیچ سے میز کی گوٹ کھولی اور پرانا کپڑا نکال کر نیا کپڑا منڈھا تو ان کو خوشی ہوئی اور فرمایا کہ ”اب لکھتے خوب بنے گا۔“

کپڑے اگرچہ بہت گراں نہیں پہنتے تھے، لیکن نفاست کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا، کھانے کی خوبی کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ خوش ذائقہ ہو، بلکہ یہ بھی لازمی تھا کہ خوش رنگ ہو اور سلیقہ کے ساتھ دسترخوان پر چنا جائے۔

اسی نفاست پسندی کی بنا پر لکھنؤ کے تمدن کو دلی کے تمدن پر ترجیح دیتے تھے۔

چائے ہمیشہ سادی پیتے تھے اور اس میں بہتر سے بہتر دانہ دار اور انگریزی شکر بلکہ کبھی کبھی مصری ڈالتے تھے، فرماتے تھے کہ دودھ ڈالنے سے چائے کی لطافت چلی جاتی ہے اور دیسی شکر اگرچہ

میٹھی زیادہ ہوتی ہے لیکن اس میں ایک قسم کی ہیک ہوتی ہے، ہندوستانی عطر کی تیزی کو ناپسند فرماتے تھے، ہکا انگریزی عطر البتہ انگیز کر لیتے تھے، (اگر چہ استعمال نہیں کرتے تھے) فرماتے تھے کہ اس کی خوشبو میں لطافت ہوتی ہے، ایک دفعہ میں نے غسل کیا تھا، کپڑے بدلے تھے اور کوئی تیز ہندوستانی عطر لگایا تھا اور اس شان سے ان سے ملنے گیا، بیٹھا ہی تھا کہ فرمایا ”تم نے عطر لگایا ہے، کیسی سخت بو ہے“ میں نے چاہا ہٹ کر دوڑ بیٹھوں، فرمایا ”اس سے کیا ہوتا ہے“۔

خاک ساری | مولانا باوجود خودداری کے سجد خاک سار تھے، ہر قسم کے آدمیوں سے بلا تکلف ملتے تھے اور ان سے گھٹنوں بات چیت کرتے تھے، اعظم گڑھ میں ایک جلد ساز تھے، جو مولانا کے زمانہ طالب علمی کے دوست تھے، اخیر عمر میں اعظم گڑھ میں قیام کیا تو ان سے روزانہ صحبت رکھتے تھے، جب کبھی وہ نہ آتے تو ان کو خود بلواتے تھے۔

لکھنؤ میں رہتے تھے تو منشی محمد علی صاحب محرر دارالعلوم کے کمرہ میں اکثر جا بیٹھتے اور چائے پیتے، تمام طلبہ سے بے تکلف ملتے اور ان کی عیادت کرتے، امین آباد اور چوک میں بے تکلف جاتے، کبھی کبھی بعض دوکانوں پر بھی بیٹھ جایا کرتے تھے۔

جس زمانہ میں علاقہ کا انتظام کرتے تھے، اس وقت راجپوت وغیرہ جو اسامی تھے، آتے تھے تو زمین پر بیٹھتے لیکن مولانا خود ہی ان کو برابر بٹھاتے تھے۔

کبھی مکان پر جاتے تو تمام اعزہ و احباب کے مکان پر جا کر ان سے ملاقات کرتے۔

ایک دفعہ لکھنؤ میں گولہ گنج کی ایک سڑک پر جہاں دارالعلوم تھا، مدرسہ سے نکل کر وہ اپنے قیام گاہ (مکان نواب مرشد آباد جوان دنوں اخبار حق کا دفتر تھا) پر جا رہے تھے، راقم الحروف ساتھ تھا، اتفاق سے کچھ دیہاتی مسلمان دھوتی باندھے پیچھے سے آرہے تھے، جب وہ میرے برابر آئے تو چپکے سے مجھ سے پوچھا کہ ”مولوی شبلی یہیں ہوں“ میں نے کہا ہاں، وہ آگے بڑھ گئے، مولانا نے فرمایا یہ کیا کہتے تھے، میں نے کہا پوچھتے تھے کہ مولوی شبلی صاحب یہی ہیں، یہ سن کر مولانا مسکرائے اور فرمایا خدا کی قسم مجھے ان کے اتنے سے فقرہ سے جو خوشی ہوئی وہ بڑوں بڑوں کی تعریف سے نہیں ہوئی۔

مسلم لیگ سے اختلاف کے زمانہ میں کسی نے راجہ صاحب محمود آباد کی نسبت ان سے یہ کہا کہ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ میں شبلی کو تباہ کر دوں گا، تو جواب میں کہلایا کہ راجہ صاحب مجھے آپ تباہ نہیں

کر سکتے کیوں کہ میں زمین کی گھاس ہوں، آندھیاں اونچے اونچے درختوں کو گراتی ہیں، زمین کی بے قدر گھاس کو نہیں لے۔

عموماً معمولی کپڑے پہنتے تھے، کھری چارپائی اور چٹائی پر بیٹھتے تھے، آرائش اور تکلف سے پاک تھے۔

مخصوص اوقات میں خلوت پسندی | شہرت نے اگرچہ مولانا کو شمع محفل بنا دیا تھا، بہت سے لوگ ان سے ملنے آتے تھے وہ خود جلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے، یارباش اور احباب پسند تھے، مگر کام کے اوقات اور سونے کے وقت میں ان کو خلوت ہی پسند تھی، کام کے اوقات اور آرام کے گھنٹوں میں کسی شخص کا وجود بلکہ تخیل بھی ان کے لیے سخت تکلیف دہ ہوتا تھا، رات کو جیسا کہ پہلے گزر چکا، ہمیشہ کمرے میں تنہا سوتے تھے اور کتنا ہی بڑا مکان ہو، لیکن اس میں کسی دوسرے کو سونے نہیں دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دوسرے شخص کے تخیل سے بھی نیند نہیں آسکتی۔

بعض اوقات لوگ ان سے ملنے آتے اور دیر تک بیٹھے رہتے تو ان کو سخت تکلیف ہوتی، وہ خود فرماتے تھے کہ میں نے عجیب متضاد طبیعت پائی ہے، احباب کی صحبت لازمی ہے، لیکن چند مخصوص گھنٹوں میں بالکل تنہائی ہونی چاہیے، صحبت کے لیے چار بجے شام سے اٹھ بجے شب تک کا وقت مخصوص تھا، ان کے دروازے پر چلی قلم میں لکھا ہوا یہ اعلان چسپاں رہتا تھا کہ ”چار بجے سے پہلے ملنے کی اجازت نہیں۔“ بمبئی کو انہوں نے جن اسباب کی بنا پر پسند کیا تھا، ان میں ایک خلوت گزینی بھی تھی، فرماتے تھے کہ یہاں شبلی پڑا پھرتا ہے، اور کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ شبلی ہے“ (بروایت مولانا عبدالسلام) اسی خلوت گزینی کی بنا پر بعض اوقات بمبئی میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ”بمبئی میں سارا دن کام کے لیے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں، اس لیے برس دن تک یہاں سے ٹلنے کا ارادہ نہیں۔“

اظہار رائے میں بے باکی | مولانا اپنی جورائے قائم کر لیتے تھے، اس کے اظہار میں بے باک تھے، جو لوگ اس رائے کے مخالف ہوتے تھے، ان کے دلائل کا رد بھی اسی سختی سے کرتے تھے، مولانا شروانی

۱۔ حدیث شریف میں مسلمانوں کی تمثیل میں یہی آیا ہے، ”مثل المؤمن كمثل الزرع الريح تغيثه ولا يزال المؤمن يصيبه بلا، ومثل المنافق كمثل شجرة الا از لا تھتز حتى تستحصد“ (ترمذی ابواب امثال)۔

اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں ’دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں، لیکن دوستوں کی مراد کبھی ان کو رسمی تعلق اور چالپوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی، عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے، مخالفین کی مخالفت سے رو برد نہیں رکھتے تھے، مگر ان کے پس پشت بیان اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرے، مخالف کی رائے کی تردید سختی سے کرتے تھے، اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے، باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اس کو ذلیل و رسوا کرتے۔“

جس زمانہ میں وہ علی گڑھ تشریف لے گئے، تمام کالج بلکہ تمام قوم پر سید صاحب کا اثر محیط تھا، اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ جب سید صاحب نے کانگریس کی مخالفت کی تو دفعۃً تمام قوم سیاسیات میں حصہ لینے سے الگ ہو گئی اور ایک مدت تک الگ رہی، لیکن مولانا جیسا کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا ہے، اسی وقت سے سید صاحب کی اس پالیسی کے شدت کے ساتھ مخالف تھے، اخیر میں انہوں نے پالیسی پر جو آزادانہ نظمیں اور آزادانہ مضامین لکھے، ان کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زمانہ اور قوم کی موجودہ روش کا نتیجہ تھے اور مخالفین اس کو جاہ پرستی اور شہرت طلبی پر بھی محمول کرتے تھے، لیکن درحقیقت ان کو ابتداء ہی سے اس پالیسی سے نفرت تھی اور اس وقت سے اخیر دم تک وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔

اس وقت قدیم عربی نصاب کی مخالفت کرنا اور ایک عربی مدرسہ میں انگریزی اور علوم جدیدہ کا داخل کرنا ایک ایسا کام تھا جو ایک شخص کو تمام علما کی لعنت و ملامت کا آماج گاہ بنا سکتا تھا لیکن مولانا نے لوگوں کی مخالفت مولیٰ لی، مگر جس راستہ کو انہوں نے صحیح سمجھا اس سے پیچھے نہ ہٹے، کم زور دل کے لوگ بدنامی کے خوف سے اپنی رائے کا آزادانہ اظہار نہیں کر سکتے لیکن مولانا اس قسم کی بدنامی سے بالکل نہیں گھبراتے تھے، ایک بار ندوہ میں انگریزی کے داخل کرنے کی تحریک مولانا نے نہایت شد و مد کے ساتھ کی لیکن مولانا حبیب الرحمن خاں نے جو غالباً اس جلسہ کے پریسڈنٹ تھے، بحث کا موقع نہیں دیا، مولانا نے جلسہ کے بعد ان سے پوچھا کہ ”آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں؟“ تو انہوں نے کہا ”تمہاری بدنامی کے ڈر سے۔“

لیکن علما کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت کی جو رائے انہوں نے قائم کر لی تھی، اس پر برابر

اڑے رہے، اور بالآخر وہ کام یاب ہوئے، ندوہ میں انگریزی تعلیم داخل ہوئی، اور اب بہت سے مدرسوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور بے تکلف مولوی سیکھ رہے ہیں، مگر یہ سارا فیض ان ہی کے استقلالِ رائے کا ہے۔

سچائی کے مقابلہ میں وہ عوام کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ”میرا اصول یہ ہے کہ انسان ہر کام کے نقص و ہنر کا خود فیصلہ کر سکتا ہے، اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً عوام کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔“

اور اگر ان کے سامنے کبھی یہ تذکرہ آتا کہ فلاں کام سے فلاں شخص ناراض ہو جائے گا، تو فرماتے تھے کہ ”میں یہ کب چاہتا ہوں کہ تمام دنیا مجھ سے خوش رہے، اور اس کے ساتھ یہ شعر بھی پڑھتے تھے:

خاطر یک دو کس ارشاد شود از تو بس است زندگانی بہ مراد ہمہ کس نتواں کرد

علم کلام کے سلسلہ میں بعض مذہبی مسائل کی تشریح میں اپنا راستہ عام شاہراہ سے الگ اختیار کیا اور جن باتوں کو امام غزالی اور امام رازی نے صرف خلوت میں کہا تھا، ان کو علانیہ برسر عام ظاہر کیا، جس کی بدولت ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا، مگر اس کی کچھ پروا نہ کی، البتہ جب آخر میں سیرت نبوی ﷺ کی تاثیر سے ان میں انقلاب حال پیدا ہوا تو صورت اور ہو گئی۔

وہ فقہی مسلک میں حنفی تھے اور نہایت سخت حنفی تھے، اس کے بعد کثرت سے مطالعہ اور وسعت

نظر سے سب کچھ بن گئے، مگر بہر حال وہ حنفی ہی رہے اور عمر بھر اپنی حنفیت کا اعلان کرتے رہے۔

ساوگی | مولانا کا خاندان ایک آسودہ خاندان تھا، ان کے والد بہت بڑے وکیل تھے اور ریسانہ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے تین بھائی کام یاب وکیل اور بیرسٹر اور انگریزی طرز معاشرت کے دلدادہ تھے، مولانا نے کامل سولہ سال علی گڑھ کالج میں بسر کیے، جو دینیوی جاہ و جلال کی نمائش گاہ تھا، مدتوں حیدرآباد میں ایک معقول مشاہرہ پر ملازم رہے، جہاں کے تمدن کا اندازہ داغ کے اس شعر سے ہو سکتا ہے:

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم یہاں بھی سچے ہیں مکاں کیسے کیسے

اس بنا پر خیال ہو سکتا ہے کہ ان پر بھی اس طرز معاشرت کا اثر پڑا ہوگا اور انہوں نے اس

قدیم ساوگی کو کھودیا ہوگا، جو گروہِ علما کا تمغہ امتیاز ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا فطرۃً نہایت سادگی پسند تھے اور ہمیشہ اپنے معتقدین و تلامذہ کو

سادگی کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہ سچ ہے کہ خودداری اور بلند ہمتی کی وجہ سے وہ کسی سوسائٹی میں پست ہو کر رہتا نہیں چاہتے تھے، اس بنا پر وہ حیدرآباد میں کسی قدر ترک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے، چنانچہ نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”مجھ کو سر دست ۵۰۰ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی جاتی ہے، خرچ بڑھتا جاتا ہے، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتذل بد حیثیت، بے وقعت ہو کر ہوں تو پس اندازہ ہو سکتا ہے۔“ (محسن الملک-۱۰)

تاہم وہ طبعاً سادگی کی طرف مائل تھے اور ابتدا سے انتہا تک انہوں نے اس شان کو قائم رکھا، ان کو نہایت کثرت سے سفر کرنے پڑتے تھے لیکن ان کا خود بیان ہے کہ میں نے سفر میں ملازم ساتھ نہیں لیا، تنہا گھوما کرتا تھا، قسطنطنیہ کے طویل سفر کے لیے اگر چہ اعزہ و احباب نے باصرار کہا:

لا جرم خاد کے نیز بہ ہمراہ بہ بر

لیکن مولانا یکہ و تنہا روانہ ہو گئے۔

مولانا صحرائیت و فضائیت کے بہت دلدادہ تھے، اس لیے اگر چہ مکان وسیع، پر فضا اور خوش منظر پسند کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ ان کو دوسرے قسم کی زیب و زینت اور سامان آرائش کی کچھ پروا نہ تھی، مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ان کو کان پور میں مسجد کے ایک حجرے میں ٹھہرتے ہوئے دیکھا تھا، ندوہ میں مدتوں وہ اوپر کے ایک کمرہ میں مقیم رہے، فرنیچر کی کل کائنات ایک چٹائی، ایک فرش اور ایک بنگ سے زیادہ نہ تھی، البتہ محسن کسی قدر وسیع تھا اور ادھر ادھر فضائیت تھی، اس کے بعد انہوں نے کراہیہ کا ایک بڑا مکان لیا جس میں متعدد کمرے تھے لیکن ان کی ضروریات کے لیے صرف ایک کمرہ تھا، بقعہ میں طلبہ اور بعض مدرسین رہتے تھے، آخر میں امین آباد پارک کے ایک بالائی کمرے میں اٹھ آئے تھے، جس کا کراہیہ ۱۰ روپیہ ماہ وار تھا لیکن پارک کی فضائیت کے اس قدر شیفٹ تھے کہ فرماتے تھے کہ ایسی کوئی جگہ بسنی میں بھی نہیں، ایک بار یہ دیکھ کر کہ بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آتے ہیں، اس کمرے کو فرنش بھی کیا، ایک دری اور ایک قالین، متعدد کرسیاں منگوائیں لیکن جب ”خدام الدین“ کی جماعت قائم کی اور ان کو زہد و تقشف اور سادہ زندگی اختیار کرنے کی طرف مائل کیا تو کرسیاں دفتر سیرت نبوی ﷺ کو دے دیں، اور دری اپنے فرزند محمد حامد صاحب کو عنایت کی اور خود ایک چٹائی پر بیٹھنا پسند کیا، فرماتے تھے کہ ایک میز اور ایک کرسی تو البتہ میرے لیے لازمی ہے کہ بغیر اس کے لکھ نہیں سکتا اور تمام چیزیں غیر ضروری ہیں۔

کپڑے بھی نہایت سادہ پہنتے تھے، کپڑوں کی تعداد بھی نہایت محدود تھی، سات آٹھ سپید پانچامے، اسی قدر رسید کرتے اور تین چار سرد اور گرم شر و انیاں اور یہ کپڑے کوئی بہت زیادہ قیمتی بھی نہیں ہوتے تھے، عمامہ اور عبا کا استعمال صرف مخصوص جلسوں میں کرتے تھے اور غالباً یہ چیزیں کسی قدر گراں قیمت ہوتی تھیں، اخیر اخیر میں تو طبیعت سادگی کی طرف بے انتہا مائل ہو گئی تھی، ایک بار مولوی عبدالسلام صاحب سے فرمایا کہ دنگلے کے لیے مجھے کوئی چھینٹ لا دو، وہ ۴ گز کی ایک نقلی جامدہ دار لے گئے، وہ دل میں ڈر رہے تھے کہ اگر یہ ناپسند ہوئی تو مجھ پر جھلائیں گے لیکن اس کو بار بار ادھر ادھر سے دیکھ کر فرمایا کہ ”ہاں نہایت عمدہ ہے، اب اس سے بہتر کپڑا دنگلے کے لیے کیا ہو سکتا ہے“ چنانچہ اسی کا دگلا بنوایا اور دو سال اسی کو پہنتے رہے، ایک بار تو شیر وانی وغیرہ سب بالائے طاق رکھ دی تھی اور صرف ایک کرتہ ایک صدری اور میرٹھ کی ٹوپی استعمال کرنی شروع کی تھی، ندوہ کے جس جلسہ انتظامیہ میں مولانا پرمکیشن بیٹھا تھا، اس میں مولانا اسی وضع میں گئے تھے فرماتے تھے کہ اس لباس نے مجھ میں کچھ ایسا انکسار پیدا کر دیا تھا کہ میں خاموش تمام لوگوں کا منہ دیکھتا رہا، شیر وانی پہننے سے بدن میں جو جستی پیدا ہوتی تھی، اس کا مطلق اثر نہیں معلوم ہوتا تھا ورنہ ایک ڈانٹ میں تمام کمیشن ہوا ہو جاتا۔“

اپنے زیر تربیت طلبہ کو ہمیشہ سادہ لباس اور عالمانہ وضع اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور ان کے سامنے خود اپنا نمونہ پیش کرتے تھے، وفات سے صرف ایک ماہ پیش تر اپنے ایک حوصلہ مند عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں ”افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہے، میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے، جو سید صاحب سکھا گئے، ہندو اسی سے بازی لے گئے اور قیامت تک لے جائیں گے، میں اپنے مصارف برابر گھٹا رہا ہوں، سرمائی کچھ نہیں بنوائی، پرانی چھینٹ کی اچکن اس سال کو بھی ختم کر لے گی اور انشاء اللہ اخیر سادگی تک آ جاؤں گا، بھائی! ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کیا ہوتا ہے، یہ سچ ہے کہ لوگ بد حیثیت کی وقعت نہیں کرتے لیکن یہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کو دو چار دن کا تجربہ ہو، جن لوگوں میں برسوں آدمی رہ چکا اور رہے گا، وہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ محض بیکار ہے۔“ (مسعود-۳۳)

دارالمصنفین میں تعلیم و تربیت کے لیے جن طلبہ کو انتخاب کرنا چاہا، ان کے لیے یہ شرط بھی لگادی، ”وضع و لباس و فرانس میں علما کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں، گو یہ جزئی بات ہے لیکن میں

شروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قص لہجیہ تو سخت ناگوار ہے، میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہوں۔“ (مسعود-۲۱)

ندوہ میں خدامِ دین کی جماعت اسی اصول کے مطابق قائم کی تھی اور وہاں سے الگ ہو کر مدرسہ سرائے میر کو بالکل گروکل کے اصول پر چلانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

یوپی کے گورنر لاٹوش صاحب ولایت واپس جا رہے تھے، چوں کہ وہ ہر دل عزیز رہے تھے، اس لیے ان کو الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر بڑا مجمع تھا، مولانا بھی تشریف لے جا رہے تھے لیکن ان کے پاس کوئی اچھی عبا نہ تھی، مجھے لکھا کہ تمہارے پاس کوئی اچھی عبا ہو تو بھیج دو، میں نے اپنی دو تین عبائیں بھیج دیں، مولانا نے ان میں سے ایک سبز رنگ کی عبا جس میں ریشم کی دھاریاں تھیں اور مدنی وضع کی تھی، پسند کی اور اس کو پہن کر تشریف لے گئے، جب میں حسب معمول شام کو مولانا سے ملنے گیا تو فرمایا کہ آج تمہاری عبا نے مجھ کو بہت ذلیل کیا، وہاں مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) بھی تھے، وہ چار آنے نگر کی شروانی پہنے تھے، مجھے بڑی شرم آئی۔

رحم دلی | وہ فطرۃ نہایت رقیق القلب تھے، اس لیے معمولی سے معمولی درد انگیز واقعہ سے ان کا دل بھرا آتا تھا۔

ایک بار اعظم گڑھ سے پالکی پر سوار ہو کر مکان جا رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ چند آدمی شدت کے ساتھ گریہ و زاری کر رہے ہیں، واقعہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ غریب کاشت کار ہیں، ان کا تیل مر گیا ہے، فوراً ان لوگوں کو دس روپیے دیے۔

مولانا کے خاندان کے لوگ اسامیوں پر سختی کرتے، ان کو مارتے پینتے تو مولانا اس کو بہت ناپسند فرماتے، کسی کی فاقہ زدگی سے سخت متاثر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ایک شخص فاقہ سے ہے تو میں کھانا نہیں کھا سکتا۔

فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی بادشاہ کی رعایا میں ایک شخص بھی فاقہ سے رہ جائے تو اس کو کھانا

حرام ہے۔

یہ رحم دلی ہی کا اثر تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر رو دیتے تھے، ادھر دل پر ذرا چوٹ لگی اور ادھر

لے ڈانڈھی ترشوانا۔

آنکھوں میں آنسوؤں تیرنے لگے۔

ایک دفعہ شام کے وقت امین آباد پارک کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، مکان کے پہلو میں ایک لڑکی کا کان چھیدا جا رہا تھا، وہ بار بار چیختی تھی، تو مولانا کے چہرہ و پیشانی پر شکن پڑ پڑ جاتی تھی، جب ضبط نہ ہو سکا تو ملازم کو بلا کر کہا کہ ”اس لڑکی کی ماں سے جا کر کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو کیوں ذبح کر رہی ہے، مولانا سمجھتے تھے کہ ماں لڑکی کو ماری ہے لیکن ملازم نے آکر کہا کہ لڑکی کا کان چھیدا جا رہا ہے۔

ذکاوتِ حس | دنیا میں جو بڑے بڑے اشخاص گزرے ہیں وہ ہمیشہ تر نہایت شدید احساس تھے اور اسی قوتِ انفعالی نے ان کو قوم کی اصلاح، مذہب کی تجدید اور علم کی خدمت پر آمادہ کیا تھا، مولانا میں بھی یہ قوتِ شدت کے ساتھ موجود تھی اور اسی قوت نے ان کو ایک فطری شاعر، ایک پر جوش مقرر اور ایک قومی مصلح بنایا تھا۔

اس قوت کا اثر مولانا کے اخلاق و عادات کے ایک ایک جزئیات سے نمایاں ہوتا تھا، معمولی سے معمولی ناگوار واقعہ پیش آجاتا تو ان کی پیشانی پر گرہ پڑ جاتی تھی، کوئی بات خلاف مزاج ہو جاتی تو سخت برہم ہو جاتے لیکن تھوڑی دیر کے بعد غصہ کا فور ہو جاتا، سکون و اطمینان میں ذرہ برابر خلل پڑتا تو بدحواس ہو جاتے، رات کو سوتے تو گھڑی کے کھٹکھٹانے کی آواز ناگوار ہوتی، امین آباد میں یکہ والے چلاتے تو ناگواری ظاہر کرتے، بمبئی میں مکان لیتے تو خاطر پر اس کا لحاظ رکھتے کہ ٹریم کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز وہاں تک نہ پہنچے، بدن پر کبھی بیٹھ جاتی تو سخت ناگواری محسوس کرتے، فرماتے تھے کہ ”بمبئی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں کھیاں نہیں ہوتیں، شور و غل سخت ناپسند تھا، جھوم و کشتکش سے سخت گھبراتے تھے اور سکنڈ کلاس میں صرف اسی لیے سفر کرتے تھے اور اسی لیے دوستوں کے مکانوں کے بہ جائے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے، ورنہ ان باتوں سے ان کو جاہ و اعزاز مقصود نہ تھا، اسی ذکاوتِ حس نے ان کو کسی قدر عجلت پسند بھی بنا دیا تھا، کسی کام کا خیال آتا تو اس کے کرنے میں نہایت عجلت سے کام لیتے، ہم لوگوں کو کسی بات کا حکم دیتے تو چاہتے کہ یہ کام فوراً ہو جائے، اگر ذرا دیر ہو جاتی تو سخت برہم ہوتے، اکثر ایسا ہوتا کہ وہ یاد فرماتے تو ہم یہ سوچ کر سہم جاتے کہ کوئی کام ایسا تو نہیں کہ انہوں نے کرنے کو کہا اور ہم نے اب تک نہیں کیا اور وہ اسی کی باز پرس کے لیے یاد فرما رہے ہوں۔

جب بیگم صاحبہ بھاول پور نے ندوہ کی عمارت کے لیے پچاس ہزار روپے عنایت فرمائے تو

ایک رات مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ندوہ کا بورڈنگ بھی تمام تر مستورات کے چندہ سے تیار ہو، یہ خیال پیدا ہونا تھا کہ اضطراب سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگے، بالآخر ضبط نہ ہو سکا اور ۳ بجے شب کو شمع جلائی اور مستورات کے نام ایک اپیل لکھا، جس کو صبح کے وقت چھپنے کے لیے بھیجا، ایک بار اعظم گڑھ میں برسات کا زمانہ تھا اور نیشنل اسکول کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی، ایک رات کو شدت سے پانی برسنے لگا اور مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ پانی برس رہا ہے، عمارت کی دیواریں گر رہی ہوں گی، اس تخیل سے اس قدر پریشان ہوئے کہ لحاف پھاڑ کر روئی نکالی اور کان میں ڈالی تاکہ پانی کے آواز سننے میں نہ آئے اور پریشانی دور ہو۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے ان کی ذکاوتِ حس کے مظاہر کو ان کے وفات کے مضمون میں نہایت استقصار کے ساتھ جمع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں، ”احساس بہت شدید تھا اس لیے رنجِ عالم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑنے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا، اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہو گئی، اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازم تھا۔“

عصبیتِ دینی | مولانا کے مزاج میں سخت عصبیت پائی جاتی تھی اور اس کا اثر مختلف مظاہر سے نمایاں ہوتا تھا، ابتدا میں وہ ایک متعصب حنفی تھے اور حنفیوں کی تائید اور غیر مقلدین کی تردید میں رسالے لکھتے تھے اور ان سے مناظرے کرتے تھے، مولانا کے گاؤں کے متصل ایک موضع کا نام جیراج پور ہے، یہاں مولوی سلامت اللہ صاحب ایک غیر مقلد عالم تھے، ان کا اور مولانا کا حریفانہ مقابلہ رہتا تھا۔

عام قومی حیثیت سے وہ عربوں اور ترکوں کے سخت حامی تھے، عربوں کے اس لیے کہ وہ اسلام کے منبع و ماویٰ، نبی کریم ﷺ کی قوم ہیں اور قرآن ان کی زبان میں ہے اور ترکوں کے اس لیے کہ ان کے زمانہ میں مسلمانوں کی عزت اور اسلام کی سلطنت ان ہی کے دم قدم سے قائم تھی، قسطنطنیہ کے سفر میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مسٹر آرنلڈ مولانا کے ساتھ تھے اور مولانا سے عربی پڑھا کرتے تھے، جہاز پر اسپین کا ایک عیسائی بھی ساتھ تھا، جو مسٹر آرنلڈ کے عربی پڑھنے سے نہایت جلتا تھا اور تحقیر کے ساتھ عربی حرفوں کو نہایت برے لہجے میں ادا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ اونٹوں کی زبان ہے، مولانا سفر نامہ

میں اس واقعہ کو لکھ کر تحریر فرماتے ہیں، "اگرچہ مجھ کو اس کی ان حرکتوں سے رنج ہوتا تھا لیکن جو قوم ایک مدت تک ذلت کے ساتھ عربوں کی زیر دست رہ چکی تھی، عرب اور عربی زبان کے ساتھ اس کا یہ سلوک بے جا نہ تھا۔"

اسی سفر میں مولانا کی رگ حمیت پر ایک اور نشتر لگا، جب جہاز عدن میں پہنچا تو سہالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار ہو کر جہاز کے قریب آئے اور بہت سے مبتذل حرکتیں کرنا شروع کیں، ناچے، گائے، بغلیں بجائیں اور ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ لوگ دوئی چونی پیسے جو کچھ انعام میں دینا چاہتے تھے اس کو سمندر میں پھینک دیتے تھے اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے تھے، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے، اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزا آتا تھا لیکن مولانا کی حالت کچھ اور تھی، چون کہ غلطی سے ان کا خیال تھا کہ یہ عرب کے بچے ہیں، اس لیے یہ طبعی بات تھی کہ وہ ان کو عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے لیکن وہ انعام لینے کے لیے ایسے مبتذل حرکتیں کرتے تھے کہ یہ مولانا کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا تھا، ان کو عبرت ہوئی کہ عرب کی اب یہ حالت ہو گئی کہ غیروں کے سامنے ان کو اس قسم کے حرکات سے مطلق شرم نہیں آتی، اس لیے ان کا دل بے اختیار بھر آیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے اختیار زبان سے نکلا، تم یا عمر! مسٹر آرنلڈ پاس تھے، ان کو مولانا کی تغیر حالت کا خیال ہوا، مولانا نے اپنے دل کی کیفیت اور اس کا سبب بیان کیا، تو انہوں نے ایک بار آنکھ اٹھا کر مولانا کی طرف دیکھا اور چپ ہو رہے لیکن بعد کو جب معلوم ہوا کہ سہالی قوم عرب نہیں ہے، تو مولانا کو کسی قدر تسکین ہوئی، اسی غصہ و رنج کا نتیجہ تھا کہ قصیدہ سفریہ میں مولانا کے قلم سے اس قوم کے ججو میں یہ اشعار نکلے:

مردم شہر کہ خود را بہ سہالی نامند	حیوان اند نہ بل از حیواں ہم بدتر
خوار بد بخت و سیہ کار و سیہ چہرہ درشت	سفلہ و ممتخص و کج روشن و بد گوہر
خویشترین را بہ عرب بستہ و حاشا کہ عرب	اس چہنیں خوار و زبوں شان نہ پسندد اور
چوں زبان ہمہ تازی بود و ہم چو عرب	نام شان بستہ بود بالقب جدید پدر
عامیان در خلط افتند و گمان بازیرند	کہ مگر در نسب و نسل ز معاداند و مضر
تخم و ہم ریضہ اس نخل ز خاک جش است	کہ دریں جائے بیار آمد و افشاند شر

جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ تمدن اسلامی" کی تردید جن اسباب کی بنا پر کی ان میں ایک

بڑا سبب یہ تھا کہ اس نے عرب کی تحقیر کی تھی، ان کی طرف بہت سے معائب منسوب کیے تھے، چنانچہ الاثقاد میں مؤلف سے جو معذرت کی ہے، اس کی تمہید ان الفاظ میں شروع کی ہے۔

”اے فاضل مؤلف! میں آپ کے احسان کا انکار نہیں کر سکتا، کیوں کہ آپ نے اس کتاب میں میرا نام شان دار طریقہ سے لیا ہے، مجھ کو مستند قرار دیا ہے، میرے اقوال سے استشہاد کیا ہے اور مجھ کو مشاہیر علمائے ہند میں شمار کیا ہے لیکن بایں ہمہ کیا میں یہ پسند کر سکتا ہوں کہ آپ میری تعریف اور عربوں کی ہجو کریں، ان کو اپنے تیر و سنان کا آماجگاہ بنائیں، ان کی طرف ہر قسم کے عیوب و شائع منسوب کریں، یہاں تک کہ ان کے اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں اور ان کے پر نچے اڑادیں۔“

اسی عصبیت کی بنا پر ترکوں کے تمام معاملات سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے، جب ٹرکی پر کسی پور پین سلطنت کی طرف سے حملہ ہوتا تھا تو ہر ممکن طریقہ سے ترکوں کی اعانت میں حصہ لیتے تھے، ان کی کام یابی سے خوش اور ناکام یابی سے رنجیدہ ہوتے تھے، ترکوں اور روسیوں میں جو جنگ ہوئی تھی، اس میں مولانا نے ترکوں کی امداد و اعانت کے لیے ایک انجمن قائم کی، خود اس کے سکرٹری بنے اور اپنے ضلع سے تین ہزار کی رقم چندہ کر کے بھیجی، جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ندوہ میں مولانا نے ایک پر جوش تقریر کی، تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ان پر رقت طاری ہو گئی اور گلو گرفتہ ہو گئے، چندہ ہوا تو خود سوروپیہ کی رقم دی۔

سلطان المعظم کو نہایت وقعت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بقطنظیہ میں عید کے دن سلطان کا جو جلوس دیکھا، اس سے سخت متاثر ہوئے، اسی تاثر اور انفعال کی حالت میں مثنوی عید یہ لکھی ہے جس میں سلطان المعظم کا نام نہایت عقیدت مندانہ طریقہ سے لیا ہے اور طرح طرح سے ان کے وجود کو اپنے قومی و اسلامی جذبات کی تسکین کا سرمایہ بنانا چاہا ہے۔

ترکوں کے اخلاق اور حسن معاشرت کے نہایت معترف تھے، چنانچہ سفر نامہ میں ترکوں کے اخلاق و طرز معاشرت کا ایک عنوان قائم کیا ہے اور اس میں ان کے تمام اخلاق و محاسن گنائے ہیں، سفر نامہ کا اختتام بھی ترکوں ہی کی مدح سرائی پر کیا ہے۔

عربوں اور ترکوں کے علاوہ تمام سلاطین اسلام کے سخت حامی تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے لے کر مامون جہاں گیر اور عالم گیر پر جو الزامات لگائے جاتے تھے، شدت کے ساتھ ان کی تردید

کرتے تھے، جہاں گیر کو تمام دنیا صرف ایک عیش پسند بادشاہ خیال کرتی تھی لیکن مولانا نے اس پر اللہ وہ میں جو مضمون لکھا ہے، اس میں اس قسم کے مذہبی، سیاسی اور علمی واقعات اس کثرت سے جمع کیے ہیں جن سے اس خیال کی بہت کچھ تردید ہو جاتی ہے، عالم گیر پر تعصب و تنگ دلی کا جو الزام قائم کیا جاتا تھا، ایک سلسلہ مضمون میں اس کی تردید نہایت پر زور طریقہ سے کی ہے۔

ان کی یہ عصبیت ان کے اس خیال کا نتیجہ تھی کہ یہ بادشاہ بہر حال مسلمانوں کے نمائندے اور اسلام کے فرمانروا تھے، مخالفین ان کی برائیاں اس لیے دکھاتے تھے کہ اس سے اسلام اور مسلمان بدنام ہوں اور مولانا کو یہ بدنامی کسی حال میں گوارا نہ تھی۔

پابندی اوقات | وہ اپنے معمولات اور فرائض کے سخت پابند تھے، فرماتے تھے کہ جب میں علی گڑھ میں تھا تو مجھے یاد آتا ہے کہ جب کالج کی گھنٹی ہوتی تھی تو ٹھیک وقت پر پہنچنے کے لیے میں اس تیزی سے دوڑتا تھا کہ پاؤں میں درد ہو جاتا تھا، علی گڑھ سے علاحدہ ہو کر اگر چہ انہوں نے تمام عمر آزادانہ بسر کی لیکن اس حالت میں بھی جو معمول تھا اس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا تھا، عموماً صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے اور دن نکلنے تک تمام ضروریات سے فارغ ہو کر تصنیف و تالیف کے لیے بیٹھ جاتے تھے اور آٹھ بجے تک اس سے بھی فارغ ہو جاتے، اس کے بعد اخبار بینی، کتب بینی اور دوسرے متفرق کام کرتے تھے، خطوط کا جواب روز اند دیتے تھے، قاضی تلمذ حسین صاحب جو ایک زمانہ میں مولانا کے سخت مخالف ہو گئے تھے، فرماتے تھے کہ ”تمام عیوب کے ساتھ مولانا شبلی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خط کا جواب ٹھیک وقت پر دیتے ہیں“ وہ خطوں کا جواب اس پابندی سے دیتے تھے کہ ایک دن کی بھی دیر نہیں کرتے تھے، ہم لوگ ڈاک آنے جانے کے دن گن کر جواب کی امید باندھتے تھے اور ٹھیک وقت پر جواب آ جاتا تھا۔

اللہ وہ کی اشاعت میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی، اس سے سخت پریشان ہوتے تھے اور اس کے لیے صاحب مطبع اور مضمون نگاروں پر سخت پابندیاں عائد کرتے تھے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا تھا تو فرماتے تھے کہ اب تو یورپ میں رہنے کو جی چاہتا ہے، جہاں کام ٹھیک وقت پر انجام پاتا ہے۔

اعزہ واقارب سے محبت | مولانا اگرچہ بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتے تھے، تاہم اعزہ واقارب سے نہایت محبت رکھتے تھے، والدہ کے انتقال کو اگرچہ ایک مدت ہو چکی تھی لیکن مولانا کے دل میں اب تک ان کی محبت کی یاد تازہ تھی، فرماتے تھے کہ جب کبھی والدہ یاد آ جاتی ہیں تو تڑپ تڑپ جاتا ہوں۔

مولانا کے والد نے مولانا کی والدہ کی زندگی ہی میں ایک دوسری شادی کر لی تھی اور مولانا کو اس سے اس قدر اختلاف تھا کہ جب تک مولانا کے والد زندہ رہے، انہوں نے اس مکان میں قدم تک نہیں رکھا، جس میں یہ دوسری بی بی رہتی تھیں لیکن والد کے مرنے کے ساتھ ہی محبت اور انسانیت کے اقتضا سے مولانا نے خود اسی مکان میں قیام کیا اور باوجودیکہ مولانا کے دوسرے بھائی وکیل تھے اور مولانا سے زیادہ آمدنی رکھتے تھے لیکن مولانا نے خود اپنے وظیفہ سے ۳۰ روپیے ماہ وار ان کی تنخواہ مقرر کر دی اور اس کو برابر دیتے رہے، چنانچہ اپنے بھائی مولوی اسحاق مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں ’’دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپیے ہیں چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا، اس سے غریبانہ زندگی خاصی طرح بسر ہو سکتی ہے۔‘‘ (الحق ۱۹)

بھائیوں سے اس قدر الفت رکھتے تھے کہ مہدی مرحوم نے انتقال کیا تو مولانا نے ہفتوں کسی سے بات چیت تک نہیں کی، فرماتے تھے کہ والد مرحوم آتے تھے اور لوگوں سے ہنستے بولتے تھے تو مجھے تعجب ہوتا تھا، ایک بار مولوی عبدالسلام صاحب نے پوچھا کہ آپ نے ان کا مرثیہ کیوں نہیں لکھا، تو بولے کہ جو اس کب بجاتھے۔

مہدی مرحوم کی بیوہ سے اگرچہ مولانا بذات خود ناراض رہتے تھے لیکن اپنے وظیفہ میں ان کو بھی شریک کر لیا تھا اور ایک ماہ وار رقم ان کو ہمیشہ دیا کرتے تھے۔

اخیر میں مولوی اسحاق صاحب کی موت نے تو ان کی زندگی کا خاتمہ ہی کر دیا، مولانا پر اس حادثہ کا جو اثر ہوا، اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے، جو انہوں نے اس زمانہ میں لکھے ہیں، ان کے انتقال کے بعد جتنے دنوں زندہ رہے، ان ہی کے ماتم میں رہے اور آخر کار اسی غم میں جان دی۔

پہلے محل سے اولاد زینہ میں صرف ایک حامد صاحب ہیں، وہ ایک دفعہ والد سے ناراض ہو کر کہیں چل دیے تھے، تو اس قدر بدحواس ہوئے کہ کئی دن تک کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، وہ ایک دفعہ اعظم گڑھ میں طاعون میں مبتلا ہوئے، مولانا لکھنؤ میں تھے، خبر ملی تو فوراً لکھنؤ سے اعظم گڑھ روانہ ہو گئے اور ان کی تیمارداری کی۔

مولانا کی دوسری شادی سے جو لڑکا پیدا ہوا، اس سے بھی وہ بڑی محبت رکھتے تھے، ان کی محبوب ترین چیز صرف کتاب تھی لیکن صرف یہی لڑکا تھا جو اس معاملہ میں کتاب کی قائم مقامی کر سکتا تھا،

چنانچہ حیدرآباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں ”اس پیرانہ سالی میں خدانے مجھ کو پھر باپ بنایا، کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔“ (مہدی-۱۲)

افسوس ہے کہ اس لڑکے نے وطن میں انتقال کیا، اس وقت مولانا حیدرآباد میں تھے، یہ افسوسناک خبر پہنچی تو ان پر بدحواسی کا عالم طاری ہو گیا، فرماتے تھے کہ تین دن تک پڑا پڑا ہائے ہائے!! کر کے رویا کرتا تھا۔

لڑکیوں سے نہایت محبت رکھتے تھے، چھوٹی لڑکی فاطمہ بیمار ہوئی اور بیماری نے طول کھینچا تو لکھنؤ بلا کر نہایت اہتمام کے ساتھ علاج کیا لیکن افاقہ نہ ہوا اور وطن میں جا کر اس نے انتقال کیا، مولانا کو اس کی خبر ہوئی تو سب کو ہشادیا اور کمرے میں جا کر خوب روئے، اس کی علالت کی حالت میں اس کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان سے محبت کا اظہار ہوتا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں ”قرۃ العین من! سخت افسوس سے سنا کہ تم کو ابھی تک افاقہ نہیں ہوا، عزیز بی! میری اولاد میں جس کو مجھ سے پداری محبت ہے، صرف تمہیں ہو، اس لیے تم سمجھتی ہو کہ مجھ کو کس قدر تمہاری بیماری کا رنج ہے، میں اس وقت لکھنؤ سے بہت دور ہوں، ورنہ فوراً پہنچتا، خدانے چاہا تو لکھنؤ پہنچ کر سب سے پہلے بندول آؤں گا۔“ (فاطمہ خانم-۳)

نواسوں سے بھی محبت رکھتے تھے، ایک بار بڑی لڑکی کے لڑکے کو اپنے ساتھ لکھنؤ لائے اور اس کو چند دنوں ساتھ رکھا۔

پوتے سے نہایت الفت تھی، ایک مرتبہ غازی پور میں حامد صاحب کا بچہ بیمار ہوا تو مولانا بنارس میں تھے، خبر ہوئی تو سخت پریشانی کی حالت میں غازی پور گئے اور کئی دن مقیم رہ کر اس کا علاج کیا، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں ”میاں حامد کا بچہ سخت غلیل ہو گیا اور میں نہایت پریشانی میں غازی پور گیا اور آج آ کر پھر واپس جاتا ہوں۔“ (مہدی-۲۲)

بدقسمتی سے اسی علالت میں اس بچے نے انتقال کیا، اس کے بعد تا مرگ دوسرے پوتے کے پیدا ہونے کی حسرت دل میں رہی۔

دوسری بی بی سے بھی بہت محبت رکھتے تھے، چنانچہ ان کا انتقال ہوا تو فرماتے تھے کہ میں اس زور سے چیخ کر رویا کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہو گیا۔“

اپنے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولوی حمید الدین صاحب مرحوم سے نہایت خلوص تھا اور

ان کو ہر بات میں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، کابل سے ترجمہ ابن خلدون کی تحریک ہوئی تو انہی کا نام پیش کیا، علی گڑھ کی عربی پروفیسری کے لیے نواب محسن الملک نے لکھا تو انہی کے لیے کوشش کی اور وہ اسی کوشش سے وہاں کے پروفیسر مقرر ہوئے، دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپل کے لیے مولانا کا انتخاب ہوا تو انہوں نے یہ جگہ بھی مولوی حمید الدین صاحب کو دلا دی، ان کی فارسی سخن سنجی نکتہ آفرینی اور آخر میں ان کی قرآن فہمی کے بے حد معترف تھے، مسائل کی تحقیق میں ان سے مشورے کرتے تھے، ان کے فارسی کلام کی نسبت کہتے تھے کہ یہ زبان ہے، ان کی مذہبی علمی و عملی شیفتگی اور پابندی کی بنا پر ان کو درویش کہتے تھے اور تھے بھی، وہ ایسے ہی عقیدہ اور عملاً نمونہ سلف رحمۃ اللہ تعالیٰ، دیندار اور عبادت گزار، تہجد گزار، متقی، متوکل، صابر و قانع، متواضع و خاک سار، غرض مجموعہ اوصاف۔

اعزہ میں مولوی محمد سمیع صاحب سے بھی بہت انس تھا، چنانچہ سفر قسطنطنیہ میں ان کو ساتھ لیجانا چاہا تھا، اسی تعلق کی بنا پر ان کے بھائی علی ضامن کا بہت خیال رکھتے تھے اور تعلیمی معاملات میں ان کو مالی اعانت دیتے تھے۔

وہ اپنے تلامذہ سے بھی مثل عزیزوں ہی کے محبت رکھتے تھے، راقم الحروف فراغت کے بعد ۱۹۰۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ایک ملازمت کے خیال سے لکھنؤ سے چلنے لگا تو مولانا سے رخصت ہونے گیا، انہوں نے پہلے آذربیل مولوی شرف الدین صاحب نج ہائی کورٹ کلکتہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر دیا کہ وہ سر ڈینی سن راس صاحب سے جو ان دنوں مدرسہ عالیہ کے صدر تھے، مجھے ملادیں، خط لکھ کر میرے ہاتھوں میں دیا تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر فرمایا ”سلیمان اگر ندوہ میں گنجائش ہوتی تو میں تم کو کہیں جانے نہ دیتا۔“

دوسرے تلامذہ سے بھی ان کا برتاؤ یہی تھا اور ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھی سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، حالاں کہ مولانا کا مزاج بہت جھلاتا تھا، یعنی ان کو غصہ جلد آتا تھا، پھر بھی ہر شاگردان پر نچھاور ہونے کو تیار رہتا تھا اور اس غصہ کو بھی ان کی محبت ہی کا مظہر سمجھتا تھا۔

کتبِ نبوی | مولانا کو بچپن ہی سے کتبِ نبوی کا نہایت شوق تھا، جب اعظم گڑھ میں ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے تو روزانہ ایک کتب فروش کی دوکان پر جا کر فارسی کی کتابیں دیکھا کرتے تھے، ایک روز

۱۔ افسوس ہے کہ راس صاحب نے ان دنوں ستمبر ۱۹۳۰ء میں قسطنطنیہ میں وفات پائی جہاں وہ انگریزی و ترکی مصالحت کی بنا پر تھیں۔ ۱۲۔

مولانا کے والد نے ان کو کتب فروش کی دوکان پر دیکھا تو منع فرمایا، اب مولانا نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کی دوکان سے کتابیں لے آتے تھے اور مکان پر دیکھتے تھے، بڑے مزے کی بات تو یہ تھی کہ باوجود اس شوق کے کتاب کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جاتا تھا لیکن صرف ایک آدھ لفظ اور ایک آدھ سطر سمجھ میں آتی تھی اور اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہو کر کرب معاش کے کاموں میں مصروف ہوئے، تب بھی یہ شوق قائم رہا، امانت کا کام کرتے تھے اور ادھر ادھر گھوڑے پر سوار ہو کر دورہ کرتے پھرتے تھے لیکن اس حالت میں بھی دیوانہ حماسہ ساتھ رہتا تھا، جہاں ذرا سا آرام لینے کا موقع ملا، اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ حج و زیارت کے سلسلہ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو وہاں کے کتب خانوں کی بھی سیر کی، فرماتے تھے کہ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ان ہی کتب خانوں میں نظر آیا، تمہید ابن عبد البر یہیں دیکھی تھی۔

علی گڑھ تشریف لے گئے تو اس شوق کے پورا کرنے کا کافی سامان ہاتھ آیا، سید صاحب کتب خانہ بہترین کتابوں کا مجموعہ تھا اور انہوں نے مولانا کے ذوقِ علم کو دیکھ کر مطالعہ کی عام اجازت دے دی اور مولانا نے دل کھول کے اس گنجینہ علم سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ ایک خط میں نہایت مسرت کے ساتھ لکھتے ہیں ”سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں، لہذا صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپے کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے۔“ (سج-۳)

علی گڑھ میں مولانا کے ایک اور دوست تھے جن کو کتابوں کا بڑا شوق تھا، وہ مولانا کے پاس فخریہ کتابیں بھیج دیتے تھے اور مولانا نہایت شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، چنانچہ ایک عزیز کو نہایت مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع دیتے ہیں ”یہاں ایک شخص عبدالحمید نامی اہل مدحکمہ کلکٹری ہیں، یہ صاحب دیوان ہیں اور کتابوں کے بڑے شائق، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کا دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو

بہت سی کتابیں لکھوادی ہیں اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بیچارے فخریہ کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں..... ممکن ہے سلمان ساوجی و طالب آملی دیکھنے کو مل جائے۔“ (سج-۲)

گزشتہ تعلیم المامون اور سیرۃ النعمان کی تصنیف تک تو ہندوستان کے علمی سرمایہ نے مولانا کا ساتھ دیا لیکن الفاروق کی تصنیف کا خیال ہوا تو مولانا کو یہ سرمایہ ناکافی معلوم ہوا، اس لیے مصر و قسطنطنیہ کے ائق کی طرف نگاہ اٹھائی اور محض ذوق علم کے لیے طویل المسافت اور کثیر المصارف سفر کے لیے تیار ہو گئے اور ہندوستان کی علمی تاریخ میں ممالک اسلامیہ کا غالباً یہ پہلا سفر ہے جو محض ذوق علم کے لیے کیا گیا، مولانا قسطنطنیہ پہنچے تو کتب خانوں کی سیر میں مصروف ہوئے، کتب خانے نہایت دور دور واقع تھے لیکن مولانا پیدل جاتے تھے اور ان کو دیکھتے تھے، چنانچہ اپنے والد کو قسطنطنیہ سے ایک خط میں لکھتے ہیں ”کتابیں نہایت عجائب و غرائب ہیں، لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہو سکتی ہے، نہ حافظان کے لیے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل زیادہ سیر کرتا ہوں کیوں کہ کتب خانہ دور دور واقع ہیں۔“ (مکاتیب-۱)

ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں ”سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لی جائے یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جاسکے، کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں لیکن کہاں تک لکھوائی جاسکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں۔“

اس وقت بلکہ زمانہ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔“ (مکاتیب-۱)

سفر نامہ میں قسطنطنیہ کے جو حالات لکھے ہیں، ان میں کتب خانوں کا ذکر اس تمہید کے ساتھ کیا ہے۔ ”ترتیب مضمون اور نسق کلام کی وجہ سے میں اس عنوان پر دیر میں پہنچا، ورنہ ذاتی شوق اور غایت سفر کے لحاظ سے یہی مضمون تھا، جس کو میں سب سے اول اور سب سے مفصل لکھتا..... اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلیم و تعلم کا چرچا ہے، وہ ہندوستان، عرب، مصر، شام، بلاد مغرب، فارس اور ایران ہیں، ان میں سے اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو نہیں دیکھا ہے وہ ایسے قوی وسائل سے معلوم ہے کہ دیکھنے کے برابر ہے، اس بنا پر میں کافی یقین کے ساتھ

کہہ سکتا ہوں کہ تمام اسلامی دنیا میں قسطنطنیہ عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔“ (ص ۸۹، ۹۰)

ہندوستان کا شاید ہی کوئی کتب خانہ ہو جس کو انہوں نے بار بار نہیں دیکھا، رام پور کا سرکاری کتب خانہ، لکھنؤ میں مولوی حامد حسن صاحب کا کتب خانہ، خدابخش خاں لاہری کی باگی پور، ایشیا ٹک سوسائٹی لاہری کی کلکتہ، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد وغیرہ کے علاوہ لوگوں کے ذاتی کتب خانوں کی بھی سیر فرمایا کرتے تھے، بلکہ جب کسی شہر میں جاتے تھے، تو وہاں اگر کتابوں کا کوئی ذخیرہ کسی کے پاس ہوتا تو اس کو جا کر ضرور دیکھتے۔

مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی کتاب اول سے آخر تک نہیں پڑھتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر یہ طریقہ اختیار کروں تو ایک ہی کتاب میں الجھ کر رہ جاؤں، بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر اوراق الٹتے پلٹتے رہتے تھے اور نہایت سرعت کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے لیکن بایں ہمہ کتاب میں جو بہترین معلومات ہوتیں، ان پر نگاہ پڑ جاتی اور ان معلومات پر اس قدر حاوی ہو جاتے کہ کتاب پر یو یو کرنے کے لیے بالکل تیار ہو جاتے۔

مولانا کی تصنیفات کا زیادہ تر حصہ بہ ظاہر تاریخ و سیر میں ہے، اس بنا پر بہت سے ناواقف لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نے تاریخ و ادب کے سوا اور کوئی فن سرے سے پڑھا ہی نہیں تھا اور کم از کم یہ خیال تو ہر شخص کے دل میں گزرتا ہوگا کہ ان کے مطالعہ میں تاریخ و سیر کے سوا اور کسی فن کی کتابیں نہیں رہتی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے مولانا نے فلسفہ، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث غرض تمام علوم کو بالاستیعاب پڑھا تھا اور ہمیشہ ان علوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، تاریخ و ادب کی نسبت جس کو ان کی تمام تر کائنات سمجھا جاتا ہے، مولانا خود فرماتے تھے کہ ”یہ تو ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے۔“

صحت و علالت، سفر و حضر، جلوت و خلوت، غرض ہر حالت میں کتابیں ان کی رفیق رہتیں، سفر کشمیر سے واپس آ کر جب سخت بیمار پڑے تو اس حالت میں بھی مطالعہ برابر جاری تھا، فرماتے تھے کہ میں اس زمانہ میں اکثر صدر ادا دیکھا کرتا تھا۔“

ایک بار جب اعظم گڑھ میں سخت طاعون آیا اور خود مولانا کے فرزند محمد حامد صاحب بتائے طاعون ہوئے تو لوگ شہر سے باہر چھپروں میں نکل گئے اور مولانا بھی مع حامد کے چھپر میں مقیم تھے اور شبلی منزل کو چھوڑ دیا تھا، ایک روز اسی حالت میں محقق طوسی کی شرح اشارات دیکھ رہے تھے، محقق طوسی

نے امام رازی پر ایک اعتراض کیا تھا جو مولانا کو غلط معلوم ہوا، باوجودیکہ شہر میں طاعون تھا اور بنگلہ بند تھا، لیکن فوراً اٹھے اور بنگلہ کھول کر محاکمات نکالی اور اس میں دیکھا تو واقعی محقق طوسی کا اعتراض غلط تھا۔ وہ بذاتِ خود اگرچہ ہر چیز میں ترتیب و نظام چاہتے تھے لیکن مطالعہ کے معاملے میں ان کو مجبوراً یہ اصول توڑ دینا پڑتا تھا، کمرے میں کتابیں ادھر ادھر پڑی رہتی تھیں، مولانا کو اگرچہ یہ بے ترتیبی ناگوار تھی لیکن فرماتے تھے کہ کیا کیا جائے؟ اگر کتابوں کو مرتب رکھوں تو مطالعہ میں خلل واقع ہو۔

مولانا کی کثرتِ تصنیفات کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے اوقات کا اکثر حصہ تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صبح کو صرف ایک دو گھنٹے تصنیف و تالیف میں صرف کرتے تھے اور صرف صفحہ دو صفحہ لکھتے تھے، بقیہ اوقات کتبِ نبوی کے نذر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ ”میں تنہائی میں کبھی بغیر کتابوں کے نہیں بیٹھ سکتا“ مولوی وحید الدین سلیم جب لکھنؤ میں مسلم گزٹ کے ایڈیٹر بنے اور امین آباد پارک میں مولانا کے پہلو میں رہتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ”مولانا شبلی کیوں قاق ہو گئے ہیں؟ میں جب جاتا ہوں کبھی ان کو بیکار نہیں پاتا، ہر وقت کتابیں الٹا پلٹا کرتے ہیں، یہ صحت کے لیے سخت مضر ہے، مولانا عبدالحی مرحوم فرنگی محلی کو اس کی بدولت صرع کا عارضہ ہوا اور وہی ان کی موت کا سبب ہو گیا۔“

اسی طرح مولانا کی نظر سے تمام موجودہ کتابیں گزر چکی تھیں، فرماتے تھے کہ ”اب تو کتابیں دیکھنے کو نہیں ملتیں“ جب کسی نئی اور نادر کتاب کا پتہ چلتا تو اس کے دیکھنے کے شوق میں بیتاب ہو جاتے، بسبئی کی جامع مسجد میں ایک مختصر سا کتب خانہ ہے، مولوی عبدالسلام صاحب جب بسبئی میں ان کے ساتھ تھے، تو ان سے فرمایا کہ جا کر اس کتب خانہ کو دیکھ آؤ اور اگر کوئی نادر اور قلمی کتاب ہو تو اس کا نام لکھ لاؤ، وہ چند کتابوں کے نام لکھ لائے، انہی کتابوں میں فقال کی کتاب محاسن الشریعہ کا نام بھی تھا، فقال بہت بڑے متکلم ہیں اور عقلی طرز پر قرآن مجید کی تفسیر کی ہے، تفسیر کبیر میں جاہِ جاان کے اقوال مذکور ہیں اور مولانا نے ان کو علم کلام کے بانیوں میں قرار دیا ہے اور علم کلام اور الکلام میں ان کے جتہ جتہ اقوال سے جو تفسیر کبیر میں مذکور ہیں فائدہ اٹھایا ہے، مولانا نے ان کی کتاب کا نام پڑھا تو شوق کے لہجہ میں فرمایا کہ یہی ایک کتاب دیکھنے کے قابل ہے اور دوسرے روز خود گئے اور اس کو دیکھا۔

مولانا کتبِ نبوی کے لیے نہایت نادر اور بلند کتابیں انتخاب کرتے تھے اور جو لوگ معمولی

کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، ان کی حالت پر سخت افسوس کرتے تھے اور اس کو نظامِ تعلیم کی اتری کا نتیجہ بتاتے تھے، قسطنطنیہ میں جو مسلمانوں کے تمام قدیم علمی جواہرات کی کان ہے، جب ان کو نظر آیا کہ یہاں لوگ معمولی درجہ کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں، تو سخت متاسفانہ انداز میں یہ ریمارک کیا ”میں کتب خانوں میں جب لوگوں کو کتابوں کے مطالعہ میں مشغول دیکھتا تھا تو ہمیشہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کس قسم کی کتابیں ان کے پیش نظر ہیں لیکن میں نے کسی کے سامنے مختصر معانی، ایسا غوجی، شرح و قایہ، جلائین وغیرہ کے سوا کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔“

حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلام میں تعلیم کا طریقہ ایسا اتر اور ذلیل ہو گیا ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے اور جس قدر کہیں کہیں کچھ رہ گیا ہے، آئندہ اس کی بھی امید نہیں۔“ (سفرنامہ ص ۹۷، ۹۸)

کتابوں کا نہایت شوق تھا، مصر، بیروت، شام اور یورپ میں جو بہترین کتابیں شائع ہوتیں ان کو بہت شوق سے منگواتے اور عمدہ جلد بندھوا کر ان کو میزیا الماری میں رکھتے، قدیم قلمی کتابوں کی جستجو میں ہمیشہ مصروف رہتے اور جب کوئی عمدہ کتاب مل جاتی تو نہایت فیاضی کے ساتھ خریدتے، ہانس الارواح کا ایک مطالعہ مذہب نسخہ ہاتھ آیا، تو اس کو سو روپیہ پر خریدا، ایک قرآن دو سو روپیہ پر خرید لیا، بہت سی قلمی کتابیں نقل کرواتے تھے اور ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے، خصائص ابن جنی، اخبار الحکما، شہر زوری، کشف الادلہ، رباعیات سخابی، رد المنطق لابن تیمیہ کے نسخے ان کے کتب خانے میں اسی طرح دو درو سے نقل ہو کر آئے تھے لیکن اس شوق کے پورا کرنے کے لیے ان کے پاس کافی روپیہ نہ تھا، اس لیے اگر کہیں بہترین کتابیں ان کی نظر سے گزر جاتی تھیں تو ان کو اپنی مفلسی پر سخت افسوس ہوتا تھا، ایک بار مولوی سید علی بلگرامی کے کتب خانہ میں مطبوعات یورپ نظر سے گزریں، تو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھا ”مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ ہو گیا ہوں، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں، کیا کہوں اپنے علما کی بد قسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔“ (شروانی-۳۲)

جن نادر چیزوں کو خود نہ خرید سکتے، اپنے علم دوست دولت مند دوستوں کو ان کے خریدنے کی

ترغیب دیتے، چنانچہ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام اس قسم کے متعدد خطوط ہیں، ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں ’اکبر، جہاگیر اور شاہ جہاں کی علمی نفاست پسند یوں کے وہ نمونے آج کل یہاں آگئے ہیں کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر، اس میں کتاب الآلات کا بھی ایک عمدہ نسخہ ہے۔

لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں وہ خوشنویسوں کے قطعے اور تصاویر ہیں، خدا بخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کروں گا۔‘ (شروانی-۱۷)

مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ میں نے وہ مرقع مولانا کی تحریر پڑھ کر خریدا، کتاب خانے میں ہے، منصور کے قلم کا سرخ سون کا بوٹا اس میں ہے، امریکہ کے ایک مؤلف نے حال میں لکھا ہے کہ ساری دنیا میں حبیب گنج میں منصور کے ہاتھ کی گلکار (FLORAL) تصویر ہے۔“

درس و تدریس | علما کے فرائض و اعمال میں تصنیف و تالیف، وعظ و پند اور ہدایت و ارشاد کے علاوہ درس و تدریس بھی ہے، مولانا نے اگرچہ اور مشاہیر علما کی طرح اپنا کوئی مستقل حلقہ درس قائم نہیں کیا، تاہم بہت سے خوش قسمت لوگوں کو ان کی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوا، تحصیل علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اعظم گڑھ میں خود بھی ادب کی تکمیل کرتے تھے اور ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ’دریں فرصت بادب کار دارم خود چیزے از ادب می خوانم و دیوان حماسہ بدیگرے می آموزم۔‘ (مکاتیب-۲)

وکالت کی غرض سے ہستی میں چند روز کے لیے طرح اقامت ڈالی تو وہاں بھی یہ مشغلہ جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں ’دریں روز ہادکان کشادہ ام و تن باموخن کساں دردادہ‘
مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اسی زمانہ کے تربیت یافتہ ہیں۔

وکالت چھوڑ کر علی گڑھ میں آئے تو اگرچہ کالج کے تعلق سے یہ مستقل مشغلہ ہو گیا لیکن ایک ایسے شخص کے نزدیک جس کے سر پر صدر اٹمس باز غدا و حمد اللہ کی دقت آفرینیوں کا نشہ ہو، جس کی زبان پر عرب جاہلیت کے اشعار چڑھے ہوئے ہوں، جو حدیث و فقہ کے بہترین علما سے درس حاصل کر چکا ہو، فارسی کے چند انتخابات کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، اس لیے یہاں بھی خارجی طور سے بعض لوگ مولانا سے ادب کا درس حاصل کرتے رہے۔

ندوۃ العلماء میں تشریف لائے تو یہ بہ کثرت طلبہ کو مولانا سے مستفید ہونے کا موقع ملا لیکن ندوہ میں انہوں نے باضابطہ طور پر کبھی درس نہیں دیا، بلکہ اس کی صورت یہ تھی کہ کبھی قرآن مجید کے حقائق و معارف پر درس دیتے، کبھی صدر شروع ہوتی اور اوپر کے درجہ کے طلبہ شریک ہوتے، مولانا حفیظ اللہ صاحب پڑھاتے اور مولانا اس پر نکتہ چینی کرتے یا خود کسی مسئلہ پر تقریر کرتے، کبھی ادب کی کوئی کتاب شروع کراتے، کبھی صحیح بخاری پڑھاتے، بعض اوقات قدیم طریقہ املا کے موافق کسی علمی مسئلہ پر خطبہ دیتے اور اس میں تمام طلبہ شریک ہوتے، اسی طرح ہمیشہ طلبہ کو مولانا سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کا موقع ملتا رہا، تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر کی تعلیم اس سے الگ تھی اور ندوہ کے طلبہ میں مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا جو مذاق پیدا ہو گیا ہے وہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے

علی گڑھ کالج کے زمانہ میں مولانا فارسی عربی اور قرآن مجید کا درس کالج کے طلبہ کو دیتے تھے، یہ طلبہ ان علوم کے علاوہ ادب و شاعری کا ذوق بھی مولانا سے حاصل کرتے تھے، چنانچہ چودھری خوشی محمد ناظر، سید سجاد حیدر ریلدرم، مولوی ظفر علی خاں، مولانا محمد علی غیرہ ان کے اس فیضِ صحبت سے مستفید تھے۔

لطفِ صحبت | مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اپنے مضمون مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ (مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۱۵ء) میں تحریر فرماتے ہیں ”صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں، عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی، ان کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی بعض نادار اور نازک پہلو ضرور بیان کیے، فضول باتیں میں نے ان کی زبان سے کبھی نہیں سنی۔“

عام طور پر مولانا کی صحبت سے مستفید ہونے کا وقت ۴ بجے شام سے شروع ہوتا تھا اور آٹھ بجے شب تک ختم ہو جاتا تھا، چار بجے شام کے بعد ان سے ملنے کی عام اجازت تھی اور ہر کہ دمہ بلا تکلف ان سے مل سکتا تھا، مولانا اس مخصوص وقت کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے، نہ ان کے یہاں ترتیب سے کرسیاں بچھائی جاتی تھیں، نہ لوگوں کی خدمت میں پان اور سگریٹ پیش کیا جاتا تھا اور نہ چائے و حقہ کا دور چلتا تھا، چند کرسیاں اور چند مونڈھے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے اور مولانا کبھی آرام کرسی پر اور کبھی کھرے پلنگ پر لیٹے ہوتے تھے، جو آتا کرسی یا مونڈھا گھسیٹ لیتا اور بیٹھ جاتا، ظاہر داری اور

۱۔ افسوس کہ ۱۲ اپریل ۱۹۴۳ء کی رات کو لکھنؤ میں بہ عارضہ قلب وفات پائی۔ ”س“

تصنع سے کسی کی تعظیم و تکریم بالکل نہیں کرتے تھے، اگر کوئی نیا شخص ہوتا تو پلنگ سے اٹھ بیٹھتے یا کرسی پر ذرا سنبھل کے بیٹھ جاتے، معمولی طور پر صرف یہ پوچھ لیتے ”کہاں سے آنا ہوا“ اور ”کیا مقصد ہے؟“

محاضرات کی کتابوں میں بعض کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، جن کو کنگول کہتے ہیں، ان کتابوں کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا، بلکہ ان تمام علوم و فنون کے متعلق نادر اور لطیف نکتے جمع کر دیے جاتے ہیں، اس لیے انسان ان سے دل بھی بہلا سکتا ہے اور علمی فوائد بھی حاصل کر سکتا ہے، یعنی یہی حال مولانا کی صحبت کا بھی تھا، وہ ایک مختلف اہمیتوں کا صاحب کمال تھے، یعنی بہت بڑے شاعر تھے، بڑے فلاسفر تھے، بہت بڑے مورخ تھے، بہت بڑے انشا پرداز تھے، بہت بڑے سیاح تھے، بہت بڑے وسیع المعلومات تھے، بہت بڑے سیاسیات کے نکتہ شناس تھے، بہت بڑے جامع الفنون تھے، اس بنا پر ان کی صحبت میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور وہ ہر فن کے متعلق نہایت بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، شعر و شاعری کا ذکر آ جاتا تو عربی فارسی اور اردو کے سیکڑوں منتخب اشعار سنادیتے اور اس کے ساتھ ان پر تنقید بھی کرتے جاتے، کسی فن کے متعلق کتابوں کا ذکر آ جاتا تو میسوں مطبوع اور قلمی کتابوں کا نام بتا دیتے، فلسفہ اور منطق کے کسی مسئلہ کا ذکر آ جاتا تو مع مالہ و ما علیہ اس پر تقریر کر دیتے، وسعت نظر کی بنا پر سیکڑوں تاریخی واقعات اور سینکڑوں مہذب لطیفے یاد تھے، سیر و سیاحت میں ہر قسم کی چیزیں نظر سے گزر چکی تھیں، بڑے بڑے علما و فضلاء اور رہبران قوم سے ملنے جلنے کا اتفاق ہو چکا تھا اور ان کے خیالات سے واقف تھے، اس بنا پر ان چیزوں کی آمیزش سے یہ علمی صحبت نہایت شگفتہ اور دل چسپ ہو جاتی تھی، ان کی صحبت میں فضول، لغو یا عام باتیں کبھی نہیں ہوتی تھیں، کبھی کوئی علمی مسئلہ چھڑ جاتا، کبھی کسی زیر تالیف کتاب کے متعلق کوئی گفتگو شروع ہو جاتی، کبھی تو میات و سیاسیات کا تذکرہ ہو جاتا، کبھی کسی مضمون کا ذکر ہوتا۔

بڑے بڑے ارباب کمال کی صحبتوں میں عموماً یہ عالم نظر آتا ہے کہ حاضرین مودبانہ خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہیں، اور ایک باوقار اور پر عظمت ہستی کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے، اس کو کانوں سے سن لیتے ہیں لیکن بے تکلفی، سادگی اور خاک ساری کی بنا پر مولانا کی صحبت اس سے بالکل مختلف تھی، ان کے یہاں ہر شخص نہایت بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ کر ان کی گفتگو میں حصہ لے سکتا تھا، ان کے خیالات کی مخالفت اور ان پر نہایت بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کر سکتا تھا۔

ان کو بعض مولویوں اور عربی خوانوں کی پست ہمتی اور عدم صفائی وغیرہ سے سخت تنفر تھا، اس لیے

مبلی الاعلان اس کی بھی برائی کرتے تھے لیکن اگر کسی شخص میں کوئی خوبی نظر آتی تو اسی طرح اس کا تذکرہ بھی کرتے اور نہ صرف تذکرہ کرتے بلکہ لوگوں کو خطوط میں بھی لکھتے، مولوی حمید الدین صاحب کی فارسی زبان دانگی کے قائل تھے اور تعریف کرتے تھے، آخر میں ان کی تفسیر نظام القرآن کے متعلق دوسرے رسائل کی بھی مدح فرماتے، ندوہ میں جو طلبہ کسی قابل نکلے مولانا نے ان کو اسی طرح ہر جگہ روشناس کیا، مولانا حفیظ اللہ صاحب فرماتے تھے کہ ”طلبہ کی تعریفیں کر کر کے مولوی شبلی ان کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے ساتھ ساتھ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری کے حسن اخلاق و تورع، مولانا ارشاد حسین صاحب کے تفقہ، مولانا فیض الحسن صاحب کی عربیت اور محمد فاروق صاحب کی ادبیت و معقول دانگی کا تذکرہ ہمیشہ نہایت مدح و ستائش کے ساتھ کرتے تھے، معاصرین میں مفتی عبداللہ صاحب ٹوکی اور مولانا شیر علی صاحب (حیدرآباد) کی نکتہ رسی کی داد دیتے تھے، مولانا شاہ سلیمان صاحب کے حسن تقریر اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی کی خوبی بیان کی مدح فرماتے تھے اور علمائے دیوبند میں سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی روشن خیالی اور سیاسی گہرائی اور مولانا محمود احسن صاحب کے علم و فضل اور تقویٰ کے معترف تھے، کبھی کبھی ان سے خط و کتابت بھی رہتی تھی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی دینی برکت و صحبت اور بے نیازی کی بھی قدر کرتے تھے۔ (شروانی-۵۷)

اسی طرح سرسید کی انشا پر دازی، مولانا حالی کی سخن نبوی اور نواب وقار الملک کی اخلاقی قوت کے بے حد مدح تھے اور ہر موقع پر اس کا ذکر فرماتے تھے۔

احباب } مولانا کے تعلقات نہایت وسیع تھے، اس لیے ان کے احباب کے ناموں کا استقصا نہایت مشکل ہے، تاہم جن لوگوں سے اخیر تک تعلقات قائم رہے ان میں نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب وقار الملک، نواب عماد الملک، مولوی سید حسین بکرامی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں، نواب سید علی حسن خاں، ایم مہدی حسن، مولوی ریاض حسن خاں صاحب اور خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز بکھنوی کے نام خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں۔

نواب محسن الملک کے ساتھ مولانا کے تعلقات علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ان تعلقات نے استحکام کیا، نواب صاحب مولانا کے فضل و کمال کے معترف تھے اور مولانا ان کے فضل و احسان اور لطف عمیم کے ہمیشہ مداح رہے، ساتھ ہی ان کی کج و بیچ پالیسی سے ہمیشہ گھبراتے بھی تھے، تاہم

گورنمنٹ سے ان کی صفائی کرانے میں نواب صاحب کی کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا، حیدرآباد کی ملازمت اور اجراءے وظیفہ میں بھی نواب صاحب کی کوششیں شامل تھیں، نواب صاحب نے مولانا کو بار بار علی گڑھ بلانا چاہا لیکن مولانا نے اس کو منظور نہیں کیا، سفر کشمیر سے واپس آ کر مولانا علیل ہوئے تو نواب صاحب عیادت کے لیے خود اعظم گڑھ تشریف لائے، واقعہ شکست پا کے بعد مولانا لکھنؤ آئے تو نواب صاحب نے لکھنؤ آ کر مولانا کی عیادت کی، نواب صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے ماتم میں مولانا نے الندوہ میں ایک پرورد مضمون لکھا، جس میں ان کی تمام خوبیاں گنائیں۔

مولانا حالی سے ان کے تعلقات علی گڑھ کے قیام میں پیدا ہوئے، اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا حالی کالج میں آ کر قیام کرتے اور دونوں صاحبوں میں شعر و سخن اور علم و فن کی صحبتیں ہوتیں، بلند شعر پڑھے جاتے اور سنے جاتے، مطالعہ کے لیے کتابیں منتخب کی جاتیں، مولانا حالی بہت نیک طبیعت، متواضع اور خاک سار بزرگ تھے، بڑوں کا کیا ذکر، وہ چھوٹوں سے بھی چھوٹے ہو کر ملتے، وہ گو مولانا سے عمر میں بڑے اور تصنیفی عہد کے لحاظ سے بھی مقدم تھے، مگر وہ مولانا کا ذکر دوسروں سے اس طرح کرتے تھے جیسے کسی اپنے سے کسی بڑے کا ذکر کر رہے ہیں، علی گڑھ کے بعد جب مولانا اعظم گڑھ گئے تو مولانا شیروانی سے ان کی خیریت دریافت کرتے اور جب وہ حیدرآباد گئے تو مولوی عبدالحق صاحب سے ان کی خیریت پوچھتے، انہی کے ذریعہ ان کو سلام کہلاتے، حیدرآباد میں تقریر پر مبارکباد انہی کے ذریعہ بھجوائی اور حیات جاوید کا نسخہ بھی ہدیہ بھیجا۔ (مکتوبات حالی)

مولانا شبلی جب ندوہ آئے اور وہاں کے طلبہ کے بعض مضامین الندوہ میں چھاپے تو سب سے پہلے مولانا حالی ہی نے ان کی تعریف کی اور حوصلہ افزائی فرمائی، مولانا کے پاؤں میں گولی لگنے کا جب واقعہ پیش آیا تو بہت مضطرب ہوئے، خط لکھا، اس واقعہ پر نظم لکھی اور ان کے عزیزوں سے ان کی خیریت دریافت کی۔

مولانا سید علی بلگرامی سے مولانا کے تعلقات علم دوستی کی راہ سے تھے، حیدرآباد کے وظیفہ کے تقرر اور ملازمت میں ان کی کوششوں کو بہت دخل تھا، مولانا حیدرآباد جاتے تھے تو ان کے مکان پر مہینوں قیام فرماتے تھے، الفاروق کے دیباچہ میں مولانا نے ان کا نام خاص طور پر لیا ہے، ایک بار وہ لکھنؤ میں آئے تو مولانا ان کو ندوۃ العلماء میں معائنہ کی غرض سے لائے اور ان کے سامنے مختلف طلبہ سے عربی

میں تقریریں کرائیں، مولوی سید علی صاحب مولانا کو بعض عمدہ کتابیں ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بنگرامی سے مولانا کے تعلقات سرسید کے ذریعہ سے ہوئے، یعنی چونکہ نواب صاحب ایک علم دوست آدمی تھے، اس لیے سرسید نے نواب صاحب کو اسی راستہ سے اپنی تحریک سے وابستہ کیا، مولانا کی تصنیفات ان کے پاس بھیجیں اور خود ان سے اس سلسلہ میں ایک دو تصنیف کے طالب ہوئے، غرض اس طرح مولانا کے نام اور کام سے نواب صاحب کو تعلق خاطر پیدا ہوا، جو طرفین سے اعتراف کی حد تک پہنچا اور یہ تعلقات سرسید علمی تھے، ان سے ان ہی مسائل پر برابر مراسلت اور خط و کتابت رہتی تھی۔

انہوں نے مولانا ہی کے تعلقات کی بنا پر اپنا انگریزی کتب خانہ ندوہ کو عنایت فرمایا تھا، جلسہ دہلی میں انگریزی میں ترجمہ قرآن کی تجویز منظور ہوئی تو مولانا نے ان ہی کو ترجمہ کے لیے انتخاب فرمایا تھا، دارالمصنفین پران کی جو نگاہ لطف و کرم تھی وہ درحقیقت مولانا ہی کے تعلقات کا نتیجہ تھی۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے جس طرح تعلقات قائم ہوئے اور جس طرح انہوں نے وسعت حاصل کی، اس کی تاریخ خود مولانا شروانی نے لکھی ہے ”علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۸۸۷ء میں ہوئی، آغاز تعارف اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ایک ریویو لکھا، بعض اہم مسائل پر اعتراض کیا، غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا:

رسی آنگہ بدر دما کہ چوما خامہ گیری و حرف بنگاری

یہی اختلاف باعث ملاقات ہوا، ملاقات بڑھ کر سرحد نیاز مندی تک پہنچی، نیاز مخلصانہ محبت سے مبدل ہوا اور الحمد للہ کہ وہ اخلاص علامہ مدوح کی رحلت تک قائم رہا اور یقین ہے کہ میری حیات تک دل سے مخونہ ہوگا، موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی، بلکہ حسرت کا اضافہ کر دیا، قریباً ۳۰ سالہ مودت کے دوران میں صد ہا ملاقاتیں ہوئیں، بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا، حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدم سے مشرف ہوا، ہر قسم کے مسائل پر بحث و مباحثے رہے، اس تمام تجربے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور بااخلاص دوست تھے۔“

۱۔ اس مسودہ کو دیکھتے وقت مولانا شروانی نے اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے:

”الحمد للہ تعلق اخلاص آج بھی اس درجہ پر ہے جو زمانہ حیات علامہ میں تھا، حالانکہ نصف صدی سے زیادہ عمر تعلق محبت کی ہے۔“

تعلقات کی شگفتگی کا اندازہ ان مراسلتوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ ہو سکتا ہے، جو دونوں دوستوں میں باہم ہوئی ہیں، مولانا حبیب الرحمن خاں فارسی میں غزلیں کہتے ہیں اور مولانا کی خدمت میں بھیجتے ہیں، وہ ان کے ٹوکے پر تغیر و تبدل کرتے ہیں، مولانا کی تصنیفات پر ریویو لکھتے ہیں اور مولانا داد دیتے ہیں، ان کے زورِ تحریر کو دیکھ کر مولانا کو مضمون نگاری کا میدان تنگ نظر آتا ہے اور ایک مستقل تصنیف کا مشورہ دیتے ہیں، ایک مشترک کتاب کی تصنیف کی تجویز ہوتی ہے، جس کا نام ”حبیب شبلی“ تجویز کیا جاتا ہے، تصنیفی مشورے ہوتے ہیں اور مولانا اس کا خاکہ پیش کرتے ہیں، مولانا علیل ہوتے ہیں تو ان سے حکیم عبدالمجید خاں کے نام خط لکھواتے ہیں، غسلِ صحت کے بعد ایک جلسہ دعوت ترتیب دیتے ہیں تو ان کو خصوصیت کے ساتھ مدعو فرماتے ہیں ندوہ میں جو اہم معاملات پیش آتے ہیں ان میں ان کی اعانت کے محتاج ہوتے ہیں، نادر اور پیش قیمت کتابیں نظر سے گزرتی ہیں تو ان کو خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں، تصنیف و تالیف کے لیے کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے تو بلا تکلف ان کے کتب خانے سے منگواتے ہیں، اپنا کتب خانہ فروخت کرنا چاہتے ہیں تو اس راز کی صرف انہی کو خبر دینا چاہتے ہیں، غرض ان گونا گوں تعلقات کی بنا پر وہ مولانا کے دوست بھی تھے، ہمتون مشورہ بھی تھے، محسن بھی تھے اور ایک عزیز بھائی بھی تھے۔

حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے تعلقات کی ابتدا معلوم نہیں، غالباً حکیم صاحب کے قیام رام پور کے زمانہ سے ہوئے، جب رام پور کا کتب خانہ حکیم صاحب کے زیر انتظام تھا، آخر زمانہ میں جب حکیم صاحب رام پور سے چلے آئے تھے اور قومی کاموں میں دلچسپی لینے لگے تھے تو ان تعلقات میں مزید وسعت ہوئی، اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں اور بھی تعلقات بڑھ گئے تھے اور حکیم صاحب ہی کے مکان پر قیام فرماتے تھے، دہلی میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ حکیم صاحب کی کوششوں سے ہوا اور مولانا کے مخالفین کی قوت کو ان ہی کے اثر نے نمایاں نہیں ہونے دیا، اصلاح ندوہ کے لیے دہلی میں جو جلسہ ہوا اس میں اگر حکیم صاحب کا ہاتھ کام نہ کرتا تو اس کا انعقاد ناممکن ہو جاتا۔

نواب سید علی حسن خاں صاحب مولانا کے بیحد معتمد و معترف تھے، تعلقات کی ابتدا گزشتہ تعلیم اور المامون سے ہوئی، ۱۸۹۱ء میں جب حیدرآباد کا سفر کیا تو نواب صاحب نے راستہ میں مولانا کو اپنے ہاں بھوپال میں روک لیا، یہ پہلی ملاقات تھی، نواب صاحب کو نواب شاہ جہاں بیگم نے جب اپنی ریاست کا ڈاکٹرِ تعلیم مقرر کیا تو نواب صاحب نے مولانا سے مشورے طلب کیے اور اس سلسلہ

میں وہ کئی دفعہ بھوپال جا کر ان کے ہاں ٹھہرے۔

نواب صاحب نے متعدد بار مولانا کو مالی نذرانے بھی پیش کرنا چاہے لیکن مولانا کی خود داری اور بے نیازی نے ان کو قبول نہیں کیا، اتفاق سے ۱۹۰۳ء میں نواب صاحب بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ آگئے اور مولانا بھی معتمد دارالعلوم کی حیثیت سے ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ رہنے لگے، تو تعلقات میں اور زیادہ استواری پیدا ہوگئی، اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں، نواب صاحب مولانا کو گاڑی بھیج کر بلواتے تھے اور اپنی کونھی کے قیام پر اصرار کرتے تھے، کبھی کبھی مولانا وہاں چند روز کے لیے قیام بھی کرتے تھے۔

ندوہ پر انہوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ مولانا ہی کے اثر سے وقف کیا، ندوہ کی رکنیت اور دلچسپی بھی مولانا ہی کے تعلقات کا نتیجہ تھی، یہی وجہ ہے کہ جب مولانا نے استعفا دیا تو وہ بھی مستعفی ہو کر اصلاح ندوہ کی کوششوں میں مصروف ہو گئے اور آخر میں ندوہ کی نظامت کا کام انہوں نے اسی دوستی و محبت کی یادگار میں قبول کیا، جس کو وہ ساہا سال انجام دیتے رہے۔

ایم مہدی حسن سے لطف ادب اور حسن معاشرت کے تعلقات تھے، ان میں اور مولانا میں نہایت پر لطف اور بے تکلفانہ خط و کتابت ہوتی تھی، وہ نہایت عمدہ قسم کے لفافے اور خط کے کاغذ بھیج دیتے تھے کہ ان کے نام جو خطوط بھیجے جائیں، ان کے لیے یہ کاغذ مخصوص کر لیے جائیں، مولانا کی ذات سے ان کے مرنے کے بعد بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی اور، شبلی سوسائٹی اور ”معاصرانہ چشمک“ کے عنوان سے معارف میں جو مضامین لکھے وہ اسی دل چسپی کا نتیجہ تھے۔

ان کے علاوہ مختلف شہروں مثلاً بمبئی، علی گڑھ، پٹنہ، کلکتہ اور الہ آباد میں مولانا کے بہت سے احباب تھے اور جب مولانا ان شہروں میں جاتے تھے تو ان سے صحبتیں رہتی تھیں۔

احبابِ علما | مولانا کے احباب کی اس فہرست پر نظر ڈالنے سے مولانا کے مذاق طبیعت کا اندازہ نہایت آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے، مولانا کے ان تمام احباب کی حیثیتیں اگرچہ مختلف ہیں، تاہم ذوق علم ایک ایسی چیز ہے جو سب میں مشترک ہے، علما میں سے ان کے تعلقات ندوہ کے سبب سے سب سے قائم تھے، ان میں قابل ذکر اشخاص یہ بزرگ دار ہیں، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھولوا رووی، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولانا سید محمد علی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء، مولانا شیر علی صاحب حیدرآباد، مولانا فضل حق صاحب رام پور، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پور، مولانا ابراہیم صاحب آرووی، مولانا شاء اللہ

صاحب امرتسری، مگر چوں کہ وہ قدیم و جدید کے درمیان واسطہ تھے، اس لیے کبھی کبھی قدیم کی خاطر جدید اصحاب سے اور کبھی جدید کے سبب سے قدیم علما سے ان کا تصادم ہوتا رہتا تھا اور یہی سبب ہے کہ بے غرض اصحاب علم کے سوان سے سب ہی سے ان بن ہوتی ہی رہتی تھی، چنانچہ مولانا ثروانی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں ”علامہ شبلی چوں کہ ساہا سال تک کالج میں رہے تھے، ایک حد تک ان کے خیالات آزاد تھے، علما کے موجودہ رسمی طریقوں کو وہ لوازم دین نہیں خیال کرتے تھے، اعتراف کرنے میں بے باک تھے، ان کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اس کے آثار تھے، لہذا متاخرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علما کو ان کی جانب سے شبہات تھے، بعض کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر نہ وہ میں آئے تھے، تا کہ یہاں بھی الحاد کا رنگ جمائیں، خلاصہ یہ کہ اخیر وقت تک علامہ شبلی قدیم طبقہ کے علما میں شیر و شکر نہ ہو سکے، تاہم اس قدر کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ تھی قدیم و جدید سوسائٹی کی صلح و آشتی کا، لیکن افسوس کہ مذکورہ بالا اختلافات نے ان کوششوں کو بار آور نہ ہونے دیا۔“

باہم معاصرین کے اعترافات | مولانا نے اپنے معاصرین کے ساتھ اور ان کے معاصرین نے ان کے ساتھ ہمیشہ خوش گوار تعلقات قائم رکھے، دونوں نے ایک دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اور علانیہ ایک نے دوسرے کی مدح و ستائش کی۔

مولانا کو نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا آزاد، اور خواجہ عزیز الدین کے ساتھ شرفِ معاشرت حاصل تھا اور ان میں ہر ایک دوسرے کے فضل و کمال کا معترف تھا، نواب محسن الملک کو مولانا کے ساتھ جو حسن ظن تھا، اس کا اعتراف انہوں نے ایک تقریر میں نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے، چنانچہ شمس العلماء کے خطاب پر مولانا کو مبارک باد دینے کے لیے علی گڑھ کالج میں جو جلسہ ہوا، اس میں بحیثیت پریزیڈنٹ کے انہوں نے یہ الفاظ فرمائے ”وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں، جنہوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ اور استعارہ، عبارت آرائی اور تصنع سے پاک اور بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔“

نواب محسن الملک اور مولانا کے اخلاق و فطرت میں بہت بعد تھا، اس بنا پر گو متعدد بار اختلاف کے اسباب بھی پیدا ہو گئے اور علی گڑھ پارٹی کے بہت سے لوگوں نے ان کی مخالفت بھی کی،

لیکن بایں ہمہ مولانا اور نواب صاحب کے تعلقات میں اخیر دم تک عملاً فرق نہیں آیا۔

مولانا کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور الفت تھی اور ان کی دقت نظر اور ان کی سخن بینی کے ہمیشہ مداح رہے، فرماتے تھے کہ وہ جو ہر کو خوب سمجھتے تھے اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی، رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے، صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ ”یہ نثر کا حماسہ ہے“ مولانا کہتے تھے کہ ان کے اس فقرہ نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا اور اس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آ گیا، جو پہلے سامنے نہ تھا۔

فرماتے تھے ”میں دریا ہوں اور حالی کنواں ہیں“ میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں لیکن وہ گہرے ہیں، جب تک کافی مواد تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے، مولانا حالی کی تصنیفات میں حیاتِ سعدی کو نہایت پسند فرماتے تھے، شعر العجم حصہ دوم میں سعدی کے حالات لکھنے میں اس لیے پس و پیش کرتے تھے کہ حالی کے بعد اس میں کیا اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن مجبوراً سعدی کے حالات لکھے تو اس کے ساتھ یہ حاشیہ لکھا ”مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں، سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔“

حیاتِ سعدی شائع ہوئی تو اس پر ریویو لکھا، مولانا کا عام قاعدہ تھا کہ جس چیز کو خود پسند کرتے تھے، اپنے اعزہ، تلامذہ اور احباب کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، حیاتِ سعدی بھی اسی قسم کی پسندیدہ چیزوں میں تھی، چنانچہ ایک عزیز کو لکھتے ہیں، ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تھنڈے بھیجی ہے، یہ شیخِ سعدی کی نہایت دلچسپ اور محققانہ سوانحِ عمری ہے، میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں، دیکھو کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ ہے، واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے، اس کتاب کے اور خریدار پیدا کرنے چاہئیں۔

پاؤں کے حادثہ کے بعد مولانا حالی نے ایک رباعی لکھ کر اندوہ میں چھپنے کے لیے بھیجی تو اس کے شکر یہ میں مولانا نے شذرات میں مولانا حالی کی ذرہ نوازی کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا ”مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے، وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا کرتے ہیں لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیاز مندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔“

مولانا حالی کو بھی مولانا سے نہایت عقیدت اور محبت تھی، سیرۃ النعمان شائع ہوئی تو مولانا حالی نے اس پر ریویو لکھا جس میں فرماتے ہیں ”انہوں نے (شبلی نے) اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی، اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے، سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلا منظر پر پاتا ہوں جس طرح حسن تناسب اعضاء کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت و روایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے و قیاس سے کام لیا گیا ہے، اسی طریقہ استدلال سے فلسفہ و مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے پردے اٹھا دیے ہیں۔“

مولانا حالی مولانا کی تصنیفات کو شوقیہ منگاتے تھے اور لائبریری میں رکھتے تھے، ایک بار مولانا کی چند کتابیں لائبریری کے لیے منگائیں اور لکھا کہ خود تو آنکھوں سے معذور ہوں لیکن یہ کتابیں دوسروں کے لیے منگوائی ہیں کہ

قبتہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

بعض اوقات مولانا خود اپنی تصنیفات ان کی خدمت میں ہدیہ بھیجتے تھے اور وہ اس کی نہایت قدر کرتے تھے، دستہ گل شائع ہوا اور اس کو مولانا نے ان کی خدمت میں ہدیہ بھیجا تو مولانا حالی نے اس کے جواب میں لکھا کہ ”کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جس نے سیرۃ النعمان، انفاروق اور سوانح مولانا ناروم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کا ہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے، جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ

سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔“

دو دل بودن دریں رہ سخت ترغیب است سالک را
نجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایمان ہم
شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کون سی بات ہے، مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا، الا الذی ابتلی بمثل ما ابتلی به القائل،

میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ ہے، اس کو بھی چھپوا کر شایع کر دوں، مگر دستہ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں، و لیس فی ذالک شاقبة التصنع۔

مولانا نے سوانح مولانا روم ہدیہ بھیجی تو مولانا حالی نے رسید میں لکھا ”سوانح کو میں اب تک ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں، اول مولوی وحید الدین دیکھنے کو لے گئے، اس کے بعد غلام حسین نے مانگ لی، آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ من عرف منزلتکم فی التصنیف کل لسانہ آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے، خدائے تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ و سلامت رکھے۔“

باہم اخلاقی تعلقات بھی نہایت شگفتگی کے ساتھ قائم تھے، سفر کشمیر کے بعد مولانا کو ایک طویل علالت سے صحت یاب ہونے کی توقع ہوئی اور اس مسرت میں ایک جلسہ دعوت کرنا اور اس جلسہ میں جن احباب کو مدعو کرنا چاہا، ان میں ایک مولانا حالی بھی تھے، چنانچہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں ”آپ اس بات کے لیے تیار رہیں کہ اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے تمام خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے، آپ کو بھی تکلیف کرنی پڑے گی۔“ (شروانی-۹)

صحت یاب ہونے کے بعد مولانا نے قصیدہ کشمیریہ لکھا اور مولانا حالی کی خدمت میں بھیجا تو مولانا حالی نے ایک طویل خط لکھا، جس کی ابتدا اس قطعہ سے کی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

لہ الحمد پس از نا خوشی ورنج دراز
شبلی ما، مراد از سر بالیں برخواست

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں ”مولانا! قصیدہ کشمیریہ کی متعدد کاپیاں وصول ہوئیں، پہلے اس سے کہ آپ کے عطیہ کا شکریہ ادا کروں، مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، جس نے مدت دراز کے بعد آپ کی صحت کا مشرکہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا، فی الواقع آپ کی حالت نازک ہو گئی تھی اور مرض کو حد

۱۔ یہ اشعار پہلے لڑ چکے ہیں، دیکھیے صفحہ ۳۲۶۔

سے زیادہ امتداد ہو گیا تھا، باوجودیکہ تبدیل آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی، مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا، اب درحقیقت صرف خدا کے فضل پر اور بحسب ظاہر شفیق و ہمدرد و معالج پر صحت کا انحصار تھا، اذاً اراد اللہ شیئاً هیئاً اسبابہ، ایسی حالت میں ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب کا آنا صاف دلالت کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کو ابھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا، فوالحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ما انعم علینا بابقائکم فینا وبنعمۃ وجودکم لدینا“

مولانا کے پاؤں میں گولی لگی تو مولانا حالی کو اس سے سخت تشویش لاحق ہوئی، اخبارات میں جو حالات شایع ہوئے، اس کے سننے سے تسکین نہیں ہوئی، تو مولانا کے فرزند محمد حامد نعمانی کو بغرض استفسار حال ایک خط لکھا اور باوجود اس ضعف کے مولانا کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ آنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اس خط میں تحریر فرماتے ہیں ”آج تک جو کچھ اخبارات کے حوالہ سے جناب مولانا کے حالات سننے گئے ہیں ان سے کچھ تشفی نہیں ہوئی، اس لیے ناچار آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ میرا یہ خط مولانا کو دکھا کر اور جو کچھ وہ اپنا حال لکھوائیں اس کو قلمبند کر کے از رو لطف میرے پاس بھیج دیں، نیز یہ بھی لکھیں کہ سبئی کے ڈاکٹر جب علی جو مولانا کو وہاں بلا تے ہیں، وہاں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔“

بہت دن سے ارادہ کر رہا ہوں کہ میری پوتی یعنی غلام الثقلین کی اہلیہ جو لکھنؤ میں ہے، اس سے ملنے کے لیے لکھنؤ آؤں اور وہاں سے مولانا کو دیکھنے اعظم گڑھ آنے کا بھی قصد ہے، مگر اب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا، اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڑھ آنے سے پہلے آپ کو وہاں سے اطلاع دوں گا، مولانا کی خدمت میں بصد حسرت دیدار و اشتیاق زیارت سلام و نیاز کہہ دیجئے گا۔“

لیکن باوجود ان مخلصانہ تعلقات کے مولانا کی بعض عبارتوں اور بعض خطوط سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ دونوں معاصرین میں باہم چشمک بھی تھی، مثلاً ایک موقع پر سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں ”تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا، وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں، اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر یو یو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چوں کہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں، اس لیے مذاق حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرض کے بالکل خلاف ہے۔“

۱۔ سوانح مولانا روم، ذکر ”دیوان“، ص ۵۰، طبع اول۔

موازیہ انیس و دہیر میں ایک موقع پر لکھتے ہیں ”ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، ان میں باوجود دعوائے آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں۔“
 موجودہ سوانح نگاری کے متعلق اسی قسم کی تنقید مولانا نے اپنے بعض مضامین میں بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ ”یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے، اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے۔“

ان عبارتوں سے یہ ظاہر ہے یہ چوٹ مولانا حالی پر ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں سے ”حیات جاوید“ مراد ہے کہ کنا یہ سے گزر کر مولانا نے خطوط میں حیات جاوید کے متعلق تصریحاً بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ ”حیات جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل، خیر وللناس فی ما یعشقون مذاہب“۔ (شیروانی-۲۵)

لیکن یہ مولانا حالی کی ذات پر نہیں جن کی وہ بجد قدر کرتے تھے، بلکہ سرسید کے ناتمام باگیری (سوانح عمری) پر اظہار خیال ہے، اگر حیات جاوید کا مصنف مولانا کا کوئی عزیز بھی ہوتا تب بھی وہ اس تصنیف کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کرتے۔

مولوی نذیر احمد اور مولانا میں اگرچہ وہ ربط و اخلاص نہ تھا جو مولانا کو مولانا حالی کے ساتھ اور مولانا حالی کو مولانا کے ساتھ تھا، تاہم بالکل بے تعلقی بھی نہ تھی، کانفرنسوں کے اجلاس میں اکثر دونوں بزرگ ایک ساتھ پبلک اسٹیج پر نظر آتے تھے اور ایک دوسرے کے متعلق جو کچھ کہتا تھا، اس سے بے تکلفانہ تعلقات کی جھلک نمودار ہوتی تھی، ایک بار اسٹریٹیجی ہال میں کانفرنس کا اجلاس ہوا، تو مولوی نذیر احمد نے اپنی تقریر میں نظریقانہ لہجہ میں کہا ”میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی، اب تو ایسا ذہول ہو گیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پر پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں۔“

دہلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا تو مولانا مولوی نذیر احمد سے ملے اور چوں کہ چند لڑکوں کو عربی میں تقریر کرنے کے لیے ساتھ لے گئے تھے، اس لیے مولانا نے خصوصیت کے ساتھ ان کو جلسہ میں شریک ہونے کے لیے دعوت دی اور الندوہ جاری ہوا تو مولوی نذیر احمد صاحب نے اس کی تعریف میں ایک

۱۔ موازیہ زیر عنوان ”اعتراضات“ ص ۲۳۵، طبع اول۔

خط لکھا اور چند عربی شعر لکھ کر بھیجے جن کو مولانا نے الندوہ کے شذرات میں شائع کیا، شعر یہ تھے:

يقولون ان العلم والفضل والنهى حبیس علی المتقدم المتبصر
فلما تصفحننا صحائف ندوة وجدنا بان الفضل للمتأخر

ترجمہ: لوگ کہتے ہیں کہ فضل و کمال انہوں کا حصہ تھا، مگر جب میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ فضل و کمال تو

پچھلوں ہی کا حصہ ہے۔

مولانا نے ۱۸۹۰ء کی کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا تھا، اس میں ان دونوں بزرگوں کے نام

بڑی عزت سے لیے ہیں:

نگہ از مہر سوائے حالی آزادہ فلک وآں نذیر احمد طوطی شکر خا بنگر

مولانا محمد حسین آزاد سے تعلقات نہ تھے، ان سے صرف ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی

تھی، جب کہ ان کا دماغ خراب ہو چکا تھا، بایں ہمہ مولانا ان کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز مانتے تھے اور فرماتے تھے کہ آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے، اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔“

الندوہ میں جہاں گیر پر جو مضمون لکھا ہے، اس کی تمہید میں نیرنگ خیال کی عبارت کا اقتباس

اس الفاظ میں کیا ہے ”ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہاں گیر کی یہ تصویر کھینچی ہے۔“

جس زمانہ میں شعر العجم لکھ رہے تھے، آزاد کی کتاب ”مخند ابن پارس“ نکلی، اس کی نسبت ایک

دوست کو تحریر فرماتے ہیں ”آزاد کی کتاب آج دیلو آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مر نہیں، تاہم وہ ادھر ادھر کی نہیں بھی ہانک دینا تو وحی معلوم ہوتا لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم بھی نہیں رکھا، بارہویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا، اس لیے یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔“ (مہدی-۳۶)

مولانا محمد حسین آزاد کی وفات کی خبر جب مولانا کو پہنچی تو ان پر بے حد اثر ہوا، اسی وقت

مدرسہ بند کر دیا اور تعزیت کا ایک جلسہ کرایا، جس کے پہلے مقررہ خود تھے، اس تقریر کے وقت نہ صرف ان کے چہرہ سے بلکہ ایک ایک لفظ سے شدت غم کا اثر محسوس ہوتا تھا، تقریر میں سب سے پہلا فقرہ جو ان

کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا:

”آج خدائے سخن مر گیا“

خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی سے نہایت وسیع تعلقات تھے، قیصر نامہ ان کی مشہور فارسی مثنوی ہے، مولانا ان کی فارسی دانی اور قادر الکلام کے قائل تھے، تعلقات کا آغاز غالباً اس وقت سے ہوا، جب علی گڑھ جا کر مولانا نے اپنی اور حزمین کی فارسی غزلیں خواجہ صاحب کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیجی تھیں، اس کے بعد سے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے، ندوہ کے قیام سے پہلے مولانا جب لکھنؤ جاتے تھے، تو اکثر انہی کے یہاں قیام فرماتے تھے، قیام لکھنؤ کے زمانہ میں بھی بعض اوقات ان کے یہاں جا کر دن دن بھر رہتے تھے، مولانا خواجہ صاحب کی بلند ہمتی اور خودداری کے دل سے معترف تھے، البتہ شاعری میں ان کے مراعاتِ لفظی کو پسند نہیں فرماتے تھے، مولانا کے پاؤں میں گولی لگی تو خواجہ صاحب نے ایک رُبائی لکھی، مولانا بعض فارسی تحریروں کے متعلق خواجہ صاحب سے مشورہ بھی لیتے تھے، ایک بار ”الناظر“ نے مولانا کو خواجہ صاحب کا شاگرد لکھ دیا تھا، اس کی تردید میں مولانا نے لکھا کہ: ”خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں“۔ (مکاتیب-۱)

خواجہ صاحب کو الناظر کے اس بیان کا حال معلوم ہوا تو سخت افسوس کا اظہار کیا۔

۱۹۰۸ء تھا کہ مولانا نے حضور نظام سابق میر محبوب علی خان بہادر کی خدمت میں ندوہ کی

طرف سے ایک خریطہ پیش کرنے کے لیے یہ شعر کہا تھا:

تا جہاں باشد و ایں گنبد گرداں باشد دہر فرمان بر محبوب علی خاں باشد
پھر یہ شعر بغرض مشورہ خواجہ صاحب کے پاس بھیجا جو صاحب گئے تھے، انہوں نے آکر کہا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ گنبد گرداں کی ترکیب اچھی نہیں معلوم ہوتی، مولانا نے یہ سن کر فرمایا کہ اب ہمارے خواجہ صاحب سٹھیا گئے۔

آخر میں مولانا کے معاصر دستوں میں سے ایک بزرگ کا نام لینا چاہتے ہیں، جو فیصلہ تعالیٰ اس وقت تک ہم میں ہیں اور کہنہ سالی کے باوجود قلم و کاغذ کی تفریحات اور علمی مشاغل میں مصروف ہیں، میری مراد مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری سے ہے، جو مصنف البرامکہ کی حیثیت سے مشہور ہیں اور اس وقت جب کہ ان کی عمر اسی کے قریب ہوگی، بھوپال کے محکمہ تاریخ کے مہتمم ہیں اور ابھی اپنی کتاب البرامکہ کا دوسرا ایڈیشن جو پہلے سے دونا ہے مرتب کر کے چھپوایا ہے، مولوی صاحب مدوح کو مولانا سے ان

کے علی گڑھ کے زمانہ قیام سے بے تکلفاً نہ دوستی، آمدورفت اور مشاغلِ علمی میں استشارہ کا تعلق تھا، وہ گویا علمی میدان میں مولانا مرحوم کے ہم رکاب تھے، مولانا نے جو سلسلہ فرماں روا بیان اسلام کا شروع کیا تھا، اس کی مناسبت سے انہوں نے سلسلہ وزراء اسلام شروع کیا تھا اور اس سلسلہ میں البراکہ اور نظام الملک طوسی دو کتابیں لکھیں اور دونوں کے مسودے چھپنے سے پہلے مولانا کی نظر سے گزر چکے تھے، مولوی صاحب نے آج کل اپنی زندگی کے دلچسپ مشاہدات یا وایام کے نام سے لکھے ہیں، اس میں مولانا کے اور اپنے بے تکلفی کے واقعات اور آمدورفت کے حالات بھی درج کیے ہیں، مگر:

عہدِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

امرا اور والیانِ ملک سے تعلقات | مولانا کے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں بڑے بڑے امرا اور والیانِ ملک کاج کو دیکھنے آتے تھے، اور وہاں ان کے خیر مقدم کے جلسے ہوتے تھے، ان جلسوں کے پروگرام کا ضروری جز مولانا کی نظم ہوتی تھی، اس تعلق سے تمام معزز مہمانوں سے وہ نہ صرف روشناس ہو جاتے تھے، بلکہ ان کے فضل و کمال کا سکھ ان مہمانوں کے دلوں پر ثبت ہو جاتا تھا، خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیا، سر آسمان جاہ صدر اعظم حیدرآباد، جنرل عظیم الدین خاں مدارالمہام رام پور وغیرہ سے وہ اسی طور سے روشناس ہوئے تھے اور سب نے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔

پہلے پہل جب سرسید کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں حیدرآباد گئے تو اکثر امراء کبار نے ان کی قدر و منزلت کی اور خود اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں تک ان کی شہرت پہنچی، دوبارہ ۱۸۹۶ء میں جب وہ حیدرآباد گئے تو امرا اور اکابر دکن کی قدر دانی اس حد تک پہنچی کہ انہوں نے جلسہ کر کے ان کو ایڈریس پیش کیا اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے ازراہ قدر دانی سو روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا اور ۱۹۰۱ء میں ان کو اپنے ایک عہدہ جلیلہ پر فائز فرمایا، جس سے ۱۹۰۵ء میں وہ مستعفی ہوئے تو پھر بدستور پہلا وظیفہ جاری فرمایا، ۱۹۱۶ء میں جب اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں تک دارالمصنّفین کی امداد کے تعلق سے مولانا کا اسم گرامی پہنچا تو تعریف فرمائی اور ان سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر فرمایا، منصب داران و امراء دکن میں سے مولانا کے تعلقات زیادہ تر نواب فخر الملک بہادر وزیر تعلیم نواب سرفسر الملک بہادر سپہ سالار آصفیہ اور نواب عماد الملک بہادر معتمد تعلیمات سے تھے۔

دوسرے والیان ریاست میں سے بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال سے متعدد بار ان کو ملاقاتیں

ہوئیں، ایک دفعہ ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلماء کی امداد کے تعلق سے اور دوسری دفعہ ۱۹۱۲ء میں سیرۃ نبوی کے لیے ان ملاقاتوں میں ان سے مولانا بہت متاثر ہوئے، پہلی ملاقات کے تاثرات اسی زمانہ میں الندوہ میں لکھے ہیں، دوسری دفعہ کی ملاقات کا ذکر مکاتیب میں ہے (شروانی۔ ۱۰۱) اس سفر میں ہڑپائینس مرحوم نے مولانا سے دریافت فرمایا تھا، آپ کی صحت کی یہ حالت ہے، آپ اپنا جانشین تو تیار کر لیں، مولانا نے سیرت کے متعلق دو شعر کہے تھے، جن میں ایک یہ ہے:

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے
سلطان کا اشارہ سلطان جہاں بیگم کی طرف تھا۔

جب مولانا کا انتقال ہوا تو بیگم صاحبہ نے بہ حسرت فرمایا کہ ”فقیر بے نوا تو چل بسا، سلطان باقی ہے، بیگم صاحبہ نے اپنی بعض تصانیف میں بھی مولانا سے مشورہ لیا ہے۔

نواب حامد علی خاں بہادر والی رام پور سے ان کے تعلقات ان کی ولی عہدی کے زمانہ سے تھے، جب زمامِ انتظام جنرل عظیم الدین خاں کے ہاتھ میں تھی اور مولانا مدرسہ عالیہ اور کتب خانہ کے تعلق سے رام پور آیا جایا کرتے تھے، مولانا جب سفر ترکی سے واپس آئے تو ریاست رام پور نے ان کے اس سفر کے مصارف ادا کر کے ان کی اس علمی زحمت فرمائی کا شکر یہ ادا کرنا چاہا، مگر مولانا نے قبول نہیں کیا، سرسید کی وفات کے بعد رام پور میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں پھر ملاقات ہوئی، ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے تعلق سے پھر جا کر ملے اور نواب صاحب نے پانچ سو روپے سالانہ ندوہ کے لیے مقرر فرمائے جو چند سال جاری رہے۔

نواب صاحب جزیرہ (جنجیرا) اور ان کا پورا خاندان مولانا کا شیدائی تھا، چنانچہ جب بمبئی جاتے تھے تو اکثر ان لوگوں سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہتی تھیں، ایک بار اکتوبر ۱۹۱۲ء میں خود جزیرہ (جنجیرہ) تشریف لے گئے تھے۔

مولانا کو صرف ہندوستان ہی میں یہ عزت حاصل نہ تھی، بلکہ ان کی شہرت کا غلغلہ بیرونی ممالک میں بھی پہنچ گیا تھا اور وہاں سے عملاً اس کا اعتراف ہوتا تھا، چنانچہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تو وہاں کے تمام اکابر سے ملاقاتیں رہیں اور گورنمنٹ ترکی کی طرف سے تمغہ مجیدی عطا ہوا، امیر عبدالرحمن خاں والی کابل نے ترجمہ کا حکمہ قائم کیا تو اس کی سرکاری شپ کے لیے مولانا کا انتخاب کیا

لیکن مولانا نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انگریزی گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب دیا اور اپنی مختلف علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں ان کو ممبر بنایا، دربار میں بھی بحیثیت شمس العلماء کی کرسی تھی، دربار تاجپوشی کے موقع پر بھی وہ شریک دربار ہوئے تھے اور شاہ ایڈورڈ نے ان کو ہار بخشا تھا۔

مذہب | مولانا کی مذہبی زندگی میں مختلف تغیرات پیدا ہوتے رہے، ابتدا میں وہ ایک متعصب حنفی اور متشدد مولوی تھے، غیر مقلدوں سے مناظرے کرتے تھے، ان کی تردید میں رسالے لکھتے تھے، خود فرائض و سنن کے سخت پابند تھے اور دوسروں سے نہایت سختی کے ساتھ ان کی پابندی کراتے تھے، فریضہ حج سے تو زمانہ طالب علمی ہی میں مشرف ہو چکے تھے اور دوسرے فرائض کا بھی نہایت شدت سے اہتمام کرتے تھے۔ ان کے خالو نے اعظم گڑھ میں ایک برف خانہ بنوایا تھا، فرماتے تھے کہ ”جب ہم لوگ گرمی کے زمانہ میں افطار کے وقت برف پیتے تھے، تو اپنے خالو کے حق میں دعائیں کرتے تھے، امانت کا کام کرتے تھے تو اسی گرمی کے زمانہ میں متصل کئی کئی کوسوں کا دورہ کرنا پڑتا تھا لیکن بایں ہمہ وہ روزہ قضا نہیں کرتے تھے، علی گڑھ کے زمانہ قیام میں سخت گرمیوں میں سرسید کے ساتھ نئی تال گئے تھے، اس سفر میں بھی روزہ کا اہتمام تھا، اثنائے قیام ندوہ میں ۱۳۲۹ء کے رمضان میں جو اگست ۱۹۱۱ء میں پڑا تھا، دن میں کثرت مطالعہ کے سبب سے ایک آنکھ میں پانی آنے لگا اور اس کی بینائی جاتی رہی، تاہم روزے رکھے۔

ندوہ میں آنے کے بعد بعض اوقات جماعت میں شریک ہوتے تھے، البتہ پاؤں کے حادثہ کے بعد معذوری ہو گئی تھی، پھر بھی ایک دفعہ یہ اہتمام کیا کہ کہا مقرر کیے اور ڈولی پر بیٹھ کر مسجد جانے لگے، مگر چونکہ مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم جو اہمات فرماتے تھے، نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے اور رکوع و سجود میں دیر تک رہتے تھے اور مولانا اپنے پاؤں کی معذوری کے سبب سے اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے چند روز کے بعد جماعت کی شرکت چھوڑ دی۔

اسی طرح اخیر زمانہ قیام اعظم گڑھ میں ایک دفعہ ایک حافظ صاحب نے جو بہت کھینچ کھینچ کر قرأت کرتے تھے، مغرب کی نماز میں امامت کی، مولانا مقتدی تھے، نصف ساق تک ایک پاؤں نہ ہونے کی وجہ سے دیر تک ایک پہلو پر بیٹھنے میں ان کو تکلیف ہوتی تھی، اس لیے نماز کے بعد بہت جھلائے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث کا حوالہ دے کر فرمایا ”کہ آپ لوگوں کو معذروں کا ذرا خیال

نہیں ہوتا، وہ صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے اور سویرے ہی وضو کر کے نماز پڑھتے تھے۔

صبح کو کبھی زبانی اور کبھی قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کا معمول تھا اور اس میں بھی ان کے مزاج میں یہ نفاست پسندی تھی کہ وہ تلاوت کے لیے مطبوعہ قرآن کے نسخوں کو بہت کم پسند کرتے تھے، وہ ہمیشہ اس کے لیے قرآن پاک کا کوئی نہ کوئی قلمی نسخہ رکھتے تھے اور اخیر عمر میں بھی بمبئی میں اس کے لیے جو نسخہ خرید ا تھا وہ بڑا قیمتی تھا۔

علی گڑھ جا کر ان کی مذہبی زندگی میں جو انقلاب پیدا ہوا اس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عجیب عجیب بدگمانیاں ہیں اور عوام بلکہ علما تک کا خیال ہے کہ وہ علی گڑھ میں جا کر وضع قطع، عقائد و اعمال کے لحاظ سے معاذ اللہ بالکل آزاد خیال نیچری ہو گئے تھے لیکن یہ تمام سرخلاف واقعہ ہے، یہ بالکل سچ ہے کہ علی گڑھ جا کر ان کے مذہبی خیالات میں بہت کچھ وسعت اور آزادی پیدا ہو گئی تھی، یہ بھی سچ ہے کہ جس شدت کے ساتھ وہ پہلے پابند تھے علی گڑھ میں وہ اہتمام و تشدد باقی نہیں رہا، بلکہ حیدرآباد تک یہی حال رہا اور یہ متکلمین کی ہر قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا اور کچھ ماحول کا اثر بھی لیکن اس پر بھی ان کی حنفیت کا غلو اپنی جگہ پر قائم رہا۔

لطیفہ: دارالعلوم کی پرانی عمارت کے صحن میں ایک مستف حوض تھا، خاک سار نے ایک دفعہ حوض کے پائپ سے وضو کیا اور اس کی چھت پر نماز پڑھنے لگا، ساتھ ہی میلان خاطر کی بنا پر اتفاقاً اس وقت رفع یدین بھی کیا، میں نے مولانا کو نہیں دیکھا وہ مولانا حفیظ اللہ صاحب کے چھپرے کے نیچے بیٹھے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے، نماز پڑھ چکا تو پاس بلایا، پھر فرمایا، میری عجیب قسمت ہے میں تو پکا حنفی ہوں اور جو مجھ سے پڑھتا ہے وہ اہل حدیث ہو جاتا ہے، حمید الدین کا یہی حال ہوا اور تمہارا بھی یہی حال ہے۔

جب وہ کالج میں گئے ہیں تو طلبہ کی مذہبی زندگی ان کو پسند نہ آئی، گو یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا، تاہم انہوں نے طلبہ میں نماز کی پابندی کا شوق پیدا کر دیا، لجنۃ الصلوٰۃ کے نام سے طلبہ کی ایک انجمن قائم ہوئی، جس میں وہ شریک تھے، کالج کے طلبہ میں مذہبی معلومات پیدا کرنے کی خاطر وہ سال میں ایک دفعہ مجلس میلاد کیا کرتے تھے اور خود اس میں بیان فرمایا کرتے تھے اور دینیات کے درس میں

۱۔ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اپنے چچا مولوی سلیم صاحب کے اثر سے جو عامل بالحدیث تھے، ایک زمانہ میں اہل حدیث ہو گئے تھے، پھر رجوع کر لیا۔

وہ دل چسپی پیدا کر دی تھی کہ طلبہ ان کے کلاس میں شوق سے شریک ہونے لگے، خود سرسید کی اس شکایت پر کہ طلبہ نماز میں کیوں شریک نہیں ہوتے، یہ صاف کہہ دیا کہ ”چوں کہ آپ شریک نہیں ہوتے“ (سرسید مسلسل ابول کی شکایت کے سبب سے گھر جا کر نماز پڑھتے تھے اور جمع بین الصلواتین بھی کرتے تھے)

وضع و قطع کے لحاظ سے مولانا اگرچہ کوئی متقشف مولوی نہیں معلوم ہوتے تھے، تاہم انگریزی لباس انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا، لطیفہ: سیرۃ النعمان کے جواب میں مولانا عبد العزیز صاحب رحیم آبادی نے ”حسن البیان“ نام کتاب لکھی تھی، اس میں غلط فہمی کی بنا پر مولانا پر انگریزی لباس پہننے کا الزام لگایا تھا، مولانا فرماتے تھے کہ ”اتفاق سے ایک جگہ میری ان کی ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ میں انگریزی لباس تو کبھی نہیں پہنتا، مولانا رحیم آبادی نے پشیمانی ظاہر کی اور فرمایا کہ میں نے یوں ہی سنا تھا۔“ ڈاڑھی کی غیر شرعی ہیئت سے بھی ان کو سخت بیزاری تھی۔

ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں لوگوں نے رقص و سرور کا سامان کیا، ان کو معلوم ہوا تو سخت خفگی ظاہر فرمائی اور شرکت سے انکار کر دیا، آخر وہ حرکت ملتوی کی گئی، تب انہوں نے شرکت کی۔ اپنے صاحب زادہ کی پہلی شادی میں ہر قسم کے رسوم و بدعات سے احتراز کیا اور اس موقع پر ایک موثر تقریر کی جس میں ان تمام رسوم کی جڑ کاٹ دی اور اہل برادری کے لیے شادیوں میں جہیز وغیرہ کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا، جس کی تعمیل بہت دنوں تک رہی اور اب بھی کسی قدر ہے۔

قطنطیہ کے سفر میں جہاز پر پرندوں کے گوشت کھانے سے کئی روز تک اس بنا پر اجتناب کیا کہ ان کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ جہاز پر پرندوں کا گوشت نہیں کیے جاتے، مگر انہوں نے خود جا کر دیکھا کہ اس جہاز پر پرندوں کا گوشت کھانا شروع کیا۔

عقائد و خیالات | تاہم عقائد و خیالات کے لحاظ سے وہ عقلیت پسند تھے لیکن ان کی عقلیت پسندی کے معنی یہ ہیں کہ وہ احکام مذہبی کو مصالح و حکم پر مبنی سمجھتے تھے، اسی لیے وہ احکام الہی کی مصلحتوں اور حکمتوں کی تلاش میں رہتے تھے اور اشاعرہ کے اس خیال کے کہ احکام الہی کا منشا محض مشیت الہی ہے اور وہ کسی حال میں ان دونوں باتوں میں جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ثابت کیا ہے اور تاہم یہ کامسک بھی یہی ہے، کوئی تضاد نہیں، بے شبہ احکام مصالح و حکم پر مبنی ہیں لیکن یہ بھی مشیت الہی کا کرشمہ ہے، خاک سار کا ایک شعر ہے:

تیری قدرت وہ کہ سکتی ہے جو تیری مشیت ہے مگر تیری مشیت آپ ہی پابند حکمت ہے
لیکن یہ ضرور نہیں کہ یہ مصالح اور حکم پوری طرح بندوں کی سمجھ میں بھی آجائیں اور جو بندے سمجھیں وہ تمام تر صحیح بھی ہو۔

مصلحت و حکمت پر مبنی نہیں، سخت مخالف تھے، اسی بنا پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ معجزات کے بھی قائل نہ ہوں گے، کیوں کہ وہ خرقِ عادت پر مبنی اور خلافِ عقل ہوتے ہیں لیکن یہ سوء ظن قطعاً غلط ہے، وہ معجزات کے قائل تھے اور سرسید وغیرہ کی تاویلات کو دور از کار اور ملح سمجھتے تھے، چنانچہ الکلام میں لکھتے ہیں لیکن خرقِ عادت تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام میں بھی کچھ نہ کچھ اس کی جھلک موجود ہے، اس لیے اس عقیدہ کا حل کرنا ضرور ہے، قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقہ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شبہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی لیکن انکار محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو لوگوں کے لیے کافی ہیں، جو پچارے عربی زبان اور اس کے طرز و اسلوب سے نا آشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلویح کیا کام دے سکتی ہے۔“ (ص ۸۵، ۸۶)

لیکن بایں ہمہ وہ بات بات کو معجزہ نہیں مانتے تھے، ان کے نزدیک معجزات کے ثبوت کے لیے قطعی شہادت کی ضرورت تھی اور قرآن مجید چوں کہ قطعی الثبوت ہے، اس لیے اس میں جہاں خرقِ عادت کا ذکر ہوگا، واجب التسلیم ہوگا۔

لیکن مولانا کے نزدیک یہ امر نہایت غور اور دقت نظر سے طے کرنا پڑے گا کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ اس کے ثبوت میں قطعی الدلالة ہیں یا نہیں، مفسرین میں بہ قول مولانا جو محقق گزرے ہیں، مثلاً قتال، ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر اصم وغیرہ ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں بہت کم خرقِ عادت مذکور ہیں اور جو واقعی مذکور ہیں، ان کی صحت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

ان کا یہ خیال الکلام کے لکھنے وقت یعنی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء تک تھا لیکن سیرت کی تصنیف کے وقت وہ اپنے پچھلے خیال سے پھر چکے تھے، چنانچہ احادیث صحیحہ میں رسول اللہ ﷺ کے جو معجزات مذکور ہیں، ان کا ذکر خویرۃ النبی ﷺ کی دو جلدوں میں کیا ہے اور مقدمہ میں لکھ بھی دیا ہے، البتہ جن

۱۔ الکلام بحث معجزات۔

معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج اور تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔“ (خاتمہ دیباچہ سیرت جلد اول)

وہ جن اور شیطان کے وجود کو بھی تسلیم کرتے تھے لیکن ان کے متعلق عوام جو واقعات بیان کرتے ہیں ان کو وہ ہم پرستی سمجھتے تھے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ کے حال میں ان کا جو مضمون ہے، اس میں لکھتے ہیں ”جن کے وجود سے انکار نہیں لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے۔“ (مقالاتِ نبوی ج ۵ ص ۷۳)

اس سے شاید مولانا کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ دوسروں کی صورت بن کر نمایاں نہیں ہوا کرتے، ورنہ شخصیتوں سے امان اٹھ جائے، ہاں احادیث میں شیاطین کا بہ تبدیل صورت نظر آنا صاف و صریح مذکور ہے۔

وہ گو فرشتوں کے وجود کے پہلے بھی قائل تھے لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ملائکہ کا اطلاق حسب تصریح مولانا روم و مولانا بحر العلوم شارح منثوری بعض ملکات نبوی اور ملکات بشری پر بھی ہوا ہے، جیسا کہ سوانح مولانا روم میں انہوں نے لکھا ہے لیکن سیرت کی تالیف کے زمانہ میں اس حقیقت کے چہرہ سے بھی پردہ اٹھ چکا تھا اور جبریل امین اور دوسرے فرشتوں کے مستقل شخصی وجود کے نام ان کی اس کتاب میں اسی طرح آئے ہیں، جس طرح عام مسلمان مانتے ہیں۔“

حشر و نشر، جنت و دوزخ اور واقعات مابعد الموت کے متعلق جہاں تک ان کی قدیم کلامی تصنیفات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی کلامی مشغولیتوں کے زمانہ میں ان چیزوں کو فقط روحانی سمجھتے تھے، مگر جب سے انہوں نے ادھر چند اخیر برسوں میں سیرۃ النبی ﷺ کے تعلق سے احادیث کا مطالعہ شروع کیا تھا، ان کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا تھا، ان کے ذہن و عقل کی دنیا ہی بدل گئی تھی، ان کے اس انقلاب میں علامہ ابن تیمیہ کی تصنیفات کو بھی بڑا دخل تھا۔

بدعات سے ان کو ہمیشہ سے سخت نفرت تھی، بدعات شعبان و محرم کا ان کے ہاں پتہ بھی نہ تھا، اسی طرح بزرگوں کے مزارات پر جا کر عوام جن بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ ان کو شرک سمجھتے تھے، بلکہ بعض دفعہ وہ غصہ میں احتیاط سے آگے بڑھ جاتے تھے، ایک بار ایک صوفی ان سے ملنے آئے، سلسلہ کلام میں مولانا نے فرمایا کہ اجیر وغیرہ کے بتکدوں کو جلا دینا چاہیے، اس وقت تو وہ صاحب

خاموش رہے لیکن وہاں سے اٹھ کر آئے تو مولوی عبدالسلام ندوی صاحب سے کہا کہ ان حضرت کو مراقب تو نہیں ہو گیا ہے، اگر ان کا یہ خیال تھا تو کم از کم میرے سامنے اس طرح ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

لطیفہ: ایک دفعہ مولانا بمبئی سے اجمیر کے راستہ سے لوٹے، اجمیر کے اسٹیشن پر پہنچے تو مجاور جو اسٹیشن پر زائروں کے لینے کے لیے آتے ہیں، مولانا کی طرف بڑھے، مولانا نے ان سے بے رُخی برتی تو انہوں نے کہا کہ ”یہ حضرت فرعون بے سامان معلوم ہوتے ہیں“ مولانا نے فرمایا ”ہاں میں تو فرعون بے سامان ہوں، مگر آپ فرعون باسامان ہیں۔“

الفاروق میں ایک ضمنی موقع پر لکھتے ہیں ”اسلام نے شرک کو کس زور شور سے مٹایا لیکن غور سے دیکھو تو قبروں اور مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرز عمل ہے، اس میں اب بھی کس قدر شرک کا مخفی اثر موجود ہے، گو استفادہ عن القبور اور حصول برکت کے خوش نما الفاظ نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے۔“

الکلام میں مولانا نے ملحدین کے بہت سے اعتراضات نقل کر کے ان کے جوابات دیے ہیں، بعض لوگوں نے دیدہ و دانستہ یا نادانستہ ان اعتراضات کو مولانا کے عقائد میں داخل کر دیا، ۱۹۱۴ء میں معاملات ندوہ کی تحقیقات کے لیے دلی میں جو جلسہ ہوا، اس میں بعض مخالف علمائے ان بنی عقائد کی بنا پر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا اور ظاہر کیا کہ وہ مادہ کو قدیم اور غیر مخلوق اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں، اس پر سید عبدالسلام صاحب مرحوم مالک مطبع فاروقی دہلی نے مولانا سے اس کے متعلق سوال کیا، مولانا نے اس کا جواب یہ لکھا ”جس کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے، وہ ملحد اور زندیق ہے، میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں، نہ قدیم بالزمان، البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں۔“

الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کیے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے، میں نبوت کو عطیہ الہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت ﷺ کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں جانتا، باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں، میں عقیدہ اور فقہاء دونوں لحاظ سے اہل سنت و جماعت سے ہوں۔“

اس اعلان میں آخری سطریں یونہی چھپی ہوئی ہیں، مگر چوں کہ میں اس واقعہ کے وقت حاضر تھا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اس لیے مجھے علم ہے کہ اصل میں پہلے جو کچھ مولانا نے لکھا تھا، اس کی اخیر سطریں انہوں نے یہ لکھی تھیں، جو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اب تک میرے پاس ہیں ”باقی میرے عقائد وہی ہیں جو حضراتِ حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں۔“ (شبلی ۹ مئی ۱۹۱۳ء)

نوٹ

مگر چوں کہ سید عبدالسلام صاحب اہل حدیث تھے، اس لیے ان کی درخواست پر مولانا نے وہ الفاظ رکھے جو اعلان میں ہیں، یہ ان کی وفات سے صرف چھ مہینے پہلے کی تحریر ہے۔ جن صاحبوں نے عقلیت پسندی کی بنا پر ان کو معتزلی سمجھا یا سمجھانا چاہا ہے، وہ غلطی پر ہیں، چنانچہ مولانا نے اس اعلان میں تمام صفات الہی کے قدیم ہونے کا جو عقیدہ ظاہر کیا ہے وہ معتزلہ کا نہیں کہ وہ سرے سے صفات کو نہیں مانتے اور نہ ذات الہی کے سوا کسی چیز کو وہ قدیم مانتے ہیں، نہ اشاعرہ کا ہے کہ وہ صفات فعلی کو حادث کہتے ہیں، بلکہ یہ خالص ماتریدیہ کا عقیدہ ہے، جیسا کہ کتب ماتریدیہ میں مذکور ہے۔

”وہ عقیدہ بھی حنفی تھے“ یہ فقرہ ذرا تشریح طلب ہے، آج عام طور سے حنفی اور غیر حنفی مسلمان سب گویا اشعری ہیں، یا اشعری سمجھے جاتے ہیں، مگر شروع میں یہ کیفیت نہیں تھی، حنبلی جس طرح عقائد میں امام احمد بن حنبل کے اور مالکی امام مالک کے پیرو تھے، اسی طرح شافعی عموماً امام شافعی کے بعد پیدا ہونے والے ایک شافعی المذہب امام ابو الحسن اشعری التونی (۳۲۴ھ) کے پیرو بنے اور حنفی امام اعظم کے ایک شاگرد در شاگرد امام ابو منصور ماتریدی حنفی (التونی ۳۳۳ھ کے مقلد ہوئے)۔

۱۔ جیسا کہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اپنے اس مضمون میں جو مولانا کی وفات پر لکھا ہے، بتایا ہے، مولانا شرر اپنے نظری مسلک کے لحاظ سے فقہاً اہل حدیث اور عقیدہ اشعری تھے، مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے، مولانا اور وہ جب یک جا ہوتے، تو میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ دونوں میں اشعریت پر تیز و تند گفتگو ہوتی، اس ضد میں مولانا شرر کا اخیر میں خیال تھا کہ وہ امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری لکھیں، مولانا نے اس کے ماخذ بھی ان کو بتائے تھے۔ ۲۔ مولانا نے الکلام میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ اسلام کا ایک بڑا فرقہ معتزلہ مادہ کو قدیم مانتا ہے، (ص ۵۴) یہ مولانا کا سہو قلم ہے، معتزلہ مادہ کو قدیم نہیں حادث مانتے ہیں۔ (مقالات الاسلامیین امام ابو الحسن اشعری مقالہ معتزلہ)۔

بہت سے اصولی مسکوں میں اشعریوں اور ماتریدیوں کا اتفاق ہے لیکن پندرہ میں مسکوں میں اختلاف بھی ہے، بعضوں نے کوشش کی ہے کہ اختلافات کو اختلافات لفظی بتا کر دونوں کو متفق بتائیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے بعض اہم مسائل میں جو شدید اختلاف ہے، وہ کسی لفظی تاویل سے مٹ نہیں سکتا۔

مولانا کو ان بعض اختلافی مسائل میں اشاعرہ سے بحد علواً اختلاف تھا، چنانچہ انہوں نے اپنی ہر کلامی تصنیف میں ان کی مخالفت کی اور بے حد مخالفت کی اور ان کو اس بات سے بے حد رنج تھا کہ حنفی کیوں اشعری بن گئے ہیں، اسی لیے انہوں نے ایک دفعہ اپنے زیر ہدایت میرے قلم سے ایک مضمون لکھوایا تھا، جس کا عنوان یہ ہے۔

”فرقہ حنفیہ عقائد میں کس کا مقلد ہے؟“

یہ مضمون الندوہ مارچ ۱۹۱۲ء (ربیع الاول ۱۳۳۰ھ) میں چھپا ہے اور خود انہوں نے بھی علم الکلام میں اس کے متعلق حسب ذیل فقرے لکھے ہیں ”یہ عجیب بات ہے کہ اگر فرقہ حنفیہ جو تمام فرقہ بائے اسلامیہ سے تعداد میں زائد ہے، اعتقادات کے لحاظ سے ماتریدیہ ہے، تاہم علم کلام میں اشعریہ کے مقابلہ میں ماتریدیہ کی شہرت بہت کم ہے، اس عدم شہرت کا یہاں تک اثر ہوا کہ آج اکثر علمائے حنفیہ اشاعرہ ہی کے ہم عقیدہ ہیں، حالانکہ قدیم زمانہ میں کسی حنفی کا اشعری ہونا نہایت تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، علامہ ابن الاثیر تاریخ کامل واقعات ۶۶۶ھ میں لکھتے ہیں ”وہذا مما یستظرف ان یکون حنفی اشعریاً“ یعنی یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی شخص حنفی ہو کر اشعری ہو۔“ (علم الکلام ص ۹۰)

اس کے بعد مصنف نے ماتریدیہ کے ان عقائد کی فہرست دی ہے جن میں وہ اشاعرہ سے الگ ہیں۔

مولانا مرحوم اپنی کتابوں میں سے علم الکلام کو بہت ناقص سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ ”مجھے افسوس رہ گیا کہ جس تفصیل سے اشاعرہ کے علم الکلام کا ذکر میں نے کیا، ماتریدیہ کا کیوں نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ انہوں نے اس کتاب کو علالت کے زمانہ میں لکھا، جس کے سبب سے پوری تفصیل نہ کی جاسکی اور شاید یہ بھی وجہ ہو کہ علمائے احناف نے علم کلام پر بہت کم کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں ”ماتریدیہ کی گمنامی کی وجہ یہ ہوئی کہ علمائے حنفیہ نے علم کلام میں بہت کم تصنیفات

کیں، اس فن میں جس قدر مشہور اور معرکہ آرا کتابیں ہیں وہ شافیہ کی تصنیفات ہیں، جو عموماً اشعریہ تھے۔ (علم الکلام ص ۹۰)

فروری ۱۹۰۹ء میں شیخ عبدالقادر صاحب (پونہ) مولانا سے ایک کلامی مسئلہ کی تشریح چاہتے ہیں، وہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں ”جملہ مستفسرہ اشاعرہ کا عقیدہ ہے، اشاعرہ نئی فرقہ کی ایک شاخ ہے لیکن اب تو تمام سنی اسی حماقت میں گرفتار ہیں، خیر اس فقرہ کو رہنے دیجئے، گو میرے ذاتی عقیدہ کے خلاف ہے۔“ (۸)

اس خط پر میرا حاشیہ ہے جو ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا ہے۔

”عقائد میں (مولانا) ماتریدیہ کو ترجیح دیتے تھے۔“

بہر حال اہل سنت کے یہ دو مقابل کے فرقے تھے، علامہ سبکی جو مشہور اشعری ہیں، شرح عقیدہ ابن حاجب میں لکھتے ہیں:

”حاصل یہ کہ اہل سنت کے تین گروہ ہیں، پہلا گروہ اہل حدیث ہے اور ان کے اصول کی بنیاد نقلی دلیلوں پر ہے اور دوسرا گروہ عقلی اور فکری علم و استدلال والے اور وہ اشعریہ اور حنفیہ ہیں، اشعریہ کے امام ابو الحسن اشعری اور حنفیہ کے امام ابو منصور ماتریدی ہیں۔“

وبسا الجملة فهم (ای اهل السنة) بالاستقراء، ثلاث طوائف، الاول اهل الحديث ومعتمد مبادئهم الادلة السمعية والثاني اهل النظر العقلي والصناعة الفكرية وهم الاشعرية والحنفية وشيخ الاشعرية ابو الحسن الاشعري وشيخ الحنفية ابو منصور الماتريدي (اتحاف السادة جلد ۱ ص ۶)

یہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اسی طرح باہم مختلف اور دست و گریباں ہیں، جس طرح اسلام کے اور دوسرے فرقے، گوان میں صلح پسندوں کے بیچ بچاؤ سے کبھی کبھی روک تھام بھی ہوتی رہی، ان اختلافات کی شدت کی صحیح حیثیت اگر کسی کو دیکھنی ہو تو امام ماتریدی کی شرح فقہ اکبر (منسوب الیہ) امام فخر الاسلام بزدوی کی کتاب العقیدہ، ابو شکور سلمی کی کتاب التہمید ابن ہمام کی مسایرہ اور متاخرین میں ملا علی قاری کی شرح فقہ اکبر دیکھئے۔

جن مسائل میں حنفیہ اور اشعریہ کا اختلاف ہے، ان میں چند مسائل حسب ذیل ہیں:

- ۱- اللہ تعالیٰ کے صفات فعلیہ جیسے خلق و رزق و رحمت وغیرہ اشعریہ کے نزدیک حادث ہیں، اور ماتریدہ کے نزدیک تمام صفات الہی قدیم ہیں۔
- ۲- اشیا میں حسن و قبح اشعریہ کے نزدیک فقط شرعی ہے، اور ماتریدہ کے نزدیک شرعی کے ساتھ عقلی بھی ہے۔

۳- اشعریہ کے نزدیک بندوں میں اپنے افعال پر جو قدرت ہے وہ وہی ہے، اس کو افعال کے صدور میں کوئی دخل و تاثیر نہیں، ماتریدہ کے نزدیک بندوں کی قدرت کو ان افعال کے صدور میں دخل و تاثیر ہے اور اسی لیے ان سے مواخذہ ہے۔

۴- ماتریدہ کے نزدیک خدا جس طرح جوہ و ظلم سے اور جو صفات اس کے شایان شان نہیں، ان سے شرعاً پاک ہے، اسی طرح عقلاً بھی پاک ہے، اشاعرہ کے نزدیک شرعاً پاک ہے عقلاً نہیں۔

۵- ماتریدہ کے نزدیک خدا نے اپنے احکام اپنے بندوں پر اپنی رحمت سے مصالح اور حکمت پر مبنی کیے ہیں، اشعریہ کے نزدیک مصالح و حکمت پر مبنی نہیں۔

۶- ماتریدہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اشیا میں خواص اور تاثیرات و دلالت کی ہیں، اشاعرہ کے نزدیک اشیا میں کوئی خاصہ اور تاثیر نہیں، اللہ تعالیٰ ضرورت کے وقت ان میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔

۷- ماتریدہ کہتے ہیں کہ خدا کسی کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا، اشعریہ کے نزدیک نہ صرف یہ کہ وہ دے سکتا ہے، بلکہ اس نے دی ہے۔

۸- ماتریدہ کے نزدیک ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا، اشاعرہ کے نزدیک ہوتا ہے۔ مولانا شبلی نے علم الکلام اور الکلام دونوں کتابوں میں طرح طرح سے اشاعرہ پر حملے کیے ہیں اور بڑے زور شور سے ان کے دلائل کا رد کیا ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اشاعرہ کا رد انہوں نے معتزلہ کی محبت میں کیا ہے، حالانکہ یہ معتزلہ کی محبت میں نہیں، بلکہ ماتریدہ کی محبت میں ہے، البتہ ان کا قصور یہ ہے کہ وہ اس مخالفت پر بھی اپنی کلامی تصنیفات میں اشاعرہ کے چکر سے نہیں نکل سکے اور امام غزالی اور امام رازی کی گرفت میں جو اس الاشاعرہ ہیں، عرصہ تک رہے۔

امام غزالی اور امام رازی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے عام رسائل میں اشعریہ کا حد درجہ التزام کرتے ہیں، حتیٰ کہ امام رازی تفسیر میں کب کیا جبر تک کے ثابت کرنے کے لیے قدم قدم پر رکتے ہیں مگر

وہ مطالب عالیہ وغیرہ مخصوص کتابوں میں بلکہ تفسیر میں بھی بعض حقائق کی حکیمانہ تشریح میں اشعریت کی کوئی پروا نہیں کرتے، امام غزالی کبھی معتزلہ کے ہم زبان ہوتے ہیں، کبھی صوفیہ کے، کبھی حکما کے، یہی سبب ہے کہ قاضی ابن رشد نے اپنی کتاب کشف الادلہ میں امام غزالی کی نسبت جل کر یہ لکھ دیا کہ ”ابو حامد غزالی کا کیا کہنا وہ اشعریوں کے ساتھ اشعری، معتزلیوں کے ساتھ معتزلی اور صوفیوں کے ساتھ صوفی ہیں۔“

امام غزالی کی کتابوں میں سے جواہر القرآن، المعتقد من الصلال، التفرقة بین الاسلام والزندقة، المصنوع علی غیر اہلہ وغیرہ ابتدائی کلامی رسائل مولانا کے زیر نظر رہے اور ان دونوں اماموں کی ان ہی تصانیف سے مولانا نے ان کے ان خیالات کو جن لیا ہے، جو آج کل کے خیال اور مذاق کے مطابق ہو سکتے تھے اور یہی ان کا علم کلام ہے۔

غرض الکلام لکھتے وقت ان پر سب سے زیادہ غزالی کا اور پھر رازی کا اثر تھا لیکن اس کے بعد جب علامہ ابن تیمیہ کی کتابیں چھپ چھپ کر آنے لگیں تو علامہ ممدوح کا اثر ان پر غالب آنے لگا، اس اثر کا آغاز علامہ ابن تیمیہ کی کتاب ”الرد علی المنطقیین“ سے شروع ہوا اور آخر یہاں تک بڑھا کہ وہ جولائی ۱۹۱۲ء میں یعنی وفات سے چار ماہ پہلے مجھے لکھتے ہیں کہ ”تم نے شروع کر دیا تو خیر، ورنہ ابن تیمیہ کی لائف فرض اولین ہے، مجھے اس شخص کے سامنے رازی و غزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں، ان کی تصنیفات میں ہر روز نئی باتیں ملتی ہیں۔“ (س-۷۸)

آخر میں مجھ سے فرماتے تھے کہ ”میں اب ہر چیز میں ابن تیمیہ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار ہوں۔“ آخر زمانہ میں ان میں روحانی جستجو کی خلش پیدا ہو گئی تھی، اسی زمانہ میں بعض صوفیوں سے بھی ملاقاتیں کیں، ایک دفعہ ایک ملاقات میں مولانا وارث حسن صاحب نے جن سے مولانا کے بھائی مولانا حمید الدین صاحب الہ آباد یونیورسٹی کی عربی پروفیسری کے زمانہ میں جو شامیہ ۱۹۱۷ء ہو، بیعت ہو چکے تھے، مولانا کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مولانا نے تقلیدی بیعت پسند نہیں کی، مگر ان کو مانتے تھے۔ مولانا کے اخیر زمانہ کی فارسی غزلوں میں خواجہ شیراز کی شراب کارنگ صاف نظر آتا ہے، اس کو دیکھ کر بعض صاحبوں کو خیال ہوا تھا کہ مولانا پر تصوف کارنگ آ رہا ہے، اور اس کی تلاش تھی کہ ان کوڑا جہاں آباد وطن تھا، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے فیض حاصل کیا تھا، لکھنؤ میں شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد میں قیام فرمایا تھا، وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں، لکھنؤ کے بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب نے ان سے تربیت پائی اور بہت سے شہروں میں ان کے فیض روحانی نے وسعت حاصل کی، خاک سار بھی ان کی زیارت سے بارہا سعادت مند ہوا۔

کی اس شرابِ حقیقت کا پیر مغال کون ہے، مگر یہ واقعہ نہ تھا، تاہم اتنا درست ہے کہ فلسفہ و حکمت کا نشہ ان کے سر سے اتر چکا تھا اور یہ کہنے لگے تھے:

دردِ دل بودن دریں رہ خست ترغیب است، سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دادو بوے ایمان ہم
فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود
گست راز دگر آں راز کہ افشائی کرد

طیفہ: ۱۹۱۴ء کے شروع میں جب اصلاحِ ندوہ کے سلسلہ میں ان کو دہلی میں قیام کا اتفاق ہوا تو ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے حلقہٴ مشائخ میں انہوں نے تصوف پر تقریر فرمائی جو بڑی جامع و مانع و موثر تھی، تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر تصوف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔ اسی زمانہ میں دہلی میں اہل حدیث کے زیرِ اہتمام ایک مجلس میں توحید پر ایسا عمدہ مدلل اور موثر بیان فرمایا کہ خود اہل حدیث اس غالی حنفی کی پاکیزہ توحید سے متاثر نظر آتے تھے، اگر کچھ روز اور ان کی زندگی وفا کرتی تو عجب نہیں کہ یہ قالِ حال بن جاتا اور جو انقلابِ روحانی گزشتہ متکلموں کے حالات و خیالات میں پیش آیا وہ چودہویں صدی کے اس متکلم میں بھی نظر آتا، جس کے آثار ان میں روز بروز نمایاں سے نمایاں تر ہوئے چلے جاتے تھے، شاید اسی عالم میں یہ فرمایا ہوا:

ساغر زندگیم حیف کہ جز دردِ نداشت
جز ہمیں جرعہٴ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام

مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرزا پوری نے مجھ سے بیان کیا:

”غالباً ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کانپور تشریف لائے، میں اس زمانہ

میں مدرسہ الہیات کے آخری سال میں پڑھتا تھا، اراکین مدرسہ کی درخواست پر مولانا معائنہ کے لیے

مدرسہ تشریف لائے اور طلبہ کا امتحان لیا، چنانچہ مجھ سے دریافت فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو

کیسے زندہ کیا کرتے تھے، میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ میں اس وقت موجود نہ تھا، یہ سنتے ہی مولانا

کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور انھہ کر مجھے مینہ سے لگایا اور فرمایا تمہارے جواب نے میرے ایمان کو تازہ

کر دیا، ان کی اس حالت اور اس کہنے کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ آج تک ان کی وہ کیفیت اور ان کا وہ مقولہ بھولنا

نہیں، جب یاد کرتا ہوں ان کی ایمانی صورت سامنے آ کر لطف دے جاتی ہے۔“

۱۔ یہ روایت مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ، یہ مولانا کے اخیر زمانہ میں ندوہ میں

زیرِ تعلیم تھے۔

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ ”جس زمانہ میں مولانا الکلام لکھ رہے تھے، متکلمین نے وجود باری پر عقلی دلیلیں قائم کی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے ضعف و قوت پر نقد کر رہے تھے، ایک دن ایک صحبت میں انہوں نے اقبال صاحب سے فرمایا کہ تم وجود باری پر کوئی مضبوط عقلی دلیل دے سکتے ہو؟ انہوں نے متداول عقلی دلیلیں پیش کیں، مولانا نے ایک ایک کی کم زوری ظاہر کر دی، اسی طرح وہ دیر تک ایک کے بعد دوسری دلیل پیش کرتے رہے اور مولانا ان کو توڑتے رہے، آخر میں انہوں نے تھک کہ کہا کہ ”اچھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو دعویٰ کیا وہ معاذ اللہ غلط اور جھوٹ ہے“ ان الفاظ کا سننا تھا کہ مولانا پر تاثیر کا ایک عالم پیدا ہوا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دیر تک روئے رہے اور جب ذرا سکون ہوا تو ان سے کہا ”عزیز من!

ع باخدا لیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار

اصل یہ ہے کہ مولانا وجود باری کی ان فلسفیانہ دلیلوں کو جن کو متکلمین نے پیش کیا ہے، اعتراضات اور شبہات سے بری نہیں سمجھتے تھے، وہ وجود باری کے اقرار کو فطری کہتے تھے اور اس کو دلیل منطقی کا محتاج نہیں سمجھتے تھے اور اس کے لیے قرآن پاک نے جو تنبیہی شہادتیں پیش کی ہیں ان ہی کو مفید یقین کرتے تھے، چنانچہ الکلام میں بحث کے خاتمہ پر لکھتے ہیں: ”آج جب کہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہو گئی ہے جب کہ کائنات کے سیکڑوں اسرار فاش ہو گئے ہیں، جب کہ حقائق اشیانے اپنے چہرہ سے نقاب اٹھ دیا ہے، بڑے بڑے فلاسفر اور حکما انتہائے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کر سکے، جو قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا۔“

اور یہی صحت ایمان کا وہ اخیر نقطہ ہے جس پر امام جوینی امام غزالی اور امام رازی بلکہ قاضی ابن رشد بھی جو عمر بھر عقلی دلیلوں کی جمع و ترتیب میں سرگرداں رہے، بالآخر خُز کے تھے اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا۔

یٰلہ الا اللہ ہے، محمد رسول اللہ ﷺ یہ کہ

حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات بابرکت کے ساتھ ان کو جو غیر معمولی شیفتگی ہمیشہ تھی، جیسا کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں علانیہ فرمایا، شیفین گانیم و پیسیر پرست، وہ سیرت نبوی ﷺ کی تالیف و تصنیف کے زمانہ میں جوں جوں آگے بڑھتے جاتے، ترقی کرتی جاتی تھی،

۱۔ الکلام، ص ۳۸، طبع اول۔

احادیث کے مطالعہ نے ان میں روحانیت کی ایک سرخوشی پیدا کر دی تھی اور آخر میں ہمیشہ اسی پاک شراب کے نشہ میں مغمور رہتے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں اخلاقی نظموں کا جو سلسلہ انہوں نے شروع کیا تھا، وہ اسی ذاتی اور وجدانی حالت کا نتیجہ تھا۔

یہ بھی سلسلہ وفات میں اوپر آپ پڑھ چکے کہ مرتے وقت بھی جو چیز ان کے لب ناتواں پر بار بار آتی تھی، وہ یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت تھی۔

ع تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

آخر ان کی یہ پیشین گوئی بھی جو اسی سال کی تھی پوری ہوئی:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستان لکھی مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبرِ خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا
دو سال پہلے ۱۹۱۲ء میں ایک ادب نواز دوست کو کس حسرت سے لکھا تھا ”شعر العجم اب کہاں،
ایک آنکھ میں پانی اتر آیا، دوسری بھی ضعیف ہو گئی، سیرت پر خاتمہ ہو جائے تو یہ حسن خاتمہ ہے۔“
بجھ لکھ کہ یہ دعا قبول ہوئی اور محبوب ﷺ کی سیرت ہی پر خاتمہ ہوا، جو حسن خاتمہ کی نشانی ہے۔

خاتمہ

ناظرین! آپ نے نو سو صفحوں تک میری رفاقت کی، اس اثنا میں آپ کے اس شریک سفر اور رفیق نظر نے ایک مجسمہ علم و فن اور پیکر خدمت دین و ملت کی زندگی کا مرقع جیسا کہ اس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کم زوریوں کی جھانپائیاں بھی ہوں گی لیکن مجموعی طور سے حسن و جمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصور کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، آئیے ہم اور آپ اس کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں اور زبان سے کہیں، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْہٗ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاکِ طینتِ را

۳۰ اپریل ۱۹۳۱ء

شبلی منزل، اعظم گڑھ

ضمیمہ

مراثی و قطعات

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اخبارات و رسائل میں اس کثرت سے مرثیے اور تاریخی قطعے شائع ہوتے رہے کہ ان کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے لیکن اس موقع پر ان چند خاص مرثیوں اور تاریخی قطعوں کا ضمیمہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو ان کے خاص عقیدت مندوں نے لکھے ہیں اور جو ان کی زندگی کی سوانح کے بیان میں نکتہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مرثیہ فارسی

از

مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل، ایم اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ اعظم گڑھ

آہے ست سرد جنبش باد بہار نیست	جائے نشاط در چمن روزگار نیست
کونو گلے کہ چاک دلش آشکار نیست	کولال کہ داغ جگر در نہاں نہ داشت
زہریت سر برون زدہ این ہزہ زار نیست	خونے ست تو، تو کہ گلشن نام کردہ اند
کور است دل گرش نگہ اعتبار نیست	سنگست دیدہ گر نم اشکش نمی چکد
دنیا مجوزہ ایست عروس نگار نیست	ز نہار چشم دل بہ فریب رخس مدوز
آرے نہاد باد تو دانی قرار نیست	بنیاد کاخ عمر بہ بادے نہادہ اند
خودایں زمانہ چہست اگر رہ گزار نیست	در کاروان سرائتواں خانہ ساختن
کاین کاخ را اساس بقا استوار نیست	یارے کزین خرابہ رود در غمش منال
دانی کہ نوش ویش جہاں پائیدار نیست	اہر و کشاہ دار بہ شیریں و تلخ دہر

نواں چو جامِ عیش دریں خاکداں زدن

بر تلخی زمانہ نیر ز و فغاں زدن

لیکن کنوں کہ سیل حوادث ز سرگزشت
باید ز شیون من بیچارہ درگزشت
بگزار تا بہ نالہ دل از غم تہی کنم
کارم کنوں ز سعی تو اے چارہ گرگزشت
پذیر عذر تلخ نوائی زمن کہ باز
زہر آہ غم ز گلو تا جگر گزشت
چوں کعبہ گر سیاہ بہ پوشیم می سزد
کاں نقشبند سیرت خیر البشر گزشت
آوارہ گشتہ گلہ و چوپاں بخواب رفت
در رہ بماند قافلہ و راہبر گزشت
آرے اگر دلت نہ گداز و بحال قوم
بارے بہ ہیں چہ بر سر علم و ہنر گزشت
زیبہ اگر قد علم علم سرنگوں
کز کشور کمال شہ داد گرگزشت
زہت گہ ہنر کہ بدان برگ و ساز بود
بازش نگہ کنید و پرسید سرگزشت
ناصح بہ دجلہ باری مژگان ما مکیر
کایں گریہ نیست بہر عزیزے کہ برگزشت

ما ایں فغاں بہ بیکی علم و فن کنیم

یا شیونے بہ زندگی خویشین کنیم

دانشور یگانہ بہ دارالقرار شد
زہد اگر جہاں ہمہ اش سو گوار شد
باد سحر بہ ماتم او آہ برکشید
چشم ستارہ در غم او اشکبار شد
دانشوران دہر بہ ماتم نشستہ اند
کز روزگار نادرہ روزگار شد
تا رخ نہفت ساقی نخبانہ علوم
آب بقا بہ کام خضر ناگوار شد
دردا کہ گنجدار معارف ز دہر رفت
دا حسرتا کہ شبلی معجز نگار شد
اے جہل شاد باش کہ گیتی بہ کام تست
وائے علم خون بشو کہ درونت نگار شد
آوخ کہ ہجو گنج بہ خاکش نہاں کنند
کزوے ہزار گنج نہاں آشکار شد
گلزار دیں کہ از نم کلکش بہار داشت
بے برگ ماندہ است کہ آل آبیار شد
عیسی دے کہ جان بہ تن مردگان دمید
آخر چہ شد کہ خود ز جہاں بر کنار شد

خلقے ز خواب واہمہ ہشیار کرد و خفت

بخت ہنر بہ زمزمہ بیدار کرد و خفت

دردا کہ جبہ نازش اہل جہاں نماند
اکنوں کہ چامہ گوئے نظیری نظیر مرو
یکتا گلے کہ باد بہار گزشتہ داد
از سر بہ پاست ماتم رازی و ابن رشد
دردا کہ باز دامن اردو زباں تہی است
در یوزہ شرار غمے از کجا کنیم
آوخ کجا روند و چه سازند چوں زیند
چرخ خمیدہ پشت چہ جوئی نظیر او
سیرت نہ شد تمام و دریغا کہ کس زما

تختے فشانده بود برش برہنچید و رفت

شانے نشانده بود بہارش ندید و رفت

اے شمع جمع فضل کہ از ماجد اشدی
بیگانگان کمال تو نشانختند حیف
شاید کہ نشر علم بہ گردوں ہم آرزوست
دادت کسے نہ داد مگر از جہانیاں
دربار گاہ قدس مگر شاعرے نہ بود
در سیرت است حاجت تحقیق نکتہ
یا جلوہ بے حجاب تمنا است کز جہاں
مادر فغان و ییچ نہ پرسی ز حال من
ایں خستہ را بہ منزل مقصود ہم رساں

ما را بہ غم گزارشتہ آخر کجا شدی
زین رہ مگر بہ بزم گہ آشنا شدی
کایں خاکدان گذارشتہ سوے ما شدی
کائے داد خواہ قوم بہ پیش خدا شدی
تا بہر نغمہ سنجی حمد و ثنا شدی
تا خود کنوں بہ بارگہ مصطفیٰ شدی
مستانہ وار در حرم کبریا شدی
آخر کنوں چہ شد کہ تو نا آشنا شدی
آخر نہ خود ز لطف و کرم رہنما شدی

اے راہبر ہماں کہ شتابت نمی سزد

تو بخت قوم ہستی و خوابت نمی سزد

غافل ز حال ملت بیضا چگونہ
 ما خاکیاں بہ ماتم تو خاک بر سریم
 اینجا دلت طپید ہجران مصطفیٰ
 در فکر قوم سیر چمن خوش نداشتی
 اہل جنان بحسن کلام تو کے رسند
 در چار دانگ دہر نظیرت نہ داشتی
 ما بے تو ہم چو عسکرے بے شاہ ماندہ ایم
 با خاکیاں تیرہ درون سخت زمستی
 دیر است تاز حال تو آگاہ نیستم

وقت است سرد را کہ سراز خواب بر کنی

بر حال نشتگان بہ عنایت نظر کنی

بگر کہ حال ما بفرق تو چوں شد است
 ہر نقش آرزو کہ بر اینچہم ز دل
 آن ندوہ کز فیوض تو مہد کمال بود
 و آن نیشل کہ ہمت تو دادہ اش وجود
 باغے کز آبیاری تو خرمی گرفت
 جامے کہ پر ز بادہ نابلش گذاشتی
 دارالمصطفین کہ بہشت فیوض تست
 بدخواہ دیں کہ چید اساس حصار کذب
 تو چوں کلیم طور نشین وصال و قوم

از دیدہ خواب رفتہ و از دل سکون شد است
 چون رشہ نگاہ کنوں غرق خون شد است
 ہر خام راستیزہ گمہ آزمون شد است
 یکسر خراب و خستہ و خوار و زبون شد است
 تاراج فتنہ سازی چرخ خروں شد است
 چون کاسہ سپہر دگر و اژگول شد است
 می سو دسر بہ چرخ مگر بے ستوں شد است
 باز از گلولہ باری کلکتہ مصون شد است
 از ساوگی فریفتہ ہر فسوں شد است

برخیزد با ز لطف بہ اہل نیاز کن

بر مادر خربنہ تحقیق باز کن

نوحہ استاذ

از خاک سار سلیمان ندوی

اے متاعِ عزت پیشیں کے چھپے کارواں
شام اقبال گزشتہ! مقطعِ عہدِ سلف!
غونچے فصلِ پسین! موجِ نسیمِ صبحِ دم!
علمِ دفن کا عشق تھا جس کی طبیعت کا خمیر
جس کے لب کی جو صدا تھی نوحہ اسلاف تھی
جس کی ہر رائے زریں آزار ملت کا علاج
جس کی اک بات تھی روحِ بلائی کی اذان
جس کے ہر مصرع میں سوڑا آتشِ زخمِ دروں
جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رود فرات
پیکر آرائے سخن جس کا دماغ نکتہ در

آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان
شمعِ بزم! صحبتِ آخر! نشانِ رفتگان
نغمہٴ آخرِ سحر! مرغِ گلستانِ خزاں
صفحہٴ قرطاس جس کا فخرِ قومی کا نشان
جس کی ہر فریاد تھی صورتِ درائے کارواں
جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسباں
جس کی رگ رگ میں تھیں سوڑ درد کی چنگاریاں
جس کے ہر فقرہ میں مخفی مرہمِ دردِ نہاں
جس کے ہر صفحہ کا دامنِ رشک دریاے عمان
مرکبِ پرواز معنی جس کی پانچوں انگلیاں

اب ہمیشہ کے لیے وہ آہ! ہم سے چھٹ گیا

وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

کیا فریبِ صبر کھائے غمِ نصیبِ دلِ فگار
جاننا ہوں ہر بشر کو راہِ روِ عاجلِ سفر
جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا
یاد آئے جب وہ اس کا فقرہ نا مختتم
اس طرف لبِ توصیہ فرمائے تکمیلِ عمل
پھر رُکے کس طرح پر شوری قلبِ مضطرب
اے سروشِ موت! اک لمحہ توقف کر کہ میں
تیرے ادراقی پریشاں کس طرح ترتیبِ دوں
جب سوادِ خط ترا آئے گا آنکھوں کو نظر

جس کی دولت لٹ گئی کب اس کو دل پر اختیار
جاننا ہوں زندگی کو اک لباسِ مستعار
پھر دل اندوہ گیس کو کس طرح آئے قرار
”آہ سیرت! آہ سیرت چھوڑ کر سب کاروبار“
اس طرف جاں جملائے نزع و رنجِ احتضار
کس طرح رُک جائے خونِ نابی چشمِ اشکبار
پوچھ لوں ”اے احمد مختار کے سیرت نگار
کچھ طریقِ نقد سکھلا، کچھ بتا اندازِ کار
کس طرح پائے گا قلبِ مضطرب صبر و قرار

اہل میت اک توقف پوچھوں آقا سے میں میرے آقا میں فدا اور جاں مری تجھ پر نثار
تو نے فرمایا کہ ”تاریخِ عرب“ تحریر ہو ہو چکی تھیں، اب ہو کون دیا چہ نگار
بہر تسکین دل بے صبر کچھ فرمائیے
میرے آقا پھر ذرا حرمِ بیاں دکھلائیے

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجازِ بیاں کون پھوٹے اب مرے بے جان سے نفروں میں جاں
مرکزِ امید جو تھا آہ وہ جاتا رہا جذبہ شوقِ زیارت اب مجھے کھینچے کہاں
اب پر پرواز معنی کون بخشے گا مجھے پست مضمون کون پہنچائے گا اب تا آسماں
کون کھولے گا مرا اب عقدہ اشکالِ فن کون سمجھائے گا مرز حسن اسلوبِ بیاں
کون دیکھے گا مرا اب زور بازو سے قلم کون دیکھے گا مری جولانی طبعِ رواں
کون نامہ میں کرے گا اب عزیزی اسے خطاب کس کا ”تم“ کہنا بڑھائے گا مری تو قیر و شال
کس کے نام کو بناؤں اب میں عنوانِ خطاب ”سیدی“ ”مولائی“ ”استاذی“ ”غزالی الزماں“
اس کی مجلس تھی تماشا گاہِ اربابِ نظر آہ اے دست اجل تو نے منایا وہ سماں
میں نے جب پوچھا بتائے اس نے ہر فن کے رموز اب اگر چاہوں تو ڈھونڈوں آہ کس کا آستیاں
جب اسے دیکھا نئی روحِ عمل پیدا ہوئی اس کی باتیں جب سنیں پائی نئی تاب و توان

اس دلی پر شور میں گر شور تھا تو اس سے تھا

میرے بازو میں اگر کچھ زور تھا تو اس سے تھا

تیرے فرزند ان ندوہ تیری کوشش کے ثمر کم سنی ہے سہ نہیں سکتے ابھی رنجِ پدر
کچھ ابھی بچے ہیں رازِ مرگ سے واقف نہیں رو کے مچلے ہیں کہ کیوں آقا نے چھوڑا ہے یہ گھر
کیا ابھی جانیں یہ خوں نابہ فشانہ چشم کی کس طرح سمجھائیں ان کو صدمہ دارغِ جگر
نوجواں جو ہیں وہ کہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو ملالِ طبع ہم سے باعثِ عزم سفر
کس ہوس سے تو نے ان کی تربیت فرمائی تھی آہ کس امید سے تو نے لگائے تھے شجر
باغبان کیا رک نہیں سکتے ہو اگلی فصل تک لوگ کہتے ہیں کہ اب کی لائیں گے یہ برگ و بر
طاقت پرواز تک تاخیر کرنی تھی ضرور اب نکل آنے لگے تھے بازوؤں پر بال و پر
جب کبھی باہر ہوا جانا تو ان سے مل گئے وعدہ دیدار کیوں اٹھا ہے اب کی حشر پر

ان کی خاطر سے ہوئے اکثر ارادے ملتوی
اور اگر کارِ ضروری ہے کہ ٹل سکتا نہیں
ملتوی ہو جائے کچھ دن کے لیے عزمِ سفر
عرض اتنی ہے کہ ہو ان کی تیبی پر نظر

اپنے بچوں کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور
پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہے دور

تو نے جب چھیڑا ہے کوئی سخت یا آسان کام
مقصدِ اعظم ترا یعنی بنائے درس گاہ
شائقِ فن کے لیے سامانِ تکمیلِ علوم
تھے ابھی پیش نظر کچھ اور قومی مسئلے
ان مقاصد کے علاوہ اور بھی تھے کچھ امور
کام ادھورے ہیں، بہت پھر کیوں ہو عزمِ سفر
نا پسند آیا ہے اس کو چھوڑ دینا نا تمام
جس میں طرزِ نو سے ہو تعلیمِ فن کا انتظام
اور اک چھوٹی سی تصنیفی جماعت کا قیام
نشر دیں، تعطیلِ جمعہ، انتظامِ وقف عام
تیرے ہاتھوں سے ابھی پانا تھا جن کو انصرام
اس قدر تو ہو تو وقف ان کا بن جائے نظام

لوگ ٹھہرائیں جنازہ پوچھ لوں بھولا نہ ہو
یا ہو اس وقت اور عالم میں کہیں ایسا نہ ہو

کو بچ ہوتا ہے جہاں سے قوم کے غمخوار کا
شغلِ دائم جس کا تھا غمِ خواری دین میں
وقف ماتم جو رہا جب تک کہ اس میں جاں رہی
سو گوار اپنے بزرگوں کا رہا جو عمر بھر
خون روئے جس نے قومی بے کسی پر تیس سال
تھا صفِ میدانِ ملت کا وہی شمشیر زن
دل نہ تھا پہلو میں اس کے پارہ سیماب تھا
چارہ گر آزارِ قومی کا جو تھا رخصت ہوا
بے نواز داستانِ غم نہ تھی اس اس کی زباں

عالمِ اسلام میں تھا اک وہی روشن دماغ

آہ اس تاریک خانہ کا وہی تھا اک چراغ

www.KitaboSunnat.com

وداعِ شبلی

از خان بہادر مولوی رضا علی صاحب وحشت کلکتہ

خون می چکد ز ناصیہ داستان ما	آہ از وفاتِ شبلی شیوا بیان ما
ماہستگانِ خنجر جور زمانہ ایم	غیر از متاعِ دردِ نخواہ از دکان ما
اسلامیان بہ ماتم شبلی نشستہ اند	ہے چہ چور و کفر سیہ شد جہان ما
زین بزمِ آں مورخِ بالغِ نظر گذشت	کز رفتش برفت اثر داستانِ ما
آں نو بہارِ گلشنِ صدق و صفا نماند	شد پایمالِ جور ز خزاں گلستانِ ما
آں خضر پے فحشتِ کجارت ظاہر است	با منزل آشنا نہ شود کاروانِ ما
آں نکتہ دانِ بزمِ تعزلی کجاشافت	شد بے چراغِ مجلسِ عشرت نشانِ ما
از قندِ پارسی کہ ز لبہاش می چکید	ایراں بہ رشک بود ز ہندوستان ما

صد حیفِ آں ادیبِ اریب از میاں بہ رفت

وحشت نہ ماند لذتِ کام و دہانِ ما

قطعہ تاریخ

از جناب خواجہ عزیز الدین صاحب لکھنوی

المتوفی ۱۳۳۳ھ - ۱۹۱۵ء

آہ! سرِ دفترِ اربابِ کمال	کہ ز دفترِ کدہ فانی رفت
حاکمِ محکمہ علم و حکم	ناظمِ ملکِ سخن دانی رفت
فاضل و افضل و بے مثل نماند	کامل و اکمل و لاثانی رفت
با کمالے کہ تو آگاہی ازد	ہمہ دانے کہ تو می دانی رفت
ہمیش ہیں کہ بیک پائے آخر	تا بہ منزلِ گمہ روحانی رفت
راہِ داں آمد و ہم راہِ شناس	رہِ دشوار بہ آسانی رفت
بر دل و جان من از رفتن او	رنجِ روحانی و جسمانی رفت

خاست چوں از سر جان ہاتفِ گفت

مولوی شبلی نعمانی رفت

قطعاً مرثیہ و تاریخ

از

پہچ مداں سلیمان

کون کہتا ہے کہ زیر خاک ناپیدا ہوا
شبلی سیرت نگار مرسل قدسی سرشت
عشق پیغمبر میں فرقت سے بہت بچین تھا
لے گیا ہے شوق دیدار نبی سوائے بہشت

فلک پہ دھوم ہوئی عاشق رسولِ امم
سوانح نبوی کر رہا ہے خوب رقم
ہوا یہ حکم الہی مجھے پسند آیا
حضور میں اسے لاؤ بصد وقار و حشم

برائے لوحِ مزار

سعدی عصر و غزالی زمانِ خلدونِ دقت
شبلی نعمانی والا گہر عالی سرشت
سیزدہ صد بود وی و دو در روز پنجمیں
بت و ہشت ماہ ذی الحجہ کہ ایں منزل بہشت
چہار شنبہ ۱۳۳۲ھ
۲۸ رزی الحجہ

قطعاً تاریخ

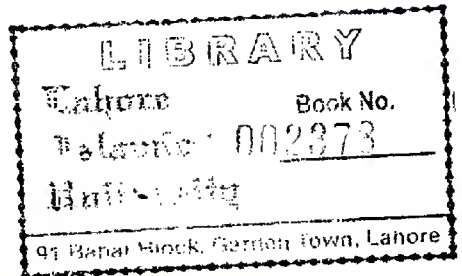
از

مولوی سید احمد مرتضیٰ نظر صاحب، وکیل سرونج (مالوہ)

مولف آثار مالوہ و صولت شیر شاہی

چو علامہ شبلی پاک باطن
بجگم الہی ز دار فنا رفت
نظر ہاتفِ غیب سالِ دفاتش
بگفتا کہ ”شبلی بہ دار بقا رفت“

۱۳۳۲ھ



PRINTED IN INDIA. 20034222, FAX 20034200

ISBN 81-906613-3-7



9 788190 661331